Poly
ABS/
P.V.
Elast

Pho

Cox & Cooks

Mac Travels

Mac Security Agency

Mac Detective Agency

Mac Consultancy Services

Security Consultancy Services

Credit Collection & Investigation Agency

OFFICES

16-B, SHAKESPEARE SARANI
OPPOSITE ASTOR HOTEL
CALCUTTA - 700071
Phone : 44-[illegible]

PARK STREET
CALCUTTA - 700016
Phone : 24-8354 & 24-8355

[illegible], SHAKESPEARE SARANI
CALCUTTA - 700017
Phone : 43-5903

ONE NETAJI SUBHAS ROAD
CALCUTTA-700001
[illegible] & 22-[illegible]
Cable : [illegible]

Kind Attention
Importers, Actual Users Export Houses

We are the indenting agents for the following Raw Materials

Polythene Moulding Powder
ABS/Nylon Moulding Powder
P.V.C. Resins
Elastic Cloth
Low density High density
M.M. V.P.Monomer
Fine Chemical
Self Adhesive Tape &
Insulating Tape

Ferrous Non Ferrous Metals

Please Contact :

NARANG ENTERPRISES
L-4, Connaught Circus, New Delhi-110001

Phone 311976 Telex 031-3980 SAUI IN Cable QUICKSERV

HEARTY GREETINGS

AND

BEST WISHES

ON THE AUSPICIOUS OCCASION

OF A

REPUBLIC DAY

FROM

MOHAN GOLD WATER

Dolly Ganj, Luknow (U.P.)

APEEJAY

SERVING THE NATION IN DIVERSE FIELDS

Manufacturers	STEEL STHUCTURALS & PIPES INGOTS, BILLETS ETC
Shipping	CARRY MERCHANDISE ALL OVER THE WORLD
Tea	SEVERAL GARDEN PRODUCE QUALITY TEA FOR FOREIGN AND DOMESTIC MARKETS
Imports/Agencies	STEEL, DRUGS, CHEMICALS, PHARMACEUTICALS, ROLLING STOCK, NEWSPRINT, EDIBLE OILS ETC
Exports	STEEL, STEEL PIPES GARMENTS, LEATHER GOODS ENGINEERING ITEMS
Hotels	FIVE STAR PARK HOTELS AT CALCUTTA VIZAG, AND NEW DELHI (Under Construction)

APEEJAY PVT. LTD.

17 Park Street, Calcutta

PHONE 246881-32-83

TELEX 021 7309 APEEJAY

BOMBAY NEW DELHI VIZAG

With Best Compliments From

BRANCHES

A DICTIONARY

URDU [illegible]

AND ENGLISH

JOHN [illegible]

[illegible] TEACHER AT THE [illegible]

OF [illegible]

[illegible] SIZE 20x30 CLOTH BOUND

CAN BE HAD FROM Rs 72/-

THE SHAN-E-HIND MONTHLY

FLAT 8, ANSARI MARKET, DARYA GANJ

NEW DELHI-110002

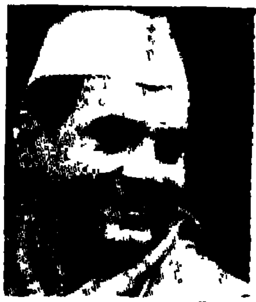

ہریانہ۔ خوشحال مستقبل کی طرف گامزن

سنہ ۱۹۵۰ء میں ہمارا آئین نافذ ہوا۔ اس کے بنیادی اصول ہیں انصاف، آزادی، مساوات و اخوت۔ یہی اُصول مختلف ترقیاتی پروگراموں میں ہماری رہنمائی کرتے رہے ہیں۔ ان اخلاقی اصولوں کی رہنمائی میں ہم غریبی، ناخواندگی اور بے روزگاری جیسے مسائل کا سامنا کرتے ہوئے ترقی کی راہ پر گامزن رہے ہیں۔ زراعت، صنعت، مواصلاتی نظام، سائنس اور ٹکنالوجی جیسے مختلف شعبوں میں ہماری کامیابیاں تو بے مثال ہیں ہی پر سماج کے مفلس اور دبے ہوئے طبقوں کی طرف بھی ہم نے خاص توجہ دی ہے۔ نتیجہ کے طور پر آج یہ طبقات بھی قوم کی تعمیر نو میں بھرپور تعاون دے رہے ہیں۔ شریمتی اندرا گاندھی کی پُرجوش قیادت میں ہریانہ نے ترقی کی کئی منزلیں طے کی ہیں۔ ساتھ ہی مستحکم اور چوکس انتظامیہ نے امن و امان اور ترقی کے لئے سازگار فضا بنا[illegible]
وزیر اعظم شری راجیو گاندھی کو حاصل عوامی انتخابی فتوے ۲۱ ویں صدی میں ہماری قوم کے ایک عالمی رہنما کے طور پر اُبھرنے کی غمازی کرتا ہے۔ ہریانہ اپنی چومکھی ت[illegible] اعث چند برسوں میں ترقی کی ایک مثال بن گیا ہے۔ امید واثق ہے کہ ہم ترقی کی راہ پر مسلسل گامزن رہیں گے۔

● ہریانہ نے ۷۰ لاکھ ٹن اجناس کی پیداوار کی ہے جب کہ سنہ ۱۹۶۶ء میں یہ صرف ۲۶ لاکھ ٹن تھی۔

● آبپاشی سہولیات سنہ ۱۹۶۶ء میں ۱۲ لاکھ ۹۲ ہزار ہیکٹر کی نسبت اب بڑھ کر ۲۷ لاکھ ہیکٹر میں میسر ہو گئی ہے

● سبھی ہریجن بستیوں میں بجلی لگا دی گئی ہے اور ۶۰۴۴۳ ہریجن گھروں میں رعایتی شرح پر ایک پوائنٹ کے کنکشن دئے جا چکے ہیں۔ ۱۰۰ ہم گاؤں کی گلیوں کو بجلی کی روشنی سے منور کر دیا گیا ہے۔

● چھوٹی صنعتوں کی تعداد سنہ ۱۹۶۶ء میں ۴۵ کے مقابلے اب ۵۰۵۰۰ ہو گئی ہے۔ ۱۸۲۴۰ دیہی اکائیوں میں ۵۴۴۷ افراد کام کرتے ہیں جن میں سے ۵ فی صد کا تعلق کمزور طبقوں سے ہے۔

● صنعتوں میں تیزی سے اضافے سے سالانہ صنعتی برآمدات سنہ ۱۹۶۶ء کے ساڑھے چار کروڑ روپے کی نسبت اب ۲۰۰ کروڑ روپے تک ہو گئی ہے۔

● ریاست میں طبی سہولیات ۵ کلومیٹر کے دائرے میں دستیاب ہیں۔ اب طبی سہولیات پر فی کس ۴۴ روپے ۱۵ پیسے صرف کئے جاتے ہیں جب کہ سنہ ۱۹۶۶ء میں اس مد پر صرف ایک روپیہ ۴۲ پیسے خرچ کئے جاتے تھے۔

● ہریانہ نے خاندانی منصوبہ بندی میں اعلیٰ کارکردگی کے لئے متواتر سنہ ۱۹۸۲-۸۳ اور سنہ ۱۹۸۳-۸۴ میں اعزازات حاصل کئے ہیں۔

● ۶۹۰۴ دقت والے گاؤں میں سے ۴۱۰۰ گاؤں کو صاف پینے کا پانی مہیا کرایا جا چکا ہے۔ سنہ ۱۹۸۶ء تک پینے کے پانی کی کمی والے سبھی گاؤں کو یہ سہولت میسر کرا دی جائے گی۔

● ریاست میں پرائمری، مڈل، ہائر اور کالج درجہ تک کی تعلیمی سہولیات بالترتیب ایک کلومیٹر، ۲.۰۳۷ کلومیٹر، ۲.۹۵ کلومیٹر اور ۱۰.۴۵ کلومیٹر کے دائرے میں دستیاب ہیں۔

● ریاست میں چار لاکھ ۳۰ ہزار کنبوں کو غریبی کی سطح سے اوپر اٹھانے کے لئے اقتصادی امداد دی گئی ہے۔ اقتصادی طور پر کمزور طبقوں کے ۱۰۱۴۱ افراد میں ایک لاکھ ۳۵ ہزار ایکڑ فاضل اراضی تقسیم کی جا چکی ہے۔ تین لاکھ بے گھر لوگوں کو مفت رہائشی پلاٹ دئے گئے ہیں۔

● سنہ ۱۹۶۶ء میں سڑکوں کی لمبائی ۵۱۰۰ کلومیٹر کے مقابلے اب ۲۰ ہزار کلومیٹر ہو گئی ہے۔

● ہریانہ روڈویز کی ۲۹۰۰ آرام دہ بسیں روزانہ ۷.۶ لاکھ کلومیٹر کی مسافت طے کرتی ہیں جن میں ۱۱.۱۳ لاکھ مسافر سفر کرتے ہیں۔

● گزشتہ سال دس کروڑ شجر لگائے گئے تھے سال رواں میں اتنے ہی اور شجر لگانے کا عمل جاری ہے۔

میری سرکار امن و اخوت کے ماحول میں صاف ستھرے اور مستعد انتظامیہ کے ذریعہ ترقی کی رفتار میں برق رفتاری لانے کا عزم کرتی ہے۔ ہم اپنی روایتی قدروں کو برقرار رکھ کر ایک جدید دور کا آغاز کرنے کا عزم رکھتے ہیں۔ ہماری منزل ہے درخشاں مستقبل۔ آیئے! آج ہم سب اس مبارک موقع پر وزیر اعظم شری راجیو گاندھی کی جرأت مندانہ اور پُرجوش قیادت میں دیش کی سالمیت اور یکجہتی کو قائم رکھنے کے لئے متحد ہو کر کام کرنے کا عزم کریں۔

بھجن لال وزیر اعلیٰ ہریانہ

ABDULRAB

ریانہ۔ خوشحال مستقبل کی طرف گامزن

۱ء میں ہمارا آئین نافذ ہوا۔ اس کے بنیادی اصول ہیں انصاف، آزادی، مساوات و اخوت۔ یہی اصول مختلف ترقیاتی پروگراموں میں ہماری رہنمائی کرتے رہے ہیں۔ ان اخلاقی میں ہم غریبی، ناخواندگی اور بے روزگاری جیسے مسائل کا سامنا کرتے ہوئے ترقی کی راہ پر گامزن رہے ہیں۔ زراعت، صنعت، مواصلاتی نظام، سائنس اور ٹکنالوجی جیسے مختلف کامیابیاں تو بے مثال ہیں ہی پر سماج کے مفلس اور دبے ہوئے طبقوں کی طرف بھی ہم نے خاص توجہ دی ہے۔ نتیجہ کے طور پر آج یہ طبقات بھی قوم کی تعمیر نو میں بھرپور تعاون یتی اندرا گاندھی کی پُرجوش قیادت میں ہریانہ نے ترقی کی کئی منزلیں طے کی ہیں ساتھ ہی مستحکم اور چوکس انتظامیہ نے امن و امان اور ترقی کے لئے سازگار فضا بنائے رکھی ہے نظم شری راجیو گاندھی کو حاصل عوامی انتخابی فتوے ۲۱ویں صدی میں ہماری قوم کے ایک عالمی رہنما کے طور پر اُبھرنے کی غمازی کرتا ہے۔ ہریانہ اپنی چوطرفہ ترقی کے نتیجہ کے میں ترقی کی ایک مثال بن گیا ہے۔ امید واثق ہے کہ ہم ترقی کی راہ پر مسلسل گامزن رہیں گے۔

لاکھ ٹن اجناس کی پیداوار کی ہے جب کہ ۱۹۶۶ء میں یہ صرف ۲۶ لاکھ ٹن تھی۔

۱۹۶۶ء میں ۱۲ لاکھ ۹۲ ہزار ہیکٹر کی نسبت اب بڑھ کر ۲۷ لاکھ ہیکٹر میں میسر ہو گئی ہے

- سبھی ہریجن بستیوں میں بجلی لگا دی گئی ہے اور ۶۰۴۴۳ ہریجن گھروں میں رعایتی شرح پر ایک پوائنٹ کے کنکشن دئے جا چکے ہیں۔ ۱۰۰ گاؤں کی گلیوں کو بجلی کی روشنی سے منور کر دیا گیا ہے۔
- چھوٹے صنعتوں کی تعداد ۱۹۶۶ء میں ۴۵۰۰ کے مقابلے اب ۵۰۰۰۰ ہو گئی ہے۔ ۴۰ ۱۸۲ دیہی اکائیوں میں ۵۳۴۷ افراد کام کرتے ہیں جن میں سے ۵۰ فی صد کا تعلق کمزور طبقوں سے ہے۔

ری سے اضافے سے سالانہ صنعتی برآمدات ۱۹۶۶ء کے ساڑھے چار کروڑ روپے لروڑ روپے تک ہو گئی ہے۔

ں سہولیات ۵ کلو میٹر کے دائرے میں دستیاب ہیں۔ اب طبی سہولیات پر فی کس یہ خرچ کئے جاتے ہیں جب کہ ۱۹۶۶ء میں اس مد پر صرف ایک روپیہ ۳۲ پیسے خرچ کئے جاتے تھے۔

- ہریانہ نے خاندانی منصوبہ بندی میں اعلیٰ کارگزاری کے لئے متواتر ۸۳-۱۹۸۲ء اور ۸۴-۱۹۸۳ء میں اعزازات حاصل کئے ہیں
- ۴۹۰ دقت والے گاؤں میں سے ۲۱۰۰ گاؤں کو صاف پینے کا پانی مہیا کرایا جا چکا ہے ۱۹۸۶ء تک پینے کے پانی کی کمی والے سبھی گاؤں کو یہ سہولت میسر کرا دی جائے گی۔
- ریاست میں پرائمری، مڈل، ہائی اور کالج درجہ تک کی تعلیمی سہولیات بالترتیب ایک کلومیٹر، ۲۰۳۷ کلومیٹر، ۲۰۹۵ کلومیٹر اور ۵۰۴، ۱۰ کلومیٹر کے دائرے میں دستیاب ہیں۔
- ریاست میں چار لاکھ ۳۰ ہزار کنبوں کو غریبی کی سطح سے اوپر اٹھانے کے لئے اقتصادی مدد دی گئی ہے۔ اقتصادی طور پر کمزور طبقوں کے ۱،۰۱،۴۱ افراد میں ایک لاکھ ۲۵ ہزار ایکڑ فاضل اراضی تقسیم کی جا چکی ہے تین لاکھ بے گھر لوگوں کو مفت رہائشی پلاٹ دئے گئے ہیں۔
- ۱۹۶۶ء میں سڑکوں کی لمبائی ۵۱۰۰ کلومیٹر کے مقابلے اب ۲۰ ہزار کلومیٹر ہو گئی ہے۔
- ہریانہ روڈویز کی ۳۰۹۰۰ آرام دہ بسیں روزانہ ۶۰۷ کلومیٹر کی مسافت طے کرتی ہیں جن میں ۱۱،۱۳ لاکھ مسافر سفر کرتے ہیں۔
- گزشتہ سال دس کروڑ شجر لگائے گئے تھے سال رواں میں اتنے ہی اور شجر لگانے کا عمل جاری ہے۔

میری سرکار امن و اخوت کے ماحول میں صاف ستھرے اور مستعد انتظامیہ کے ذریعہ ترقی کی رفتار میں برق رفتاری لانے کا عزم کرتی ہے۔ ہم اپنی روایتی قدروں کو برقرار رکھ کر ایک جدید دور کا آغاز کرنے کا عزم رکھتے ہیں ہماری منزل ہے درخشاں مستقبل۔ آئیے! آج ہم سب اس مبارک موقع پر وزیر اعظم شری راجیو گاندھی کی جرأت مندانہ اور پُرجوش قیادت میں دیش کی سالمیت اور یکجہتی کو قائم رکھنے کے لئے متحد ہو کر کام کرنے کا عزم کریں۔

بھجن لال وزیر اعلیٰ ہریانہ

HAYAT HASHMI

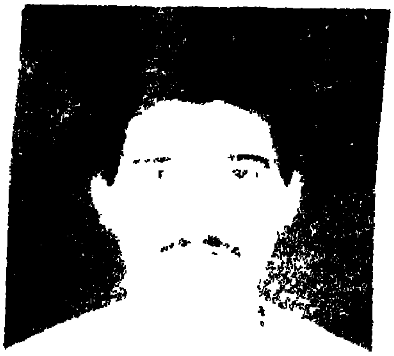

PINARA ABDULRAB
NISHTAR
DEIRA-DUBAI

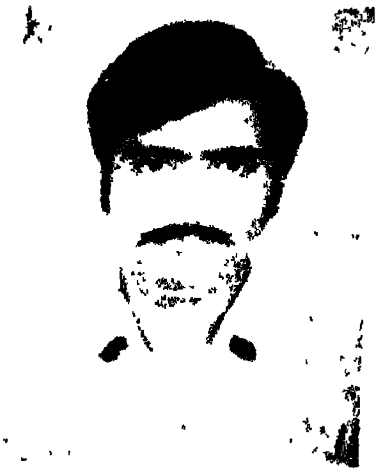

MOHD. MOBIN
ZAKHMI
SURAT

اشاعتِ خصوصی جشنِ جمہوریت

ٹیلیفون نمبر ۲۶۵۶۹۳ رجسٹرڈ نمبر D (DN) 152

رجسٹرار آف نیوز پیپرز فار انڈیا کا رجسٹریشن نمبر ۵۷/۲۶۳۴۲

قیمت سالانہ
چوبیس روپے
فی پرچہ
ڈھائی روپے
اس شمارے کی قیمت
تین روپے

ماہنامہ

شانِ ہند نئی دلی

ایڈیٹر
سرور تونسوی

Accession Number. 86098
Date 21.12.87

جلد نمبر ۴۶ جنوری ۱۹۸۵ء شمارہ نمبر ۱

نیا یومِ جمہوریت اور شانِ ہند

تھا کل بھی، مگر آج ہے رنگِ چمن اور — جمہور کی قدروں سے بڑھی شانِ وطن اور
گلشن ہے یہ سینہ وادی ہر چند کا گلشن — طوفاں سے نکھرتا ہے صداقت کا چمن اور
کچھ بڑھ سی گئی عشق کی پاکیزہ نگاہی — کچھ آ ہی گیا حسن میں بے ساختہ پن اور
دامن کا الجھنا بھی دل آویز ہے یارو — پھولوں کا چلن اور، نہ کانٹوں کا چلن اور
پانی میں کبھی ایسی روانی تو نہیں تھی! — آزاد ہیں، دلشاد ہیں کچھ گنگ و جمن اور
چمکی ہوئی سردی میں ہے چمکی ہوئی قسمت — پھولوں کی مہک اور ہے کلیوں کی پھبن اور
ہر گوشۂ گلزار میں بارات سجے گی — پردے میں کہیں چھپ کے نہ بیٹھے گی دلہن اور
گلشن کی فضاؤں کو قرار آ گیا آخر — ہر روز نہ بدلے گا اب آئینۂ چمن اور

فیاض بہ ہر گام ہیں میرے لئے کیجیے
آئینۂ جاں بن کے تجھے نور آیت دلن اور

پبلشر کاشف سرور تونسوی نے لیتھو کے صفحات خواجہ پرنٹنگ پریس چتلی قبر جامع مسجد دہلی، اور بلاک کے صفحات پائلٹ پرنٹرس دہلی
میں چھپوا کر دفتر شانِ ہند نزد فلش منڈ انصاری مارکٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا۔

جمہوریت کے
کروڑوں
ستون
چار ہفتے پیشتر
دسمبر کے آخری ہفتے میں
ہمارے کروڑوں
شہری اور دیہاتی
بوڑھے اور جوان
مردوں اور عورتوں نے
اُمڈ کر
اپنی حکومت
مُنتخب کی
اور آزاد ووٹ
اور جمہوریت کی طاقت کو
ایک بار پھر نمایاں کیا۔
جمہوریت اور آزادی
ہمارا بیش قیمت خزانہ
اور بے بہا ورثہ ہے۔
آئیے
اپنی جمہوریہ کی
35 ویں سالگرہ پر
اسے برقرار رکھنے
کا عہد کریں۔
اتحاد اور مضبوطی کے ساتھ
davp 84/272

بلبل چہ گفت؟ گل چہ شنید؟ و صبا چہ کرد

اتر پردیش اردو اکیڈمی —— اونٹ رے اونٹ تیری کون کل سیدھی

ہندوستان میں اردو اکیڈمیوں کی بسم اللہ اتر پردیش اردو اکیڈمی سے ہوئی تھی جو ۱۹۷۲ء میں قائم کی گئی۔ دوسری ریاستوں میں اردو اکیڈمیاں بعد میں وجود میں آئیں اُن کے آئین، اور قواعد و ضوابط اور طریقۂ عمل بھی اتر پردیش ہی کی اکیڈمی کے [illegible] یا عکس ہیں۔ بادی النظر میں یہ اکیڈمیاں اردو زبان کی ترقی و فروغ کے لیے معرضِ وجود میں آئی ہیں لیکن درحقیقت اردو زبان [illegible] کے متعلق بجا طور پر صرف یہی کہہ سکتی ہے کہ ع

کھلونا دے کے بہلایا گیا ہوں

اتر پردیش اردو اکیڈمی (اور اسی طرح سے ملک بھر کی اردو اکیڈمیاں) اپنی بنیادی تشکیل ہی سے ع

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی

کے مصداق ہیں نہ صرف پوری جنرل کونسل بلکہ اگزیکیوٹو کمیٹی تک ریاستی حکومت نامزد کرتی ہے۔ اور اس پر بھی بس نہیں پریذیڈنٹ، چیرمین اور وائس چیرمین بھی وہی مقرر کرتی ہے سکریٹری بھی وہ اپنے سکریٹریٹ سے بھیجتی ہے۔ اگزیکیوٹو کمیٹی میں زیادہ تر یونیورسٹیوں کے پروفیسر، ریڈر اور صدر شعبہ [illegible] اور حکمران پارٹی کے معتمد دیے جاتے ہیں [illegible] کی وجہ سے جو بیشتر سیاسی مصالح سے کی جاتی ہیں، یہ اکیڈمی ایک ادبی تنظیم کے بجائے سرکار کے وفاداروں [illegible] کی ایک تفریح گاہ بن گئی ہے جہاں ہر جنرل کونسل، مجلس انتظامیہ اور بے شمار سب کمیٹیوں کی میٹنگ میں شرکت کے لیے ممبروں کو آمد و رفت کے فرسٹ کلاس کے کرائے، بھتے کے علاوہ چائے کافی، پان، سگرٹ اور پرتکلف لنچ ملتے ہیں اور کبھی کبھی تحائف بھی۔

اس ضمن میں یہ پُر لطف واقعہ بھی سن لیجیے کہ عرصہ ہوا اتر پردیش اردو اکاڈمی کے ایک ذمہ دار رکن نے علی گڑھ سے لکھنؤ تک کے سفر خرچ میں گومتی ایکسپریس کا فرسٹ کلاس کرایہ درج فرمایا جب سفر خرچ کا یہ بل اکاؤنٹس ڈیپارٹمنٹ میں گیا تو اکاؤنٹنٹ صاحب نے اس ذمہ دار رکن کی خدمت میں حاضر ہو کر اُن کے کان میں کہا کہ حضور گومتی ایکسپریس کا سٹاپ علی گڑھ میں ہے ہی نہیں تو آپ نے گومتی ایکسپریس سے سفر کیسے کیا؟ (اُن دنوں گومتی علی گڑھ میں نہیں رکتی تھی) اور اس انکشاف پر ممبر مذکورہ نے دوسرا بل بنا کر پیش کیا۔

جنرل کونسل کا تازہ ترین اجلاس جو ۱۲ دسمبر ۱۹۸۷ء کو صرف آدھ گھنٹے کے لیے ہوا تھا، اور جس میں صرف چند تعزیتی قرار دادیں ہی پاس ہو سکی تھیں، اس پر تقریباً (۲۰) ہزار روپے سے بھی زیادہ صرف ہوا۔ لنچ کے دوران ایک ممبر نے مرغ کھاتے ہوئے اور بریانی کھاتے ہوئے بڑے پُر لطف انداز میں فرمایا "اردو کے مرنے کا تو افسوس ہے لیکن اس کی فاتحہ کا کھانا واقعی مزیدار ہوتا ہے"! تمام تر حکومت کی نامزد کی ہوئی اکیڈمی [illegible] سے یہ توقع کرنا کہ وہ اردو زبان کے جائز حقوق دلانے کے لیے حکومت سے کوئی مطالبہ کرے گی یا کسی قسم کی جدوجہد کرے گی کسی بے وقوف کا خواب ہی ہو سکتا ہے۔ اس کونسل [illegible] کے باوجود اگر کبھی کوئی باضمیر ممبر [illegible] اردو سے متعلق قول و فعل میں کھلے ہوئے تضاد سے [illegible] سچی بات کہہ اٹھتا ہے تو اس کی بات کی نقار خانے میں طوطی کی آواز سے زیادہ اہمیت نہیں [illegible]

کرنا جاتی ہے جو نہ اخباروں کو بھی جاتی ہے۔ حکومت کو اگر کوئی زیادہ اہم اور ناگزیر مسئلہ درپیش ہوجاتا ہے جیسے اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کا تو فوراً حکومت کو میمورنڈم پیش کرنے کے واسطے اس کا مسودہ بنانے کے لیے ایک ہنگامی کمیٹی کی تشکیل کرنی پڑتی ہے اور زیرِ بحث مسئلہ نہ صرف سرد خانے بلکہ قبرستان میں پہنچ جاتا ہے۔

خیر یہ تو اکیڈمی کے دائرہ عمل کا رُخ ہے کہ اس کی چند دار اور بیشتر ممبران کو اردو زبان سے زیادہ حکومت کی خوشامد اور اس کے نتیجے میں اپنی نامزدگی اور اس کے حاصلات پیارے ہیں، لیکن اب اس کا دوسرا رخ بھی ملاحظہ فرمایئے جس میں حکومت سے ہر پیسے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا بلکہ جس کا براہ راست تعلق [illegible] اندرونی نظم و ضبط اور کارکردگی سے ہے۔ کچھ کم اس سے [illegible] وہ کچھ بہتر توقعات رکھ سکتے تھے۔ مگر بڑی شرم اور [illegible] کہ اکیڈمی کا یہ داخلی رُخ اپنے خارجی رُخ سے بھی زیادہ تلخ اور مکروہ بن چکا ہے۔ [illegible] بابت [illegible] صادق آتی ہے کہ [illegible] تیری یا کو [illegible] [illegible] بھائی جو کل سید [illegible]

موجودہ [illegible] اسلامی معاملات [illegible] تجربہ [illegible]

[illegible] اور ہند کی [illegible] مروجہ [illegible]

[illegible] دفتری کاموں سے بالکل ناواقف ہونے کی وجہ سے [illegible] اور اپنی بیویوں [illegible] . . . . . .

. . . . . . کے [illegible] رہا [illegible]

جانے سے [illegible] کی وجہ سے اکیڈمی کے رکابۂ خوار [illegible] کا شکار ہیں۔ پہلے بڑی پیٹے سے اب ہاتھ سے پائے نہیں چلتا۔ پہلے ان کے پاس سائیکل بھی نہیں تھی لیکن اب اکیڈمی [illegible] کے بغیر گھر سے قدم نہیں نکالتے اکیڈمی [illegible] کے [illegible] اور باہر [illegible] موجود ہے۔ کاش کہ یہ سب باتیں اسی رسم پر [illegible] کہلانے [illegible] کے دن پھیرے سب کے پھیرے!

نہیں یہ بظاہر کم عقل سید ھے سادے اور نیم تعلیم یافتہ [illegible] اپنے دوسرے ہتھکنڈوں سے بھی غافل نہیں ہیں۔

[illegible] ویوانہ بکارِ خویش ہشیار۔ اس کے علاوہ موصوف حد سے زیادہ ضدی اور مردم آزار بھی واقع ہوئے ہیں۔

پیشتر کے چیرمینوں نے یہ ایک صحت مند روایت قائم کر رکھی تھی کہ وہ اپنے کچھ فرائض اور اختیارات اپنے وائس چیرمینوں کو بھی ڈیلیگیٹ کر دیا کرتے۔ موجودہ چیرمین مفتی صاحب نے اپنے وائس چیرمین جناب رام لعل کو اس سے محروم رکھا کیونکہ ایک مفتی ہونے کی وجہ سے یہ بخوبی جانتے ہیں کہ اسلام کی رُو سے ہر غیر مسلم کافر ہے اور ایک کافر سے کسی مفتی کا نباہ کرنا از خود کفر ہے۔

اس سلسلے میں کئی سینیئر ممبروں نے اصرار کیا لیکن اُن کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ بالآخر یہ معاملہ مجلسِ انتظامیہ تک پہنچا۔ اس نے ایک مرتبہ نہیں بلکہ دو مرتبہ مفتی صاحب کو ہدایت کی کہ آپ جناب رام لعل کو بھی اپنی ذمہ داریوں میں شریکِ کار بنائیے لیکن اس کے باوجود انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ تیسری مرتبہ جب پھر یہ مسئلہ انتظامیہ میں بڑے پُرزور طریقے سے بہت سے ممبروں نے اٹھایا تو مفتی صاحب اجلاس سے واک آؤٹ کر گئے کیونکہ اُن کے منکر نکیر انھیں گھر سے ہی ایسا کرنے کا سبق پڑھا کر لائے تھے۔

جیسا کہ ہم شانِ ہند [illegible] اشاعت میں لکھ چکے ہیں کہ بیگم حامدہ حبیب اللہ پریذیڈنٹ اکیڈمی نے اکیڈمی سے شائع ہونے والے دو رسالوں [illegible] اکیڈمی [illegible] ماہنامہ [illegible] کی نگرانی جناب رام لعل صاحب کو سونپا ہے اور تب ہی سے مفتی صاحب [illegible] کسی بھی کمیٹی میں شرکت نہیں فرماتی کیونکہ ان کی کمیٹیوں نے سمجھایا ہے کہ [illegible] انتہائی بے عزتی ہے۔

اس سلسلے میں دو تین باتیں اور بھی سنتے چلیے۔ [illegible] صاحب کا جلسے سے واک آؤٹ کرنا، مجلسِ انتظامیہ کی [illegible] میں نہیں لکھا گیا۔ اکیڈمی کے دونوں مندرجہ بالا رسالے [illegible] کی تاریخ سے شائع ہوتے ہیں۔ ہر پرچے میں کسی نہ کسی بہانے [illegible] کی تصویر [illegible] شائع ہوتی ہے کیونکہ مفتی صاحب نے [illegible] نشین کرا رکھا ہے کہ اب اسلام سے [illegible] اتنا اور شائع کرکے آپ اپنے [illegible] کے لیے جائز [illegible] دیا ہے۔ ان رسالوں کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ ان کے [illegible]

سے زیادہ خریدار نہیں ہیں۔ جبکہ اکیڈمی ان دونوں رسالوں کی اشاعت پر کم سے کم ستر پچھتر ہزار روپیہ سالانہ خسارہ برداشت کرتی ہے۔ اس کے باوجود مجلسِ انتظامیہ کے پچھلے اجلاس میں مفتی صاحب نے یہ فرمائش کی تھی کہ ان رسالوں سے کام کے متعلق اکیڈمی کے ایک کارکن کو دو سو روپیہ ماہوار مزید الاونس اور بونس دیا جائے۔ جوش سمینار اور مشاعرے کے لیے منظور کیا گیا تھا پچیس ہزار لیکن اس پر خرچ کیا گیا پچاسی ہزار کیا ایسی عدیم المثال بدعنوانی کے بعد سوائے اتر پردیش اردو اکیڈمی کے کسی دوسرے ادارے کا سربراہ منہ دکھانے کے قابل رہ سکتا تھا؟

اکیڈمی میں پچیس ہزار روپے ایک نئے کارکن نصرت حسین رضوی لے کر فرار ہو گئے۔ اُن کے ضامن اکیڈمی ہی کے دو ممبر صاحبان پروفیسر شبیہ الحسن اور ڈاکٹر نیر مسعود تھے۔ غبن کی تحقیقات کے سلسلے میں جو کمیٹی تشکیل دی گئی تھی اُس نے متفقہ فیصلہ دیا کہ مفرور کارکن کے ساتھ ہی غبن میں اکیڈمی کے سابق سکریٹری غلام حسین زیدی بھی ملوث ہیں۔ اکیڈمی نے از راہِ غربا نوازی و اعزا نوازی غبن شدہ روپے کی بازیابی کی کوئی عملی کوشش نہیں کی۔ ضامنوں سے کسی قسم کی بازپرس مناسب نہیں سمجھی۔ بلکہ غلام حسین زیدی کی تنخواہ کی بقایا جو غبن کی تحقیقات کے سلسلے میں رکی ہوئی تھی اُسے چیرمین صاحب کی سفارش پر آسانی سے ادا کر دیا حالانکہ غبن کا سارا روپیہ [illegible] چاہیے تھا اور یہ مفرور ضامنوں سے روپیہ وصول [illegible] چاہیے تھا بلکہ شبیہ الحسن صاحب ایسے [illegible] والے [illegible] چاہیے تھے کہ اپنے [illegible] کو ادا [illegible]۔

جناب [illegible] کے لیے ایک قاعدہ موسوم بہ آسان اردو لکھا تھا۔ اکیڈمی کی انتظامیہ کمیٹی نے ماہرین کی رائے لینے کے بعد شروع اپریل [illegible] میں یہ فیصلہ کیا کہ [illegible] کے بجائے اکیڈمی خود شائع کرائے۔ اگست ۱۹۸۲ء میں جب موجودہ چیرمین برسرِ اقتدار آئے تو [illegible] اُس ۴۸ صفحے کے قاعدے پر بے دریغ روپیہ [illegible] اور تصویر سازی پر صرف کیا جانے لگا حتیٰ کہ رفتہ رفتہ تیس ہزار روپے اکیڈمی کی تحویل سے نکل گئے۔ اس کے بعد اس کی طباعت کے لیے

مفتی صاحب بہ نفسِ نفیس خود دہلی جا کر دو آفسٹ پریسوں کے چھپنے ٹنڈر لائے جو ۴۵ ہزار اور ۴۰ ہزار روپے کے تھے اور لطف کی بات یہ ہے کہ جن پریسوں سے یہ ٹنڈر دیے گئے اُن کے یہاں کوئی آفسٹ پرنٹنگ مشین ہے ہی نہیں۔ جبکہ دہلی میں کم و بیش دو ہزار آفسٹ پریس ہوں گے اور یہ ٹنڈر بذریعہ ڈاک یا اشتہار طلب کیے جا سکتے تھے جو یقیناً اس سے ایک چوتھائی رقم کے ہوتے جب یہ ٹنڈر مجلسِ انتظامیہ کے سامنے پیش ہوئے اور ممبروں کو پہلی دفعہ یہ پتا چلا کہ چار جزو کے ایک قاعدے کی صرف پانچ ہزار جلدوں پر ایک لاکھ روپیہ خرچ ہوگا تو انھوں نے بڑا واویلا مچایا اور محسوس کیا کہ اس قاعدے کو مفتی کی آڑ بنا کر اکیڈمی کے روپوں کا استحصال کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ اخراجات کی جانچ پڑتال کے لیے ایک ہنگامی کمیٹی تشکیل کی گئی۔ بدقسمتی سے اکیڈمی کی روایت یہ ہے کہ ہر کمیٹی کا بھی چیرمین اکیڈمی کا چیرمین ہی ہوتا ہے۔ لہٰذا اس سب کمیٹی کے بھی سربراہ مفتی صاحب تھے انھوں نے جب دیکھا کہ بعض مالی بے ضابطگیوں کے اعتراضات براہِ راست اُن پر وارد ہو رہے ہیں مثلاً بلا کسی بجٹ کے ایک چھوٹے سے قاعدے کے متعلق کتابت اور طباعت پر اتنی کثیر رقم کیسے خرچ ہو گئی، لکھنؤ کے بجائے دہلی کے آفسٹ پریسوں سے کیوں رجوع کیا گیا اور وہ بھی سینکڑوں آفسٹ پریسوں میں سے صرف دو ایسے پریسوں سے جن کے ہاں آفسٹ پرنٹنگ مشین [illegible] کہ بصورتِ موجودہ قاعدہ چھپنے کے لائق ہی نہیں ہے مصنف نظرِ ثانی کرکے اسے پھر پیش کریں اور اُس وقت اُس کی اشاعت پر از سرِ نو غور کیا جائے گا۔

مجلسِ انتظامیہ میں اس تجویز کے پیش ہونے سے پہلے ممبروں نے پوچھا کہ قاعدہ جب چھپنے کے لائق ہی نہ تھا تو اس پر اب تک اتنی کثیر رقم کیوں صرف کی گئی؟ یہ تو سابقہ غبن سے بھی کہیں زیادہ افسوسناک معاملہ ہے کیونکہ یہ ناگزیر نہ تھا۔ اور بہت بڑی دیدہ دلیری سے آنکھوں میں دھول

چھوڑی جا رہی تھی۔

اکیڈمی کے ارباب بست و کشاد اس حقیقت سے بے بہرہ تھے کہ اُردو زبان کی بقا کے لیے سب سے زیادہ ضروری امر یہ ہے کہ نئی نسل کو اُردو کی طرف رجوع کیا جائے۔ اس کے لیے کتابیں، رسالے، چارٹ وغیرہ شائع کرائے جائیں لیکن اس سلسلے میں اُتر پردیش اُردو اکاڈمی کی کارکردگی بالکل صفر ہے۔ جہاں زندہ شعراء کے غزلیات کے مجموعے اور مرحوم شعراء کے کلام کے انتخابات نیز نکات الشعراء، منتخب العروض، گلشنِ بے خار وغیرہ جیسی کتابیں شائع کی جا رہی ہیں وہاں یہ کوششیں بھی کی جانی چاہیئے کہ ایسی کتابوں کو پڑھنے والے بھی تیار کیے جائیں موجودہ نسل میں جو انگلیوں پر گنے جانے والے حضرات ان کتب سے مستفید ہو سکتے ہیں اُن کے بعد ان کتابوں کو کون پڑھے گا۔

بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اشاعتِ کتب کے ماتحت اکیڈمی کا روپیہ کافی حد تک خرد برد کیا جا رہا ہے جو کتاب کوئی ناشر پانچ ہزار روپے میں چھاپ سکتا ہے وہ اکیڈمی میں پندرہ ہزار روپوں میں پہنچتی ہے۔

قریب قریب یہی کیفیت لائبریریوں کی امداد کی ہے بعض ایسی لائبریریوں کو مالی امداد دی جاتی ہے جن کا کوئی وجود ہی نہیں ہے اور اگر ہے بھی تو معشوق کی کمر کی طرح موہوم یعنی صرف کاغذی۔ ایک مرتبہ اکیڈمی کے کو آرڈی نیٹر لائبریریوں کا جائزہ لینے کے واسطے دور سے پر بھیجے گئے تھے۔ اُن کی رپورٹ سے پیشتر ہی اکیڈمی میں کئی جگہوں سے یہ شکایتیں پہنچیں کہ وہ صاحب لائبریریوں کے منتظمین سے اس دھمکی کے ساتھ رشوت طلب کر رہے تھے کہ مجھے کچھ دو ورنہ تمہاری لائبریری کی پول کھول دونگا اور گرانٹ بند ہو جائے گی ؎

تیر سیاہ نامۂ لشکر یاں شکستہ صف
ہائے وہ تیر یم کش اہلکار ہر کوئی ہدف

آج کل ایکشن کا دور دورہ ہے۔ مارچ میں الیکشن ہو جائے گا۔ اُتر پردیش کی نئی وزارت بنے پر شانِ ہند ایسی منظم تحریک شروع کرے گا جس سے اُتر پردیش کی حکومت مجبور ہو جائے گی کہ وہ اردو اکاڈمی اتر پردیش کی ان بے ضابطگیوں کے بارے میں کسی جج کے ذریعہ تحقیقات کرائے تاکہ اتر پردیش کے اُردو دوستوں کو اصل صورتِ حال کا علم ہو سکے۔ کیونکہ اب کسی بھی ریاستی چیف منسٹر کو یہ جسارت کرنے کی ہمت نہ ہو سکے گی کہ وہ وزیر اعظم جناب راجیو گاندھی کے نقشِ قدم پر چلنے سے انکار کرتے ہوئے بھرشٹاچار کے خلاف عملی قدم نہ اُٹھائے شانِ ہند کی آئندہ اشاعتوں میں نہ صرف اُتر پردیش اُردو اکاڈمی کے سلسلے میں مزید انکشافات کیے جائیں گے بلکہ دیگر ریاستوں کی اُردو اکیڈمیوں کی کارگزاریوں سے بھی آپ کو روشناس کرایا جائے گا۔

سِرِّ مغفرت

ایک ہزار روپیہ انعام

شریمد بھگوت گیتا کا منظوم اُردو ترجمہ جس کے متعلق دعوے سے کہا جا سکتا ہے کہ اُردو میں آج تک ایسا سلیس اور عام فہم منظوم ترجمہ شائع نہیں ہوا۔ اگر کوئی صاحب اس دعوے کو جھٹلا سکیں تو انہیں ایک ہزار روپیہ نقد انعام دیا جائے گا سِرِّ مغفرت کے شروع میں شریمد گیتا سے متعلق جو معلومات دی گئی ہیں آج تک کم سے کم اُردو میں ان کا وجود نہیں تھا۔ مؤلف ابو الفصاحت پنڈت بلا رام ورتن پنڈوری نے گیتا سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے سِرِّ مغفرت میں جو واقفیت بہم پہنچائی ہے اس سے گیتا کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ قیمت صرف بائیس روپیہ علاوہ محصول ڈاک

دفتر ماہنامہ شانِ ہند، خلیل شرف چتلی قبر دہلی ۶

[illegible]

اردو اکادمی دہلی

ایک نظر میں

* اردو کے مشہور ادیبوں، شاعروں، صحافیوں کو ادبی خدمات کے اعتراف میں پانچ پانچ ہزار روپے، اکادمی کے نشان، شالیں اور اسناد ایوارڈ کے طور پر دی جاتی ہیں۔
* اردو ناشرین کی حوصلہ افزائی کی خاطر اچھی مطبوعات پر دو دو ہزار روپے کے انعامات بھی دیے جاتے ہیں۔
* سال میں ایک بہترین مطبوعات پر دہلی کے مصنفین کو دو دو ہزار روپے کے انعامات دیے جاتے ہیں۔
* مستحق اور ضعیف اہلِ قلم حضرات کو پس مرگ ان کے وارثوں کو تین سو روپے ماہوار کی مالی امداد فراہم کی جاتی ہے۔
* مستحق اہلِ قلم حضرات کی تحقیقات کی طباعت پر مالی امداد دی جاتی ہے۔
* مشاہیر شعرا، ادبا اور اہلِ قلم حضرات کے اعزاز میں اور ایسے ہی مہمانوں کے لیے اعزازی تقاریب منعقد کی جاتی ہیں۔
* اکادمی کی مرکزی لائبریری کے لیے اردو کی جدید اعلیٰ اور معیاری کتب کو خرید کر عوام کے فائدے کے لیے محفوظ کیا جاتا ہے اور اداروں و درسگاہوں کو ایسی کتابیں مفت دستیاب کرائی جاتی ہیں۔
* دہلی کی تہذیبی، ثقافتی اور سماجی زندگی پر مذاکرات سیمینار، نشستیں منعقد کی جاتی ہیں اور ان میں پیش کی جانے والی تقاریر، مقالوں اور رپورٹوں کو شائع کرایا جاتا ہے۔
* اردو ادب کی مختلف اصناف میں مجلسوں اور نشستوں کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ پیش کیے جانے والے کلام اور فن پاروں کو شائع کیا جاتا ہے۔
* اردو کی تعلیم کو فروغ دینے کے لیے چھٹی، آٹھویں اور دسویں جماعتوں کے ہونہار اور امتیازی نمبر حاصل کرنے والے طلبا کو وظائف دیے جاتے ہیں۔
* اردو اسکولوں میں طلبا کے تقریری، مضمون نویسی، خوش خطی، غزل اور نظم خوانی وغیرہ کے مقابلے منعقد کیے جاتے ہیں۔
* اردو خوش نویسی کے فن کو فروغ دینے کے لیے اکادمی کی طرف سے اردو کتابت کا ایک دو سالہ کورس چلایا جا رہا ہے۔
* بورڈ، یونیورسٹی کے امتحانات میں اردو میں اوّل پوزیشن حاصل کرنے والے طلبا کو سند، رقم، سرٹیفکیٹ اور میڈل بطور انعام دیا جاتا ہے۔
* زیرِ درس [illegible] کے لیے [illegible] کی تعلیم کے [illegible] کا [illegible] جاتا ہے۔
* اردو معیاری ادب سے متعلق انجمنوں کو پروگرام کے انعقاد کے لیے مالی امداد دی جاتی ہے۔

ٹیکس کی ذمہ داریاں کم کیجئے

انکم ٹیکس ایکٹ ۸۰ سی کے تحت ۱۰ سالہ اجتماعی میعادی جمع کھاتہ (سی۔ ٹی۔ ڈی) اور ۱۵ سالہ پبلک پراویڈنٹ فنڈ (پی۔ پی۔ ایف) میں رقوم جمع کرائیے

سی۔ ٹی۔ ڈی

کم سے کم دس روپے ماہانہ زیادہ سے زیادہ ایک ہزار روپے یہ رقم پانچ کے حاصل ضرب کے ساتھ ایک یا ایک سے زیادہ کھاتوں میں ماہانہ جمع ہو سکتی ہے۔

سرمایہ کاری کی بالائی حد مشترکہ کھاتوں میں دوگنی ہو جاتی ہے۔

۱۰ فیصد سود جو ٹیکس سے مستثنیٰ ہے دس روپے ماہانہ کے کھاتے پر یہ رقم پورے عرصے کی تکمیل پر ۲۰۷۱ روپے مع بونس کی شکل میں ملتی ہے۔

ایک سال بعد رقم نکالنے کی اجازت اور دوبارہ پانچ سال کے بعد جمع شدہ رقم کے نصف تک رقم نکالنے کی اجازت۔ اگر رقم نہ نکالی گئی ہو تو دس روپے کے کھاتے پر ۵۰ روپئے کا بونس مدت مکمل ہونے پر ادا کیا جائیگا۔ مزید رقم اسی تناسب سے بونس کی ادائیگی ... یا ماہانہ قسطیں ... جمع کرائی جائیں تو جمع کی جانے والی رقوم ... کے ساتھ قبول کی جاتی ہیں۔

... مرکز میں ... کے ذریعہ اور گھروں میں ... کے ذریعہ آپ کے دروازے پر سروس مہیا کی جاتی ہے۔ ... تمام ڈاک گھروں میں کھاتے کھولے جا سکتے ہیں۔ ... جمع رقم کی مد پر دولت ٹیکس سے مستثنیٰ۔

پی۔ پی۔ ایف

کم سے کم سرمایہ کاری میں ۱۰۰ روپے زیادہ سے زیادہ سرمایہ کاری سال میں ۴۰۰۰۰ روپے یہ رقم یک مشت یا بارہ قسطوں میں جمع ہو سکتی ہے۔

۱۹۸۴-۸۵ء میں ۹ فیصد سالانہ سود جس پر ٹیکس نہیں لگے گا۔

قرضے لینے اور جزوی رقم نکالنے کی سہولت۔ ... اس رقم پر ڈگری نہیں ہو سکتی۔ خود روزگار مہیا کرنے والوں کے لئے بہترین اسکیم۔

اس کھاتے میں جو رقم جمع کر دی جاتی ہے بشمول اس رقم کے جو جمع کرنے والے پر انحصار رکھنے والی بیوی اور اس کے بچوں کے نام بھی جمع کرا دی جائے۔ اسے انکم ٹیکس اور دولت ٹیکس میں رعایت کا مستحق سمجھا جاتا ہے۔

تمام ہیڈ پوسٹ آفسوں، اسٹیٹ بینکوں اور قومی ملکیت کی دیگر بینک شاخوں میں کھاتے کھولے جا سکتے ہیں۔

جمع رقوم پر دولت ٹیکس نہیں لگتا اور اس پر کم از کم ... رقوم جمع رکھنے کی شرط بھی عائد نہیں ہوتی۔

نیشنل سیونگز آرگنائزیشن

کاموٹی کا کُل ہند طرحی مسالمہ

(دبیل انجم کاموٹی)

آج مورخہ ۲۲ محرم الحرام [illegible] مطابق ۱۹ اکتوبر [illegible] بروز جمعہ آستانۂ صوفی کاموٹی میں لگے ہوئے شامیانہ میں ہزاروں کی تعداد میں سامعین کرام جمع ہیں۔ شامیانہ کے دائیں طرف خواتین سامعین کا انتظام ہے اور حسب معمول سیکڑوں خواتین بھی جمع ہیں سب کی نگاہیں شامیانہ کے مغربی حصہ میں بنے ہوئے اسٹیج کی طرف ہیں۔ اسٹیج کو برقی رنگ برنگی قمقموں کے ذریعہ خوبصورت دیئے سے سجایا گیا ہے۔ شامیانہ کے اندر سامعین کی نشستوں کا معقول انتظام ہے۔ اس وقت رات کے دس بج چکے ہیں۔ یہ تمام اہتمام حضرت صوفی عبدالحکیم کاموٹی کے عرس مبارک اور امام عالی مقام حسین علیہ السلام کی یاد میں ایک طرحی مسالمہ کی شکل میں گزشتہ کئی سالوں کی طرح اس سال بھی کیا گیا ہے۔ یہ طرحی کُل ہند مسالمہ اب ہندوستان گیر شہرت حاصل کر چکا ہے۔ اس طرحی مسالمہ کے لئے دو مصرعے دئے گئے ہیں۔ وہ ہیں،

① "چراغ سبط نبی کو بجھا سکا نہ کوئی" ——— [illegible]

② "روشن رہے گا عزمِ حسینی کا آفتاب"

اس سال کی طرح اس سال بھی شہر کاموٹی و ناگپور کے منتخب شعرائے کرام کے علاوہ چند بیرونی شعرائے کرام کو بھی مدعو کیا گیا ہے۔ مسالمہ کی صدارت عزت مآب جسٹس قاضی مجیب الدین صاحب (ہائی کورٹ ناگپور) فرما رہے ہیں۔ [illegible] کلام پاک اور نعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوا۔ پھر صاحب صدر کے [illegible] رہے ہیں۔ [illegible] کے مطابق صدر موصوف کی خدمت میں ایک سپاس نامہ پیش کیا۔ سجادہ نشین صوفی مجیب الرحمٰن صوفی غلام رسول اور صوفی غلام ربانی کی جانب سے پیش کیا گیا۔ اس کے بعد ناگپور یونیورسٹی سے مختلف امتحانات پر اپنا ڈگری حاصل کرنے والے قابل علم و دانش کو خطابات سے نوازا جا رہا ہے۔ ان میں دو نوجوان خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ایک ہیں ڈاکٹر ضیاء انور جنہیں "ثریا ادب" کا خطاب دیا گیا اور دوسری ہیں ڈاکٹر شیرہ رشید جنہیں "زہرۂ سخن" کے خطاب سے نوازا گیا۔ اب صدر محترم شہدائے کربلا پر اپنی جامع تقریر سے نواز رہے ہیں۔ لوگ ہمہ تن گوش ہو کر سن رہے ہیں۔ صدر محترم حسب معمول بڑی اچھی اور سلجھی ہوئی تقریر کر رہے ہیں۔ آج کے مسالمہ کی نظامت تلقین صدر کے ذمہ ہے مگر وہ ابھی تک تشریف نہیں لائے۔ نظامت کے لئے سرپرست مسالمہ قبلہ شاطر حکیمی نے مجھ ناچیز کا انتخاب کیا گرچہ میں نے کچھ مشاعروں کی نظامت اپنی بساط کے مطابق کی ہے مگر مسالمہ کی نظامت کا یہ پہلا موقع تھا۔ خیر خدا پر بھروسہ کرتے ہوئے میں نے مائیک تھام لیا ہے۔ اپنی مختصر سی بات کے بعد کسی شاعر کو مسالمہ کے آغاز کے لئے آواز دینا ہی چاہتا تھا کہ مسالمہ کے سرپرست اور استاذ محترم قبلہ شاطر حکیمی نے مجھ سے مائیک لے لیا اور اپنا طرحی کلام سنانے لگے۔ دراصل ان کی طبیعت آج کل ناساز چل رہی ہے۔ خیر آپ کا کلام سماعت فرمایئے ؎

عالم میں انتخاب محبوں میں لاجواب
ایسا کوئی حسین نہ ایسی کوئی کتاب

محترم شاطر حکیمی صاحب اپنے مخصوص انداز میں تحت اللفظ میں اپنا کلام سنا رہے ہیں اور بھرپور داد و تحسین حاصل کر رہے ہیں۔ ان کے یہ دو شعر بھی بہت پسند کئے گئے ؎

ہو نہ وفا سے [illegible] رہا
[illegible] تیرے چمن کا مہکتا ہوا گلاب
خون حسین تما نہیں کوئی
ظالم کا چہرہ چھپ نہیں سکتا پس نقاب

محترم شاطر حکیمی صاحب کو بہت داد دی گئی دراصل جس کے دل میں امام حسین عالی مقام کی محبت ہے وہ ایسے شعر کہہ سکتا ہے۔ اب میں خود حاضر ہو گیا ہوں۔

اور اپنا طرحی سلام حسبِ معمول ترنم میں سنا رہا ہوں شائقین حضرات داد دے کر فکر سا کے حوصلے بڑھا رہے ہیں۔ دو شعر آپ کی نذر کر رہا ہوں ؎

ایثار اہلِ بیت سے ثابت یہ ہو گیا
حق والے ہر مقام پہ پہنچے ہیں کامیاب
اے مقتلِ حسین تری زندگی دراز
برپا ہے تیرے دم سے زمانے میں انقلاب

اب بیرونی شاعر نیّر دموہی کو اُن کے مختصر سے تعارف کے بعد آواز دی گئی۔ نیّر دموہی پہلی بار کامٹی تشریف لائے ہیں۔ اور لوگ سنبھل کر بیٹھ گئے ہیں۔ نیّر صاحب نے پہلے ایک قطعہ سنایا۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیں ؎

رسول اللہ کا دلبر اگر مقتل میں آ جاتا
فلک کیا شے ہے عرشِ خالق اکبر آ جاتا
حسین ابنِ علی کا قتل ہے راز مقدر نہ
زمینِ کربلا پہ چشمۂ کوثر اتر آتا

واہ کا شور و غل ہے کہ تھمنے نہیں پا رہا ہے پورا پنڈال واہ واہ اور سبحان اللہ کے نعروں سے گونج رہا ہے اور سبھوں نوازِ ترنم نے فضا کو اور دلکش بنا دیا ہے۔ واہ کا شور کم ہوا تو نیّر صاحب اپنا طرحی کلام سنا رہے ہیں ؎

شبیر چرخِ دین صداقت کا آفتاب
شبیر باغِ دیں کا مہکتا ہوا گلاب

مسالہ ابتدا ہی سے عروج پر ہے۔ پنڈال سامعین سے بھرا پڑا ہے بہت سے سامعین جگہ نہ ملنے کی وجہ سے باہر ہی سے کھڑے کھڑے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ نیّر دموہی بہت کامیاب ہیں۔ اُن کا یہ شعر تحفتاً بہت پسند کیا گیا ؎

ظاہر ہی تیر آگے ہے باطن میں تیر اور نہ صورت کبھی لا جواب ہے سیرت کبھی لاجواب
نیّر دموہی کلام ختم کر کے نہایت کامیاب مائیک سے رخصت ہو رہے ہیں۔ اب ناگپور کے عزیز منطق مائیک پر آ رہے ہیں گو کہ یہاں کافی اثر نہیں چھوڑ رہے ہیں تاہم اُن کا یہ شعر اچھا لگا ؎

ہوئیں کوششیں ناکام یزیدِ لعینوں کی
حسین ابنِ علی کو مٹا سکا نہ کوئی

اب کامٹی کے نوجوان اور مترنم شاعر اشفاق نجمی مائیک پر ہیں اور اپنے کلام سے محظوظ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور کسی حد تک کامیاب ہیں۔ اُن کے دو شعر آپ بھی سنئے ؎

غمِ حسین میں پلکوں پہ آنسوؤں کے چراغ
ہم اہلِ درد کی صورت جلا سکا نہ کوئی
کچھ اپنے وقت کے معبود بھی بنے لیکن
بس اک حسین ہی بن کر دکھا سکا نہ کوئی

اب ناگپور کے نوجوان شاعر حمید انصاری تشریف لا کر تحت میں بڑی عمدگی سے اپنا کلام سنا رہے ہیں اور داد وصول کر رہے ہیں ؎

ستم کی دھوپ میں زینب کے ماسوا کوئی
ردائے صبر کے غنچے کھلا سکا نہ کوئی
خدا کی راہ میں سر تو کٹا گئے لیکن
مقامِ حضرتِ شبیر پا سکا نہ کوئی

اب مہمان لیکن جانے پہچانے شاعر حسن فتح پوری کو زحمت دی جا رہی ہے حسن فتح پوری جواں سال شاعر ہیں اور بھوپال میں مقیم ہیں۔ جتنے اچھے شاعر ہیں اُتنے ہی اچھے انسان بھی ہیں مائیک پر آ کر پہلے قطعات سے نواز رہے ہیں ؎

ہر شعری تشکیل کا بانی ہے حسین پرواز تخیل کی روانی ہے حسین
ہاں مصرعۂ اولیٰ کو محمد کہیے اسلام ترا مصرعۂ ثانی ہے حسین

واہ و تحسین کا شور کم ہوا تو دوسرا قطعہ عنایت کر رہے ہیں ؎

اسلام کی عظمت کا نشاں خونِ حسین
قرآن کی خاموش زباں خونِ حسین
دنیا نہ مٹا پائے گی تا حشر اسے
ہے دین کی رگ رگ میں رواں خونِ حسین

واہ پھر مکمل کر دی جا رہی ہے اور حسن فتح پوری بڑے احترام ادب کے ساتھ وصول کر رہے ہیں۔ حسن فتح پوری کا بڑا پیارا ہے۔ سامعین نے حوصلہ بڑھایا تو ایک اور قطعہ دیکھا ؎

کربلا تو کسی بیوہ کی کہانی مانگے
اُس بچپن تو کبھی اُس کی
ہاں مگر ایک نئی بات ہے کہ فرات

ایسا دیا ہے جو عباس سے پانی مانگے

پدایانِ حسین بھی شاعر کی حوصلہ افزائی فرما رہے ہیں۔
طلو کو دہرانے کے بعد حسن فتح پوری اپنے مخصوص انداز میں
پابلطرح کلام سنا رہے ہیں ؎

اوصاف کیا بیان کروں آپ کے جناب
بحرِ گراں ہیں آپ تو میں ہوں فقط حباب

حسن مطلع میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ مصرعۂ طرح کو ضم
کیا گیا ہے۔ آپ بھی دیکھئے ؎

ہوں سیکڑوں یزید ہزار آئیں انقلاب
"روشن رہے گا عزمِ حسینی کا آفتاب"

ایک تو کلام کی پاکیزگی اور سونے پہ سہاگا پڑھنے کا خوبصورت
انداز۔ گویا ہر طرح سے حسن فتح پوری کامیاب ہیں آگے فرماتے
ہیں ؎

یہ جیت تو یزید کے مقصد کی ہار ہے
شبیر اپنے سر کو کٹا کر ہیں کامیاب

اکبر حبیب قاسم و عباس شیر خوار
اک کربلا کے واسطے کیا کیا ہیں انتخاب

ذلت کی زیست سے بھلی عزت کی موت ہے
کربل کی سرزمیں سے اٹھا پہلا انقلاب

حسن فتح پوری اپنا کلام ختم کر کے نہایت کامیاب لوٹ
رہے ہیں۔ اور مسالمہ نہایت کامیابی کے ساتھ اپنی منزل کی
طرف بڑھ رہا ہے۔ اب ایک اور مہمان شاعر ناشر حیدری رائے
پوری کو زحمت دی جا رہی ہے۔ ناشر حیدری مجمع کو زیادہ متاثر
کر پائے۔ اُن کے دو شعر آپ بھی دیکھئے ؎

مصطفیٰ کی بولتی تصویر صرف اکبر تھے
پھر ایسی شان کا جلوہ دکھا سکا نہ کوئی

صرف تمہارا امتحاں علی اکبر
کہ گاہوارے سے مقتل تک آ سکا نہ کوئی

... دل کی محفلیں ہوں یا مسالموں کی مجلسیں سامعین
... نظمیں ہمارے ہوتی رہتی ہیں۔ کبھی فرمائشیں یا قاعدہ
... جاتی ہیں تو کبھی کبھی چھوٹی چھوٹی پرچیوں کے

ذریعے۔ یہاں آوازیں تو نہیں لگائی گئیں مگر کچھ پرچیاں میرے پاس
ضرور آئی ہیں۔ پرچیوں میں زیادہ تر بیرونی شعرائے کرام کو سننے
کی فرمائشیں درج ہیں لیکن چونکہ ابھی کچھ کامٹی اور ناگپور کے
شعرائے کرام باقی ہیں اور انہیں موقع محل دیکھ کر بلایا جا رہا ہے
اس لئے فرمائشوں پر زیادہ دھیان دینا ضروری نہ تھا۔ مقامی
شعرائے کرام میں خلش قادری کا نام نہایت نمایاں ہے میں
انہیں زحمت دے رہا ہوں۔ خلش قادری علاقۂ ودربھ کے
معتبر شاعر ہیں مگر کچھ دنوں سے اپنی ناسازیِ طبیعت کے باعث
مشاعروں اور مسالموں سے دور ہو گئے ہیں۔ خلش قادری کی
ترنم میں پڑھیں چاہے تحت میں سامعین اُن کے کلام کو پسند
فرماتے ہیں۔ آج اپنا کلام تحت میں سنا رہے ہیں اور داد
وصول کر رہے ہیں۔ چند شعر آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔ کیا
خوب کہتے ہیں ؎

پوچھوں جو صبح و شامِ غریباں کا میں حساب
شمس و قمر کے چہرے پہ پڑ جائیں گے نقاب

موجیں سمٹ کے سینۂ ساحل میں رہ گئیں
دیکھا گیا نہ تشنہ دہانوں کا اضطراب

دامانِ قتل گاہ میں چھینٹیں لہو کی ہیں
یا منتشر ہے ریت پہ اللہ کی کتاب

خلش قادری کامیاب ہو کر مائک سے لوٹ رہے ہیں اور
اب ایک اور مہمان شاعر ضیاء القمر رائے پوری مائک پہ تشریف
لا رہے ہیں۔ ترنم میں اپنا کلام سنا رہے ہیں۔ دو شعر آپ کی نذر ہیں

شجاعت اور اطاعت کا نام ہے عباس
یہ وہ لقب ہے جس کو نبھا سکا نہ کوئی

رسولِ پاک کی عظمت تو دور کی شے ہے
حسین ہی کے مقابل میں آ سکا نہ کوئی

قمر رائے پوری نے کوئی خاص تاثر نہیں چھوڑا ہے۔ اب
ناگپور کے رمضان طالب کو دعوت دی جا رہی ہے۔ طالب
صاحب تحت میں کلام سنا رہے ہیں اور کامیاب ہیں۔ دو شعر
پسند کئے گئے یہ آپ بھی ملاحظہ فرمائیں ؎

قدرت کی ادا ہیں سب کچھ لٹا کے بھی خوش ہیں

کربلا کی دھوپ میں سب کچھ لٹا سکا نہ کوئی

کسی کے پیاسوں نے پانی پلا دیا سب کو
نبی کے پیاروں کو پانی پلا سکا نہ کوئی

اب نہایت ادب و احترام کے ساتھ حضرت پیام اعظمی
کو دعوت دی جا رہی ہے جو اعظم گڑھ سے تشریف لائے ہیں۔
حضرت پیام اعظمی محتاجِ تعارف نہیں۔ مسدس پہ قدرت
رکھتے ہیں۔ بڑے بڑے علماء آپ کے ارشادات کو سند آ
پیش کرتے ہیں۔ اس سے زیادہ حضرت پیام اعظمی کی کیا
توصیف کی جا سکتی ہے کہ اہلِ علم و فضل انہیں "انیس عصر"
کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ حضرت پیام اعظمی مائیک پر آ کر
ماحول کا جائزہ لے رہے ہیں۔ سامعین میں ہلچل سی مچی ہوئی
ہے۔ حضرت پیام اعظمی طرحی سلام سے پہلے چند قطعات سنا کر
محظوظ فرما رہے ہیں۔ ایک قطعہ خاص طور سے بہت پسند کیا گیا
آپ کی ضیافتِ طبع کے لئے حاضر ہے۔

مانگہ نمازِ علوی کی خاطر
خورشید سرِ شام پلٹ آیا تھا
لیکن ترے اک سجدے کی خاطر کشش
جاتا ہوا اسلام پلٹ آیا تھا

حضرت پیام اعظمی سے سامعین بڑے متاثر ہو رہے ہیں۔
واہ واہ و تحسین کی صداؤں سے پنڈال گونج رہا ہے۔ طرحی کلام
کے چند شعر بھی ملاحظہ فرمائیں۔ واہ کیا اندازِ بیان ہے۔

عمل کی اتنی بلندی پہ جا سکا نہ کوئی
نبی کے دوش سے کاندھا ملا سکا نہ کوئی

جوابِ اصغرِ بے شیر لا سکا نہ کوئی
گلے پہ تیر سے تو مسکرا سکا نہ کوئی

ہلالِ عید میں لے گئے تھے نیزے پر
کہ کاٹ کر بھی ترا سر جھکا سکا نہ کوئی

حضرت پیام اعظمی بہت کامیاب رہے۔ کچھ شعر تو ان
سے بار بار پڑھوائے گئے۔ اور اب کامٹی کے جوان فکر شاعر ڈاکٹر
یونس افسر کو دعوتِ سخن دی جا رہی ہے۔ یونس افسر
صاحب کافی اچھے اور جانے پہچانے شاعر ہیں۔ حسبِ معمول

تحت میں اپنا طرحی کلام سنا رہے ہیں

صداقتِ حق تھی کہ جس کو دبا سکا نہ کوئی
حسینیت کو جہاں سے مٹا سکا نہ کوئی

یہ اور بات کہ سب جنگ پر تھے آمادہ
نگاہ سبطِ نبی سے ملا سکا نہ کوئی

رہ فرات پہ پہرہ تو سخت ہے لیکن
رہِ حسین پہ پہرہ لگا سکا نہ کوئی

چراغ شام تو کتنے ہی بجھ گئے جل کر
چراغِ سبطِ نبی کو بجھا سکا نہ کوئی

یونس افسر بہت کامیاب ہیں۔ سامعین انہیں برابر داد دئے
چلے جا رہے ہیں۔ اور جب وہ اس شعر پر پہنچے

حسین جب بھی لکھو تو حسین لگتا ہے
تمہارے نام کی خوبی کو پا سکا نہ کوئی

تو پورا مجمع واہ واہ اور "سبحان اللہ" کے شور میں ڈوب گیا۔ کئی بار
اس شعر کو یونس صاحب سے پڑھوایا گیا۔ ڈاکٹر یونس افسر
کے بعد ناگپور کے پروفیسر یونس صاحب کو زحمت دی گئی۔
پروفیسر یونس گزشتہ چند سالوں سے بلا ناغہ اس مسالمہ میں
شرکت فرما رہے ہیں۔ بڑے مخلص اور قدر شناس آدمی ہیں
شاعری میں جدید و قدیم روایت کے حامل و قائل ہیں۔ فکر میں
شگفتگی اور اسلوبِ بیان میں دلکشی ہے۔ مگر افسوس کہ
میں ان کے طرحی کلام کے منتخب اشعار نوٹ نہیں کر سکا
تاہم طرحی کلام سے پہلے انہوں نے چند شعر سنائے تھے جن
میں سے یہ شعر آپ کی خدمت میں پیش ہے۔

قریب جاؤ تو سانسوں کی آنچ آتی ہے
درونِ دشت نہ جانے مزار کس کا ہے!

مشاعروں کی دنیا میں آج چند نام بڑے معتبر ہیں۔ جو
صرف مشاعروں کی کامیابی کی ضمانت تصور کئے جاتے ہیں
مشاعروں کی زینت سمجھے جاتے ہیں۔ انہیں میں سے ایک
نام جوگا سنگھ انور کا بھی ہے۔ جوگا سنگھ انور گزشتہ
بھی مسالمہ میں تشریف لائے تھے اور بڑی کامیابی حاصل
جب بھی ان کا نام زبان پر آتا ہے تو ان کا یہ شعر بھی یاد آ

MOB
HMI
PAT

ہے ۔ ؎

ان چند لکیروں سے دھرتی تو بٹی لیکن
تحریر کوئی دل کو تقسیم نہ کر پائی

شاعر انسانیت اور اخوت پر یقین رکھتا ہو وہی شاعر ایسے شعر سکتا ہے۔ جوگا سنگھ انور کا نام سنتے ہی سامعین میں ایک ی کی لہر دوڑ گئی۔ اور میں دیکھ رہا ہوں کہ جو لوگ اسٹیج سے کچھ دور ے ہوئے ہیں وہ بھی جگہ بنا کر اسٹیج کے نزدیک آنے کی کوشش ہے ہیں۔ اور جوگا سنگھ انور اپنے مخصوص ترنم میں حضرت حسین ام عالی مقام کی بارگاہ میں اپنا نذرانہ پیش کر رہے ہیں ؎

یزید میت گیا لیکن بچا سکا نہ کوئی
چراغ سبط نبی کو بجھا سکا نہ کوئی
نظر نظر میں ابھی تک لہو کا منظر ہے
بہتروں کی شہادت بھلا سکا نہ کوئی

سامعین جھوم جھوم کر داد دے چلے جا رہے ہیں اور جوگا سنگھ انور اسی رح نغمگی بکھیرتے چلے جا رہے ہیں۔

علا ہ کر راہ میں شہدائے کربلا کے سوا
ہتھیلیوں پہ سر اپنا سجا سکا نہ کوئی
حسین صبر و شجاعت کی انتہا تھے
مگر ابھی آپ کا ثانی بنا سکا نہ کوئی
شہید ہو کے بھی کچھ اور سربلند ہوتے
وقار عزم حسینی گھٹا سکا نہ کوئی
یزید لاکھ اٹھاتے گئے مگر انور
حسین کا سر اقدس جھکا سکا نہ کوئی

ماشاء اللہ کی گونج میں جوگا سنگھ انور مائیک سے ہیں۔ اب صرف تین شعرائے کرام باقی رہ گئے ہیں رہا دو بجا چاہتے ہیں۔ ڈاکٹر منشا الرحمٰن خاں ر سال سے ناگپور کامٹی کے ادبی ماحول کو گرم کا انداز عام فہم، ہر بزم ہر مجلس کی رونق بنے رہتے یب سادگی اور اخلاق میں بھی مثال۔ ڈاکٹر منشا الرحمٰن دعوت دی جا رہی ہے۔ آپ مائیک پر آکر فرما رہے ؎

لہو کو اپنے ٹھکانے لگا سکا نہ کوئی
رخ حیات کو یوں جگمگا سکا نہ کوئی
حضور آپ سا ملت کی سربلندی کو
سر عزیز کٹا کر بچا سکا نہ کوئی

ڈاکٹر منشا صاحب کو مناسب داد دی جا رہی ہے۔ ڈاکٹر منشا ہی ایک ایسے شاعر تھے جنھوں نے دونوں مصرعوں پر طبع آزمائی کی ہے۔ دوسرے طرحی سلام کے بھی دو شعر بہت پسند کئے گئے آپ بھی دیکھئے ؎

ابن علی سراپا جلال و جمال تھے
سیرت میں آفتاب تو صورت میں ماہتاب
تیغوں کے زیر سایہ ادا کی نماز عشق
ٹھہرے وہ امتحان شہادت میں کامیاب

اب محترم شارق جمال صاحب کو دعوت دی جا رہی ہے آپ حضرت طرفہ قریشی کے شاگرد رشید ہیں۔ پورے خلوص کے ساتھ اردو ادب کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ آپ کی زندگی حضرت طرفہ قریشی مرحوم کی تربیت کا آئینہ ہے۔ مائیک پہ آکر عنایت کر رہے ہیں ؎

امین فطرت حق بن کے آ سکا نہ کوئی
حد اطاعت شبیر پا سکا نہ کوئی
مثال تشنگی تم ہمیں ملے کیسے
نصیب اصغر بے شیر پا سکا نہ کوئی
یہ صرف کوثر و تسنیم کا مقدر تھا
بلا کی تشنہ لبی تھی بجھا سکا نہ کوئی
بڑے تھے اہل ستم آندھیوں کی طرح مگر
"چراغ سبط نبی کو بجھا سکا نہ کوئی"

اب سالار کے آخری شاعر حضرت مہدی نظمی کو احترام و ادب کے ساتھ آواز دی جا رہی ہے۔ حضرت مہدی نظمی ماشاءاللہ پاک کے عظیم المرتبت اور صاحب تسلیم شاعر ہیں۔ مجمع ہمہ گوش آواز ہے۔ حضرت مہدی کی بلندئ تخیل کا احاطہ کرنا مشکل ہے معلوم ہوتا ہے یہ سب کرم ہے مولائے کائنات کا اور فیضان ہے امام عالی مقام کا۔ مائیک پہ پہلے قطعات سے مستفیض فرما

رہے ہیں۔ لوگ بڑے ذوق و شوق سے اُنہیں سن رہے ہیں۔ ہر طرف داد سے نواز رہے ہیں۔ اُن کے کلام سے میں خود اتنا محظوظ ہو رہا تھا کہ کوئی شعر نوٹ نہیں کر سکا۔ پھر سوچا کہ مسالمہ کے اختتام پر اُن کا کلام حاصل کر لوں گا مگر یہ بھی ممکن نہ ہو سکا۔ بہر حال: اُن کا یہ شعر یاد رہ گیا ہے

اسیرِ حسن کو شہرِ فردوس آگیا

اسیرِ حسن پیاس کا پیمانۂ شباب

اس طرح مسالمہ کا یہ پہلا دور ختم ہوا۔ سامعین کے پُر زور اصرار پر مسالمہ کا غیر طرحی دور شروع کیا گیا۔ جس میں صرف بیرونی شعرائے کرام کو موقع دیا گیا۔ دوسرا دور بھی خوب کامیاب رہا۔ اس طرح یہ طرحی مسالمہ رات کے تین بجے ختم ہوا اور بہت کامیاب رہا۔ مسالمہ کی کامیابی کے لئے محترم قبلہ شاطر حکیمی، صوفی حبیب الرحمن، صوفی حفیظ الرحمن، صوفی غلام رسول اور صوفی غلام رحمان مبارک باد کے بہت بہت مستحق ہیں جن کی انتھک کوششوں اور دوڑ دھوپ کا نتیجہ یہ مسالمہ یادگار ثابت ہوا۔

آئینۂ حقیقت

(تضمین بر اشعار اقبالؒ)

بھول کر اپنی حقیقت، صیدِ لاچاری ہے تو
سروری ہے تیرا ورثہ، اہلِ سرداری ہے تو
تو نہیں بے مایہ قطرہ، قلزمِ جاری ہے تو
"کیوں گرفتارِ طلسمِ ہیچ مقداری ہے تو
دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکتِ طوفاں بھی ہے"

خامیِ تدبیر تھی یہ، تھی نہ قسمت کی خطا
بحر در آغوش ہو کے، بھی تو تشنہ لب رہا
موسمِ گل آیا، رنگ و بو لٹا کر چل دیا
تو ہی ناداں تھا، چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیِ داماں بھی ہے

کندن لعل گر دھر

بھری والا منڈی (ضلع فرید کوٹ)

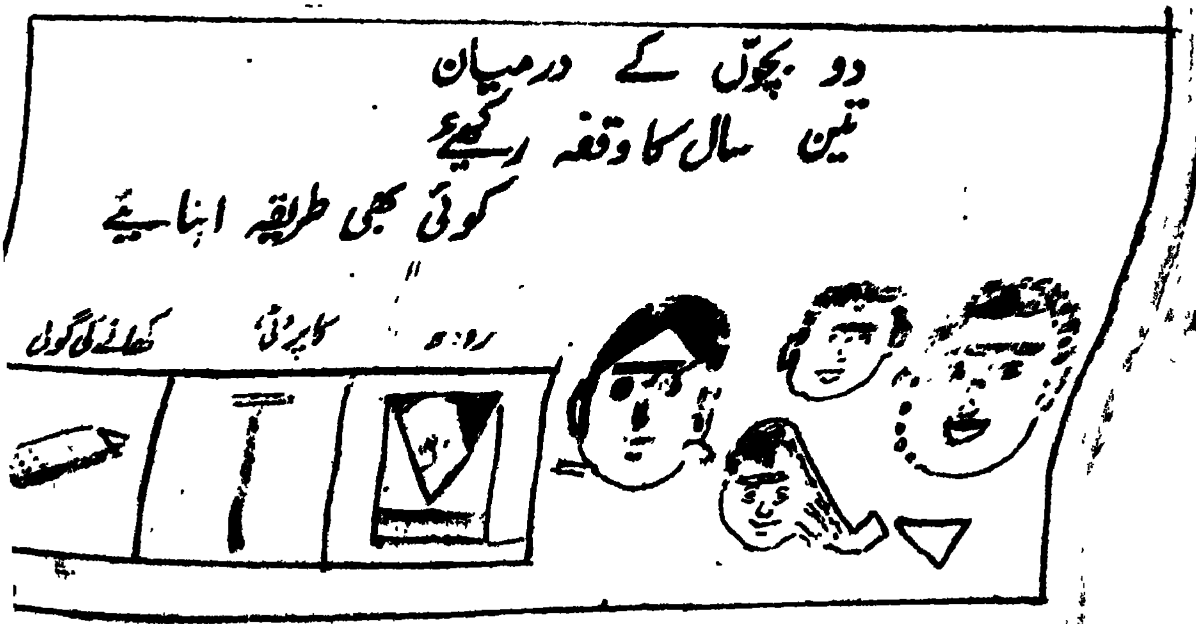

جشنِ جمہوریت کے مبارک موقع پر

ہر ہندوستانی کے لئے دل کی

گہرائیوں سے

نیک خواہشات

ہوٹل راج دوت

نئی دہلی

J.N.L. New Delhi

مشاعرہ نمائش مظفر نگر

(بی ۔ ایل احسانی حسن پور لوہاری)

مظفر نگر کی نمائش میں ہر سال ایک مشاعرہ بھی ہوتا ہے
اس مشاعرہ کا انتظار بڑی شدت سے کیا جاتا ہے۔ اس امر کا
اعتراف شعرائے کرام بھی کرتے ہیں۔ ہم پورے سال مشاعرے
پڑھتے ہیں لیکن یہ مشاعرہ سب سے نرالا اور اچھوتا ہوتا ہے
یہاں کے سامعین پوری رات فرش پر بیٹھ کر مشاعرہ سنتے ہیں
مشاعرہ کمیٹی کے ممبران بھی بڑی دلچسپی اور سرگرمی سے حصہ لیتے
ہیں۔ وہ اچھے سے اچھے شعراء کو یہاں بلانے کی کوشش کرتے
ہیں۔ ان کی طرف سے کسی قسم کی کوئی کمی نہیں رہتی اب رہی
مشاعرہ کی کامیابی یہ عوام کے مذاق پر منحصر ہے۔ یہاں کے ذمہ دار
حکام سے لے کر سامعین تک سبھی سخن فہم اور ادب نواز ہیں۔

اب میں آپ کو نمائش کے اس پنڈال میں لئے چلتا ہوں
جہاں کوئی ہلچل اور ہر سال یہ مشاعرہ و دیگر تقریبات ہوتی ہیں

پنڈال کے دروازہ پر بے پناہ ہجوم ہے آپ دروازہ سے اندر جانا
کارِ دارد والا معاملہ نظر آتا ہے تو آپ چھوڑیئے آیئے! اس گیٹ سے
چلئے تو آپ کو اسٹیج تک لے جائے گا۔ گو یہاں بھی پاس کی ضرورت
ہے لیکن شعراء کے ہمراہ نکل چلئے۔!

اب اسٹیج سے صرف ایک نظر سامنے ڈالئے پنڈال میں
سروں کا ایک ٹھاٹھیں مارتا سمندر ہے کہیں بھی تل دھرنے کو جگہ
نہیں ہے ادھر گیٹ پر وہی شور و غل ہے اگر یہ مزید حضرات اندر
آتے ہیں تو کہاں اور کیسے سمائیں گے۔ یہ سوال پریشان کن ہے

دس بج کر ۴۵ منٹ ہو چکے ہیں جو حضرات
مشاعرہ کو سننے کے لئے گھنٹوں پہلے سے جمے بیٹھے ہیں وہ اب
تالیوں پر اتر آئے ہیں اس کا مطلب صاف ظاہر ہے کہ بس
اب حد ہو چکی مشاعرہ شروع کرایا جائے لیجئے انتظار کی گھڑیاں
ختم اور صدارت کے لئے ضلع کے ہر دل عزیز اور مشہور رہبر
جناب سید مرتضیٰ صاحب کا اسم گرامی پیش کیا جا رہا ہے۔

اور ساتھ ہی ڈی۔ ایم صاحب مظفر نگر سے بھی اسٹیج پر ہی
تشریف لانے کی درخواست کی جا رہی ہے۔ ڈی۔ ایم صاحب
آ رہے ہیں اور تالیوں سے صدر صاحب اور ڈی۔ ایم صاحب کا
خیر مقدم ہو رہا ہے ادھر وسیم بریلوی نے مائیک سنبھال کر مظفر نگر
کے ایک ترنم شاعر راغب عالم کو یاد کیا ہے عالم آگئے ہیں لیکن گیٹ
پر ایک شور و غل ہے ہر کوئی اندر آنے کے لئے زور آزمائی کر رہا ہے
پولیس نے یہ ہنگامہ فرو کرا دیا ہے اور عالم صاحب یوں نغمگی کا مظاہرہ
کر رہے ہیں۔

وہ خدا کو بھی شرمندۂ احسان کیا ہے
اک محبت نے ہمیں آج مسلمان کیا ہے

لیجئے دو دو شعر سنا رہے ہیں اور عالم صاحب لہک
رہیں ہیں

معصوم سے چہرے پہ یہ مخمور سی آنکھیں
کیا کیا نہ مرے قتل کا سامان کیا ہے

چہرواروں کا اک دھماکہ ہوا ہے اور آپ کو سنا بھی جا رہا
کیوں مائیک سے کھسک آئے ہیں۔ پھر وسیم صاحب
دوسرے مشہور شاعر سلیم کھتولوی کو دعوتِ غزل دے رہے
اس اعلان پر سٹپٹا کر رہ گئے ہیں اور آتے ہی ایک مجبور
غزل بے دلی سے شروع کی ہے

ہزار پردوں میں حسنِ فطرت چھپا ہے لیکن چھپا نہیں
نگاہ سے ماورا ہی وہ شعور سے ماورا نہیں ہے
ہماری آہ و فغاں کو شاعر سمجھ رہے ہیں غزل ترانہ ما
ہم اپنی قسمت کو رو رہے ہیں کسی سے شکوہ گلا نہیں

سلیم صاحب کا موڈ خراب ہے لہٰذا وہ مائیک سے
ساتھ جدا ہو رہے ہیں اور اب اپنی جمود کو توڑنے
کے نوعمر شاعر عبدالحق سحر آ رہے ہیں غزل سنا

بھیگے میں زندگی کے گزارے گئے ہیں ہم
کتنے حسیں فریب سے مارے گئے ہیں ہم
ہر حادثہ چمن کا ہمیں پر ہوا تمام
شامت کسی کی آئی تو مارے گئے ہیں ہم
پہلے تو غم دئے ہمیں پھر دیں تسلیاں
یعنی ڈبو ڈبو کے ابھارے گئے ہیں ہم

صاحب سرکاری کرکے داد لوٹتے اپنی جگہ آ رہے ہیں دیکھا یک تو عمر ملوفت کو چھوتی ہوئی پیکر غزل حنا تیموری آکر ں اپنے فن موسیقی کا مظاہرہ کر رہی ہیں ۔

ہے میرا عشق بھی بہتے ہوئے دریا کی طرح
چند لمحوں میں سمندر سے ملا جاتا ہے
میرے ہونٹوں پہ مچلتے ہوئے لفظوں کی قسم
بات کرتی ہوں تو افسانہ ہوا جاتا ہے

داد دینے والے زیادہ اچھل کود کر رہے ہیں حالانکہ مجھ میں کچھ نہیں ہے اگر اختر آرائی رہی میرے قریب بیٹھے ہوئے نہ ہوتے تو یں ایک مصرع بھی نہ لکھ پاتا (حنا صاحبہ کی) بانک پن سے کو لوٹنے کی ٹھان رہی ہیں ۔

ان اندھیروں کو اجالوں کی ضرورت ہی نہیں
یہ دیا کون یہاں روز جلا جاتا ہے

ے تالیوں پر اتر آئے ہیں اور اسی عالم میں آپ ے مائیک سے جدا ہو رہی ہیں اور دیو بند کے نواز اکبر غزل سرا ہیں ۔

مری حسرتیں ، لوگ بے پناہ ہو گئے
راہ میں ، قافلے تباہ ہو گئے
سفید ہو گیا ، سب کے دل سیاہ ہو گئے

داد و تحسین وصول کئے پلٹ رہے ہیں ادھر لاوہ کو شباب پر لے جانے کے لئے

یہ قفس تو میں خوش ہوں لیکن
ہے کہ چمن میں بہار ہے کہ نہیں
ہنگامہ کا گماں ہو رہا ہے کئی بار [illegible]

ہوا ہے ۔

یہ قتل و خون ۔ یہ غارت گری ۔ یہ ظلم و ستم
میں سوچتا ہوں کہ پروردگار ہے کہ نہیں

پھر داد کا عالم نہ پوچھئے اور آپ ابھی رخ در رخ سے محفل کو چونکا رہے ہیں ۔

جب لگ دیتے ہیں غم دوست تھما جاتا ہے
تب کہیں جاکے دعاؤں میں اثر ہوتا ہے
تم نہیں وہ بھی نہیں وہ بھی نہیں وہ بھی نہیں
کون ہے جو غریبوں پہ ستم ڈھاتا ہے

اب داد دینے والے بھی بے حال سے ہو چلے ہیں اور آنجناب محفل نے محفل کو گرما رہے ہیں ۔

دھوپ ہی ٹھیک ہے ان چھاؤں سے جو گم کر دے
کم سے کم دھوپ میں سایہ تو نظر آتا ہے

لیجئے اب تالیاں بھی جاگ اٹھی ہیں ایک اور ایک اور کے شور میں غزل سرا ہیں ۔

خود اپنے آپ سے چھپنے کی آرزو کی ہے
تمہاری یاد سے جب جب بھی گفتگو کی ہے
کلی کلی ہے پریشاں پھول پھول اداس
یہ کس دلیل نے توہین رنگ و بو کی ہے
فقیہہ شہر سے کچھ کم نہیں ہیں ہم اختر
کہ ہم نے بادہ پرستی بھی باوضو کی ہے

پھر داد نے ہنگامہ کا روپ دھار لیا ہے اور تالیوں کے بے ہنگم شور میں کمال پاشا رہے ہیں اصحاب قمر اندوری الاپ رہے ہیں ۔

بے زباں نور کی نور کی بات ہے
نور کا ذکر ہے طور کی بات ہے
میرے آنگن میں جگنو بھی آتے نہیں
چاندنی رات تو دور کی بات ہے
کم سے کم ایک دیا ہی جلا دیجئے
بات کیجئے قمر کی بات ہے

قمر صاحب ابھی [illegible]
یہاں سن لیا جاتا ہے یہ اتنے [illegible]

ہوا ایسا ذکر شک اور زور آزمائی کرکے چلتے بنے وہ دیکھتے غزالاں
زاں ہم غزل اپنا نکہت ہری سدری سفید بارڈر والی بستی
نہ مایک پہ آکر پچے ترنم بشی سمجھ میں نہ آنے والے ترنم سے غزل
پیش کر رہی ہیں ـــ

پہلے دیدار کا مشتاق بنا دیتے ہیں
پھر نگاہوں کو ترسنا بھی سکھا دیتے ہیں
دل کے زخموں پہ چھڑکتے ہیں نمک لفظوں کا
پاس رہ کر بھی جدائی کی سزا دیتے ہیں
شام ڈھلتے ہی جلا دیتے ہیں دل کی شمعیں
پھر اسی شمع کو اشکوں سے بجھا دیتے ہیں

حسن اور یہی حسرت کا اداوہ وہ ساس ہی کیوں نہ ہو اس پر جوش
گوش اور حسین غزل پھر نکہت صاحبہ کو ہر شعر پر داد کیسے نہ دی جاتی
ایسے چھوڑ دیتے کہ ہر شعر کے سمجھنے میں پوری قوت سماع برباد کرنا پڑی
تب جا کے کوئی شعر سمجھ میں آیا ہوگا بس ترنم کو کس نام سے پکارا
جائے گا۔ آئیے پھر ایک شگفتہ غزل حق کانپوری سے سننے گا ـــ

کہوں میں سے مقصد پہ آپ ہاتھ ملتے ہیں
کچھ چراغ ایسے ہیں بجھتے ہیں نہ جلتے ہیں
اشک میری آنکھوں میں بے سبب مچلتے ہیں
یہ عجیب مسافر ہیں رکتے ہیں نہ چلتے ہیں
جانے کیسے بے پردہ گھر سے وہ نکلتے ہیں
ہاتھ ملنے والے تو اب بھی ہاتھ ملتے ہیں

پنڈال بھی انگڑائیاں سی لے رہا ہے اور حق صاحب خوب شگفتگی ادا
کر رہے ہیں ـــ

اب تو دل کے گوشوں سے یوں دھواں سا اٹھتا ہے
جیسے بند کمرے میں خط کسی کے جلتے ہیں

پھر تو ان تالیوں پر اتر آئے ہیں اور حق صاحب محفل کو
گرما کر تالیوں کی گڑگڑاہٹ میں جا رہے ہیں۔ اب اس رنگ
کو بدلنے کے لئے ناظم انصاری ناگپوری اگر یوں بحث میں
اضافہ کر رہے ہیں ـــ

میں سمجھوں تب ترے باپ کو پٹا لوں گا
میرے دماغ میں ایسا پلان باقی ہے

تمہیں تو یاد نہ ہوگا کہ مارا تھا پتھر
ہمارے ماتھے پہ اب تک نشان باقی ہے
ابھی سے کیا جھگڑاتے ہو کیس بنے ناظم
ابھی تو آپ کا آدھا مکان باقی ہے

پنڈال میں ایک مکمل قہقہہ اور ہڑبازی ہے لیجئے اب ترنم سے
واغ رہے ہیں ـــ

مقام عشق ہے میں اب غلط گرا تو نہیں
بسمیاں کی طرح سب کو گھورتا تو نہیں
نظر جھکائے جو بیٹھا ہے مہ جبینوں میں
کہیں وہ مولوی صاحب کا چھوکرا تو نہیں
تمہارے گھر کے سبھی لوگ مجھ پہ مرتے ہیں
مجھے تغیر جانے کی سوچنا تو نہیں

پنڈال میں پھر ایک ہنگامہ سا ہنگامہ اور شور و غل ہے اور
آپ فرما رہے ہیں ـــ

ابھی سے چوڑیاں توڑو نہ مٹنے کی اماں
میں کر رہا ہوں تجمل پھر سل ابھی مرا تو نہیں

پیچھے سے پھر تالیاں جاگ اٹھی ہیں ایک اور ایک اور کے شور
ناظم صاحب فاتح محفل بنے شاداں ہٹ رہے ہیں دیکھا تو
مظفر رزمی یوں بانکپن سے غزل سرا ہیں ـــ

ہر ایک شخص تری چاہ کے گمان میں تھا
نہ جانے کون سا جادو تری زبان میں تھا
سوال تم سے ہے اے بادلو جواب تو دو
کہاں گیا وہ پرندہ جو آسمان میں تھا
بلند و پست ہماری نظر میں کچھ بھی نہیں
زمین پہ بھی وہی ہے جو آسمان میں تھا

رزمی صاحب بھی داد و تحسین لے کر اپنی جگہ آ رہے ہیں
افتخار امام آکر عطا کر رہے ہیں ـــ

پہلے تمام شہر پناہوں کے ساتھ تھیں
بجھتے بھی تو کہ زندگی سپاہیوں کے ساتھ تھیں

دوسرے مصرعے پہ داد کا عالم نہ پوچھئے کئی بار دہرا
ہوا ہے ـــ

منزل کی دھوپ بن کے سمٹنے لگے ہو تم
ہم گردِ راہ ہو کے بھی راہوں کے ساتھ ہیں
نیکی ہمیں قبول مگر ہو لتیں نہیں
وہ ساری لذتیں جو گناہوں کے ساتھ ہیں
واقف ہیں اپنے قتل کے ہر فیصلہ سے ہم
قاتل ہمارے خود ہی گواہوں کے ساتھ ہیں

اب داد پر ہنگامہ کا گماں ہو رہا ہے افتخار امام صاحب یہاں کے لئے نئے شاعر ہیں اس لئے سامعین ان کے مزاج کو سمجھ نہ پائے کچھ انہوں نے بھی غلطی کی کہ کبھی تحت سے پڑھتے ہیں کبھی ترنم سے۔ اس طرح یار لوگ بھی مذاق کے موڈ میں ہیں، امام صاحب کو وہ داد نہ دی گئی جو ان کو ہر مشاعرہ میں ملتا رہا ہے۔ لیجئے اب اس مشاعرہ کے بیرو راحت اندوری سے یہ لاجواب اشعار سنیئے ؎

سانحہ تو کسی دن گذرنے والا تھا
میں بچ بھی جاتا تو اک روز مرنے والا تھا
مرا نصیب مرے ہاتھ کٹ گئے ورنہ
میں تیری مانگ میں سیندور بھرنے والا تھا

اب شور غل کم ہوا تو گرج رہے ہیں ؎

روایتوں کی صفیں توڑ کر بڑھو ورنہ
جو ہم سے آگے ہیں وہ راستہ نہیں دیں گے
شراب پی کے بڑے تجربے ہوئے ہیں ہمیں
شریف لوگوں کو ہم مشورہ نہیں دیں گے

صاحب محفل کو گرما کر اور رنگ جما کر مائیک سے جدا ہوئے اور ہلال سیوہاروی فرما رہے ہیں ؎

[illegible] سمجھا ہی نہیں اس خوبصورت طنز کو
[illegible] کو تو بیشتر شعرا کا بیاں اچھا لگا
ان سے جب پوچھا گیا کیسا لگا ہندوستاں ؟
کہا۔ دور سے ہندوستاں اچھا لگا

اب ہلال صاحب ایک مولانا سے مخاطب ہیں ارشاد ہے ؎

بیروت کی خبروں نے تری جس کو جگایا
اللہ رکھے جذبۂ اسلام چلا جا
لیکن یہ مناظر تو وطن میں بھی بہت ہیں
بیروت بہت دور ہے آسام چلا جا

اسی غل غپاڑہ میں ہلال صاحب چلتے بنے آج فرمائشوں کو بھی نظر انداز کر گئے آئیے اب وسیم بریلوی سے بھی ایک غزل سن لیجئے ؎

بے حسی کا موسم سارا منظر پیاسا پیاسا تھا
میں نے ہی آواز تجھے دی تو، تو اک سناٹا تھا
ہم دونوں اک پیاس کے مارے خالی خالی بیٹھے تھے
اور ہماری رگ رگ میں اک پاگل دریا بہتا تھا
وہ تو کچے بیروں کی اک ٹھکری لے کے نکلی تھی
اس کو کیا معلوم کہ بازار میں کیا کیا بکنا تھا

وسیم صاحب ایک گیت اور سنا کر مائیک سے جدا ہو رہے ہیں اور نسیم رضوی نے اپنی طرح سُر لئے اور عجیب ترنم سے غزل چھیڑی ہے کہ جس پر کچھ تالیاں بجنے لگی ہیں ؎

وہ دور بھی تھا اپنا جب شوق ہمیں بھی تھا
غالب کی کتابوں پر لڑکی کا پتا لکھنا
غالب کے خطوں جیسی تہذیب نہیں باقی
آداب بڑوں کو چھوٹوں کو دعا لکھنا

پھر آپ نے ایک گیت شروع کیا ہے یا۔ لوگوں اور منچلوں نے پسند نہیں کیا آپ چپ چاپ مائیک سے کھسک آتے ہیں اور اتنی سی بات کے لئے یہ مشاعرہ کمیٹی کی تاریخ بھی بھاری ہوگی گویا یہ قلم ضائع اور برباد کر دی گئی آئیے اب عالم فتح پوری سے بھی سن لیجئے گا ؎

جو راستہ تمہیں رہبر بتا رہا ہے میاں
یہی تو ہے کہ جو مقتل کو جا رہا ہے میاں
یہ ڈوبتی ہوئی سی پتوار بس سے کیا ہوگا
بہت ہی زور پہ طوفان آ رہا ہے میاں
ابھی سے دیکھنا اک روز خون برسے گا
یہ گہرا گہرا سا بادل جو چھا رہا ہے میاں

جب عالم ایسے مشہور شاعر اپنی روایتی شاعری چھوڑ کر اس قسم کے کلام سنانے لگیں گے تو تمام توقعات اور اُمیدیں ڈھیر ہو کر رہ جاتی ہیں جب شعراء کی بے دلی کا یہ حال ہو تو پھر مشاعرہ کیسے اُٹھے گا۔ ابھی بے دلی سے یار لوگ بھی سُن کر داد دے رہے ہیں یا آ رہے ہیں آپ نے دو چار اور شعر بھی سُناتے ہیں گویا بادل ناخواستہ کوئی قرض چکایا ہو مشیر صاحب عطا کرتے ہیں ۔

ممکن ہے کل زبان و قلم پر ہوں بندشیں
آنکھوں کو گفتگو کا سلیقہ سکھائیے

مانگا ہوا لباس پہننے سے پیشتر
اپنا مزاج اُس کے مطابق بنائیے

داد کا شور کم ہوا تو ارشاد ہوا ہے ۔

زخم در پردہ ہمارے جسم پر آئے بہت
زندگی میں پھول کم کم سنگ برسائے بہت
اب مرے گھر سے کوئی دیوار ملتی ہی نہیں
تھے کبھی بستی میں کل تک میرے ہمسائے بہت

مشیر صاحب بھی داد و تحسین وصول کر کے مائیک سے جدا ہو رہے ہیں اور اب ہنگامہ پرور شاعر، دنیا میں کیف بھوپالی آ گئے ہیں زبانوں کا ایک طور سا شور ہے کچھ سنائی نہیں دے رہا ہے پہلے کیف شعر کہنے لگے اور پاؤں اُٹھنے لگے ہیں پہلی غزل الاپ رہے ہیں ۔

حکم موسم کا نہ ٹالا جائے گا
آج روزہ توڑ ڈالا جائے گا

ایسے ہی کہتے ہیں مادر گھٹا چھونے لگی گویا موسم کا تقاضا یہ ہے کہ آج پی جائے لیکن روزہ سے اُس کا کیا تعلق ۔؟ سنا ہے کیف صاحب قرآن پاک کا منظوم ترجمہ بھی فرما رہے ہیں اور اُسی قرآن پاک کا یہ مذاق ـــــ؟ آپ اُسی طرح جھوم رہے ہیں ۔

روزِ محشر جب بھی رندِ باخدا
ہاتھ میں لے کر پیالا جائے گا

یار لوگ سنی سنائی غزل کو سُن کم رہے ہیں اور تفریح کے موڈ میں زیادہ تالیاں بجا کر زور آزمائی کر رہے ہیں ۔

جب جبیں مسجد جانا پڑا
راہ میں ایک میخانہ پڑا
حرج نہ ہو تو دیکھتے چلئے
راہ میں ایک دیوانہ پڑا

کیف صاحب کے ساتھ ہی پہلا دور پونے ۲ بجے ختم ہو رہا ہے دوسرے دور کے لئے یار لوگ حسبِ دستور بیٹھے ہیں اس دور میں کتنی شعراء کو خوب خوب سنا گیا اور چار بجے تک یہ دور چلا۔

دو سال سے اس مشاعرہ کو شہر کے کسی ادارہ یا کالج پارٹی کے سپرد کر دیا جاتا ہے اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ غیر ادبی اور غیر شاعرانہ ماحول کے ہاتھوں میں یہ مشاعرہ چلا جاتا ہے لہٰذا اس کا حشر معلوم۔ یہ مشاعرہ صرف کاروباری ہو کر رہ جاتا ہے دیہ شعراء کو خوب بھاری رقم دی جاتی ہے آنے والے شعراء کچھ حاضری دے تو دیتے ہیں لیکن جیسا کہ یہاں کی روایت رہی ہے وہ حق ادا نہیں کر رہے جو اُن پر فرض عائد ہوتا ہے مثلاً :-

کچھ لوگ کہتے ہیں مشاعرہ جما نہیں
کچھ یہ نعرہ بلند کرتے ہیں کہ مشاعرہ کامیاب نہیں ہوا

چند لوگوں کی یہ رائے ہے کہ شعراء نے تازہ کلام نہیں سنایا غرض جتنے منہ اُتنی باتیں اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے جب مشاعرہ کامیاب نہیں ہوا تو چار بجے تک کیسے جاری رہا۔ اور اس کو اتنی دیر تک کس نے سنا ــ؟ اب دیکھئے میں نے تمام مشاعرہ کیسے نوٹ کر لیا۔ ظاہر ہے مشاعرہ حسبِ روایت سنا گیا اور سامعین بھی جمے رہے صرف شعراء نے بے دلی کا ثبوت دیا ورنہ مشاعرہ کمیٹی نے تو مشہور اور مقبول شعراء کو مدعو کیا ہے جو ہر سال یہاں آ رہے ہیں اور مشاعرہ کو چار چاند بھی لگاتے رہتے ہیں سامعین کا ہجوم بھی ہر سال کی طرح وہی تھا پھر یہ آوازیں کیوں ــ؟ یہ اُن شعراء سے پوچھا جائے جو حق ادا نہیں کرتے اور اپنی ذمہ داری کو محسوس نہیں کرتے کمیٹی تو واقعی مستحق ہے کہ اُس نے ایک اچھے اور معیاری انتظام کیا اور عوام کے سامنے پیش کر دیا اب مجھے بھی اجازت

خدا حافظ   پھر ملوں گا [illegible]

"میرے وطن سے اچھی کوئی زمیں نہیں ہے"

محمد نقی خاں اثر اندوری
باوڑی والی مسجد،
جھابوہ ایم۔ پی

میرے وطن سے اچھی کوئی زمیں نہیں ہے
سارے جہاں میں ایسی دھرتی کہیں نہیں ہے

بادِ نسیم اس کے آنگن میں گھومتی ہے
بوئے شمیم اس کے دامن کو چومتی ہے
ہر ہر روش پہ اس کے سبزے لہک رہے ہیں
غنچے چٹک رہے ہیں اور گل مہک رہے ہیں
سرتاپا میکدا ہے ہر ایک اس کا منظر
جامِ جہاں نما ہے ہر ایک اس کا منظر
میرے وطن سے اچھی کوئی زمیں نہیں ہے

باغوں کو اس کے گنگا شاداب کر رہی ہے
کھیتوں کو اس کے جمنا سیراب کر رہی ہے
عزم و عمل کے ہر سو چشمے ابل رہے ہیں
صنعت گری کے شعبے سونا اگل رہے ہیں
رشکِ جناں ہیں اس کی گل آفریں بہاریں
حسنِ ازل ہیں اس کی سرکردہ یادگاریں
میرے وطن سے اچھی کوئی زمیں نہیں ہے

مرغانِ خوشنوا کا رس گھولتا ترانا
بلبل کا چہچہانا بھونروں کا گنگنانا
پیغام دے رہا ہے خوشحال زندگی کا
انسان سے محبت کا اور دوستی کا
یہ سرزمیں کہ جس پہ ہم لوگ بس رہے ہیں
ہر سمت نور پرور جلوے برس رہے ہیں
میرے وطن سے اچھی کوئی زمیں نہیں ہے

مل جل کے کام کرنا دستور ہے ہمارا
آپس میں پیار کرنا منشور ہے ہمارا

ہے تین رنگ والا پرچم ہماری عظمت
بھارت میں بسنے والی ہر قوم کی ضمانت
ہم جس کے زیرِ سایہ آرام پا رہے ہیں
اور اپنی ایکتا کا انعام پا رہے ہیں
میرے وطن سے اچھی کوئی زمیں نہیں ہے

چشتی کی سرزمیں ہے نانک کا یہ چمن ہے
گوتم کا دیش ہے یہ گاندھی کا یہ وطن ہے
اک دُرِ بے بہا ہے کشمیر اس زمیں پر
جنت کی خوشنما ہے تصویر اس زمیں پر
تاج و قطب اجنتا ہیں شان اس زمیں کی
گنگ و جمن سے دریا ہیں جان اس زمیں کی
میرے وطن سے اچھی کوئی زمیں نہیں ہے

اس خاک سے بنے ہیں پرتاپ اور ٹیپو
آزاد و شاستری اور گاندھی پٹیل نہرو
امیر و نظیر و حالی پیدا یہیں ہوئے ہیں
ٹیگور اور تلسی پیدا یہیں ہوئے ہیں
دنیا سے کچھ عجب ہے میرے وطن کی مٹی
لاکھوں میں منتخب ہے میرے وطن کی مٹی
میرے وطن سے اچھی کوئی زمیں نہیں ہے

اے دوستو ہم اس کی آغوش میں پلے ہیں
ہم کیا ہیں سورما ہیں غازی ہیں من چلے ہیں
رکشا کریں گے مل کے ہم مادرِ وطن کی
اپنے لہو سے سینچیں گے ہم زمیں چمن کی
دشمن اٹھائے گا سر تو سر کو توڑ دیں گے
اور آنکھ اگر دکھائی تو آنکھ پھوڑ دیں گے
میرے وطن سے اچھی کوئی زمیں نہیں ہے

بقیہ صفحہ کا: قومی یک جہتی کے نقطۂ نظر سے ایسے پُر مغز مضامین لکھنے کی ضرورت ہے، اشد ضرورت ہے جیسا کہ اعلیٰ حضرت جناب برق صاحب گورنر ہریانہ نے اپنے ایک انگریزی لیکچر میں فاضلانہ و عالمانہ طور پہ شعرِ اقبال پر روشنی ڈالی اور جس کا اردو ترجمہ ہریانہ ساہتیہ اکادمی نے شائع کیا ہے۔ اردو زبان قومی یکجہتی کا سمبل رہی ہے۔ اور اس کے اسی رول کو فروغ دینے کی ضرورت ہے

کالیداس گپتا رضاؔ کی

تا حال مطبوعہ تصانیف

- "شعلۂ خاموش" — مجموعۂ کلام قیمت ۵۰ روپے
- "شورشِ پنہاں" — مجموعۂ کلام قیمت ۲۰ روپے
- "شاخِ گل" — مجموعۂ کلام قیمت ۱۵ روپے
- "اُجالے" — نعت اور سلام قیمت ۱۰ روپے
- "شعورِ غم" — سلام وغیرہ قیمت ۳ روپے
- "شاخِ جاوید" — مجموعۂ کلام رباعیات قیمت ۲۰ روپے
- "دی سائیلنٹ فلیم" — THE SILENT FLAME ENGLISH Rs. 10/-

- "ہندوستان مشرقی افریقہ میں" (تاریخ) قیمت ۱۹ روپے ۵۰ روپے
- "مکتوباتِ جوشؔ ملسیانی" بنام رضاؔ (مخطوط) قیمت ۱۹ روپے ۵۰ پیسے
- "منثوراتِ جوشؔ ملسیانی" قیمت ۲۰ روپے
- "متعلقاتِ غالب" قیمت ۲۰ روپے
- "دعائے صباح" — غالب کی ایک مثنوی قیمت ۱۵ روپے
- "غالبیات چند عنوانات" قیمت ۵۰ روپے

- "انتخابِ آتش و غالب" — چکبست قیمت ۴۰ روپے
- "چکبست اور باقیاتِ چکبست" قیمت ۴۰ روپے
- "کلیاتِ چکبست" (نظم) قیمت ۶۰ روپے
- "سبو و سراغ" — مجموعۂ مضامین قیمت ۲۵ روپے
- "مقالاتِ چکبست" قیمت ۷۵ روپے
- غیر مطبوعہ تصانیف کا اعلان طبع ہونے پر کیا جائے گا

وِمل پبلیکیشنز
۲۰۵ چرچ گیٹ چیمبرز نیو میرین لائنز
چرچ گیٹ بمبئی ۴۰۰۰۲۰

غالی اقبالیوں سے گزارش

ڈاکٹر تارا چرن رستوگی

جب کبھی اقبال پر تحقیقی مضامین شائع ہوتے ہیں تو غالی اقبالیوں کے جذبات بھڑک اٹھتے ہیں۔ لہذا آن ہی سے یہ اخطاب ہے۔

میرے نزدیک اُردو محض زبان و ادب ہی نہیں ہے۔ کلچر بھی ہے اور میں حالانکہ پیشہ ور اُردو سے صرف میرے دوستانہ مراسم ہی رہے ہیں اُردو کو اپنا دین و ایمان بھی سمجھتا آتا ہوں مگر میرا یہ ایمان کمزور نہ ہونے کے باوجود کبھی کبھی متزلزل ضرور ہونے لگتا ہے بالخصوص اس وقت یا ایسے حالات درپیش ہو جانے ہر جب تنقید، تحقیق، ادبیات بلکہ علم و دانش جو متعدد تنظیموں پر محیط ہوتا ہے سے متعلق امور پر بحث و تمحیص سے لوگ کنّا کترا پر اُتر آتے ہیں۔ ضرورت افہام و تفہیم کی ہوتی ہے۔ جلّم نمائی و ہٹک زنی سے رعب جمانے کی کوشش کرنا، تعظامراتب سے روگردانی کرتے ہوئے تو تو میں میں پر اتر آنے سے ہم اپنی کم ظرفی ہی مظاہرہ کرتے ہیں۔ عمر انگریزی درس و تدریس، انگریزی ادبیات، نیز تقابلی ادبیات پر ریسرچ سکالرز کی نگرانی، علمی استعداد جب چار مضامین میں ایم۔ اے اور انگریزی میں ڈاکٹر دیکھو میں منظر کا مجھ جیسا خاکسار ابھی گفت و دیوانہ باور کرو یہ تو نہیں ہو سکتا۔ اقبال، اقبالیات پر اعلیٰ سطح کا کام علی سردار جعفری، جگن ناتھ آزاد، قمر رئیس، بشیر احمد ڈار، کلیم الدین احمد اور راقم الحروف ہی نے کیا ہے۔ خون لگا کر شہیدوں میں شامل ہونے والوں کی کب کمی رہی ہے۔

ریسرچ کے معیار پر پورے اُترنے والے درج ذیل تین مضامین کے شائع ہوتے ہی سورج سوا نیزے پر اتر آیا "مجاہدین" "رجال الاقبال" یعنی غالی اقبالیے میدان میں اتر آئے۔

۱۔ علامہ اقبال کا وصیت نامہ از محمد عظیم فیروز آبادی ہماری زبان یکم اکتوبر ۱۹۸۴ء

۲۔ اقبال کے والد شیخ نتھو (حصہ اول) از محمد عظیم فیروز آبادی، ہماری زبان ۲۲ اکتوبر ۱۹۸۴ء

۳۔ اقبال کے والد شیخ نتھو (حصہ دوم) از محمد عظیم فیروز آبادی ہماری زبان ۱۵ نومبر ۱۹۸۴ء

تینوں مضامین اعلیٰ معیار کے ہیں۔ اتفاق و اختلاف، افہام و تفہیم کے دروازے کبھی بند نہیں رہتے۔ ان سے متعلق ڈاکٹر عبدالمغنی صاحب ہماری زبان (۵ دسمبر ۸۴ء) میں یوں رقمطراز ہوتے ہیں۔

"محمد عظیم فیروز آبادی کا مضمون شائع ہوا ہے۔ ایک غیر معمولی اور شوقیانہ مضمون کے مصنف نے صرف چند سطروں کی تحریر کو افسانہ بنانے کی کوشش کی ہے جس کا مقصد کوئی تحقیق نہیں، ایک محترم شخصیت پر کیچڑ اچھالنا ہے یہ محض ایک نمود پسندی ہے تاکہ ایک شوشہ چھوڑ کر لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کی جائے۔ یہ وہی حرکت ہے جو کچھ عرصہ پیشتر تارا چرن رستوگی صاحب کرتے رہے تھے لہذا اس میں کوئی نیا پن نہیں ہے۔۔۔۔۔۔۔"

کیوں صاحب کیا لفظ "حرکت" سوقیانہ نہیں ہے؟ مغنی صاحب کا مضمون اُن کی علمیت کا آئینہ دار ہے۔ کلیم الدین احمد کے بارے میں جو کچھ اُنہوں نے اپنی ایک کتاب میں لکھا ہے وہ استدلال پر مبنی نہ ہو کر جذباتی ہر کتو دکا کر یہ منظر نامہ پیش کرتا ہے۔ وہ یہ بھی نہیں بتا سکے ہیں کہ "عالمی ادب" کس کو کہتے ہیں۔ دراصل عالمی ادب ایک گمراہ کن ادبی اصطلاح ہے جس پر میں نے دو مضامین موقر جریدہ کو دیئے ہیں۔

غالباً مغنی صاحب کے "محراب و منبر" کرنے سے خوف زدہ ہو کر ہماری زبان کی ادارت نے ۲۲ دسمبر ۸۴ء کے شمارے میں "اقبال کے بارے میں معذرت" کے تحت لکھا ہے

"ہماری زبان کے شمارے مورخہ یکم اکتوبر ۱۹۸۴ء میں عظیم فیروز آبادی صاحب کا مقالہ "اقبال کا وصیت نامہ" شائع ہوا تھا۔ اس میں جو غیر شائستہ زبان استعمال کی گئی ہے اس کے لئے ہم قارئین سے معذرت خواہ ہیں......"

یعنی مفتی صاحب کو سارٹیفکیٹ دے دیا گیا یا ان کی بات کی تصدیق کر دی گئی۔ یہ عجیب و غریب ادبی صحافت ہے کہ غیر شائستہ زبان والے مضامین کو شائع کر دے اور بعد کو غیر شائستگی کی نشان دہی کیے بغیر معافی مانگنے پر اتر آئے۔ معذرت کی چنداں ضرورت نہ تھی کیونکہ عظیم صاحب ہر اعتبار سے معیاری گفتار و کردار کے شخص ہیں۔

ہماری زبان کے شمارے مورخہ ۲۲ دسمبر ۱۹۸۴ء میں محمد عظیم صاحب کے مضامین سے متعلق دو مراسلے شائع ہوئے ہیں۔ پہلا مراسلہ بیگم صالحہ عابد حسین صاحبہ کا ہے "بہت اچھا مراسلہ ہے کاش وہ یہ مشورہ بھی دے دیتیں کہ لوگ اقبال کو برہمن زاد (؟) وغیرہ بتانا بند کر دیں، چونکہ غلط بیانی ہی سے اس کا ازالہ کرنے کی ضرورت پیدا ہو جاتی ہے۔

دوسرا مراسلہ جناب ڈاکٹر احسن اختر صاحب کا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ عظیم صاحب "سچے محقق ہیں اور علامہ کے بارے میں تحقیق کر رہے ہیں۔" اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے دو شہروں کی فہرست وغیرہ سے کوائف پیش کرتے ہوئے بالواسطہ اقبال کی ذات کو "شیخ سپرو" بتایا ہے۔ یہ تیخ سپرد لیفلا ہے مگر اس سلسلے میں مزید کچھ کہنے کے پہلے قدرے پس منظر کی جانب رجوع کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ معذرت کے ساتھ تفصیلات کا خاکہ پیش کرتا ہوں۔

نہ جانے کیوں کچھ اردو حلقوں میں بالخصوص ان نا سمجھ اشخاص پر مشتمل حلقوں میں جو اقبال کے صاف شفاف چہرے پر داغ لگا دینا چاہتے ہیں اور جو یہ نہیں جانتے کہ ریسرچ کے معنی و مفہوم رقبہ حدود اربعہ کیا ہیں، تین چار اشخاص گردن زدنی سمجھے جاتے ہیں کلیم الدین احمد مرحوم، فراق گورکھپوری، عظیم فیروز آبادی، ڈاکٹر حیدری کشمیری اور خاکسار رستوگی۔ اگر لوگوں کا بس چلے تو کلیم صاحب کو جوارِ رحمت سے گھسیٹ لائیں اور فی النار کر دیں کیونکہ مرحوم نے یہ کہا تھا کہ اقبال کو عالمی ادب میں کوئی مقام نہیں دیا جا سکتا۔ فراق صاحب اب اس جہانِ فانی میں نہیں رہے مگر چونکہ انہوں نے کہا تھا کہ اقبال کی شاعری ملک کے لئے احساس سے نا آشنا نے محض ہے اور جارحانہ تمائلات و رجحانات کو جنم دیتی معلوم ہوتی ہے۔ ہندو ہیں یا ہم وطن ہیں یا مسلم ہیں ہم وطن ہیں / ہم وطن ہیں سارا جہاں ہمارا۔ کیا بات ہوئی۔ ایسے دعوے شدید ترین ردِ عمل پیدا کر سکتے ہیں۔ جناب حیدری کشمیری نے بھرپور ثبوت پیش کرتے ہوئے یہ ثابت کر دیا کہ حاجی نول، اقبال کے جدِ امجد نہیں تھے، لوٹ تھے اور انہوں نے کبھی شادی ہی نہیں کی۔ بنہایت فاضلانہ طور پر عظیم فیروز آبادی نے بہت پہلے یعنی کئی سال پہلے ہماری زبان کو ایک مضمون دیا تھا بہ عنوان "کیا اقبال کشمیری پنڈت تھے" جو مضمون نا بذا میں بیں وضاحت و تشریح کے ساتھ اقبال سے متعلق اس غلط بیانی کو کہ وہ کشمیری برہمن "زاد" (نژاد) تھے فوکس میں لا کر متعدد ثبوت پیش کئے تھے کہ دعویٰ قابلِ ترک ہے۔

ان سب اشخاص سے پہلے میں نے دو مضمون "ہماری زبان" نئی دہلی کو دیئے تھے۔

۱۔ اقبال سے متعلق چار فیصلہ طلب امور

۲۔ چہ گفتمت، چہ شنیدی، چہ در گماں آمد

پہلے مضمون میں شبہات مع دلائل پیش کئے تھے۔ (۱) اقبال برہمن زاد (ویسے زاد کہنے سے ذم کا پہلو نکلتا ہے، نژاد کہنا چاہیے کیونکہ زاد کے ایک معنی لڑکا بھی ہوتا ہے) نہیں تھے۔ سپرو کوئی گوتر (गोत्र) نہیں ہوئی۔ گوتر کو گوت ناخواندہ و متوسل طور پر تربیت یافتہ ہی کہتے ہیں، لفظ غلط ہے۔ (۲) اقبال نے مسجد قرطبہ میں نماز نہیں پڑھی، مسجد قرطبہ (جو اب دراصل Cathedral یعنی بڑا گرجا ہے) میں اقبال کو جا نماز مسجد (؟) کے اندر ہے وہی سیڑھیوں پر بچھا دکھایا گیا ہے۔ (۳) اقبال کی برگساں سے ملاقات محض افسانہ نگاری پر مشتمل شاہکار ہے۔ (۴) تاریخ ولادت سے متعلق تھا۔

عرض کرتا چلوں، پہلے مضمون کے محرک کہیل بھائی (عظیم آبادی) تھے۔ میں نے اپنے شبہات ان کے سامنے پیش کئے

تھے۔ بھائی جان نے مجھے کہا کہ شائستہ زبان میں مضمون کی شکل دے کر لکھ ڈالو۔ حکم کی تعمیل کرتے ہوئے میں نے مضمون لکھ کر بھائی جان کو دے دیا۔ سُہیل بھائی نے اس کا کشمیری زبان میں ترجمہ "شیرازہ" (ریاست جموں کشمیر) میں بھی لکھوا دیا۔ کہیں سے بھی یہ آواز نہیں آئی کہ "ہم اقبال کے خاندان سے وابستہ ہندو شاخ کے لوگ ہیں۔"

چند سال قبل ستمبر کی متعدد مضامین میں گھول پیش ہوئی جن کا واشگاف و با استدلال جواب میں نے اپنے دوسرے مضمون "چہ گفتند چہ شنیدی چہ دیگاں آمد" میں دے دیا۔ جس پہ جناب صفدر سیتاپوری (ہومیو پیتھک کے ڈاکٹر، اور مذہب سے غالباً وابستہ ہو گئے تھے) نے ایک مضمون لکھ مارا جو زیرِ بحث نکات سے کوئی واسطہ ہی نہ رکھتا تھا۔

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات اُن کو بہت ناگوار گذری ہے

میں نے دندان شکن جواب لکھ کر ہماری زبان کو پیش کر دیا تھا۔

اقبال تو "اقبال" ہو کوئی کرے مگر حقیقت یہ ہے کہ ہند و پاک کے ادیبوں اور ناقدوں میں اقبالیات کو سب سے زیادہ موضوعات میں نے ہی فراہم کئے ہیں مثلاً ؎

اقبال اور گایتری منتر، اقبال کے نظریات انتقاد سے متعلق کلام اقبال کا احتجاجی آہنگ، اور

(Papers) : Iqbal & Religions other than Islam

" . Iqbal's works : A Socio-political Perspective

" : Iqbal & Tagore Perspective

مزید براں،

Iqbal's works : A Psycho-sociological Perspective

غالباً یہاں یہ بتانا بے محل نہ ہوگا کہ "اثر" سے متعلق سب سے پہلے میں نے ہی وضع کیا جو میرے اس تحقیقی مقالے (western influence on Iqbal) جس پر مجھے انگریزی ادبیات میں ڈاکٹریٹ بھی ملا ہے، اور جس کو میں اُردو میں شائع ہونے والے اپنے متعدد مضامین میں بھی بتا چکا ہوں۔

تھا اقبال اپنا بڑا شاعر تھا، عظیم شاعر تھا۔ وید، اپنشد، گیتا وغیرہ بھی اس کے زیرِ مطالعہ آئے مگر جیسا کہ گایتری کے ترجمے سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو بھی مطالعہ تھا وہ میکس مولر پہ زیادہ محیط تھا۔ گایتری منتر میں صرف ۱۶ حروف ہیں، میکس مولر کی گایتری منتر کی تفسیر کو اقبال نے نظم کیا ہے اور بہترین ترجمہ کیا ہے۔ مخزن میں جب یہ ترجمہ شائع ہوا تھا تو اس کے ساتھ ہی شذرات میں اقبال نے سوریہ نرائین اپنشد کا ذکر کیا ہے۔ صرف سوریہ اپنشد ہی کہنا چاہیئے تھا۔ سوریہ نرائین اپنشد کوئی نہیں ہے مگر میکس مولر نے چونکہ یہی نام لکھا تھا لہذا اقبال نے بھی لے لیا۔ بہرکیف ترجمہ بہت خوب ہے۔ اس موضوع پر میرا مضمون گفتگو بمبئی کے کسی شمارے میں شائع ہوا تھا۔

بات کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔ جب میں نے ثابت کر دیا کہ اقبال برہمن نژاد نہیں تھے تو سُہیل بھائی نے مجھ سے پوچھا کہ اب یہ بتاؤ کہ اقبال نے اتنا بڑا جھوٹ کیوں بولا ؎

برہمن زادہ رازِ آشنائے رُوم و تبریز است

ہوا یہ، میں نے عرض کیا کہ ایک اعتبار سے اقبال کی بات کو درست قرار دیا جا سکتا ہے۔ اقبال نے گایتری کا ترجمہ کیا تھا لہذا گایتری منتر کے خالق رشی وشوامتر (Vishwamitra) سے وہ ناواقف نہ تھے۔ رشی وشوامتر کو "جہاں دوست" کے نام سے اقبال نے جاوید نامہ میں پیش کیا ہے۔

ایک دلچسپ بات، وشوامتر تپسیا کرتے تھے تو اُن کے چاروں طرف برف جم جاتی تھی گرد اہ مار سفید سے حلقہ زن۔ مزید براں اقبال کو یہ بھی معلوم تھا کہ ویدک آریہ دھرم میں، دو پیدائشیں مانی جاتی ہیں، جسمانی اور روحانی۔ ایک عمر پہنچ جانے پر بالخصوص بالغ ہو جانے سے کچھ پیشتر "گایتری منتر دیا جاتا ہے (یہ ہندو روزمرہ ہے) اور گایتری لینے والا برہمن میں پیدائش (؟) یعنی اُس کا رمز آشنا ہو جاتا ہے۔ لہذا گایتری منتر لینے والے کو برہمن (ब्राह्मण) کہا جا سکتا ہے۔ یہ نظریہ آریہ سماج کا ہے اور اقب

اِس سے واقف ہونگے۔ اُن کا مطالعہ بھی تھا اور سوامی رام تیرتھ سے دوستانہ مراسم بھی تھے۔ اگر اِس استدلالی کھینچ تان سے کام لیا جائے تبھی اقبال کو برہمن نژاد کہا جاسکتا ہے۔ (زاد اور نژاد میں فرق ہے)۔

اقبال نے ایشیا کے استحصال اور مغربی استعماریت کے خلاف سب سے پہلے آواز اُٹھائی، جو قابلِ ستائش ہے۔

نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ
خواجگی نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات

شکوہ، جوابِ شکوہ، طلوعِ اسلام وغیرہ نظمیں بہترین سماجیات و تاریخی پس منظر بھی رکھتی ہیں، اور دعوت و عزیمت بھی دیتی ہیں۔ اقبال نے جمال الدین افغانی کے پیغام پر خاطر خواہ توجہ صرف کی تھی مشرق اور مغرب کو بطور قاطیغوریاس (Category) اور اصطلاح استعمال کرنے والا پہلا شخص افغانی ہی تھا۔ مغربی طاقتوں کی استعماریت اور دوسری اقوام بالخصوص مشرق کی اقوام کا استحصال کرنے والی مغربی طاقتوں کے خلاف نعرہ بلند کرنے والا پہلا شخص افغانی تھا اور دوسرا اقبال۔ ساتھ ہی، اقبال پر سرسید کی تحریک کے اثرات مرتب ہو رہے تھے۔ افغانی مغرب کی سائنس اور علوم کا دلدادہ بھی تھا اور وہ مسلمانوں سے مغربی علوم و فنون کا بائیکاٹ کرنے کی تلقین نہیں کرتا تھا، وہ مسلمانوں کو ہر طرح آراستہ و اسلحہ بند دیکھنا چاہتا تھا۔ اقبال کی بھی یہی خواہش تھی، لیکن افغان کی طرح اقبال گفتار و کردار کے غازی نہ تھے۔ افغانی زبردست مقرر تھا مگر اقبال کی تقاریر میں افغانیت تھی، اُن کی شاعری میں "افغانیت" ہے اور "انسانیت" ہے۔ وہ بنی آدم اُن کے پیشِ نظر تھا ؎

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

[illegible] کا ایک اور شعر، فارسی شعر، جو اُن کے کلیات میں شامل [illegible]یات میں قابلِ توجہ ہے ؎

[illegible] سوئے افلاک تو اش ہم نیافت
از غبارِ مہ و ماہ اندیشہ گرد آلود بود

[illegible]ممکن ہیں، اُن کا یہ شعر بھی قابلِ داد ہے، حالانکہ سباق و سیاق کے نقطۂ نظر سے اُس کو پیش کرنا غیر ضروری سا معلوم ہوتا ہے ؎

من درونِ سینہ خود سومنا تے ساختم
آستانِ کعبہ را دیدم جبیں فرسودہ بود

غرضیکہ اقبال بہ حیثیت شاعر خاصی وسیع عظمت کا حامل ہے۔ شعرِ اقبال سے آگے پڑھنے والوں کو بیگم صالحہ عابد حسین صاحبہ کا مراسلہ بہ غور پڑھنا چاہیئے اور کچھ کہتے وقت یا لکھتے وقت احتیاط برتنا چاہیئے۔ ورنہ درج ذیل سوالات و شبہات سامنے آنے لگتے ہیں، جو ریسرچ کے اعتبار سے ناگزیر بھی ہیں اور بغایت اہم بھی ہیں۔

۱۔ اقبال قطعاً برہمن زاد یا نژاد نہ تھے۔

۲۔ اقبال نے اپنے والد ماجد کا نام تبدیل کیا تھا۔ شیخ نتھو سے شیخ میر محمد اور پھر شیخ نور محمد۔

۳۔ آفتاب اقبال، جو پہلی بیوی سے محمد اقبال کے بڑے صاحبزادے تھے۔

اُن کو گھر سے نکال دیا اور عاق کر دیا۔ کیوں؟ یہ ثبوت میرے پاس تھا یعنی آفتاب اقبال کا خط میرے خط کے جواب میں۔ خط ہذا کی فوٹو سٹیٹ کاپی سہیل عظیم آبادی نے کروائی تھی اور وہ یقیناً مرحوم کے کاغذات میں ہوگی۔ میرے پاس جو مراسلہ تھا وہ ملبہ زدہ ہوگیا۔ لینڈ سلائیڈ میں، گھر کے چار افراد زندہ دفن ہوگئے تھے۔ اور میری چار ہزار کتب پر مشتمل لائبریری تباہ و برباد ہوگئی صرف ۱۳۰۰ سو کتب اور مسودات صاف کیے جا سکے۔

بہرکیف مراسلہ ہذا کا ایک پھٹا ہوا حصہ ہنوز میرے پاس ہے میں اِس سلسلے میں مزید کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ بہرکیف ایک بات عرض کردوں۔ اقبال کے ایک دوست کنہیا لال گابا ہوا کرتے تھے، جو اپنے دوست کی طرح دل پھینک تھے۔ مسلمان ہو جانے پر اُن کا نام اقبال کی تجویز پر خالد لطیف گابا ہوگیا اور اِس طرح K. L. Gaba ہمارے سامنے رہے۔ اُنہوں نے اپنی سوانح حیات Friends & Foes) میں اقبال کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اقبال کی ازدواجی زندگی خوشگوار نہ تھی۔ وہ اقبال کو پاکستان کا شکوہ مقبرا کہا کرتے تھے۔

۴. اقبال پر روشنی ڈالنے والی ایک اور کتاب "والدِ آفتاب" پاکستان میں شائع ہوئی ہے۔

۵. اقبال پر ایک صاحب اقبال سنگھ نے انگریزی میں کتاب The Ardent Pilgrim لکھی تھی، جو خاص اہم تصنیف ہے۔ اقبال سنگھ کا ایک مضمون DR OMNISER (Delhi) میں ۱۹۸۰ء کے کسی شمارے میں شائع ہوا تھا جس میں مجلہ وغیرہ ایک طوائف کا عطیہ ملنے کا ذکر کیا گیا تھا۔

۶. اقبال کو جرمنی کی میونخ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی جس ذریعہ پر ملی تھی، اقبال نے اصلیتہً پہلے اس کا انگریزی میں ترجمہ کر کے Development of Metaphysical in Persia کیمرج یونیورسٹی میں پیش کیا مگر اس یونیورسٹی نے اس مقالے پر Certificate of Research ہی دیا

کیا اس حقیقت سے کچھ نتیجہ نہیں نکلتا؟

۷. اقبال اور عطیہ کی ملاقات کو محض افسانوی شاعر کی بات ہی سمجھنا چاہیئے (ملاحظہ ہو "چہ گفت"، "چہ شنیدی"، "چہ رنگ آمد" جو ہم نے ہماری زبان کو دیا تھا)

۸. کیا اقبال نے ایم اے (فلسفہ) فرسٹ ڈویژن میں پاس نہیں کیا؟

۹. کیا بہ حیثیت فلسفی اقبال کو فارابی، ابن سینا، ابن رشد ایسے مسلم علماء کے برابر مقام و مرتبہ دیا جاسکتا ہے؟

۱۰. کیا اقبال کے لیکچر جو بعنوان Reconstruction of Religious Thought in Islam میں کوئی اوریجنیلیٹی (Originality) ہے؟ کیا ان میں معتزلہ اور اخوان الصفا کے خیالات کی صدائے بازگشت نہیں ہے؟ کیا اس میں مغرب کے فلسفیوں کے ہاں سے خوشہ چینی نہیں کی ہے؟ کیا ندوہ اور دیوبند کے دبستان خیالات کے حامل علمائے دین اقبال کے خیالات سے اتفاق کرتے ہیں؟ میرے ایک سنی مسلمان دوست درج ذیل شعر کو بھی اسلام کی اسپرٹ کے خلاف سمجھتے ہیں ؎

ز جبریل امیں قرآں بہ پیغام نمی خواہم
ہمہ گفتار معشوق است قرآنے کہ من دارم

الغرض، اس نوعیت کے مستنبات کی تعداد کم نہیں ہے۔ اگر ریسرچ کرنے اور گلہائے عقیدت پیش کرنے میں فرق نہیں ہے تو بات اور ہے۔ اقبال بہ حیثیت شاعر بہت وقیع اور رفیع مقام و مرتبہ کے حامل ہیں۔ اقبال کی شاعری نے مسلمانوں ہی نہیں غیر مسلموں میں بیداری پیدا کی، بالخصوص اس نوعیت کی نظموں نے جس میں استحصال و استعماریت کی خبر لی گئی ہے۔ پر کار و شعور ریسرچ کسی بات سے روگردانی نہیں کر سکتی ؎

قدم بے باک تر نہ در حریم جان مشتاق
تو صاحب خانہ آخر چرا دزدانہ می آئی (اقبال)

❋ ❋

گرمیٔ شوق میں وہ جرأت رندانہ کہاں
وائے محرومیٔ تقلید و زوالِ تنقید (اقبال)

سمجھ میں نہیں آتا، اقبال کی جا بجا تعریف و توصیف کیوں کی جاتی ہے؟ ہر وہ کوئی کو تنقید کیوں سمجھا جاتا ہے۔ بالا خوانی کیوں پیش آتی ہے؟

اسلام نے دنیا کی تاریخ میں قابلِ قدر رول ادا کیا۔ نظر غائر سے دیکھنے والی بات یہ بھی ہے کہ "ہندو"، "ہندی"، "ہند" تینوں الفاظ فارسی کے ہیں۔ پہلا الفاظ بطور قاطع بیاس استعمال کیا گیا تھا، بعد کو مذہب کا نام ہی بن گیا۔ ریسرچ کو تاجوت لانے سے کم دشوار و محال کام نہیں ہوتا۔ افسوس کا مقام ہے کہ ہم ہا ہوں کی سی باتیں کرنے لگتے ہیں ؎

خاک ہند فطرت بہ پستی ایک مشت خاک ورنہ داشت
ورنہ از ما تا بہ بام آسماں یک زینہ بود

اقبال کی عظمت سے کبھی روگردانی نہیں کی جاسکتی مگر بالا خوانی و اغلاق کو بھی کیوں روا رکھا جائے۔ "اقبال ہو، اقبال ہو" کے نعرے ہوں، جیسے اپنی اپنی خیال اپنا اپنا۔ اگر اس مضمون کو دہلی کے ایک شمارے میں مشمول مضمون بعنوان "متعلق اور متناظر دہلی کے شاعری نمبر میں مشمول میرے مضمون کے ساتھ میرے معروضات مزید انکشاف طور پر سامنے آجاتے ہیں ؎

ہم کھٹکتے ہیں دلِ مفتی میں کانٹے کی طرح
کیونکہ ہم کہتے ہیں اقبال ہو، اقبال نہ ہو

ڈاکٹر اُودے سرن ارمان (بلاری) نے ہندی افسانہ نگاری میں اپنا ایک مقام بنانے کے بعد اپنے اُردو افسانوں کا مجموعہ

مان سروور

شائع کر کے اُردو ادب میں جو مقام پایا ہے وہ درجنوں افسانوی مجموعوں کے خالق افسانہ نگاروں کو بھی حاصل نہیں ہو پایا۔

چنانچہ

"مان سرودر" اُردو افسانوں کا مجموعہ ہندی اور انگریزی میں اشاعت پذیر ہو کر دُنیائے ہندی کے ساتھ ساتھ مان سروور کے انگریزی ایڈیشن نے انگلینڈ تک شہرت پائی ہے۔ مان سروور انگریزی ایڈیشن پر انگلینڈ کے تین انگریزی ادب کے ماہرین نے دیباچہ۔ تقریظ اور گرامی قدر رائے سے نوازا ہے۔

اُردو ایڈیشن	ہندی ایڈیشن	انگریزی ایڈیشن
۲۱ روپے	۱۵ روپے	۲۵ روپے

نداب ڈاکٹر اُودے سرن ارمان کے تازہ ترین بہترین افسانوں کا مجموعہ -

ہر بار کہا دل نے

طباعت کی منازل طے کر رہا ہے۔ تفصیلات کے لئے لکھیے
دفتر ماہنامہ شانِ ہند فلیٹ نمبر ۸ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی نمبر ۱۱۰۰۰۲

ہری چند اختر

ایک باغ و بہار شخصیت

رام لال نابھوی

یکم جنوری ۱۹۰۰ء کو سما چاؤں بنلیع ہری چند اختر ہوشیار پور ریاست پنجاب میں ایک دیہاتی اور مہذب رسم و رواج کے پابند براہمنوں کے گھر میں پیدا ہوئے، جن کا ذریعۂ معاش کاشتکاری تھا۔ خاندان بھر میں کوئی پڑھا لکھا نہ تھا۔

جالندھر کے گورنمنٹ اسکول میں زیر تعلیم تھے کہ حفیظ جالندھری سے ملاقات ہو گئی۔ گرامی مرحوم کی صحبت میں گئے، شعر کہنے کا شوق پیدا ہوا۔ ہائی اسکول سے فراغت پا کر فارمن کرسچن کالج میں داخل ہو گئے۔ بی اے پاس کیا اور ایک اخبار میں نوکری کر لی۔ شروع میں شرما تخلص کرتے تھے، پھر اختر کہلانے لگے۔ وہ زخمی تخلص سے بھی شعر کہتے رہے۔

سال ۱۹۳۹ء سے سال ۱۹۴۷ء تک لاہور میں مقیم رہے۔ لاہور ادبی سرگرمیوں کا مرکز تھا، یہ بھی شامل ہو گئے۔ طبیعت میں ظرافت کا رنگ غالب تھا۔ بے حد ذہین و ذکی الطبع تھے۔ چھیڑ خانی کرنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ مشاعروں میں شرکت کرنے لگے۔ مشاعرے فتح ہوتے۔ نظم و نثر دونوں میں عبور حاصل تھا۔ کہیں ابتدائیہ لکھ رہے ہیں، کہیں اخبار کا مزاحیہ کالم لکھا جا رہا ہے۔ کہیں مشاعرے کے لیے نظم مرتب ہو رہی ہے۔

جالندھر میں حفیظ جالندھری اور گرامی مرحوم کی صحبتوں نے فکر و فن کو جلا بخشی۔ مولانا تاجور نجیب آبادی نے جب لاہور میں انجمن ارباب علم کی بنیاد رکھی تو اختر اور ان کے ساتھیوں نے مولانا سے اختلاف رائے ہونے کی وجہ سے بزم ادب قائم کی۔ مولانا تاجور جیسے عالم کے مقابلے میں کسی انجمن کے قائم کرنے کا خیال ہی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ کسی سے مرعوب نہیں ہوتے تھے۔ وہ بڑے سے بڑے شاعر اور ادیب سے ٹکرا جاتے تھے۔ بات سے بات نکالنا اور نکتے سے نکتہ پیدا کر لینا اور پھر حسب موقع استعمال کرنا ان کا کمال تھا۔ فی البدیہہ شعر کہنا ان کی طبیعت کا خاصا تھا۔ ان کے ہاتھ سے نہ ظفر علی خان جیسا جغادری بچا۔ نہ منشی راج نرائن ارمان کی مونچھیں بچ پاتیں۔ نجیب آبادی کی توند، یا خواجہ حسن نظامی کی تبلیغ، ان کی زد میں آنے سے نہیں بچیں۔ غرضیکہ کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔

لاہور کی ادبی سرگرمیوں میں تاثیر، سالک، صوفی تبسم، حفیظ جالندھری، بخاری، پطرس، علامہ گرامی، علامہ اقبال، محمد عبدالغفور، نریندر ناتھ، تاجور، وارستہ، پریشاں، فدا، ظفر علی خاں، کرشن چندر، کنہیا لال کپور، کنور سین، ہاس، یگانہ، دواریکا داس شعلہ، موہن سنگھ دیوانہ، محمود شیرانی، کرم چند، کنور سین، ملک فیروز خاں نون، گوپال متل، غلام محمد، جیسے سخن شناس، سخن ور، سخن گو جمع ہو جاتے تھے، زبان اور فن پر بحث ہوتی تھی۔ ادھر ایک نے چھیڑا، ادھر جواب حاضر۔ پھر کسی نے نکتہ نکالا، کسی نے پھبتی کسی، ادھر سے جواب ملا۔ میدان میں سب ڈٹے رہتے۔ صف آرائیاں ہوتیں، چوٹیں ہوتیں، نوک جھونک کے جوہر کھلتے۔ بذلہ سنجی پروان چڑھتی، ہاؤ ہو ہوتی، لطیفے پیدا ہوتے۔ یہی وہ محفلیں تھیں جہاں اختر کے طنز و مزاح کو جلا ملی اور وہ باغ و بہار شخصیت بن گئے۔

کس کی ہمت تھی کہ ظفر علیخاں سے ٹکرا جاتا۔ بڑے بڑے شاعر ان کے نام سے دبکتے تھے، حکومتیں ان سے خوف کھاتی تھیں۔ اختر سے کہیں نوک جھونک چل رہی تھی۔ کہیں ان کے شعر میں تعقید نظر آئی۔ فوراً تعقید لفظی کے سقم پر آ بنے پڑے اور آخری فعل کو الگ کر کے یعنی "کون بولے گا" کی جگہ "بولے کون گا" کی زمین میں ظفر علی خاں کی پوری ڈھنگ کا نقطہ مرتب کر دیا۔ رنگ ملاحظہ ہو:

پھر ظفر کے بعد گانے ایسے ڈھولے کون گا

پھر سُنائے ٹھمریاں "بیٹی" جو بولے کون گا
آمنت مرحوم کہہ جیسیں ٹھوسے کون گا
بھرے جاتے یوں ہی پھندے جوتے کون گا
نبض تک خاموش رہ جاتی ہے رعبِ حُسن سے
حالِ دل پوچھا اگر اس نے تو بولے کون گا
تو جو مجھ پر کر رہا ہے بے خبر مشقِ کلوخ
جن کے تیرے واسطے لائے غلولے کون گا
ہے شبِ وعدہ ادھر مجھ پر ہے غلبہ نیند کا
وہ اگر آئے تو پھر دروازہ کھولے کون گا
دوزخی صاحب بھی ساحل سے جمٹ بیٹھا اگر
عشق کے طوفان میں کھاتے جھکولے کون گا

ترکی بذلہ سنجی، رنگینی وشوخی، خوش طبعی وخوش گفتاری،
دگی، پرکاری اور برجستگی اور سب سے بڑھ کر شیریں بیانی
نیں مشاعروں کی کھینچ لاتی تھی۔ وہ ایک گوشے میں بیٹھ جاتے،
ے مداح ان کے ارد گرد سب کی نظریں کھنچ جاتی تھیں
شاعروں کی نظریں اختر پر۔ ادھر کسی نے مصرعہ کہا اور پنڈت
کی رگ پھڑکی اور اس سے پہلے کہ شاعر دوسرا مصرعہ کہتا،
ت جی شعر پورا کر دیتے اور اس طرح کہ ساری محفل زعفران
رہو جاتی، شاعر سٹپٹا جاتا۔ پنڈت جی کی کبھی نیت ایسی
ں ہوتی تھی کہ کوئی شاعر اُکھڑ جائے لیکن وہ اپنی فطرت
ت سے مجبور تھے۔ اُن کی بات کا کوئی بُرا نہیں مانتا تھا۔
نکہ سب جانتے تھے کہ وہ الماس کی طرح شفاف، آئینے
طرح آبدار، پھول کی طرح خوش رنگ اور طوطی کی طرح
ش نوا تھے، وہاں نہ بغض و عناد تھا نہ رشک و حسد، نہ غرور
نت، نہ خود نمائی اور خود ستائی۔ ایک پھلجھڑی چھوڑ دیتے اور
ست الست۔ بیٹھے لطف لیتے۔ مشاعرہ میں وہ رنگ بھر
تے تھے کہ اُن کی حاضری مشاعرہ کی کامیابی کا ضامن ہوتی
ی کچھ نہیں سمجھتے تھے۔ اگر وہ کسی شعر پر بہت زیادہ داد دیتے
تو سامعین سمجھ لیتے تھے کہ یا تو اس شعر میں کوئی سقم ہے یا
در حقیقت تعریف کے قابل ہے۔ ایک مشاعرے میں ایک
ہ شاعر اپنی غزل پڑھ رہے تھے، غزل کی زمین تھی

"رات کٹتی گھات کتنی ہے" شعر کا پہلا مصرعہ تھا: "یہ دل ہے یہ
جگر ہے یہ کلیجہ" پنڈت جی کب چوکنے والے تھے، بلند آواز سے
دوسرا مصرعہ کہا "قصائی لایا ہے سوغات کتنی" محفل لالہ زار ہو گئی۔
یہ واقعہ اتنا مشہور ہوا کہ آج بھی اس شعر کو لوگ چٹخارے
لے لے کے پڑھتے ہیں۔

بقول مرزا جعفر حسین۔ جوش ملیح آبادی کا کہنا ہے کہ یہی
چند اختر بے حد زود گو تھے، انہوں نے بے شمار غزلیں نظمیں کہی
تھیں جو بہت بڑی تعداد میں تلف ہو گئیں۔ جو کچھ فراہم ہو سکا وہ
ایک مختصر مجموعہ کی صورت میں "گھڑیاں" کے نام سے شائع
ہوا ہے۔ اب دیکھئے کہ اختر جوش ملیح آبادی کو بھی نہیں بخشتے تھے۔
اور انہیں ملیح آباد کا ہیسٹہ مالی کہا کرتے تھے۔

اختر کی طبیعت میں بلا کی جدت، لطافت اور اُن کے
احساسات میں غضب کی تازگی اور انفرادیت تھی۔ ایک مشاعرے
میں شمولیت کے لئے کچھ شاعر جموں جا رہے تھے۔ راستے میں
پنڈت ولستہ پرشاد فدا نے اختر سے کہا کہ ایک غزل ہوئی ہے
مقطع نہیں ہو رہا ہے۔ زمین تھی "خدا ہو کر دعا ہو کر" اختر صاحب
نے فی البدیہہ یہ فرمایا "مزا جینے کا آخر دل لگانے پر ہی ملتا ہے
فدا صاحب کسی پر دیکھ لینا تھا فدا ہو کر"۔ اللہ اللہ۔ شعرا حضرات
لوٹ پوٹ ہو رہے تھے اور اختر صاحب یوں بیٹھے تھے جیسے
کچھ ہوا ہی نہیں۔ شعر کی بندش میں ایک تڑپ تھی، ایک چمک تھی،
ایک شعلہ تھا جو بتوں تک اپنی لَو دیتا چلا گیا۔

شملہ کا ایک واقعہ سُنئے۔ گیئٹی تھیٹر میں ایک ڈرامہ بعنوان "تمنا"
شام کو ہونے والا تھا۔ ہیروئن نہ آئی اور ڈرامہ نہ ہو سکا۔ پنڈت جی
بھلا کب چپ رہتے۔ بولے ایک شعر ہو گیا ہے

تھی جس پر کامیابی منحصر چل دی وہی لڑکی
تمنا کی جگہ خونِ تمنا دیکھتے جاؤ

ادھر بات تھی، اُدھر ذہن سے کونپل پھوٹی۔ عقل کی ندرت،
خیال کی جدت، وزن و آہنگ سے مناسبت اور شعر کے نوک
پلک جانچنے کی فنی صلاحیت پنڈت جی میں غضب کی تھی۔

پنڈت جی نہ شراب پیتے تھے نہ گوشت کھاتے تھے۔ محض سگریٹ
پیتے تھے جو بعد میں انہوں نے چھوڑ دی تھی۔ یار لوگ ایک بار

کوٹھے پر سے گئے اشعار سیر کرنے چلے گئے وہاں طوائف نے جام پیش کیا۔ پنڈت جی کہنے لگے بہن جی، بیٹا، شراب نہیں پیتے۔ طوائف "بہن جی" کا لفظ سن کر کھلکھلا اٹھی اور پورا کوٹھا باغ و بہار بن گیا۔ یار لوگ قہقہوں سے دوہرے ہوتے جارہے تھے۔ بعد میں مدت تک طوائفوں میں یہ لفظ پھلجھڑیاں چھوڑتا رہا۔

پنڈت جی نڈر اور بیباک تھے۔ موت سے چند ماہ پیشتر کراچی میں یوم اقبال کے سلسلے میں منعقدہ ایک جلسے میں علامہ اقبال کی شاعری پر مضمون پڑھا۔ اس میں انہوں نے کہا کہ ہر چند کہ شاعری رنگ میں بنگلہ کی کشمکش جس شدت سے جاری ہے وہ بلا فرقہ بندہ ثابت ہوگی۔ ادب اور ادیب، شعر اور شاعری بنی نوع انسان کا مشترکہ اثاثہ ہوتے ہیں۔ شاعر اور ادیب کو ایک خاص حلقے سے منسوب کرنے والے شعر اور ادب کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہے ہیں۔ علامہ اقبال شاعر تھے صرف شاعر۔ آہستہ آہستہ انہیں شاعر مشرق کہا جانے لگا۔ پھر حکیم ملت، پھر شاعر پاکستان اور اگر رفتار یہی رہی تو شاعر مغربی پاکستان بنا دیئے جائیں گے حتیٰ کہ سکڑ کر شاعر لاہور رہ جائیں گے۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ دنیا کی نظروں سے اردو کے سب سے بڑے شاعر کو ٹکسالی دروازے کا شاعر کہا جانے لگے۔ اس کی بازگشت دیر تک سنائی دیتی رہی۔

پنڈت جی کی زندگی تلخیوں سے معمور تھی۔ آنکھ کی بینائی سے پریشان رہے۔ صحت خراب رہی۔ پلیگ کے حملے سے بچے تو دو مرتبہ نمونیہ ہوا۔ درد ریح، درد گردہ کے مریض تھے بڑا لڑکا راجندر چل بسا۔ مالی حالت اچھی نہیں تھی۔ وزیروں گورنروں سے دوستی تھی لیکن کبھی کسی سے کچھ طلب نہیں کیا۔ پوری زندگی سے قوت کر پیار کیا۔ ان کے غم کی ترجمانی اس ایک شعر میں موجود ہے ؎

نے چمن کی خزاں مطمئن رہے کہ یہاں
خدا کے فضل سے اندیشۂ بہار نہیں

پنڈت جی یکم جنوری ۱۹۵۸ء کو چل بسے۔ ان کے انتقال پر ہندوستان پاکستان میں بڑا ماتم ہوا ؎

وہ نہ بیکتا تھا بے سہاروں کا وہ شور محشر اٹھا کے اٹھا
ستم ظریفی تو کوئی دیکھے ہنسانے والا رلا کے اٹھا

(حالانامہ ۔ ۔ ۔)

غزلیات

رفیق ہرپالوی (دریا)

اب نہیں احساس کس نے کتنے غم ہم کو دیے
جب ہنسا تو ہنس دیے جب کوئی رویا رو دیے

کتنے ارماں دل میں تھے کیا کیا امنگیں تھیں مگر
سامنا اُن کا ہوا تو حوصلے سب کھو دیے

اپنی محنت اپنی کاوش کا صلہ کچھ بھی نہیں
جیسے چٹانوں میں ہم نے بیج سارے بو دیے

اک یہی دولت ہے اپنی اک یہی ہے کائنات
پیار سے دل میں بسایا آپ نے جو غم دیے

گردشِ ایام کو ٹھوکر لگا دیتا ہوں میں
گردشِ ایام نے یہ حوصلے مجھ کو دیے

جانبِ طوفان کشتی موڑ دی ہم نے رفیق
بادباں، پتوار، لنگر اہلِ ساحل کو دیے

رفیق ہرپالوی معرفت مسٹر... ... محلہ ترنی، دیلیا۔ ایم۔ پی۔ ۴۸۶۰۰۱

غزل

محمد شفیع کلیم گھوسوی، دیوریا

حال مرا دیوانوں سا
جلتا ہوں پروانوں سا
جب بھی یاد اُن کی آئی
دل لرزہ طوفانوں سا
منزلِ راہِ محبت میں
ہر پتھر دربانوں سا
جب نہ تمنا بر آئے
تڑپا ہوں دیوانوں سا
ذات پات کے جھگڑے میں
انساں ہے انسانوں سا
چاہے کس آدمی چاہے جو
کام مگر حیوانوں سا
آئی بہار کلیم مگر
گلشن ہے ویرانوں سا

Accession Number
......86097
Date 21...12.87

ضمیر کی آواز

ڈاکٹر اودے سرن ارمان (   )

سات ہزار روپے میرے سامنے رکھتے ہوئے بابو گیان چند نے کہا "ستو لوری سیمنٹ اور چاہیے امید ہے کہ مجھے نا امید نہ ہونا پڑے گا" میں نے نوٹوں کی گڈی اٹھاتے ہوئے کہا آپ کا کام تو کرنا ہی ہوگا۔

ابھی چاہیے یا چھ سات دن بعد"

ٹھیکیدار صاحب اگر فوری ضرورت نہ ہوتی تو اس قدر تیز دھوپ میں آپ کو تکلیف دینے حاضر نہ ہوتا" میں نے گودام سے کمپاؤنڈ والے کو کہا اور بابو گیان چند کو یقین دلایا کہ وہ اس پل پر جہاں کام چل رہا ہے میں بھی تھوڑی دیر میں وہاں پہنچتا ہوں اور ان کا کام وہیں کروا جائے گا۔ بابو گیان چند کولڈ ڈرنک کی بوتل دو تین گھونٹوں میں ہی ختم کرتے ہوئے فوری طور پر نئے پل کی جانب چل پڑے۔

بیوی کی گڑگڑاتی آواز نے مجھے چونکا دیا جو خفگی کے لہجے میں کہہ رہی تھیں کہ اس جھلسا دینے والی دھوپ میں پرندے تک اپنے گھونسلوں میں دبکے بیٹھے ہیں اور ایک آپ ہیں جو نہ معلوم کس کنٹرکٹ میں لگے ہوتے ہیں۔ بیوی نے نوٹوں کی گڈی اٹھاتے ہوئے کہا اب سمجھی کہ آپ کیوں اس دوپہری میں بھی سب کچھ بھولے ہوئے ہیں۔ یہ چیز ہی ایسی ہے کہ اس کے لئے آدمی اپنوں تک کو بھول جاتا ہے مجھے کتاب کی طرح خاموش پا کر بیوی نے نسوانی حربہ استعمال کرتے ہوئے مقوی حسن مسکراہٹ کے ساتھ کہا اتنے نوٹ دیکھ کر تو مردہ بھی کروٹ لے لے گا آپ ہیں کہ کشتی کی چھاؤں میں بھی اداس ہیں۔ میں نے بیوی کو اپنے قریب بٹھاتے ہوئے رازدارانہ لہجے میں اسے بتایا کہ ڈاری گیشن منسٹر کی بیٹی کی شادی ہے جس کی وجہ سے انہوں نے اپنے محکمہ کے افسران سے تین لاکھ روپیہ فراہم کر دینے کو کہا ہے جس کی وجہ سے مجھ پر بھی مخصوص انداز میں اوپر سے دباؤ پڑ رہا ہے کیونکہ بہت جلد یہ رقم اکٹھا ہو کر جانی ہے۔ ٹھیکے تو اوپر والوں نے اپنی پرسنٹیج ویسے ہی بڑھا دی ہے جس سے مارجن اتنا کم رہ گیا ہے کہ گھر کا خرچ تک چلنا دشوار ہو رہا ہے اور اس پر مزید یہ مطالبہ ہے۔ لہٰذا مجبوراً بابو گیان چند کا کام کرنا ہی ہوگا۔

میری ان باتوں کو سنتے سنتے بیوی کی ہشاش بشاش صورت پر کسی قدر گہری سوچ کی لکیریں ابھر آئی تھیں مگر اصرار پر کہنے لگیں۔

دیکھو جی اس طرح پل کمزور رہے گا اور اگر بارش میں یہ بیٹھ گیا تو کتنی جانوں کا نقصان ہوگا اور یہ سب پاپ ہمارے سر پر ہوگا۔

میں نے حوصلہ مندانہ آواز میں کہا محض میرے اور تمہارے سوچنے سے پل تھوڑے ہی اچھا بن جائے گا پل کمزور بننے میں تو نیچے سے اوپر تک ان گنت لوگ ذمہ دار ہیں تم تو ویسے ہی گھبرانے لگتی ہو۔ ٹھوڑی پر انگلی رکھتے ہوئے قدرے اطمینان سے کہنے لگیں تو پھر آپ نے کیا سوچا ہے؟ بس بتوں کا انتظار کر رہا ہوں وہ آ جائے تو میں پل پر جاؤں کیونکہ بابو گیان چند وہاں میرا انتظار کرے گا۔

مگر بتوں تو تین بجے سے پہلے آئے گا نہیں۔ کیونکہ جب سے اس نے تنخواہ بڑھانے کو کہا ہے اور آپ نے اس کی مانگ پر دھیان نہیں دیا تب سے وہ تین بجے کے بعد ہی آنے لگا ہے۔ کہتا ہے کہ اس کی بیٹی کی شادی ہے۔ مگر میں سمجھتی ہوں کہ تنخواہ بڑھوانے کے لئے اس نے بہانہ بنا رکھا ہے۔ آج کل لیبر کلاس کا دماغ ساتویں آسمان پر ہے اس لئے خود جا کر اسے گاڑی سے لے آئیے۔ کیونکہ بابو گیان چند کو سیمنٹ کے کٹے دینے کے لئے بتوں کی فوری ضرورت تھی لہٰذا میں نے گیراج سے کار نکالی اور بتوں کے گاؤں کی [illegible] آج تک کے ملازموں کی بے مروتی کا خیال آتا رہا کہ ان لوگوں کے ساتھ چاہے کتنا ہی اچھا سلوک کیا جائے مگر جب اپنی غرض ہو، دوسری جگہ سے کچھ

زیادہ ملتا ہے وہیں کام کرنے لگتے ہیں اور اطلاع تک دیئے بغیر کام چھوڑ جاتے ہیں۔ بچوں کا گاؤں آگیا تھا مگر میں اس کا مکان نہیں جانتا تھا جامن کے پیڑ کے نیچے تین بچے پیڑ سے از خود گری ہوئی جامنوں کو چن رہے تھے۔ میں نے کار روکی اور نیچے اتر کر جامن کے پیڑ کے قریب جا کر بچوں سے بچوں کے گھر کا پتہ دریافت کیا۔ بچے مجھے اور کار کو دیکھ کر کچھ سہم گئے کہ میں نے ان کی گھبراہٹ کو دور کرنے کے لئے بڑے پیار سے کہا کیا مجھے جامن نہیں کھلاؤ گے۔ یہ سنتے ہی تینوں بچے پھول کی طرح کھل اٹھے اور اپنی اپنی اکٹھی کی ہوئی جامنوں میں سے اچھی اچھی جامنیں نکال کر مجھے دینے لگے سب سے چھوٹے بچے نے توتلی زبان سے کہا میلی جامن بڑی اچھی ہے کچی لیٹھا (ریٹھا) ہے لوکا (کھا) لو۔ بچے کے میلے کچیلے ہاتھوں سے مجھے کراہیت تو ہوئی مگر اس کی توتلی زبان سے نکلے ہوئے پرخلوص الفاظ اس کا معصوم چہرہ۔ اور والہانہ انداز میں جامن کا پیش کرنا مجھے اس قدر بھایا کہ میں نے بلا تکلف جامن لے لی کہ دوسرا لڑکا بے ساختہ کہنے لگا بابو جی یہ بھنگی کا لڑکا ہے اس کے ہاتھ کی جامن نہ کھانا لو میری جامن کھالو۔ اس پر چھوٹا معصوم بچہ قدرے سہم کے پیچھے ہٹ گیا۔ سب سے بڑا لڑکا کہنے لگا بابو جی یہ دھوبی کا لڑکا ہے اور بہت گندہ ہے اس کی جامن نہ کھانا یہ لو میری جامن کھالو میں دھیمر ہوں۔ میں نے تینوں بچوں کی جامنیں لے لیں اور انہیں بڑے پیار سے سمجھایا کہ بھنگی تو ہم سب کی گندگی صاف کر کے ہمیں صاف ہوا میں سانس لینے کی آسانیاں مہیا کرتا ہے۔ ہم اپنے گندے میلے کچیلے کپڑے دھوبی کو دیتے ہیں جنہیں وہ دھوکر ہمیں صاف ستھرا رکھنے میں مدد دیتا ہے۔ دھیمر ہمارے گھروں کے برتنوں کی صفائی کرتے ہیں اور ہمیں صاف ستھری زندگی بسر کرنے کی راحت پہنچاتے ہیں۔ لہٰذا ہمیں تو ان سب کا احسان مند ہونا چاہیئے نہ کہ ان سے نفرت کریں اور ذات برادری کے چھوٹے بڑے ہونے کی بات کریں۔ ہم سب بھائی بھائی ہیں" میں نے یہ کہتے ہوئے تینوں بچوں کی دی ہوئی جامنیں کھالیں جس پر تینوں بچوں کی باچھیں کھل گئیں اور انہوں نے اپنی اپنی ساری جامنیں مجھے دینے کی کوشش کی۔

میں نے بڑے پیار سے بچوں سے کہا کہ یہ سب جامنیں تم سب کھاؤ اور جیب سے تین روپے نکال کر ایک ایک روپیہ ہر بچے کو دینے کو ہاتھ بڑھایا تو تینوں نے ایک ایک روپیہ لینے سے انکار کر دیا۔ میں نے اصرار کیا تو بھنگی کا لڑکا کہنے لگا بابو جی میں نہیں لوں گا میری ماں مارے گی ایک بار کسی کے آنگن میں اٹھنی ملی تھی تو میری ماں نے وہی مجھ سے لے کر اس آنگن میں ہی پھینک دی۔ اور کہا تھا کہ کسی کی چیز نہیں اٹھاتے حرام کی کمائی بری ہوتی ہے۔

دھوبی کے لڑکے نے بھی بتایا بابو جی میری ماں بھی مارے گی میں نہیں لوں گا۔ ایک بار کپڑے دھوتے ہوئے کسی پینٹ میں سے سات سو روپیہ کے نوٹ نکل آئے تھے تو کپڑے کا نمبر دیکھ کر میرے ابا کے ہاتھ پینٹ کے مالک کے گھر بھجوا دیئے تھے۔ میرے ابا نے کہا تھا کہ رکھ لو ہم کون سے کسی کے گھر چرانے گئے تھے۔ کوئی پوچھے گا بھی تو کہہ دیں گے کہ ہم نے نہیں دیکھے۔ مگر میری ماں نے منہ بگاڑتے ہوئے میرے ابا کو ڈانٹ دیا تھا۔ اور کہا تھا کہ خدا تو دیکھ رہا ہے۔ نیت ٹھیک رکھو ایمان کو سنبھالو اسی فعل سے ہی پورا پڑے گا۔ یہ سنتے ہی میرے ابا ڈر گئے اور روپے واپس کر آئے۔ دھیمر کے لڑکے نے بھی ویسے ہی ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا کہ میری بھی ماں مارے گی۔ ایک بار میری ماں کو ایک ساہوکار کے گھر میں پونچھا لگاتے، نقد نوٹوں سے بھرا بٹوہ ملا تھا اور اس نے فوراً مالک کے حوالے کر دیا جب میرے بابا جی کو پتہ چلا تو میری ماں پر خفا ہوئے اور کہا کہ تم نے بے کار بٹوہ واپس کیا۔ [illegible] کام آتا۔ اس پر میری ماں نے بگڑ کر کہا [illegible] ایسے حرام کے روپے لاتے ہوئے شرم نہ آئی۔ بے ایمان بن کر جینے سے تو بھوکے مر جانا بہتر ہے۔ ہم غریبوں کے پاس صرف عزت اور ایمان ہی تو ہوتا ہے اگر یہ بھی چلا گیا تو پھر کیا رہ جائے گا۔

تینوں بچوں نے میرے گناہ گار ضمیر پر اس زور سے تازیانہ لگایا کہ میں اپنے آپ سے نفرت کرتے ہوئے سوچنے لگا کہ بچپن میں میری ماں نے بھی مجھے ایسی ہی اچھی باتیں بتائی تھیں۔ عورتیں مردوں کی

بہت زیادہ رحم دل اور مذہبی جذبہ کی مالک ہوتی ہیں۔ اگر امریکہ میں کوئی عورت یہ بدتمیزی ہوتی تو ہیروشیما، ورنا گاساکی جیسے بم نہیں گرائے جاتے۔ میں انہیں خیالات میں گم تھا کہ بچوں نے مجھے چپ چاپ دیکھ کر یک زبان ہو کر کہا: بابو جی آپ ناراض ہو گئے ہیں۔ میں نے روپے جیب میں رکھتے ہوئے کہا نہیں، میں یہ سوچ رہا تھا کہ گاؤں کے لوگ اپنے گھر آنگن میں جامن، آم، پپیتا، آڑو، کٹھل، امرود اور کیلے وغیرہ کے پیڑ لگاتے ہیں جن سے پھل بھی ملتے ہیں اور سایہ بھی اور امیروں کے پاس کوٹھیوں میں یہ وکیریا، یوکلپٹس، املتاس، رائل پام، سرو اور اشوک کے پیڑ لگائے جاتے ہیں جن سے پھل ملتے ہیں اور نہ ہی بہتر سایہ۔ ہوا کے ایک تیز جھونکے سے ٹوٹ جاتی ہیں زمین پر آ رہی ہیں اور بچے انہیں اٹھانے کے لئے دوڑے۔ اور مجھے بچوں کے گھر کا پتہ دریافت کرنے کا دھیان آیا اور میرے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ وہ اس وقت مکان پر نہیں تھا کیونکہ اس وقت سڑک پر پتھر توڑنے جاتا ہے۔ میں نے دل ہی دل میں جانا کہ وہ تو میرے پاس نوکری کرتا ہے اور دوپہر کو کھانا کھانے اور آرام کرنے کے لئے گھر آتا ہے۔ تو وہ پتھر توڑنے کیسے جاتا ہے۔ میری خاموشی کو بھانپتے ہوئے دھنو رام کا لڑکا بولا بابو جی وہ ہر روز دوپہر کو سڑک پر ایک ڈھیری پتھر توڑ کر ٹھیکیدار سے چار پانچ روپیہ لیتا ہے اور پتھر توڑنے کے بعد اپنی نوکری پر چلا جاتا ہے

بچوں سے بچوں کی بات یہ سب کچھ سن کر میں نے سمجھ لیا کہ بچوں نے لڑکی کی شادی کا بہانا نہیں بنایا بلکہ حقیقت میں وہ ضرورت مند ہے مجھے اس کی تنخواہ بڑھا دینی چاہیئے تھی۔ میں نے بچوں کو پیار بھری نظروں سے دیکھا اور کار سٹارٹ کر کے گھر کی طرف لوٹا میرا دل بار بار کہہ رہا تھا کہ اگر میں نے بچوں کی تنخواہ بڑھا دی ہوتی تو اتنی کڑی دھوپ میں وہ پتھر نہ توڑتا۔ اب میں اس کی تنخواہ اس کی فرمائش سے بھی دوگنی بڑھا دوں گا۔ جب میں اسراف کی ...ل کی چوری کر کے اسے اچھے داموں بیچ کر سرکاری کاروبار ...کھاتا ہوں ان کی پیسے ادا کرتا ہوں تو بچوں کی تنخواہ بڑھانے سے کیا فرق پڑ جائے گا سیمنٹ کے دو تھیلے اور نہ سہی۔ سرکاری کمپنی کو اس کمائی سے عیش پرستی کرتے ہیں یہ بیچارہ تو ضروری کام میں صرف کرے گا۔ اس طرح ایک غریب کی مدد بھی ہو گی۔ تینوں بچوں کی باتیں اور ان کی ماؤں کی نصیحتیں کار چلنے کے ساتھ ساتھ اسی تیز رفتاری سے میرے دماغ میں گھوم رہی تھیں اور مجھے اپنے پیشے سے نفرت پیدا ہو رہی تھی میرے دل و دماغ میں ہلچل مچی ہوئی تھی سیمنٹ اور لوہا ناجائز طور پر فروخت کر کے ناجائز روپیہ کمانے سے میں دل ہی دل میں توبہ کر رہا تھا مجھے لگ رہا تھا کہ میں غلط کام کر رہا ہوں میری اس حرکت سے قوم اور ملک کا نقصان ہو گا چند روپیوں کا لالچ مجھے خطرناک حالات میں گرفتار کر دے گا۔ میں ایمان فروش ہوں، ضمیر فروش ہوں، قوم کا دشمن اور ملک کا غدار ہوں۔ یہی سوچتا سوچتا میں گھر آ پہنچا۔ کار گیراج میں کھڑی کر کے باہر نکلا تو بیوی کہہ رہی تھی کیوں؟ بچوں نے آنے سے انکار کر دیا نا؟ مجھے پتہ تھا کہ وہ آپ کے ساتھ نہیں آئے گا کوئی نہ کوئی بہانہ بنا دے گا تم نے ہی اسے منہ چڑھا رکھا ہے ارے میں کہتی ہوں کوئی دوسرا نوکر ... اسی تنخواہ میں مل جاتا ہے ملک میں بے روزگاری کا یہ عالم ہے ایک بلاؤ گے سو آ جائیں گے۔ اسی طرح وہ لگاتار بولتی رہی جب ابلتے ہوئے آتش فشاں کی طرح خاموش ہو گئی تو میں نے اسے حقیقت حال سے آگاہ کیا اور اپنی کایا پلٹ کی بات بھی سنائی تو وہ سنجیدگی سے بولی آپ کی تمام باتوں سے میں متفق ہوں۔ دیا دھرم سے ہی آدمی [illegible] میں انسان بنتا ہے۔ مگر آپ کسی سے رشوت لیں یا سرکاری مال ناجائز طور پر فروخت کر کے ناجائز روپیہ نہ کمائیں یہ تو ہو سکتا ہے لیکن کسی کو رشوت نہ دیں یہ نہیں ہو سکتا.........

بیوی نے آخری الفاظ جس زوردار انداز میں کہے تھے وہ اب تک میرے دل و دماغ کو جھنجھوڑ رہے ہیں اور میں ابھی تک اسی مذبذب میں معلق ہوں کہ کیا واقعی رشوت ہمارے معاشرہ میں اتنی گہرائی تک گھر کر چکی ہے کہ "رشوت" ہمارا قومی کردار بن چکی ہے؟

مُلک و قوم کی شاندار ترقّی کے لئے

وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی

کے

جدید بیس نکاتی پروگرام

کی کامیابی اور اُسے عملی جامہ پہنانے میں

بمبئی مرکنٹائل کوآپریٹو بینک لمیٹڈ

پوری طرح مستعد ہے اور اپنی پوری تمام خدمات وقف کرتا ہے بینک نے موجود

پیداوار کی رقم پر ۱۰ فیصد سے زائد سرمایہ اسی پروگرام کے تحت پسماندہ طبقوں

کو فراہم کیا ہے

ہیڈ آفس

۷ے محمد علی روڈ بمبئی ۔۔۔۔ ۳

فون نمبر ۳۲۲۳۹۴۱-۷۶۵

دہلی برانچ

۱۰۵ سہ منزلہ نیتاجی سبھاش مارگ دریا گنج دہلی ۲

فون نمبر ۲۹۴۳۴۳ - ۲۶

غزل

نسیمؔ شاہجہاں پوری

حال پوچھا مرا با دیدۂ تر لوگوں نے
خوب ہنس ہنس کے کہا سب سے مگر لوگوں نے

مثلِ پرچشن کئے شام و سحر لوگوں نے
جب سُنی میری تباہی کی خبر لوگوں نے

جب کبھی حال مرا رحم کے قابل دیکھا
پھیر لی دیدہ و دانستہ نظر لوگوں نے

کون کم ظرف ہے خودراز یہ کھل جائیگا
کی مری وضع پہ تنقید اگر لوگوں نے

اپنے عیبوں کو چھپانے کے لئے دُنیا سے
کتنے الزام لگائے مرے سر لوگوں نے

جس نے خودداری و ایماں کا نہ چھوڑا دامن
اُس کو جینے نہ دیا تنگ نظر لوگوں نے

جس کو اک بار بھی دیکھا ہے ترے ساتھ نسیمؔ
اس پہ کیا کیا نہ ڈالے ہیں اثر لوگوں نے

غزل

میکشؔ اجمیری

جان دے کر بھی ہوں وعدے کو نبھانے والا
میں نہیں ساتھ تیرا چھوڑ کر جانے والا

میں اُبھر آیا ہوں چندن کے درختوں کی طرح
خوش ہوا تھا مجھے مٹی میں ملانے والا

اب میرا نام کبھی دل سے ہٹا پائے گا
ریت پر نام مرا لکھ کے مٹانے والا

میں محبت کو بنا رکھا ہے
حسن کا کوئی تو ہو ناز اُٹھانے والا

میری ایجاد ہے ناپختہ ذہن کی آمد
تو ہے انسانی کھلونوں کو بنانے والا

اور بھی قلب کو مایوس کئے دیتا ہے
مجھ کو بربادی کا احساس دلانے والا

ساری دشواریاں ہو جاتی ہیں آساں میکشؔ
شرط بس یہ ہے کہ ہو جان لٹانے والا

غزل

ساجدہ مرزا بمبئی

مجبوریٔ دل اُن کو بلایا نہیں جاتا
جاناں بھی اگر چاہوں تو جایا نہیں جاتا

انساں کو خلافت کا شرف مل تو گیا ہے
یہ بارِ گراں اُس سے اٹھایا نہیں جاتا

دوں ساتھ زمانے کا یہ ممکن نہیں مجھ سے
خودداریٔ فطرت کو دبایا نہیں جاتا

اک شامِ تخیل کا فسانہ ہے غمِ دل
ہنس کر اُسے اے دوست سنایا نہیں جاتا

پوشاک بدلنے سے بدلتا نہیں انساں
آئینے میں صورت کو چھپایا نہیں جاتا

توبہ ارے ناصح مری توبہ ارے توبہ
توبہ کا بھی اب بار اُٹھایا نہیں جاتا

اک طرفہ تماشا ہے مرا ماضیٔ ہستی
بھولی ہوئی باتوں کو بھلایا نہیں جاتا

وہ دیکھ رہے ہیں مجھے میں سوچ رہا ہوں
پھر ساجدہ کیوں اُن کو بلایا نہیں جاتا

غزل

ایم۔ آر قریشی سوزؔ

سرمایۂ حیات ہیں میری غزل کے شعر
محتاجِ التفات ہیں میری غزل کے شعر

اک ربطِ خاص ہے جنہیں فکر و نگاہ سے
وہ روحِ کائنات ہیں میری غزل کے شعر

یہ تم کو دیں گے دعوتِ نظارۂ جمال
حسنِ تخیلات ہیں میری غزل کے شعر

تفسیرِ زیست بھی ہیں یہ تخلیقِ زیست بھی
اک شرحِ کائنات ہیں میری غزل کے شعر

یہ پیار کا تمہیں بھی سلیقہ سکھائیں گے
دل کے معاملات ہیں میری غزل کے شعر

سنئے گا آپ ان میں صدائے شکستِ دل
غم ہائے کائنات ہیں میری غزل کے شعر

اے سوزؔ اہلِ زیست کو معلوم ہی نہیں
گنجینۂ حیات ہیں میری غزل کے شعر

غزل

کوثر ــــــ قزدونی

عزمِ دار و رسن کو پلنے دو
وقت کے ساتھ ہم کو چلنے دو

چاندنی پیار کی نکلنے دو
دل اگر جل رہا ہے جلنے دو

تم بہاروں کی وضع مت چھوڑو
شاہراہوں کو آگ اگلنے دو

اپنی منزل کی سمت بڑھتے رہو
وقت کو کروٹیں بدلنے دو

دل کے آئینے کو جِلا بخشو
زلفِ احساس کو مچلنے دو

ڈھالنا ہے اگر کرنِ خورشید
شمع کو رات بھر پگھلنے دو

اوجِ پرچم کو دیکھ کر کوثرؔ
ہم نشیں جل رہے ہیں جلنے دو

غزل

غیاث الدین غیاثؔ
(جھابوہ) ایم۔ پی

غم نہیں ہے یہ نہیں کیوں دامنِ گلشن چھوڑا
ہے قلق یہ کہ بہاروں میں نشیمن چھوڑا

اس کو احساس ہوا ہوگا تباہی کا مری
ورنہ اس شوخ نے کیوں ہاتھ سے دامن چھوڑا

مڑ کے دیکھا نہ کبھی شاخِ نشیمن کی طرف
میں نے جس روز سے اے دوستو گلشن چھوڑا

چاند پانی میں اتر آیا ہمیں ایسا لگا
رات دریا میں جب اس شوخ نے کنگن چھوڑا

کیا ملا ہم کو زمانے میں کہ غربت کے سوا
جب سے ہم نے تری سرحد کو لئے بچپن چھوڑا

قوم وہ در پئے آزار رہی دنیا میں
باخدا جس نے بھی اخلاق کا دامن چھوڑا

مہرباں مجھ پہ رہی گردشِ دوراں اے غیاثؔ
عمر بھر اس نے کبھی میرا نہ آنگن چھوڑا

غزل

...... ایس۔ ایم۔ عقیلؔ ٹمکوری شموگہ

اک قیامت تھا ڈھل گیا سورج
آج دوزخ اگل گیا سورج

شام ہوتے ہی کوہساروں میں
سر چھپانے نکل گیا سورج

پوچھئے سارے چاند تاروں کو
رفتہ رفتہ نکل گیا سورج

صبح کو شبنمی بدن لے کر
قطرے قطرے میں ڈھل گیا سورج

ابرِ رحمت کے آڑے آتے ہی
گر رہا ہے سنبھل گیا سورج

چاند تاروں کو روشنی دے کر
ظلمتوں سے بہل گیا سورج

مثلِ عارض بنا بوقتِ غروب
رنگ کیسا بدل گیا سورج

عارضِ سرخیٔ شفق سے عقیلؔ
آج مجھ سے بہل گیا سورج

اندرا گاندھی

جناب عبدالرب نشتر
مچھوری (دیرہ دون)

پچھلے چار ماہ سے ہسپتال میں ہوں۔ بستر علالت پر ہی اندرا
جی کے افسوسناک قتل کی خبر سُنی تو فی البدیہہ یہ اشعار آنسوؤں
کے ساتھ ساتھ کاغذ پر نقش ہو گئے۔ (نشتر)

تو غریبوں کی نگہباں تھی اندرا گاندھی
دیش والوں پہ مہرباں تھی اندرا گاندھی
ہم کو مالک کی طرف سے یہ ملا تھا تحفہ
ہم پہ آکاش کا احسان تھی اندرا گاندھی
یاد آئے گی زمانے کو محبت تیری
پیار تھی چاہ تھی ارمان تھی اندرا گاندھی
ذات اور پات کے خانوں میں اسے فٹ نہ کرو
صرف انسان تھی انسان تھی اندرا گاندھی
دشمنوں کے لئے نشتر تھی وہ نشتر جیسی
دوستوں کے لئے قربان تھی اندرا گاندھی

قطعات

سلام ساگری

مرحومہ وزیر اعظم اندرا گاندھی کو خراج عقیدت

دشمنوں پر نگاہ ڈالی | با وفا بن کے اُف جفا کر دی
... ایک عورت کا | بزدلی کی بھی انتہا کر دی

... کو اے اندرا گاندھی | تو نے کتنا بڑا کیا احسان
... اتحاد کی خاطر | ملک پر اپنے ہو گئی قربان

... پست ہوئے | فیل کے سامنے تھے خرگوش
اندرا گاندھی | حوصلہ تیرا شیر نر کی طرح

زبانی جینتی منانے سے حاصل | عمل وہ کرو جس میں ہو کچھ حقیقت
کرو اندرا جی کے آدرش پورے | حقیقت میں یہ ہے خراج عقیدت

کرو قومی یکجہتی دامن بڑھا | اگر تم کو ہے اندرا جی کی چاہت
حکومت کو دیں مل کے ہم تم تعاون | تو ہو ان کے خوابوں کا تعمیر بھارت

بعد مردن ہو گئی ہے تو اکرا تہا سماں | یعنی اب ہے زندگی دائم تری خاتون ہند
دیش پہ قربان ہو کر کس کو کب نصیب | انفرادیت ہوئی قائم تری خاتون ہند

غزل

محمد مبین نغمہ کھام گاوں
(سعودیہ)

کون یہ دل میں بس گیا لوگو | جال میں اپنے کس گیا لوگو
کشت دل میں نہ آئی سرسبزی | ابر آکے برس گیا لوگو
یہ بھی جینے میں کوئی جینا ہے | دل ہنسی کو ترس گیا لوگو
زہر تنہائیوں کا مار گیا | ناگ راتوں کو ڈس گیا لوگو
بے حسی بے وفائی عام ہوئی | جیسے ہاتھوں کا رس گیا لوگو
آنکھ صیاد سے لڑی جب سے | دل سے خوف قفس گیا لوگو
دل نغمہ پہ چھائی غم کی گھٹا | جب کوئی ہم نفس گیا لوگو

غزل

گور نام کھنہ گلشن (لندن)

میں اُسے پاتے ہی تنہا ہو گیا | ڈوب کر دریا میں پیاسا ہو گیا
ترک اُلفت پہ وہ آمادہ ہوئے | رابطہ اُلفت اور گہرا ہو گیا
زندگی کیا اور دے سکتی مجھے | ایک دُکھ تھا جو کہ اپنا ہو گیا
ہمسفر تھا تو تو دلکش تھی حیات | بن ترے میں اک تماشا ہو گیا
جب اُٹھایا ہے مؤرخ نے قلم | ہر ورق میرا ہی چہرہ ہو گیا
جل بجھے حسن رفاقت کے چراغ | پیار کا موسم بھی سپنا ہو گیا
تن بدن میں وحشتوں کا شور ہے | دل کا گلشن ایک صحرا ہو گیا

مجاہدِ افغانستان محافظِ ہندوستان ہے

افغان مجاہدین کی مدد کرنا ہندوستان کی فلاح اور بقا کے لیے انتہائی ضروری ہے

افغان مجاہدین

کی مدد کے لیے نئے سال ۱۹۸۵ء کا تیرہ ۱۳ شیٹ والا رنگین اور مصوّر کیلنڈر دس روپیہ کا منی آرڈر بھجوا کر منگائیے

محصول ڈاک ہمارے ذمہ ہوگا۔

افغان نیوز بلیٹن

کے مستقبل خریداروں کی خدمت میں نئے سال کا یہ تحفہ بالکل مفت پیش کیا جا رہا ہے۔ افغان نیوز بلیٹن کا زرِ سالانہ پچیس روپے بذریعہ منی آرڈر بھجوا کر اس کی مستقل خریداری قبول فرمائیے اور اور یہ تحفہ بالکل حاصل کریں

انجمن افغان دوستان:- ۱۰۔ ج۔ ایم۔ ایل۔ اے کوارٹرز جے پور راجستھان ۳۰۲۰۰۱

SHAN-E-HIND, DELHI

January 198

بلا ٹکٹ

سفر کرنے والا
ایسا شخص ہے
جس کے کوئی
ضمیر نہ ہو!

بھارتی ریلوے آپ کی جائداد ہے۔ بلا ٹکٹ سفر کرنے سے ریلوے کو
جو نقصان ہوتا ہے وہ کروڑوں روپے ہے جبکہ اس نقصان کی رقم سے
ریلوے آپ کو سفر کی بہترین سہولتیں مہیا کر سکتی ہے تاکہ آپ زیادہ آرام سے سفر کر
سکیں بہتر ٹرینیں بنائی جا سکیں جو چیزیں خراب ہو گئی ہیں ان کو بدلا جا سکے۔

اب یہ آپ کا کام ہے کہ آپ اس لعنت کو ختم کرنے میں ہماری مدد کریں۔
......کیونکہ آخرکار اس سے آپ ہی کو فائدہ پہنچے گا۔

نادرن ریلوے

JANUARY 1985 — Phone : 275602 — Regd. No.D-(DN) 370
THE SHAN-E-HIND MONTHLY NEW DELHI-110002 — REGD. No. D-(DN) 353
Regd. with the Registrar of Newspaper at R. No. 644,57

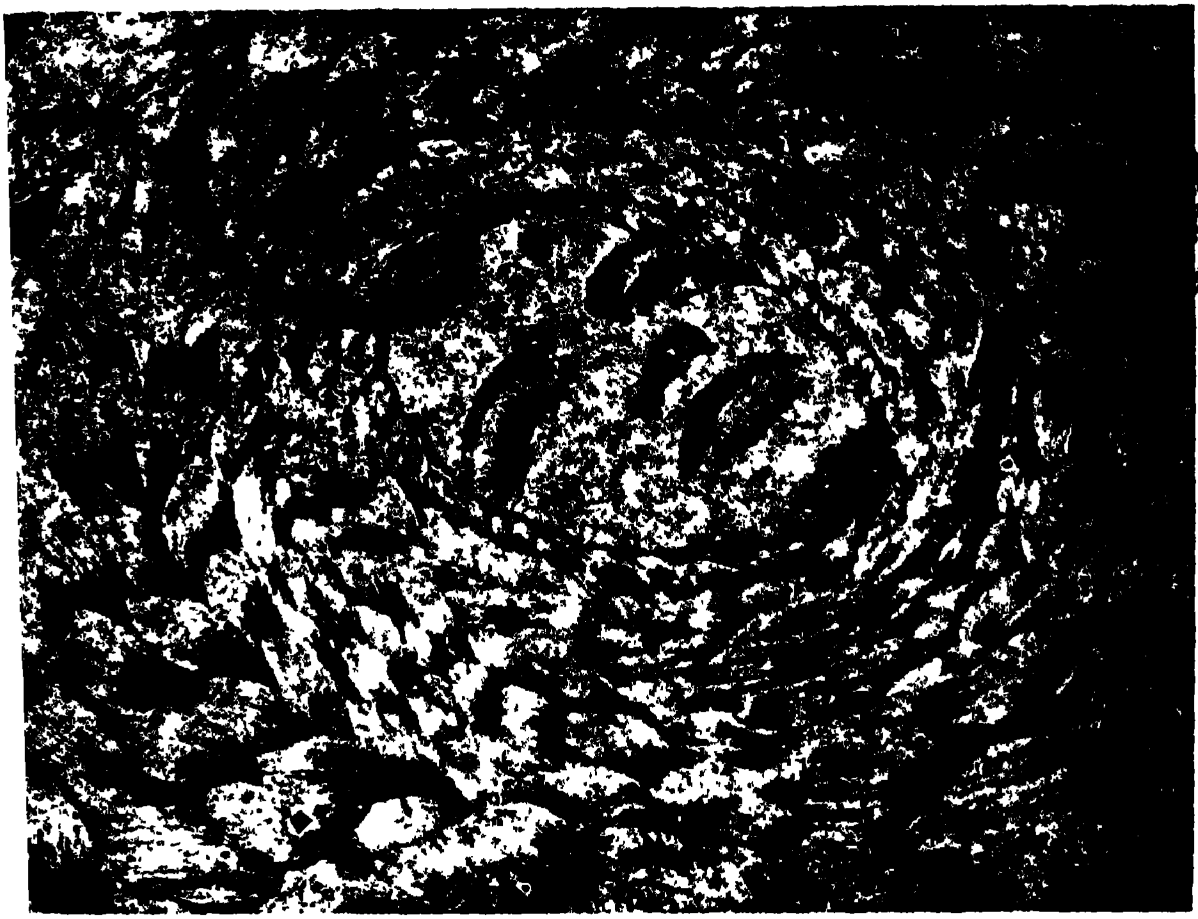

بالوں کا انداز چاہے کوئی بھی ہو لیکن اگر بالوں کی
یہ گھٹائیں ہمیشہ قائم رکھنا چاہیں، انہیں دراز، ملائم اور کالا دیکھنا چاہیں تو زلفی ہیر
ٹانک ہی استعمال کیجئے۔ یہ گرتے بالوں کو روکتا ہے، خشکی دور کرتا ہے اور بالوں کی جڑوں کے نیچے تک
پہنچ کر بالوں کی بیماریوں کو ختم کر دیتا ہے۔ زلفی ہیر ٹانک تیل نہیں بالوں کی غذا ہے۔ سر پر نئے
بال اگانے میں مدد دیتا ہے۔ اپنے بال صابن سے نہ دھویئے۔ یہ بالوں کی جڑوں کو جلا دیتا ہے سر دھونے
کے لئے زلفی پاوڈر استعمال کیجئے جو بالوں کو صاف رکھتا ہے، ان کو ریشم کی طرح ملائم بناتا ہے۔

● شمع لیبارٹریز، لال کنواں، دہلی ●

عرب ممالک میں زلفی حاصل کرنے کے لئے رجوع فرمائیں
مکہ اور مدینہ منورہ میں
ایم۔ ایم۔ ملیباری

متحدہ عرب امارات میں
ملک بیوٹی ایجنسی:
● دبئی (فون نمبر: ٢٢٣٦٥١ ، ٢٢٣٦٥٠)

● دیرہ (فون نمبر: ٢٢٤٤٣٩)
● شارجہ ● ابو ظہبی
دیگر ممالک

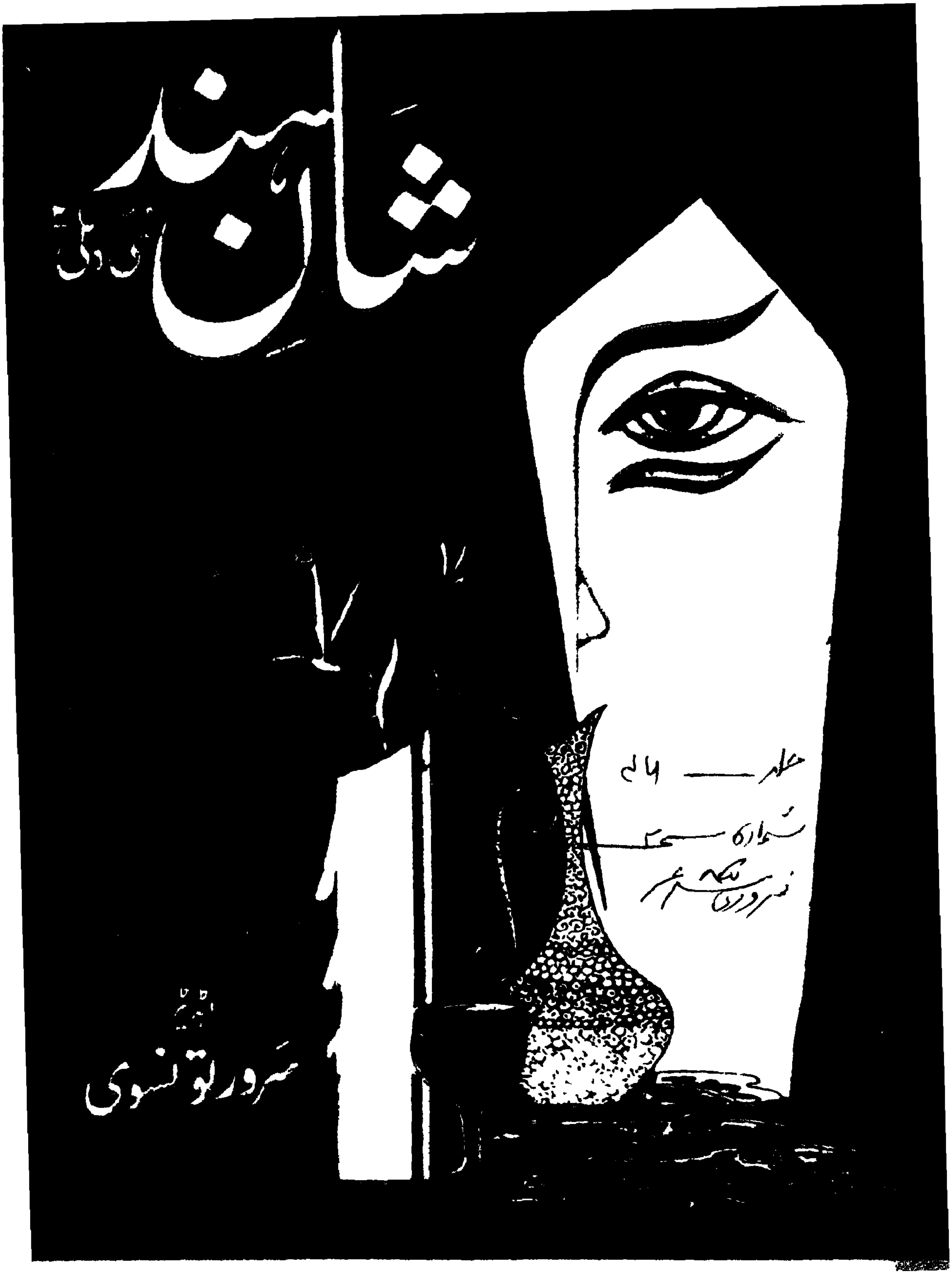
شانِ ہند
نئی دہلی
سرور تونسوی

ٹیلیفون نمبر ۲۷۵۶۰۴۰   رجسٹرڈ نمبر ۳۵۳ (DN) A
رجسٹرار آف نیوز پیپرز آف انڈیا کا رجسٹریشن نمبر ۵۷/۴۴۴۰

ایڈیٹر
سردر تونسوی

ماہنامہ
شانِ ہند
نئی دہلی

قیمت سالانہ
بیس روپے
فی پرچہ
ڈھائی روپے

جلد نمبر ۳۴   فروری ۱۹۸۵ء   شمارہ نمبر ۲

"فغانِ محرومی" تضمین بر اشعارِ اقبال

کندن لال گوہر

کیا بتاؤں تجھ کو کیا گنجِ گراں کھویا ہے
حُسن خود آرا گیا، جب ذوقِ نظارا گیا
عقل کی حکمت گئی، اور عشق کا سودا گیا
شوق بے پروا گیا، فکرِ فلک پیما گیا
تیری محفل میں نہ دیوانے نہ فرزانے رہے

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

اٹھ گئے اہلِ نظر، جلوہ دکھائے گا کسے
تو مسیحا دم سہی، لیکن جلائے گا کسے
جام چشمِ مست سے بیخود بنائے گا کسے
خیر تو ساقی سہی، لیکن پلائے گا کسے
اب نہ وہ میکش رہے باقی نہ میخانے رہے

پرنٹر پبلشر سردر تونسوی نے لیتھو کے صفحات خواجہ پریس پتہ شیخ منگلو جامع مسجد دہلی، اور بلاک کے صفحات پائینیر پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر شانِ ہند خلیف ۸۰ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا

ڈاک گھر بچت بینک میں جمع کرائے گئے 200 روپے

آپ کو 1,00,000 روپے فاضل دلا سکتے ہیں

بچت کی ایک سرکاری اسکیم جو چھوٹے بچت کاروں کو 8.5 فیصد ٹیکس سے مستثنیٰ سود کے علاوہ 50 روپے تا ایک لاکھ روپے کے کسی بھی انعام کا استفادہ بھی پیش کرتی ہے۔

انعامی اسکیم

ڈاک گھر بچت بینک کھاتے میں کم از کم 200 روپے جمع رکھنے سے آپ پبلک ڈرا کے ذریعے نکالے گئے انعام کے مستحق ہو جاتے ہیں۔ ڈرا ہر سال جنوری اور جولائی میں نکالے جاتے ہیں۔ ہر ڈرا کے تقریباً 22 ہزار انعاموں کی کل مالیت لگ بھگ 30 لاکھ روپے ہوتی ہے۔

ڈاک گھر بچت بینک کے تین لاکھ سے بھی زائد کھاتے دار ایسے انعام حاصل کر چکے ہیں۔
آپ اپنے خاندان کے ہر فرد کے نام کھاتا کھلوا کر اپنے انعام جیتنے کے مواقع میں اضافہ کر سکتے ہیں یا آپ چاہیں تو اپنے نام سے جتنے بھی چاہیں کھاتے کھول سکتے ہیں۔

ڈاک گھر بچت بینک میں 10 اپریل تک کھاتہ کھول لیجئے تاکہ آپ جنوری 86ء میں نکالے جانے والے ڈرا میں شامل ہو سکیں۔

قومی بچت ادارہ

بُلبُل چہ گُفت؟ گُل چہ شُنید؟ و صبا چہ کرد

مشاعرہ اندرپرستھ اسٹیڈیم

جشنِ جمہوریت کے سلسلے میں گذشتہ ۳۵ سالوں سے
ـو کا مشاعرہ نیز ہندی کوی سمیلن اور پنجابی کوی دربار لال
میں منعقد ہوتے رہے اور جشنِ جمہوریت کی تقاریب
سلسلے میں ہونے والے اس مشاعرہ کا نام ہی لال قلعہ
شاعرہ مشہور ہوگیا اور ویسے بھی تاریخی طور پر اُردو
اعرہ اور لال قلعہ ایک ایسی تثلیث ہے کہ جسے بادشاہان
رنے بھی برقرار رکھا۔ اور جشنِ جمہوریت کے مشاعرہ
بنا سورگیہ پنڈت جواہر لال نہرو کے عہد میں شروع
ئی اور اس مشاعرہ میں کم و بیش ہر سال وہ تشریف
تے رہے۔ اس کے بعد سورگیہ لال بہادر شاستری
لال قلعہ کے مشاعرہ میں تشریف لائے۔ سورگیہ اندرا
ندھی صاحبہ کی مصروفیات اپنے پیش رو وزرائے اعظم
سے کہیں بڑھ گئی تھیں اس لیے غالباً وہ اس مشاعرہ
میں کبھی تشریف نہ لا سکیں اور ویسے بھی اندرا جی کے
عہد میں مشاعرہ جمہوریت کا معیار منتظمین مشاعرہ کی ذاتی
اغراض کے باعث کم سے کمتر ہوتا گیا مگر اس میں کوئی
شک نہیں کہ لال قلعہ کا مشاعرہ ملک بھر میں ایک معتبر
اور قومی مشاعرہ کی حیثیت سے اپنا ایک مقام رکھتا ہے۔

ہمارے بعض قومی رہنما جو قومی یکجہتی اور سیکولرازم
نام رٹتے رہتے ہیں اُن کے نہاں خانۂ دل میں کہیں
کہیں یہ رمق ضرور رہتی ہے کہ بعض قومی روایات
خصوصاً جن کے ساتھ مسلمانوں کا تعلق ہو انھیں جیسے
بھی ہو مٹایا جائے۔ لہٰذا کچھ سالوں سے لال قلعہ سے
متعلق اس قومی روایت کو مٹانے کی کھچڑی پک رہی
تھی چنانچہ اس کا اظہار ۱۹۸۲ء میں ایشیاڈ کے
بعد صاف کھُل کر کیا جانے لگا اور لال قلعہ مشاعرہ کی
کمیٹی میں یہ تجویز رکھی گئی کہ لال قلعہ کا مشاعرہ جشنِ
جمہوریت اندر پرستھ اسٹیڈیم میں منعقد کیا جائے
مگر بھلا ہو پروفیسر جاوید وششٹ کا اور کچھ ان کے ہم
نواؤں کا کہ یہ تجویز سر سے نہ چڑھ سکی۔

مگر اس سال روزنامہ "قومی آواز" میں یہ خبر شائع
ہوئی کہ جناب گلزار بھارتی نے پریس کانفرنس میں
اعلان فرمایا کہ امسال جشنِ جمہوریت کا مشاعرہ، کوی سمیلن
اور کوی دربار اندر پرستھ اسٹیڈیم میں ہوں گے۔ حیرت ہوتی
کہ اُردو اکاڈمی کی مشاعرہ کمیٹی نے اس سلسلہ میں اپنی آواز
کیوں بلند نہ کی۔ ہو سکتا ہے کہ عوام کی آواز اس فیصلہ
کے خلاف بلند ہوتی مگر قومی آواز میں ہڑتال ہو جانے کی
باعث اُردو پرستوں کی آواز بلند نہ ہو سکی۔ دوسرے
کچھ اُردو اخبارات کو کیا پڑی تھی وہ تو خود اس سے
متفق ہیں کہ ایسی قومی روایات جن کے ساتھ مسلمانوں
کا کچھ بھی تعلق ہو وہ نیست و نابود ہو جائیں۔

اس سلسلے میں ایڈیٹر شانِ ہند نے اُردو اکاڈمی
کے سیکریٹری صاحب سے بات کی تو انھوں نے فرمایا
کہ ہمارے گلزار بھارتی جی اور دہلی انتظامیہ یہ چاہتا ہے
کہ اس مشاعرہ میں عوام کا اتنا بڑا مجمع ہو کر دُنیا کے
ریکارڈ کو حیرت ہو۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ امسال جشنِ جمہوریت
کے مشاعرہ میں جمِ غفیر تھا اور یہ جمِ غفیر اکٹھا کرنے کی
وہی ترکیب کی گئی جس طرح عام طور پر ریلیوں میں
عوام کو جمع کر لیا جاتا ہے۔ مگر اس جمِ غفیر نے مشاعرہ

کی مٹی پلید کرنے میں جو اہم کردار ادا کیا اُس سے حکومت دہلی اور فری کلا سنگ بھارتی یقیناً ناواقف نہیں ہیں۔ اور اگر وہ اپنے آپ کو معصوم سمجھتے ہیں تو پھر ہم اُن کی خدمت میں یہ صاف صاف عرض کر دیں کہ مشاعرہ کی ناکامی کے اسباب حسب ذیل تھے۔

۱۔ مشاعرے کو لال قلعہ سے دربدر کرنے کے خلاف عوام کا احتجاج۔

۲۔ جناب ڈاکٹر صلاح الدین خاں اور جناب انور دہلوی کے ذاتی مخالفوں کی رنجش۔

۳۔ مشاعرے کی نظامت تسلی بخش نہیں تھی۔

۴۔ شعراء کی ترتیب قطعاً غلط تھی۔

۵۔ مشاعرے میں داخلے کے پاسوں کو زیادہ تر نااہلوں کو دیا جاتا۔

۶۔ فری کلا سنگ بھارتی کی انتخابِ شعراء میں مداخلت

اولین پانچ وجوہات کے بارے میں تو کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ رہی پانچویں وجہ تو اس کا کوئی جواب وہ ہے کہ مشاعرہ کمیٹی نے جن شعراء کا انتخاب کیا اُن کے علاوہ متعدد بھرتی کے شعراء مشاعرہ کمیٹی کی اطلاع کے بغیر کہاں سے آ گئے۔

نور جہاں نور حیدر آبادی جو یقیناً شاعرہ نہیں ہے اس ... نے خود مدیر شانِ ہند کو بتایا کہ وہ کلا سنگ بھارتی کے ہاں گئیں اور بھارتی جی انھیں دیکھتے ہی کہنے لگے ارے نور جہاں تو حیدر آباد سے کب آئی اور انھوں نے فوراً فون اٹھایا اور اردو اکیڈمی کے سیکریٹری صاحب کہا کہ نور جہاں نور حیدر آبادی کو خود ہی طرف سے دعوت نامہ دیا جائے۔ اور نور جہاں نور کا یہ اپنا بیان ہے کہ انھیں حیدر آباد کا کرایہ وغیرہ دیا گیا۔ جبکہ وہ آگرہ میں رہتی ہیں اور مولانا انور صابری کی بہو بن چکی ہیں اگر نور جہاں نور کا یہ بیان جو اُس نے مدیر شانِ ہند کو دیا ... ب کی موجودگی میں دیا صحیح ہے تو ہم فری ... سے دریافت کرنے کا حق رکھتے ہیں

کہ انھوں نے ایسی حماقت کیوں کی؟ حماقت کا لفظ سے آپ چونکیے نہیں۔ اسی قبیل ہزار داستان جیسے عرفِ عام میں نور جہاں نور کہا جاتا ہے کے بارے میں اگر بھارتی جی نے کسی بھی مقامی شاعر یا کم از کم کنور مہندر سنگھ بیدی سحر سے ہی دریافت کر لیا ہوتا تو وہ یقیناً یہ حماقت نہ کرتے اور اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر نے جونہی مشاعرے کی سٹیج پر نور صاحبہ کو دیکھا وہ مشاعرے سے اُٹھ کر چلے گئے۔ بیدی صاحب مشاعرہ کمیٹی کے صدر ہیں انھیں حیرت ہوئی کہ اس ننگِ شاعری کو اس معتبر اور ملک گیر شہرت رکھنے والے مشاعرہ میں کیسے مدعو کر لیا گیا۔

ہمیں مشاعرہ کمیٹی سے بھی مخلصانہ شکوہ ہے کہ شاعروں کا انتخاب کرتے وقت محض نام چڑھے شاعروں کو ہی اولیت دی جاتی ہے ملک کے بہترین شعرا کو محض اس لیے نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ اُن کے پاس کوئی ایسا وسیلہ نہیں کہ وہ مشاعرہ کمیٹی کے ارکان یا کلا سنگ بھارتی تک رسائی حاصل کر سکیں۔ ہمیں یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ ایڈیٹر شانِ ہند نے محض ایک شاعر جناب گوہر عثمانی مراد آبادی کے نام نامی کی سفارش کی تھی اور سب نے دیکھ لیا کہ اس کربلائی مشاعرہ میں گوہر عثمانی صاحب پوری غزل سنا سکے اور داد بھی پائی اور نئی دہلی دور درشن نے مشاعرہ کی جو جھلکیاں پیش کیں اُس میں سب سے اولین جگہ گوہر عثمانی صاحب کو دی اور ان کے چھ اشعار پیش کیے گئے جبکہ بڑے بڑے نامور شعراء کا محض ایک ایک یا دو دو اشعار پیش کیے گئے۔ آخر میں ہم اس سال اس مشاعرہ کی بُری طرح ناکامی پر دلی افسوس کرتے ہوئے کلا سنگ بھارتی جی سے کہیں گے کہ وہ اس بھرم کو مٹانے کی کوشش نہ کریں جو مشاعرہ لال قلعہ کے ساتھ منسلک رہی ہے اور اگلے سال سے یہ مشاعرہ پھر لال قلعہ میں ہی منعقد کیا جائے۔ ●●

ابوالفصاحت پنڈت لبھو رام جوش ملسیانی

پدم شری ابوالفصاحت پنڈت لبھو رام جوش ملسیانی [illegible] کو پیدا ہوئے اور ۲۷ جنوری ۱۹۷۶ء کو وفات پا گئے۔ [illegible] جس طرح داغ دہلوی کے سینکڑوں شاگرد تھے۔ اسی طرح اُن کے آخری شاگرد جناب جوش ملسیانی کے بھی سینکڑوں شاگرد ہیں جن میں حضرت [illegible] ایسے [illegible] پاک [illegible] شہرت [illegible] نام بھی شامل ہیں۔

بادۂ سرجوش، جنونِ جوش، فردوسِ گوش، شرحِ دیوانِ غالب، نغمۂ فردوس اُن کی مشہور تصنیفات ہیں ان کے علاوہ جوش صاحب کے شاگردوں کی غزلوں پر اُن کی اصلاح [illegible] بہت [illegible] اصلاحِ سخن [illegible] کی حیثیت رکھتی ہے آزاد ہندوستان کے سب سے پہلے ہوم منسٹر پنڈت گوبند ولبھ پنت کے ہاتھوں ۱۹۵۶ء میں جوش ملسیانی کو ایک ابھینندن گرنتھ پیش کیا گیا۔

جوش ملسیانی کی وفات کے بعد اُن کے فرزند ارجمند جناب عرش ملسیانی نے اُن کے نثری مضامین کا مجموعہ مرتب کر کے کئی سال ہوئے پنجاب گورنمنٹ کو دیا تھا اور اُن کی کلیات بھی ترتیب دے کر بھیجی تھی جن کی اشاعت کی منظوری حکومت پنجاب نے دے دی اور یہ دونوں مسودے پنجاب بھاشا بھاگ پٹیالہ کو چھاپنے کے لیے دے دیے۔

عرش صاحب کی وفات کے بعد اُن کی اہلیہ محترمہ نے پنجاب بھاشا بھاگ پٹیالہ کو بارہا لکھا کہ جب ان دونوں کتابوں کی اشاعت کے لیے حکومت پنجاب کے خزانہ سے منظوری مل چکی ہے تو یہ کتابیں کیوں نہیں شائع کی جا رہی ہیں۔ جناب ساحر ہوشیارپوری خود پٹیالہ اس غرض سے جاتے رہے کہ یہ دونوں یادگار کتابیں پنجاب بھاشا بھاگ جلد سے جلد شائع کرے مگر معلوم ہوا ہے کہ بھاشا بھاگ پٹیالہ نے دونوں مسودے حکومت پنجاب کو واپس کر دیے ہیں کہ اُن کے پاس کتابوں کی اشاعت کا کوئی انتظام نہیں ہے۔

اب جبکہ پنجاب میں راشٹرپتی راج ہے اور ہمارے راشٹرپتی ذاتی طور پر پدم شری ابوالفصاحت پنڈت لبھو رام صاحب جوش ملسیانی سے نہ صرف واقف ہیں بلکہ اُن کی شرافت و انسانیت اور اعلیٰ شاعری کے معترف رہے ہیں، لہٰذا اُن سے مؤدبانہ گزارش ہے کہ حکومت پنجاب [illegible] کو ہدایت کریں کہ حکومت پنجاب اپنا وعدہ پورا کرے۔ اور حکومت پنجاب اگر دونوں کتابوں کی اشاعت کا انتظام کرنے سے قاصر ہے تو حکومت پنجاب ماہنامہ شانِ ہند دہلی کو یہ خدمت سونپ سکتی ہے۔ شانِ ہند پبلی کیشنز اس وقت تک کئی بہترین اور قابلِ قدر کتابیں شائع کر چکی ہیں لہٰذا ہم حکومت پنجاب کی یہ [illegible] بھی حاصل کرنے کی ذمہ داری لیتے ہیں۔

۱۳ جنوری کو جناب ساحر ہوشیارپوری نے اپنے دولت کدہ پر پدم شری ابوالفصاحت پنڈت لبھو رام جوش ملسیانی کے یوم پیدائش کے سلسلے میں ایک نشست کا انتظام کیا جس میں متعدد حضرات نے شرکت فرمائی۔

صفحہ ۳۰ کا بقیہ

"مگر باتیں تو معقول کر رہے تھے"

"وہ کالج نہ پڑھتا ہے"

"اتنے آپ نے کھانے پر روک کیوں نہیں کیا کبھی گا کھلا ملازمت کے بعد گاؤں آیا اور آپ نے اسے کھانے کو پوچھا تک نہیں بارہ بجے تک مجھ کو یہاں بٹھا رہا"

"اچھا تو رات کی اس کی دعوت کر دینا" اور کرشن لال نے ایک مشتبہ نگاہ اپنی ہیرا پر ڈالی باپ کا دل تو ہے قدم قدم پر دھوکا کھتا تو بہات کرشن لال کے دماغ میں پیدا ہوئے ہوں گے کون کہہ سکتا ہے انہوں نے کہا "اب جاؤ مجھے بھی آرام کرنے دو تھوڑی دیر میں آ کر پھر میرا سر دبا دینا"

ہیرا چلی گئی اور کرشن لال ہیرا کی آئندہ زندگی پر غور کرتے ہوئے سو گئے۔

بن جاتا ہے۔ ایک ایسا مرقع جس میں پاکستان کے مختلف مزاج کے ادیب، شاعر، صحافی، نقاد اور ناشر اپنی اپنی جھلک دکھاتے ہیں۔ اُن کی تعداد اتنی ہے کہ تفصیلات نہیں شخصیات میں جانا ممکن بھی نہ تھا اور غالباً وہ ایسے خاکوں کو کتاب میں تبدیل بھی نہ کرنا چاہتا تھا۔ لیکن یہ اس کی محبت ہے کہ اس نے ہر اہلِ قلم کا نام، کام، اور مقام یاد رکھا۔

اس سفرنامے میں رام لعل کی افسانہ نگاری بہت کام آئی ہوگی۔ چنانچہ رام لعل بطور افسانہ نگار افراد اور واقعات کی جزئیات سے جو تاثر آفرینی کرتا ہے اس سے اُس نے یہاں بھی خصوصی کام لیا چنانچہ بعض ادیبوں کے بارے میں اُس نے چند سطروں میں جو تاثرات قلم بند کر دیئے اُن سے اگر اُس کی مفصل تصویر مرتب نہیں ہوتی تو کم از کم اُن کی مکمل فہرست قلم بند کر ڈالی۔ کبھی کبھی تو وہ خاکوں کی صورت تو یقیناً اختیار کر لے جاتے ہیں اور دیکھا جائے تو دن بھر لاتعداد ادیبوں سے ملنا اور پھر اُن سب کی شخصیات کے تاثرات کو محفوظ کرنا آسان کام نہیں یہ رام لعل ہی کا کمال ہے کہ اُس نے اتنا مفصل اور بھرپور سفرنامہ قلم بند کر ڈالا چنانچہ چھوٹی بڑی تفصیلات، اہم اور غیر اہم، معقول اور نامعقول کرتا ہیں ــــ یہ سب مل کر، ایک ایسی موزیک کی صورت اختیار کرتے ہیں جو پاکستان کے ادبی منظر کی تصویر پیش کرتا ہے ایسی تصویر جو رنگین بھی ہے اور دلکش بھی!

جن دنوں "افکار" میں پاکستان کا سفرنامہ چھپ رہا تھا تو میں نے صہبا لکھنوی کو ایک خط (شمارہ اکتوبر ۱۹۸۰ء میں) جو لکھا اس پر اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

"رام لعل چونکہ افسانہ نگار ہیں اس لئے انھوں نے بہت جگہ پر ایک افسانہ نگار کی آنکھ سے کام لیتے ہوئے جزئیات نگاری بھی کی ہے۔ اور چھوٹی چھوٹی تفصیلات کو خوبصورتی سے بیان کیا ہے اور ان سب پر مستزاد لاہور سے رام لعل کی ایسی جذباتی وابستگی! جب وہ اس مکان کو یاد کرتے ہیں، جہاں شادی کے بعد کا پہلا بچہ پیدا ہوئی تو اُن منظروں میں مسرت کی چبھن بھی محسوس کی جا سکتی ہے۔ اسی طرح کتابوں کی دوکان اور قدیم سینما کی عمارات اور اُن میں دکھائی گئیں فلموں کی یادیں بھی جذباتی تلازموں کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اور اس سے ان کے یہاں رہ جانے کی خواہش کونپل کی طرح پھوٹتی محسوس ہوتی ہے۔

آپ نے بعض اہم تحریریں شائع کی ہیں یہ سفرنامہ بھی انھیں میں شمار ہوگا۔"

یہ تاثر چند قسطوں پر مبنی تھا مگر مکمل سفرنامہ پڑھ لینے کے بعد تو میں اس کی اہمیت کا اور بھی قائل ہو چکا ہوں۔

غزل

• ڈاکٹر محمود دیوان (لندن)

عقل و خرد کے پاسباں میری بڑی بھلی سمجھ
یہ عشق ہے کھیل آگ کا اس کو نہ دل لگی سمجھ
اہلِ جہاں کی عقل سے بالا ہے بزمِ عشق کی
پروانے ہی نہیں جلے شمع بھی جل اٹھی سمجھ
خود غرضیاں ہیں دہر میں باعثِ رنج جاں گزیں
اپنی خوشی تو کر چکا میری بھی کچھ خوشی سمجھ
یہ حسن اور عشق تو ہیں کاروبارِ اہلِ دل
میرا شریکِ کار بن، خود کو نہ اجنبی سمجھ
جامِ شکستہ کا ملال ہم سے نہ بار بار کر
شیشے سے کم نہیں ہے دل اس کی بھی نازکی سمجھ
کر کے خود کو بے حجاب میرا بھی دل کیا کباب
ٹھکے نہیں گے سب جناب اس کو بھی تو کبھی سمجھ
واعظ ہوں یا کہ شیخ جی دیوانؔ سے خفا سبھی
اس میں بھی رمز ہے کوئی باتیں نہ بے تکی سمجھ

گوشۂ عقیل صدیقی

دلی اردو اکادمی کا مشاعرۂ شاعرات

سرور تونسوی

دلی اردو اکادمی کی پروگرام کمیٹی کے صدر کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ اردو کو زیادہ سے زیادہ مقبول بنانے اور اس زبان کی اہمیت اور افادیت کا احساس پیدا کرانے کے لیے کئی دلچسپ پروگرام ترتیب دے رہے ہیں لہٰذا اسی سلسلے میں ۲۶ فروری ۸۵ء کو اردو اکادمی دلی کے زیرِ اہتمام ایوانِ غالب میں "خواتین کا مشاعرہ" منعقد ہوا۔

چونکہ ڈاکٹری ہدایات کے مطابق مجھے رات گئے تک جاگنے کی ممانعت ہے اس لیے مشاعرے میرے لیے "شجرِ ممنوع" کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اردو اکادمی کے اسسٹنٹ سیکریٹری جناب عابدی صاحب نے بتایا کہ خواتین کا مشاعرہ ساڑھے پانچ بجے شام شروع ہوگا اور آٹھ بجے تک ختم ہو جائے گا۔ تو میں نے اس خیال سے اس مشاعرے میں شریک ہونے کی دعوت قبول کر لی کہ اندازہ لگایا جا سکے کہ ہماری شاعرات نے پچھلے پندرہ سال میں اردو شاعری کے سلسلے میں کیا ترقی کی ہے۔

کیونکہ گذشتہ پندرہ سال میں میں نے صرف تین یا چار مشاعروں میں ہی شرکت کی جن میں شاعرات کی تعداد بہت ہی کم تھی۔ دوسری وجہ اس مشاعرہ میں شرکت کی محرک یہ ہوئی کہ مدعو شاعرات میں کئی نام ایسے تھے جو میرے لیے بالکل نئے تھے۔ اور تیسری اہم وجہ یہ تھی کہ قارئین شان ہند کا مسلسل مطالبہ رہتا ہے کہ میں حسب سابق کسی نے کسی مشاعرہ کا آنکھوں دیکھا حال لکھتا رہوں کیونکہ "شانِ ہند" کی مقبولیت کی دیگر دو وجوہات "یہ کہتے یار بہ اندازِ محرمانہ گزر گر" اور "کلبل چہ گفت؟ گل چہ شنید صبا چہ کرد" کے علاوہ مشاعروں کا آنکھوں دیکھا اور کانوں سنا حال بھی ایک وجہ ہے

لہٰذا اس "مشاعرۂ شاعرات" کا آنکھوں دیکھا اور کانوں سنا حال لکھنے کی غرض سے "ایوانِ غالب" کی راہ لی۔

سب سے پہلے جناب شریف الحسن نقوی سیکریٹری دلی اردو اکادمی سے ایوانِ غالب آڈیٹوریم کی برآمدے میں ملاقات ہوئی۔ نقوی صاحب نے مختلف زاویوں سے اپنی بھرپور مخالفت و مخاصمت کے باوجود اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کر دیا ہے کہ کسی اردو اکادمی کو کامیابی کی منازل سے ہمکنار کرنا ہو تو کس طرح محنت اور دیانت داری کے ساتھ ساتھ مرنجان مرنج پالیسی اختیار کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ مجھ ایسے آتش زیر پا کو بھی انھوں نے اپنے اخلاق، شرافت و نجابت، حلیمی و انکساری کے ساتھ اپنی کارکردگی کی تفصیل پورے ثبوت کے ساتھ بتا کر قائل کر دیا کہ انھوں نے نہ تو جشن جیجن کے لیے اکادمی سے روپیہ دیا اور نہ ہی اکادمی نے روپیہ کو وہ کسی فضول خرچی میں صرف کرتے ہیں ہر شعبہ کی ایک کمیٹی مقرر ہے وہ کمیٹی جو کچھ منظور کرتی ہے وہ اس پر لفٹننٹ گورنر کی منظوری کے بعد

عمل درآمد کرتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ دفتر شانِ ہند میں کئی شکایات اُردو اکاڈمی دہلی کے بارے میں عام معززین اور سرکاری کارندوں کی طرف سے برائے اشاعت موصول ہوئیں مگر ایڈیٹر شانِ ہند نے ان جملہ شکایات پر جب بھی نقوی صاحب سے بات چیت کی تو انھوں نے پورے ثبوت کے ساتھ ہر اعتراض کو جھٹلا دیا۔ عوام کو شکایت تھی کہ مجتبےٰ خان مالک ایجوکیشنل بک ہاؤس کو جو کہ فوٹوگرافی کا بھی کام کرتے ہیں اکاڈمی کی ہر تقریب کی تصاویر کے لیے بلایا جاتا ہے۔ اب فلاعلی ایسے چابک دست فوٹوگرافر اور دیگر فوٹوگرافرز ان تقاریب کی تصاویر لیتے ہیں جو تصویر اچھی ہوتی ہے وہی حاصل کر لی جاتی ہے۔ اور نقوی صاحب نے یہ بھی یقین دلایا کہ ایجوکیشنل بک ہاؤس سے کتابوں کی خریداری میں بھی کوئی رعایت نہیں برتی جاتی کی بلکہ اُسے بھی دوسرے بک سیلرز اور پبلشرز کے مطابق [illegible] رسد کی ہی آرڈر ملے گا۔

[illegible] ہوا تو دوسری صف میں جناب ساقی صاحب کو بیٹھے دیکھا لہٰذا اُن کے قریب ہی نشست حاصل کر لی مگر کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ نے ہم دونوں کو صف اوّل میں لا بٹھایا کہتے ہیں کہ جیسے نبی عورت نہیں ہو سکتی اُسی طرح عورت شاعر نہیں ہو سکتی۔

میں ذاتی طور پر اس قول کا قائل نہیں ہوں۔ مرحوم علامہ عشق آبادی فرمایا کرتے تھے۔ تھے سرورؔ صاحب میری نظر سے کوئی عورت ایسی نہیں گذری جسے میں شاعر کہہ سکوں۔ میں نے محترمہ ممتاز مرزا صاحبہ کو ایک روز اپنے غریب خانہ پر تشریف لانے کی استدعا کی اور علامہ عشق آبادی کو بھی بُلا لیا جب انھوں نے ممتاز مرزا سے کلام سُنا تو فرمانے لگے سرورؔ صاحب ممتاز واقعی شاعر ہے چونکہ مشاعرہ وقت پر شروع نہ ہو سکا اس لیے مندرجہ بالا سطور میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے یوں سمجھیے کہ آپ بھی اسے پڑھ کر ہماری طرح انتظار کا وقت آسانی سے

کاٹ سکیں گے مہمان خصوصی محترمہ سعیدہ خورشید صاحبہ تشریف نہیں لا سکیں لہٰذا چھ بج کر پانچ منٹ پر جناب نقوی صاحب مائیک پر کہہ رہے ہیں کہ اس مشاعرۂ خواتین کی صدارت انجمن ترقی اُردو ہند دہلی شاخ کی جنرل سیکریٹری محترمہ بیگم حمیدہ سلطان صاحبہ فرمائیں گی سامعین نے اس اعلان کی طویل تالیوں سے تائید کی ہے اور بیگم حمیدہ سلطان صاحبہ نے اسٹیج پر مسندِ صدارت سنبھال لی ہے مدعو شاعرات اور اردو اکاڈمی کی ممبر خواتین بھی اسٹیج پر تشریف فرما ہو گئی ہیں۔ نقوی صاحب نے اعلان کیا ہے کہ اس مشاعرہ کی نظامت محترمہ جمیلہ گپتا فرما رہی ہیں اور مشاعرہ کا افتتاح محترمہ کانتا اگروال شبنمؔ صاحبہ فرمائیں گی ڈاکٹر رضیہ نے صدرِ مشاعرہ کو اور یاسمین نے محترمہ شبنم صاحبہ کو [illegible] اُردو اکاڈمی [illegible] جناب کنور مہندر سنگھ [illegible] اسٹیج پر تشریف لائے۔ اور فرمایا کہ اُردو اکاڈمی [illegible] کے لیے ہم قدم اُٹھا رہی ہے ہم نے اس سلسلہ میں کئی دلچسپ پروگراموں کا خاکہ تیار کر رکھا ہے ایک تمثیلی مشاعرہ بھی کرانے کی تجویز زیرِ غور ہے [illegible] اگر میں آپ اور شاعرات کے درمیان [illegible] نقوی صاحب اور دیگر ممبران [illegible] شکریہ ادا کرتا ہوں جن کے بھرپور تعاون سے [illegible] اکاڈمی اچھے پروگرام پیش کرتی ہے۔ صدارتی خطبہ ارشاد فرمانے کے لیے نقوی صاحب محترمہ بیگم حمیدہ سلطان صاحبہ سے گذارش کی ہے محترمہ فرما رہی ہیں کہ مجھے تو اس مشاعرہ کی صدارت کیلیے یونہی پکڑ لیا گیا ہے۔ میں لکھنا ہی جانتی ہوں بولنے کا شعور نہیں رکھتی۔ میں یہ ضرور چاہتی ہوں کہ جیسے خواتین نے افسانہ نگاری میں اپنا مقام بنا لیا ہے بلکہ مردوں سے اس زمرہ میں بہت آگے ہیں شاعری کے سلسلے میں بھی خواتین ایسا ہی نام پیدا کریں۔

اس کے بعد نقوی صاحب نے محترمہ کانتا اگروال شبنمؔ

سے مشاعرہ کا افتتاح کرنے کی درخواست کی ہے شبنم صاحبہ نے مختصر الفاظ میں یہ یقین دلاتے ہوئے کہ ہم خواتین شاعری کے سلسلے میں آگے آنے کی کوشش کر رہی ہیں مشاعرہ کا افتتاح کرتے ہوئے جمیلہ بیگم صاحبہ سے مشاعرہ کی کارروائی شروع کرنے کو کہا ہے۔

محترمہ جمیلہ مناسب الفاظ میں سامعین سے مخاطب ہونے کے بعد مشاعرے کی کارروائی کشمیر سے تشریف لانے والی شاعرہ رُخسانہ جبین صاحبہ سے شروع کر رہی ہیں۔ رُخسانہ جبین ایک قطعہ کے بعد تحت میں غزل ارشاد فرما رہی ہیں ؎

بہت تباہ کیا اب ذرا سنبھال ہوا۔
کہ تیرے قہر سے ہو گئی میں نڈھال ہوا
انھوں نے بھی دے تہہِ آسیری بستی ہے
مجھے نہ سطحِ سمندر پہ یوں اُچھال ہوا
اسے بھی تو نے زمیں بوس کر دیا آخر
یہی تو ایک عمارت تھی بے مثال ہوا

داد ہے کہ سری نگر تک سُنائی دے رہی ہوگی۔ سنیے محترمہ کیا فرما رہی ہیں ؎

وہ ایک لمحہ امانت تھا اب تو لوٹا دے
سپرد تیرے کیا تھا جو پچھلے سال ہوا

اچھا شعر پڑھنے کا انداز شاعرانہ اور اُس پر حسنِ کشمیر اس شاعرہ نے داد کو شورِ قیامت میں تبدیل کر دیا ہے رُخسانہ جبیں غزل کے ایک ایک شعر پر داد پانے کے بعد اپنی جگہ تشریف لے گئیں تو میں نے کنور صاحب سے گزارش کی ایسی شاعرہ کو لال قلعہ کے مشاعرہ میں مدعو کرنا چاہیے اور انھوں نے اس تجویز کو پسند فرمایا۔

اب اعلان ہوا ہے کہ محترمہ شبانہ نذیر مائیک پر تشریف لا رہی ہیں۔ شبانہ نے ایک مختصر سی نظم "دعا" سنانے اور اس پر بہت اچھی داد پانے کے بعد غزل شروع کی ہے فرما رہی ہیں ؎

چمن کو پھول وطن کو نئی بہار ملے
ہمیں بھی دامنِ صد چاک و تار تار ملے
یہی ہے آمدِ فصلِ بہار کا حاصل
تمام پھول گلستاں میں دل فگار ملے
جنھیں غرور تھا دنیا میں کج کلاہی کا
فرازِ دار پہ ہم کو وہ تاجدار ملے

بیٹی شبانہ اپنے والدِ محترم جناب رفعت سروش سے اچھے شعر کہنے لگی ہے۔ یہ مقطع سنیے ؎

شبانہ ہم بھی دکھائیں کمالِ شعر اگر
زبانِ اردو کو ماحول سازگار ملے

شبانہ نذیر بہت اچھی داد پانے کے بعد مائیک سے الگ ہو گئیں۔ تو جمیلہ صاحبہ نے اورنگ آباد کی شاہین شہزاد کو دعوتِ سخن دی ہے۔ شاہین صاحبہ دتی کلاتھ ملز کے مشاعرہ اور اسی ایوانِ غالب کے ایک مشاعرہ میں دھوم مچا چکی ہیں۔ سنیے لحنِ داؤدی آپ کی قوتِ سامعہ میں اضافہ کر رہی ہے ؎

چند یادوں کے سوا پاس اپنے کیا رہ جائے گا
ڈوبتی آہوں کا باقی سلسلہ رہ جائے گا
جانے کیوں رہ رہ کے دل میں گونجتی ہے اک صدا
قافلے چل دیں گے اک دن راستہ رہ جائے گا

داد اس شعر اور ترنم کا حق ہے۔ اور ایوانِ غالب داد سے گونج رہا ہے اکثر نوعمر اور ادھیڑ عمر شاعرات بن سنور کر اور اپنے چہروں پہ میک اپ کی تہیں جما کر آتی ہیں کہ جیسے وہ مشاعرے میں نہیں کسی فیشن شو میں شریک ہونے آئی ہیں مگر شاہین مہاراشٹر کے نسوانی رکھ رکھاؤ اور وقار کی ضامن بنی ہوئی ہیں کیا مجال ہے کہ سر سے پلو سرکنے دیں۔ سنیے نسوانی وقار کی امین شاہین کیا آفت ڈھا رہی ہیں نغمہ سرا ہیں ؎

چاہتا یہ کون ہے لیکن یہ ہوگا ایک دن
عکس کھو جائیں گے سارے آئینہ رہ جائے گا

اچھا شعر، ترنم لاجواب اور سا[illegible] بہ مشاعرہ [illegible]

دجہاں ہوا۔ ہے کہ بس کچھ نہ پوچھیے داد کا شور کم ہوا تو شاہین نے سامعین کو آہ اور واہ کا ورد کرنے کے لیے یوں مجبور کر دیا ہے

رات اپنے ساتھ افسانے کئی لے آئیگی
اور سحر تک کوئی تنہا جاگتا رہ جائیگا

داد پھر اس شعر کا حق ادا کرنے پر مجبور ہو گئی ہے۔ اور میں اپنے پاس تشریف فرما کنور صاحب سے کہہ رہا ہوں کہ لال قلعہ کے مشاعرہ میں مدعو کیا جاتا شاہین کا حق ہے شاہین کافی حد تک مشاعرہ لوٹ کر اپنی جگہ تشریف لے گئیں تو جمیلہ صاحبہ نے بڑے رکھ رکھاؤ والے انداز میں اعلان کیا کہ اب صبیحہ خان کلام سنائیں گی۔ ایک آواز آئی ہے کہ شاعرہ کا تعارف پورا کیا جائے۔ جمیلہ کہنے لگیں آپ گھر کے بھیدی معلوم ہوتے ہیں۔ صبیحہ میری بیٹی ہے اور علیگڑھ یونیورسٹی میں زیر تعلیم ہونے کے باعث اس میں یہ شعور آیا ہے ماں تو خاک چھانتی رہی مگر بیٹی دنیائے شاعری میں نام کرے گی۔ سنیئے تحت میں صبیحہ قطعہ فرما رہی ہیں ؎

نونہالانِ چمن تم پہ چمن ناز کرے
اپنی خوشبو سے گلستاں کو معطر کر دو
مشعلِ راہ بنو ہر نئی منزل کے لیے
آج ہر راہگزر رحمت کے منور کر دو

ایک قطعہ اور سنانے کے بعد صبیحہ نے ترنم سے غزل شروع کی ہے ؎

اس بستی میں آئے نغمات لیے
باہر نکلیں جانے کیا حالات لیے
شعر کی دنیا عشق و جنوں کی دنیا ہے
ہم بھلا آ پہنچے دل میں جذبات لیے
تم آتے تو پھر دل ہلکا کر لیتے
ہم بیٹھے ہیں آنکھوں میں برسات لیے

داد مناسب اور شاعرانہ انداز سے ملی ہے اور صبیحہ فرما رہی ہیں ؎

چھوٹی موٹی چار کتابیں پڑھ کر ہم
آئے ہیں کچھ لفظوں کی سوغات لیے
آ جاؤ تو اس کا مان بھی رہ جائے
رات کھڑی ہے تاروں کی بارات لیے

اس شعر پر داد تو ملی مگر رات کھڑی ہے ذرا اکھڑتا ہے۔ جمیلہ صاحبہ فرما رہی ہیں کہ میرے لیے تو یہ بھی مشکل ہے کہ میں اس کے اچھے شعر پر بھی داد نہیں دے سکتی کنور صاحب فرمانے لگے آخر کسی ماں کی بیٹی ہے"

اب محترمہ ڈاکٹر ذکیہ انجم صاحبہ صدر شعبۂ اردو ماتا سندری کالج نئی دہلی مائیک پر تشریف لائی ہیں اور تحت میں غزل سرا ہیں ؎

دل سے یادوں کی خواہشوں کو مٹائے نہ بنے
یہ وہ قصہ ہے کسی طور بھلائے نہ بنے
سارے ماحول پہ رنجش کا دھواں چھایا ہے
زخم کس کس نے دیئے ہیں یہ بتائے نہ بنے
گھر درے فن کے پسِ پردہ چلے خوش فہمی
ایسے ماحول کے نزدیک تو جائے نہ بنے
لوگ لفظوں کی قبا پہنے ہوئے خوش ہیں مگر
ذہن کا راز چھپائیں تو چھپائے نہ بنے
دل میں شیشوں کی صدائیں ہیں مقید جیسے
نغمہ و ساز سے کچھ ربط بڑھائے نہ بنے
راہِ ہستی ہے بڑی سخت مگر اے انجم
وہ نشاں چھوڑ کہ دنیا سے مٹائے نہ بنے

ڈاکٹر ذکیہ انجم مناسب داد پانے کے بعد اپنی جگہ تشریف لے گئیں تو جمیلہ صاحبہ نے پدم شری محترمہ ممتاز مرزا صاحبہ سے کلام عطا فرمانے کی استدعا کی ہے۔ سنیئے۔ ممتاز صاحبہ ترنم سے غزل عطا فرما رہی ہیں ؎

شامِ فراق بزم سجانے کو آ گئی
پھولوں کی یاد صبح جلانے کو آ گئی
اُن کے بغیر پھول کھلاتی تو کیا نسیم
اکثر چمن میں آگ لگانے کو آ گئی

دشتِ طلب میں دل پہ جو گزری نہ پوچھیے
ٹھنڈی ہوا کبھی نیند دلانے کو آگئی
جب بھی کیا ہے جشنِ چراغاں بہار نے
بادِ خزاں چراغ بجھانے کو آگئی

داد ہے کہ ایوانِ غالب بھی نازاں ہے کہ آج ہماری شاعرات ہند و پاک کے صفِ اوّل کے شعراء کرام سے کسی طرح بھی کم نہیں ہیں۔ خود صدر صاحبہ کے چہرے سے عیاں ہے کہ شروع میں جو کچھ انھوں نے فرمایا تھا آج کے مشاعرہ کی اکثر شاعرات نے اُسے جھٹلا کر رکھ دیا ہے سنیئے ممتاز صاحبہ کس قدر بہترین شعر عطا فرما رہی ہیں ؎

اُٹھ کر تمھارے در سے بھٹکتے کہاں کہاں
اچھا ہوا کہ موت بُلانے کو آگئی

داد ہے کہ اپنا حق وصول کر رہی ہے اور ممتاز صاحبہ کا مقطع بھی سماعت فرما لیجیے ؎

ممتازؔ بزمِ شعر کہاں اور میں کہاں
اک غم کی داستان سُنانے کو آگئی

ممتازؔ صاحبہ داد و ستائش سے لدی پھندی اپنی جگہ جانے لگیں تو سامعین نے پُر زور مطالبہ کیا ہے کہ ایک غزل اور مرحمت فرمائیں چنانچہ محترمہ ممتاز صاحبہ نے ایک دوسری غزل کے تین چار بہت اچھے اشعار سنا کر حسبِ سابق داد پاتے ہوئے اجازت چاہی ہے اور اب مائیک پر تشریف لائی ہیں محترمہ ساحرہؔ قزلباش اور آپ نے راگ پہاڑی میں غزل شروع کی ہے ؎

چاہے اک شب کی ہو دلکشی چراغوں کی
پھر بھی خوبصورت ہے زندگی چراغوں کی
آپ نے تو دیکھا ہے صبح کا حسیں منظر
آپ نے نہیں دیکھی بے بسی چراغوں کی
ہم جلا کے اُٹھیں گے مشعلِ دلِ ویراں اب
کھو گئی اندھیروں میں روشنی چراغوں کی
بستیوں کی تاریکی اب بھی بین کرتی ہے
کون بھول سکتا ہے دوستی چراغوں کی

ساحرہؔ اور اُن کے شوہر نامدار امیر آغا قزلباش دونوں کے لیے داد ودیعت ہو چکی ہے۔ لہٰذا داد ساحرہ نے آج بھی خوب حاصل کی ہے اب اعلان ہوا ہے کہ جناب بسمل سعیدی صاحب ٹونکی مرحوم کی صاحبزادی ڈاکٹر اسماء سعیدی صاحبہ کلام عنایت فرما رہی ہیں سنیئے ارشاد ہوا ہے ؎

کب حسن کی اداؤں میں وہ دلبری رہی
وہ دلبری رہی ہے نہ وہ دل دہی رہی
جس میں خوشی نہ ہو وہ کیا زندگی رہی
روشن نجوم و ماہ رہے روشنی رہی
جب تک ترا خیال رہا چاندنی رہی
ذکرِ زمانہ کیا زمانے میں کیا رہا
انساں میں جب نہ اُنسیتِ باہمی رہی
بسملؔ سے رہبر تو میسر نہیں رہے
حاصل مگر اُنہی کی ہمیں رہبری رہی
دل کے اُفق پہ چھائی ہے جب بھی قنوطیت
اُمید کی کرن وہیں کچھ ٹمٹما رہی

ڈاکٹر اسماء سعیدی صاحبہ کے کلام میں اپنے والدِ محترم کا رنگ نمایاں ہے مگر جس مشکل زمین میں انھوں نے یہ غزل کہی ہے وہ اس کی نشاندہی کر رہی ہے کہ خواتین شاعری کے میدان میں اب مردوں سے آگے نکلنے کی کوشش میں ہیں۔ اب مائیک پر تشریف لائی ہیں محترمہ مسعودہ حیات صاحبہ ایک قطعہ کے بعد غزل اپنے روایتی ترنم میں شروع کی ہے ؎

ہوتا ہے مہرباں جو ستمگر کبھی کبھی
لگتا ہے اور تیر سا نشتر کبھی کبھی
اک اک ترے خیال سے وہ پھول کھل اُٹھے
[illegible] جو مجھ پہ نیند میں پتھر کبھی کبھی
پاتا ہے منزلوں کو تو تنہا چلے چلو
راہوں میں لوٹ لیتے ہیں رہبر کبھی کبھی

داد اس شعر پر بہت اچھی دی گئی ہے اور سامعین نے

(۳) شعر کو دو بارہ پڑھوایا ہے دیکھئے مسودہ حیات صاحب کیا عجیب و غریب شعر فرما رہی ہیں ؎

جو چھید ہوئے تھے اہنسا کے نام پر
دیکھے ہیں اُن کے ہاتھ میں خنجر کبھی کبھی

داد پھر اپنے نقطۂ عروج پر ہے اور حیات صاحبہ کس قدر حقیقتِ حال بیان فرما رہی ہیں ؎

گہرے سمندروں کی جو تہہ تک پہنچ گئے
موجوں میں بہہ گئے وہ شناور کبھی کبھی

داد سے کہ حیات صاحبہ کو ملک کی صفِ اول شاعرہ تسلیم کرنے کا اعلان کر رہی ہے اور محترمہ یوں نغمہ زا ہیں ؎

یک سر بدل گئی ہے محبت کی ہر روش
دیکھو حصارِ غم سے بھی باہر کبھی کبھی
ہم کر سکیں نہ جن کا تصور بھی اے حیات
دیکھے ہیں وہ نگاہ نے منظر کبھی کبھی

حیات صاحبہ داد سے جھولیاں بھر کر اپنی جگہ پر تشریف لائیں، تو جمیلہ صاحبہ فرمانے لگیں کہ صاحب صدر (صدر صاحبہ کو کہنا چاہئے تھا) کی فرمائش ہے کہ اب میں کلام سناؤں [illegible] اس وقت [illegible] غزل سنا رہی ہیں جبکہ سامعین کی بیشتر تعداد [illegible] میں بھی نہیں آئی تھی۔ ارشاد ہوا ہے ؎

اک خلش سی ذہن و دل کو [illegible] دن تڑپائے ہے
راستوں کی بھیڑ میں جب زندگی کھو جائے ہے
[illegible] تو رک [illegible] جائے ہے
جب مرا ماضی مجھے اس حال میں یاد آئے ہے
راستوں کی گرد سے منزل کا اندازہ نہ کر
میرا ذوقِ جستجو ہر گام یہی سمجھائے ہے
ہم سے سادہ دل لٹا دیتے ہیں ساری کائنات
جب کوئی دزدیدہ نظروں سے کرم فرمائے ہیں

داد تو خیر [illegible] شعر پر [illegible] قدرتی امر ہے لیکن جس [illegible] انداز میں جمیلہ نے یہ شعر پڑھا ہے

وہ داد میں اضافہ کا موجب ہوا ہے۔ جمیلہ صاحبہ مقطع ارشاد فرما رہی ہیں ؎

تو جمیلہ اک تدفین ہے [illegible] کتاب دہر کا
تیرے دم سے [illegible] ہا نگ منزل آئے ہے

اب محترمہ کا نام [illegible] صاحبہ شبنم مائک پر تشریف لائی ہیں۔ دو قطعات نحت [illegible] سنانے کے بعد غزل ترنم سے سنا رہی ہیں ارشاد ہوتا ہے ؎

جنوں کی جرأت و ظلمت کا احترام کرو
کسی کی لغزشِ پا ہو ہمارے نام کرو
بجھا بجھا سا چراغِ حیات ہو کہ [illegible]
یہ نا تمام نشاط [illegible] تمام
خیالِ گردشِ ایام سے [illegible]
ہر ایک لمحے کو [illegible] دورِ جام کرو
دلوں سے [illegible] بیگانگی مٹا ڈالو
اک ایسی شمع [illegible] فروزاں کا اہتمام کرو
[illegible] سے کوئی سوئے حرم میکدہ چلا آیا
جناب شیخ ہیں [illegible] سلام کرو

شبنم صاحبہ [illegible] داد پانے کے بعد جمیلہ صاحبہ [illegible] رسمی سے تعارف کے بعد محترمہ رفیعہ شبنم عابدی سے کلام سنانے کی درخواست کی [illegible] اور پورے [illegible] وقار سے رفیعہ شبنم عابدی آئیں تو بڑے ہی بڑے تیکھے اور چبھتے ہوئے انداز میں کہنے لگیں، سرزمین دلی کے ادب نواز سامعین [illegible] مسکراتے [illegible] اور شوخ [illegible] آوازوں اور [illegible] کو فردوس البلاد [illegible] شاعرہ کے کلام پر اپنی [illegible] کے ساتھ [illegible] ہوس کا اظہار کافی حد تک بازاری انداز میں کر رہے تھے رفیعہ شبنم [illegible] سے بالکل خاموش ہو گئے ہیں اور رفیعہ شبنم نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے ان نااہلوں اور غیر مہذب ٹولے کو بڑے ہی طنزیہ اور ادبی

اعلانات یوں پیش کر رہا ہوں۔۔

"سب سے پہلے میں ادارہ دلی اردو اکادمی کو مبارکباد دینے والوں کا خواہاں ہوں۔ خصوصی طور پر شاعرات کی تعداد [illegible] ورنہ اردو شاعری کا یہ المیہ رہا ہے کہ ایک مدت تک عورتیں ریختہ کہتی رہیں اور مرد ریختی۔ آج کا یہ مشاعرہ اس [illegible] شعری رویے کے خلاف ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے۔ جسے ہم اور آپ دونوں نے قبول کیا ہے۔ ہم نے منظر میں رہ کر اور آپ نے پس منظر [illegible] کیونکہ آج اظہار کی گردن پر [illegible] اور سماعت کی آنکھوں پر قدامت پرستی کی [illegible] اس امید پر اپنا کلام [illegible] کی نذر کر رہی ہوں۔"

رفیعہ شبنم [illegible] کی مختصر سی تمہید نے مشاعرے میں جان پیدا کر دی ہے [illegible] نہیں اور ریختی اور ریختہ کے لغوی معنوں [illegible] حضرات نے جی بھر کر شبنم صاحبہ کو داد دی ہے اور وہ گروہ جو ہر مشاعرہ پر پھبتی کسنے کے لیے گھروں سے ہی تیار ہو کر آیا تھا بقول "بولتی بند ہو گئی" کے مصداق یہ سوچ رہا ہے کہ انھیں بھی کسی عورت نے ہی جنم دیا تھا۔

سنئے رفیعہ شبنم ایک آزادانہ نظم "آخری خواہش" سنا رہی ہیں آپ بھی سنیے اور اگر آپ کا دل داد دینے پر مجبور ہو جائے تو پھر آپ بھی اس داد میں شامل ہو جائیے جو ایوانِ غالب کو میدانِ حشر بنائے ہوئے ہے۔

آخری خواہش

سینکڑوں بار یہی دل میں خیال آیا ہے
میں تری راہ [illegible] بن کے [illegible] تھی
تیری آنکھوں کے سمندر سے گزر سکتی تھی
تیری رگ رگ میں لہو بن کے اتر سکتی تھی
یہ دل [illegible] طبیعت نے مگر [illegible] نے [illegible] دیا
اور اب سوچتی ہوں
کاش! ہو جائے یونہی
تیری راہ کا کانٹا بن جاؤں
اور جب تو کسی رنگین تصور میں مگن بے خیالی میں
مجھے روند کے آگے بڑھ جائے
تیرے [illegible] چبھوں
تیرے لہو میں مل جاؤں

نظم نے وہ داد پائی ہے کہ غزل بھی منہ دیکھتی رہ گئی۔ اب رفیعہ شبنم [illegible] غزل کے اشعار سنا کر [illegible] ڈھا رہی ہیں فرماتی ہیں ؎

رات [illegible] کو لفظوں میں دبائے رکھا
میز پر تیری کتابوں کو سجائے رکھا
تو نے اک شام جو آنے کا کیا تھا وعدہ
میں نے دن رات چراغوں کو جلائے رکھا
کس سلیقے سے خیالوں کو زباں دے دے کر
مجھ کو اس شخص نے باتوں میں لگائے رکھا
شاید آ جائے کسی روز وہ سجدہ کرنے
اسی امید پہ آنچل کو بچھائے رکھا
چوڑیاں [illegible] نمازوں کا بھرم
پھر بھی ہاتھوں کو دعا میں اٹھائے رکھا
جانے کیوں آ گئی پھر یاد اسی موسم کی
جس نے شبنم کو ہواؤں سے بچائے رکھا

داد کا یہ عالم ہے کہ ہر سامع کہہ رہا ہے کہ اس مشاعرہ میں رفیعہ شبنم حاصلِ مشاعرہ رہی ہیں کنور صاحب از خود فرما رہے ہیں کہ [illegible] صاحب! شبنم صاحبہ کو اب کی بار لال قلعہ کے مشاعرہ میں ضرور مدعو کیا جائیگا سامعین کے اصرارِ طویل پر شبنم صاحبہ دوسری غزل عطا فرما رہی ہیں ؎

ہر لمحہ اضطراب رہا بے کلی رہی
اس زندگی میں کوئی ایسی کمی رہی

شہنائیوں کی گونج میں وہ کھو گیا کہیں
ماتھے پہ میرے اُس کی بندیا سجی رہی
کہنے کو یوں تو ایک اکیلا درخت تھا
کتنی رُتوں سے اُس کی مگر دوستی رہی
آخر مرے خلوص میں تھی کونسی کمی
وہ جا چکا تھا اور میں یہ سوچتی رہی
مجبوریاں، خموشیاں اور نارسائیاں
ان برف کی سلوں میں تمنا دبی رہی
موجوں کے تیز ہونے پہ وہ چیختا رہا
خود اُس کے بھی مزاج میں تیزی نئی رہی

رفیعہ شبنم عابدی آپ کے دلوں پر ایک نا مٹنے والا نقش چھوڑ گئی ہیں اور داد سے لدی پھندی تالیوں کی طویل جھنکار میں اپنی جگہ تشریف لے گئیں تو جمیلہ صاحبہ نے محترمہ بیگم ذکیہ سلطانہ نیر سے کلام عطا فرمانے کی درخواست کی ہے۔ محترمہ فرمارہی ہیں:

عندلیب خستہ جاں کو نغمہ زن سمجھے تھے ہم
اک خموشی تھی جسے سازِ چمن سمجھے تھے ہم
اب کھلا ہم پر کہ تھی دیوانگی بھی مرحلہ
مستقل ہنگامۂ دار و رسن سمجھے تھے ہم
ہمتِ تازہ عطا کی اُس نے سب کچھ لوٹ کر
راہ بر نکلا وہ جس کو راہزن سمجھے تھے ہم
دل فقط ویرانۂ ماضی ہے اے نیر جسے
ناشنیدہ آرزوؤں کا چمن سمجھے تھے ہم

اب ایک ایسی شاعرہ کو مائک پر تشریف لانے کی تکلیف دی جارہی ہے جس پر شاعری ہمیشہ ناز کرے گی۔ میری مراد محترمہ ساجدہ زیدی سے ہے۔ آپ نظم کی شاعرہ ہیں اور ان کے کئی مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ اپنے کسی مطبوعہ مجموعہ سے ایک نظم سنا رہی ہیں۔ کیا زبان ہے کیا لب و لہجہ ہے کہ زبان سے پھول جھڑ رہے ہیں۔ اُردو کیسے بولی جاتی ہے یہ ساجدہ زیدی سے سیکھئے۔ سامعین کے اصرار پر غزل عطا فرما رہی ہیں۔ ارشاد ہوا ہے:

روشِ جنوں کو عالم میں ہمیں دوام کرتے
جو رہ راستوں میں رُکتے دلِ ہی قیام کرتے
نہ نظر میں آگ جلتی نہ لبوں پہ حرف آتا
نہ نقابِ رُخ اٹھاتے نہ سلام عام کرتے
یہ جراحتوں کا موسم، یہ دفورِ غم کی شبنم
یہی زادِ راہ لے کر سفرِ مدام کرتے
سرِ بزمِ دوستاں بھی نہ کھلی زباں ہماری
ارے رنجِ نارسائی تجھے کیسے عام کرتے
وہی اک سکوتِ مبہم وہی خامشی پیہم
کوئی ہم زبان ملتا کبھی ہم کلام کرتے

ساجدہ زیدی صاحبہ داد و ستائش کی آوازوں اور طویل تالیوں کی جھنکار میں اپنی جگہ تشریف لے گئیں تو محترمہ سیدہ فرحت علی محمودی سے جمیلہ صاحبہ نے کلام مرحمت فرمانے کی استدعا کی ہے۔ گیسے محترمہ فرحت واقعی بے مثال اشعار مرحمت فرما رہی ہیں:

صفحۂ دل پر کوئی حرف تمنا لکھوں
کچھ بتا اے دلِ مایوس مگر کیا لکھوں
بند خوابوں کے دریچے ہیں ہوا طوفانی
سرد ہے بزمِ تخیل کی فضا کیا لکھوں
میر کی طرح لکھوں قلزمِ ہستی کو سراب
قولِ غالب ہے کہ قطرے کو بھی دریا لکھوں
رگِ احساس میں جب زہر کے نشتر اُتریں
کیسے ممکن ہے کہ قاتل کو مسیحا لکھوں

داد ہے کہ سامعین سیدہ فرحت کی پختہ کلامی کو تسلیم کر رہے ہیں۔ سیدہ فرما رہی ہیں:

اس اندھیرے میں کہاں پاؤں جمائے کوئی
شبِ تاریک میں کیا صبح کا نغمہ لکھوا

سامنے نظروں کے ہے درد کی ماری دُنیا
کیا غمِ زار کا اس حال میں نوحہ لکھوں
موت کے ساز کی لے تیز سہی سخت سہی
زندگی پھر بھی تری جیت کا نغمہ لکھوں
ہوں جو تنہا میں کبھی خلوتِ ہستی میں
عظمتِ رُوحِ بشر تیرا قصیدہ لکھوں

بہت اچھی داد پاکر جب سیدہ فرحت صاحبہ اپنی جگہ جانے لگیں تو سامعین نے پرزور مطالبہ کیا ہے کہ محترمہ ایک غزل اور مرحمت فرمائیں۔ سنیے محترمہ سیدہ صاحبہ دوسری غزل کا کس قدر بہترین مطلع ارشاد فرما رہی ہیں ؎

محبت میں ہوس کا رنگ جب شامل نہیں ہوتا
کوئی قاتل نہیں ہوتا کوئی بسمل نہیں ہوتا

اس مطلع اتوار پر خوب خوب داد پانے کے بعد فرحت صاحبہ عطا فرما رہی ہیں ؎

ہمیشہ کھیلتا رہتا ہے جو امواجِ طوفاں سے
سفینہ وہ کبھی شرمندۂ ساحل نہیں ہوتا
نہ جس میں سوز و سازِ زندگی کی لے ابھرتی ہو
دھڑکنے کو دھڑکتا ہے مگر وہ دل نہیں ہوتا

داد کو خوب سے خوب تر سمیٹتی ہوئیں سیدہ صاحبہ فرماتی ہیں ؎

نہ جب تک عشق کی وارفتگی ہو رہبرِ منزل
ہم اہلِ شوق کو لطفِ سفر حاصل نہیں ہوتا

محترمہ فرحت صاحبہ بڑے احترام کے ساتھ مائیک سے اپنی جگہ تشریف لے جا رہی ہیں اور اب اناؤنسر صاحبہ نے یہ خوشخبری دی ہے کہ صدر صاحبہ بیگم حمیدہ سلطان بھی کلام عنایت فرمائیں گی۔ صدر صاحبہ نے ارشاد فرمایا کہ میں ایک پرانی نظم سنا رہی ہوں جو میں نے ایک تقریب میں استقبالیہ کے طور پر سنائی تھی۔ کچھ اشعار آپ بھی سُن لیجیے ؎

پھر گلاؤں میں ہے شانِ رعنائی
کہ دُلہن بن کے پھر بہار آئی
پتّا پتّا ہے حسن کی تصویر
بوٹا بوٹا ہے نقشِ زیبائی
گل بداماں ہے ہلکی ہلکی شفق
اُودا اُودا ہے چرخِ مینائی
بھینی بھینی ہے پھر نسیمِ بہار
پھر رہی ہے چمن میں اترائی
بال کھولے ہیں سنبل تر نے
ہوکے زلفوں کی اُن کی شیدائی
ساریاں سرخ چمپئی اُودی
جامہ زیبی میں شانِ رعنائی
گوندھ کر پھر سمن بروں کے لیے
ہار پھولوں کے ہے صبا لائی
اُٹھ کے میکدے سے سوئے چمن
ہے ابھی ابھی آئی

اب جمیلہ صاحبہ مشاعرہ کے اختتامی لوازمات انجام دینے ہی والی تھیں کہ انھیں اطلاع دی گئی کہ مُراد آباد سے تسنیم صدیقی صاحبہ آگئی ہیں اس پر جمیلہ صاحبہ نے اعلان کیا کہ تسنیم صدیقی چونکہ سیدھی ہسپتال سے آرہی ہیں اس لیے وہ دیر سے آئی ہیں ایک آواز آئی ہے کہ ہسپتال میں کیا کچھ جننے گئی تھیں اس پر جمیلہ صاحبہ فرما رہی ہیں کہ شعر تو جیسے وہ سناتی ہیں وہی اب بھی سنائیں گی بہر حال اُن کے اشعار کے ساتھ ہسپتال کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ پردے کی اوٹ سے لجاتی۔ شرماتی اور پور سے لتی ہوئیں تسنیم صدیقی بڑے ناز و ادا سے مائیک پر آگئی ہیں اور کہہ رہی ہیں کہ بیٹھ کر پڑھنے کی عادی نہیں اس پر کنور مہندر سنگھ بیدی فرماتے

لگے کہ اگر آپ کھڑی ہو کر پڑھنا چاہیں تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اس پر تسنیم صاحبہ کہنے لگیں کہ نہیں میں بیٹھ کر پڑھوں گی۔ آپ اُٹھ کر سنیئے۔ اس پر کنور صاحب تو خاموش ہو رہے مگر یار لوگ کہاں چوکنے والے تھے لہذا ایک آواز آئی کہ یہ تو آپ کے ساتھ ..... کھڑے بھی سن سکتے ہیں۔ مشاعروں میں سامعین یا شعراء یا شاعرات کے درمیان نقرہ بازی اور حاضر جوابی کے نادر نمونے سننے میں آتے رہتے ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ تسنیم صدیقی ابھی تک حاضر جوابی اور پھکڑ بازی میں طاق نہیں کر سکی ہیں۔ بہر کیف تسنیم صاحبہ نے راگ پہاڑی میں غزل شروع کی ہے غزل پڑھائی ہے مگر سُن لینے میں کیا برائی ہے دیئے کہ ان پیشہ ور شاعرات کے پاس تازہ غزل بہت کم ہوتی ہے۔ اور تازہ کلام تو آج کل مشاعروں میں شاذ و نادر ہی سُننے کو ملتا ہے لیجئے تسنیم صدیقی نغمہ سرا ہیں ؎

بھیگا بھیگا موسم ہے وقت بھی سہانا ہے
آ نہ ایسے عالم میں خود کو بھول جانا ہے
گردشِ زمانہ کو آئینہ دکھانا ہے
بجلیوں کے سائے میں آشیاں بنانا ہے
اے غمِ زمانہ تو آج مجھ کو تنہا رہنے دے
آج اُن کی آنکھوں کی جھیل میں نہانا ہے
زہرِ غم کو ہنس ہنس کر اسی لیے پیا ہم نے
آنسوؤں کے سائے میں ہم کو مسکرانا ہے
دیکھیں کس کو ملتی ہے منزلِ وفا تسنیم
اک طرف محبت ہے اک طرف زمانہ ہے

جو مشاعرہ اب تک نہایت ہی اچھے ڈھنگ سے چل رہا تھا اور نہایت ہی یہ مشاعرہ کامیابی کے لحاظ سے آپ اپنی مثال تھا تسنیم صاحبہ کی معقول اندر کسی حد تک غیر سنجیدہ نامناسب حرکتوں سے ابتذال کی حد تک آ گیا۔ دل پھینک حضرات تسنیم سے دوسری غزل سننے کا اصرار کر رہے ہیں۔ آپ بھی ان کی دوسری غزل کے دو اشعار سن لیجئے ؎

خشک ہونے لگا آنچل میرا
پھر تعاقب کرے بادل میرا
اب کے بچھڑو گی تو کھو جاؤنگی
راستہ روک لے پاگل میرا

یہ شعر تسنیم صاحبہ نے یہ کہہ کر سنایا ہے کہ اپنے مخصوص سننے والوں کی نذر کر رہی ہوں بہر کیف تسنیم صاحبہ نے ایوانِ غالب میں اچھی خاصی اودھم مچا دی۔ اندر صدر صاحبہ کہہ رہی ہیں کہ میں نے ابتدا میں جو کہا تھا وہ کافی حد تک غلط ثابت ہوا۔ یہ مشاعرہ سن کر تو ایسا معلوم ہوا کہ ہماری شاعرات شاعر حضرات سے کسی طور بھی کم نہیں ہیں اور آج کے مشاعرہ میں جو کلام سنایا گیا ہے وہ اردو شاعری میں قابل تعریف حد تک اپنا مقام رکھتا ہے۔ اس کے بعد محترمہ صالحہ عابد حسین نے سامعین اور شاعرات کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ایسی چٹکیاں لیں کہ کئی شاعرات اپنی شاعری کا حدود اربعہ دل ہی دل میں ناپ رہی ہوں گی۔

میرے لیے آج کی یہ نشست پوری دلچسپ رہی کہ میرے دائیں جانب جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر اور ان کے ساتھ جناب انور دہلوی تشریف فرما تھے اور بائیں جانب جناب ساقی صاحب۔ لہذا ان کی شعروں پر اور کچھ شاعرات پر جو تبصرے ہو گئے ان کا مشاعرے کی کاروائی سے تعلق نہیں رہا۔ نو بج کر چالیس منٹ پر یہ مشاعرہ ختم ہو گیا ہے۔ ●●

ڈاکٹر تاراچرن رستوگی

سیتاپور (یوپی) کا ایک اردو نواز خاندان شاعری تین پشت میں

جناب کرشن سروپ صاحب کے توسط سے مجھے ان کے والد بزرگوار جناب سورگیہ رام سروپ اور ان کے دادا جناب بابو رام صاحب کے مجموعہ ہائے کلام ملے۔ اس خاندان نے اردو کی قابلِ قدر خدمت انجام دی ہے۔

جناب رام سروپ صاحب ضبط سیتاپوری (اترپردیش) کا مجموعہ کلام بہ عنوان "نوائے ضبط" اردو اکیڈمی اترپردیش کے مالی تعاون سے بار اول اگست ۱۹۷۸ء میں شائع ہوا۔ ضبط مرحوم نے انتساب اپنے والد بزرگوار جناب بابو رام شیدا کے نام نامی سے کیا ہے۔ اس کے پیشتر کہ نوائے ضبط پر کچھ لکھا جائے یہ برمحل ہی ہوگا کہ شیدا صاحب کے کلام پر بھی اظہار خیال کیا [illegible]۔

شیدا صاحب بعمر ۸۷ سال جنوری ۱۹۲۷ء میں واصل بحق ہوئے۔ شیدا صاحب کا کلام مرتب ہونے پر ایک صاحب کے توسط سے نول کشور لکھنؤ کو بھیجا گیا، مگر وہاں یہ مسودہ کھو گیا۔ لہٰذا ایک مثنوی چراغِ معرفت ہی دستیاب ہے۔ یہ مثنوی سورش جوشن پریس سیتاپور میں ۱۹۰۳ء میں زیورِ طباعت سے مزین ہوئی اور ۱۳ صفحات کو محیط ہے۔ مثنوی مسدس [illegible] میں لکھی گئی ہے جو [illegible] بند پر مشتمل ہے۔ آخر میں ایک نظم "فریاد نامہ" ہے اور اس کے بعد [illegible] منظوم [illegible] پہلی میسوی اور دوسری [illegible] ہوئی ہیں۔ جناب بابو رام شیدا بڑے عبادت گذار انسان تھے اور ان کے کلام میں تصوف باہمہ رنگ و روشنی جلوہ ریز ہو کر دعوتِ نظارہ دیتا ہے۔ تصوف موٹے طور پر تین اقسام کے تحت مطالعہ میں آتا ہے "ہمہ اوست"، "ہمہ از اوست"، اور "ہمہ در ہمہ"۔ بنظرِ غائر یہ تینوں اقسام ایک [illegible] نظر آتی ہیں۔ [illegible] دنیا [illegible] ہے یہی

تصوف ہے اور یہی مسٹی سزم MYSTICIMS ہے بقول ے

اٹھا لے بڑھ کے کوئی سا اسے او دیوانے
شراب ایک ہے بدلے ہوئے ہیں پیمانے

شیدا صاحب فرشتہ صفت انسان تھے اور ان کی پوری زندگی "دل بہ یار، دست بکار" پر استوار تھی۔ زبان و بیان پر پوری گرفت رکھتے تھے۔ [illegible] بطور اشعار متناسخ ہو کر ان کے کلام میں کرن کرن نظر آتا ہے۔

چراغ معرفت جب وہ پردہ رخ انور سے اٹھا دیتے ہیں
جلوہ [illegible] دکھا دیتے ہیں

بطور تبرک چند درج ذیل بند ملاحظہ ہوں۔

کیا کروں سیر چمن کیا گلِ خنداں دیکھوں
بوئے خوش سونگھوں [illegible] کیا رنگِ گلستاں دیکھوں
چشمِ مشتاق سے کیا روئے حسیناں دیکھوں
[illegible] مصر میں یا یوسفِ کنعاں دیکھوں
[illegible] منظورِ نظر
[illegible] کوئی اس سے برتر

[illegible] عالم [illegible] رونق [illegible] کیا ہے
[illegible] تماشا [illegible] ہے
[illegible] غلطاں کیا ہے
[illegible] حسیناں کیا ہے
[illegible] دیکھوں [illegible] زبان سے [illegible]
[illegible]
[illegible]
دل [illegible]
[illegible]
[illegible]

قیس و فرہاد کو دیوانہ بنایا اس نے
شہر بھر کوہ و بیابان میں پھرایا اس نے

خوابِ غفلت ترے عشاق کی بیداری ہے
بیخودی جس کو سمجھتے ہیں وہ ہشیاری ہے
کفر کیا چیز ہے کیا مذہب و دینداری ہے
زہد و تقویٰ ترے میخانہ کی مے خواری ہے

گر ہے مقبول جو تو مجرد نیاز شیدا
آستاں کا ترے سجدہ ہو نمازِ شیدا

بطور نمونہ مشتے از خروارے، یہی مخول بند پیش کیے گئے ہیں۔ اب ملاحظہ کیجیے فریاد نامہ کے چند اشعار پیش ہیں ؎

چارۂ بیچارگاں تجھ سے مری فریاد ہے
جرم بخشِ عاصیاں تجھ سے مری فریاد ہے
کس کے در پہ جاؤں تیرا آستانہ چھوڑ کر
دے مجھے جائے اماں تجھ سے مری فریاد ہے

ہوں تماشائے قدرت، نام تیرا ہر زباں
ہے مجھے وردِ زباں تجھ سے مری فریاد ہے

" تجھ سے مری فریاد ہے" اس لمبی ردیف نے فریاد نامہ کو از دل خیزد بر دل ریزد بنا دیا ہے۔

نوائے ضبط کے خالق چودھری رام سروپ ضبط سیتاپوری کو ذوقِ شعر و سخن میراث میں ملا۔ بقول لفظان کے ہم زلف جناب گوپی ناتھ امن لکھنوی نے لکھا استاذی نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی جن کی ان کی مایہ ناز تصنیف بھگوت گیتا کے منظوم ترجمے پر حیارت سرکار سے پدم بھوشن [illegible] افتخار ملا، امن صاحب کے دوست تھے۔ امن صاحب نے اثر مرحوم کی تخلیق، سروشِ فطرت پر بھی پیش لفظ لکھا جس کو امن صاحب نے مجھے دے دیا تاکہ میں اثر صاحب کو پیش کردوں۔ یہ جملہ معترضہ مشکلات ذہنی و قلبی کے تحت مرقوم ہو گیا۔ مزاج دیگر اوصاف شعری امن صاحب نے ضبط کے کلام میں درج ذیل خوبیوں کی بھی نشاندہی کی کہ

"ضبط صاحب کو شاعری وراثت میں ملی۔ طبیعت [illegible] [illegible] پیدا کیا غزل لکھنے لگے انکی شاعری میں غمِ جاناں بھی ہے اور غمِ دوراں بھی، نغمۂ شادی بھی نوحۂ غم بھی۔ آپ بیتی بھی۔ روایتی رنگ بھی ہے اور اُپج بھی۔ متانت بھی ہے اور شوخی بھی۔ دل کی باتیں بھی ہیں اور دماغ کی بھی۔"

امن صاحب نے دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ عرضِ حال کے تحت ضبط نے اپنے مجموعۂ کلام کے چار ادوار بتلائے ہیں۔

دورِ اوّل	۱۹۱۹ء	لغایت	۱۹۳۶ء
دوسرا دور	۱۹۵۳ء	"	۱۹۵۸ء
تیسرا "	۱۹۵۸ء	"	۱۹۶۶ء
چوتھا "	۱۹۶۷ء	"	۱۹۷۱ء

شاعری سے متعلق اپنی رائے پیش کرتے ہوئے لکھا کہ "... شاعر کا کلام اس کے دلی جذبات کا آئینہ دار ہوتا ہے جس میں اس کی فطری خصوصیتیں، مزاجی اور فکری کیفیات۔ اس کے گرد و پیش کے حالات، رجحانات، اثر انداز واقعات و حادثات، اس کی مسرتوں، صحبتوں اس کے مشاہدات و تجربات اور اس کے کردار کے نمونے جذب رہتے ہیں ... فن اور ادب نوع انسان کا بیش قیمت تجربہ ہے جس سے انسان کی بلندیٔ فکر اور گہرے احساسات ظاہر ہوتے ہیں۔ اس طرح تخلیقِ ادب میں شاعر کی زندگی کا جو حصہ صرف ہوتا ہے اسے اس کی ادبی زندگی کہہ سکتے ہیں (ص ص ۱۰ - ۱۱)

جناب ضبط صاحب کے خود خیالات در خورِ اعتنا بھی ہے اور خاصے اہم بھی۔ گرد و پیش سے مرتب ہونے والے اثرات جب قالبِ شعری میں ڈھل جاتے ہیں تو شعری کاوشوں میں سوز و گداز، مسرت و بصیرت، خلوص و محبت وغیرہ خصوصیات شعلگی طور پیدا کر دیتی ہیں۔ نوائے ضبط ۲۵۶ صفحات کو محیط ہے اور غزلیات و نظمیات پر مشتمل ہے۔ چودھری رام سروپ ضبط اپنے والد کی طرح پاکیزگیٔ نفس، حسنِ معاملگی، حب الوطنی، انسان دوستی سے حامل شخص تھے۔ ولیکن ... کو بہتر سے بہتر بنانے کا جذبہ ان کے دل [illegible]

قلی ہمدردی ہی تک محدود نہ تھا، وہ اپنے جذبات کو عملی جامہ
پہنانا بھی جانتے تھے۔ "دل بیدار ہی ہو کر رہ جانا کافی نہیں ہوتا
ہے "دست بہ کار" بھی رہے۔ ملازمت سے سبک دوش ہو جانے
کے بعد سرو ادے "یعنی طلوعِ انسانیت کی تحریک میں جس
کو بابا جاوے نے شروع کیا تھا شامل ہو گئے۔ وہ زمانے
کو خوش حال دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ گیتا کے مہان اپدیش نشکام
کرم یعنی صلہ سے بے نیاز ہو کر عمل پیرا ہونے کی تلقین پر
عمل پیرا ہوئے۔ وہ نظارۂ فلاح و بہبود کو جگہ جگہ بلکہ تمام دنیا
میں دیکھنا چاہتے تھے، ملاحظہ ہو یہ شعر ؎

مطمئن ایک نظارے سے اگر دل ہوتا
سینۂ طور فقط نقطۂ منزل ہوتا

"سینۂ طور" کی ترکیب نئی ہے اور بامعنی ہے۔ یہ شعر بیدل
کے درج ذیل سے ملتا جلتا شعر ہے ؎

دل اگر می داشت وسعت بے نشاں بود ایں چمن
رنگ مے بیروں نشست از بسکہ مینا تنگ بود (بیدل)

ملاحظہ ہو درج ذیل اشعار ؎

نہ خدا کی نہ سفینے کی تمنا ہوتی
- قعرِ دریا مری نظروں میں جو ساحل ہوتا

ہر فردِ بشر ہے عیش طلب ہر سانس پہ آسائش کی ہوس
- جب دل سے سکوں ناپید ہوا پھر عیش کا ساماں کیا ہوگا

ہے جذبِ دل کا کہ ہے یہ کیفِ نظر کا
- کثرت میں عیاں رنگ ہے وحدت کے اثر کا

ملتا ہے شرف خوبیِ تقدیر سے ورنہ
- ہر اک کے لیے بختِ سکندر نہیں ہوتا

دل اگر دردآشنا نہ ہوا — اس کا ہونا ہی کیا ہوا نہ ہوا

زندگی خواب سہی یا کوئی افسانہ سہی
سازِ ہستی اسی عنوان میں ڈھلتا دیکھا

ترکِ مے، ترکِ محبت، ترکِ دنیا، ترکِ خود
کر دیا سب ترک لیکن لب پہ تیرا نام تھا

اس شعر میں لفظ ترک کی تکرار سے ایک فارسی
شعر یاد آ گیا

سربرہنہ نیستم دارم کلاہِ چار ترک
ترکِ دنیا، ترکِ عقبیٰ، ترکِ مولیٰ، ترکِ ترک

بس ضبط صاحب نے ترکِ ترک کا ذکر نہیں کیا ہے
ایسی کوئی غزل نہیں ہے جس کے شعر بطور مثال پیش
نہ کیے جا سکیں۔ نظمیں بھی خلوصِ دل نیز وطن پرستی میں
سرشار ہیں۔ "یومِ آزادی"، "جمال گاندھی"، سنت دنوبا
نوجوانانِ وطن سے خطاب، بڑی کامیاب نظمیں ہیں۔ یوم
آزادی شاعر کے نزدیک دورِ انقلاب کا آغاز تھا ؎

پھر زمانے میں دورِ شباب آ گیا
- انقلاب آ گیا انقلاب آ گیا (یومِ آزادی)

خدا رسیدہ بڑا باکمال تھا گاندھی
- جہاں میں آپ ہی اپنی مثال تھا گاندھی (جمال گاندھی)

پیامِ امن لے کر اک نیا پیغامبر آیا
وہ اک روشن ستارہ تھا جو بھارت پہ ابھر آیا (سنت ونوبا)

جواہر لال نہرو کے انتقال پُر ملال پر جو نوحہ ضبط
صاحب نے کہا ہے بہت خوب ہے، پہلا شعر پیش ہے ؎

افسوس ملک و قوم کا رہبر نہیں رہا
دُنیا میں آہ ہادیِ اکبر نہیں رہا

لال بہادر شاستری کے واصل بحق ہو جانے پر
جو نوحہ کہا ہے۔ مسدس میں ہے اور فنکاری کے لحاظ
سے چکبست اور درگا سہائے سرور کے مسدسوں کی یاد
تازہ ہونے لگتی ہے ؎

رہنمائے قوم اے ہندوستاں کے تاجدار
اے نگہبانِ وطن، اے بیکسوں کے غمگسار
تو وطن پر تھا فدا اہلِ وطن تجھ پہ نثار
تیری ہستی قوم کی بستی باعثِ صد افتخار
ارتقائے قوم کی خاطر ہوا تیرا وجود
ذات سے تیری وطن کی مشکل تھی ہست و بود

مسدس میں کہی ایک اور نظم جو دیانند سرسوتی کے
وحدانیت کے قائل ہو جانے سے متاثر ہو کر کہی
گئی ہے بڑی اچھی نظم ہے۔ ایک بند ملاحظہ ہو

موجزن دل میں ہو اُن کے خیالِ وحدت
وید بھگوان کی بتلائی تعلیموں کو عظمت
کی وہ توصیفِ خدا غیر کی کھو دی شرکت
نہ برہمن کی نہ واعظ کی رہی کچھ حاجت

دل پُر نور میں اوہام پرستی نہ رہی
خانۂ دل میں کسی غیر کی ہستی نہ رہی

ضبطؔ صاحب کو قطعات و رباعیات کہنے پر بھی قدرت حاصل تھی۔ ایک قطعہ اور ایک رباعی بطور مثال پیش ہے ؎

عہدِ پیری شباب کی باتیں
روزِ روشن میں رات کی باتیں

اب کہاں ولولے جوانی کے
عیش کے دن نہ عیش کی راتیں (قطعہ)

بگڑی ہوئی تقدیر بنانا مشکل ✽ گمراہ کو ہے راہ پہ لانا مشکل
سوئے ہوئے انسان کو جگانا آساں
(رباعی) بیدار کو لیکن ہے جگانا مشکل

من حیث المجموع، ضبطؔ صاحب کو غزل گوئی زیادہ مرغوب تھی، آخری دور کے چند اشعار سے حظ اٹھائیے ؎

انسانیت کے نام پہ حیوانیت کے کام
انسان بدل گیا کہ زمانہ بدل گیا

اپنا دیوانہ ہی جو کہہ کے پکارا ہوتا
شان بڑھ جاتی مری نام تمہارا ہوتا

ہم نہ کوچے یار سے اُٹھے مثالِ نقشِ پا
مٹتے مٹتے بھی غبارِ راہِ جاناں ہو گئے

غرض اس کو نہ کچھ ہے وید سے مطلب نہ قرآں سے
ترے شیفتہ کو کیا غرض ہندو نہ مسلماں سے

فی الواقع، ضبطؔ صاحب کا مسلک و مشرب صلحِ کل تھا اب یہ انسانیت دوست دُنیا میں نہیں رہا مگر اسکی آواز لافانی ہے، جس پر ہر ایک لبیک کہنا پسند کرے گا۔

ضبطؔ صاحب کے بڑے صاحبزادے جناب چودھری کرشن [illegible] صاحب بھی جو محکمہ منصوبہ بندی میں [illegible] آفیسر تھے

آج کل مظفرؔ بجنوری [illegible] میں یو۔ پی ۔ [illegible] رہے ہیں۔ اچھے شاعر اور باذوق انسان ہیں۔

ان کے چند اشعار بھی سن لیجیے ؎

دائرہ در دائرہ چلتی رہی ہے گفتگو
موت کیا ہے اور کیا ہے زندگی رنگ و بو
گناہوں سے بچا کوئی نہیں ہے

اُجالا یاں ذرہ ذرہ کا کوئی نہیں ہے
اندھیرے ہی اندھیرے ہیں افق تک
دیا جلتا ہوا کوئی نہیں ہے

صبح سے شام تک چلتا رہا ہوں
فرازِ منزل پہ بڑھتا رہا ہوں

یہ ہے وہ شاعر جو اردو [illegible] میں کبھی پیچھے نہیں رہا۔ ●●

غزل

منظور مظلومؔ کاشمیری
[illegible]

اگر بے تاب ہیں آنکھیں انھیں بے تاب رہنے دو
ان آنکھوں میں ہر اک حسرتِ دیدار رہنے دو
مبارک ہوں تمھیں دیر و حرم [illegible] جلوہ
مجھے شیخ و برہمن میکدے سے پیار [illegible] دو
نہ جاؤ تم ابھی [illegible] رہنے دو [illegible] سے
مری اُجڑی ہوئی دنیا ابھی گلزار رہنے دو
مشاد و نگاہِ ناصب کو دُنیا سے وہ [illegible]
مرے ہاتھوں میں کوئی دم ذرا تلوار رہنے دو
سفر سے میں تھکا ماندہ ابھی آیا ہوں منزل پر
ابھی مجھ سے فرشتو قبر میں تکرار رہنے دو
[illegible] اس [illegible] کو تمھاری دید بازی ہے
[illegible] اپنے عہد کے وہ امری سرکار رہنے دو
نہ یہ جنت کا شیدائی نہ یہ حوروں کا شیدا ہے
تم اس مظلومؔ کو کشمیر میں سرشار رہنے دو

غزل

ڈاکٹر تحفۃ کور، کشمیر یونیورسٹی

شش جہت، ارض و سما، زمن و زماں بنتے گئے
صرف اِک "کن" سے یہ سارے جہاں بنتے گئے
گانٹھ اور اِک میں زمن و زماں بنتے گئے
بڑھ کے ایسے مکاں میں لامکاں بنتے گئے
میں جو سمٹا، ذرے ذرے میں سرایت کر گیا
اور جب پھیلا تو بحرِ بے کراں بنتے گئے
زہرِ تیز روح کو بس چھیڑنے کی دیر تھی
زخم اپنے آپ اپنی داستاں بنتے گئے
ذہن کے کینوس پہ وہ اک پیکرِ نور تھے
جیسے جیسے سامنے آئے، دھواں بنتے گئے
پہلے نظروں کا تصادم، پھر وہ باہم اختلاط
سلسلے یوں اُن کے میرے درمیاں بنتے گئے
جب کبھی ڈالی انہوں نے اک بہار آگیں نظر
دل کے ویرانے میں ہر سو گلستاں بنتے گئے
تیرہ بختی، تشنگی، آہیں، رنج و حرماں، اضطراب
یوں کئی ذوقِ وحشت دل میں کارواں بنتے گئے
ہر الم مانی صفت نقاشیاں کرتا رہا
دل کی دیواروں پہ یوں ہی کچھ نشاں بنتے گئے
ابتدا میں ساری فطرت تو وہ بے جان تھی
"شبد" کی ہر گونج پر کون و مکاں بنتے گئے
درحقیقت نا تمامی ہے بنائے کائنات
اور اسی شئے سے رموزِ کن فکاں بنتے گئے

بھول کر بھی یاد اُن کی دم بدم آتی رہی
یوں بھی اِک نقش تو نقشِ جاوداں بنتے گئے

شردھانجلی

(جوہن آنور)

ہات تیری لکیر تو ہے تک
تیرا ہر عزم، عزمِ فولادی
تجھ سے قائم تھی آبروئے وطن
تجھ سے روشن تھی شمعِ آزادی
تیرے سینے میں نرم دل تھا مگر
سخت چٹان ہر ارادہ تھا
درد یوں تو ہزار ہیں لیکن
تجھ میں دردِ وطن زیادہ تھا
پھول بکھرے تھے جتنے گلشن میں
ایک لڑی میں پرو دئے تو نے
کھود پھینکیں جڑیں کدورت کی
بیج الفت کے بو دئے تو نے
آگے بڑھتا نہ کیوں بھلا بھارت
تیرے ہاتھوں میں تھی عنانِ وطن
بن گئے مثلِ گردِ راہ سفر
رہ گئے پیچھے دشمنانِ وطن
سانحہ یہ مگر ہوا کیسا
کس لئے سوگوار ہے عالم
شدتِ غم سے ہو گیا کس کے
سرنگوں آج ہند کا پرچم
حیف صد حیف آج ہم میں نہیں
رہبرِ کاروانِ آزادی
کیسے کہہ دیں کہ ہو گئے قرباں
دیس پر اپنے صلح کی دیوی
یاد جب جب بھی تیری آئے گی
سنگ، ہم یوں ترا منائیں گے
پھول شردھا کے لے کے ہاتھوں میں
یادِ تیری پہ سر جھکائیں گے

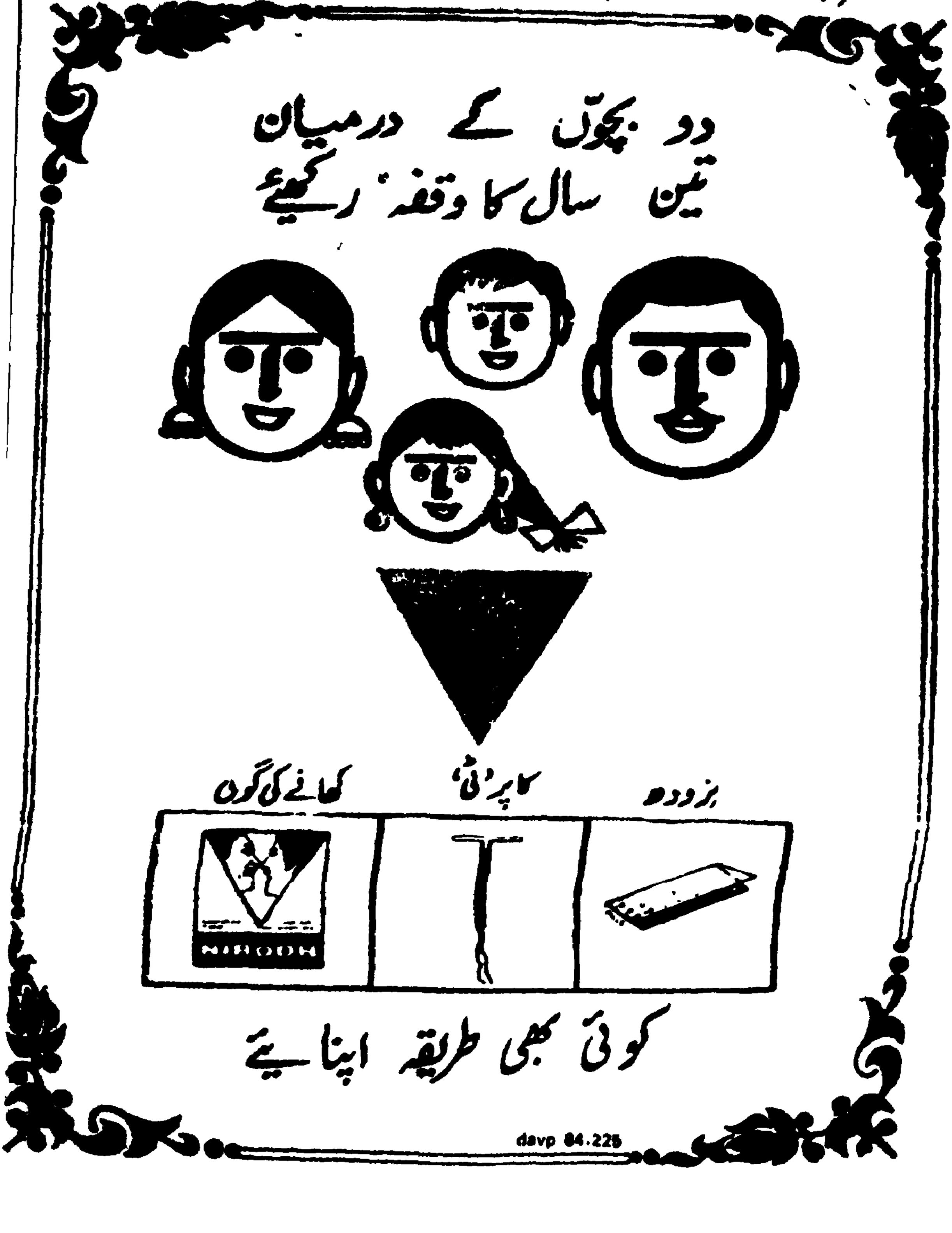
دو بچوں کے درمیان
تین سال کا وقفہ رکھیے
کھانے کی گولی
کاپر ٹی
نرودھ
NIRODH
کوئی بھی طریقہ اپنائیے
davp 84.225

غزلیں

ڈاکٹر سید المحمود دیوان (لندن)

ملتے نہیں ہیں لوگ کسی بدنصیب سے
رہتے ہیں دور دور ہمیشہ غریب سے
جب دیکھا زندگی کو نہایت قریب سے
آنکھوں میں وقت لگتے ہیں کتنے عجیب سے
اب تیرا غم بھی راز بنا کر نہ رکھ سکا
عاجز ہیں اس قدر رہو اپنے نصیب سے
اک تیری بے وفائی سے مجبور ہو گیا
ورنہ کبھی نباہ نہ کرتا رقیب سے
ہمراہ شیخ چلئے بہانہ حسین ہے
ملتی ہے راہِ میکدہ کوچۂ حبیب سے
کچھ اور فاصلے بڑھتے جاتے ہیں دل بچن
نکلے ہیں جب کبھی وہ ہمارے قریب سے
بارِ گرانِ زیست اٹھانا محال ہے
دیوان آپ الجھئے نہ اپنے طبیب سے

شکیلہ مہ جبین قابل

کیا بتائیں تمھیں گزری شبِ فرقت کیسی
ہم سمجھتے ہیں کہ ہوتی ہے قیامت کیسی
کس کا شکوہ ہے دلِ زار شکایت کیسی
عشق میں جور و ستم کی یہ حکایت کیسی
اب تو ہر اشک ہے آنکھوں میں لہو کا قطرہ
رنگ لائی ہے یہ بربادِ محبت کیسی
جس کو مل جائے تری مست نظر سے صہبا
اس بلا نوش کو پھر جام کی حاجت کیسی
ایک آدم کی ہیں اولاد خدا کے بندے
پھر ہے انساں کو یہ انساں سے عداوت کیسی
جب نہ امید رہی کوئی شفا کی قابل
پوچھتے ہیں وہ ہے بیمار کی حالت کیسی

محترمہ فاطمہ وثیقہ بانکی

تسکینِ قلب کے لیے حسنِ یقین تو ہے
گو سنگِ در نہیں ہے ہماری جبیں تو ہے
کیوں آسماں تلاش کریں اپنے واسطے
سجدہ کریں گے خاک پہ ممکن زمیں تو ہے
اکثر اسی خیال سے راحت ملی مجھے
اپنا نہیں ہے پر وہ سلامت کہیں تو ہے
جانے یہ کیوں ہیں برہم سے اجڑنے کے بعد بھی
دیکھیں ذرا ہمارا نشیمن یہیں تو ہے
بے وجہ ہاں میں ہاں جو ملاتے تھے کل تلک
اُن کی زباں پہ آج مکمل نہیں تو ہے
ہم جی رہے ہیں اب بھی اسی اعتبار سے
آئے گی صبح نو یہ ہمارا یقیں تو ہے
ہے جس کی یاد اب بھی وثیقہ کا آسرا
وہ دل کے آس پاس ہی پہلو نشیں تو ہے

روی بھارد واج (گوڑگاؤں)

دل پر لفظ محبت لکھ
رس کی بھری عبارت لکھ
بیگانوں کے من میں بھی
اپنے پن کی عظمت لکھ
پڑھے زمانہ صدیوں تک
ایسی کوئی حکایت لکھ
تو کرموں کی چادر پر
دوزخ لکھ یا جنت لکھ
اپنے سانسوں کے سُر میں
رام نام کی بھگت لکھ
روحی یوگ کی شکتی سے
تو اک نئی شریعت لکھ

بمبئی مرکنٹائل کوآپریٹو بنک لمیٹڈ

رجسٹرڈ آفس ۷۸ محمد علی روڈ بمبئی ۴۰۰۰۰۳

دہلی آفس ۳۶۵۵ نیتاجی سبھاش مارگ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
فون نمبر ۲۶۸۲۶۶ — ۲۶۴۳۷۲

★ — ہمارے یہاں شرح سود تمام نیشنلائزڈ اور شیڈولڈ کمرشیل بنکوں کے مقابلہ ایک فی صد زیادہ ہے۔

★ ہندوستان کا پہلا کوآپریٹو بنک جس کو زرمبادلہ میں کاروبار کے لیے لائسنس جاری کیا گیا۔

★ — ہمارے بنک میں اوقاف کی جمع شدہ رقم کی آمد۔ فی دفعہ ۱۳(۵) (الف) (iii) انکم ٹیکس ایکٹ ۱۹۶۱ء کے تحت انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہے۔

اس کے علاوہ

★ ہم آپ کے آرام و آسائش کی ضروریات مہیا کرنے کے لیے آسان قسطوں پر قرضہ فراہم کرتے ہیں ایک فیصدی کا فرق بہت بڑا فرق ہے۔ یہ آپ کی رقم میں ہزاروں روپیوں کا اضافہ کرتا ہے آپ بھی اس کا فائدہ اٹھائیں۔

زین جی رنگون والا (منیجنگ ڈائرکٹر)	حسینی، ایس۔ ڈاکٹر (چیرمین)	شمیم کاظم اسسٹنٹ جنرل منیجر شمالی ہند

یومِ آزادی

حیات ہاشمی
قائملہ۔ ایم۔ پی

آج تک یاد ہیں وہ غلامی کے دن
بات کرتے تھے غیروں کی آواز میں
صرف دن ہی نہیں سیکڑوں سال تک
کھیت اپنے تھے کھلیان تھے غیر کے
آخر اک دن سرِ آدمیت اٹھا
جس کے سینے میں دل کی جگہ درد تھا
جس نے بے حس جوانوں کو آواز دی
جس نے نبضِ حمیت پہ انگلی رکھی
سُرخ ہونے لگی سرزمینِ وطن
ہوش کھُلنے لگا جوش بڑھنے لگا
سلسلہ ٹوٹ پایا نہ منصور کا
رنگ لائیں شہیدوں کی قربانیاں
آج تک یاد ہے وہ مبارک گھڑی
آسماں کی بلندی کو چھونے لگا
گرم زنجیروں کا بازار ہونے لگا
حُسنِ اُلفت لیے گاہک ہو! جو
غربت دُور سے دُور ہوتی گئی
اب نہ شکوے نہ کوئی شکایت رہی
مل چلے کھیت میں نیک ہو گئے
نیت کا نہا کے گانے لگی کامنی

دن کو جب رات کہنے پہ مجبور تھے
جی رہے تھے مگر زیست سے دور تھے
قبضۂ غیر میں اپنی قسمت رہی
ہاتھ میں اپنے بس اپنی محنت رہی
جس کے چہرے پہ تیور بغاوت کے تھے
جس کی آنکھوں میں آنسو شرافت کے تھے
جس نے بوڑھوں کو زورِ جوانی دیا
خون کو جس نے حکمِ روانی دیا
اور شہیدوں کی تعداد بڑھنے لگی
باڑھ سی فوجِ آزاد بڑھنے لگی
ٹوٹ کر رہ گئیں خود ہی در رو در کی
ہو گیا آخر آزاد اپنا وطن
سیکڑوں سال کی جہد کا ماحصل
وہ ترنگا نشاں وہ نشانِ عمل
رنج و غم کی دکانوں میں تالے پڑے
تو عداوت کی کانوں میں جالے پڑے
پاس سے پاس آتی گئی دوستی
اب نہ تدبیر تقدیر کو کوستی
لہلہانے لگی محنتوں کی فصل
اُس کے کھلیان پر آج اُس کا دخل

یہ حقیقت ہے لیکن حقیقت یہ ہے
مشکلوں سے ملی ہیں یہ آسانیاں
بھول جانا سبھی بھول جانا، مگر
یاد رکھنا شہیدوں کی قربانیاں

اور دھرتی کانپ اٹھی

احمد حسین شمس ایڈووکیٹ
(کشن گنج)

(تیسری قسط)

ـ ہر جگہ کیمونزم کا راج ہوگا۔ کیمونزم وقت کی پکار ہے اسے اب کوئی نہیں روک سکتا وہ دونوں کے خیال میں ابلا تفریق تھا تاہم ... منوہر کو محبت تھی وہ چاہتا تھا کہ ابھی اور ... اور اگرچہ کشن لال اسے ہر بات میں شہ دیتے چلے جا رہے ہیں مگر گفتگو کا سلسلہ جاری ہے اور صرف اس لئے کہ یہ گھر ہیرا کا تھا ہیرا کا نام ہی منوہر کے لئے سکون کا باعث تھا اس نے کہا "اگر آپ کہیں تو میں اشتراکی لٹریچر آپ کو پڑھنے کے لئے دوں"

"نہ! ایسی غلطی ہرگز نہ کرنا اشتراکیت کو کتابوں اور پمفلٹوں ہی میں رہنے دو یہ بلا ہے جو ہندوستان پر نازل ہونا چاہتی ہے۔ جو ازم مذہب کا مذاق اڑائے وہ بھی کوئی ازم ہے ایسے ازم کے سائے سے بھی گریز کرنا چاہیئے"

"مذہب انسانیت ہی کا دوسرا نام ہے"

"تو کس مذہب نے انسانیت کی مخالفت کی کہ آج کیمونزم اور سوشلزم کی ضرورت آ پڑی"

"آپ ذرا طیش میں آ گئے" منوہر نے ذرا مسکراتے ہوئے کہا۔

"تم نے ایسی بات ہی کیوں کہی تمہاری باتوں سے صاف ظاہر ہے کہ چونکہ مذہب نے انسانیت کی خدمت نہیں کی اس لئے اب ان ازموں کی ضرورت آ پڑی" کشن لال کی پیشانی پر شکن آ گئی۔

"ابھی چند سال پہلے بنگال، بہار اور پنجاب میں جو اس قدر خونریزیاں ہوئیں بے گناہوں کے خون سے ہولی کھیلی گئی۔ بوڑھوں اور اپاہجوں کو ریزہ ریزہ کر دیا گیا۔ معصوم بچوں کو نیزہ پر اچھالا گیا۔ عورتوں کی عصمتیں لوٹی گئیں۔۔۔۔ یہ سب سوشلزم اور کیمونزم کر کے

... نام پر؟ ہندوؤں نے اپنے بھگوان کو پکارا مسلمانوں نے اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا اور پھر تلواریں کھنچ کر شب بے گناہوں کے خون سے رنگین ہو گئیں مذہب نے ہی انسانیت کا گلا گھونٹا ہے اسلام صلح آشتی کا دعویٰ کرتا ہے مگر مسلمانوں کی تاریخ کا ہر ورق خونیں داستان سے رنگین ہے عیسائیت اور بدھ ازم محبت اور اہنسا کے مدعی ہیں مگر ان کی تاریخیں اس کے خلاف ثبوت دیتی ہیں ہندوؤں اور یہودیوں نے مذہب کے نام پر کیا کم خون بہایا ہے کہ ان کی طرف سے نظریں پھیری جائیں؟ مذہب عبارت ہے نفرت سے دھرم نام ہے تعصب کا خدا اور بھگوان کا فقط بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ انہیں کتابوں کا حوالہ دے دے کر ایک دوسرے کی گردن ماری جائے اور آپ کہتے ہیں۔ مذہب نے انسانیت کی خدمت کی"

منوہر اتنی باتیں ایک سانس ہی میں کہہ گیا۔

"مگر افراد کی غلطیاں مذہب اور دھرم کو بدنام نہیں کر سکتیں تم مسلمانوں کو بدنام کر سکتے ہو اسلام کو نہیں ہندوؤں کو گالیاں دے سکتے ہو ہندو دھرم کو نہیں دھرم اور مذہب اصول و اعتقادات ہی سے پہچانے جاتے ہیں" کشن لال ذرا دھیمے پڑے۔

"جی نہیں جو اصول عملی جامہ نہ پہن سکے وہ اصول نہیں مذہب انسانیت کا نام نہیں"

"مگر ڈاکٹر اقبال نے تو تمہارے خلاف فتویٰ دیا ہے مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا"

اور انہوں نے یہ بھی تو کہا ہے

آپس میں بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا
جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے

یہی خدا اور بھگوان مسلمان اور ہندو کو آپس

میں قطعی نہیں دیتے اسلام اور ہندو دھرم کو تو چھوڑیئے خود ہندو دھرم تک میں یہاں شودروں کو ناپاک سمجھا جاتا ہے لاکھ کوشش کرنے پر بھی شودروں کو مندروں میں جانے کی اجازت نہیں کیا گارے اور اینٹ کی بنی ہوئی عمارت اتنی مقدس ہے کہ انسان کے داخلے سے وہ ناپاک ہو جائے ایسی عمارتیں کیوں خواہ مخواہ زمین گھیرے کھڑی ہیں ان عمارتوں کو مسمار کر دینا ہی بہتر ہے جو انسان اور انسان میں تفریق کی باعث ہوں ......"

ابھی بات یہیں تک پہونچی تھی کہ ایک شور و غوغہ سنائی دیا ایک ہنگامہ تھا جو کشن لال کی کوٹھی کی طرف بڑھتا ہوا آرہا تھا آگے آگے گائے اور بھینس اس کے پیچھے عدالت کا ایک چپراسی اور اسی سرکل کے چوکیدار وردی پہنے ان کے پیچھے سلیم میاں اپنے بال بچوں کے ساتھ۔ اور ان کے پیچھے بستی کے چند نوجوان ہو ہا کرتے ہوئے چلے آرہے ہیں اور سب کے پیچھے میاں حسین بخش کا برق انداز دلاور خاں لٹھ سنبھالے ہوئے۔ سلیم رو رہا تھا برق انداز دلاور خاں اس کی ماں بہن کو گالیاں دے رہا تھا۔

سامنے مویشیوں کو گھیر کر رکھا گیا دلاور خاں لاٹھی ٹیک کر وہیں کھڑا رہ گیا چپراسی برآمدے میں آیا اور آداب بجا کر ایک طرف کھڑا ہو گیا سلیم میاں کی آنکھیں گنگا جمنا بہا رہی تھیں سنوہر اس منظر سے متاثر ہوا مگر کشن لال بدستور مسکرا رہے تھے۔

سلیم نے آگے بڑھ کر روتے ہوئے کہا "......
حضور کچھ فیصلہ کر دیجئے"

کشن لال نے چپراسی سے پوچھا "کی ڈگری"

چپراسی نے کہا۔ "ایک سو پچاس روپے کی"

سلیم صحن پر سر ٹیک کر کہنے لگے "حضور بالکل غلط میں نے میاں صاحب سے صرف پچاس روپے قرض لئے تھے۔ سو روپے دے چکا ہوں اب ایک سو پچاس روپے کی ڈگری کیسے ہو گئی؟"

"تم چپ رہو!" کشن لال نے ڈانٹ کر کہا اور سلیم واقعی چپ ہو گیا۔

کشن لال نے چپراسی سے پوچھا "تم روپیہ لوگے یا یہ جائیداد؟"

"سرکار" چپراسی نے کہا "روپے تو سلیم میاں عدالت میں جا کر پیش کریں میں تو ان مویشیوں کو لے جا رہا ہوں"

"سلیم بول اٹھا مگر حضور غضب ہو گیا دودھ دینے والی گائے اور بھینس یہاں لانے کے پہلے ہی دلاور خاں میاں صاحب کے گھر پہونچا آیا ہے"

ابھی اس نے اتنا کہا ہی تھا کہ دلاور خاں اپنی جگہ سے تڑپ کر آیا اور کشن لال کے سامنے سلیم کی گردن پکڑی اور اسے جھنجھوڑ کر اٹھایا اور چپ بہ گالیاں دے کر کہا۔ "حرامزد سرکار کے سامنے بھی جھوٹ بولتا ہے وہ گھونسے جاؤنگا کہ اٹھ کر پانی بھی نہ پی سکے گا" سلیم کا چھوٹا بچہ چیخ مار کر رو اٹھا اس کے بڑے لڑکے نے آگے بڑھ کر اپنے باپ کو سنبھالا اور دلاور خاں کی طرف دیکھ کر کہا۔ اس ضعیف انسان پر تمہیں ہاتھ اٹھاتے ہوئے شرم بھی نہیں آتی اور وہ بھی سرکار کے سامنے"

"برآمدے پر ایک بھیڑ لگ گئی تھی کشن لال کے گھر کی عورتیں دروازے کی اوٹ میں آ کر کھڑی ہو گئیں کشن لال کا پوتا سندر ان دوڑا دوڑا آیا اور بھاگا ایک ایک کا موہنہ تکنے لگا سنوہر پیچ و تاب کھا رہا تھا اسے چپراسی سے زیادہ برق انداز پر غصہ آ رہا تھا اس نے مجمع پر نگاہ ڈالی مجمع بالکل شانت تھا مویشی دنیا و مافیہا سے بالکل بے خبر بدستور جگالی کر رہے تھے سامنے پوال کے ڈھیر پر بھینس نے اپنا موہنہ ڈال دیا تھا۔

سلیم نے دلاور خاں سے کہا۔ تم بھی مسلمان ہو میں بھی مسلمان ہوں قرآن پاک کی قسم کھا کر کہو تم چپراسی کے ہاتھ میں روپے دے کر گائے بھینس لے کر چپت نہیں ہو گئے یہ دونوں چوکیدار بھی گواہ میں"

دونوں چوکیداروں نے فوراً کانوں پر ہاتھ دھرے

اور فقی میں سر ہلا کر کہا "کیوں سلیم میاں یہ سفید جھوٹ کیوں؟"
سلیم نے کہا " اے بھائی چوکیدار اور چپراسی تو عدالت کا آدمی ہے دلاور خاں حسین بخش کا برق انداز ہے مگر تم پٹواری تو ہمارے علاقہ کے آدمی ہو اب تم لوگوں نے ہمیں جھوٹا بھی ٹھہرا دیا"

"تو آپ سچے ہی کب کہے ہیں" کشن لال نے ایک معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔

منوہر نے کہا "کشن کاکا! کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ ڈیڑھ سو روپیہ دے کر سلیم کی جائیداد بچا لیں۔"

"تو تم نے سمجھا نہیں" کشن لال نے کہا "یہی تو سب سے پہلے میں نے چپراسی سے پوچھا تھا وہ تو حکم کا بندہ ہے وہ اپنی طرف سے تو کچھ نہیں کر سکتا اور ابھی تمہیں ان باتوں میں دخل دینے کی ضرورت نہیں جب وکیل بن جاؤ گے تو ان باتوں کو سمجھنے لگو گے۔" پھر انہوں نے چپراسی سے پوچھا "یوں بھئی تم نے کھانا کھا لیا ہے۔؟"

"نہیں حضور صبح سے تو اسی آسامی نے جان کھا رکھی ہے کھانے کی فرصت کہاں"

"اچھا تو آرام کرو پہلے آتما تب پرماتما" پھر انہوں نے سلیم سے کہا "سلیم میاں تم بھی مکان جاؤ میں سب انتظام کئے دیتا ہوں ہاں آتے وقت جو میں نے کہا ہے کہ لیتے آنا" اور پھر انہوں نے اپنے نوکر سے کہا لوگوں سے کہہ دو یہاں سے چلے جائیں وقت بہت زیادہ ہو گیا ہے"

نوکر نے حکم کی تعمیل کی دونوں چوکیدار بھی دو بجے آنے کا وعدہ کر کے چلے گئے۔

منوہر اٹھا اور اس نے بھی اجازت چاہی۔

کشن لال نے کہا "منوہر! میں نے جس کام کیلئے تمہیں بلایا تھا وہ تو پوچھا ہی نہیں تم نے خواہ مخواہ کی بحث چھیڑ دی ذرا شام کو ٹہلتے ہوئے چلے آنا تم سے باتیں کرنے میں ذرا لطف آتا ہے"

منوہر کے چلے جانے کے بعد کشن لال نے چپراسی سے سرگوشیاں شروع کر دیں۔ پروانہ دیکھا ڈیڑھ سو روپیہ کی ڈگری تھی ڈیڑھ سو روپیے میں ایک بھینس جو دو تین مہینے کے اندر اندر بچہ دینے والی ہو اور دس بیل دو گائیں گوال نہیں چپراسی کو ڈگری کے روپیے سے غرض ہے ان مویشیوں سے اسے کیا مطلب مگر یہ قانونی بات سلیم کے سامنے ہونی چاہئے۔

کشن لال نے دلاور خاں اور چپراسی کے کھانے کا انتظام کر دیا اور خود اندر جا کر کھانا کھانے کے بعد اپنے کمرے میں لیٹ رہے نوکر حقہ دے گیا اسی سے دل بہلانے لگے۔

تھوڑی دیر کے بعد ہیرالال کمرے میں آئی ایک دفعہ پھر کشن لال مغموم ہو گئے بیٹی کی جوانی عذاب جان سے کم نہیں لڑکی گھرانے کی عزت ہے جوان لڑکی اور یہ مذموم دنیا! عزت حاصل کرنا آسان کام نہیں بڑی مشکل سے عزت اور شرافت حاصل ہوتی ہے مگر ایک ہلکی سی لغزش بڑے سے بڑے شریف کی پگڑی اتار لیتی ہے اور خصوصاً اس وقت تو انسان مونہہ دکھانے کے قابل نہیں رہتا جب کسی بے عزتی اور بدنامی کی وجہ خود اس کی اپنی لڑکی ہو۔

ہیرا نے پوچھا "یہ ہنگامہ کیسا تھا دروازے پر"

"سلیم میاں کی جائداد قرق ہو گئی ہے"

"آپ کیوں نہیں چھڑا لیتے؟"

"یہی تو سوچ رہا ہوں ورنہ سلیم تباہ ہو جائیگا"

"اور منوہر سے کیا باتیں ہو رہی تھیں"

"وہ پاگل ہے کہتا ہے دھرم نے ہمیشہ انسان کو نقصان پہنچایا ہے۔ ہونہہ" اور کشن لال مالش لینے لگے۔

"وہ ناستک ہو گیا ہے کیا؟"

"رام جانے لڑکا برا نہیں مگر کالج جا کر دھرم نشٹ کر دیا ہے شاید۔"

(بقیہ صفحہ ۵۰ پر)

سِرِّ معرفت
ایک ہزار روپیہ انعام

شریمد بھاگوت گیتا کا منظوم اردو ترجمہ جس کے متعلق دعوے سے کہا جا سکتا ہے کہ اردو میں آج تک ایسا سلیس اور عام فہم منظوم ترجمہ شائع نہیں ہوا۔ اگر کوئی صاحب اس دعوے کو جھٹلا سکیں تو انہیں ایک ہزار روپیہ نقد انعام دیا جائے گا سِرِّ معرفت کے شروع میں شریمد گیتا سے متعلق جو معلومات دی گئی ہیں آج تک کم سے کم اردو میں ان کا وجود نہیں تھا مؤلف ابوالفصاحت پنڈت رلا رام رتن پنڈوری نے گیتا سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے سِرِّ معرفت میں جو واقفیت بہم پہنچائی ہے اس سے گیتا کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے

قیمت صرف ۱۲ ر روپے علاوہ محصول ڈاک

(پتہ)

دفتر شانِ ہند فلیٹ ۸ انصاری مارکیٹ دریا گنج دہلی ۲

غزل

• سید ابو محمد قیام افکلی (اعظم گڑھ)

نالوں میں اثر ہوگا تو کچھ ہو کے رہیگا
وہ بیج محبت کا کبھی بو کے رہیگا
ہر وقت بھروسہ ہے مجھے ابرِ کرم کا
سب نامۂ اعمال سیہ دھو کے رہیگا
اے غافلو ہوشیار زمانے کی ہوا سے
وہ قافلہ لٹ جائے گا جو سو کے رہیگا
شکوہ نہ کسی کا نہ شکایت ہے کسی کی
قسمت میں جو لکھا ہے وہی ہو کے رہیگا
واقف نہیں آدابِ محبت سے مرا دل
جو چاہتے ہیں آپ وہی ہو کے رہیگا
باتوں کا پرکھنا اچھے قیامؔ آئے نہ جس کو
وہ قیمتی دل اپنا کبھی کھو کے رہیگا

شمالی ہند کے مشہور غزل گو
حضرتِ گوہر عثمانی کا

مجموعۂ کلام　　(قیمت پچیس روپے)

اعتراف :۔ شائع ہو گیا ہے بہترین کلام مشاہیرِ ملک کے گرانقدر مضامین سے مزین۔

تقسیم کار :۔ ماہنامہ شانِ ہند فلیٹ ۸ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

دلی انتظامیہ ترقی کی شاہراہ پر

عوامی خدمات کے دو سال

- منصوبہ جاتی اخراجات میں تین گنا اضافہ۔ سال ۸۰-۱۹۷۹ء میں ۱۴ر۱۰۷ کروڑ روپے سے بڑھ کر سال ۸۵-۱۹۸۴ء میں تقریباً ۲۹۰ کروڑ روپے۔
- کمزور ترین طبقے کے لوگوں کی حالت سدھارنے کے لیے بیس نکاتی پروگرام کے تحت چلائی جارہی اسکیموں کے لیے منصوبہ جاتی اخراجات کا ۴۸ فی صد وقف۔
- سال ۸۵-۱۹۸۴ء میں صنعتی اکائیوں کی تعداد بڑھ کر ۶۵ ہزار ہوگئی جبکہ سال ۸۳-۱۹۸۲ء میں ۵۵ ہزار تھی
- تین مقامات پر ایک کھڑکی سیوا شروع۔ بھائی کانکنی علاقے میں جدید طریقے سے کھدائی کا کام شروع۔
- ہزار صنعتی پلاٹوں کے فروغ کا کام آخری مرحلے میں۔
- عام صارفین کے فائدے کے لیے چلتا پھرتا بازار اور مناسب داموں والی ۳۰۰۰ ہزار سے بھی زیادہ دکانیں موجود۔ کارپوریشن آف انڈیا کے گوداموں سے راشن کی خوردنی اشیاء کی براہ راست فراہمی۔
- میٹروپولیٹن کونسل نے صارفین حزبیہ (تنازعات) بل پاس کردیا ہے۔
- بین صوبائی بس اڈے کے پاس دریائے جمنا پر ۷ر۲ کروڑ روپے کی لاگت سے تعمیر ہونے والے پل کا ۷۰ فی صد کام مکمل وزیر آباد اور لونیاں والے پلوں کی تعمیر بھی تقریباً مکمل۔
- سبھی کے لیے ابتدائی تعلیم کے نشانہ کو پورا کرنے میں دلی ملک سب سے آگے۔
- تکنیکی تعلیم کو بڑھاوا دینے کے لیے فوٹوگرافک انسٹی ٹیوٹ اور دلی ٹیکنالوجی انسٹی ٹیوٹ کا قیام
- ۵۰۰ بستروں والے دو اسپتالوں اور ۱۰۰ بستروں والے اسپتال کی تعمیر بڑے پیمانے پر جاری دیہی اور دور دراز کے علاقوں میں پالی کلینک اور ڈسپنسریاں کھول گئیں۔
- خاتون صنعت کاروں کے لیے بننے والے صنعتی کمپلکس میں دس فی صد اور دیگر صنعتی کمپلیکسوں میں تین فی صد پلاٹ محفوظ
- خواتین کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کی روک تھام سے متعلق بل میٹرو پولیٹن کونسل سے پاس۔
- ریاستی سائنس و ٹکنالوجی کونسل کا قیام توانائی کے بہتر استعمال میں لائے جانے والے ملکنہ طریقہ سے متعلق اسکیموں کا آغاز
- سبھی کالونیوں میں اور تقریباً ۸۰ ہریجن بستیوں میں پینے کے پانی اور بجلی کے بندوبست۔
- بڑے پیمانے پر رہائشی اسکیموں پر تیزی سے عملدرآمد شروع۔ بھیڑ بھاڑ والے علاقوں، بازآبادکاری کالونیوں، اور تسلیم کی گئی غیر مجاز کالونیوں میں ماحولیاتی سدھار پروگرام پر عملدرآمد شروع ہے۔

محکمۂ اطلاعات و اشاعت، دلی انتظامیہ دلی

FEBRUARY 1985 Phone : 275602 Regd· No.D-(CN) 370
THE SHAN-E-HIND MONTHLY NEW DELHI-110102
Regd with the Registrar of Newspaper at R. No. 644 57

بالوں کا انداز چاہے کوئی بھی ہو لیکن اگر بالوں کی
یہ گھٹائیں ہمیشہ قائم رکھنا چاہیں، انہیں دراز، ملائم اور کالا رکھنا چاہیں تو زلفی ہیئر
ٹانک ہی استعمال کیجئے۔ یہ گرتے بالوں کو روکتا ہے، خشکی دور کرتا ہے اور بالوں کی جڑوں کے نیچے تک
پہنچ کر بالوں کی بیماریوں کو ختم کر دیتا ہے۔ زلفی ہیئر ٹانک تیل نہیں بالوں کی غذا ہے۔ سر پر نئے
بال اگانے میں مدد دیتا ہے۔ اپنے بال صابن سے نہ دھوئیے۔ یہ بالوں کی جڑوں کو جلا دیتا ہے۔ دھونے
کے لئے زلفی پاؤڈر استعمال کیجئے جو بالوں کو صاف رکھتا ہے۔ ان کو ریشم کی طرح ملائم بناتا ہے

● لیبارٹریز، لال کنواں، دہلی ●

عرب ممالک میں زلفی حاصل کرنے کے لئے رجوع فرمائیں
مسقط اور مکہ معظمہ میں
ایم۔ ایم ملیباری

متحدہ عرب امارات میں
منیب بورا ایجنسی
● دبئی فون نمبر
● مسقط فون نمبر

● دبئی فون نمبر
● شارجہ ● ابوظہبی
دیگر ممالک کے لئے
ایجنسی حاصل کرنے کے لئے لکھئے

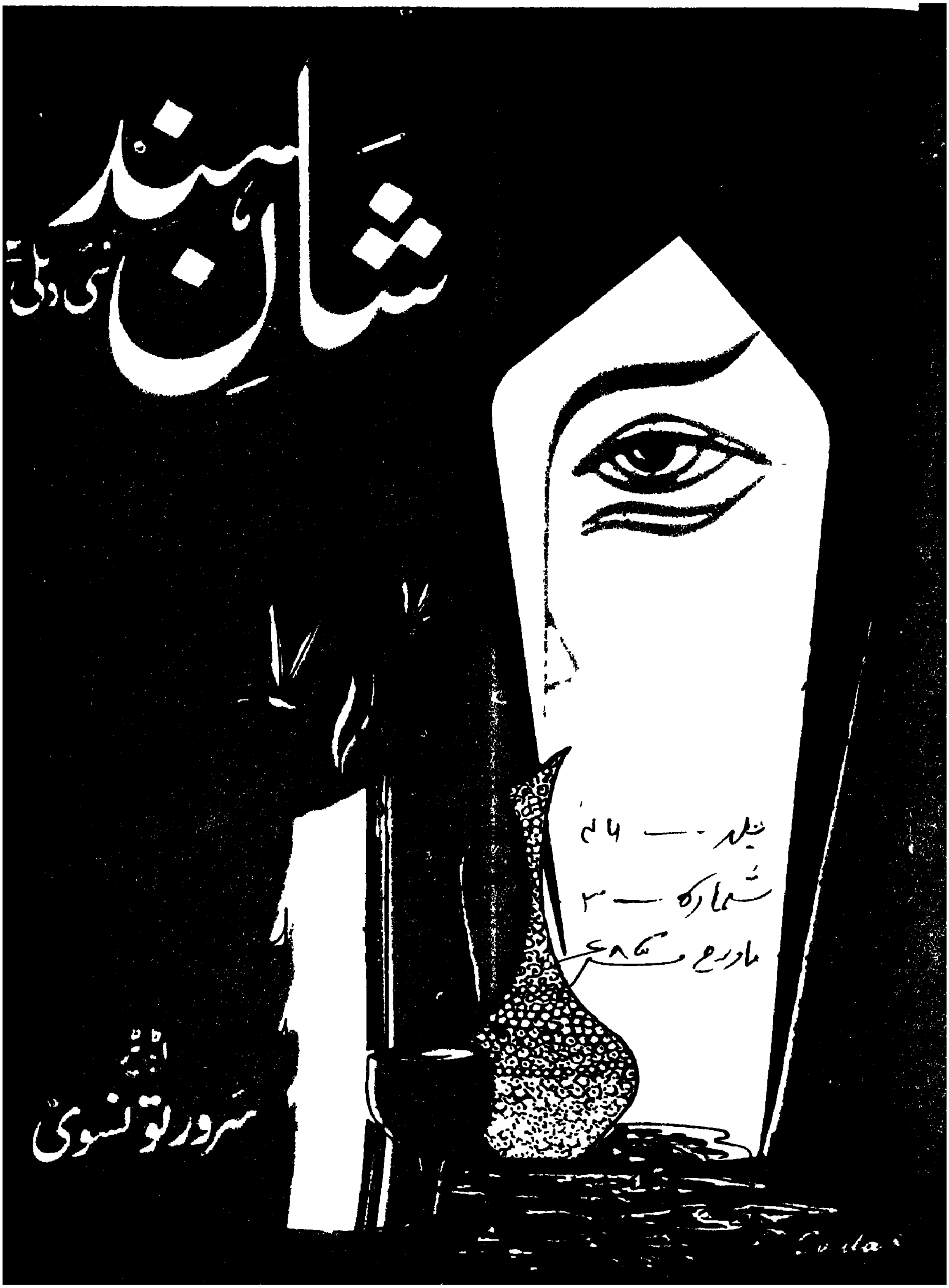

شانِ ہند
نئی دہلی
جلد — ۱۸
شمارہ — ۳
مارچ ۱۹۸۴ء
ایڈیٹر
سرور تونسوی

At Shriram, the focus is always on good performance, whether in the factory, field, office—or auditorium. Artistic talent is promoted as systematically as work talent.

Employees of Shriram Fertilisers & Chemicals, at Kota and elsewhere, are given every opportunity to develop their talents—in music, dance, drama—and perform at their best.

Our Shriram Kala Mandir at Kota is equipped with the latest lighting and acoustics technology. And our Shriram Ramlila is a brilliant spectacle which attracts thousands from all over Kota and the neighbouring areas.

SHRIRAM

PEOPLE GROWING TOGETHER

Shriram Fertilisers & Chemicals

(Prop. DCM LIMITED)

LATE GOPI NATH AMAN
(16-9-1898 — 7 / 1983)

AMAN SAHIB WITH SH LAL BAHADUR SHASTRI

SH B D JATTI (ACG PRESIDENT)
AWARDING PADAM BHUSHAN TO AMAN SAHIB ON 2-4-1977

SH AMAN ADDRESSING A CONFERENCE
(CHIEF GUEST SH JAWAHARLAL NEHRU
& PRESIDED BY SH JAI SUKHLAL HATHI
STATE MINISTER HOME)

SH RADHA RAMAN
(C E C DELHI) PRESENTING
TAMRAPATRA TO AMAN SAHIB

ٹیلی فون نمبر ۲۷۵۶۰۲ رجسٹرار آف نیوز پیپرز فار انڈیا کا رجسٹریشن نمبر ۵۷/۴۴۴۹۶ رجسٹرڈ نمبر ڈی ۳۷۰ DN

ہندو پرست ہوں نہ مسلماں پرست ہوں
دامن پرست ہوں نہ گریباں پرست ہوں

ہر ذرۂ وطن سے ہے فیاض مجھ کو پیار
یعنی وطن پرست ہوں انساں پرست ہوں
(فیاض گوالیاری)

ماہنامہ
شانِ ہند نئی دہلی

ایڈیٹر
سرور تونسوی

فی پرچہ اڑھائی روپیہ
زرِ سالانہ ۲۴/- روپئے

بیادِ جناب گوپی ناتھ امن لکھنوی

اس شمارے کی قیمت تین روپے

جلد نمبر ۱۴	مارچ ۱۹۸۵ء	شمارہ نمبر ۳

معذرت

۱۲ اکتوبر ۱۹۸۴ء کو انجمن یادگارِ امن لکھنوی کی سالانہ نشست کے سلسلے میں جو مشاعرہ منعقد ہوا اس کا آنکھوں دیکھا حال راقم نے لکھ کر اعظم گڑھ حافظ عبدالستار صاحب خوشنویس کی خدمت میں بھیجا کیونکہ شانِ ہند کی کتابت اعظم گڑھ میں ہوتی ہے۔ مگر بدقسمتی سے یہ روداد راستے میں گم ہو گئی جس کی وجہ سے میں نادم ہوں کہ حسبِ وعدہ اس مشاعرہ کی روداد شائع نہ ہو سکی تاہم ان شعرائے کرام کے اسمائے گرامی حسبِ ذیل ہیں جنہوں نے اس مشاعرہ میں شرکت فرمائی۔

جناب حسین علی جعفری (صدرِ مشاعرہ) ذکی طارق صاحب سکریٹری ادبی سنگم غازی آباد۔ جناب اسلم حنفی ڈبائی۔ ڈاکٹر ریاض ساحل غازی آبادی۔ تپش غازی آبادی۔ سرور صاحب ایڈیٹر شانِ ہند نیز جناب تصور نصرانی۔ عبدالرفیق محسن۔ حضرت ادیب لکھنوی۔ تابش لکھنوی۔ ضمیر صاحب۔ عتیق صاحب۔ علی احمد صاحب۔ رام چندر رشید صاحب۔ سید محمود نقوی۔ جناب ڈاکٹر اوڈے سنگھ ارمان بلاروی۔ ناظم صاحب۔ جناب قمر سنبھلی۔ ریاض اختر ادیبی۔ خنداں دہلوی شاگرد حضرت امن لکھنوی۔ عشرت کرت پوری۔ جمیل ہاپوڑی۔ ضیا میرٹھی تلمیذ حضرت سیماب اکبر آبادی حضرت اعجاز وارثی۔ شمس غازی آبادی۔ ڈاکٹر دھرمیندر ناتھ (فرزند ارجمند حضرت امن لکھنوی) جناب شارق میرٹھی۔ نیاز مند سرور تونسوی

ودیا پرکاش سرور تونسوی ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے خواجہ پریس چتلی قبر منگلو جامع مسجد دہلی سے چھپوا کر دفتر شانِ ہند فلیٹ ۸ انصاری مارکیٹ دریا گنج۔ نئی دہلی ۲-۱۱۰۰۰ سے شائع کیا۔

القرآن المنظوم

مُرتبہ: کبیر کوثر

- قرآن پاک کا اردو، ہندی، انگریزی میں منظوم ترجمہ
- قرآن مجید کے ترجموں کی تاریخ ساز اولین پیش کش
- قرآن مجید کے متن کے ساتھ ساتھ اردو ہندی میں لفظ بہ لفظ کبیر کوثر کا منظوم ترجمہ
- قرآن حکیم کا متن اور عبداللہ یوسف علی کا انگریزی ترجمہ جسے حکومت سعودی عربیہ کی سندِ منظوری حاصل ہے۔
- ہندوستان کے علمائے کرام جناب ابوالحسن، منت اللہ صاحب امیر شریعت بہار اور اڑیسہ، قاضی القضات مولانا نظام الدین۔ مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی مرحوم وغیرہ کی اسنادِ پسندیدگی سے مرصع۔
- فوٹو آفسیٹ پر دو رنگی طباعت۔ رنگین سرورق
- ھدیہ: دس روپیہ فی پارہ علاوہ محصول ڈاک۔ یا حسب حیثیت

کبیر کوثر کی دلکش، نظر افروز، سہل المفہوم مساعیِ جمیلہ کا نادر و نایاب تحفہ

پہلا پارہ نومبر ۱۹۸۵ء سے دستیاب ہے

بلبل چہ گفت؟ گل چہ شنید؟ وصبا چہ کرد؟

دلی اردو اکاڈمی

ہندوستان میں سب سے پہلے اُتر پردیش اردو اکاڈمی قائم ہوئی۔ اس کے بعد بنگال، بہار، مدھیہ پردیش، مہاراشٹر، کرناٹک، راجستھان، آندھرا پردیش وغیرہ پردیشوں میں اردو اکاڈمیاں وجود میں آئیں۔ سب سے آخر میں دلی اردو اکاڈمی قائم ہوئی۔ ہر نئی اکاڈمی نے اتر پردیش اردو اکاڈمی کے آئین کو پیش نظر رکھ کر اپنا آئین بنایا اور اسی کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش اپنے اپنے ذرائع کے مطابق کی۔ اس لحاظ سے اتر پردیش اکاڈمی ایک ماں کا درجہ رکھتی ہے اور باقی پردیشوں کی اردو اکاڈمیاں اس کی بیٹیوں کی حیثیت رکھتی ہیں۔

اتر پردیش اردو اکاڈمی کو جو سرکاری امداد ملتی ہے وہ ہندوستان کی دیگر تمام اردو اکاڈمیوں کو ملنے والی سرکاری مجموعی امداد کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ اس لئے کسی دوسرے پردیش کی اکاڈمی کا مقابلہ اتر پردیش اردو اکاڈمی سے نہیں کیا جانا چاہئے۔

اتر پردیش اردو اکاڈمی میں جو بے ضابطگیاں ہو رہی ہیں اور خصوصاً موجودہ چیئرمین کے باعث جو درشت ہی ٹوٹ پڑی ہے یعنی ایک ابتدائی قاعدہ کی محض کاغذی تیاری میں جو ہزاروں لاکھ روپیہ ضائع کر دیا گیا، اس کی کچھ جھلکیاں آپ نشانِ ہند کی کسی گذشتہ اشاعت میں ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ لہٰذا جب کوئی ماں بدکار ہو تو اس کی بیٹیاں اپنی ماں کے نقش پا پر چلنے میں کوئی برائی نہیں سمجھتی ہیں بلکہ اکثر اوقات بیٹیاں ماں سے چار قدم آگے نکل جاتی ہیں۔ یہی حالت ہماری کچھ اردو اکاڈمیوں کی بھی ہے، جن کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں ہے۔ اس وقت ذکر دلی اردو اکاڈمی کا ہے جو پاؤں پاؤں چلنے کی عمر میں آئی ہے مگر اس نے جو کارہائے نمایاں کئے ہیں ان کی شہرت نہ صرف اپنے ملک میں ہی ہے بلکہ پاکستان، انگلینڈ اور دوسرے ممالک تک جا پہنچی ہے اور وہاں کے اخبارات میں اس کا ذکر آ رہا ہے۔

اسکولوں میں اردو کی تعلیم کے لئے کوشش کرنا۔ اردو کے قابل طالب علموں کو وظائف دینا، اردو پڑھانے والے موزوں اساتذہ کی تقرری کے لئے کوشش کرنا۔ اردو کتابت سیکھنے کے لئے کلاسز جاری کرنا اور اسی قسم کے کئی ایسے پروگرام ہیں جو دوسری اردو اکاڈمیوں کی طرح دلی اردو اکاڈمی بھی انجام دے رہی ہے مگر فرق ہے تو صرف یہ کہ دوسری اکاڈمیوں کے زیر تحت یہ پروگرام شروع تو ہوتے ہیں مگر ان کی دیکھ ریکھ کے مناسب انتظامات نہیں ہیں۔ مگر دلی اردو اکاڈمی کے سکریٹری بذات خود ان پروگراموں کی نگرانی کرتے ہیں۔ اردو اکاڈمی کے دیگر ممبران کے تعاون سے ان پروگراموں کی دیکھ ریکھ بہتر انداز کی جاتی ہے۔ دلی اردو اکاڈمی کو سرکاری مدد ایک خاص حد تک ہی ملتی ہے مگر جو مفید اور قابل تعریف پروگرام اردو کی ترقی اور اردو کی بقا و حیات کے

اس نے اس مالی سال میں انجام دئے ہیں ان کی تفصیل اس ایڈیٹوریل میں تو کیا اگر شانِ ہند کا ایک شمارہ بھی وقف کر دیا جائے تو بھی تشنۂ تکمیل رہے گی۔ مگر اس کے دو چار مخصوص پروگراموں کی اگر داد نہ دی جائے گی تو یقیناً ناانصافی ہوگی۔

"شانِ ہند" کی گزشتہ اشاعت میں اردو اکاڈمی دہلی کے زیر اہتمام مشاعرۂ خواتین کا آنکھوں دیکھا اور کانوں سنا حال آپ کی نظروں سے گزرا ہوگا۔ دلی میں اب تک متعدد خواتین کے مشاعرے ہو چکے ہیں مگر جو کامیابی اس مشاعرہ کو حاصل ہوئی اس قسم کے دوسرے مشاعرے اس کی گرد کو بھی نہ پہنچ پائے تھے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ کسی مشاعرے کی کامیابی یا ناکامی کے بارے میں ایڈیٹر شانِ ہند کی رائے کو کسی طور بھی چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔

مرزا داغ دہلوی پر سیمینار اپنی طرز پر ایک ایسا سیمینار تھا کہ مرزا داغ کی روح بھی داد دئے بغیر نہ رہ سکی ہوگی۔ اس کے بعد دلی اردو اکاڈمی کی جانب سے اردو افسانہ ورکشاپ / سیمینار منعقد ہوا جس میں ملک بھر کے مشہور افسانہ نگاروں کے علاوہ اردو کے بلند پایہ دانشوروں کو بھی مدعو کیا گیا تھا خوش قسمتی سے ان دنوں پاکستان اور لندن سے کچھ پاکستانی شاعر بھی دلی میں موجود تھے لہٰذا ان شعرائے کرام کا بھی اس سیمینار میں شایانِ شان استقبال کیا گیا۔ جناب علی سردار جعفری کو بھی اس سیمینار میں ان کے اعلیٰ مقام کے مطابق خوش آمدید کہا گیا۔

اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ اردو افسانہ پر ایسا پُر وقار اور مفید مطلب سیمینار ہندوستان تو کیا دنیائے اردو میں پہلی بار منعقد ہوا اور اس سیمینار کی کامیابی کا سہرا یقیناً سیمینار کے ڈائرکٹر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے سر جاتا ہے جنہوں نے نہ معلوم کس کس طرح مشکلات پر قابو پا کر ایسی ایسی ادبی ہستیوں کو اس سیمینار میں اکٹھا کر دیا جن کو دیکھنے کے لئے بھی اردو پرست ترستے ہیں۔

مگر بُرا ہو بعض اردو ادیبوں، نقادوں اور شاعروں کی دلی کدورت، منافقت اور دو غلے پن کا کہ انہوں نے اپنے کچھ حواریوں کے ذریعہ "قومی آواز" میں خطوط شائع کرا کے اپنے دل کے پھپھولے پھوڑنے کی ناکام کوششیں کی۔ سب سے زیادہ مرچیں تو نارنگ صاحب کے مخالفین کو اس بارے میں لگیں کہ جناب صلاح الدین پرویز کو اسٹیج پر کیوں لایا گیا اور ان کی بابت حقیقت افروز باتیں کیوں کہی گئیں۔ قومی آواز میں بکواس کرنے والوں میں کیا یہ سکت ہے کہ وہ سارے ہندوستان میں ایک بھی ایسا مسلمان شاعر بتا سکیں جو صلاح الدین پرویز کی طرح ہندو میتھالوجی سے پوری طرح واقفیت حاصل ہو اور وہ اس کو اپنے اشعار میں ڈھال سکے۔ اگر ہم غیر ملکی شعرائے کرام اور اپنے ملک کے سرکردہ شاعر جناب علی سردار جعفری کا استقبال کر سکتے ہیں تو وہ اپنے ہی وطن کے اس ہونہار منفرد شاعر اور قومی یک جہتی کے جیتے جاگتے روشن مینار صلاح الدین پرویز کا استقبال کیوں نہیں کر سکتے جب کہ وہ سالہا سال سے سعودی عرب میں مقیم ہیں۔ یہ کہنا کہ صلاح الدین پرویز چونکہ مالدار ہیں اس لئے ان کا استقبال کیا گیا ایک ایسی چھوٹی بات ہے کہ جسے کہتے ہوئے بھی ندامت محسوس ہونی چاہئے تھی۔ کہنے والے تو یہ کہتے ہیں کہ واک آؤٹ کرنے والے نام نہاد ادیب یا اردو پرست وہ حضرات تھے جو صلاح الدین پرویز سے مالی فائدہ اٹھانے میں کامیاب نہ ہو سکے یا دوسرے الفاظ میں صلاح الدین پرویز نے ان حضرات سے دھوکا نہ کھایا۔ پاکستان اور لندن کے اردو اخبارات نے اس اردو افسانہ ورکشاپ / سیمینار کی کامیابی کے بارے میں جو نوٹ شائع کئے ہیں اگر انہیں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے یہ مخالفین پڑھ لیں تو شاید بواسیر کے عارضہ میں مبتلا ہو جائیں۔

دلی اردو اکاڈمی کے زیر تحت سہ روزہ سیمینار "دلی والے" بھی اپنی نوعیت کا انوکھا اور مفید نیز معلوماتی سیمینار تھا جس میں پچاس کے قریب دلی کی اُن آنجہانی ہستیوں پر خاکے پڑھے گئے جو دلی کی روایات کے آئینہ دار تھے اور جن کا تعلق اردو زبان کی نشو و نما سے رہا۔ اس سیمینار کے ڈائرکٹر ڈاکٹر صلاح الدین

، اپنی بساط کے مطابق اس سیمنار کو ہر نوع سے بہتر
ے بہتر انداز میں کامیاب بنانے میں جو کوشش کی اس کی
ریف کی جانی چاہیئے ۔

دلی اردو اکاڈمی کے سکریٹری جناب شریف احسن
نقوی جس مستقل مزاجی سے اردو اکاڈمی کو فعال ادارہ
انے میں کوشاں ہیں اس کے بارے میں صرف یہی کہا
اسکتا ہے کہ خدا نقوی صاحب کو نظر بد سے بچائے
ور انہیں اسی انہماک سے دلی لگن کے ساتھ اردو کی
دمت کے لیئے عمر طویل عطا فرمائے ۔ دلی اردو اکاڈمی
ے اسسٹنٹ سکریٹری مسٹر عابدی اور اسٹاف کے
یگر ممبران نے جس تندہی سے کئی کئی دن اور رات مسلسل
ام کر کے اکاڈمی کی تقریبات کو کامیاب بنانے میں
نت کی ہے وہ یقیناً قابل تعریف ہے ۔ نا انصافی ہوگی
گر اکاڈمی کے ایڈمنسٹر آفیسر جناب محمد عارفین صاحب
کا ذکر خیر نہ کیا جائے ۔ عارفین صاحب مختلف سرکاری
محکموں میں کئی مشہور زمان افسران کے ساتھ اپنے فرائض منصبی
کو جس خوش اسلوبی، دیانت داری اور ایمان داری سے
نبھاتے آئے ہیں وہ ہر سرکاری ملازم کے لیئے مشعل راہ
سے کم نہیں ۔ یہ ریکارڈ ہے کہ عارفین صاحب اپنی تمام
ملازمت کے عرصہ میں کبھی ایک منٹ بھی دیری سے دفتر
نہیں پہنچے، ہاں شام کو خواہ رات کے نو بج جائیں اپنا
کام نپٹائے بغیر گھر نہیں جاتے تھے ۔ ایک سرکاری اہلکار
اچھا افسر اور ایڈمنسٹر آفیسر کو کیسا ہونا چاہیئے، اس
کی زندہ مثال عارفین صاحب ہیں ۔ دلی کی شرافت اور
تہذیب پکار پکار کر کہتی ہے کہ میں عارفین کے وجود میں
دیکھی جاسکتی ہوں ۔ اور دیانت داری اور ایمانداری
زبان حال سے پکارتی ہیں کہ اگر ہمیں اپنانا ہو تو عارفین
صاحب کے نقش قدم پر چلیئے ۔

ایڈیٹر شان ہند کو یہ تسلیم کرنے میں دلی مسرت
ہے کہ جہاں وہ کئی اردو اکاڈمیوں کی کارکردگی سے
مایوس ہو کر ان اکاڈمیوں کو اردو کے لیئے ایک فال بد
سمجھنے میں حق بجانب تھا دلی اردو اکاڈمی کی بہترین اور
قابل آفریں کارکردگی سے اسے یہ محسوس ہونے لگا
ہے کہ شاید دوسری اردو اکاڈمیاں بھی دلی اردو
اکاڈمی کے نقش قدم پر چل کر اپنے فرائض منصبی کو
بہتر انداز میں ادا کرنے لگیں ۔ ●●

فارم ۴ بابت ملکیت وغیرہ رول ۸

۱۔ نام رسالہ　　شان ہند
۲۔ مقام اشاعت　　فلیٹ ۵ ۔ انصاری مارکیٹ
دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
۳۔ میعاد اشاعت　　ماہنامہ
۴۔ پرنٹر پبلشر، ایڈیٹر اور مالک: ودیا پرکاش سرور
۵۔ قومیت　　ہندوستانی
۶۔ پتہ　　فلیٹ ۵ ۔ انصاری مارکیٹ
دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

میں ودیا پرکاش سرور مالک پرنٹر پبلشر
ماہنامہ شان ہند اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا
تفصیلات میرے علم واطلاع کے مطابق درست اور
صحیح ہیں ۔

ودیا پرکاش سرور
۲۸ فروری ۱۹۸۵ء

پروفیسر گوپی چند نارنگ کی
تین نئی کتابیں
۱۔ اقبال کا فن　　پچاس روپے
۲۔ وضاحتی کتابیات　　پینتالیس روپے
۳۔ اسلوبیات میر　　پندرہ روپے
دفتر شان ہند فلیٹ ۵ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۲

گورنر اتر پردیش

جناب راجیو گاندھی صاحب وزیر اعظم نے وزارتِ عظمیٰ کا حلف لینے کے بعد فرمایا تھا کہ وہ ملک کو صاف ستھرا ایڈمنسٹریشن دیں گے اور کسی بھی ناپسندیدہ شخصیت کو اپنی وزارت میں نہیں لیں گے اور نہ ہی صوبائی حکومتوں میں آیا رام گیا رام ایسے اشخاص کو گھس پیٹھ کرنے دی جائے گی۔ جناب راجیو گاندھی صاحب نے اپنی کیبنٹ کے اسمائے گرامی کا اعلان فرمایا تو زیادہ تر وہی حضرات نئی کیبنٹ میں تھے جو کہ محترمہ آنجہانی اندرا گاندھی صاحبہ کی وزارت میں تھے۔ مگر ایک نام اس فہرست میں نہ دیکھ کر ملک کے ہر ذی فہم اور انصاف پسند کو اچنبھا ہوا کہ جناب محمد عثمان عارف صاحب کو راجیو گاندھی نے اپنی کیبنٹ میں کیوں نہیں لیا؟ کیونکہ محمد عثمان عارف صاحب کا سیاسی، اخلاقی، تہذیبی اور سماجی کریکٹر ایسا بے داغ رہا کہ جس پر فرشتے بھی ناز کریں۔ مگر یہ کہہ کر دانشور طبقہ خاموش رہا کہ "رموزِ سلطنت شاہاں بدانند"۔

کچھ حضرات نے جناب محمد عثمان عارف سے دلی زبان میں پوچھا بھی کہ آپ کو راجیو گاندھی صاحب نے نظر انداز کیوں کر دیا؟ مگر عارف صاحب نے مسکرا کر یہی جواب دیا کہ "میں نے کبھی کسی عہدے کے حصول کے لئے کندھا مار کر آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کی۔ آنجہانی محترمہ اندرا گاندھی صاحبہ نے مجھے حکم دیا تو جو بھی خدمت انہوں نے مجھے سونپی بسر و چشم انجام دی۔ میری وطن پرستی یا اندرا کانگریس کا ایک ادنیٰ ممبر ہونا یا خدمتِ وطن کے لئے ہر وقت تیار رہنا کسی معاوضہ یا حصولِ عہدہ کا رہینِ منت نہیں ہے بلکہ میں اصولاً اور صدقِ دل سے وطن پرست ہوں اور ملک کی خدمت کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں اور پورے یقین کے ساتھ یہ ایمان رکھتا ہوں کہ ہندوستان میں اندرا کانگریس ہی ایک ایسی پارٹی ہے جو اسے ترقی کی منازل درجہ بدرجہ طے کرا سکتی ہے اور سیکولرازم عقیدے کے مطابق حکومت کو چلا سکتی ہے۔ لہٰذا میں وزیر رہوں یا اندرا کانگریس کا ایک سپاہی مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

مگر چند ماہ بعد جبکہ ریڈیو اور ٹی وی پر جب یہ خبر سنی گئی کہ جناب محمد عثمان عارف صاحب کو اتر پردیش کا گورنر مقرر کیا گیا ہے تو ایسا محسوس ہوا کہ یہ اس سال کی وہ خوشگوار خبر ہے جسے اہلِ ملک نے انتہائی دل کی گہرائیوں سے پسند فرمایا ہے۔ ہمارے ملک میں یہ پہلا موقع ہے کہ کسی گورنر کی تقرری پر بازاروں میں عوام کی طرف سے خوشنودی اور مبارکباد کے پوسٹر چسپاں کئے جائیں۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ جس قدر اخبارات و رسائل نے جناب محمد عثمان عارف کے گورنر مقرر کئے جانے پر ادارتی شذرے لکھے ہیں آج تک کسی گورنر کے بارے میں نہیں لکھے گئے۔ اندور، دہلی یا الہ آباد یا بھوپال راجستھان کا اتر پردیش کے گورنر سے کوئی تعلق نہیں مگر عارف صاحب کے گورنر مقرر ہونے پر بھوپال، دہلی، اندور اور دیگر مقامات پر جو مبارکباد اور خوشنودی کے پوسٹر چسپاں ہوئے یا جلسے منعقد ہوئے وہ اس حقیقت کے مظہر ہیں کہ ہندوستانی عوام بلا تخصیص مذہب و ملت ہر اس شخص کے لئے آنکھیں بچھانے کو تیار ہیں جن کا سیاسی اور اخلاقی کیریکٹر بے داغ ہے۔ اور حکومت کے اونچے سے اونچے عہدے پر ایسے صاف باطن، ایماندار، دیانت دار اور سیکولر پسند شخصیت کے تقرر کو عوام اپنے لئے ایک نیک فال سمجھتے ہیں۔ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ جناب وزیر اعظم راجیو گاندھی نے جس اعتماد اور یقین

ہ ساتھ عارف صاحب کو ہندوستان کے سب سے
ڑے پردیش کا گورنر مقرر فرمایا ہے جناب عارف
ماحب اپنے محبوب وزیر اعظم کی توقعات پر پورا اتریں
گے۔ عارف صاحب نام اور مذہب کے لحاظ سے خدا
ے فضل سے ایک صالح مسلمان ہیں اور مذہبی طور پر
ن سے خلاف شرع کسی بھی بدعت کی توقع نہیں
جا سکتی مگر ان کے ذمہ جو فرض لگایا گیا ہے وہ
، بحیثیت ایک ہندوستانی کی حیثیت سے انہیں ودیعت
یا گیا ہے۔ لہذا ہم اپنے مسلمان احباب، اخبار
یسوں اور اردو کے سرپرستوں سے مودبانہ
زارش کریں گے کہ وہ اس خیالِ خام کو اپنے
ہن سے قطعاً نکال دیں کہ اتر پردیش کا گورنر ایک
سلمان ہے تو وہ اردو کو اتر پردیش کی دوسری
سرکاری زبان قرار دینے میں تمام حدود کو پھلانگ
ے گا۔ ایسا سمجھنا بھی محمد عثمان عارف صاحب کے
ساتھ سراسر زیادتی ہوگی۔ جب ملک کا راشٹرپتی
ی حکومت کو یہ حکم نہیں دے سکتا کہ اردو کو
س کا جائز مقام دیا جائے اسی طرح کسی صوبے
ہ گورنر بھی اپنی صوبائی حکومت کو یہ حکم نہیں
ے سکتا کہ اردو کو وہاں کی دوسری سرکاری زبان
رار دے دیا جائے یا اس سلسلے میں کوئی آرڈی ننس
اری کیا جائے۔ ایسی سب باتیں صوبائی حکومت کے
دائرہ اختیار میں ہوتی ہیں۔ اس میں کوئی شک
نہیں کہ ہمارے راشٹرپتی اور جناب محمد عثمان
عارف صاحب گورنر یو۔ پی۔ دونوں اردو کے
سرپرست ہیں اور دل و جان سے چاہتے ہیں کہ اردو
کو اس کا جائز حق ملے مگر یہ دونوں معزز ہستیاں
خود ایسا حکم نہ جاری نہیں کر سکتیں۔ اس لئے
سلمان حضرات کو ذرا احتیاط سے کام لینا چاہیے اور
گورنر یو۔ پی۔ سے غلط توقعات نہیں رکھنی چاہئیں۔
ایڈیٹر شان ہند کے ۳۵ سالوں سے

جناب عارف صاحب کے ساتھ یقیناً نیازمندانہ تعلقات ہیں
مگر کیا مجال ہے کہ اس طویل عرصہ میں انہیں کسی
موقع پر بھی انصاف، سچائی یا اخلاقی و تہذیب
کا ساتھ دیتے ہوئے نہ پایا ہو۔ ہاں یہ ہمیشہ رہا
کہ انہوں نے خوشامدیوں سے کبھی واسطہ نہیں رکھا
خواہ کوئی عزیز رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو، اس کا
ناجائز کام کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ ادیبوں
شاعروں اور اردو پرستوں کے لئے ان کا دروازہ
ہمیشہ کھلا رہا مگر ان کی سفارشوں پر انہوں نے
وہاں تک ضرور دھیان دیا جہاں حق و انصاف
کا خون ہو رہا ہو یا کسی بے گناہ کے ساتھ زیادتی
ہوئی ہو۔ اس لئے یو۔پی۔ کے اردو ادیبوں،
شاعروں اور نام نہاد اردو پرستوں کو دوستانہ
مشورہ ہے کہ وہ یو۔پی۔ کے راج بھون کو اتر پردیش
اردو اکاڈمی کا دفتر نہ سمجھ لیں بلکہ راج بھون کا
جو احترام ہونا چاہیے اس کا خاطر خواہ خیال
رکھیں۔

ہماری دلی دعا ہے کہ عارف صاحب کو خدا
ہمیشہ اپنی امان میں رکھے اور انہیں عمرِ طویل عطا ہو
کیوں کہ ملک اور قوم کی بڑی توقعات ان سے
وابستہ ہیں۔ ہم صمیم قلب سے عارف صاحب کو
اس عزت افزائی پر دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

جگدیش حنیف دہلوی کا تازہ ترین مجموعۂ کلام

آوازِ دل

شائع ہو گیا ہے۔ قیمت پندرہ روپے مجلد
اپنی لائبریری میں اس معقول مجموعۂ کلام کا اضافہ
آپ کے باذوق ہونے کی دلیل ہے۔
دفتر شان ہند، فلیٹ ۹ انصاری مارکیٹ
دریا گنج۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

اردو اکادمی دہلی

ایک نظر میں

- اردو کے مشہور ادیبوں، شاعروں، صحافیوں کو ادبی خدمات کے اعتراف میں پانچ پانچ ہزار روپے، اکادمی کے نشان، شالیں اور اسناد ایوارڈ کے طور پر دی جاتی ہیں۔
- اردو ناشرین کی حوصلہ افزائی کی خاطر اچھی مطبوعات پر دو دو ہزار روپے کے انعامات دئے جاتے ہیں۔
- سال میں ایک بار بہترین مطبوعات پر دہلی کے مصنفین کو دو دو ہزار روپے انعامات دئے جاتے ہیں۔
- مستحق اور ضعیف اہل قلم حضرات کو پس مرگ اُن کے وارثوں کو تین سو روپے ماہوار کی مالی امداد فراہم کی جاتی ہے۔
- مستحق اہل قلم حضرات کی تخلیقات کی طباعت پر مالی امداد دی جاتی ہے۔
- مشاہیر شعراء ادبا اور اہل قلم حضرات کے اعزاز میں اور ایسے ہی مہمانوں کے لئے اعزازی تقاریب منعقد کی جاتی ہیں۔
- اکادمی کی مرکزی لائبریری کے لئے اردو کی جدید اعلیٰ اور معیاری کتب کو خرید کر محبان اردو کے فائدے کے لئے انہیں محفوظ کیا جاتا ہے اور اردو درسگاہوں کو ایسی کتابیں مفت دستیاب کرائی جاتی ہیں۔
- دہلی کی تہذیبی، ثقافتی اور سماجی زندگی پر مذاکرات سیمینار اور نشستیں منعقد کی جاتی ہیں اور ان میں پیش کی جانے والی تقاریر، مقالوں اور رپورٹوں کو شائع کرایا جاتا ہے۔
- اردو ادب کی مختلف اصناف میں مجلسوں اور نشستوں کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ پیش کئے جانے والے کلام اور فن پاروں کو شائع کیا جاتا ہے۔
- اردو کی تعلیم کو فروغ دینے کے لئے چھٹی آٹھویں اور دسویں جماعتوں کے ہونہار اور امتیازی نمبر حاصل کرنے والے طلباء کو وظائف دئے جاتے ہیں۔
- اردو اسکولوں میں طلباء کے تقریری، مضمون نویسی، خوش خطی، غزل اور نظم خوانی وغیرہ کے مقابلے منعقد کئے جاتے ہیں۔
- اردو خوش نویسی کے فنکاروں کو فروغ دینے کے لئے اکادمی کی طرف سے اردو کتابت کا ایک دو سالہ کورس چلایا جا رہا ہے۔
- بورڈ اور یونیورسٹی کے امتحان میں اردو میں اول پوزیشن لانے والے طلباء کو معتدبہ رقم، سرٹیفکٹ اور میڈل بطور انعام دیا جاتا ہے۔
- غیر اردو داں بالغان کے لئے تعلیم کے مراکز قائم کئے جاتے ہیں جہاں شائقین کو اردو زبان کی تعلیم کے ساتھ ساتھ شعر و ادب کا ذوق پیدا کرایا جاتا ہے۔
- اردو زبان و ادب سے متعلق انجمنوں کو پروگرام کے انعقاد کے لئے مالی امداد دی جاتی ہے۔

کاروائی سالانہ نشست انجمن یادگار امن لکھنوی

غازی آباد

چودھری تیسٹرز بی ٹی روڈ غازی آباد کے ہال (گوشی گلشن) میں بتاریخ ۱۱ر اکتوبر ۱۹۸۱ء اتوار کو بوقت صبح گیارہ بجے انجمن یادگار امن لکھنوی کی سالانہ نشست منعقد ہوئی۔ پروگرام کا آغاز جناب گرسرن لال ادیب لکھنوی (برادر خورد امن لکھنوی مرحوم) کی استقبالیہ تقریر سے ہوا۔ آپ نے انجمن کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی۔ اِس انجمن کا انعقاد اکتوبر ۱۹۸۰ء میں ہوا۔ اس کے بعد باقاعدہ جلسے ہوتے رہے۔ علاوہ طرحی اور غیر طرحی شعری نشستوں کے ادبی موضوعات پر تقاریر بھی ہوئیں۔ مہمان خصوصی عالی جناب ویاس دیو مصرا سابق چیف جسٹس ہماچل پردیش ہائی کورٹ کی ذاتِ والاصفات کے متعلق آپ نے فرمایا کہ آپ صرف ماہر قانون ہی نہیں بلکہ قومی یکجہتی کے پیکر بھی ہیں۔ وسیع الاخلاق، بلیغ النظر، قابل مقرر اور ماہر دینیات بھی ہیں۔ جناب مصرا جی اُن معدودے چند اشخاص میں ہیں جو عالم باعمل ہیں۔ صدر محترم عالی جناب سید حسین علی جعفری کا تعارف کراتے ہوئے آپ نے فرمایا۔ جعفری صاحب شاعر، مقرر، بے لوث سماجی کارکن اور تنظیمی صلاحیتوں کے حامل ہیں۔ آپ کو خدا نے ایسی قدرتِ بیان عطا فرمائی ہے کہ مجالس میں تقریر کرتے ہوئے سامعین کے دلوں کو متاثرات سے اور آنکھوں کو اشکوں سے بھر دیتے ہیں۔ لیکن عام محفلوں کو زعفران زار بھی بنا سکتے ہیں۔ جناب مصرا اور جناب جعفری دونوں ہی برادر مرحوم جناب امن کے قریبی دوستوں میں سے ہیں۔

جناب ادیب کی تقریر کے بعد مہمان خصوصی اور صدر محترم نے مرحوم جناب گوپی ناتھ امن لکھنوی کی تصویر پر گل پاشی کی۔ جناب شمس غازی آبادی نے امن مرحوم کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ یوپی سوشل ویلفیئر بورڈ کی ممبر مسز شری چمپا بہن نے امن صاحب کو خراجِ عقیدت دیتے ہوئے اپنی تقریر میں کہا، امن جی میرے تیاسمان تھے اُن کے درشن کرکے ہمیشہ مجھے ادبی اور سماجی سیوا میں حوصلہ افزائی بھی ہوتی۔ میں نے جہیز کے خلاف کام [illegible] کے لئے دلی کے دیہات کی پدیاترا کی تحقیقۃً پایا کہ امن صاحب کی جگہ عوام کے دلوں میں سب سے [illegible] کی حیثیت سے نہیں بلکہ دُکھ درد سمجھنے اور قوم کی بے لوث خدمت کرنے والے کی حیثیت میں ہے وہ بھاشا کی تعصب سے الگ رہے کیونکہ وہ اُردو کے عالم تو تھے ہی ساتھ ہی ہندی سنسکرت گرمکھی کی گہری جانکاری رکھتے تھے اِس لئے اُن کے پاس اِن زبانوں کی کویتا وہ ساہتیہ کے شعر کی خوشبو تھی۔ وہ اخلاقی قدروں میں یقین رکھتے تھے کسی سے نفرت نہیں کرتے تھے شراب کے خلاف تھے مگر شرابیوں کے خلاف نہیں کیونکہ اُن میں ایکا نہیں تھا اس لئے نفرت نہیں تھی۔ امن صاحب کے درشن کرنا میرے لئے تو نعمت جیسا سمجھا گیا تھا ہی جو بھی اُن سے ملا آتے روحانی دولت بھی۔

جناب ذکی طارق نے ایک مقالہ پیش کیا جس کا موضوع تھا جناب امن لکھنوی کی غزل اور نظم نگاری۔ مقالہ سے قبل ذکی صاحب نے فرمایا کہ غازی آباد ڈسٹرکٹ انتظامیہ سے خط و کتابت جاری ہے کہ امن صاحب کی غازی آباد میں سیاسی اور سماجی زندگی سے تعلق اور دیرینہ کو دیکھتے ہوئے اُن کی کوئی یادگار قائم کی جائے سڑک یا پارک کا نام اُن کے نام پر رکھا جائے۔ ذکی صاحب کے مقالہ سامعین نے بہت پسند فرمایا۔

ذکی صاحب کے مقالے کے بعد جناب عبداللطیف اعظمی جامعی نے مقالہ پیش فرمایا جس کا عنوان تھا "جناب امن لکھنوی ایک سچے گاندھی وادی" جامعہ سے امن صاحب کا تعلق برسوں رہا۔ اعظمی صاحب امن صاحب کے دوستوں میں سے ہیں۔ اس لئے اِن کا تاثراتی مقالے میں دلی عقیدت کا اظہار تھا۔ جناب ضیا پرنسپل محمد جناب سیماب اکبر آبادی کو ادبی خدمات کے لئے انجمن یادگار امن لکھنوی کی طرف سے مہمان خصوصی کے دستِ مبارک سے ایک شال پیش کیا گیا۔ ضیا صاحب نے اس موقعہ پر قطعہ تاریخ پڑھا۔

دہلی یونیورسٹی کے اردو ڈپارٹمنٹ کے اسسٹنٹ پروفیسر جناب سید محمد عقیل رضوی نے امن صاحب ایک معاملہ کے عنوان سے ایک پُرمغز مقالہ پیش کیا جو بہت سراہا گیا۔

بزم مقالات کے اختتام پر مہمان خصوصی عالی جناب وائس چانسلر اور صدر محترم عالی جناب سید حسین علی جعفری صاحب نے امن صاحب کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے امن صاحب کی شخصیت اور کارناموں پر روشنی ڈالی۔ ان تقاریر میں یادوں کے دیے سلگتے تھے۔

نثری نشست کے بعد شعری نشست ہوئی جس کی نظامت کے فرائض جناب اعجاز مارہروی نے سر انجام دیئے۔

نذرِ امن

مہدی نظمی

ہر سخن تیرا ہے قرآنِ زبانِ اردو
تو ہے پیغمبرِ دورانِ زبانِ اردو

نازشِ لکھنؤ اعزازِ دیارِ دلی
اے جواں مرد نگہبانِ زبانِ اردو

سادگی حسن اثر سوز تصوف کی جھلک
اے ولی رنگ غزل خوانِ زبانِ اردو

امن کہتے ہیں تجھے امن کی آواز ہے تو
تجھ پہ نازاں ہیں دبستانِ زبانِ اردو

بس سے روکی نہیں دنیا میں گھٹن کی ظلمت
تو ہے وہ نیرِ تابانِ زبانِ اردو

یوں تو لاکھوں ہیں مگر صورت کے دیکھو تو سہی
آج ہے کون زباں دانِ زبانِ اردو

صدقہ اس شخص کرم کا اتارو نظمی
عمر بھر جو رہا قربانِ زبانِ اردو

نوٹ: یہ نظم جناب مہدی نظمی نے ششماہی تحریک امن کی یاد میں اس شمارے کے لئے تحریر فرمائی تھی۔

جناب امن لکھنوی کی وفات پر

ہے بُرا حال وطن جانِ وطن تیرے بغیر
سونی سونی ہے ہماری انجمن تیرے بغیر

جان تھیں باغ و چمن کی تیری خوش الحانیاں
اب کہاں باغ و چمن باغ و چمن تیرے بغیر

دیکھ سکتا کاش تو ہیں کتنے محزون و ملول
طفل و پیر و جوان و مرد و زن تیرے بغیر

دیدۂ حیراں ہے حیراں اب نظر آتا نہیں
سادگی میں وہ نرالا بانکپن تیرے بغیر

کون ہے اپنا جہاں میں ہم جسے اپنا کہیں
کیوں نہ ہو دل وقفِ صد رنج و محن تیرے بغیر

اب کہاں پائیں گے تیری سی زباں تیرا سا دل
ہو چکی بزمِ سخن بزمِ سخن تیرے بغیر

عظمتِ علم و کمال و فکر و فن کو رو دیئے
عظمتِ علم و کمال و فکر و فن تیرے بغیر؟

تیرا مرنا ہو گیا بارِ گرانِ زندگی
اہلِ دل ہیں دل گرفتہ خستہ تن تیرے بغیر

تجھ سے اچھے آدمی ملتے ہیں کب اس دور میں
خوش نما خوش رنگ گل کھلتے ہیں کب اس دور میں

اور تھا اگلا زمانہ اب زمانہ اور ہے
ساز اس کے اور ہیں اس کا ترانہ اور ہے

زخمِ دل درد جگر کی لذتیں اس دور میں؟
اور ہی تیر نظر ان کا نشانہ اور ہے

چاہتے ہیں ایک ایک پتھر آج سجدوں کا خراج
اور ہے تو امن! تیرا آستانہ اور ہے

اقتدار و مسند و منصب کا شیدا ہے جہاں
تیری فطرت اور اے مرد یگانہ اور ہے

آشیانہ ہے کہ جس سے آباد ہے باغ و چمن

اور ہیں باغ و چمن اب اصفیا شاد و رہے
اب بلبل اہلِ نظر ہیں اور حیرت کا جال
حُسن کا انداز طرز و اشفتا شاد و رہے
بس کے بچھے ور ششے کو لیجیا چاہیے
سوز غم درد محبت کا فسانہ اور ہے
اڑ گیا تو توڑ کر اپنے قفس کی تیلیاں
اپنی قسمت میں قفس کا آب و دانہ اور ہے
جب بھی تیری محفلوں کے دن ہمیں یاد آئیں گے
یاد سے تیری دلِ ناشاد کو بہلائیں گے

بزم جعفری متو منشا

انجمن یادگار ... لکھنؤ کی سالانہ نشست ... میں پیش کی گئی

منظوم عقیدت

دستِ قضا نے چھین لی وہ ذات باصفات
دستِ قضا مشیتِ رب ہے تو کیا کہیں
اشکوں کو روک لیں سرِ مژگاں بجا بجا
یارائے ضبط اس پہ نہ آئے تو کیا کہیں
کیسے کہیں کہ کوئی ہمارا چلا گیا
سارا جہاں کہے کہ ہمارا تو کیا کہیں
اللہ صبر و شکر عطا کر ہمیں کہ ہم
تیری رضا کو واقعی اپنی رضا کہیں
سب لکھنؤ کی واہ اک شمع بجھ گئی
اب کس کو بزمِ شعر و ادب کی ضیا کہیں
یعنی وہ امن جس کا طلب گار ہے جہاں
یعنی وہ امن جس کو صدائے وفا کہیں
تسلیم و صبر و ضبط بڑی چیز ہے مگر
دل اُس کو جب تڑپ کے پکارے تو کیا کہیں
سارا رفت آدمی کہیں ذکر بلیغ کو
یا فطرت بشر کی کوئی انتہا کہیں
سینہ دیں تو کیا اسے ماہِ تمام سے
یا مہرِ متاعِ حقیقت نما کہیں
استادِ امن تھے کہ صبح کی دھوپ تھے
یا پیکرِ جمال ضیا در صبا کہیں
یا اُس کو آگہی کے سمندر کا نام دیں
یا آسمانِ علم کی نیلی ردا کہیں
یا صاحبِ جمالہ کہیں طور کی جگہ
یا بت کدے میں ہند کے قبلہ نما کہیں
یا سبزگی کو نام دیں گنگا کی موج کا
یا سلسلۂ وطن کا مذاقِ آشنا کہیں
گاندھی کا جاں نثار وہ اک مرد حق شناس
دل چاہتا ہے حق گر وہ حق نما کہیں
یعنی فدائے علم و ادب گوپی ناتھ امن
جس کو فنا کے بعد بھی جانِ بقا کہیں
واللہ یہ تعلقِ خاطر کی بات ہے
حق اُس کوششِ منقبوں کا نہ ہوگا ادا کہیں
اے شمس اس سانحۂ طبیعت کی داد دو
کچھ اس طرح کہ لوگ تمہارا کہا کہیں

* شمس غازی پوری

انجمن یادگار لکھنؤ کی سالانہ نشست میں پیش کیا گیا۔

قطعہ تاریخ

از حضرت امن

اُٹھ گیا دنیا سے اک جانِ وطن　　رو رہی ہے انجمن کی انجمن
آہ وہ دیپک اچانک بجھ گیا　　جس سے روشن تھی ابھی بزمِ سخن
اُٹھ گیا وہ نغمہ سنجِ گلستاں　　جس سے تھی گرمیٔ صحنِ چمن
عظمتِ ہندوستان و طن کا شیفتہ　　تھی فلاحِ قوم کی دل میں لگن
شمعِ آزادی کا پروانہ تھا وہ　　دل میں رکھتا تھا نہاں سوزِ وطن
ہم قدم گاندھی و نہرو کا　　تھا نشانِ قوم تن اور اُس کا من
شکوہ بر لب وہ اسیری میں نہ تھا　　بن گیا تھا ... [illegible] ... دکن
دل تھا جب دردِ غلامی کا شکار　　تھا زباں پر نغمۂ حبِ وطن
اک ادیب و شاعرِ اعلیٰ تھا وہ　　نکتہ سنج و آشنائے علم و فن
گو ہر کا شانہ امن کا لکھنا لکھا　　اس کا ہر اک شعر تھا ... [illegible]

صدر محفل وہ ہر اک محفل میں تھا | تھا امیر کاروانِ علم و فن
تیغ کوئی اس کے مکتوب میں دیکھی | تھا عجب شیریں کلامی کا چلن
اہتمام ذرہ دیکھو دل میں تھا | ہیں کے گرویدہ سخن دبر ہمن
وقف جو کردہ گئی اس کے لئے | زندگی میں دولتِ شعر و سخن
کھل رہا ہے کی [illegible] کو رعنائیاں | جس کو تھا نیا ہی پیرہن
تھا نفس امن تلمیذ عزیز | نام گوپی ناتھ تھا استادِ فن
چھٹ گیا ہیہات ہم سے چھٹ گیا | وہ ہمارا رہنمائے راہِ فن
اور جام اسے شاعر خوش بیاں | رخصت اے روح رواں انجمن
سال رخصت ہو کر آب کو لکھا | رخصت اے سبحے طیق و بم وطن

۱۹۸۰ + ۳۰ ۱۹۸۴

کون ہے وہ جو شریک غم نہیں
اے ضیا کس دل میں یہ ماتم نہیں

سوگوار ضیا امرتسی

قطعہ

قافلہ ہر نفس کے ہم کارواں | موت کی راہوں میں وہ بھی کھو گئے
دعم دل بسمل ہوکہ تھم ہی گئے | امن بھی دنیا سے رخصت ہو گئے

از۔ بسمل شاہجہاں پوری

آفتاب تھا امن

جس سے ملتی تھی ادب کو روشنی | وہ ادب کا چراغ بھی نہ رہا
کون سمجھائے گا ادب کی باتیں | اب وہ حالی دماغ بھی نہ رہا

✲

گلزار ہستی تھی جانِ شعر و ادب کی | ایسے پھولوں کا باغ بھی نہ رہا
وہ فلسفہ نکتہ داں وہ ادیب | حیف صد حیف ماغ بھی نہ رہا

شعر گوئی کا آفتاب تھا امن
اہل علم و فن کا ماہتاب تھا امن

از صحیح گو

روزنامہ نئی اخبار
مورخہ ۹ جولائی ۱۹۸۴ء

قطعہ رحلت برادر محترم جناب امن لکھنوی

از ادیب لکھنوی

اُٹھ گیا حیف امن سا بھائی | دل غم درد سے دوچار ہے ۔ ہائے
سال رحلت ادیب نے لکھا | رحلت فخر روزگار ہے ۔ ہائے

۱۹۸۳ء

نوحۂ غم

چمن میں گل بھی نظر آ رہے ہیں خار مجھے
خوشی کی بات بھی خنداں ہے ناگوار مجھے
نہ پوچھ اے مرے غم خوار و غمگسار نہ پوچھ
میں اشک بار ہوں رہنے دے اشکبار مجھے
تمام دن نہیں ہاں ہاں تمام رات نہیں
تمام عمر ہی رہنا ہے سوگوار مجھے
کسی کو لاکھ بھلاؤں بھلا نہیں سکتا
کسی کی یاد ستاتی ہے بار بار مجھے
جناب امن گئے اب جہاں میں امن کہاں
یہی خیال رلاتا ہے بار بار مجھے
کچھ خبر تھی کہ رکھنا ہے سنگ سینے پہ
یہ جبر ہے جسے کرنا ہے اختیار مجھے
وہ جانے زیست پہ گرتی ہیں بجلیاں کتنی
ابھی اٹھانا ہے کتنے غموں کا بار مجھے
وہ اہل علم بھی دنیا سے اٹھتے جاتے ہیں
یہ فکر کرتا ہے رہ رہ کے بے قرار مجھے
جو زخم سینے میں خنداں ہیں خون رو رہے ہیں
دکھائی دیتی ہے یہ خونچکاں بہار مجھے

سوہن لال خنداں

آہ امن صاحب

میں سمجھتا تھا بڑا بھائی جسے | جس کو مجھ سے بھی محبت تھی سدا
امن کی رحلت کی خبر سن کر مجھے | ایک صدمہ [illegible] سا [illegible]

بچھڑ گیا ہم سے امن سا شفیق رفیق　　اے قضا کے ہاتھ تو نے کیا کیا
مردِ میدانِ صحافت بھی تھا وہ　　جنگِ آزادی کا بھی تھا سورما
جیل بھی کاٹی مصائب بھی سہے　　اور وزارت کا بھی چکھا ذائقہ
صاحبِ دل صاحبِ فکر و نظر　　وہ محبِ قوم بھی شاعر بھی تھا
اُس کا با مقصد تھا پاکیزہ کلام　　اُس کا ہر شعر دل کا آئینہ
شعر کی دُنیا میں تھا وہ نامور　　شاعروں میں بھی تھا وہ خوشنوا
اُس کو قدرت نے دیا سونے کا دل　　اُس کو فطرت نے دیا ذہن رسا
اُس کی فکر و فن پہ تھی گہری نظر　　اُس کو حسبِ حُسن کا احساس تھا
اُس نے دیکھا زندگی کا گرم و سرد　　اُس نے دیکھا خشک تر سوکھا ہرا
زندگی سادہ تھی اور اُونچے خیال　　اُس نے بالپن سے تھی سیکھی یہ ادا
اُس نے جیون کو سمجھ رکھا تھا کھیل　　بار ہا ہارا وہ جیتا بارہا
ایسے پاؤ گے کہاں بالغ نظر　　امن بیچ میں گوہر نایاب تھا
اُس پہ ارزاں ہوں ترے لطف و کرم　　اُس پہ برسے تیری رحمت کی گھٹا

شانتی دے اُس کی روحِ پاک کو
ہے یہ غالب کی دعا اور التجا

جناب منوہر لال صاحب غالب چکولی

رُباعیاتِ غم

اے اخترِ دل سوختہ اے مہرِ وفا　　کیوں رُوتا ہے جنت میں ہے وہ ذاتِ صفا
بولیں وفاتِ عیسوی میں طاہر سب بار کرو کچا یہ اعداد بنا
۱۱۵　۲۳　۱۹۸۵

اشکِ غم

وہ شہسوارِ لکھنؤی تہذیب چل دیئے
سرمایہ دارِ لکھنؤی تہذیب چل دیئے
سُونا پڑا ہے مکتبِ تہذیبِ لکھنؤ
آموزگارِ لکھنؤی تہذیب چل دیئے
چھائی ادب کے باغ پہ ہے ٹوٹ کر خزاں
جانِ بہارِ لکھنؤی تہذیب چل دیئے
تھے پاسدارِ لکھنؤی تہذیب جو یہاں
وہ شہر یارِ لکھنؤی تہذیب چل دیئے
کردارِ لکھنؤی جنہیں تھا جان سے عزیز
وہ جاں نثارِ لکھنؤی تہذیب چل دیئے
تہذیبِ لکھنؤی کا نشاں مٹ مٹا گیا
جو تھے وقارِ لکھنؤی تہذیب چل دیئے
تہذیبِ لکھنؤ میں ہے ماتم بپا ہوا
سر رشتہ کارِ لکھنؤی تہذیب چل دیئے
تہذیبِ لکھنؤ کو جہاں میں تھا جن پہ فخر
وہ افتخارِ لکھنؤی تہذیب چل دیئے
اُف حضرتِ منور و عالی جنابِ امن
آئینہ دارِ لکھنؤی تہذیب چل دیئے
اخترؔ فلک غم ہوں نہ کیوں اہلِ لکھنؤ
وہ ناجدارِ لکھنؤی تہذیب چل دیئے

(عالی جناب بخشی اختر آمر لکھنوی)

اشکِ غم

بر وفات منشی گوپی ناتھ صاحب

امن لکھنؤی بتاریخ ۷ جون ۱۹۸۴ء بعمرہ ۷۰ برس بمقام جموں

قطعات

ماتم منا رہے ہیں سب ہم امن لکھنوی کا　　چھایا ہوا ہے اخترؔ غم امن لکھنوی کا
زار و منور الفت محترم چل دیئے تھے　　محفل میں تھا غنیمت دم امن لکھنوی کا

فنِ سخن کے نکتے پوچھیں گے کس سے جا کر　　جائیں گے محفلوں میں کس کو غزل دکھا کر
ناچیز سے اخترؔ ہر شعر ڈھونڈیں گے اب　　بیٹھے گا انجمن میں کون اپنا سر اٹھا کر

تاریخی قطعہ بر وفات علامہ گوپی ناتھ صاحب امن لکھنوی

قدر لکھنؤ کا وہ شاعر نہیں رہا　　مخمورِ لکھنوی نا ۔۔ ماہر نہیں رہا
حاصل تھی شعر کہنے پہ قدرت تمام　　وہ امن سا زمانے میں شاعر نہیں رہا

علامہ جناب راز لائلپوری صاحب
۱۹۸۵ء

افتتاحیہ تقریر مہمانِ خصوصی عالیجناب وی ایس دیو مصرا

سابق چیف جسٹس ہماچل پردیش ہائی کورٹ

صدرِ محترم بزرگو اور دوستو ۔

جب مجھے اس بزم کے لئے مدعو کیا گیا تو کچھ تعجب بھی ہوا کیونکہ نہ میں شاعر ہوں اور نہ اردو دانوں میں ہوں ۔ آج کل سیاست والوں ، منسٹروں ، چیف منسٹر وغیرہ کو مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے بلانے کا رواج ہے اور وہی ہر موضوع پر تقریر کرتے ہیں ایسی کہ تقریر ختم ہونے پر اگر خیال فرمایا جائے کہ کیا کہا گیا تو کچھ سمجھ میں نہ آئے ۔ میں نے اس بزم کے مدعو کرنے والے منتظمین سے بھی سوال کیا مجھے کیوں بلایا جا رہا ہے تو جواب ملا آپ کو اس لئے بلایا گیا ہے کہ آپ ان صاحب کے ساتھ متعدد مشاعروں اور جلسوں میں شریک ہوتے ساتھ رہے ہیں آپ نے انہیں نزدیک سے دیکھا ہے ۔ میں بھی اسی بزم میں اس لئے حاضر ہوا ہوں کہ جناب احسن کا میں بھی قدیم مداح رہا اور اُن کے ساتھ مجھے ملک و ادب کی خدمت کے مواقع ملے ہیں اس لئے مجھے یہ حق ہے کہ میں احسن صاحب کے متعلق کچھ کہہ سکوں ۔

سن ۱۹۳۱ء کے لگ بھگ کا ذکر ہوگا ۔ جنم اشٹمی کے موقع پر تیج کا ایک خاص نمبر نکلتا تھا ۔ ہم سب بھی سال بھر اس انتظار میں رہتا تھا کہ کب یہ نمبر نکلے ۔ ہمارا خاندان نئی دلی میں رہتا تھا ۔ میرے والد سرکاری ملازم تھے گھر میں انگریزی اخبار 'نیشنل کال' آتا تھا ۔ اسٹیٹسمین نہیں اس کا فرق اُس زمانے کے لوگ اچھی طرح سمجھتے ہیں ۔ یعنی ہم نیشنل والے تھے گھر میں تیج کا اسپیشل نمبر آتا تھا ۔ ہم بچوں کا کام یہ ہوتا تھا کہ مضامین اور نظمیں پڑھی جائیں اور اُس میں جو تصاویر ہیں اُن کو کاٹا جائے فریم میں جڑ دیا جائے وہی تصاویر ہمارے گھر میں لگی ہوتی تھیں مجھے یاد ہے ان تصاویر میں ایک چرخہ چلاتا ہوا گاندھی کو گلوب پر بیٹھے ہوئے دکھایا گیا تھا اور احسن صاحب کا شعر اُس کے نیچے لکھا ہوا تھا ۔ وہ شعر اب تو مجھے یاد نہیں اور نہ ہی اُس زمانے میں شعر و سخن کی ہماری جانکاری تھی کہ سمجھ سکوں اس کا مطلب کیا تھا مگر یہ ضرور یاد ہے کہ وہ احسن صاحب کے لکھے ہوتے تھے کیونکہ اُن کے نیچے احسن صاحب کا نام تھا ۔ اُس کا ایک مصرع شاید یہ تھا ۔

ع ۔ کوئی نہ ہو غلام یہ تیرا پیام ہے

یہ اُس وقت کی باتیں ہیں جب لیڈر اور سیاسی کارکن ملک کی خدمت میں کچھ لیتے نہیں بلکہ دیتے تھے ہیں ۔ آج کل ایسا نہیں ہے ۔ گدھ کی طرح انتظار کر رہے ہیں کب موقع ملے کھانا شروع کر دیں ۔

اسکول کی تعلیم ختم کر کے جب کالج میں آیا تو مشاعروں اور جلسوں میں جانا شروع کیا وہاں احسن صاحب کو دیکھا لیکن اُن سے بات چیت آزادی کے بعد ہی شروع ہوئی ۔ میں ولایت سے تعلیم حاصل کر کے آیا تھا سن ۱۹۴۷ء کا دور دلی میں بڑی پریشانیاں تھیں ۔ دلی میں شیعہ حضرات سوچ رہے تھے محرم اور چہلم کے جلوس اور مجلسیں ہو سکیں گے کہ نہیں ۔ اس سلسلے میں کو خاص حضرات سے واقفیت بڑھی ۔ احسن صاحب سے بھی جان پہچان دوستی بڑھی مشاعروں ، جلسوں ، مجلسوں میں ساتھ گئے ۔ میں ان صاحب کے گھر بھی گیا ان سے خوب خوب باتیں ہوئیں ۔ مذاق کا لطف بھی لیا ۔ ہم لوگ بھی احسن صاحب کے ساتھ مذاق کر لیتے تھے اور وہ اُس کا بھی مزہ لیتے تھے ۔ اس مذاق کے متعلق جعفری صاحب نے ابھی ذکر فرمایا تھا مگر اس کا ایک پہلو انہوں نے چھوڑ دیا تھا ۔ میں کسی سبھا سنستھا کے خلاف نہیں کہہ رہا لیکن اکثر دیکھا گیا ہے جب تک شاعر یا مقرر نہ پہنچے منتظمین بہت انتظار رہتے ہیں لیکن مشاعرہ اور جلسہ ختم ہوا تو وہ پریشان ہوتا ہے کہ گھر کیسے جاؤں ۔ ہم لوگ بھی ان پریشانیوں سے گذرے ہیں ۔ امروہے میں مجلس ہوتی جاتے وقت موٹر کار کا انتظام تھا لوٹتے وقت ریل گاڑی ۔ آنے میں بہت دیر تھی وقت گذارنے کے لئے منتظمین نے ہمیں امروہہ گھمانا شروع کیا ۔ ایک درگاہ میں لے گئے جہاں [illegible]

ہاتھ پر رکھ لیجئے تو کوئی تماشا نہیں تھا۔ مرکاہ والے اندر سے ایک بڑا کالا بچھو
لائے اور فوراً کہا ہاتھ پھیلایئے میں نے امن صاحب کی طرف
اشارہ کرکے کہا یہ ہمارے بزرگ ہیں ان کے ہاتھ پر بچھو رکھیئے۔
یعنی ہمیں بچھو پر اعتبار نہیں تھا ورنہ نشانہ بنایا امن صاحب کو۔
ان کے ہاتھ پر بچھو رکھا گیا مگر اس نے کاٹا نہیں۔ اس تذکرہ کا مقصد
یہ ہے کہ امن صاحب جتنے سنجیدہ تھے اصولوں کے پابند تھے اتنے
ہی مذاق میں مزہ لینے والوں میں سے تھے۔ ان کے متعلق
مذاق ہوتا کوئی فقرہ یا جملہ یا پھبتی کسی جاتی تو وہ اس سے لطف
اندوز ہوتے تھے۔

زندگی ایسی ہی چیز ہوتی ہے جس میں سردی گرمی بہار و
خزاں سب کچھ شامل ہے۔ امن صاحب کی زندگی میں کیا کچھ تھا
کہاں تک بتلایا جائے ان کی علمیت کے بارے میں تو سب جانتے
ہی ہیں مگر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ عالم باعمل تھے۔ آج
کل لوگ اصولوں کا ڈھنڈورہ پیٹتے ہیں۔ بڑی بڑی تقریریں بلند
آواز میں کرتے ہیں کہ کمزور طبقوں کے لئے یہ ہونا چاہیئے یہ کرنا چاہیئے
مگر خود کیا کرتے ہیں اس کا سوال ہی نہیں۔ امن صاحب جو کہتے تھے
وہی خود بھی کرتے تھے۔ میں نے ان کے رہن سہن کا ڈھنگ دیکھا ہے
کیونکہ ان کے گھر آیا جایا کرتا تھا۔ ان کے یہاں ملازم کو بھی گھر کے
بچے جیسا پیار ملا اس نے تعلیم حاصل کی اور ایک اچھی نوکری
پاکر ٹیچر بن گیا۔ ان کے یہاں جتنے ملازمین آئے اچھی اچھی نوکریوں
پر پہنچے اور یہ قابلِ ذکر بات ہے۔ آج کون ہے جو منسٹر یا اسپیکر جیسے
عہدوں پر پہونچ کر بھی بس میں سفر کرے گا۔

آج آدمی بک رہا ہے یا بکنے کو تیار ہے ہر شخص کی ایک قیمت
ہے کس کی کیا وہ بات جانے دیجئے جو لوگوں کو خریدے وہ اس
علاقے کا راجا بن جاتا ہے۔ دنیا والے انہیں دوست رشتے دار یہاں تک
کہ گھر کے لوگ بھی ناراض ہو جاتے ہیں اس کے تمام دھرے جاتے
ہیں اصولوں کو مانا جائے تو غلط کام کیسے کیا جا سکتا ہے۔ اس
لئے اصولوں پر چلنا بہت مشکل ہے۔ اور اس کا امتحان ابھی زندگی
کے میدان میں ہوتا ہے اس امتحان کے بعد جو سند ملتی ہے جیسے
بی اے ایم اے کی ڈگری صرف نام سے نہیں ملتی اس کے لئے
امتحان پاس کرنا ضروری ہے۔ اصول کے لئے بھی صرف جاننا ماننا
ہی کافی نہیں ہے بلکہ امتحان میں کامیابی ضروری ہے۔ اصولوں کے
امتحان بہت مشکل ہوتے ہیں۔ عزت جبھی ملتی ہے جب امتحانات
سے کامیابی کے ساتھ گذر جائیں۔

امن صاحب کی یہ تعریف ہے کہ وہ اصولوں سے کبھی بھی
نہیں ہٹے ان کو کبھی یہ جرأت ملی۔ شاعری کی ہی بات لیجئے شعرا
حضرات تعریف کرنے پر آئیں تو زمین آسمان کے قلابے ملا دیتے
ہیں حاصل ہو جائیں یا ادھر برائی کریں تو ہجو لکھتے
ہیں شاعر لوگوں سے خوش ہو کر یا لوگوں کو خوش کرنے کے لئے
قصیدے بھی لکھتے ہیں۔ مشاعروں میں واہ واہ کے لئے کیسی
قسم کے اشعار لکھتے ہیں آپ حضرات خوب واقف ہیں لیکن امن
صاحب بھی ایک شاعر تھے لیکن نصف صدی سے زیادہ شاعری کی
لیکن کچھ کہا۔ ان سے پوچھئے۔ کلام میں آپ کہیں کوئی ایک شعر اصولوں کے
خلاف دکھا دیجئے یا کسی غلط آدمی کی تعریف میں کوئی قصیدہ یا نظم
یا اک شعر ہی دکھا دیجئے۔ جو کہا واہ واہ کے لئے نہیں عقیدت کی بنا پر
کہا۔ دماغ و دل میں کوئی فاصلہ یا فرق نہ ہو سکتے لوگ کر پاتے ہیں

میں جیتے جیسے رہ چکا ہوں اس لئے جانتا ہوں کہ اہمیت
پانے یا بڑی جگہ پر پہنچنے سے انسان پر کیا گذرتی ہے جیسے جیسے آپ
ابھرتے ہیں لوگ آپ کے خلاف ہوتے جاتے ہیں سب سے پہلے
دوست ہی خلاف ہوتے ہیں کیونکہ وہ یہ سوچتے ہیں کہ یہ ہمارے
ساتھ کا آدمی اتنا اوپر کیسے پہونچ گیا۔ آپ جتنا اوپر اٹھئے گا لوگ اتنے
ہی عیب نکالیں گے۔ وہ اپنی حماقتوں سے آپ کو تولیں گے اور
برائی کریں گے۔ عیب نہ بھی ہو تو بھی عیب نکالیں گے جیسے لوگوں
کو عیب نکالنے دوسروں میں برائیاں دیکھنے اور ڈھونڈھنے
کے علاوہ اور کچھ کام ہی نہیں رہا لوگ اپنے معیار سے آپ کے
متعلق اندازہ لگائیں گے فیصلہ کریں گے کوئی شراب کے معیار
سے دیکھے گا کوئی رشوت کے۔ یعنی کوئی چمک ہے تو لوگ اس میں
کالے دھبے ڈھونڈتے ہیں میں یہ سب کیوں عرض کر رہا ہوں۔
اس لئے کہ اگر امن صاحب میں اگر کوئی برائی ہوتی تو لوگ ضرور
کہتے کہ ان کے پاس کوٹھی ہے یا بچوں کے پاس اتنے مربع پلاٹ
ہیں بھائی بھتیجوں کے پاس کارخانے یا دکانیں ہیں جو آج کل
عام باتیں ہیں مگر امن صاحب کا دامن بے داغ رہا۔ میں نے

امن صاحب کا ذکر ۶۱ والان کا گھر بھی دیکھا اور دریا گنج کا بھی۔ جب تک میں دلی میں رہا یعنی جامعہ چل پرویش جانے سے پہلے ہفتہ اُن کے گھر جاتا۔ بامن نے اُنھیں قریب سے دیکھا ہے وہ تمام بُرے کاموں سے دور تھے اُن میں کوئی بُرائی یا عیب نہیں تھا۔

ابھی منیر لکھنوی مرحوم کا ذکر آیا تھا اُن کے امن صاحب شاگرد تھے اور کئی شاگرد تھے ادیب لکھنوی، جوش ملیح آبادی، روشن اعظم گڑھی اور نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی وغیرہ۔ جناب اثر لکھنوی جب بھی دلی تشریف لاتے تھے تو میرے یہاں ٹھہرنے کا کرم فرماتے تھے۔ کیونکہ وہ سب سے بڑی عمر کے تھے، اس لئے اور شاگردان عزیز اُن سے ملنے تشریف لاتے تھے۔ جوش ملیح آبادی بھی آتے تھے امن صاحب کو بھی [illegible] تاکہ کچھ شعر و شاعری کی بزم گرم ہو۔ اُس زمانے میں جوش صاحب اُن کی [illegible] کوشش کرتے تھے [illegible] کا نشہ ہو کر بھی شراب نہیں پیتے۔ امن صاحب نے فرمایا! میرے والد نہیں پیتے تھے اور اس کو بہت خراب مانتے تھے اور دوسروں کو اسے پینے سے منع کرتے تھے۔ جوش صاحب بولے: والد نے منع کیا مگر والد کے والد تو پیتے رہیں گے تو آپ کس کا کہا مانیں گے۔ یہ مذاق چلتے اور ہم لوگ اور ہم لوگ لطف لیتے ایک ایک مذاق میں کتنے مسئلے، مرحلے اور کتنی باتیں طے ہوتیں، تھیں۔ لیکن امن صاحب چاہے بزم مشاعرہ ہو یا ادبی نشست دوستوں کی محفل ہو یا سیاسی جلسے اُصولوں کے حق میں اور برائیوں کے خلاف آواز اُٹھاتے وہ بُرائی دیکھ کر خاموش نہیں رہے کیونکہ خاموشی بھی ایک طرح کی حمایت ہوتی ہے۔ جب امن صاحب کسی جلسے یا مشاعرے کے صدر ہوتے تھے، کچھ لوگ ناراض بھی ہوتے تھے کہ یہ اُصولوں کے بہت پابند ہیں ایسا نہیں ہونے دیں گے ویسا نہیں ہونے دیں گے۔ بہرحال امن ہمیشہ اُصولوں پر قائم رہے۔ میں امن صاحب کے ساتھ محفلوں میں رہا ہوں۔ آ بس شعر پر تقریر ختم کروں گا ؎

یوں تو بہت ہیں عشرت گاہیں
ان کی محفل اُن کی محفل

جواب طلب امور کے لئے جوابی خط لکھا کیجئے تاکہ آپ کو جواب فوراً مل سکے۔ [illegible]

بقیہ صفحہ ۴۲ سے اُس کے علاوہ ایک ہوئی ہیں جناب اور [illegible] لکھنوی۔ ان کا کلام بہترین ہے مگر انھوں نے ایک چیز کبھی نہیں دی سب پہلے تو اور تب سے گوشہ نشینی میں اور اب بھی جب میں نے واپسی پر آنے کے لئے درخواست کی تو صاحب نے فرمایا سٹیج پر بیٹھا نہیں جاتا ہے تم میں تو جمعہ کو بیٹھ [illegible] ہوں امن صاحب اور ادیب صاحب میں دوست تعلق رکھتے ہیں اس میں شعر و ادب ہی نہیں بلکہ تحقیق بھی پیدا ہوئی۔

امن صاحب کی ذات اعزاز کی محتاج نہ تھی عوام کی ہر طرح خدمت بھی کی اور رہنمائی بھی مگر روزانہ کی زندگی میں ذرہ بھر بھی فرق نہ آیا۔ وہی سادگی، وہی خلوص وہی صدق دلی اور وہی خدمتِ انسانیت کا جذبہ۔ جو جوانی میں تھا وہی اب بھی رہا۔ بلکہ سادگی پہلے سے زیادہ ہو گئی۔ کوئی اعزاز امن صاحب کی شان میں اضافہ نہیں کر سکتا تھا پھر بھی حکومتِ ہند نے اُن کو پدم بھوشن کا اعلیٰ اعزاز عطا کر کے ان کی خدمت کا اعتراف کیا۔ اسی سلسلے میں ہم لوگوں نے امن صاحب کو ایک استقبالیہ دیا تھا اس موقعہ پر میں نے جو نظم پڑھی وہ پوری تو مجھے یاد نہیں صرف مقطع یاد ہے ؎

اے جعفری قربانی سنجیر کے بدلے
ہے امن ابھی اور سدا امن رہے گا

مجھے اُمید قوی ہے کہ امن صاحب کے پرستار شمعِ امن کو ہمیشہ روشن رکھیں گے۔ اُن کی یاد میں ایک مستقل ادارہ قائم کریں گے جس کے ذریعے مرحوم کے شعر و سخن۔ علم و ادب۔ فلسفۂ حیات و موت۔ دین و مذہب اور صدق و صفا سے عوام فائدہ اُٹھا سکیں گے اور یکجہتی کی اک نئی بنیاد پڑ سکے گی۔

دیوان

قیمت پندرہ روپے

تقریر صدرِ بزمِ مقالات عالیجناب حسین علی جعفری نیشنل کمشنر اسکاؤٹس

خواتین و حضرات

حضرت امن لکھنوی کی ذات با برکات ایسی تھی کہ جن کے اوصاف زبان و بیان کے دائرے میں نہیں آسکتے۔ ایسی خدا پرست راست گو۔ عالی مقام اور مجسمۂ اخلاق و علم ہستیاں کم پیدا ہوتی ہیں۔ جو سوتی ہوئی دنیا کو جگا کر جب اس جہانِ فانی سے رخصت ہوتی ہیں تو ایسے نقش چھوڑ جاتی ہیں جو انہیں زندہ جاوید کی صورت میں تبدیل کردیتے ہیں۔ امن صاحب کی ذات گرامی ایسی ہی تھی۔

امن صاحب سے مجھے شرفِ ملاقات اس وقت حاصل ہوا جب میں ہندو کالج میں فرسٹ ایئر کا طالب علم تھا۔ ۲۴ یا ۲۵ دسمبر ۱۹۲۸ء کی بات ہے پنڈت امرناتھ ساحر دہلوی کے دولت کدے پر سالانہ مشاعرے میں (یہ مشاعرہ تاریخی ہوتا تھا) موصوف شرکت کے لئے آئے تھے۔ میں نے انہیں دنوں شاعری میں نیا نیا قدم رکھا تھا۔ نہ میں امن صاحب کے متعلق زیادہ جانتا تھا نہ وہ میرے متعلق جانتے تھے مشاعرے کی طرح یہ تھی۔

چٹکنا غنچہ و گل کا صدائے خندۂ دل ہے

آپ تو جانتے ہی ہیں نو آموزوں کو شروع ہی میں پڑھا دیا جاتا ہے۔ ابتدائی دور میں غزل پڑھنے کو مجھے بلا لیا گیا میرا اک شعر امن صاحب کو بہت پسند آیا اور وہی شعر مجھے اُن کے نزدیک لے گیا میں آپ کے سامنے بھی وہی شعر پڑھے دیتا ہوں ؎

مخالف ختم تو ہوتے ہی تو اچل بھی ہو گئی بہم
مرا جینا تو مشکل تھا مرا مرنا بھی مشکل ہے

غزل ختم ہونے کے کچھ لمحات بعد امن صاحب نے مجھے پاس بلا کر بہت تعریف کی جو میرے لئے اب تک مشعلِ راہ ہے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کیا کرتے ہیں۔ میں نے جواب دیا پڑھتا ہوں ہم دونوں نے جو باتیں کی وہ ادھوری ہی تھیں وہ میں دہراؤں گا نہیں۔ انہوں نے میرا امتحان لیا تھا کہ اعلم گنجہ کا رہنے والا ہے کچھ جانتا ہے یا نہیں۔ میں نے بھی اُسی لہجے میں جواب دیا تو بہت خوش ہوئے۔ میرے شعر کی تعریف کرتے ہوئے مجھے کہنے لگے، ابھی جو تمہارے جذبات اب ہیں وہ جوانی بھر نہیں رہنے چاہئیں۔ میں نے بھی جواب دیا جناب ایسے جذبات تو جبھی آتے ہیں جب جوانی اُبھرتی ہے۔ بڑھاپے میں نہیں آتے جب بڑھاپا آئے گا تو ایسے جذبات چھوڑ دوں گا۔ اس مشاعرہ کے بعد تو اُن کی خدمت میں بیٹھنے کے اکثر موقعے ملے۔ بہت سے مشاعروں، جلسوں، بیت بازیوں میں اُن کے ہمراہ شرکت کی۔ دہلی کی بہت مجلس میں یا حسین ڈے پر برابر ملاقات ہوتی رہی۔ دلی میں ہی نہیں دلی کے باہر بھی کبھی اندور کبھی علیگڑھ۔ بھوپال اور پونچھ ساتھ سفر کیا۔ یو پی کے بہت سے اضلاع میں ساتھ ساتھ گئے۔ میرے کرم فرما جناب جسٹس دیاس دیو صاحب بھی اکثر ساتھ رہے۔ ایک دو مرتبہ جناب ادیب لکھنوی بھی ساتھ تھے۔ وہ سفر وہ محفلیں وہ جلسے اب تک نظروں کے سامنے ہیں۔ عجیب کی بزمیں ہوتیں گفتگو رات باتیں کرتے بیتتی کبھی کسی کا واقعہ کبھی کسی کا قصہ۔

ہم نے امن صاحب کو بہت نزدیک سے دیکھا اُن کا رہن سہن، کس طرح کھاتے ہیں کس طرح اٹھتے بیٹھتے ہیں کس طرح خدا کی عبادت کرتے ہیں اور سب سے بڑی بات جو میں نے اُن میں دیکھی (۱۹۲۸ء کی پہلی ملاقات سے اُن کے انتقال تک) کہ وہ تعریف تو بارہا بہت سے لوگوں کی کرتے تھے مگر اُن کے منہ سے کبھی کسی کی برائی نہیں سنی۔ امن صاحب کی طبیعت کے متعلق میں کیا کہوں۔ اُن کی علمی، مزاحیہ اور سبق آموز گفتگو اب تک دل کی تسکین کا باعث ہے۔ اب جب کہ وہ نہیں ہیں اور ہم اس زمانے پر نظر ڈالتا ہوں تو آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں اور دل تڑپ جاتا ہے۔

امن صاحب کی ایک خاص صفت اُن کی طبع مزاح تھی۔ وہ شگفتہ طبیعت کے انسان تھے بڑے حاضر جواب تھے اور بات کہنے کا سلیقہ تھا ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ ہمیں حسن قصہ میں شرکت کے لئے امروہہ ضلع مرادآباد جانا تھا راستے

میں گھٹا کاٹنی پڑتا تھا جو اس زمانے میں کشتیوں کا تھا۔ کچھ کشتیوں کو مشاعرہ میں شرکت کے لئے کھول دیا گیا تھا۔ پل تو ٹوٹا ہوا تھا اور بیچ کا حصہ بہہ گیا تھا۔ ہمارا بچہ ایک بچھونے جانا تھا اور ایک بج چکا تھا۔ سب باری باری گئے مگر کام والوں آگئے پل والے بھی مانے آخر پیر اچھرا آیا بن گیا دس پندرہ منٹ میں سب کشتیاں چل گئیں اور ہم لوگ بھی پار ہو گئے کچھ دور چل کر آنے پر امن صاحب نے پوچھا جھوٹ کیا پل والوں سے کیا کہہ دیا کہ وہ لوگ فوراً بات مان گئے جب کہ ہم سب وہاں سے بات کر کے لوٹ آئے تھے نہ مجھ سے کام بنا نہ مصرا جی سے۔ انہوں نے جواب دیا اچھا جناب میں نے ان لوگوں سے کہا کمبختو کیوں اپنی موت بلا رہے ہو جانتے ہو کہ لا پتی تریاشی ہیں بخشیں گے نہیں۔ تو صاحب ۱۰ منٹ سے زیادہ دیر کشتیاں آنے میں نہیں لگی ہم جب پہنچے تو وہاں والے سخت ناراض تھے الگ بٹھا دیئے گئے دیر بہت ہو گئی تھی جو آنا تھا وہ آ چکا تھا نماز تو قضا ہو ہی چکی تھی کھانا بھی قضا ہو گیا۔ اس دن صبح جلدی چلنے کی وجہ سے ناشتہ بھی نہیں کیا تھا۔ ایک صاحب بلانے آئے پنڈال میں جاتے جاتے انہوں نے فرمایا کھانا جلسے کے بعد ہی کھائیں میاں مسرور مصرا جی نے کہا ' جی ہاں لہو کا شیر دور سے دہاڑتا ہے لیکن امن صاحب کا انداز ملاحظہ فرمایئے کہا صاحب یہی بات نہیں ہے بلکہ ہے جو ظرف ہے خالی وہ صدا دیتا ہے!

یہ مخلص ملتیں باتیں ہمارے سامنے ہیں ہم نے ان کا کتنا لطف اٹھایا کیا بتائیں۔ ان کی برجستگی کی بہت سی مثالیں اور اشعار مجھے یاد ہیں مگر وقت اتنی اجازت نہیں دیتا کہ میں اور کچھ ذکر کروں۔

امن صاحب منسٹر بھی رہے ڈپٹی اسپیکر بھی۔ پبلک ریلیشنز کمیٹی کے چیئرمین بھی رہے اور اسٹیٹ ٹرانسپورٹ اتھارٹی کے چیئرمین بھی وہ جس عہدے پر رہے جس کرسی پر بیٹھے اسے منزل معراج تک پہنچا دیا۔ وہ جن جگہوں پر رہے وہ ان کی عزت اور فخر کا باعث نہیں بنی بلکہ ان جگہوں کو قبول فرما کر امن صاحب نے ان عہدوں کو عزت بخشی۔ آج کل اگر کسی کو وزن کے لئے بھی راج مل جائے تخت و تاج مل جائے تو اس کی موت کیا سے کیا ہو جاتی ہے۔ میں تو دلی میں دیکھتا ہوں کہ جن کے پاس کل بھر پیٹ روٹی بھی نہیں تھی وہ اگر ایک مہینے کے لئے کرسی پر بیٹھ گیا تو بیٹے بیٹیوں اور اپنے لئے الگ الگ مکان بنوا لئے مہمانوں کے ٹھہرنے کے لئے الگ جگہیں بن گئیں یہ سب کیسے ہو گیا۔ امن صاحب ہمارے گاندھی وادی تھے۔ آج کل کے گاندھی وادی نہیں جب لوگ گاندھی وادی کہتے ہیں تو مجھے جھجک محسوس ہوتی ہے ایسے بہت کم ہیں جو واقعی گاندھی وادی ہیں۔ امن صاحب اصلی گاندھی وادی تھے کیوں کہ گاندھی وادی کے پاس لنگوٹی کے سوا اور جائداد نہیں ہوتی یعنی اس کے تن پر سادے کپڑوں کے علاوہ اور کوئی جائداد یا دولت نہیں ملے گی۔ ایسے آدمی بہت کم ہیں میرے کئی ساتھی، ساتھ کے پڑھے منسٹر ہیں۔ کچھ لیڈر۔ بہت سے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔ میں سب کو نہیں کہتا مگر زیادہ تر کا حال معلوم ہے کل تک گھر میں روز چولہا نہیں جلتا تھا آج ان کے بڑے بڑے مکان ہیں کوٹھیاں ہیں۔ لیکن یہ شخص یعنی امن لکھنوی جس پر ہم فخر کرتے ہیں اور مرتے دم تک فخر کرتے رہیں گے۔ اونچی اونچی کرسیوں پر بیٹھا منسٹر، ڈپٹی اسپیکر، چیئرمین رہا۔ بڑوں سے بڑوں سے دوستی رہی لیکن بڑے بڑے عہدوں پر رہتے ہوئے بھی امن صاحب اسی نوکری والان کے مکان میں رہے جس میں نہ ڈھنگ کی کھڑکی تھی نہ دروازہ۔ اور میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ جیسے تہی دست آئے تھے ویسے ہی چلے گئے لیکن دنیا والوں کو بتا دیا کہ جب ملک کی خدمت کرنی پڑتی ہے تو تہی دست رہنا پڑتا ہے اور تہی دست جانا پڑتا ہے بلکہ جو تھوڑا بہت سرمایہ پاس ہو وہ بھی خرچ کر دینا پڑتا ہے۔ یہ بڑا سبق ہے جو امن صاحب کی زندگی سے ہمیں ملتا ہے جو اور کہیں کم ہی ملتا ہے۔

جناب امن اور ان کے برادر خورد جناب ادیب لکھنوی نے عزیز لکھنوی سے تلمذ حاصل کیا۔ میں بھی جناب عزیز لکھنوی کے یہاں جایا کرتا تھا کیوں کہ میرے بہنوئی عزیز لکھنوی کے دوستوں میں سے تھے۔ جناب ادیب لکھنوی جو یہاں تشریف فرما ہیں میں سچ کہتا ہوں اگر عزیز لکھنوی کے کلام کا جائزہ لیا جائے تو ان کا کلام سر چشمہ۔ جہاں تک شعر و سخن کا تعلق ہے اساتذہ کا ایک مرتبہ

بقیہ صفحہ ۲۳ پر

جنابِ امن لکھنوی کی غزل اور نظم نگاری

تاریخ کے اوراق اس امر کے گواہ ہیں کہ اُردو شعرا نے آزادی کی عظمت اور حب الوطنی کے نغمے گائے ہیں اور سیاسی و انقلابیت کی بھرپور عکاسی کر کے ہندوستان کے عوام میں صرف اپنے کلام کے ذریعہ دلچسپی پیدا کی بلکہ اُن کو اس تحریک کے لیے اکسایا بھی۔

چکبست۔ حالی۔ آزاد۔ حسرت موہانی۔ سیماب۔ مولانا ظفر علی خاں۔ اقبال۔ تلوک چند محروم۔ بسمل الٰہ آبادی و دیگر امن لکھنوی نے اپنی ولولہ انگیز نظموں سے قومی تحریک اور جنگِ آزادی کو تیز تر کرنے میں ناقابلِ فراموش رول ادا کیا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ انگریزی ظلم و استبداد کے خلاف اُردو شعر و ادب میں وافر اور وقیع سرمایہ ملتا ہے۔

اس مختصر مضمون میں جنگِ آزادی کے سپاہی اور اُردو کی قومی شاعری کے محکم ستون جناب امن لکھنوی کی قومی نظموں اور غزلوں کا مطالعہ کرنے کی کوشش کروں گا۔ مایا کوفسکی، پابلو نرودا اور ناظم حکمت کی طرح جناب امن صاحب نے بھی اپنے قلم سے تلوار کا کام لیا ہے۔ اپنی بے باک نگاری اور شعلہ نگاری کے صدقے وہ کئی بار جیل کی سلاخوں سے شاد و غزلخواں گذرے ہیں۔ وہ قید میں رہ کر بھی زنداں کی دیواروں پر تاروں سے چاندنی چھنتی ہوئی محسوس کرتے اور چاندنی رات کا بھرپور حظ اُٹھاتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں

دیوارِ زنداں چاندنی چھنتی ہے پتوں میں

... صافیہ میں پائے ابسو ... سکھ نظارے

... صاحب کا اُردو شاعری کی ... صنف غزل پر ہی طبع آزمائی نہیں کی ہے بلکہ نظم میں بھی اپنے قلم کی جولانیاں دکھائی ہیں اُن کی شاعری کا بنیادی احساس ہمارے اُن کے تجربات اور مشاہدات کا ہمہ گیر ...

دیکھنے کو ملتا ہے۔ اُن کی شاعری میں رنگ برنگے پھول بھی ہیں اور خار دار جھاڑیاں بھی۔ جھوٹ، دھوکا، فریب اور طلسماتی فضا کے بجائے سچائی۔ حقیقت اور دل پر گذری ہوئی کیفیات کو جس خوبصورت انداز سے نظم کیا گیا ہے وہ اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ امن صاحب ایک سچے شاعر ہیں۔ وطن سے اُن کو والہانہ پیار ہے۔ ان نظموں میں آزادی کی بڑی حسین رنگین تصویر دیکھنے کو ملتی ہے۔ وہ آزادی کے ایک لمحے کو غلامی کی حیاتِ جاوداں سے بہتر سمجھتے ہیں اور طلبا کو سعادت مندی کا سبق دیتے ہوئے طنزاً فرماتے ہیں۔

یہ کیا کہ وطن کے گیت گاتے ہو تم
کیوں نیند کے ماتوں کو جگاتے ہو تم
کہتے ہو کہ ملک کو کریں گے آزاد
کالج میں شریر ہوتے جاتے ہو تم

شاعر ایک ایسا آلہ ہے جو ہمیشہ کام کرتا رہتا ہے کوئی بھی موسم ہو وہ اُس کی ذرا سی تبدیلی کو بھی فوراً محسوس کرتا ہے اور اُس کو ظاہر کرتا رہتا ہے۔ معاشرے میں اُس کی ٹھیک وہی حالت ہے جو انسانی جسم میں آنکھ کی ہوا کرتی ہے۔ جب ہماری قومی زندگی کا پیراہن چاک چاک ہو رہا تھا تو اُس پر آنسو بہانا اور اُس کے رفو کی تدابیر کرنا شاعر کے لیے فطری امر تھا چنانچہ "... مسلسل فریب" "دلِ مایوس سے خطاب" "وقتی اور ... ماں و اُمید" جیسی نظمیں جہاں ... کے حالات سے پوری طرح واقف ... ہیں۔ ان نظموں میں شاعر نے خارجیت اور داخلیت ... ات ... کشف کا ثبات ... مزاج کا ... جلتا ہے جو ... انا ... کی بنیاد ہوتا ہے ... وہ خلوص ہے جو امن صاحب کو اپنے ملک اور قوم سے رہا ہے۔

اُردو شاعری میں قنوطیت ... اور مرحوم ... کی ... کہ

عرصے سے چلی آرہی تھی لیکن امنؔ صاحب نے اپنے قلم کے ذریعہ دُنیا کو جنت بنانے اور انسان کو تہذیب یافتہ بنانے کے لئے استعمال کیا۔ اُنھوں نے استحصالی طاقتوں کے خلاف عوام کی سرفروشی کی ستائش اور اُن کی آزادی کی جدوجہد کی پُرخلوص اور پُرزور حمایت کی۔ آغازِ جنگ عظیم سے ۱۹۴۲ء کی شدید جنگ تک جو نظمیں امنؔ صاحب نے کہیں ہیں اُن کا اگر تنقیدی مطالعہ کیا جائے تو ہم دیکھیں گے کہ وہ بھی آزادی سے متاثر ہوکر کہی گئیں ہیں۔ جذبات کا اُبال زیادہ ہے جس کے ذریعہ عصری آگہی اور سماجی شعور فنکارانہ پیرایۂ بیان میں سمویا گیا ہے۔ "جنگ" اور جنگ پر ایک نفسیاتی نظر، ایسی نظمیں ہیں جن میں جنگ کی ہولناکیوں کا ذکر ہے۔ مظلوم اور سادہ لوح عوام کی دل گداز داستان ہے۔ یہ اس قسم کی نظمیں ہیں جو محض شاعری کرنے کے لئے نہیں لکھی گئیں ہیں بلکہ ان کی پشت پر وہی جذبۂ متبرک خواہشِ امن موجود ہے جو گاندھی جی کے دل کی دھڑکن اور امنؔ صاحب کے مزاج کا خاصہ تھی۔

۱۹۴۷ء میں جب فرقہ پرستی کے جنون نے ساری ہندو مسلم مذہبی اور تہذیبی روایتوں کو دفن کرکے درندوں کی طرح انسانوں کو پھاڑنا شروع کیا جب مسلمانوں اور ہندوؤں کے ضمیر میں ایسا خلا پیدا ہوگیا جہاں محبت اور انسانیت پر بھی نہ مار سکیں۔ تو اس وقت بھی شاعر اُس طوفانِ منافرت کو محبت میں بدلنے کے لئے کمربستہ دکھائی دیتا ہے شاعر نے اس آزمائش میں اپنا دامن تنگ نظری اور درندگی سے آلودہ نہ ہونے دیا بلکہ انسانیت کے نام پر اُن تمام فرقہ پرستوں عوام کے حوالے پہ لکھے جنھوں نے ہندوستان کے نام کو دنیا میں ذلیل و خوار کر دیا تھا۔ ہنگاموں کے آغاز پر اور ہنگاموں کے ختم ہونے پر اسی طرح کی نظمیں ہیں۔ مگر اس مذہبی جنون اور وبا کو پھر کیا نام دیا جائے کہ جس نے جنگِ آزادی کے سپہ سالار اور قوم کے میرِ کارواں، باپو گاندھی کا خون بہا کر دم لیا۔ یہ ایسا واقعہ نہ تھا کہ شعرائے کرام کے احساسات زخمی نہ ہوں اور ان کا قلم جنبش نہ کرے چنانچہ امنؔ صاحب نے بھی اپنے خون کے آنسوؤں کا خزانہ گاندھی جی کی موت پر شہادت کے بعد کے ذریعہ نچھاور کردیا۔ اس عقیدت میں محض غم نہ تھا بلکہ گہری نظر سے اُن حالات کا جائزہ بھی لیا گیا تھا جنھوں نے ملک کے ایک گروہ میں فاسستی رجحان پیدا کردیا تھا اور جنھوں نے اپنے مقصد کے لئے اس عظیم قومی رہنما پر بھی گولی چلانے سے دریغ نہ کیا جس کے جہاد النفس اور عمل نے انھیں سامراجی پنجہ سے چھڑایا تھا اور دُنیا کی قوموں میں سربرآوردہ بنایا تھا۔ اس نظم کے مطالعے کے بعد کہا جاسکتا ہے کہ اس میں نرا مرثیہ پن نہیں ہے بلکہ یہ دلی لگاؤ، خلوص کی گرمی اور انسان دوستی کے جذبہ کی مظہر ہے اور اس میں بہتی فکر کا پہلو نمایاں طور پر موجود ہے۔

نظموں کے ساتھ ساتھ امنؔ صاحب نے جو غزلیں کہیں ہیں اُن میں بھی اُنھوں نے محض خیال یا تصور پرستی پر قناعت نہیں کیا بلکہ بدلتے ہوئے سماجی حالات سے اپنے ذہنی اور جذباتی مطابقت کا زیادہ ثبوت دیا ہے اُن غزلوں میں اُس دور کی عام بے رونقی اور آرزوؤں کے بے رنگ رہ جانے کا اظہار سادگی اور خلوص کے ساتھ کیا گیا ہے ان میں انفرادی جذبوں کے اظہار کے مقابلہ میں اجتماعی زندگی کی محرومیوں کا عکس زیادہ ہے غمِ جاناں کے مقابلہ میں غمِ دوراں کی تصویر نمایاں طور پر ہمارے سامنے اُبھر آتی ہے۔ اُس کی وجہ شاید یہ ہے کہ شاعر نے از خود حقیقی زندگی کی آنچ محسوس کی ہے اُس زمانے کی بے مہری اور تلخی کا خود تجربہ کیا ہے اُس نے اپنی ذات ہی کو دُکھ بھرا نہیں پایا بلکہ تنگ نظری، تعصب، منافقت اور جہالت کا کھلی آنکھ سے مشاہدہ کر کے تجربہ کیا ہے اور اُن پر ردِ عمل اظہار کر حالات اور ماحول کو آئینہ دکھایا ہے۔

ان غزلوں میں زیادہ تر وہی پُرانی علامتیں منزل، بہار، خزاں، آشیاں، غربت، کارواں، دار و رسن، نشیمن وغیرہ کا استعمال کیا گیا ہے مگر شاعر نے اس دور کی مخصوص فضا کی بھرپور عکاسی کی ہے اور ان علامات کا اس دور کی واقعات سے براہِ راست تعلق دکھایا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ شاعر نے امن اور آزادی کے استقبال میں جو ترانے گائے ہیں وہ قابلِ صد مبارکباد ہیں۔

ذکی طارق ۱۹، جی۔ ٹی۔ روڈ۔ غازی آباد

منشی گوپی ناتھ امن لکھنوی — ایک سچے گاندھی وادی

عبداللطیف اعظمی

منشی گوپی ناتھ امن لکھنوی میں بہت سی خصوصیات
جمع ہو گئی تھیں۔ وہ تحریک آزادی کے مخلص مجاہد، اُردو کے
خوش گو شاعر اور ممتاز صحافت نگار تھے، مگر ان تمام خصو-
صیات سے بڑھ کر اُن کی سب سے بڑی خوبی اُن کی
سادہ اور بے ریا زندگی تھی، اُن سے گہرے گہرے اور بے تکلف
تعلقات تھے، اُن کو بہت قریب سے دیکھنے اور اُن کی
زندگی کا مطالعہ کرنے کا مجھے موقع ملا ہے، میں نے انہیں
مختلف حالات اور مختلف کیفیت میں دیکھا ہے، اُس وقت
بھی جب وہ محض صحافی تھے۔ اُردو کے صحافی جسے ملتا کم ہے
اور کام زیادہ کرنا پڑتا ہے اور بالعموم ضمیر کے خلاف لکھنا پڑتا
ہے، اور اُس وقت بھی دیکھا جب دلی میں اسمبلی قائم
ہوئی اور امن صاحب وزیر بنائے گئے، یہ زمانہ صحافتی دور
سے بھی زیادہ مشکل اور خطرناک تھا، کیوں کہ تنگی ترشی کی
زندگی دیانت داری اور ایمان داری سے گذارنا نسبتاً
زیادہ آسان ہے، لیکن اُس وقت جب اقتدار کی کرسی
وزارت مل جائے، دولت کی ریل پیل نہ سہی، آسائش کی
زندگی میسر ہو اور آگے پیچھے خوشامد پسندوں کا جم گھٹا
ہو، اُس وقت اپنی سادگی، ایمان داری اور اصول پرستی کو قائم
رکھنا مشکل ہوتا ہے، مگر امن صاحب نے دونوں زمانے
دیکھا اور خوشی اور فخر کی بات یہ ہے کہ دونوں حالات
میں اپنے کھرے اور بے لچک اصولوں پر سختی سے قائم رہے
اور انہیں خوبیوں کی وجہ سے میں نے اُن کو سچا گاندھی
وادی کہا ہے۔ گاندھی وادی سے میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ
سیاسی لحاظ سے پکے قوم پرور اور کانگریسی تھے، بلکہ میرا مطلب
ہے کہ وہ روزمرہ کی زندگی میں اصول پرست، ایمان دار
رہے، قوم پرور اور فرقہ پرستی سے بلند اور اونچے تھے۔
اس وقت میں نے جو الفاظ استعمال کئے ہیں انہیں بہت
سوچ سمجھ کر استعمال کیا ہے اور انہیں واقعی میں نے ایسا
ہی پایا، جیسا لکھا ہے۔

۱۹۳۵ء میں ایک نوجوان شاعر، نریش کمار شاد نے
جو اپنے دور کے ترقی پسند شاعروں میں اچھی حیثیت
کے مالک تھے اور شراب کے بڑے رسیا تھے، امن صاحب
سے انٹرویو کرتے وقت سوال کیا تھا کہ آپ ایک سیاست
داں ہونے کے باوجود ریاکاری سے اور ایک شاعر ہوتے
ہوئے شراب سے نفرت کیوں کرتے ہیں؟ اس کے جواب
میں امن صاحب نے برجستہ فرمایا تھا کہ شاید یہی وجہ ہے
کہ مجھ سے کوئی شخص خوش نہیں، "میں زہر ہلاہل
کو کبھی کہہ نہ سکا قند" سیاسی دنیا میں رہتا ہوں مگر کسی
گروپ سے وابستہ نہیں، شاعر ہوں لیکن لاابالی نہیں
انھوں نے یاد فرمایا، گاندھی جی کا یہ فرمان:

There are Compartments in Human life

میرے لئے منتر کا حکم رکھتا ہے۔
شراب کے بارے میں کہا: میں شراب نوشی کو بدترین
گناہوں میں نہیں سمجھتا، میرے بہترین دوستوں میں سے
اکثر شرابی ہیں، اگر مجھے شراب سے نفرت ہے تو محض اس
لئے کہ شراب نوشی سے انسان اپنے آپ کو اور اپنے
متعلقین کو نقصان پہنچاتا ہے اور جتنا وقت شراب کے
نشے میں ضائع کرتا ہے، اسے بہتر مصرف میں لا سکتا ہے
امن صاحب نے شراب کی مضرتوں کے بارے میں
جو کچھ کہا ہے، وہ حرف بحرف خود نریش کمار شاد پر صادق
آیا، وہ شراب کے ہمیشہ عادی تھے اور اُن شاعروں
میں سے تھے جو بغیر شراب کے ایک بھی شعر نہیں کہہ
سکتے، بالآخر اسی لت سے خود تباہ ہو گئے اور اُن کا پیار

بھی تباہ ہو گیا ہوتا مگر موصوف کے دوست احباب اور قدر دانوں نے اس کی مدد نہ کی ہوتی۔ شراب نوشی ہی کے سلسلے میں مجھے ایک اور واقعہ یاد آگیا۔ جس سے آنند صاحب کی اصول پرستی اور پختہ ایمان پر بڑی اچھی روشنی پڑتی ہے۔

غالباً ۵۲-۱۹۵۱ء کی بات ہے۔ آنند صاحب "اُردو سبھا" کے نام سے ایک ادبی انجمن قائم کی تھی۔ اس وقت تک یوم جمہوریہ کا مشاعرہ، جو لال قلعہ میں منعقد ہوتا ہے، حکومت کی سرپرستی اور اہتمام میں منعقد ہوا کرتا تھا۔ پہلی مرتبہ ایک پرائیوٹ انجمن کو اس کا انتظام سونپا گیا۔ یعنی آنند صاحب سے کہا گیا کہ وہ اس مشاعرہ کے انتظام کی ذمہ داری قبول کریں۔ اُردو سبھا کی مجلس انتظامیہ میں یہ مسئلہ زیر غور آیا تو آنند صاحب نے یہ شرط پیش کی کہ اس مشاعرے میں کوئی ایسا شاعر مدعو نہیں کیا جائے گا جو شراب پی کر مشاعروں میں آتا ہے اور اُسے اپنے اوپر قابو نہیں ہوتا۔ اس مسئلے پر بڑی گرما گرم بحثیں ہوئیں۔ مگر آنند صاحب اپنے موقف پر جمے رہے۔ اس مجلس میں کنور مہندر سنگھ بیدی سحر بھی موجود تھے، جن کے تعاون کے بغیر دلی میں کوئی مشاعرہ بمشکل کامیاب ہو سکتا تھا۔ یہی کیفیت اب بھی قائم ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ سحر صاحب کے ایسے متعدد شعراء سے گہرے تعلقات تھے جو شراب کے شوق سے عاری نہ تھے اور ان میں چند ایسے بھی تھے جن کی شرکت مشاعروں کی کامیابی کے لئے ضروری سمجھی جاتی تھی، مگر اس کے باوجود سحر صاحب نے بڑی فراخدلی کے ساتھ فرمایا کہ آپ لوگ جس کو چاہیں مدعو کریں، جس کو چاہیں نہ بلائیں، میرے ذمے جو کام سپرد کیا جائے گا میں اس کو انجام دوں گا۔ چنانچہ انھوں نے واقعی اپنے اس وعدے کو پورا کیا اور مشاعرے کو اپنے مکمل تعاون سے سرفراز کیا، مگر حضرت جوش ملیح آبادی کو مدعو نہ کیا گیا اور نہ مجاز مرحوم کو مدعو کیا۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ جوش شراب پیتے ضرور تھے اور پابندی کے ساتھ مگر اُن کے کچھ اصول بھی تھے اور پینے کا وقت مقرر تھا، اس پر سختی سے عمل کرتے تھے، مگر افسوس آنند صاحب کی اس شرط کو توڑنے کے لیے، اپنے اصول کے برعکس شراب کی بوتلیں لے کر مشاعرے میں آئے اور قریب ہی بیٹھ کر اپنے مخصوص احباب کے ساتھ شراب نوشی میں مشغول ہو گئے۔ مشاعرے کے صدر اس وقت کے چیف کمشنر شنکر پرشاد تھے۔ جب مشاعرہ کی کارروائی شروع کرنے کا وقت آیا تو انہوں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پوچھا: کیا جوش صاحب نہیں آئے ہیں؟ آنند صاحب اپنے جذبات کو ضبط کرتے ہوئے فرمایا: دیکھئے وہ بیٹھے شراب نوشی میں مشغول ہیں۔

جوش صاحب اُس زمانے میں سرکاری ملازمت میں تھے اور صدر صاحب دلی کے چیف کمشنر تھے جن کی وہی حیثیت تھی جو آج کل لفٹننٹ گورنر کی ہے، مگر ظاہر ہے وہ کیا کر سکتے تھے۔ بہر حال اس کشیدہ فضا میں مشاعرہ شروع ہوا اور جب حضرت جوش کی باری آئی تو انہوں نے مشاعرہ کی شرط کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے، شراب کی حمایت میں نظم پڑھی، پھر کیا تھا مشاعرے میں ہنگامہ برپا ہو گیا اور اب پروگرام کے برخلاف متعدد شعراء شراب کی مخالفت میں قطعے اور متفرق اشعار پڑھنے لگے۔ مشاعرہ براہ راست ریڈیو سے براڈ کاسٹ ہو رہا تھا، بڑی مشکل سے حالات پر قابو حاصل کیا گیا۔ اس کا اثر کئی دن تک دلی کی ادبی اور شعری فضا پر برقرار رہا۔

اس موقع پر آنند صاحب کی سادگی اور عوامی زندگی کا ایک اور واقعہ بیان کرنے کی اجازت چاہوں گا۔ جب وہ دلی اسٹیٹ کے وزیر تھے تو وہ دفتر جاتے وقت گھر سے پیدل جاتے اور واپسی میں بس سے آتے۔ مجھے اس پر یقین نہیں آتا تھا کہ ایک وزیر ایسا بھی کر سکتا ہے۔ وہ کہتے تھے کہ میرے گھر سے اولڈ سکریٹریٹ کچھ زیادہ دور نہیں ہے ویسے میں ٹہلنے اور پیدل چلنے کا بھی عادی ہوں۔ اس کے علاوہ شدید مصروفیات میں بھی نظم و ضبط اور ڈسپلن کا پابند ہوں، اس لیے واپسی بس سے کہ پیدل جاتا ہوں مگر کبھی دفتر تاخیر سے نہیں پہنچتا۔ خیر جانا تو اُن کے اختیار میں

تھ مگر بس کا سفر میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ خاص طور پر دلی میں بسوں کا جو حال ہے وہ آپ سب جانتے ہیں۔ اور دفتر بند ہونے کے بعد جو حالت ہوتی ہے وہ آپ سب پر عیاں ہے، اس لئے میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیسے بس میں سوار ہوتے ہوں گے۔ ایک مرتبہ دیکھنے کا اتفاق ہوا اور یہ دیکھ کر مجھے تعجب ہوا کہ جب اُن کی بس آئی تو لوگوں نے پہلے اُن کو سوار ہونے کا موقع دیا، پھر خود سوار ہوئے، اسی طرح بس میں بھی کوئی نہ کوئی اللہ کا بندہ اُن کو اپنی سیٹ دے دیتا تھا۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ اُن کا یہ احترام محض وزیر کی وجہ سے نہیں تھا، بلکہ ذاتی طور پر اُن کی لوگ بہت زیادہ عزت کرتے تھے۔ یہ اُن کے خلوص اور اُن کی بے لوث خدمات کا نتیجہ تھا۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جب کسی وزیر کو اپنے عہدے سے ہٹنا پڑتا ہے تو اُس کی زندگی میں ایک انقلاب آجاتا ہے۔ دوست احباب اور ارادت عقیدت کے معمول بجا ورکرنے والے کنارہ کش ہوجاتے ہیں، عیش و عشرت اور ٹھاٹ باٹ کی جگہ بے رونقی اور حسرت و یاس، رسماسمی اور چہل پہل کی جگہ گورستان جیسی خاموشی نظر آتی ہے اور پورا گھر ماتم کدہ بن جاتا ہے، مگر جب دلی کی اسمبلی ٹوٹ گئی اور امن صاحب کی وزارت ختم ہوگئی تو اُن کی زندگی پر ذرا بھی اثر نہیں پڑا، اس لیے کہ جب وزارت کی وجہ سے اُن کی زندگی اور رہن سہن پر کوئی اثر نہیں پڑا تھا تو اب اُس کے چلے جانے سے کیا فرق پڑ سکتا ہے؟!

گاندھی جی کے نام لیوا تو ویسے بہت ہیں، مگر اُن کے اصولوں پر پابندی اور سچائی کے ساتھ عمل کرنے والے بہت کم ملیں گے۔ مگر امن صاحب اُن چند قوم پرور افراد میں سے تھے جو زندگی کے ہر لمحے اور ہر دور میں پوری ایمان داری کے ساتھ اُن کے اصولوں پر عمل کرتے تھے، چاہے جیل اور صدر ہند کی زندگی ہو یا معمول کی آزاد زندگی، قول و فعل میں یکجہتی، انسانیت اور ہم آہنگی، یہ امن صاحب کے یہاں تھی، اُس کی مثالیں عنقا تو نہیں مگر کمیاب ضرور ہیں، اسی کا ایک نتیجہ تھا کہ تقسیم ملک کے بعد جب دلی پر قیامت ٹوٹی تو اِن کے محلے میں اقلیت کے افراد اور خاندان بالکل محفوظ رہے، انھوں نے اپنی عزت و آبرو اور جان کو خطرے میں ڈال کر مسلمانوں کی حفاظت کی۔ ایسی مثالیں دلی اور ملک کے دوسرے مقامات پر بھی ملیں گی جب شریف ہندوؤں نے مسلمانوں کی اور معقول مسلمانوں نے ہندوؤں کی جانیں بچائیں، انہیں شریف اور معقول لوگوں میں سے گوپی ناتھ امن بھی تھے۔

امن صاحب کی سیرت و شخصیت کے اور بہت سے تابناک اور سنہرے پہلو ہیں، جن پر روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے، مگر اس جلسے کے سامعین کے صبر و تحمل کا مزید امتحان لینا نہیں چاہتا، کیوں کہ وہ بڑی بے صبری کے ساتھ مشاعرے کا انتظار کر رہے ہیں۔ اسی لیے فی الحال اسی مختصر مضمون پر اکتفا کرتا ہوں۔

یار زندہ صحبت باقی است شکریہ!

عبداللطیف اعظمی

جناب سیٹھ آتم چند چندل ساکن ٹونک راجستھان خود شریک مشاعرہ نہیں ہو سکے۔ مندرجہ ذیل غزل ارسال فرمائی۔

غزل

کیا کیا نہ تونے یارب مجھ کو عطا کیا ہے
سو سو زباں سے تیرا سو بار شکریہ ہے

پیشِ نظر الٰہی یوں دل کا آئینہ ہے
میں تجھ کو دیکھتا ہوں تو تجھ کو دیکھتا ہے

ہر شو مری نظر میں روشن ہے نور تیرا
کعبہ ہو یا کلیسا دل تجھ کو پوجتا ہے

دن رات ہو رہی ہیں پوری مری مرادیں
تیرے کرم سے دامن میرا بھرا پڑا ہے

آنے نہ دیگا بندہ کچھ فرق اپنے دل میں
[illegible] رہے گا جیسا [illegible] رہا ہے

اس کے سوا نہیں ہے دل میں کوئی تمنا
ہر ا [illegible] تجھ کو ہی مانگتا ہے

[illegible] سے انسان پہ [illegible] کا
[illegible] تیرا [illegible]

گوپی ناتھ امن — ایک مطالعہ

مرحوم گوپی ناتھ امن ہماری مشترکہ تہذیب اور صحت مند روایتوں کے صرف علم بردار ہی نہیں تھے بلکہ یہ خوبیاں اُن کی زندگی میں شیر و شکر کی طرح شامل تھیں جنھیں ایک دوسرے سے جدا کرنا ممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اُن کا دامنِ زندگی بھی دودھ کی طرح صاف و شفاف رہا۔ اربابِ نظر جانتے ہیں کہ سیاست میں برسرِ اقتدار رہتے ہوئے اپنے دامن کو ہر طرح کی آلودگیوں اور آلائشوں سے بچائے رکھنا بجائے خود ایک کارنامہ ہے اور یہ بات بڑے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ امن صاحب نے بہ طورِ احسن یہ کارنامہ انجام دیا۔ میرے خیال میں، اگر ایک طرف اُن کی کردار سازی میں صاف ستھرے گھریلو ماحول اور تعلیم و تربیت کو بنیادی حیثیت حاصل تھی تو دوسری طرف مختلف مذاہب کے رہبروں کی زندگی کا مطالعہ اور اُن سے ذہنی وابستگی نے بھی اُن کے مزاج میں سلامت روی اور کردار میں صحت مندانہ استقامت پیدا کرنے میں اہم رول ادا کیا۔

مرحوم گوپی ناتھ کے نام کا امن ایک ایسا جزو لاینفک بن گیا کہ گوپی ناتھ کو امن سے یا امن کو گوپی ناتھ سے جدا کر دیجئے تو جاننے پہچاننے لوگوں کے لئے بھی شناخت کچھ دشوار ہو جائے گی اور صرف یہی نہیں بلکہ جو توازن و تناسب اُن کے نام کو اُن کے تخلص، کے ساتھ تھا بالکل وہی اُن کی شخصیت کو اُن کی شاعری سے بھی۔

امن صاحب نے اُس زمانے میں آنکھیں کھولیں جب لکھنوی سلطنت کے زوال کو تقریباً نصف صدی گذر چکی تھی مگر لکھنوی تہذیب کے زوال کو غالباً ابھی نصف صدی باقی تھی۔ اُن کے آباؤ اجداد رائے بریلی ایک قصبہ دلنو کے باشندے تھے۔ اور آصف الدولہ کے زمانے ہی سے شاہی دربار سے وابستہ ہو گئے تھے۔ اور لکھنؤ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ اسی کائستھ گھرانے میں جناب مہادیو پرشاد عاصی کے یہاں انیسویں صدی کے خاتمہ اور بیسویں صدی کی ابتدا سے کچھ ہی قبل یعنی ۱۲ ستمبر ۱۸۹۸ء کو ایک بچہ پیدا ہوا۔ جو نئی صدی میں پرانی صدی کی کچھ بہترین روایتوں کا داعی اور نقیب بننے والا تھا۔ عمر کے ابتدائی دس سال جو اٹھان پرداخت اور اخذ و اکتساب کے اعتبار سے انسانی زندگی میں بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ اسی سرزمین پر گذرے، مولانا عزیز لکھنوی جیسے استاد کا فیضانِ نظر حاصل کیا اور ان ہی دنوں ذہن کے سوچنے سمجھنے اور دل کے دھڑکنے کا ایک انداز متعین ہو گیا۔ لکھنؤ کی آب و ہوا میں شاعری کی تاثیر تھی۔ اور یادش بخیر یہاں کی فضاؤں میں مجلس و ماتم کے آنسوؤں سے بھیگی آوازیں برابر گونجتی رہتی تھیں، جس کے پہلو میں ایک انسان کا دل ہو اور سلجھا ہوا دماغ، وہ اس ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ انیس کے مرثیے لکھنوی معاشرت کی اِن امتیازی خصوصیات کا حسین اور بہترین امتزاج ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ گوپی ناتھ امن انیس سے خاصے متاثر نظر آتے ہیں اور انیس کے رنگ میں انہوں نے کامیاب طبع آزمائی بھی کی ہے۔ پانچویں جماعت میں تعلیم کے دوران ہی مشقِ سخن شروع کر دی تھی۔ مگر عوام میں شاعر کی حیثیت سے پہلی بار روشناسی ۱۹۲۰ء میں پولیٹیکل سفینہ کے موقع پر حاصل ہوئی۔ اور جب سے آخر وقت تک تقریباً آٹھ دہائیوں کے دوران انھوں نے بہت کچھ لکھا۔ اِن کے موضوعات میں خاصا تنوع ہے۔ سیاسی حالات، سماجی واقعات، ادبی معاملات، اور مذہبی شخصیات، یہ ہیں ان کی شاعری کے عناصرِ ترکیبی۔ جن کا مزاج ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ اور جن کی نوعیت کا فرق بھی ناقابلِ انکار۔ مگر اس

کے باوجود ان چاروں موضوعات پر اُن کے فکر و قلم کی جنبشوں میں ایک ہم آہنگی ہے اور اس رنگا رنگی میں ایک یکجہتی۔ جو نتیجہ ہے یہ دھیمی آنچ کا جو ان کے دل کی دھڑکنوں سے اُن کے دماغ میں پوشیدہ چنگاریوں کے سلگتے رہنے کے باعث پیدا ہوتی ہے یہی کیفیت اگر مزاج کا حصہ بن جائے تو شخصیت میں سادگی و پرکاری پیدا ہو جاتی ہے۔ اور پھر اِس آدمی کے 'انسان' ہونے کا اعتراف کیا جانے لگتا ہے اور اگر انسانیت کے یہی اقدار شعر کے پیکر میں بھی ڈھلنے لگیں تو شاعری براہِ راست نوعِ انسانی کی خدمت کا وسیلہ بن جاتی ہے۔ ایسی شاعری میں چونکہ گہرے خلوص اور پختہ اعتقاد کی کارفرمائی شامل ہوتی ہے اِس لئے اُس کے لب و لہجہ میں ایک دھیما پن ضرور ہوتا ہے مگر اُس کی تہ میں ایثار و اخلاق کی ایک زیریں لہر ہوتی ہے جو قاری کو کچھ دیر اور کچھ دُور تک اپنے ساتھ رکھتی ہے۔

گوپی ناتھ امن کی شخصیت اور شاعری کا مطالعہ ایک ایسا ہی تجربہ ہے۔ اسلامی شخصیتوں سے متعلق اُن کی منظومات میں یہ دلِ آویزیاں پوری آب و تاب کے ساتھ موجود نظر آتی ہیں اور سرِ دست بحث بھی اُن کی شاعری کے اُسی پہلو سے مقصود ہے۔ رسولِ خدا کی شان میں دو نظمیں، حضرت علی، امام حسن، امام حسین، حضرت عباس، حضرت علی اصغر اور موعود آخر کی مدح میں بارہ قصیدے، نو قطعات، چار سلام، اور دو مرثیے اور کئی نظمیں حضرت حسین کی شان میں میرے پیشِ نظر ہیں اور یقیناً اِس کے لئے یہ دعویٰ غلط ہوگا کہ اِس فن میں اُن کے رشحاتِ قلم کا یہ مکمل مجموعہ ہے، اِس کے علاوہ بھی اُنھوں نے بہت کچھ کہا ہوگا جو میرے مطالعہ میں نہ آسکا کیوں کہ ہر سال کچھ نذرِ عقیدت پیش کرنا اُن کے معمولات میں سے تھا۔ ایسا کیوں تھا اِس کی وجہ بہت ہی صاف گوئی اور انکساری کے ساتھ اُنہوں نے خود ہی بیان کی ہے:

میں نہ زاہد نہ عبادت ہی کی تدبیر آتے
ذی میں عالم تو ں یہ مجھ کو فنِ تفسیر آتے
مثلِ علم و ادب میں ہو گیا ہوں ایک تو کئی
شیعہ اجلاس میں اک قابلِ تعزیر آئے
شکل و صورت ہے نہ سیرت ہے نہ معلومات کا پاس
کیوں رہ نہ پھر میرے لئے کچھ تحقیر آئے
کیا سبب ہے کہ یہ اک بندۂ بے علم و شعور
چند لوگوں کو نظر قابلِ توقیر آئے
ایک ہی اس کا سبب ایک ہی اس کا باعث
جو عقیدت ہو تو اشعار میں تاثیر آئے
ایسی محفل میں بصد عجز و خلوص آتا ہوں
کہ جہاں تذکرۂ حضرتِ شبیر آئے
پیش کر دیتا ہوں کچھ نذرِ عقیدت ہر سال
تا کہ اِس سے مرے اعمال میں تنویر آئے

گوپی ناتھ امن ایک سیدھے سادے شریف انسان تھے، راست روی اُن کا اشعار ہی نہیں بلکہ مزاج بھی تھا اور اس راستے کی پہنائیوں اس قدر زیادہ پائیدار اور مستحکم تھیں کہ میدانِ سیاست میں برسوں سرگرم حصہ لینے کے وجود کہیں کجروی یا ناہمواری پیدا نہیں ہوئے مگر انھوں نے اپنی پاکبازی کو کوئی ذاتی کارنامہ نہیں سمجھا بلکہ خدا کے نیک بندوں سے عقیدت اور اُن کے فیض و عرفان کو اپنا دامن داغدار نہ ہونے کی وجہ سمجھتے رہے، یہ سرگذشت اور عقیدت اور اُن کا خوشگوار باہمی ردِ عمل بھی ایک دلچسپ ہے:

یہ اُسی کا فیض ہے مجھ کو جو کچھ شہرت ملی
معرکہ ورنہ کبھی مجھ سے نہ کوئی سر ہوا
زندگی میں تک اپنے ذہن میں پہونچا
نیک بندوں میں تھا اپنا کیوں کر ہوا
زندگی کا بیشتر حصہ سیاست میں گیا
اور سیاست داغ کوئی بھی دامن پہ ہوا
داغ لو کتنے ہی ہوں گے وہ نظر آتے نہیں
کیونکہ میں مدحت گرِ محبوبِ پیغمبر ہوا
امن بے جوشِ عقیدت بے نیازِ نسل و نام
اِس لئے مجھ کو نہ خوفِ پرسشِ محشر ہوا

آخر کے دو شعروں میں جس منکسر المزاجی اور عقیدت کا اظہار کیا گیا ہے وہ بجائے خود محترم ہے کیوں کہ اُن میں وہ اعلیٰ انسانی اقدار شامل ہیں جو جدید تہذیب میں اب ہرچند کمیاب کہ ہیں مگر نہیں ہیں اب تو بس ایسے افراد کیا یا وہی ہی ہمارا تہذیبی سرمایہ ہیں جن کی ذات [illegible] والا ہو اکرتی تھیں اور گوپی ناتھ امن ایسی ہی [illegible] ہستیوں میں سے ایک تھے۔ اُن کا اظہارِ عقیدت محض برائے شعر گفتن نہیں تھا بلکہ تاریخِ اسلام پر اُن کی گہری نظر تھی۔ اُنھیں حقیقتوں کا سچا ادراک اور شخصیتوں کا صحیح عرفان تھا۔ اور یہی علم و آگہی اُنھیں اہلِ دل کے قدموں پر سر جھکانے کے لیے آمادہ کرتی [illegible]۔ اس ضمن میں اس مرثیے کے چند قابلِ لحاظ بند [illegible] ایک [illegible] کی تحریک [illegible] پر قلم بند کیا تھا:

عہدِ رسولؐ میں ہوئیں جتنی لڑائیاں
[illegible] اُن میں تھا کہاں
راہِ رسولؐ پہ چلے حیدر سے [illegible]
[illegible] ہو ہے [illegible] میاں
جس دن ہوا پھر ایک لال [illegible] کی
چاہا کہ ڈال دیں نقطے ساری زمین کی
[illegible] کو کہ یوں ہو نہ قتلِ عام
کرتے رہے وہ صلح کا مشورہ ابا سے انجام
وہ جو اذیتیں اُنہیں دیتے تھے اہلِ شام
صد شکر کہہ کے آب وہ سہتے رہے تمام
صلحِ حدیبیہ کی طرح صلح کی ایک اور
غیروں کو بہر راست روی و حیلہ دکھائی

مرثیے کے دو بند اور قابلِ نظر ہیں جو اُن کے فن اور نظریہ دونوں کی بخوبی ترجمانی کرتے ہیں:

میدان میں تھا حال کربلا [illegible]
[illegible] کا [illegible]
[illegible]
[illegible]

لاشوں کی یوں ضرورتِ دفن و کفن گئی
کانپی زمین، وصولِ ازل قبر بن گئی
[illegible] مجھے بھی عطا کر ایسا دل
جو دیکھ کر غریبوں کو ہو جائے مضمحل
دردِ رفاہِ عام ہے دل میں مشتعل
[illegible] ہوں سے منتقل
انسانیت کے جذبے کو دل میں اُبھار دے
[illegible] مری بگڑی سنوار دے

دعائیہ طور پر جن اخلاقی قدروں کا ان اشعار میں تذکرہ کیا گیا ہے، شاعر نے تمام زندگی اُن پر عمل پیرا رہ کر [illegible] انسانی کا کمال ہے کہ اُن کا دعویٰ کرنے کے بجائے اُن کے حصول کے لیے دعا کی جا رہی ہے۔

[illegible] تاریخ میں سب سے اہم واقعہ حضرت امام حسینؓ کی شہادت ہے اور امن کے نزدیک سب سے اہم اسلامی شخصیت حضرت حسینؓ کی ہے اور حسینؓ سے محبت کو وہ مسلم ہونے کی کسوٹی گردانتے ہیں:

[illegible] اسلام ہوں زبانوں پر
حسینؓ سے جو محبت نہیں تو کچھ بھی نہیں
غمِ حسینؓ میں جو آنکھ تر نہیں ہوتی
[illegible] حقیقی نظر نہیں ہوتی
حسینی شان کے سجدے ہیں سجدے مری نظروں میں
جبینِ فرسائیوں کا نام سجدہ ہو نہیں سکتا
حالاتِ کربلا میں ایک ایسا ورق بھی ہے
محبت کے ساتھ جس میں ادب کا سبق بھی ہے

اور شخصیت کے پرستاروں سے امن کے یہ شعر خصوصی توجہ کے طلب گار نظر آتے ہیں:

جو پیروی نہ کر سکا اُسے تو وہ طریقت کیا
دلوں میں [illegible] تو کچھ بھی نہیں
اگرچہ [illegible] شبیر و شبر
[illegible] محبت نہیں تو کچھ بھی نہیں
[illegible] رجا یہ بن کے گئے [illegible]

رسولِ اکرم نے جس طرح رحم دلی، مساوات، شرافتِ انسانی اور اتحاد و اخوت کی شمعیں روشن کر کے دور کیا، شاعر کو اس کا ادراک بھی ہے اور اعتراف بھی :

رحمت کا یہ چلن تھا کہ بخشا عدو کو بھی
قائم کیا نصابِ شرافت رسول نے
سلطانی اور شاہی کے سب ٹھاٹھ برطرف
شاہوں کو بخشا ہے یہ خدمت رسول نے
بکھرے ہوئے سماج کی قائم پشت ہو گئی
دی اتحاد و محکم کی دولت رسول نے

تقسیمِ ملک کے حادثے سے جدید ہندوستانی مسلمان آج تک سب مانگی کے شدید بحران میں مبتلا ہے [illegible]۔ ان ہی دنوں آل انڈیا شعبہ کا لفظ لسر [illegible] منعقد ہوا تھا [illegible] مستقبل ایک نظم پیش کی تھی جس میں مسلمانوں سے [illegible] روابط اور خلوص، یکانگی کی جھلک صاف نمایاں ہے۔ اس [illegible] کے اشعار ہمارے سامنے [illegible] ان کے جذبات اور موجودہ حالات میں [illegible] ہمارے رہبروں کے لئے ایک لمحۂ فکریہ کہ باعتقاد عمل کی [illegible] رجحان و ردِ عمل ہم میں موجود بھی ہے یا نہیں :

منور، سے احتیاط ہو مری دعا یہ ہے
آپس میں اختلاط ہو مری دعا یہ ہے
مضبوط ارتباط ہو مری دعا یہ ہے
پھر عام انبساط ہو مری دعا یہ ہے
[illegible] وطن کو حسنِ عمل سے نکھار دیں
[illegible] غلام زمانہ [illegible] سنوار دیں

[illegible] شاعر [illegible] ہندوستانی کے [illegible] ان دوستی کے [illegible] جذبات [illegible] کا پیدا اور جس بلند [illegible] روایات اور [illegible] رجحانات کی کار فرمائی ہے۔ اتنے حوالوں اور اتنی سطروں کے لکھے کے

بعد مضمون نامکمل رہے گا اگر ان کے دو اور شعروں کو اس میں شامل نہ کیا جائے۔ ان کی شمولیت، نفسِ مضمون کی کمیوں کو بھی پورا کرے گی جو : چاہتے ہوئے بھی ہاتھ میں [illegible] اور [illegible] کے بعد کچھ کہنے کی گنجائش باقی نہیں رہتی :

ثناخوانِ پیمبر ذاکرِ اہلِ محبت
خدا کی [illegible] ہے سند مومن ہے کہ کافر ہے
وہ نیروں یاد رکھتا ہے [illegible]
[illegible] اس کو دو [illegible] اس کو دو جہاں

غزل

[illegible] (جبلپور)

تم ہیں [illegible] شاہیں دیکر
[illegible] ہو گیا کوئی یہ [illegible] دے کر
آج نفرت کے [illegible] میں ملا تھا مجھ کو
کل گیا تھا جو محبت کی صلاحیں دے کر
ہائے قسمت [illegible] آئے نہ وفاؤں کے چلن
تھک گئے لوگ بزرگوں کی مثالیں دیکر
چہرے پھولوں [illegible] اتر جائیں گے [illegible] تھا
کتنے [illegible] ہندو [illegible] تم کو بہاریں دے کر
کل [illegible] محبت کے دئے تھے میں نے
آیا ہے مجھے [illegible] کی تعلیمیں دے کر
[illegible]
[illegible] کی [illegible] دیکر
[illegible] وہ نفرت کے اندھیروں میں لگے آخر
ہم جیسے [illegible] اخلاق کی شمعیں دے کر

امنؔ صاحب اور ریڈیو

از
رفعت سروش

گو یہ نابغہ امنؔ کا نام اور کلام تو اس وقت سے ذہن نشین ہے جب سے میں نے ہوش سنبھالا کیونکہ (تحریکِ لکھنؤ) اور لطائف کا پنچور کا مطالعہ میں نے بچپن سے کیا ہے۔ لیکن امنؔ صاحب سے باقاعدہ نیاز حاصل ہوا ۱۹۴۵ء میں جب میں بمبئی سے دہلی آیا۔ مجھے یاد ہے امنؔ صاحب سے پہلی تفصیلی ملاقات انجمن ترقی اردو کی ایک میٹنگ میں (علی منزل کوچہ پنڈت) ہوئی۔ اس میٹنگ میں نیاز فتحپوری بھی موجود تھے۔ میری ایک نظم زیرِ بحث تھی۔ گفتگو کچھ تیکھا رخ اختیار کر گئی۔ میں نے نیاز صاحب کی توقع کے بالکل خلاف، برملا ان کی نسل کے احساسِ برتری کی مذمت کی اور اس موقع پر امنؔ صاحب نے گفتگو کو متوازن کیا۔ مجھے امنؔ صاحب کی فراخ دلی اور وسیع النظری پسند آئی اور تب سے میں ان سے ایک نیازمند کی طرح ملتا رہا مشاعرہ کا اسٹیج ہو یا کوئی نجی نشست امنؔ صاحب اپنی گفتگو کے لطیف انداز کو کبھی نہیں چھوڑتے جس میں ظرافت کی ہلکی سی چاشنی ضرور ہوتی تھی۔

۱۹۴۵ء سے ۱۹۶۲ء تک امنؔ صاحب سے میری ملاقاتوں کا سلسلہ صرف مشاعروں اور ادبی محفلوں تک محدود تھا لیکن ۱۹۶۲ء میں جب میرا تبادلہ وودھ بھارتی سے اردو مجلس میں ہوا تو امنؔ صاحب سے ملاقاتوں کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوا۔ — یہاں ایک بات عرض کر دوں کہ میں آل انڈیا ریڈیو سے ۱۹۴۵ء سے منسلک ہوں اور اسی ضمن میں مجھے ذوالفقار علی بخاری جیسے شخص سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا اس لئے نشر و اشاعت کے سلسلے میں کچھ میرے اپنے ذاتی خیالات بھی ہیں اور میں مشہور ناموں سے مرعوب ہونے کی روش اور معاملہ فہمی سے آزاد ہوں۔ براڈکاسٹنگ اپنی جگہ ایک فن ہے اور یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر اچھا عالم ایک اچھا براڈکاسٹر بھی بن جائے۔ اس میں بولے جانے والے لفظ کا ادراک بنیادی حیثیت رکھتا ہے اور باقی صفات ثانوی درجہ رکھتی ہیں۔ امنؔ صاحب فصاحتِ زبان کے اسرار سے واقف تھے۔ اور نشریات کے لئے وہی زبان لکھتے تھے جو وہ بولتے تھے۔ اور چونکہ وہ بولتے تھے سادہ اور سلیس زبان اس لئے ان کی ریڈیائی تقریریں کسی ایڈیٹنگ کی محتاج نہیں۔ جیسا بولنا ویسا لکھنا — کہنے میں یہ بات بہت آسان اور معمولی نظر آتی ہے مگر یہ کتنا مشکل کام ہے۔ اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اس کوچے سے گزرے ہیں۔ دراصل جب انسان نفسِ مضمون کو براہِ راست الفاظ میں ادا کرنے سے قاصر ہوتا ہے تو وہ تکلف، اندازِ بیان اور دوراز کار تشبیہ اور استعاروں کا سہارا لیتا ہے۔ اور یہ تکنیک آدمی کے ذہنی الجھاؤ کو واضح کرتی ہے۔ سادہ اور بامحاورہ زبان کا ایسا استعمال کہ اس میں تاثیرِ زبان بھی ہو، بڑی مشکل سے آتا ہے اور نثر میں اسی کا وہی درجہ ہے جو شاعری میں سہلِ ممتنع کا۔ امنؔ صاحب چونکہ زبان و بیان پر قادر تھے۔ اور آسان زبان میں اپنی بات کو واضح کرنے کا انہیں ملکہ تھا۔ اس لئے ان کی ریڈیائی تقریریں براڈکاسٹنگ کے اس اعلیٰ معیار پر پوری اترتی ہیں کہ جیسا بولئے ویسا لکھئے۔ ان کو بولے جانے والے لفظ کی عظمت کا ادراک بدرجۂ اتم ہے — امنؔ صاحب کی یہ خوبی ہے جس کے باعث میں ان کو بحیثیت براڈکاسٹر کے اردو کے چند بہترین مقرروں میں شمار کرتا ہوں۔

اس خوبی کے علاوہ امنؔ صاحب کی دوسری اہم خصوصیت یہ بھی تھی کہ ان کا مطالعہ اور مشاہدہ بہت وسیع تھا اور وہ متنوع موضوعات پر قلم اٹھانے کا حق اور سلیقہ رکھتے تھے۔ چنانچہ موضوعات ادبی ہوں کہ سیاسی، سماجی

یا مذہبی — اخلاقی ہوں یا قومی)۔ امن صاحب کو ہر موضوع پر دسترس تھی۔ اور انھوں نے بغیر کسی تکلف کے نہایت خندہ پیشانی سے درخواست کو قبول کیا اور اپنی تقریری موضوع کا پورا حق ادا کیا۔ یہ برجستگی ہر ایک کے حصہ میں نہیں آتی۔ میرا تجربہ ہے کہ بہت سے لوگ جو ان مضامین کے ماہر سمجھے جاتے ہیں یہی دقت محسوس کرتے ہیں جب وہ ریڈیائی تقریر لکھتے ہیں۔ کیونکہ جامعیت اور اختصار کے ساتھ محدود وقت میں نفس مضمون کو پیش کرنا بھی ایک فن ہے۔

تحریر شدہ تقریروں کے علاوہ ریڈیائی مباحثوں میں شرکت کے لئے زبان اور موضوع پر عبور کی اور بھی زیادہ ضرورت ہے۔ اور ساتھ ہی ایک بیدار ذہن کی بھی کہ گفتگو کی روانی اور بحث کے زور میں غیر ضروری اور قابل اعتراض باتیں نہ کی جائیں۔ اور یہ گفتگو دلچسپ بھی ہے۔ امن صاحب کو اس فن پر پورا عبور حاصل تھا۔ وہ چاہے کسی موضوع پر بولیں بذلہ سنجی اور شگفتگی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ اور یہ ایک بڑی خوبی ہے۔ اب تو خیر مباحثوں کو ریکارڈ کر لیا جاتا ہے اور اس میں یہ آسانی ہے کہ ضرورت کے مطابق ترمیم کیا جا سکتا ہے۔ لیکن امن صاحب کا تعلق براڈکاسٹنگ سے اُس دور میں رہا جب ریکارڈ کرنے کا رواج نہیں تھا۔ وہ الفاظ کو تول کر بولنے کے اُسی وقت سے عادی تھے۔

نثر کی طرح امن صاحب کا منظوم کلام بھی ریڈیو پروگراموں میں بہت مقبول رہا ہے۔ اُن کی زبان لکھنؤ اور دہلی کے امتزاج کی زبان ہے اور اس گنگا جمنی سے بھلی زبان میں غزل کے علاوہ سماجی اور سیاسی موضوعات پر اُن کی نظمیں ریڈیو کے اس معیار کے عین مطابق ہوتی ہیں کہ شاعر کے الفاظ جو اس کے منہ سے نکلے وہ سننے والے کے دل میں اتر جاتے۔

ریڈیو سے امن صاحب کا تعلق محض ایک براڈکاسٹر کی طرح ہی نہیں۔ بلکہ فن نشریات اور اس کے لوازمات سے ماہرانہ واقفیت کے باعث انہوں نے مختلف کمیٹیوں کے ممبر کی حیثیت سے اپنے مفید مشوروں سے بھی نوازا۔ امن صاحب محض ایک ادیب ہی نہیں، ایک شاعر اور صحافی بھی تھے اور مجاہد آزادی بھی۔ آزادی کی جدوجہد میں ان کو انگریزی حکومت کے دنوں قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنی پڑیں۔ اور ان کا شمار ان رہنماؤں میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنے قلم اور عمل دونوں کے ذریعہ ملک کی آزادی اور آزادی کے بعد تعمیر وطن کے لئے کام کیا۔ وہ اپنی ذات و صفات سے قومی یکجہتی کے ایک بے مثال نمونے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور بحیثیت ایک قومی رہنما کے ان کی حیثیت مسلم ہے۔ آزادی کے بعد زندگی کے مختلف شعبوں کے شعبہ نشر و اشاعت کی نئی شیرازہ بندی میں جب اردو پروگراموں کی نئی تنظیم کا سوال آیا تو امن صاحب نے صلاح کار کمیٹیوں میں نمایاں رول انجام دیا۔ اردو پروگراموں میں قومی زندگی کے نقش و نگار کو بہ حسن و خوبی پیش کیا جائے۔ اور ہر پروگرام قومی یکجہتی اور اتحاد (قومی) کی روح پیش کریں زبان عام فہم ہو۔ ان خیالات کو فروغ دینے میں امن صاحب کا بہت بڑا حصہ ہے اور انھوں نے نہ صرف لفظی طور پر بلکہ عملی طور پر بھی ان کا ثبوت دیا۔

مذاہب کا تقابلی مطالعہ اُن کا محبوب موضوع ہے۔ ان کی متنوع ریڈیائی تقریروں میں قوم کے موقعوں پر اور گرونانک جینتی کے موقعوں پر کی گئی تقریریں اب تک لوگوں کے کانوں میں گونجتی ہیں۔ جو اس امر کا ثبوت ہیں کہ مذہبی رواداری اور صلح کل مسلک کا دوسرا نام گوپی ناتھ امن ہے۔

دیوان
ناصر کاظمی
قیمت: پندرہ روپے

امن صاحب مرحوم ــــ تہذیبِ لکھنؤ کی آخری تصویر

[illegible]

میری عمر آٹھ نو برس کی تھی جب میں نے پہلی بار جناب گوپی ناتھ امن لکھنوی کو رام پور میں دیکھا تھا۔ وہ میرے والد مولانا سید اولاد حسین عرف [illegible] صاحب شاعر لکھنوی کے انتہائی قریبی [illegible] دوست تھے اور شاید اپنے دوست سے ملنے کے لئے پہلی بار رامپور آئے تھے۔ میں [illegible] کا سلام کرنے کے لئے اپنے والد کے کمرے میں داخل ہوا تو انھوں نے مجھے دیکھتے ہی کہا سلام کرو پاؤں چھوؤ تمہارے چچا آئے ہیں۔ میں نے سلام کیا روایت کے مطابق جھک کر گھٹنوں کو ہاتھ لگایا [illegible] سے مجھے گلے سے لگا لیا۔ [illegible] اغراض [illegible] سے [illegible] تھا [illegible] ہندو مسلم [illegible] تعلقات تھے [illegible] تہذیب [illegible] کبھی زندہ [illegible] موجود ہے لیکن سیاست کی [illegible] کی آندھیوں سے وہ [illegible] گرد کی [illegible] ہے۔

[illegible] ہم لوگ رام پور [illegible] میر امن صاحب مرحوم سے میری کوئی ملاقات نہیں ہوئی [illegible] میں [illegible] کا سلسلہ دوبارہ شروع ہوا [illegible] کے پاس بیٹھتا تھا اور [illegible] گفتگو کے دوران مجھے جو معلومات حاصل ہوتی تھیں وہ [illegible] میں اضافے کا موجب ہوتی تھیں [illegible] اکتساب [illegible] جاتے [illegible] شعر و ادب کے [illegible] کانات [illegible] کہانیوں کی طرح سناتے اور ان کہانیوں نے مجھے اپنے وطن کے ماضی اور حال کو سمجھنے میں مدد دی تھی۔ ایک مرتبہ انھوں نے کہا تھا کہ ہندوستانی تہذیب

کی [illegible] مسلمان عورتیں [illegible] اپنی مانگ صندل [illegible] [illegible] میر انیس مرحوم [illegible]

یارب رسولِ پاک کی کھیتی ہری رہے
صندل سے مانگ بچوں سے گودی بھری رہے

میر انیس [illegible] اپنے مرثیوں میں اہلِ حرم [illegible] عورتوں [illegible] بلکہ خالص ہندوستانی عورت کا [illegible] ان کے مراثی میں ایک [illegible] یا قاری کو اپنا دیکھا بھالا [illegible] ماحول دکھائی دیتا ہے۔

[illegible] صاحب [illegible] کو مسلمانوں کا [illegible] سمجھا جاتا تھا [illegible] دہلی [illegible] [illegible] دور [illegible] [illegible] کے تحت سات سات مہینے [illegible] نظر بند رہا کرتے تھے۔ میں ان دونوں [illegible] سے بہت وابستہ ہوا [illegible] گروہ [illegible] جو فرقہ پرستی [illegible] لیکن چند ہی مہینوں میں اُن کا [illegible] ذہن سے نکل گیا اور انھوں نے دیکھا کہ دونوں [illegible] رجحانات قوم پرستی کے رجحانات سے بدل [illegible] قدر پرستی [illegible] نظر [illegible] ہندو قوم [illegible] تو امن صاحب [illegible] سچ جو [illegible] اور محبت کی وہ زندہ ہوگی اور اسی [illegible] کا اظہار [illegible] شریف احمد [illegible] دہلی [illegible] تقریب میں بہ حیثیت صدر ان الفاظ میں کیا کہ "مہدی نقوی کا قلم کبھی غلط سمت میں نہیں اٹھا

ہمارے یہاں صحیح قسم کی جمہوری حکومت ہوتی تو [illegible] سرکاری سطح پر ان کی بہت بلند ہوتا۔ وہ سرکاری رسالے آج کے نگراں رہے تھے روزنامہ سنسار دہلی بھی ان کی نگرانی [illegible] شائع ہونا شروع ہوا تھا۔ اس لیے وہ صحافت [illegible] کے درجے پر فائز تھے۔ وہ ان کے پاس صحافت [illegible] کوئی تھی [illegible] صحافی ان سے [illegible] کم اور بہت کم تھے ان کا کہنا تھا کہ برطانوی [illegible] میں صحافت جس قدر سہل تھی آزاد ہندوستان کی فضا [illegible] مشکل ہے کیونکہ اس وقت [illegible] جب کہ آزاد ہندوستان کی [illegible] اور فکر [illegible] [illegible]۔

[illegible] لکھی تھی۔ اس نظم کا مسودہ [illegible] امن صاحب کی خدمت میں پیش کیا اور یہ درخواست کی کہ [illegible] فرمادیں۔ [illegible] [illegible] [illegible] مستند [illegible] [illegible] اور [illegible] کے بعد میں [illegible] [illegible] اور ہمارے اسلاف [illegible] [illegible] [illegible] قومی [illegible] بہت [illegible] [illegible] سکتا ہوں [illegible] کو فرصت دیجئے [illegible] جو کام [illegible] لیا جاتا [illegible] کانگرس کی [illegible] میں [illegible] بھی شامل تھا۔

[illegible]

بنائے گئے لیکن بدعنوانیوں کے ہجوم میں دیانت داریوں کا قتل اور بے ایمانیوں کے انبوہ میں ایمانداریوں کی شہادت غیر متوقع نہیں ہوتی۔ امن صاحب دیانت دار تھے اس لیے قتل ہو گئے ایمان دار تھے اس لیے شہید کر دیئے گئے۔ وہ جس مزاج اور مسلک کے آدمی تھے اس کے سلسلے گاندھی جی کے مزاج اور مسلک سے ملتے تھے اور اس دور میں ایسے نمک حلالوں کے لئے گنجائش کہاں۔ چنانچہ امن صاحب کی دریا گنج دہلی کے ایک مکان میں گوشہ گیر ہو گئے۔ اور اسی مکان میں ان کی زندگی کے آخری دن بسر ہوئے۔

امن صاحب مرحوم لکھنوی تہذیب کا آخری مرقع اور آخری نمونہ تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے انگریزی روزنامے ہندوستان ٹائمز نئی دہلی میں ایک مضمون لکھا تھا جس میں انہوں نے قدیم طرز معاشرت اور حال میں مروج ہونے والے جدید انداز معاشرت کے اس فرق کو نمایاں کیا تھا۔ اس مضمون میں تہذیب کے [illegible] جو نقشے پیدا ہوتے ہیں ان کی طرف اعتدال پسندانہ انداز [illegible] اشارے کئے گئے تھے اگر ان اشاروں کو اس وقت سمجھ لیا جاتا تو آج بہت سے تہذیبی مسئلے ہمارے [illegible] زندگی کے بحران کا سبب نہ بنتے۔ امن صاحب اردو کے طرف دار اس لیے نہیں تھے کہ وہ ہندی سے بیزار تھے۔ بلکہ وہ جانتے تھے کہ زبان [illegible] [illegible] تہذیبی زندگی کی [illegible] کوشش کی جا رہی ہے وہ قومی یکجہتی کے [illegible] تقاضوں کو [illegible] نقصان پہنچا سکتی ہے۔ اس لیے تہذیبی زندگی سے [illegible] مفاد [illegible] ہے۔

امن صاحب مرحوم نے دنیا کے [illegible] سے مذاہب کا تقابلی مطالعہ کیا تھا [illegible] بہت کم لوگ جانتے [illegible] [illegible]

اور امام حسین علیہ السلام سے بے حد متاثر تھے۔ اُنہوں نے حضرت علی اور امام حسین کی مدح میں نظمیں بھی کہیں۔ سلام اور نوحے بھی کہے اور اپنے خیالات سے مرثیہ ادب میں اضافہ کیا۔ وہ محرم کی اکثر مجلسوں میں بھی شریک ہوتے تھے اور قصیدہ خوانی کی محفلوں میں بھی، اور اپنی عقیدت کے جذبات کو بے تکلفی کے ساتھ ظاہر کرتے تھے۔ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی بے پناہ ارادت رکھتے تھے۔ اور اُن کا یہ خیال تھا کہ چودہ سو برس پہلے گمراہ انسانیت کو سیدھے راستے پر لانے اور انسان کو اس کی فطرت صالحہ کی طرف پلٹانے کے لئے انھوں نے قربانیوں سے معمور جو کوشش کی اس کی کوئی نظیر نہیں ہے۔ انہیں سنسکرت، ہندی، فارسی اور اردو کے ہزاروں اشعار یاد تھے۔ اور وہ اکثر اپنی گفتگو کو ان اشعار سے مزین کیا کرتے تھے۔ جو اُن کے حافظے میں محفوظ تھے، جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے وہ ہندی میں بھی شعر کہتے تھے اور انہوں نے دیوانِ حافظ کا ترجمہ بھی ہندی میں کیا اور شاید اپنی دیگر مصروفیات کی بنا پر پورا نہ کر سکے۔

گاندھی جی جس ہندوستان کی تعمیر کے خواہاں تھے امن صاحب اُس کی ایک زندہ تصویر تھے۔ اب یہ تصویر مغربی تہذیب کی سیلن سے اُن لوگوں کے گھروں میں دھندلی پڑ چکی ہے جو اپنی سیاسی قیادت کو معتبر بنانے کے لئے ہر گھڑی گاندھی جی کا نام جپتے ہیں۔ سچائی تو یہی ہے کہ آج ہمارے قومی فنون کے دائرے میں ایک بھی ایسا مصور موجود نہیں ہے جو گاندھی جی کی دھندلائی ہوئی تصویر کے نقش و نگار کو دوبارہ رنگ آمیزی کر کے روشن اور منور کر دے۔

امن صاحب کا ادبی اثاثہ اُن کا سیاسی ترکہ جو مضامین کی صورت میں موجود ہوگا اس قابل ہے کہ اسے کتابی شکل میں شائع کیا جائے اور مستقبل کی نسلوں کے لئے محفوظ کر دیا جائے۔ کیونکہ انہی لوگوں کی یادیں اور یہی محفوظ سرمایہ ہوگا جو ہندوستان کی آنے والی نسلوں کو ہندوستانیت کی سمت میں قدم بڑھانے کی ترغیب دے گا اور جو ہندوستانیت اب نظر نہیں آتی وہ ایک بار پھر نظر آئے گی۔

غزل

ڈاکٹر سین حقیر آستانی (ممبئی)

رخصتِ سفر کے ساتھ ہی عزمِ سفر بھی ہو
وہ انتہائے دید وہ ذوقِ نظر بھی ہو

کچھ تو گمانِ گردشِ شمس و قمر بھی ہو
طلبِ سحر کے ساتھ ہی تابِ سحر بھی ہو

ایسا تو کوئی راستہ سوجھا نہیں ہمیں
جو دل کو دردمند کرے بے خطر بھی ہو

لائیں کہاں سے ڈھونڈ کے ایسا مقام
ویرانہ بھی، چمن بھی ہو، غربت بھی گھر بھی ہو

کیا کیا نہ ہم کلام کریں اُن سے اگر بنے
لیکن نیاز و ناز کا اُن پہ اثر بھی ہو

کس سے کریں گے بات یہ چھوڑیں تو سر کہاں
اِن بیکسوں کا مسکن دیوار و در بھی ہو

شکوہ جو کر رہے ہیں شبِ تار کا ابھی
روزِ سیاہ کی ذرا اُن کو خبر بھی ہو

ضروری گذارش

کیا آپ اپنی کتاب چھپوانا چاہتے ہیں
یا
فروخت کی ایجنسی دینا چاہتے ہیں

- فوری طور پر ہم سے رجوع کریں۔ کتاب کا معیاری ہونا شرط
- کتاب چھپوانے یا فروخت کرنے میں ہم مدد کر سکتے ہیں
- اگر آپ کو کسی اردو اکاڈمی یا دیگر ادارے سے جزوی مالی امداد ملی ہے تو اشاعت کے لئے ہمیں لکھیے۔
- معلومات اور شرائط کے لئے جوابی لفافہ کے ساتھ ذیل کے پتے پر خط لکھیے۔

منور توتسوی ایڈیٹر شانِ ہند فلیٹ نمبر ۲ انصاری مارکیٹ دریا گنج دہلی ۲

اُستاذی محترم منشی گوپی ناتھ امن

از میر مشتاق احمد

امن صاحب کے نام سے میں عرصہ دراز سے واقف تھا۔ [دہلی] کے مشاعروں میں ان کا کلام سننے کا شوق رہتا تھا مگر [ا]ن سے ملاقات ۱۹۴۲ء کی تحریک میں جیل میں ہوئی۔ بس [پھر کیا] کہنا دو دیوانے مل کر بیٹھ گئے۔ جیل میں ان کو قریب سے [دیکھنے] کے بعد میں ان کی شخصیت سے اس قدر متاثر ہوا کہ [کوئی] بھی کام ان سے مشورہ کئے بغیر نہ کرتا تھا۔ نیکی کے سانچے [میں] ڈھلا ہوا یہ انسان نہایت خلیق و بردبار اور متین، فارسی [ا]ردو پر عبور رکھنے والا، مزاح پسند طبیعت والا تھا۔ جیل [میں بھی] وہ مزاحیہ چٹکلے اور اشعار سناتے رہتے تھے۔ جیل کیا [خ]وش طبعی کی ایک مجلس تھی۔

امن صاحب کو میں نے ہمیشہ مستقل مزاج، سادگی [پس]ند اور پُرخلوص پایا۔ وہ خطرہ لینے سے کبھی گھبراتے نہیں۔ [ان] کی شاعری زندگی کی ٹھوس حقیقتوں پر مبنی ہے۔ مجھے بجا [طور پر] فخر ہوگا میں ایسی عظیم شخصیت کا شاگرد ہوں۔ اردو [دنیا] میں کے شعرا ان کی نوازشات کی وجہ سے نیک نام ہوئے کچھ [شخص]یت کرسی سے بنتی ہیں مگر کچھ شخصیتیں کرسی کو زینت [بخشتی] ہیں۔ امن صاحب کی شخصیت وہ ہے جو کرسی کو زینت [بخش]تی ہے۔ کرسی ہو یا نہ ہو سماج میں ان کا ایک مقام رہا جو [ان] کی اپنی کاوش اور علم کا نتیجہ تھا۔

ملک آزاد ہوا، بٹوارے کی وجہ سے انسان وحشی درندے [بن] گئے، ان ہنگاموں کا نقشہ امن صاحب نے اپنے اشعار [میں] بہت خوبی سے کھینچا ہے اور کیفیت حقیقی کا اظہار کیا [یہ نق]شہ کتنا صحیح ہے اس کا اندازہ وہ لوگ ہی لگا سکتے ہیں [جنہ]وں نے ۱۹۴۷ء کا زمانہ دیکھا ہے ان وحشیانہ کیفیات [کو ب]یان کرنے کے بعد امن صاحب اپنے عزم کا اظہار [...] کرتے ہیں اور اس انداز سے کہ پڑھنے والے پر ایک [کیف]یت طاری ہو جاتی ہے۔ محبت کے نغمے سناؤں گا پھر بھی [...] پیت کے گیت گاؤں گا پھر بھی۔ ۱۹۴۷ء کے فسادات کو مدنظر رکھتے ہوئے امن صاحب کے یہ شعر ملاحظہ ہوں۔

جو ہندو مسلمان پر وار کھائے — ترنگے پہ جو مسلم کو ستائے
جو سکھ پریم کا راستہ بھول جائے — جو عیسائی رسم وفا کو بھلائے
محبت کے نغمے سناؤں گا پھر بھی
وہی پیت کے گیت گاؤں گا پھر بھی

یعنی جس کی زبان میں ہندو مسلم سکھ عیسائی سب ایسی ایسی کی نیتی کرنے پر اتر آئیں تب بھی میں پریم محبت کی راہ پر گامزن رہوں گا۔ پھبتی کسنے میں امن صاحب کو مہارت حاصل تھی۔ حصول آزادی کے وقت انگریزوں کے وفادار حکومت پرست ہندوستانیوں کی دلی حالت کا اچھا نقشہ کھینچا ہے اگر طنزیہ انداز بیان دیکھنا ہو تو گاندھی مجرم ہے نظم غور سے ملاحظہ فرمائیے۔ ان کی مزاحیہ شاعری بھی اعلیٰ درجے کی ہے ایسی عظیم شخصیت۔ سچے سماجی رہنما، قومی شاعر اور سب سے بڑھ کر ایک سچے انسان کو میں خراج عقیدت پیش کرتا ہوں۔ [illegible] وہ مجھ جیسی ہستیاں [illegible] جیسے کچھ دن عادی سے زیادہ نہیں چلیں [illegible] ہوتی ہے [illegible] لی یا وہی غنیمت ہے۔

نالہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے
بے نوا ہو جائے گا یہ ساز ہستی ایک دن

ناقابل فراموش

سردار دیوان سنگھ مفتون ایڈیٹر ریاست کی ناقابل فراموش دستاویز جس کے متعلق متفقہ فیصلہ ہے کہ جس اردو داں نے یہ کتاب نہیں پڑھی اس نے اردو ہی نہیں پڑھا۔ قیمت مجلد رنگین سات روپے علاوہ محصول ڈاک۔

دفتر شان ہند، انصاری مارکیٹ، فلیٹ ۵ دریاگنج نئی دہلی

گوپی ناتھ امن پیکرِ عقیدت

از عزیز دارثی
سکریٹری انجمن اتحاد وارثیہ
تالاب نزار دہلی

علامہ گوپی ناتھ امن لکھنوی کی خوبیوں کے عنوان سے مختلف اخبارات و رسائل میں متعدد ادباء، شعراء اور دیگر اہلِ قلم نے اظہارِ خیال فرمایا ہے۔ میں بھی اُن کی ہر خوبی کا معترف اور اُن کا ادنیٰ نیازمند ہوں۔ امن صاحب دلی کی سیاسی، ادبی، سماجی، ثقافتی، روحانی اور مذہبی انجمنوں میں ہمیشہ بہت ممتاز اور نمایاں رہے۔ وہ آزادیٔ وطن کے عظیم سپہ سالاروں میں سے تھے۔ فارسی، اُردو، ہندی، گُرمکھی اور انگریزی کے جید عالم تھے۔ اُردو اور ہندی کے مُفکر تھے۔ اور ایک بہترین ایڈمنسٹریٹر تھے۔ مجھے اُن کی اِس خوبی نے خاص طور پر مجھے متاثر کیا ہے کہ وہ بھگوان کے سچے بھگت تھے اسی لئے اونچے درجے کے انسان تھے۔ میرا خیال ہے اگر کوئی بھی شخص انسانیت کا علمبردار ہے تو پھر وہ ہر میدان کا شہسوار ہو جاتا ہے۔

دلی میں امن صاحب نہ جانے کتنے ذمہ دار عہدوں پر فائز رہے مگر اُن تمام مدارج اور مراتب کے لباس میں بھی وہ انسانیت کے پیکر ہی نظر آئے۔ میں نے اُن کو ڈپٹی اسپیکر کے رُوپ میں دیکھا وزیر کی حیثیت میں بھی۔ صدر محکمہ تعلقات عامہ بھی رہے۔ اور دلی پبلک لائبریری بورڈ کے چیئرمین بھی ہو گئے۔ ٹرانسپورٹ اتھارٹی کے صدر بھی رہے۔ مگر اُن کے لباس کی سادگی، گفتگو کی وضعداری، ملنساری کا جذبہ اور رہن سہن کا انداز کبھی نہیں بدلا۔ پنڈت امرناتھ ساحر دہلوی کی محفلوں سے آنند موہن زُتشی گلزار دہلوی کی تعمیرِ اُردو تک اُن کی شرکت ضروری و نازی رہی۔ جب تک اُن میں چلنے پھرنے کی طاقت رہی وہ تشریف لاتے رہے۔ اور اپنی تخلیقات سے محظوظ فرماتے رہے۔

امن صاحب عالمِ انسانیت کے سبھی بزرگوں سے عقیدت رکھتے تھے۔ چاہے وہ بزرگ کسی دھرم کے ہوں یا مذہبِ اسلام کے یا سنت و پنتھ کے یا [illegible] کرتے تھے۔ وہ [illegible] کرتے تھے

بھگوان شری کرشن کو اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی۔ اُن کی تحریریں، اُن کے کلام کے مجموعے اور بیشتر مضامین اِس خوبی کے شاہد ہیں کہ وہ سچے اور پکی عقیدت رکھنے والے انسان ہیں۔ اگر اُن کے نام سے گوپی ناتھ حذف کر دیا جائے صرف امن لکھنوی لکھا جاتے اور کسی مسلمان سے کوئی یہ کہہ دے کہ امن صاحب ہندو ہیں تو مسلمان قسم خدا کی یہ کہے گا کہ آپ سٹھیا گئے ہیں آپ ایک مومن کو کافر کہہ رہا ہے۔ ہندو پاک کے مسلمان اور دلی کے مسلمان بالخصوص اُنھیں ہمیشہ عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اتنی مدلل اور بامقصد تقریر فرماتے تھے کہ سامعین پر وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ انھیں بہت سے لوگ شیعہ کہتے تھے۔ اِس میں خدانخواستہ کسی اور کی تضحیک اور دلآزاری مقصود نہیں بلکہ اُن کا وہ رُتبہ ہے جو اُن کی قابلیت، علمیت اور واقفیت نے اُنھیں مراتب و مدارج کے ساتھ یہ رتبہ دیا تھا۔ شیعانِ ہند و پاک اور دلی والے انھیں مجتہد کا درجہ دیتے تھے۔

دلی کی کربلا یعنی شاہِ مرداں ہو یا پنچکوئیاں روڈ کا امام باڑہ یا کشمیری گیٹ کا پنجہ شریف اِن مقامات پر جو بھی پروگرام ہوتے تھے امن صاحب کا اُن میں شریک ہونا ضرور لازمی تھا۔ اِن مقدس مقامات کے علاوہ شیعہ حضرات سوئی والان، پہاڑ گنج میں بھی مجالس منعقد کرایا کرتے تھے اور امن صاحب منبر پر بیٹھ کر باقاعدہ مجلس پڑھتے تھے۔ اُن کی معلومات اور اندازِ بیان اتنا مؤثر ہوتا تھا کہ لوگ عقیدت مند اُن سے باقاعدہ مصافحہ کرتے اور مصافحہ کے بعد وہی ہاتھ اپنے سینے سے لگا تے تھے کہ [illegible] ان کا بدرجۂ اتم اظہار تھا۔

یہ تو درست ہے کہ سنسکرت اور ہندی پر [illegible]

پورا عبور تھا مگر انہوں نے باقاعدہ قرآن شریف بھی پڑھا تھا اور فقہ اور حدیث کی کتابیں بھی اُن کے گہرے مطالعے میں رہیں حضرت سید محمد دہلوی جو خود ایک مجتہد تھے اُن سے اُن کی دوستی رہی سید حسین علی جعفری جو آنریری مجسٹریٹ بھی رہے وہ اُن کے دوستوں میں شامل تھے۔ بیرسٹر یاس، یہ معصر جو ہماچل پردیش کے چیف جسٹس رہ چکے ہیں وہ ہمیشہ امن صاحب کے مقربان خاص رہے یہ سب بہت کشادہ ذہن اور وسیع المشرب انسان ہیں۔ امن صاحب کی ایسے لوگوں سے بہت قربت تھی جو ہندوستان کی آزادی کے قدر دان تھے اور اس ملک کے رہنے والوں کو اپنا عزیز، شفیق، رفیق، حبیب، لبیب سمجھتے تھے اُن کے یہاں بھید بھاؤ نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔

حضرت علی مرتضیٰ اور امام عالی مقام حسین علیہ السلام سے دلی لگاؤ تھا اپنی شاعری اور نثر میں انہوں نے پنجتن پاک کو دل کی گہرائیوں سے خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ نائب حضرت واقف مرادآبادی شمیم کرہانی سید ... علی مرحوم سے بڑی کھل کر باتیں کرتے تھے۔

۱۹۶۴ء میں جب میرا مجموعۂ کلام سفینہ و ساحل ہندی رسم خط میں چھپا تو میں نے امن صاحب سے تبرک پایا تو آپ نے جو لکھا وہ سفینہ ساحل کے ایڈیشن میں شامل ہے۔ "مرزا داغ کے جو شاگرد اتر پردیش میں ہوئے انہوں نے لکھنؤ اور دلی کی اردو کا جھگڑا مٹا دیا خود حزیں صاحب بھی اتر پردیش کے ہیں اور آپ کے استاد جناب ... سے تعلق رکھتے ہیں ... جن کے ... کی زبان کو کھیانی ہدایت ہوئی ... دہلوی کے ہی پوتے تھے۔"
اب آپ ملاحظہ فرمایئے امن صاحب کی اس مختصر تحریر نے اردو ادب کے سینکڑوں سال کے اس جھگڑے کو کس خوبی سے طے کر دیا یہ امن صاحب کی وہی انسانیت والی خوبی ہے جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے اُن کے یہاں تعصب والی عینک ہے ہی نہیں۔

اسی تبرک میں امن صاحب نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے۔

"جہاں تک عزیز وارثی کے وچاروں کا سمبندھ ہے یہ اودھ پرانت کے پرسدھ سنت حاجی وارث علی شاہ صاحب کے گھرانے کے شِشیوں میں سے ہیں۔ جو لوگ وارثیہ گھرانے سے پرچیت ہیں وہ جانتے ہیں کہ لاکھوں ہندوؤں کو بھی شاہ صاحب سے شردھا تھی جن میں میرے دادا دادی بھی تھے وارث علی شاہ جیسے صوفیانہ دھرم کا پرچار کیا اُس میں ... نہیں آنے دیا اُن کو دھرم کا سچا سروپ بتایا جو نیکتا کے آدھار پر ہونا ہے یا جسے نیکتا کا آدھار کہہ سکتے ہیں۔"

میں نے امن صاحب سے اس تحریر کی تشریح چاہی تو امن صاحب نے فرمایا کہ ہماری دادی کے یہاں جو بچہ پیدا ہوتا تھا وہ صرف ایک ہفتہ زندہ رہتا تھا۔ اس ہفتے کے اندر ایک کالا کتا ہمارے دادا کے گھر آتا تھا وہ دادی کے پلنگ کے گرد گھومتا اور بچہ مر جاتا تھا یہ بڑی تشویش ناک بات تھی اُن سے کسی نے کہا دیوہ شریف سے دھاگا لا کر پلنگ میں باندھ دو اور جو بچہ پیدا ہو اُسے وارث پاک کے آستانے پر دیوہ شریف لے جانا چنانچہ امن صاحب کے دادا دادی دیوہ شریف گئے اور وارث پاک کے قدموں میں بچہ رکھ دیا۔ اسی لئے امن صاحب نے لکھا کہ میری دادا دادی وارث پاک کے عقیدت مندوں میں سے تھے۔ یہ تھے امن صاحب کے خیالات جن کی آج ہمیں کتنی ضرورت ہے۔

امن صاحب جن دنوں صاحب فراش تھے اُن کی خدمت میں وہ ... اُن کے ... وہاں حاضر ہو کر فیض یاب سخن ہوتے تھے حکومت نے انہیں پدم بھوشن ... خطاب سے نوازا ... اردو اکادمی نے اردو ادب کے حقوق کی حفاظت میں وظیفہ دیا۔ اُن کی سیاسی خدمت کا بھی سرکار اور عوام نے اعتراف کیا۔ مگر امن صاحب کی طبیعت اِن تمام اعزازات سے بے نیاز رہی کیوں کہ اُن کا مسلک تو انسانیت تھا اور عقیدت اُن کا مذہب۔ اُن کے دل کے اندر احترام میں میری بابا بھی ہیں اور شہید کربلا حسین علیہ السلام بھی وہ حقیقتاً خلوص کے پیکر تھے محبت کی جیتی جاگتی مثال تھے۔ اُن کی نیک نیتی، وطن پرستی، سادگی اور

امن لکھنوی — کچھ ذاتی تاثرات

جشید
زیتپوری

جناب امن لکھنوی ہماری اس تہذیب کے نمونے تھے جو اب عہد گذشتہ کا قصہ ... ہے۔ وہ تہذیب و اخلاق اور بلیغ النظری کے ایک اعلیٰ معیار تھے۔ اُردو کے ایک اعلیٰ درجے کے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عمدہ مفکر، جا بعد اب روشن دماغ اور دردمند القلب انسان تھے۔ وہ تحریکِ آزادی کے ان سپہ سالاروں میں سے تھے جن کی تمام عمر خدمتِ قوم میں بیتی ہے۔ میں اُن سے باقاعدہ حیثیت سے ۱۹۵۸ء میں متعارف ہوا اُس کے بعد سے تو متعدد مشاعروں اور ادبی نشستوں میں اُن کا ساتھ رہا۔ یہاں تک کہ روشن دہلوی اور رعنداں دہلوی (جو امن صاحب کے شاگرد تھے) کے یہاں ادبی محفلوں میں ملاقاتیں رہیں۔ آج جب وہ ہم میں نہیں ہیں صرف اُن کی یادیں ہی باقی رہ گئیں ہیں۔ اُن کا دکھایا ہوا راستہ ہے جس پر چل کر ہم اپنے ملک کی بھرپور خدمت کر سکتے ہیں۔ اُن کی سیاسی زندگی اور شاعری پر تو اُن کے جیسے عظیم ہستی ہی روشنی ڈال سکتی ہے۔ مجھے تو چند واقعات یاد آرہے ہیں جنھیں میں پیش کر رہا ہوں۔

جامع مسجد کے سامنے آزاد پارک میں یوم اقبال پر ایک شاندار مشاعرہ اُس وقت کے ہوم منسٹر شری کیلاش ناتھ کاٹجو کی صدارت میں ہو رہا تھا۔ میں افضل پشاوری امن صاحب، مجاز لکھنوی اور کچھ احباب اسٹیج کے پیچھے کھڑے بات کر رہے تھے۔ مجاز اُس وقت بڑے موڈ میں تھے وہ پچی سے انہیں دلوں مجتبابت ہو کر لوٹے تھے۔ مجاز نے کہا "میں آج اس بات کو سمجھا کہ دُنیا میں امن قائم کیوں نہیں رہتا ہر وقت کوئی نہ کوئی جنگ چھڑی رہتی ہے" افضل پشاوری نے پوچھا "بھئی، اس بات کا انکشاف اچانک کیسے ہوا"۔ مجاز نے امن صاحب کی طرف اشارہ کرکے کہا "انہیں دیکھ کر"۔ پہلے تو ہم لوگ سمجھے نہیں مگر جب مجاز نے تجزیہ کیا کہ "امن صاحب منحنی بڑا ہے یہ دنیا وہ تر لوگ جانتے ہوں گے کہ امن صاحب دبلے پتلے درمیانہ قد کے تھے) مجاز کی اس بات پر ایک زوردار قہقہہ پڑا۔

سہانہ مستقبل کالج میں ایک مشاعرہ تھا۔ سابق لیفٹیننٹ گورنر جگن ناتھ آزاد اسلام مچھلی شہری، میں اور دلّی کے کئی شاعر شریک ہوئے تھے۔ ایران کے سفیر علی اصغر حکمت بھی اس میں شریک تھے (یہ عالم اور فارسی کے بہت بڑے شاعر تھے) اُن کی "قیامِ ہند کی یادگار" بیاد ہند فارسی میں شائع ہوئی ہے) کسی دوسری زبان کا ترجمہ اپنی زبان میں کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے لیکن دوسری زبان کی شاعری کا ترجمہ نا تب ہی کرنا اور وہ بھی فوراً اُسی وقت بہت ہی مشکل کام ہے۔ امن صاحب نے حکمت صاحب کے فارسی اشعار کا ترجمہ مشاعرے ہی میں اردو میں کرکے ناممکن کو ممکن بنا دیا۔ حکمت صاحب شعر پڑھتے جاتے تھے اور امن صاحب ساتھ ہی اُس کا ترجمہ کرتے جاتے تھے۔

میں نے اپنا مجموعہ کلام اُنہیں عقیدت کے ساتھ پیش کیا تیسرے دن دیکھتا کیا ہوں کہ اُن کا چپراسی ایک لفافہ لیے چلا آرہا ہے۔ لفافہ چاک کیا تو اس میں کلام کی (تالیف) پر سیر حاصل تبصرہ تھا۔ پھر دوسری کتاب "زمین ناپاک قدم" (جس میں کہ شاعری کے مضامین اور منظوروں کا مجموعہ تالیف) اور تیسری کتاب "فتح بنارس" (اردو اور فارسی کی بڑی نظموں کا کلیکشن تھیں) پیش کرنے کے تیسرے چوتھے دن ہی تبصرہ کرکے بھیج دیا۔ امن صاحب اپنے چھوٹوں کی ہر ادبی کاوش پہلی ہی فرصت میں مطالعہ کرتے تھے اور اُس کی ہمت افزائی کرتے تھے۔

جب اُن پر آرتھرائٹس کا حملہ ہوا میں اُس زمانے میں ملازمت کے سلسلے میں حیدرآباد دکن میں تھا۔ جب دلّی واپس آیا تو باوجود دلی خواہش کے اُن سے نیاز حاصل کرنے نہ جا سکا۔

بقیہ صفحہ ۴۸ پر

میرے اُستاد۔ امن صاحب لکھنوی

از کشن لال خنداں دہلوی

دل کے جذبات و احساسات کا بے ساختہ اظہار موزونیت کے ساتھ الفاظ میں کرنا شاعری ہے۔ یعنی شاعری کے لئے طبع موزوں، قلبِ حساس اور اظہار کا سلیقہ ضروری ہے۔ جب کسی شخص میں خداداد صلاحیتیں موجود ہوں تو وہ اپنی کاوش اور ریاضت سے شاعری کی معراج پا لیتا ہے۔ بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو طبعاً شاعر ہوتے ہیں اور ان سخن وروں میں بھی معدودے چند ہی ایسے ہوتے ہیں جو لطافت و نزاکت خیال کے ساتھ قواعدِ زبان و بیان، صرفی، نحوی و عروضی ضوابط اور اصولوں کی پابندیوں پر بھی نظر رکھتے ہوں۔ ایسے شاعر اُستاد کہلاتے ہیں جو فنی حدود کے اندر رہ کر خیالات کی رفعتوں کو جامۂ شعر میں پیش کرتے ہیں۔ ان کے کلام میں جذبات کی صحیح ترجمانی، پاکیزگیِ اظہار، فصاحت و سلاست، صحتِ زبان، چستیِ بندش وغیرہ ایسی خوبیاں ہوتی ہیں جن کے ذریعے ذوقِ سلیم کی تسکین ہوتی ہے۔ اردو زبان کے ایسے عظیم شعرا میں ایک ہستی تھے جناب کرشن ناتھ امن لکھنوی۔

مجھے امن لکھنوی کا شاگرد ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ مجھے اس پر ناز ہے کیوں نہ ہو وہ ایک جیّد عالم، ماہر عروض اور مشہور شاعر ہونے کے ساتھ امن صاحب ایک عالم باعمل تھے یعنی جن اُصولوں کا پیام انہوں نے اپنے کلام میں دیا اُنہیں زندگی میں بھی اُتارا۔ اُن کے لئے دنیا دِل تھی۔ تو امن صاحب کے کلام میں دِل لبھانے والی باتیں ہیں۔ انہوں نے کسی شخص کی جھوٹی تعریف نہیں کی، بلکہ کہا جائے تو ان کی نظم و نثر میں کہیں بھی کسی شخص کی ہجو یا مطلب براری کے لئے قصیدہ کوئی نہیں ہے کیونکہ وہ اقبال کے لفظوں میں "ذوالجبروتِ سنّت کے سب کا مجرا" لینے والوں میں سے تھے۔ اسی لئے کسی سے اُن کا بیر نہیں تھا۔ کسی کے آگے دستِ طلب دراز نہیں کیا۔ وہ تو اوروں سے بھی یہی کہتے تھے۔ ؎

کوئی طالب صاحبِ صدق و صفا ملتا نہیں
ورنہ اُس درگاہ سے بندے کو کیا ملتا نہیں

ایسا شخص جو قادر الکلام ہو اور اُصولوں کی زندگی جیتے تجربوں کو اشعار میں قرینے کے ساتھ پیش کرے تو عوام و خواص سے داد و تحسین کیوں نہ وصول کرے۔ امن صاحب بااُصول آدمی تھے مگر اُصولوں نے اُن کو زاہدِ خشک نہیں بنایا۔ اُن کے لطیف جذبات کو زنجیریں نہیں پہنائیں۔ شراب و کباب سے دُور تھے مگر اُن شاعروں سے متنفر نہ تھے جو ان چیزوں کے رسیا تھے۔ کسی کی بُرائی زبان پر نہ لاتے۔ گروہ بندی اُن کی سرشت میں ہی نہ تھی۔ اُنہیں داد کی تمنا نہ تھی۔ حالانکہ وہ اپنے کلام سے مشاعرے لُوٹ لیتے تھے۔

اب آپ ہی خیال فرمایئے جو شخص ادبی ماحول میں پرورش پا کر بڑا ہوا ہو وہ کیونکر ایک نادر قدر شناس نہ بنے۔ والد شاعروں کے شاگرد... [illegible] ... اُستادوں کی شاگردی کا شرف حاصل ہو تو اس میں کیوں نہ آسمان کے تارے توڑ لانے کی صلاحیت ہو۔ امن صاحب نے [illegible] عمر میں ہی شعر کہنے شروع کر دیے تھے۔ امن صاحب کے والد صاحب [illegible] شاعری کی بڑی قابلیت رکھتے تھے اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شاعری کرتے تھے۔ اُردو میں حالیؔ اور فارسی میں [illegible] تھا۔ [illegible] کے شاگرد جناب [illegible] حاصل تھا۔ اُن کے چند اشعار تحریر کرتا ہوں۔ ؎

موئے سفید لاتے ہیں پیغام موت کا
قدرت نے خوب تار سے ناتے ہیں بال کے

کیونکر نہ ہو سودائے محبت مرے سر میں
باقی ہے ابھی خون کے کچھ قطرے جگر میں

وہ مترجم اشعار بھی کہتے تھے۔ فارسی میں بھی غزلیں کہیں تھیں۔

ہندی میں اُن کی ایک ٹھمری ملاحظہ فرمائیں اُس زمانے کے لکھنؤ کا بھی ذرا خیال رہے۔

پیارے پیا کے کوئی دیس موہے لے چلے
پیا کے دیس کی ٹیڑھی میڑھی گلیاں
ڈھونڈت شیش ہینش کوئی لے چلے
پیارے پیا کے کوئی دیس موہے لے چلے

گھر میں شاعرانہ ماحول تھا اس سے جناب امن اور اُن کے برادرِ خورد جناب گردھاری لال ادیب لکھنوی جیسی شخصیتیں میدانِ سخن میں اُبھریں۔ جناب ادیب لکھنوی سے کون واقف نہیں اور مجھ پر تو خاص طور پر مہربان ہیں۔ علامہ ادیب کے کلام بلاغت نظام کے اشعار نمونے کے طور پر پیش کرتا ہوں ذرا معیار اور پختگی ملاحظہ فرمائیے ۔۔

کس کی پیری یا جوانی رہ گئی ہم جیسے سُننے کو کہانی رہ گئی
یوں تو دنیا میں کوئی رہتا نہیں رہ گئے جن کی کہانی رہ گئی
ساتھ پیری نے دیا تا حدِ گور ہم دو قدم چل کر جوانی رہ گئی
ایسے ایسے نوجواں بھی اُٹھ گئے ہم دیکھتی جن کو جوانی رہ گئی

رہ گئی کی زمین میں دو اشعار اور پیشِ خدمت ہیں

ہر کلی یوں مسکرا کر رہ گئی ہو جیسے لب تک بات آکے رہ گئی
رونقِ محفل پر گئی اُن کی نظر ہو مقابل آنکھیں جھپکا کے رہ گئی

اُن کا ایک اور مطلع پیش کرتا ہوں۔

قدر ہو اس انجمن میں میرے افسانے کی خاک
خاک بھی جائے جس محفل میں پروانے کی خاک
بادہ گردی کا سودا ہے تو اس قابل بنو
خاک پائے رہروانِ جادۂ منزل بنو

ان اشعار کے پیش کرنے کا میرا مقصد صرف اتنا ہے کہ میں یہ عرض کر سکوں کہ جناب امن کی ولادت اور پرورش جس خاندان میں ہوئی وہاں شاعرانہ ماحول تھا۔ لکھنؤ کی ادبی فضا میں اس ذوق کو پھولنے پھیلنے کے مواقع ملے۔ ادبی نشستوں اور مشاعروں میں امن صاحب کلام پیش کرتے تھے جہاں اُس زمانے کے مستند شعراء موجود ہوتے تھے۔

لکھنؤ سے امن صاحب غازی آباد آئے۔ وکالت شروع کی ساتھ ہی تحریکِ آزادی کا پیام عوام تک پہونچانے میں سرگرم ہو گئے۔ اُن کے آنے سے مقامی کانگریس میں نئی زندگی آ گئی۔ امن صاحب کے ہمسائے تھے چودھری چرن سنگھ جی جنہیں امن صاحب نے کانگریس کمیٹی کا ابتدائی ممبر بنایا تھا۔ دونوں کی دوستی مشہور تھی۔ امن صاحب نے غازی آباد میں انجمن مشاعرہ کی بنیاد ڈالی اور عالی شان کل ہند مشاعرے کرا ڈالے۔ کتنے ہی مقامی حضرات شعر کہنے لگے اور عوام میں سخن فہمی کا شعور اُبھرا۔ غازی آباد میں بزم اکبر آبادی اور اُن کے صاحبزادگان، مولوی محمد یحییٰ تنہا، مولوی ظہیر، جناب ادیب لکھنوی وغیرہ قیام پذیر تھے جن سے شاعری کا ماحول بنا مگر روحِ رواں تھے جناب امن لکھنوی۔

وکالت سے امن صاحب صحافت میں آئے اور اسی سبب سے غازی آباد سے دہلی منتقل ہو گئے ۳۳ء میں چھوٹی محلہ پیپل مہادیو حوض قاضی دہلی میں انہوں نے لشن یاں شاد صاحب کے مکان میں سکونت اختیار کی۔ شاد صاحب فرمایا کہ ... تو وہ دکان ... میں لالہ دیوان چند رہتے تھے اور وہ اتنے بڑے آدمی ہوئے کہ اُن کے نام سے چاندنی چوک میں دیوان ہال بنا۔ امن صاحب آپ بھی بہت بڑے آدمی بنیں گے تو واقعی یہ مکان امن صاحب کو اتنا راس آیا کہ وہ دہلی میں وزیر بنے اور شاد صاحب کی پیشن گوئی صحیح ثابت ہوئی۔

میں پیپل مہادیو رہتا ہوں اس لئے جناب امن صاحب سے ملاقات ہونے لگی اور جلد ہی میں اس نتیجہ پر پہونچا کہ یہ نامور شاعر، مفکر، صحافی اور سیاست داں ایک عظیم انسان ہے مثل مشہور ہے عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے یہی حال شاعری کا ہے۔ امن صاحب کے آنے کی حوض قاضی کے ادبی اور ثقافتی ماحول میں نئی زندگی آ گئی۔ نئی نئی سرگرمیاں شروع ہوئیں۔ موسیقی، مصوری، بحث و تحقیق، فینسی ڈریس، ڈرامے اور بزمِ سخن کا اہتمام ہونے لگا۔ جن میں امن صاحب کے اثر و رسوخ سے باہر سے بھی بڑی بڑی شخصیتیں اکثر شرکت فرماتی تھیں۔ مشاعروں میں وہ رنگ جمتا اور

شاعروں کو سخن شناسوں کی داد و تحسین ملتی تھی کہ وہ پھر آنے کے متمنی رہتے تھے جس کے متعلق فہیم بیگ چغتائی نے کہا تھا کہ "یہاں مجھے اتنی داد مل گئی کہ اب زندگی بھر داد نہ بھی ملے تو کوئی غم نہیں" ایک مرتبہ جوشؔ ملیح آبادی نے اپنے انداز میں داد دیتے ہوئے فرمایا تھا "سب .... دلی والے تو مر گئے لے دے کے یہیں رہ گئے ہیں" اس ماحول سے محلے کے نوجوانوں میں ذوقِ شاعری اُبھرا اور امن صاحب نے اسے جلا دی یعنی ۔ ع ۔

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا

راقم الحروف نے اس زمانے میں علامہ امن صاحب کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ کیا۔ امن صاحب کی علمیت، بلیغ النظری وغیرہ کا تو میں قائل تھا ہی مگر اُن کی حوصلہ افزائی اور شفقت سے میں خاص طور پر متاثر ہوا۔ امن صاحب کا طنز و مزاح اتنا ستھرا ہوتا تھا کہ وہ جس محفل میں بیٹھتے باغ و بہار بن جاتی۔ اُن کے طنز و مزاح کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ لبوں پر مسکراہٹیں بکھر جاتیں مگر کیا مجال جو کسی کے ماتھے پر شکن یا دل میں میل آجائے۔ چھتہ صوفی میں شاد صاحب کے دیوان خانے کے بڑے صحن میں ہفتہ وار طرحی مشاعرے ہونے لگے جس میں سنجیدہ اور مزاحیہ دونوں طرح کا کلام ہوتا تھا۔ ان میں شرکت کرنے والے امن صاحب کے علاوہ جناب چنڈی پرشاد شیدا، لبھو دیال شاد، مہاپر نرائن شوق، شیام لال روشن، لیکھ پال اشری بسمل، امیر چند کیلاش، رام شرن وغیرہ ہوتے تھے۔ راقم الحروف بھی کلام پیش کرنے کی جسارت کرتا تھا۔ کلام پڑھنے والوں میں بیشتر امن صاحب سے اصلاح لیتے تھے۔ میں نے رنگِ طنز و مزاح میں طبع آزمائی شروع کی اور یہی رنگِ شاعری عمر بھر کے لئے اختیار کر لیا۔ قبلہ امن صاحب نے میرا دل بڑھایا۔ آج مجھے محسوس ہوتا ہے کہ استاد محترم نے مجھ پر کرم فرمایا کہ اس قابل بنایا کہ میں اپنا دیوان گلِ و غنچاں (جو زیرِ طبع ہے) مرتب کر سکوں اور ہندوستان کے مختلف شہروں میں ہونے والے مشاعروں میں دلی کے مزاحیہ شاعر کی حیثیت سے شریک ہو سکوں۔

خاندان میں ایک موت ہو جانے سے امن صاحب کا دل قاضی حوض کے مکان سے اُچاٹ ہو گیا اور وہ نوگھرہ والان میں جا کر رہنے لگے لیکن چھتہ صوفی میں ہفتہ وار مشاعروں جلسوں یا محفلوں میں ضرور شرکت فرماتے تھے کبھی کبھی امن صاحب کے مکان پر بھی ادبی نشستیں جمتیں ہم سب نوگھرہ والان میں اُن کے دولت کدے پر حاضر ہوتے اور اُن محفلوں میں شریک ہوتے تھے۔

امن صاحب مصروف ترین آدمی تھے سیاست صحافت، سماجی خدمت، شعر و ادب سب ساتھ ساتھ چلتا رہتا حالانکہ اُن کا دل کبھی کبھی کہہ اُٹھتا تھا

ع۔ یہ کنارِ چمن کی ہوائیں
یہ نمودِ سحر کی ادائیں
غنچے کہتے ہیں آ مسکرائیں

اور میں مبتلائے سیاست

آزادی ملنے کے بعد ملک میں جو عام انتخابات پہلی مرتبہ ۱۹۵۱ء میں ہوتے تھے اُن میں جناب امن بھی دلی اسمبلی کے لئے اُمیدوار تھے۔ مقابلہ زوردار تھا۔ ہم پہلی مہادیو والے لوگوں نے امن صاحب کی طرف سے انتخاب میں جی جان سے محنت کی۔ امن صاحب اپنی شخصیت، قابلیت خدمات اور ہر دلعزیزی کی بنا پر جیت گئے ہماری محنت سپھل ہو گئی ایسا لگتا تھا جیسے ہم ہی ممبر بنے ہوں امن صاحب نے وہ چناؤ کتنے کم روپیوں میں لڑا اس کی مثال آج تک نہیں ملتی۔ الیکشن میں کامیابی کے بعد ڈپٹی اسپیکر بنے، وزیر بنے مگر وہ سب امن صاحب کی وہی شان تھی یعنی بانس کی چارپائی، کھدر کا معمولی اوڑھنا بچھونا۔ غرور تو نام کو بھی چھو نہیں گیا تھا، جو گیا کُشادہ پیشانی سے ملے مدد فرمائی۔ شاعروں کے لئے تو استقبال میں اور زیادہ اپناپن ہوتا تھا۔ میں جب بھی گیا امن محبت سے ملتے تھے مدد کے لئے تیار رہتے تھے اور میری غزلوں کی اصلاح کے لئے کافی وقت

نکال لیتے تھے۔ ان کا تازہ کلام سننے کا بھی موقع ملتا تھا۔ مجھے تعجب ہوتا تھا کہ اتنا مصروف آدمی شاعری کے لئے فرصت کیسے نکال لیتا ہے۔ لیکن امن صاحب کی زود گوئی کا یہ عالم تھا کہ وہ مشاعروں میں جاتے جاتے دس پانچ منٹ میں اشعار کہہ لیتے تھے اور ان پر جھولی بھر کر داد بھی لوٹ لیتے تھے کیونکہ ہر شعر سے اُستادی ٹپکتی تھی

امن صاحب کی طبع موزوں کو تحریک آزادی نے خاص طور پر متاثر کیا۔ ان کے کلام میں حب الوطنی، قوم پرستی نمایاں ہیں۔ جیل میں بھی مشقِ سخن جاری رہی، مشاعرے منعقد کئے۔ ہندوستان کے بڑے بڑے رہنما امن صاحب کے ساتھ جیل میں تھے۔ ان میں سے کئی امن صاحب کے شاگرد بنے، مہاویر تیاگی، رگھوکل تلک، مظفر حسن، میر مشتاق احمد، حکیم خلیل الرحمٰن نار، رام لال ورما ہندی وغیرہ۔ ویسے بھی امن صاحب کی رسائی بڑے سے بڑے رہنما تک تھی کئی وزیر اعظم امن صاحب سے ملنے ان کے گھر آئے۔ پرانے ساتھی آتے تو محفلیں جمتیں سخن فہم مہمان ہوتا تو شعر و شاعری کا بازار گرم ہوتا۔ ان کا حافظہ بلا کا تھا۔ ہزاروں اشعار یاد تھے اور وہ شعر کے ساتھ ساتھ یہ بھی فرماتے تھے کہ یہ شعر کس نے کس موقع پر کہا ہے۔ کبھی کبھی تو ایک ہی مفہوم کے درجنوں اشعار مختلف زبانوں کے حوالے سناتے تھے۔ اشعار سنجیدہ بھی ہوتے تھے اور مزاحیہ بھی، پھبتیاں بھی کس دی جاتیں تھیں مگر معیار سے گری بات کسی کے منہ سے کبھی نہیں سُنی۔

امن صاحب کے ساتھ مشاعروں میں شریک ہونا ایک اعزاز تھا۔ میں ان کے قریب بیٹھ کر کتنا کچھ سیکھ لیتا تھا وہ شعر کے محاسن و معیوب مجھے سمجھا دیتے تھے۔ اور باتوں باتوں میں بھی باریکیاں بتا دیتے تھے۔ ان کے مزاح سے مشاعرے کا ماحول بہتر ہی بن جاتا تھا۔ مثلاً ایک دفعہ ایک شاعر نے مشاعرے میں جب یہ مصرعہ پڑھا ع

کوشش غیر کی ہوں نام ہمارا ہو جائے

امن صاحب نے ذرا بلند آواز سے داد دی وہ

شاعر تو اپنے دل میں سوچ رہا تھا کہ بہت اچھا مصرعہ ہے مگر داد کی وجہ سے مصرعے کے معنی ہی بدل گئے۔ اور سامعین نے ایک قہقہہ لگا دیا۔

ایک دن جناب رفعت سروش سے باتوں میں امن صاحب کا ذکر چلا۔ پرانا قصہ تھا جب جناب گلزار زتشی دہلوی کی انجمن تعمیر اردو کی نشست میں ایک صاحب اپنی غزل پڑھ رہے تھے جس پر تنقید ہونی تھی۔ جب وہ غزل پڑھ چکے اور کسی نے کوئی اعتراض نہیں کیا تو گلزار صاحب نے منور لکھنوی سے کہا۔ "آپ ہی کچھ فرمائیے" منور صاحب نے کہا میں کیا کہوں گا، یہ غزل تو میری کی اصلاح کی ہوئی ہے۔ اس پر امن صاحب فوراً بولے "پھر تو صاحب مجھ کو اعتراض ہے (منور صاحب امن صاحب کے دوستوں میں سے تھے) اس غزل کا ایک مصرعہ "کر جیسے" سے شروع ہوتا تھا اور امن صاحب نے کر کے بعد جیسے کو غلط بتایا۔ آخر منور صاحب نے امن صاحب کی بات مان لی۔ اس واقعہ کے متعلق رفعت سروش صاحب نے جو بات کہی وہ بھی قابل ذکر ہے۔ انہوں نے کہا۔ "اس کا مطلب یہ ہوا کہ علم کی دو توپیں آپس میں ٹکرا گئیں" اس فقرے سے آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ امن صاحب کا علم کی دنیا میں کیا مقام تھا اور لوگ انہیں کس نظر سے دیکھتے تھے۔

امن صاحب کا اصلاح فرمانے کا ڈھنگ بھی لاجواب تھا شاگردوں کو خود ذہن پر زور ڈال کر کلام کہنے کے لئے حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ پھر ان اشعار میں ایک آدھ لفظ بدل کر شعر میں وہ جان ڈال دیتے تھے کہ وہ بہت بلند ہو جاتا تھا۔ اس میں نئے معنی آ جاتے تھے۔ سنجیدہ کے مقابلے میں مزاحیہ کہنا زیادہ مشکل کام ہے کیونکہ بات بھی ہو اور انداز بھی۔ اگر سامعین کے لبوں پر تبسم نہ آئے تو معاملہ پھس پھسا رہ جاتا ہے۔ میں مندرجہ ذیل اپنے چند اشعار پیش کرتا ہوں ان میں امن صاحب نے جو اصلاح فرمائی وہ بھی تحریر کرتا ہوں۔

شیخ نے تو پانی مانگا تھا مگر دے دی شراب
توبہ
پی کے پوچھا کیا تھا یہ میں نے کہا یہ تھی شراب

آرام جن میں کرتا تھا پی کر شراب روز
خراب

اب مجھے یاد کرتی ہیں وہ نالیاں سب مجھے
...ن نظر داد دیں انھوں نے اصلاح میں روز کو گلاب کے
...تہ بلکہ اردو اور انگریزی لفظ سے کیا فائدہ اٹھایا ہے
...ن بات یہ بھی کہ گلاب ایک قسم کی شراب بھی ہوتی

...راب دیتا رہا روز اگر نہ دی روزی
اسی لئے کبھی اللہ میاں کچھ نہ کہا
...ساشا ہو کے پاسبان رہا کریم پودے
خزاں کے دور میں نقلی بہار کون دیکھے گا

ایک دن میری موجودگی میں امن صاحب روشن دہلوی
...غزل پر اصلاح فرما رہے تھے۔ روشن صاحب نے شعر پڑھا تھا

میں نے رفتارِ زمانہ دیکھ کر
اپنے بیٹے کو لڑکا کر دیا

...ن صاحب نے اصلاح فرمائی ہے

میں نے رفتارِ زمانہ دیکھ کر
اپنے لڑکے کو لڑاکا کر دیا

اب آپ خود ہی خیال فرمائیں کہ امن صاحب سا
...ستاد ملنا کتنے مقدر کی بات ہے آن کی تعریف کرنا سورج
...راغ دکھانا ہے میں تو یہی کہوں گا ہے

قسمت مری نصیب مرا بخت ہے مرا
مجھ کو جناب امن سا استاد مل گیا

...اپنے کلام کی مقبولیت اور مشاعروں میں کامیابی
...کر روشن دہلوی نے بھی اپنی غزل کے مقطع میں امن
...صاحب کے متعلق کہا ہے

یہ ہے لکھنوی امن کا فیض روشن
ذرا کہو یہ دلی کا پانی نہیں ہے

امن صاحب کا کلام ایک پیام ہے، آن کی شاعری
...سن ہے۔ چاہے وہ قومی تحریک ہو یا حصولِ آزادی
...وقت فرقہ وارانہ فساد سے گھرا ہوا فضا یا آزاد ہندوستان
...تعمیر امن صاحب اعلیٰ اقدار کو اپنی شاعری کے ذریعے
...تک پہنچاتے رہے۔ کاروانِ منزل میں کئی غزلیں

ایسی ہیں جنہیں آپ نظم بھی کہہ سکتے ہیں مثلاً جن میں ایک تسلسل ہے۔ 'ہنگاموں کا زور ہونے پر' یا 'آزادی کے چراغ'، یا 'گاندھی جی کی شہادت' جیسی نظمیں اک ایسا صاحب دل ہی لکھ سکتا ہے جس کے من میں تڑپ ہو اور روح میں اضطراب۔

امن صاحب نے کئی کتابیں تصنیف فرمائیں جو مختلف زبانوں میں شائع ہوئی تھیں اور مشاہیر نے آن کی تعریف بھی فرمائی۔ اپنی ایک تقریر میں جواہر لعل نہرو جی نے امن صاحب کی ایک کتاب کا ذکر کرتے ہوئے ان کے انداز بیان کو لسانی مسئلوں کا ایک حل بتایا تھا۔ ادبی خدمات کے لئے آپ کو دلی ساہتیہ کلا پریشد اور اردو اکادمی ایوارڈ مل چکے تھے اور امن صاحب کی خدمات و صفات کے لئے صدر جمہوریہ ہند نے ۱۹۸۰ء میں پدم بھوشن سے نوازا۔ امن صاحب قلم کے دھنی تھے بہت لکھا آج بھی آن مسودات کو کتابی شکل دے دی جائے تو درجنوں جلدیں شائع ہو سکتی ہیں۔

پیروڈی جیسی شوخ صنف کو بھی امن صاحب نے منہ لگایا۔ استادوں کی زمینوں میں غزلیں کہیں اور خوب کہیں مثلاً فانی بدایونی کی مشہور غزل 'دیکھتے جاؤ' میں ذرا ایک شعر ملاحظہ فرمائیے ہے

جوانوں کا بڑھاپا دیکھنا تھا اولڈ دلی میں
نئی دلی میں بوڑھوں پر جوانی دیکھتے جاؤ

جناب امن کے دوسرے مجموعۂ کلام 'بو رنگ' میں ایسی کئی غزلیں شامل ہیں۔ امن صاحب نے ایک کتاب 'بڑے آدمیوں کے طنز و مزاح' تصنیف فرمائی۔ اس سے ان کی زندہ دلی کی کچھ جھلک ملتی ہے مگر اصلی لطف تو ان لوگوں نے اٹھایا جنھیں امن صاحب سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہو۔ عمر کے آخری برسوں میں وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے تھے مگر زندہ دلی کی وہی کیفیت تھی کیا مجال جو چہرے پر ذرا سی شکن ہو۔ میں جب بھی جاتا انہیں یا تو کسی کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے دیکھتا یا شطرنج کھیلتے ہوئے

ہنسی مذاق جاری رہتا۔ ایک دن ایک صاحب نے حال چال پوچھا فرمایا حال تو اچھا ہے مگر چال خراب ہے۔ ایک اور صاحب نے حال پوچھا تو برنارڈ شا کا حوالہ دیتے ہوئے کہا "اوپر کی منزل تو بالکل ٹھیک ہے مگر نیچے کی منزل بیٹھ گئی ہے۔ آپ خود ہی سوچ لیجیے جو شخص ۸۵ برس کی عمر میں بھی اس قسم کی باتیں کر سکتا ہے وہ کتنا زندہ دل انسان ہوگا۔ امن صاحب مذاق کرنے پر آتے تو ہم شاگردوں کو بھی نہیں بخشتے تھے مگر اس مذاق میں بڑا سلیقہ اور احتیاط ہوتی تھی۔

صحافت کے میدان میں امن صاحب نے جہاں سنجیدہ موضوعات پر قلم اٹھایا وہاں مزاحیہ کالموں میں سیاسی، سماجی مسئلوں پر ہنسی ہنسی میں بڑی بڑی باتیں تحریر فرماتے۔ لوگ اخباروں میں ان کالموں کو خاص دلچسپی سے پڑھتے تھے۔ پیچ اخبار میں "نقش و نگار" اور سنسار اخبار میں "نرم گرم" مزاحیہ کالم امن صاحب کے قلم کے مرہونِ منت تھے۔ ان میں ادبی چاشنی ہوتی تھی اور زندگی کی حقیقتیں اور تاریخی واقعات کا تذکرہ بھی۔ فرقہ پرستوں، حکومت پرست ٹوڈیوں سے نوک جھونک چلتی رہتی۔ کبھی کبھی اخباری معرکے بھی ہو جاتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک مسلم لیگی اخبار میں چھپا ؎

کانگریس آرہی ہے ننگے پاؤں جی میں آتا ہے بڑھ کے جوتا

امن صاحب نے اگلے دن لکھا کہ اس شعر کے مصرعۂ اولیٰ کے رکنِ آخر کے بعد سوالیہ نشان اور مصرعۂ ثانی میں نقطہ کے نیچے دو نقطے بڑھا کر پڑھیے۔

پیچ اور سنسار میں مزاحیہ کالموں کے علاوہ مختصر نظمیں بھی ہوتی تھیں جن میں رنگِ ظرافت میں واقعاتِ حاضرہ پر تبصرہ ہوتا تھا۔ عوامی جلسوں، تقاریر میں بھی مزاحیہ اشعار اور ادبی چٹکلوں کا خوبصورت استعمال ہوتا تھا۔ اسمبلی میں ہوں، یا کمیٹی میٹنگ میں۔ ادبی نشست میں ہوں یا سیاسی میٹنگ میں اپنے مزاح سے ماحول کو تر و تازہ بنائے رکھتے اور کبھی کبھی تو نہایت نازک موقعوں پر ایک لطیفہ یا تازہ مزاحیہ شعر ایک نیا سین موزوں پیش کر دیتا تھا۔

کہ بیٹنگ لکھا جائے امن صاحب جیسی عظیم شخصیت نے بہر بھی سیکھے وہ کم ہے۔ ہر جگہ نام کمایا یہاں تک کہ ۰۰ سال کی عمر میں یونیورسٹی کے امتحان میں بیٹھے اور اول آئے۔ میدانِ سیاست میں جن کی ایمانداری کی دھاک تھی، کی جان اور سماجی خدمت کے میدان کی آبرو کیا۔

امن صاحب کی یاد آتی ہے تو جی بھر آتا ہے۔ کو دیکھ کر بھی ہنسنے کے لئے کلیجہ چاہیئے۔ آخری دن ہم نے جب طبی معائنے کے لئے کہا "زبان دکھائیے" صاحب نے کہا جناب زبان دکھانے کی عادت نہیں۔ امن صاحب نے کبھی اوروں کے سامنے اپنے آنسو رکھے۔ مصیبتیں سہیں دکھ اٹھائے قید و بند اور کے آثار چڑھاؤ اچھے اچھوں کے چھکے چھڑا دیتے ہیں۔ امن صاحب اور ہی قسم کے انسان تھے۔ آنسو پینے کی ہمت رکھنے والا ہی تبسم کے پھول کھلا سکتا ہے۔ ایسا آدمی مزاحیہ شاعر یا مزاح نگار ہو سکتا ہے۔ امن صاحب عمر بھر ہنستے ہنساتے رہے میں تو مصحفی لکھنوی یہی کہہ سکتا ہوں ؎

ہنسانے والا رلا کے اٹھا

بقیہ صفحہ ۴۲ کا پرچم نا یمن شعلے کورا کہ بدلتے ہوئے دیکھنے کی ہمت نہیں رکھتا تھا۔ جب کبھی میں ان کے برادرِ خورد عالی جناب گلزار ادیب کی آواز سنتا ہوں تو یہی مغالطہ ہوتا ہے امن صاحب بول رہے ہیں۔ عرض کر دوں دونوں بھائیوں کی آواز بے حد ملتی ہے۔ بہت کئی بار اور جب بھی ان سے ملتا ہوں تو اگلی سطر امن صاحب کا چہرہ سامنے ؎

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم
ہو گئے راکھ انتہا یہ ہے

حبیب

منزل بہ منزل

۱۱ - لکھنؤ کے سری واستو کائستھ خاندان میں ۲۲ ستمبر بمطابق ۵ اشونی اسس سمبتی پرودیعنی پہلے نوراترے بروز بدھ ۶ بجے صبح ولادت ہوئی۔

۱۱ - مشہور سنت حاجی وارث علی شاہ کا آشیرواد ملا

۱۱ - آغاز اسکولی تعلیم (پہلے تو گھر میں دادا جان نے تعلیم کی ذمہ داری سنبھالی تھی) امین آباد اسکول میں داخل ہوئے

۱۱ - پہلا شعر کہا۔

۱۱ - انگریزی نظم کا اردو نظم میں ترجمہ کیا (اس وقت پانچویں جماعت کے طالب علم تھے)

۱۱ - الٰہ آباد یونیورسٹی کے میٹریکولیشن کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ اسی سال لکھنؤ میں کانگریس کے اجلاس میں پہلی بار شریک ہوئے۔

۱۱ - لکھنؤ کے سیشن کورٹ میں پہلی ملازمت کی لیکن تین ماہ بعد لکھنؤ میونسپل بورڈ کے ہیلتھ ڈپارٹمنٹ میں کلرک کی حیثیت سے تقرر ہو گیا جہاں سات برس تک کام کیا۔

۱۱ - الٰہ آباد ہائی کورٹ کے جونیئر لا (مختارشپ) کے امتحان میں کامیاب ہوئے قومی جلسوں میں نظمیں پڑھنا شروع کیا اور گاندھی جی سے متاثر ہو کر اپنا تعلق ان سے رکھا۔ کانگریس کے باقاعدہ ممبر بنے

۱۹۲۱ - "انقلاب" اخبار میں پہلی نظم چھپی۔ شفیعہ کالج لکھنؤ کے آل انڈیا مشاعرے میں شریک ہوئے۔

۱۹۲۰ - وزیر گنج وارڈ کانگریس کمیٹی کے اعزازی سکریٹری بنے

۱۹۲۰ - لکھنؤ ضلع کانگریس کمیٹی کی مجلس عاملہ کے رکن بنے والنٹیئر بورڈ کے جنرل میں مقرر ہوئے تحریک موالات کی تحریک میں سرگرم، ۱۰.۴ فروری لکھنؤ کو گرفتاری دینے والے [illegible] میں نام تھا مگر گاندھی جی تحریک ملتوی کردی۔ گاندھی جی کے تعمیری پروگرام اور کانگریس کی تنظیم میں برابر کام کرتے رہے۔

۱۹۲۲ - "دوو پنچ" لکھنؤ میں پہلا مضمون شائع ہوا۔

۱۹۲۴ - میرٹھ میں مختارشپ کی پریکٹس شروع کی

۲۴-۱۹۲۵ غازی آباد میں وکالت شروع کی۔ کانگریس کی تنظیم اور پرچار کے لئے بہت کام کیا۔ قومی تحریک میں جیل گئے۔ تعمیری کام میں تن من دھن سے مدد کی (ہریجن ادھار، تعلیم بالغان، قومی یکجہتی، ایک پیسہ چندہ تحریک، ریزولیشن چھاپنا اور والنٹیئروں کی بھرتی وغیرہ) غازی آباد میرٹھ، دہلی، ہاپوڑ شہروں اور ان کے گرد و نواح کے دیہات میں بہت کام کیا۔ غازی آباد نگر کانگریس کمیٹی کے سکریٹری رہے۔

— انجمن مشاعرہ قائم کی اور بہت کامیاب مشاعرے کئے

— ہندی میں شاعری شروع کی

۱۹۲۶ - غازی آباد میں پہلا گرودوارہ قائم کیا۔

۱۹۲۷ - علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے انٹر کے امتحان میں کامیابی حاصل کی

۱۹۲۸ - سائمن کمیشن اور شیخ چلی، منظوم کتاب شائع ہوئی۔

۳۱-۱۹۳۰ نمک قانون توڑنے اور جلسے میں تقریر کرنے کے جرم میں ڈیڑھ برس کی قید سخت کی سزا ملی۔ میرٹھ جیل اور فیض آباد جیل میں رکھے گئے۔ لیکن گاندھی اِروِن سمجھوتے کے سبب مارچ ۱۹۳۱ء لکھنؤ میں رہا کر دیئے گئے۔ جیل کے ساتھیوں میں شری لال بہادر شاستری، اور چودھری چرن سنگھ وغیرہ تھے

۱۹۳۲ - قومی تحریک میں ۶ ماہ کی قید سخت کی سزا ہوئی۔ فتح گڑھ جیل میں رکھے گئے

— رہائی کے بعد وکالت سے میدان صحافت میں آگئے۔ لالہ شنکر لال (دلی کے انقلابی نیتا) کے "وقت" اخبار میں کچھ ہفتے کام کیا۔

۴۹-۱۹۳۳ - دلی کے مشہور روزنامے "تیج" اخبار کے ایڈیٹوریل اسٹاف میں رہے جہاں شری خوشحال چند خورسند اور

شری ایم لال وہاجی کے ساتھ کام کیا۔ برسوں جوائنٹ
ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کیا۔ اس زمانے میں کئی رسائل
وجرائد کے لئے مضامین اور کالم لکھتے رہے۔ مثلاً ادیب
چمنستان وغیرہ۔ ۱۹۴۲ء میں تیج ویکلی کے ایڈیٹر بنے
اور ۱۹۴۶ء میں تیج اخبار کے ایڈیٹر کی ذمہ داری
سنبھالی۔ امن صاحب کے مضامین انہیں خاص طور
سے نقش ونگار قارئین بہت پسند کرتے تھے۔ تیج
کے اسپیشل نمبروں (کرشن جنم اشٹمی یا شہید نمبر)
میں مضمون، نظمیں اور تصاویر کے نیچے اشعار لوگ
دلچسپی سے پڑھتے تھے۔

— ملک کے مختلف حصوں میں مشاعروں، جلسوں
میں شرکت کی۔ خاص طور پر قومی مشاعرے اور تحریک
آزادی کے جلسوں اور شعری مجالس میں حصہ لیتے تھے

۴۴-۱۹۴۲۔ دلی صوبہ کانگریس کمیٹی کے پرچار منتری رہے۔ (یہ صوبہ
متھرا سے مظفر نگر تک پھیلا ہوا تھا)

۱۹۳۵۔ کانگریس کی گولڈن جوبلی پر ایک کتاب "کانگریس کا
پچاس سالہ کام" تصنیف کی۔

۱۹۳۶۔ ادیب فاضل (بی۔ اے آنرز ان اردو) پنجاب
یونیورسٹی سے اعزاز کے ساتھ کامیاب ہوئے اور اس
میں دوسری پوزیشن حاصل کی۔

— منشی پریم چند کی ہندوستانی سبھا کی مجلس عاملہ
کے اساسی رکن بنے

۱۹۳۹۔ آل انڈیا اردو کانفرنس دلی کی استقبالیہ کمیٹی کے ممبر بنائے گئے

۱۹۴۲۔ بھارت چھوڑو تحریک میں صوبہ دلی کانگریس کمیٹی کے
پرچار کا کام سنبھالا اور والنٹیر بنائے۔ دلی میں گرفتاری
ہوئی اور فیروز پور جیل میں ڈیڑھ برس نظر بند رہے۔ جیل
میں ساتھیوں میں شری بھیم سین سچر، شری ایم ایم
شاہ چودھری برہم پرکاش، ... راوصاحب، میر مشتاق احمد
وغیرہ تھے۔ جیل میں مشاعرے کراتے۔ کلچرل پروگرام
میں حصہ لیتے ... مختلف موضوعات
پر تقریریں ... کرتے رہتے۔

۴۷-۱۹۴۵۔ رہائی کے بعد گاندھی گراؤنڈ میں منعقد دلی صوبہ
کمیٹی کے پہلے جلسے کی صدارت کی اور صوبہ کانگریس
کے پرچار سمتی کے ممبر بنائے گئے۔

— سامراج واد پر ایک کتاب لکھی جس کا مسودہ
مکتبہ جامعہ میں فسادات میں نذر آتش ہوگیا۔

— دلی میں فرقہ وارانہ فسادات کے روکنے
کے لئے مجاہدانہ انتھک کام کیا۔ اقلیتوں اور مظلوموں
کی امداد کے لئے کوشاں رہے۔ شانتی ویوستھا
کے پرچار منتری بنے۔

۱۹۴۶۔ "ہندوستانی چمن" نامی کتاب دکشنی بھارت ناگری پرچار
سبھا کی طرف سے ہندی میں شائع ہوئی جس میں
شعراء کا تذکرہ تھا۔

۴۸-۱۹۴۷۔ ہندوستان کے آئین کے کچھ ابواب کا اردو میں ترجمہ
مہاتما گاندھی کا آشیرواد ملا۔ امن صاحب نے باپو
کئی مضامین کا ترجمہ اردو میں کیا

۱۹۴۷۔ صوبہ دلی کانگریس کمیٹی کے ڈیلی گیٹ برسوں رہے
اور رچنا تمک سمتی کے نائب صدر رہے

۵۱-۱۹۴۸۔ صوبہ دلی کے پریس آفیسر بنے۔ اخبارات پر
پابندی، سماج دشمن عناصر کی
راہ روی پر قابو ہی نہیں کیا بلکہ ان عناصر کی بیخ کنی
کی۔

امن صاحب نے قوانین میں کمیوں کی وجہ سے
آفیسری سے استعفیٰ دیا مگر ہندوستان کے وزیر
سردار پٹیل نے وہ استعفیٰ واپس کر دیا اور بعد میں
میں دفعہ ۱۹۱ میں ترمیم کی گئی۔

۱۹۴۸۔ شری جے پرکاش نرائن جی کے ساتھ" پرچا
نکالنے کی اسکیم بنی، مگر مالی دشواریوں کی وجہ
جامہ نہ پہنایا جاسکا۔

۴۹-۱۹۴۸۔ کانگریس پریزیڈنٹس نامی کتاب تصنیف کی
شائع نہ ہوسکی۔

۱۹۵۰۔ پنجاب یونیورسٹی کے منشی فاضل کے امتحان میں نصاب

۔ کاشی والی کے ہمہ زبانوں کے مشاعرے میں اردو کے نمائندہ شاعر کی حیثیت سے شرکت کی

۔ اردو سبھا قائم کی

۱۹۵۱ ۔ پہلا مجموعۂ کلام (کارواں وطن) شائع ہوا۔ جس میں تحریک آزادی اور حصول آزادی کے وقت کا کلام شامل تھا۔

۔ کل ہند انجمن ترقی اردو کی مجلس عاملہ کے رکن بنے۔

۱۹۵۲ ۔ دلی ریاستی اسمبلی کے ممبر کی حیثیت سے عوامی انتخابات میں کامیاب ہوئے اور ڈپٹی اسپیکر بنائے گئے تعلیم بالغان کے لئے راجندر بابو، سبھاش بوس، جواہر لال نہرو اور سردار پٹیل کی سوانح عمریاں لکھیں۔

۔ گوالیار میں آل انڈیا اسپیکرز کانفرنس میں شرکت کی

۱۹۵۴ ۔ "اردو ساہتیہ کا اتہاس" نامی کتاب ہندی میں تصنیف کی۔

۱۹۵۲ سے ۱۹۵۴ ۔ دلی اسٹیٹ ٹرانسپورٹ اتھارٹی کے چیئرمین رہے

۱۹۵۲ سے ۱۹۵۴ ۔ دلی اسٹیٹ میں چودھری برہم پرکاش کی کابینہ میں ڈویلپمنٹ منسٹر ہوئے۔ اطلاعات ترقی قانون، لیبر ہوں سپلائی، ہریجن کلیان، جیل، ٹیکس اور سماج کلیان محکمے دیئے گئے۔

۱۹۵۴ ۔ لکھنؤ میں دیوناگری لپی سدھار کانفرنس میں شرکت کی۔ سرینگر میں وکاس منتریوں کے سمیلن اور آل انڈیا لوکل سیلف گورنمنٹ کانفرنس میں دلی راجیہ کی نمائندگی کی۔

۱۹۵۵ سے ۱۹۷۴ ۔ ۱۹ برس دلی پردیش الوزت سمتی کے بلا مقابلہ صدر چنے جاتے رہے۔

۱۹۵۵ ۔ جامعہ اردو علی گڑھ کا خطبۂ صدارت پڑھا۔

۱۹۵۵ ۔ پاکستان (لاہور) میں مجلس پڑھی جس میں کئی دن کئی کئی گھنٹے امام حسین کی زندگی شہادت اور مشن پر تقریر کی

۱۹۵۵ اردو کے اخبار روزانہ سنسار کے چیف ایڈیٹر رہے

۔۔۔ ۱۹۶۲ ۔ دلی وودھان سبھا کی بھاشا سمتی، سوتنترتا سینانی سمتی اور سوتنترتا اتہاس سمتی کے ممبر رہے۔

۱۹۵۱ سے ۱۹۵۹ ۔ دلی لائبریری بورڈ اور دلی پبلک لائبریری کے چیئرمین رہے

ساؤتھ ایسٹ ایشیا لائبریری کانفرنس کی صدارت کی۔

۱۹۵۷ ۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے پرچار وبھاگ میں اردو پرچار سیل کے کنوینر رہے۔

۱۹۵۷ سے ۱۹۵۹ ۔ فلم سنسر بورڈ کی شمالی ہند ایڈوائزری پینل کے ممبر رہے۔

۱۹۵۸ آل انڈیا اردو کانفرنس کی استقبالیہ کمیٹی کے سکریٹری رہے دلی پردیش ہندی سمیلن کے کئی سمیلنوں اور جلسوں میں شریک ہوئے۔

۱۹۵۸ ۔ دلی نگر نگم کے چناؤ کے لئے کانگریسی امیدواروں کا انتخاب کرنے والے پینل کے ممبر رہے۔

۱۹۵۸ سے ۱۹۶۶ ۔ تعلقات عامہ کمیٹی کے چیئرمین بنائے گئے اور انہوں نے لفٹیننٹ گورنر دلی کے صلاح کار کی حیثیت سے کام کیا۔ اس کے ساتھ ہی لیبر ایڈوائزری کمیٹی، گرہ وکاس وبھاگ، ہریجن کلیان بورڈ، سماج کلیان وبھاگ وغیرہ کے چیئرمین رہے۔

۱۹۵۹ ۔ اکھل بھارتیہ الوزت سمتی کے نائب صدر منتخب ہوئے۔

۱۹۶۱ ۔ پاکستان میں دوسری مرتبہ مجالس پڑھنے گئے۔
ڈاکٹر راجندر پرشاد کی سوانح عمری کا اردو میں ترجمہ کیا۔

۱۹۶۳ ۔ دوسرا مجموعۂ کلام "پورنگ" شائع ہوا۔ صدر جمہوریہ ہند کو اردو کے سلسلے میں میمورنڈم دیا۔ دلی ساہتیہ سبھا کے نائب صدر بنے۔

۱۹۶۴ ۔ اکھل بھارتیہ الوزت نیاس کے سنستھاپک نیاسی بنے اور الوزت وہار بنوانے میں مدد کی۔

۱۹۶۶ ۔ دلی کی انترم مہانگر پریشد کے، دلی راجیہ گاندھی اسمارک ندھی کے صدر بلا مقابلہ چنے گئے۔

۱۹۶۷ ۔ آل انڈیا بھاشا سیمینار میں شریک ہوئے۔ صحت کی خرابی کی وجہ سے سرگرم سماجی خدمت سے رفتہ رفتہ الگ ہو کر گوشہ نشین ہو گئے

۱۹۶۸ اس وقت تک ۵۰ کمیٹیوں اور انجمنوں سے متعلق تھے

۱۹۶۹ ۔ گاندھی جنم شتابدی پرچار وبھاگ کے اردو سیل کے

اعزازی اچاریہ نے گاندھی جی کے مقولات کا اردو ترجمہ کیا۔ اور گاندھی جی سے متعلق اردو نظموں کا مجموعہ "عقیدت کے پھول" تالیف کیا۔

۱۹۷۱ ۔ انورت سیوی کا اعزاز آچاریہ تلسی کی طرف سے دیا گیا اور ان صاحب کو جیون بھر کے لئے اکھل بھارتیہ انورت سمتی کی مجلس کا اعزازی رکن اور دہلی پردیش سمتی کا سرپرست بنایا گیا۔ بڑے آدمیوں کے طنز و مزاح "کتاب تصنیف کی

۱۹۷۴ ۔ دہلی پرشاسن کی ساہتیہ کلا پریشد نے اعزاز دیا۔

۱۹۷۷ ۔ اُتر پردیش اُردو اکاڈمی نے ادبی خدمات کے سلسلے میں انعام سے نوازا

۱۹۷۷ ۔ صدر جمہوریہ ہند نے پدم بھوشن کا اعزاز دیا۔

۱۹۸۰ ۔ دہلی نگر نگم کے کمشنر شری جے این سنگھ نے شریہ [illegible] (ایک ادبی جریدے) کا ان خصوصی شمارے کا اجرا کیا اور ان صاحب کے اعزاز میں جلسہ ہوا۔

۱۹۸۲ ۔ ۱۰ جولائی ۱۹۸۲ء کو انتقال ہوا۔

ہندی کے مسلمان شعراء

یہ کتاب ہندی اُردو کی تحقیق، مسلمان بھائیوں کا ہندی سے تعلق اور خدمت مسلمان شعراء ہند کے سوانح حیات مع تصاویر سے مزین ہے جس پر ویسٹ بنگال اُردو اکاڈمی نے مصنف کو دو ہزار روپے اور بہار اُردو اکاڈمی پٹنہ نے ۳ ہزار روپے نیز اُردو اکاڈمی نے ایسی معیاری اور قابل قدر کتاب کی اشاعت پر ماہنامہ شان ہند کو دو ہزار روپے انعام دیا گیا ہے۔ یہ ایک نادر الوجود اور بے نظیر کتاب ہے جس کا بدل موجود نہیں ہے۔ محققین کالجوں اور یونیورسٹیوں کی لائبریریوں نیز ادبی اداروں کے لئے مفید ترین تحفہ ہے۔ قیمت ۵۱ روپے اور ڈی لکس ایڈیشن ساٹھ روپے۔ اب صرف ڈی لکس ایڈیشن ہی کی چند جلدیں باقی ہیں۔

دفتر شان ہند فلیٹ ۸، انصاری مارکیٹ
دریا گنج۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

آخری نظر

فرش نظر، بہشت نظر، انداز نظر کے بعد ابوالبیان حضرت بیخود موہانی رتن پنڈوروی کا پانچواں دیوان "آخری نظر" حال ہی میں شان ہند نے بہترین انداز میں شائع کیا ہے۔ آخری نظر آپ کی ذاتی لائبریری کے لیے ایک ایسا انمول اضافہ ہے جسے آپ فخر کے ساتھ باذوق احباب کو دکھا سکیں گے

قیمت : پندرہ روپیے

دفتر شان ہند فلیٹ ۸، انصاری مارکیٹ
دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

شمالی ہند کے مشہور غزل گو

حضرت گوہر عثمانی کا

مجموعۂ کلام

اعتراف

شائع ہو گیا ہے۔ بہترین کلام مشاہیر ملک کے گراں قدر مضامین سے مزین

قیمت -/۲۵ روپے

تقسیم کار : ماہنامہ شان ہند فلیٹ ۸ انصاری مارکیٹ دریا گنج۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

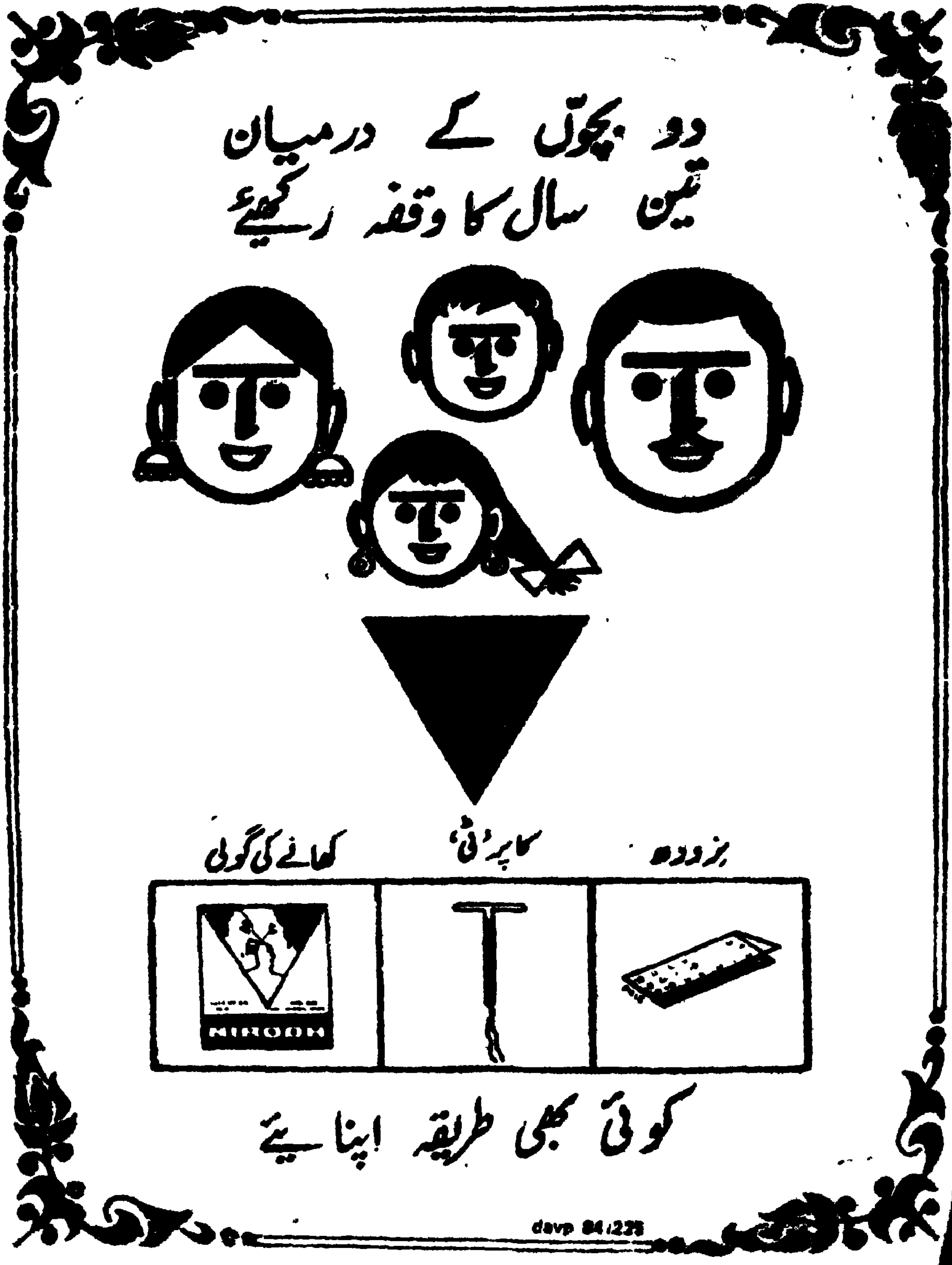
دو بچوں کے درمیان
تین سال کا وقفہ رکھیے
کھانے کی گولی
کاپر ٹی
نرودھ
NIRODH
کوئی بھی طریقہ اپنائیے
davp 84/235

بمبئی مرکنٹائل کوآپریٹیو بینک لمیٹڈ

رجسٹرڈ آفس ۷۸ محمد علی روڈ بمبئی ۴۰۰۰۰۳

دہلی آفس ۔ ۳۶۵۵ نیتاجی سبھاش مارگ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

فون :۔ ۲۶۸۲۶۶ —— ۲۶۴۳۷۲

★ ہمارے یہاں شرح سود تمام نیشنلائزڈ اور شیڈولڈ کمرشیل بینکوں کے مقابلہ ایک فی صد زیادہ ہے۔

★ ہندوستان کا پہلا کوآپریٹیو بینک جس کو زرِ مبادلہ میں کاروبار کے لئے لائسنس جاری کیا گیا۔

★ ہمارے بینک میں اوقاف کی جمع شدہ رقم کی آمدنی دفعہ ۱۲ (۵) الف (iii) انکم ٹیکس ایکٹ ۱۹۶۱ء کے تحت انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہے۔

اس کے علاوہ

★ ہم آپ کے آرام و آسائش کی ضروریات مہیا کرنے کے لئے آسان قسطوں پر قرضہ فراہم کرتے ہیں۔ ایک فیصدی کا فرق بہت بڑا فرق ہے۔ یہ آپ کی رقم میں ہزاروں روپیوں کا اضافہ کرتا ہے۔ آپ بھی اس کا فائدہ اٹھائیں۔

زین جی رنگون والا ★ حسینی ایس ڈاکٹر ★ شمیم کاظم

(منیجنگ ڈائرکٹر) (چیئرمین) (اسسٹنٹ جنرل منیجر۔ شمالی ہند)

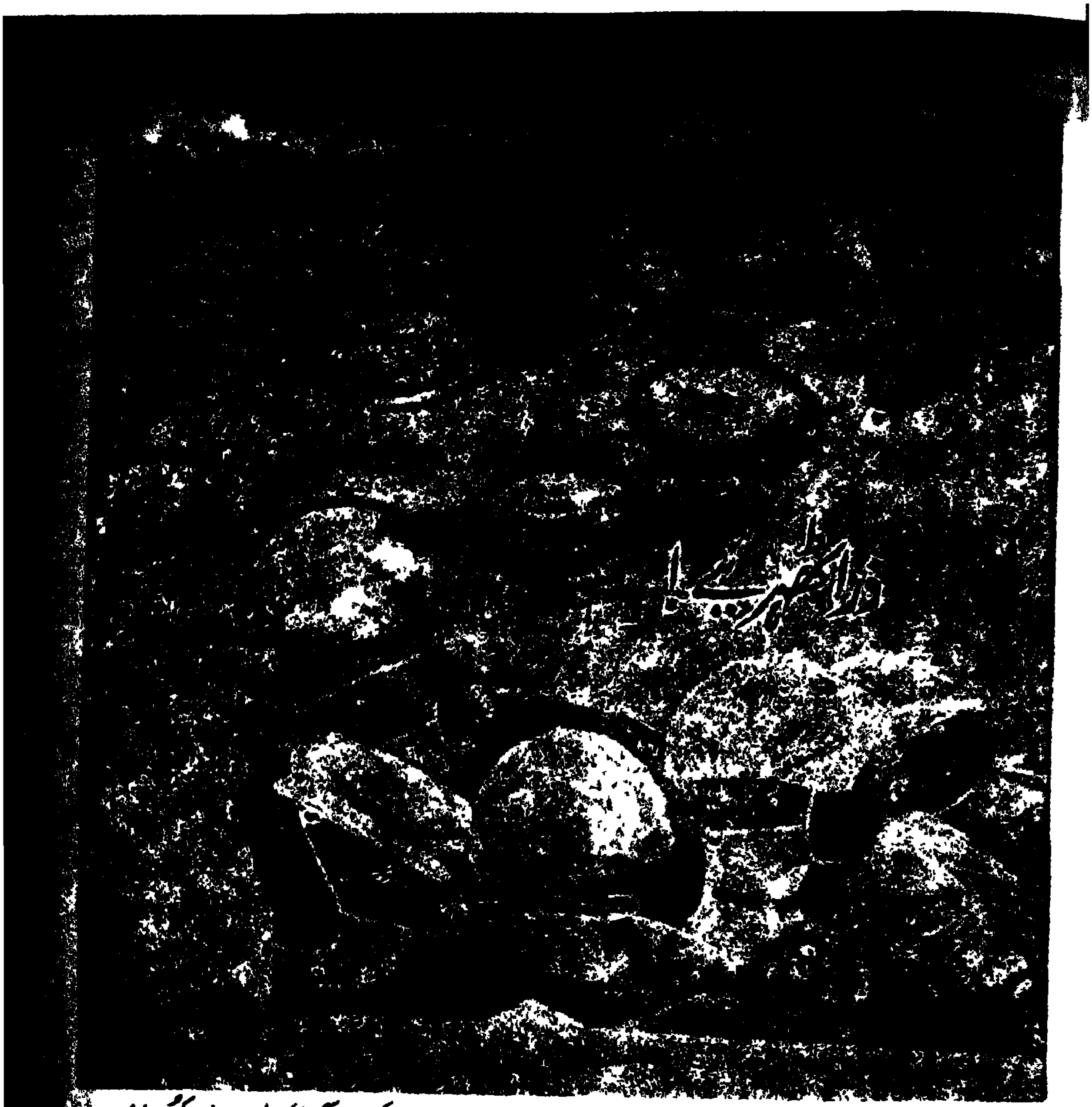

کیا آپ گلے کی تکلیفوں میں اکثر مبتلا رہتے ہیں اور اس کی وجہ سے سخت پریشان ہیں، لیکن یہ نہ سمجھئے کہ ایسی پریشان کن بیماری سے گلا کاٹ دینے سے ہی چھٹکارا مل سکتا ہے۔ ذرا ٹھہریئے! خالص دیسی ادویات سے تیار کیا ہوا "ٹونسلیکس" ایک بار صرف ایک بار استعمال کر کے تو دیکھئے، پھر آپ کو گلے کے غدود بڑھ جانے، گلے کی سرسراہٹ، خراش، گلے کے ورم، زخم اور دوسرے تمام امراض کی شکایت نہیں رہے گی۔ اگر آپ کے علم میں کوئی ایسا مریض ہو، جس کے گلے کے غدود (ٹانسلائٹس) کا آپریشن ہوتا ہے تو اُسے اس دوا کے بارے میں ضرور بتائیے گا کیوں کہ پھر اُسے آپریشن کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ چھوٹے بچے جو کھٹی میٹھی چیزیں کھا کر گلا خراب کر لیتے ہیں، اُن کے لئے بھی یہ بہت کام کی دوا ہے۔ ہر گھر میں اس کا رہنا بہت ہی ضروری ہے۔

—— شرع (یونانی اینڈ آیورویدک) لیبارٹریز، لال کنواں، دہلی ۱۱۰۰۰۶

Phone: 275602
HE SHAN-E-HIND MONTHLY NEW DELHI-110002
Regd. with the Registrar of Newspaper at R. No. 644 57
Regd·No D- DNJ 353
MARCH 1985

خرید کر پڑھئے :

مانگ کر پڑھئے :

یا پھر

چوری کر کے پڑھئے

یہ ہے ہی اتنا خوب صورت،
اتنا دل کش،
اتنا مکمل کہ اسے کسی طرح بھی
حاصل کریں کیوں کہ
یہ فیض کی شخصیت اور فن پر ایک
شاندار ادبی دستاویز ہے۔ اِس میں شامل ہیں :

قیمت : پندرہ روپے

★ خلوت اور جلوت کے بھید کھولنے والے ذاتی نقوش۔
★ نادر و نایاب تصویریں۔
★ سدابہار، ہزار رنگ و منتخب کلام۔
★ فیض کی شخصیت کے وہ ڈھکے چھپے گوشے جن پر سے پہلی بار پردہ اُٹھایا گیا ہے۔
★ ہندوستان، پاکستان، رُوس اور انگلستان کے دانش وروں کی مشترکہ کاوشوں کا گلدستہ۔

ساری اُردو دنیا میں شبستان کے "فیض نمبر" کا چرچا ہے

اس سے پہلے کہ اسٹاک ختم ہو جائے آج ہی اپنے قریبی نیوز ایجنٹ سے طلب کیجئے یا براہِ راست ہم سے منگوائیے۔

شبستان اردو ڈائجسٹ، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

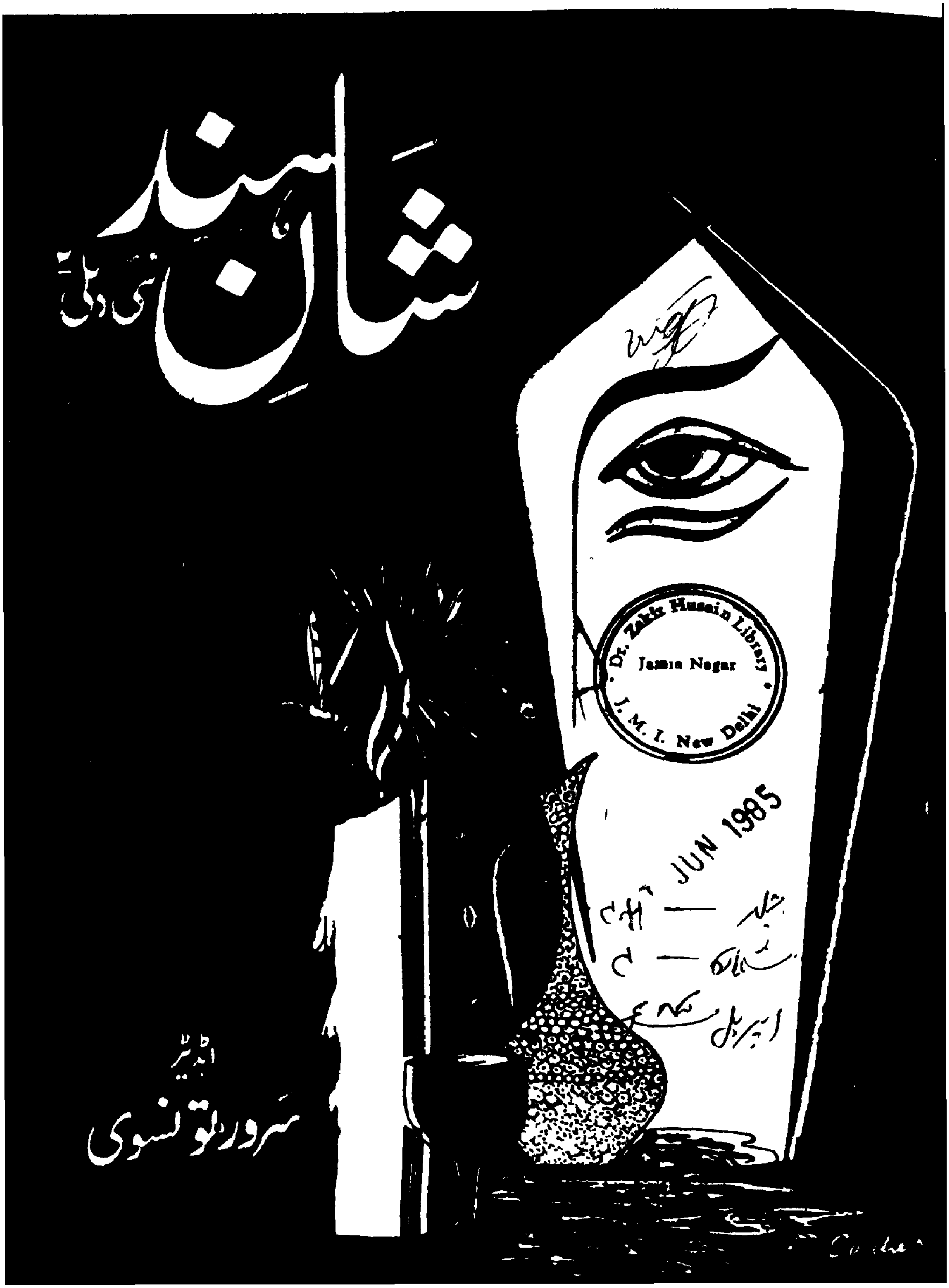

Dr. Zakir Husain Library
Jamia Nagar
J. M. I. New Delhi
JUN 1985

At Shriram, the focus is always on good performance, whether in the factory, field, office—or auditorium. Artistic talent is promoted as systematically as work talent.

Employees of Shriram Fertilisers & Chemicals, at Kota and elsewhere, are given every opportunity to develop their talents—in music, dance, drama—and perform at their best.

Our Shriram Kala Mandir at Kota is equipped with the latest lighting and acoustics technology. And our Shriram Ramlila is a brilliant spectacle which attracts thousands from all over Kota and the neighbouring areas.

SHRIRAM

PEOPLE GROWING TOGETHER

Shriram Fertilisers & Chemicals

(Prop DCM LIMITED)

ٹیلیفون نمبر ۲۷۵۶۰۲ | رجسٹرار آف نیوز پیپر فار انڈیا کا رجسٹریشن نمبر ۵۷/۷۷۷ | رجسٹرڈ نمبر ڈی (ڈی این) ۶۵۳/۵۴

ہندو پرست ہوں نہ مسلماں پرست ہوں
ہر ذرۂ وطن سے ہے فیاضؔ مجھ کو پیار
دامن پرست ہوں نہ گریباں پرست ہوں
یعنی وطن پرست ہوں انساں پرست ہوں
فیاضؔ گوالیاری

ایڈیٹر
سرور تونسوی

ماہنامہ

شانِ ہند

نئی دہلی

فی پرچہ ۲/۵۰ روپے
زرِ سالانہ ۲۴/- روپے

جلد ۶ | اپریل ۱۹۸۵ء | شمارہ ۴

ہمارا تعلیمی نصاب اور طریق تعلیم

سیمسن کو جب اندھا کر دیا گیا، تو اس نے کہا۔
روشنی جیسی نعمت عظمیٰ کو اتنی چھوٹی اور نازک سی جگہ میں کیوں رکھا گیا ہے کہ جو ظالم چاہے اُسے اکھاڑ کر اندھیرا کر دے۔ اسے تو سر سے پاؤں تک ہر جگہ ہونا چاہیئے تھا تاکہ کوئی مٹانا بھی چاہے تو مٹا نہ سکے۔

یہی حال ہمارے آج کے علم کا ہے کہ وہ ذہن کے صرف ایک ہی گوشے کو روشن کرپاتا ہے چنانچہ ہماری سیاست کے راکشس جب اس نور کو اپنے کام میں لانا چاہتے ہیں تو بٹن دبا دیتے ہیں ان کے ذہن کے اس روشن گوشے کو بجھا کر اپنے ہی نور چشموں کو اندھا کر دیتے ہیں۔
اور اندھیرا تو ہوتا ہی ہے۔ اس لیئے کہ اس میں توڑ پھوڑ، لوٹ مار، غارت گری اور خون ریزی کے کام انجام دیئے جائیں تاکہ بدامنی پھیلائی جائے اور بدنظمی پیدا کی جا سکے!
ہمارا تعلیمی نصاب اور طریق تعلیم ایسا ہو کہ ہمارا علم ہمارے ذہن کے ہر گوشہ کو روشن کر دے اور ہمارے وجود کو سراپا نکھار دے تاکہ ہمارا روشن سراپا ہماری طرف بڑھنے والے ہر ظالم کو چوندھیا دے۔ اور واپس ہونے پر مجبور کر دے۔
(ماخوذ از ....)

مدیر و پرکاشک سرور تونسوی: ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے جواہر پرنٹنگ پریس .... سے چھپوا کر دفتر شانِ ہند .... نمبر ۵، انصاری مارکیٹ، دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا۔

بلبل چہ گفت؟ گل چہ شنید؟ و صبا چہ کرد؟

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

جناب ڈاکٹر گوپی چند نارنگ جنھیں ممالکِ غیر میں "سفیر اُردو" کہا جاتا ہے — آج کل ناکام - نا اہل، جاہلِ مطلق اور نام نہاد اُردو کے مسلمان دانشوروں کی بلاوجہ مخالفت کا نشانہ بنے ہوئے ہیں - کوئی "قومی آواز" میں رطب و یابس کا سہارا لے رہا ہے تو کوئی بیسویں صدی میں دل کا غبار نکال رہا ہے

حقیقت یہ ہے کہ برصغیر ہند و پاک میں کوئی بھی ایسا اُردو کا دانشور نہیں ہے جو اُردو سے متعلق کسی بھی موضوع پر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ سے بہتر انداز میں تقریری یا تحریری طور پر برتری رکھتا ہو - چنانچہ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ ایک غیر مسلم کی اس فوقیت کو یہ اُردو کے مسلمان نام نہاد دانشور تسلیم کر لیں۔

چنانچہ افسانہ سیمینار / ورکشاپ جو ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے زیرِ اہتمام دہلی اُردو اکادمی کی طرف سے غالب اکاڈمی میں پانچ دنوں تک جاری رہا اس کی مثال آج تک دنیائے اُردو میں کہیں نہیں ملتی -

مگر اُردو کے جنازہ بردوش یہ حضرات محض حسد اور کم ظرفی کی وجہ سے آئے دن کسی نہ کسی بہانے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے خلاف کوئی نہ کوئی فتنہ اٹھائے رہتے ہیں - اور علی الاعلان اپنی کم عقلی نا اہلیت نیز جاہل پن کے ساتھ مذہبی تعصب کا ثبوت دیتے رہتے ہیں -

اترپردیش کے وزیرِ خوراک کی اُردو دشمنی

جناب واسدیو سنگھ وزیر خوراک اترپردیش کی اُردو دشمنی

کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی مگر اب وہ اُردو دشمنی کے ساتھ ساتھ اُردو کے پرستاروں کے خلاف بدزبانی پر بھی اُتر آئے ہیں - اترپردیش کے وزیرِ اعلیٰ کو چاہیئے کہ وہ اپنے وزیرِ خوراک کو سمجھائیں اور انھیں بے قابو نہ ہونے دیں اس میں کوئی شک نہیں کہ واسدیو سنگھ اپنے ساتھ کچھ ممبرِ اسمبلی کو رکھتے ہیں جن کی وجہ سے وزیرِ اعلیٰ کو شری واسدیو سنگھ کے خلاف کوئی عملی قدم اٹھانے کی جرأت نہیں ہو سکی مگر وہ یہ تو کر سکتے ہیں کہ شری واسدیو سنگھ کو یہ بتا دیں کہ اُن کی ان طفلانہ حرکتوں سے ساری وزارت بدنام ہوتی ہے - اور پھر کانگریس کی پالیسی نیز وزیرِ اعظم کے فرمودات کے بھی خلاف ہے -

علالت

کچھ دنوں سے آپ کا یہ نیازمند علیل ہے جس کی وجہ سے شانِ ہند وقت پر شائع نہیں ہو رہا - تاہم کوشاں ہوں کہ شانِ ہند وقت پر شائع ہو -

غزل

ڈاکٹر المحمود دیوان صاحب
دیوان (لندن)

ل جائے گر نظر کہیں خیرالانام سے
مطلب رہے نہ حور نہ جنت نہ جام سے
پینے کا شوق ہو تو بہت سے طریق ہیں،
چُلّو، لنڈا، پیالہ، سبُو اور جام سے
آنکھوں میں پیار، لب پہ ہنسی بات میں فریب
لُوٹا کسی نے خوب ہمیں اہتمام سے
شعر و سخن میں آپ نے پیدا کیا کمال
محفل میں داد کیوں نہ ملے خاص و عام سے
دیوانؔ، ہاں یہی تو ہیں تلمیذ آرزوؔ
محفل میں نام لیتے ہیں سب احترام سے

بلائے ناگہاں

مسز عبدالقادر

حیدر میرا بچپن کا دوست تھا۔ ہم دونوں ایک ہی محلہ میں رہتے تھے اور دونوں نے ایک ہی سکول میں تعلیم پائی تھی۔ سکول چھوڑنے کے بعد اس نے کشمہ کی تجارت اختیار کی اور اس تجارت کی وجہ سے اس کی بیشتر زندگی کافرستان میں گزری اب وہ ایک دولتمند شخص کی حیثیت سے آرام و آسائش کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ باوجود اس آسودہ حالی کے اس کی زندگی غیر مطمئن معلوم ہوتی تھی۔ ہر وقت کھویا کھویا سا رہتا۔ اسے کسی کام میں دلچسپی نہ تھی۔ سوسائٹی سے متنفر تھا۔ سوائے میرے کسی سے زیادہ میل جول نہ رکھتا تھا۔ میں نے کئی دفعہ ارادہ کیا کہ اس کی افسردگی کا راز معلوم کروں۔ مگر موقعہ نہ ملا۔ ایک دفعہ فصل کے موقعہ پر میرا اپنے حصہ داروں سے کچھ جھگڑا ہو گیا اور مجھے اپنے گاؤں جانا پڑا ——— وہاں جا کر میں زمینداری کی بندشوں میں ایسا گرفتار ہوا۔ کہ دو سال تک چھٹکارا نہ ہوا۔ اس عرصہ میں حیدر سے میری خط و کتابت جاری تھی۔ اس کے خطوں سے اکثر وحشت اور مایوسی کا جذبہ ٹپکتا تھا۔ دو سال بعد جب میں واپس آیا۔ تو میں نے سنا کہ حیدر بالکل گوشہ نشین ہو گیا ہے ——— دو تین دن تو گھر کے معمولی کام کاج میں صرف ہو گئے۔ تیسرے دن شام کے قریب میں اس کے گھر گیا۔ میرا لڑکا سلیم میرے ہمراہ تھا۔ حیدر کی حالت دیکھ کر مجھے دلی صدمہ ہوا۔ وہ بالکل ہڈیوں کا ڈھانچہ بن رہا تھا۔ اس کا رنگ مٹیالا اور جلد بدنما طور پر خشک ہو رہی تھی۔ اس کی اندر کو دھنسی ہوئی آنکھوں سے وحشت و ہراس کی علامات ظاہر تھیں۔ مجھے دیکھ کر ایک مردہ سی مسکراہٹ اس کے پژمردہ ہونٹوں پر کھیل گئی۔ میں اسے دیر تک حیرت سے تکتا رہا۔ میری حالت سے آگاہ ہو کر وہ مری ہوئی آواز سے کہنے لگا کیا دیکھ رہے ہو؟ میں خاموش رہا۔ وہ دوبارہ بولا۔ اوہ! تم نہیں جانتے میری زندگی کس عذاب میں ہے۔ میں نے اب تک اپنا راز تم سے پوشیدہ رکھا۔ مگر اب زیادہ دیر تک یہ بھید سینہ میں نہیں رہ سکتا۔ میں اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا ہوں:

(۲)

سلیم کمرے سے ملحقہ لائبریری میں رنگین پنسلوں سے تصویریں بنانے میں مصروف تھا۔ کمرے میں مکمل خاموشی تھی۔ حیدر کہنے لگا۔ سکول چھوڑنے کے بعد میری دوستی ایک ایسے شخص سے ہوئی۔ جو کافرستان میں کشمہ کی تجارت کرتا تھا۔ یہ شخص انتہائی نیک نفس اور دوست نواز تھا۔ وہ دنیا میں بالکل اکیلا تھا۔ اور تجارت کا کام انجام دینے میں اسے بہت دقت ہوتی تھی۔ اس لئے اسے ایسے آدمی کی تلاش تھی جو اس کے ماتحت کافرستان کے علاقہ میں دورہ کر کے کشمہ فراہم کرنے میں اس کی مدد کرے ——— ان دنوں میری عمر صرف اٹھارہ برس کی تھی۔ میں بالکل ناتجربہ کار تھا۔ تاہم اس نے مجھے دیانتدار اور محنتی پا کر تجارت میں حصہ دار بنا لیا۔ اور میں نے اپنا کام اس قدر شوق اور محنت سے کیا کہ سال کے اندر اندر ہماری تجارت چمک اٹھی ——— انہی ایام میں ایک دفعہ میں اپنے کوہستانی ملازم کے ہمراہ دورہ کرتا ہوا رستہ بھول کر ایک غیر آباد علاقہ میں جا پہنچا۔ گو یہ علاقہ نہایت سرسبز تھا۔ میوے سے لدے ہوئے درخت ہماری خوراک کے لئے بکثرت موجود تھے اور پیاس بجھانے کو چپہ چپہ پر حیات بخش چشمے جاری تھے لیکن رات کو سر چھپانے کے لئے جگہ ملنی دشوار تھی۔ تمام دن ہم جنگلوں میں بھٹکتے رہے۔ جیسے کہ شام قریب ہو گئی۔ شکست خوردہ آفتاب دن بھر کی خجالت سے زرد رو ہو کر لیلائے شب کی سیاہ فام زلفوں میں منہ چھپانے لگا۔ جنگلی پرندے شور و غل مچاتے ہوئے اپنے گھونسلوں کے ارد گرد طواف کرنے لگے۔ اور گھنے درختوں کی وجہ سے جنگل بے حد تاریک ہونے لگا۔ ہم اندھا دھند آگے بڑھتے گئے۔ یکایک جنگل ختم ہو گیا۔

ہم تاریک فضا سے باہر نکلے تو افق کے دلکش مناظر سے ہماری آنکھیں روشن ہو گئیں۔ ہم ایک شاداب و زرخیز میدان کے کنارے کھڑے تھے۔ کہیں دور سے روشنی دکھائی دے رہی تھی۔

ہم اس طرف بڑھے اور تھوڑی دیر میں ایک جھونپڑی کے دروازے پر جا کھڑے ہوئے ـــــ جھونپڑی میں ہلکی ہلکی روشنی ہو رہی تھی۔ روشندانوں سے دھوئیں کے مرغولے نکل رہے تھے اور بھنے ہوئے گوشت کی خوشگوار مہک اٹھ رہی تھی۔ میں نے ہچکچاتے ہوئے دستک دی۔ ایک خشک رو منحوس صورت شخص نے دروازہ کھولا۔ میں نے رات بسر کرنے کی درخواست کی۔ اس نے ہم دونوں کو سر سے پاؤں تک گھور کر دیکھا۔ پھر ایک خوفناک قہقہہ لگاتے ہوئے اندر آنے کا اشارہ کیا ـــــ اس خوفناک قہقہے سے میرا دل ہل گیا۔ طرح طرح کے وسوسے اٹھنے لگے۔ مگر تھکان سے مجبور ہو کر چپ چاپ اس کے پیچھے ہو لیا۔ جھونپڑی کی اندرونی حالت بہت ردی تھی۔ دیواریں دھوئیں سے سیاہ ہو رہی تھیں۔ ہر چیز پر سیاہی مائل گرد کی تہہ جمی ہوئی تھی اس نے ہمیں ایک شکستہ تخت پر بٹھایا۔ اور خود ہمارے کھانے کے بندوبست میں مصروف ہو گیا۔ تھوڑی دیر میں اس نے بھنا ہوا گوشت اور مکی کی روٹیاں لا کر ہمارے سامنے رکھ دیں کھانے سے فارغ ہو کر میرے ملازم نے میرا بستر اٹھا کر بچھا دیا مگر میرا دل سونے کو نہ چاہتا تھا۔ مجھے اس منحوس صورت آدمی کی آنکھوں میں شقاوت مسکراتی دکھائی دیتی تھی۔ اس بدگمانی کے زیر اثر میرے دل میں ایک نامعلوم خطرہ پیدا ہو چکا تھا میں اسی سوچ میں تھا کہ وہ قہوہ لے آیا نیند کو دور کرنے کے لئے میں نے خوب قہوہ پیا ـــــ تھوڑی دیر کے بعد مجھے سخت نیند کے جھونکے آنے لگے۔ میں نے چاہا کہ ملازم کو خبردار رہنے کی تاکید کر کے خود سو جاؤں مگر دیکھا تو وہ پہلے ہی گہری نیند کے مزے لے رہا تھا۔ میں نے اسے آوازیں دیں۔ جھنجھوڑا مگر بے سود مجھ پر نیند کا غلبہ زیادہ ہو رہا تھا۔ رفتہ رفتہ اردگرد کی چیزیں دھندلی نظر آنے لگیں۔ پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا ـــــ رات کو کیسے کیسے ڈراؤنے خواب دکھائی دئیے۔ میں نے دیکھا کہ چند دیوزاد آدمی مجھے کندھے پر اٹھائے ہوئے کہیں لئے جا رہے ہیں۔ یکایک میرے سر میں سخت ٹیس اٹھی۔ ایک عجیب کیفیت سے میرے پٹھے اینٹھنے لگے۔ دوران خون سر کی طرف زیادہ ہونے سے دماغ پھٹنے لگا۔ سخت تکلیف سے میری آنکھ کھل گئی۔ اُف! پناہ بخدا

میں نے ایک ایسا بھیانک منظر دیکھا کہ میرا خون خشک ہو گیا۔ بدن کے رونگٹے سوئیوں کی طرح کھڑے ہو گئے۔ اور دل ایک بڑے کلاک کی مانند ٹک ٹک کرنے لگا ـــــ آہ! میں ایک تیرہ و تار ڈراؤنی غار میں ایک لمبی سی چوبی میز پر چت پڑا ہوا تھا۔ میری مشکیں کسی ہوئی تھیں۔ اور سرہانے کی طرف ایک زبردست الاؤ جل رہا تھا۔ دہکتے ہوئے انگاروں کی سرخ لرزتی ہوئی روشنی میں دیواروں پر مہیب سائے ناچ رہے تھے۔ غار دوزخ کی بھٹی کی طرح لال اور گرم تھی۔ سخت گرمی سے میرا سر چکرا رہا تھا ـــــ میرے قریب ایک دیوزاد آدمی کھڑا تھا۔ جس کا بالوں سے بے نیاز سر ایک پشاوری تربوز کی طرح سڈول تھا۔ اس کا سرخ چہرہ جس پر جلادوں کی طرح بڑی بڑی سیاہ مونچھیں تھیں۔ انگاروں کی لال روشنی میں خون سے رنگا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ وہ ہاتھ میں ایک لمبا شکاری چاقو پکڑے کسی کو کچھ احکام دے رہا تھا۔ انتہائی دہشت سے میری زبان حلق میں دھنس گئی۔ اور سانس رک رک کر آنے لگی۔ اتنے میں [illegible] آواز سنائی دی۔ جسے سنتے ہی سرخ چہرہ جلاد نے اپنا [illegible] ہاتھ اٹھایا۔ اور چاقو سے میرے سر میں گھاؤ لگانے لگا۔ میں [illegible] خوف سے پہلے ہی نیم جان ہو رہا تھا۔ زخموں کی تکلیف سے بے ہوش ہو گیا۔

(۳)

مجھے ہوش آیا تو میں ایک صاف ستھرے کشادہ کمرے میں ایک آرام دہ بستر پر پڑا تھا۔ کمرے میں بالکل سکون تھا۔ ایک طرف [illegible] اور روشنی عطر کے قرابے لنڈھا رہی تھی۔ چاند کی حسین کرنیں کھڑکی سے داخل ہو کر فرش پر لوٹ رہی تھیں۔ [illegible] رفتہ رفتہ مجھے سب واقعات یاد آنے لگے۔ اور غار [illegible] آنکھوں کے سامنے پھرنے لگا۔ میں نے گھبرا کر ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ [illegible] میری چیخیں نکل گئیں [illegible] کیا۔ [illegible] زندگی سے مایوس کر دیا تھا

پھر آج آٹھ دن کے بعد تمہیں ہوش میں دیکھ کر بہت خوش ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ میری محنت ٹھکانے لگی۔ اب کچھ فکر نہیں تم بہت جلد اچھے ہو جاؤ گے ــــــ دلجوئی کے الفاظ سن کر میں نے ممنون نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا وہ ایک چالیس سالہ وجیہ اور شکیل آدمی تھا۔ اس نیک دل انسان کی بڑی ہمدردی اور انتھک خدمت گزاری سے میری صحت بہت جلد عود کرنے لگی۔ اور میں بتدریج صحت یاب ہو گیا دوران علالت میں مجھے معلوم ہوا کہ میرے محسن کا نام جواں بخت ہے اور وہ ایک قبیلے کا سردار ہے۔ میرے استفسار پر جواں بخت نے مجھے ایک عجیب و غریب داستان سنائی۔ اس نے کہا "اس علاقہ میں کئی ایک ایسی وادیاں ہیں۔ جو ہنوز دنیا کی نظروں سے پوشیدہ ہیں۔ ہر ایک وادی کا راستہ اتنا خفیہ اور پر اسرار ہے کہ کوئی اجنبی ان میں داخل نہیں ہو سکتا۔ اور ہر ایک وادی میں جدا جدا قبیلے آباد آباد ہیں۔ چنانچہ یہ وادی بھی جس میں میرا قبیلہ آباد ہے اسی طرح کی ایک پوشیدہ وادی ہے۔ اور یہاں سے ایک دن کی مسافت پر ایک اور ایسی ہی پوشیدہ وادی ہے جس میں ایک رہزنوں کا قبیلہ آباد ہے۔ ان کی سردار ایک عورت ہے جس نے جوانی کا جوہر ایجاد کیا ہے اٹھارہ سے پچیس سال تک کی عمر کے نوجوانوں کے سر سے وہ اس جوہر کو کیمیاوی طریقے سے حاصل کرتی ہے۔ اور اس جوہر کے اثر سے باوجود سن رسیدہ ہونے کے ابھی تک جوان اور نوخیز نظر آتی ہے۔ اس جوہر کو حاصل کرنے کے لئے اس نے اپنے ملازم مختلف علاقوں میں اس غرض کے لئے چھوڑ رکھے ہیں کہ وہ کسی طرح نوجوانوں کو اس کے لئے فراہم کریں ــــ ان اسیر نوجوانوں کو اس کے ملازم منشیات سے بے ہوش کر کے خفیہ غاروں میں لے جاتے ہیں۔ جہاں وہ عورت ان کے سروں سے جوہر کشید کرتی ہے۔" میں نے پوچھا "آپ کو یہ باتیں کیسے معلوم ہوئیں؟" اس نے کہا "ابتدا میں مجھے بھی ایک دفعہ اس کے آدمی پکڑ کر لے گئے تھے۔ لیکن میرے قبیلے والے غار کا کسی طرح کھوج لگا کر اور اس پر شبخون مار کر مجھے عین اس وقت چھڑا لائے جب کہ ایک سرخ چہرہ جلاد میرے سر کو زخمی کر رہا تھا" جواں بخت نے کلاہ اتار کر اپنا سر مجھے دکھایا جس پر جا بجا بڑے بڑے سفید داغ تھے۔ "اس کے بعد میں نے اب اس علاقہ میں اپنے جاسوس چھوڑ رکھے ہیں جب کوئی نوجوان ان کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ تو مجھے اطلاع مل جاتی ہے اور چھاپہ مار کر ان نوجوانوں کو بچا لیتا ہوں۔ مگر وہ عورت احتیاطاً غاریں بدلتی رہتی ہے۔ مگر میں ہمیشہ کھوج لگانے میں کامیاب ہو جاتا ہوں۔ چنانچہ جس دن رہزن تمہیں اس ڈائن کے پاس لے جا رہے تھے مجھے جاسوسوں نے مطلع کیا۔ جس پر میں نے کئی ایک غاروں میں تمہیں تلاش کیا۔ اور آخر کار ایک غار پر حملہ کر کے تمہیں نجات دلوائی۔ میں کئی دفعہ اس عورت پر حملہ کر چکا ہوں مگر وہ ہر دفعہ میرے ہاتھ سے بچ کر صاف نکل جاتی ہے۔ کاش مجھے اس کی وادی کا راستہ معلوم ہو جائے۔ اور میں ہمیشہ کے لئے دنیا کو اس ڈائن کے وجود سے پاک کر دوں۔"

(۴)

میں تقریباً چھ ماہ جواں بخت کی وادی میں مقیم رہا۔ کئی دفعہ واپسی کا ارادہ کیا مگر اس کی بے لوث محبت میرے لئے زنجیر پا ہو گئی۔ چھ ماہ بعد میں نے دل کڑا کر کے اس سے اجازت طلب کی۔ وہ کچھ سوچ کر بے دلی سے کہنے لگا۔ "تم شوق سے جا سکتے ہو۔ مگر تمہیں یہاں سے آنکھوں پر پٹی باندھ کر جانا ہو گا۔" میں نے گھبرا کر کہا "یہ کیوں؟" وہ لجاجت سے بولا "عزیز من تمہیں پہلے بتا چکا ہوں۔ کہ یہ ایک پوشیدہ وادی ہے۔ اس لئے سوائے اپنے قبیلے کے کسی اور کو خفیہ راستوں کا راز بتانا ہمارے اصول کے خلاف ہے۔ اس اصول میں بے قاعدگی کی وجہ سے نقصان کا سخت خطرہ ہے۔ کیونکہ اگر ایک قبیلے کو دوسرے قبیلے کی وادی کا راستہ معلوم ہو جائے تو وہ شب خون مار کر وادی میں گھس آتے ہیں اور قبیلے کو تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔ گو مجھے تم پر کوئی بدگمانی نہیں مگر اپنے قبیلے کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا۔ ان کے قائم کردہ اصول کی خلاف ورزی میری طاقت سے باہر ہے۔" میں نے افسردگی سے کہا۔ "تو پھر میں یہاں کبھی نہ آ سکوں گا" "میرے خیال میں کبھی نہیں" اس نے کہا۔ میں نے کہا "لیکن آپ کی ملاقات" وہ میری بات کاٹ کر بولا۔ "یہ بھی تقریباً ناممکن ہے۔" اس ناگوار گفتگو نے مجھے مایوس کر دیا۔ مجھے اس سے دلی الفت تھی اس لئے اس کے فیصلے سے میرے دل پر گہری چوٹ لگی۔ اور میرے آنسو جاری ہو گئے وہ رویا تو نہیں مگر اس کے چہرے کا اڑتا ہوا رنگ اس کے اضطراب کا شاہد تھا وہ گاؤ تکیے پر کہنیاں ٹیکے کچھ سوچ رہا تھا اس کے شگفتہ چہرے پر سادگی کی تجلیاں نمایاں تھیں۔ کاش [illegible]

کہا جب اس نے سر اٹھایا اور اپنی بکھری ہوئی مونچھوں پر ہاتھ پھیر کے
میری طرف دیکھا۔ وہ مجھ سے کہنے لگا۔ ہاں ایک صورت ہو سکتی ہے۔
اگر تم میرے سامنے جھیل کے پر قسم اٹھا کر میری برادری میں شامل ہو جاؤ۔ تو
میرے قبیلے کو اطمینان ہو جائے گا۔ میں نے اس تجویز کو فوراً منظور کر لیا۔
دوسرے دن جواں بخت نے اپنے تمام قبیلے کی دعوت کی۔ اور سب کے
سامنے ایک نیم عریاں کاہن نے جواں بخت کی چھنگلیا سے چند قطرے
خون نکال کر ایک طشتری میں ٹپکائے۔ پھر اپنی خاص زبان میں
اس خون پر مجھ سے قسم لی گئی۔ جس کا مفہوم یہ تھا کہ اگر میری وجہ سے
جواں بخت کو کسی قسم کی تکلیف پہنچی تو دیوتا مجھے بھی وہی سزا دیں۔
اس کے بعد نیم عریاں کاہن کی ہدایت کے بموجب میں نے اس مقدس خون
کو چکھا۔ اور اس رسم کے اختتام پر جواں بخت نے مجھے گلے سے
لگا لیا۔ اس کے بعد قبیلے کے سب لوگ یکے بعد دیگرے میرے گلے ملے
اور خوشیاں مناتے ہوئے رخصت ہو گئے۔ اگلے دن مجھے وادی
کا راز بتا دیا گیا۔ اور جاتی دفعہ جواں بخت نے تاکید کی کہ جب
تک میری عمر ۲۵ برس سے تجاوز نہ کر جائے۔ اس علاقہ میں اکیلا یا
کسی اجنبی کے ہمراہ سفر نہ کروں۔ جواں بخت کے خاص آدمی مجھے
اس جگہ پہنچا گئے۔ جہاں میرے حصہ دار کا بیٹا گواہ منتظر تھا۔
یہ خطہ جواں بخت کی وادی سے دو سو میل کے فاصلے پر تھا۔
میرا حصہ دار جو میری زندگی سے مایوس ہو چکا تھا۔ مجھے زندہ
سلامت پا کر بہت خوش ہوا — جواں بخت کی دوستی سے
میری تجارت کو بہت فائدہ پہنچا۔ کیونکہ جواں بخت کی وادی
میں کٹھ بہت کثرت سے پائی جاتی تھی۔ اس کے آدمی
ہمیشہ کٹھ پہنچاتے رہتے۔ اپنی آدمیوں کے ساتھ میں بھی
ہر دوسرے تیسرے مہینے جواں بخت سے ملنے جایا کرتا۔ اسی
طرح کئی سال گزر گئے۔ میری عمر ۲۵ برس سے تجاوز کر گئی۔ اب
میں بغیر محافظوں کے بے کھٹکے اس علاقہ میں سفر کرنے لگا۔ ایک
دفعہ میں جواں بخت کو ملنے جا رہا تھا راستے میں ایک چھوٹی
سی کوہستانی سرائے میں میری ایک خوش پوش مسافر سے
ملاقات ہوئی یہ شخص بڑا باتونی تھا۔ باتوں ہی باتوں
میں اس نے ذکر کیا کہ فلاں راستے سے آتے ہوئے کئی دفعہ
اس ندی کے کنارے جو نشیبی گھاٹی کے عمق میں بہتی ہے اس نے

پریوں کو گاتے دیکھا ہے۔ اس وقت تو میں نے اسے
جھٹلا دیا۔ مگر دوسرے دن سفر کرتے ہوئے راستے میں
مجھے اس ندی کا خیال آیا۔ جو یہاں سے زیادہ دور نہ تھی۔
میں نے گھوڑا اس راستے پر ڈال دیا۔ ندی کے کنارے پہنچا
تو کہیں دور پار سے ہلکی ہلکی دلکش آواز جو نسیم بہار کی نرم
رو لہروں پر مستی بکھیر رہی تھی سن کر میرے دل میں گدگدی
پیدا ہونے لگی۔ میں نے گھوڑا آگے بڑھا دیا۔ برساتی ندی
میں پانی بہت کم تھا۔ میں با آسانی اسے عبور کر کے پار کے
گھنے جنگل میں داخل ہو گیا۔ اب گیت کہیں قریب ہی سنائی دیتے
تھے — یہ نشاط انگیز راگنی مجھے اپنی طرف اس طرح کھینچ رہی
تھی۔ جس طرح مقناطیس لوہے کو کھینچتا ہے آگے بڑھ کر معلوم
ہوا کہ جنگل کو وسط سے کاٹ کر چھوٹا سا میدان بنا دیا گیا ہے
اور اس میدان میں ایک خوشنما جھونپڑی ہے جس کے ارد گرد خوش
رنگ پہاڑیوں کی لتا طرح بچھی ہوئی ہے قریب گیا تو فرط حیرت سے
میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں — سوسن کے پھولوں میں ایک
پری جمال حسینہ ایک پہاڑی ساز پر دلکش لے میں گیت گا
رہی تھی اور چند کوہستانی لڑکیاں پاؤں میں گھنگرو باندھے
اس کے سامنے ناچ رہی تھیں۔ اس حسینہ کو دیکھ کر میں
پھڑک گیا۔ اس کی بڑی بڑی خوشنما صدفی آنکھوں سے
ایک ایسا کیف کا سیلاب امڈ رہا تھا۔ جس کی تیز رو میں میرے
ہوش و حواس تک بہہ گئے — مجھے دیکھ کر انھوں نے راگ
رنگ ختم کر دیا۔ حسینہ نے مجھے بلا کر بڑے اخلاق سے اپنے
قریب بٹھایا اور ٹوٹی پھوٹی پشتو میں باتیں کرنے لگیں جب
میرے حواس قدرے درست ہوئے تو میں نے اس حسینہ سے
نام وغیرہ دریافت کیا وہ کہنے لگی میرا نام مہرلقا ہے۔ میں
ایک کوہستانی رئیس کی لڑکی ہوں۔ والدین کے انتقال پر میرا
دل ٹوٹ چکا ہے۔ یہ جگہ کبھی میرے باپ کی شکار گاہ تھی۔
یہاں اپنی کنیزوں کے ساتھ زندگی کے دن پورے کر رہی ہوں۔
میں نے تمام دن اس حسینہ کی صحبت میں گزارا۔ خوشی کے
لمحے چٹکیوں میں گزر جاتے ہیں سورج دن کی ڈھلتی چھاؤں وقت
کا نت رخصت دینے لگی۔ مہرلقا سے رخصت ہو کر جواں بخت

بکی طرح اس کی طرف ہو لیا۔ میں ابھی تک محبت کی چاشنی سے نا آشنا
تھا۔ آج پہلی بار میں نے محسوس کیا کہ میں اپنا دل اس لڑکی کو دے
چکا ہوں۔ جوان بخت کی ملاقات کے بعد میں اپنے ڈیرے پر واپس
آیا۔ تو مہ لقا کی جدائی دن بدن مجھے شاق گزرنے لگی۔ بہت
کوشش کی کہ اس کو بھول جاؤں۔ مگر دل نہ مانا اور آخر کار اپنے
کاروبار سے بد دل ہو کر زیادہ تر جوان بخت کے پاس رہنے لگا
جوان بخت میری اس تبدیلی پر متعجب تھا۔ لیکن میں نے بڑی
خوش اسلوبی سے اپنے عشق کا راز اس سے چھپائے رکھا۔
مہ لقا کی جھونپڑی جوان بخت کی وادی سے کچھ زیادہ دور نہ تھی
اس لئے اکثر اس سے ملاقات ہوتی رہتی تھی وہ اکثر جائے رہائش
دریافت کیا کرتی۔ مگر میں نے کبھی اس سے جوان بخت کا ذکر نہ کیا۔
اسے ہمیشہ اپنے ڈیرے کا پتہ دیتا۔ جو میرے کاروبار کا مرکز تھا
یہ سن کر وہ بدگمانی سے منہ پھیر لیا کرتی۔ کیونکہ وہ ڈیرا یہاں سے
تقریباً دو سو میل کے فاصلے پر تھا ـــ ایک دن جبکہ میں اسے
اپنی محبت کا یقین دلا رہا تھا۔ وہ بے اعتباری سے کہنے لگی۔
"تمہاری محبت کا میں کیسے یقین کر سکتی ہوں جب کہ تم اپنی جائے
رہائش تک مجھ سے چھپا رہے ہو" ندامت سے بے ساختہ یہ
کلمے میرے منہ سے نکل گیا "دوسرے کا راز میں نہیں
بتا سکتا" میرے اس جواب پر وہ اپنی حسین آنکھوں میں آنسو بھر
کر بولی کہ آپ مجھے اتنا ذلیل سمجھتے ہیں۔ کیا میری ذات سے
کسی کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہے ـــ درحقیقت آنسو عورت کا
زبردست ہتھیار ہے۔ جسے دیکھ کر مضبوط سے مضبوط ارادے کا
مرد بھی زیر ہو جاتا ہے ـ آہ ـ میں بھی ان صدفات کو ہموار ـــ
دیکھ کر بیتاب ہو گیا اور ان خوشنما آنسوؤں نے مجھے مغلوب کر لیا
افسوس میں نے اپنا مقدس عہد توڑ کر اسے وادی کا راز بتا دیا۔

(۵)

رات کسی ناشبہ گنہگار کے دل کی طرح تاریک تھی جس کی
نحوست سے کائنات دھواں دھار ہو رہی تھی۔ قسمت کا تارا ہی کا
سنہا اندر افق کی تاریک گہرائیوں میں کھو چکا تھا تارے سیاہ
بادلوں میں گم ہو چکے تھے ـ تمام دنیا ایک سنہ دیو کی مٹھی میں
بند معلوم ہوتی تھی جوان بخت اپنے کمرے میں گہری نیند سو رہا تھا

مگر میری آنکھوں میں نیند مفقود تھی ایک نامعلوم خطرہ مجھے
قریب تر معلوم ہو رہا تھا۔ کسی مبہم خوف سے میرا دل دھڑک
رہا تھا۔ میں جسمانی اذیت محسوس کرتے ہوئے اپنے کمرے میں
بے چینی سے چکر لگا رہا تھا ـــ آدھی رات کے قریب ایک
گرجدار آواز سے تمام وادی گونج اٹھی۔ اس مہیب آواز
سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ آہ یہ اس مہیب نقارے
کی آواز تھی جس پر خطرے کے وقت چوٹ پڑتی تھی ـــ
خطرے کے الارم پر تمام قبیلہ بیدار ہو گیا۔ جوان بخت کے گھر
میں کھلبلی مچ گئی۔ اس نے نہایت عجلت سے ہتھیار لگائے
اور مقابلے کے لئے تیار ہو گیا ـــ یکدم رہزنوں کا ایک بہت بڑا
گروہ جوان بخت کے محل پر ٹوٹ پڑا۔ وہ کمال بہادری اور
جوانمردی سے لڑا مگر رہزنوں کے ٹڈی دل کے سامنے اس کی پیش
نہ گئی۔ وہ مجروح ہو کر گر پڑا۔ رہزنوں نے اس کے ساتھ ہم سب
کی مشکیں کس لیں۔ اور ہمیں برق رفتار گھوڑوں پر لاد کر وادی سے
نکال لے گئے۔ ابھی وادی سے نکلے ہی تھے کہ جوان بخت کا باقی
قبیلہ تعاقب کرتا ہوا آ پہنچا۔ چند میل کے فاصلے پر دونوں لشکر
آپس میں گتھم گتھا ہو گئے۔ ادھر میدان کارزار گرم ہو رہا تھا۔
ادھر ہم قیدیوں کو ایک غار میں پہنچا دیا گیا۔ غار میں الاؤ جل رہا
تھا اور ایک بپھرے ہوئے شیر کے پنجرے کے قریب ایک
عورت کھڑی تھی۔ اس عورت کو دیکھ کر میں حیرت و استعجاب
سے اچھل پڑا۔ آہ وہ مہ لقا تھی ـ وہ غصے سے دانت پیس
رہی تھی۔ حالت غیظ میں اس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل
رہی تھیں۔ ایک کونے میں وہی خوش پوش مسافر کھڑا تھا۔
جو کبھی مجھے سرائے میں مل چکا تھا۔ جس نے مہ لقا کا اشارہ پا کر
جوان بخت کی مشکیں کھول لیں اور اسے خوفناک شیر کے پنجرے
میں ڈال دیا مہیب شیر نے آناً فاناً جوان بخت کو اپنے مضبوط
دانتوں میں دبوچ کر ہلاک کر دیا ـــ عین اسی وقت رہزنوں کے
لشکر میں بھگدڑ پڑ گئی اور حملہ آور مار دھاڑ کرتے ہوئے غار کے
قریب پہنچ گئے۔ خطرے کو بھانپ کر مہ لقا فوراً غار سے باہر نکلی
اور اپنی جماعت سمیت جنگل میں غائب ہو گئی۔ حملہ آور جب غار
میں داخل ہوئے تو انہیں جوان بخت کا حسرتناک انجام دیکھ کر

ازدہ صدمہ ہوا۔ اس کی لاش واپس وادی میں لائی گئی۔ جہاں نہایت احترام سے اسے سپرد خاک کیا گیا۔ چالیس دن تک اس کا قبیلہ سوگوار رہا۔ آخر چالیسویں کی رسوم پر جبکہ تمام قبیلہ جمع تھا نیم عریاں کاہن نے کہا۔ بھائیو میں یہ نہیں جاننا چاہتا کہ تم میں سے غدار کون ہے۔ لیکن تمہیں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ غدار سزا سے کبھی نہیں بچ سکتا۔ تم لوگ مقدس خون پر جوان بخت سے وفاداری کی قسم اٹھا چکے ہو۔ اور یہ کوئی معمولی چیز نہیں۔ جوان بخت کی عمر اس وقت پچاس سال کے قریب تھی اس لئے پچاس سال کی عمر میں غدار پر اس مقدس قسم کی لعنت پڑے گی اور وہ شیر کے ہاتھوں ہلاک ہوگا۔ نیم عریاں کاہن کے اس اعلان سے سب کے دل دہل گئے — کاہن کے ان الفاظ کا مجھ پر خاص اثر ہوا۔ مگر حوصلہ کر کے دل کو برقرار رکھا اور دوسرے دن اپنے ڈیرے کی طرف واپس ہوا۔ میں مجرم تھا۔ میرا سکون قلب رخصت ہو چکا تھا۔ اب تجارت میں بھی میرا دل نہ لگا میں تجارت چھوڑ کر اپنے دیس چلا آیا۔ چونکہ جوان بخت کی بدولت میں نے بے شمار دولت کمائی تھی میں امیرانہ زندگی بسر کرتا رہا لیکن میرا دل کبھی مطمئن نہ ہو سکا۔ اس نیم عریاں کاہن کے الفاظ ہمیشہ میرے کانوں میں گونجتے رہے۔ اب جس دن سے میرا پچاسواں سال شروع ہوا ہے۔ خوف سے مجھے زندگی وبال ہو گئی ہے رات کو شیروں کے دھاڑنے کی آوازیں آتی رہتی ہیں۔ شیروں کے خوفناک سائے دیواروں پر متحرک دکھائی دیتے ہیں۔ اکثر ملک الموت کے سرد پاؤں کی چاپ محسوس کرتا ہوں۔ روحیں میرے اردگرد منڈلاتی رہتی ہیں۔ جوان بخت کی کفن پوش لاش مجھے اشارے سے بلاتی ہے۔ اور اسی خوف سے گوشہ نشین ہو رہا ہوں —

حیدر کی داستان سن کر میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا کہ تمہیں وہم ہو گیا ہے۔ ورنہ ایسی قسمیں کچھ حیثیت نہیں رکھتیں اور نہ ہی تم نے جان بوجھ کر غداری کی۔ ایسی فضول قسموں کا خیال نہ کرو۔ بھلا اس شہر میں شیر کہاں سے آئے گا۔ میں بہت دیر تک اسے سمجھاتا رہا۔ بارہ بجے کے قریب میں اٹھا۔ میرا خیال تھا کہ سلیم ابھی تک سو رہا ہوگا۔ میں لائبریری کی طرف گیا۔ تو وہ کرسی پر بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگا۔ ابا میں نے چچا کی تمام باتیں سنی ہیں وہ بہت ڈرپوک ہے۔ میں نے اسے آہستہ سے ڈانٹتے ہوئے کہا سلیم ایسا نہیں کہا کرتے۔ وہ شوخی سے بولا۔ وہ درحقیقت بہت ڈرپوک ہے۔ دیکھو میں نے اسے ڈرانے کے لئے دیوار پر کیا بنایا ہے — میں نے دیوار کی طرف دیکھا سلیم نے اس پر اپنی رنگین پنسل سے ایک بہت بڑے شیر کی تصویر بنائی تھی۔ تصویر کو دیکھ کر میں بے اختیار ہنس دیا۔ اور اسے ساتھ لے کر باہر نکل آیا۔

(۶)

چونکہ رات کو میں دیر سے سویا تھا۔ اس لئے صبح دیر سے آنکھ کھلی تھی۔ ابھی میں بستر میں ہی تھا کہ حیدر کی موت کی خبر پہنچی۔ اسے رات کو کسی درندے نے ہلاک کر دیا تھا۔ میں اس وقت حیدر کے مکان پر پہنچا۔ وہاں پولیس جمع تھی۔ حیدر کی لاش بستر پر نہایت ابتر حالت میں پڑی تھی۔ اس کی شاہرگ کے قریب ایک بہت بڑا گہرا زخم تھا۔ اور کسی درندے کے خون آلود پنجے بستر کی سفید چادر پر صاف نمایاں تھے — میں سراسیمگی سے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا لائبریری میں جا نکلا۔ اچانک مجھے سلیم کی بنائی ہوئی تصویر کا خیال آیا۔ مگر دیوار کی طرف دیکھ کر میرے اوسان خطا ہو گئے — سلیم کی بنائی ہوئی شیر کی تصویر دیوار سے غائب تھی۔

پنڈت رتن پنڈوروی کی مایۂ ناز تصنیف

ہندی کے مسلمان شعراء

قیمت -/51 روپے

اب ختم ہو رہی ہے۔ چند کاپیاں باقی ہیں۔

آل انڈیا مشاعرہ دیوبند

تحسین صدیقی　[illegible]

دیوبند (سہارنپور) میں میلہ کی دیگر تقریبات کے سلسلے میں ہر سال ایک آل انڈیا مشاعرہ بھی منعقد ہوتا ہے۔

دیوبند شہرِ علم ہے یہاں کے علماء، فضلاء، شعراء و ادباء جہانِ علم و ادب و حکمت میں ایک مقام رکھتے ہیں۔

دیوبند میں دارالعلوم دنیائے اسلام کا ایک تابندہ اور درخشاں ستارا ہے۔ دارالعلوم میں بھی طلباء کی کئی ادبی انجمنیں ہیں آج اسی گہوارۂ شعر و سخن، شہرِ ادب اور مرکزِ علم و حکمت میں یہ مشاعرہ منعقد ہو رہا ہے۔ آج ۱۱ اپریل ۱۹۸۵ء کی شب ہے۔ لاہوا چاہتے ہیں جناب حبیب صدیقی مینیجر مسلم فنڈ صدارت کے لئے جناب محترم بی کے گوسوامی صاحب کمشنر میرٹھ ڈویژن کا اسمِ گرامی پیش کر رہے ہیں۔ ٹھاکر ملکھان سنگھ جی تائید کر رہے ہیں۔ اور کمشنر صاحب تالیوں کی جھنکار میں مسندِ صدارت پر جلوہ افروز ہو گئے ہیں۔ اس مشاعرہ کے کنوینر نواز دیوبندی انور جلالپوری کو دعوتِ نظامت دے رہے ہیں لیجئے پھر تالیوں سے پنڈال گونج اٹھا ہے انور صاحب نے کمشنر صاحب سے چند کلمات فرمانے کی درخواست کی ہے۔ کمشنر صاحب نے اردو کے بارے میں نہایت ہی مؤثر انداز میں اس کی اہمیت پر زور دیا فرمایا:۔

"میں نے اردو زبان شروع کی تھی اسی وقت سے مجھے شوق تھا۔ آپ نے مجھے اس مشاعرہ میں یاد کیا میں آپ کا شکر گزار ہوں۔"

وہ دیکھئے انور جلالپوری دیوبند کے ایک نوعمر شاعر ماجد صدیقی کو یاد کر رہے ہیں۔ ماجد صاحب کسرِ نفسی کا مظاہرہ کر رہے ہیں میں تمہید باندھ رہا ہوں آنے والے مہمان کا کلام سننے کے لئے آیا ہوں پھر شاعر نے اپنا المیہ ہے ؎

یہ سچ ہے کوئی بھی منزل یہاں قریب نہیں
مگر تمہارے تعاقب میں ہم… نظر سے نہیں

ماجد صاحب نے سب سے پہلے تو المیہ کا نام لیا۔ حیرت ہے کہ ماجد صاحب اسی ملک میں شہرت کی طرف گامزن ہیں۔ ہر قسم کی مراعات میسر ہیں۔ پھر بھی منزل نہ پانے کی شکایات اور عزم جواں حاصل نہ ہونے کی بات کر رہے ہیں۔ منزل گھبرانے سے نہیں ملا کرتی عزم جواں سے کام لیجئے تو منزل خود قدم چومے گی۔ پھر اسی تنگ نظری کو ملاحظہ فرمائیے ؎

جس چمن کے مہکتے پھول ہیں ہم
اس چمن ہی میں کیوں فضول ہیں ہم

میں نے چیخ کر کہا سرحد پار کر جائیے اس پر میرے پاس بیٹھے ہوئے ٹھاکر ملکھان سنگھ بھی چونکے ٹھاکر صاحب اردو کے بڑے شیدائی اور مجاہدِ آزادی ہیں سنئے ؎

ہم خزاں کو بھی کہہ رہے ہیں بہار
اس لئے آپ کو قبول ہیں ہم

آئیے چھوڑیئے اس مغلوب ذہنیت کو اور سلیم گنگوہی کو سنئے ؎

خود کو جو جھکتے نہیں جاؤ دیکھا ہیں کہتے ہوتے
میں تو ڈرتا ہوں انہیں اپنی زباں کہتے ہوئے
عشق کی پرخار راہوں کو سمجھ کر فرشِ گل
میں نے طے کی ہے نئی داستاں کہتے ہوئے

سلیم صاحب کی طبیعت خراب ہے جو شعر سنانے کا ارادہ بھول گئے سنیئے ؎

وحشت ہیتا دل طاری ہے دلوں پر اس قدر
لوگ ڈرتے ہیں خزاں کو بھی خزاں کہتے ہوئے

اختر لوالیاری تالیوں کی جھنکار میں آ کر فرما رہے ہیں۔ ؎

اب یقیں یہ کہ گھر سے ہمیں نکلنا ہے
خود اپنی راہ بنانا ہے اور چلنا ہے
دیارِ شب میں اجالے بکھیرنے کے لئے
تمام عمر چراغوں کی طرح جلنا ہے

آہ اور واہ کا شور کم ہوا تو ارشاد ہوا ہے ؎

گنگناتی ہوئی پھر کوئی صدا آئے گی
کھول دو بند دریچوں کو ہوا آئے گی
آسمانوں کی طرح خود کو سمجھنے والو
ہوش اڑ جائیں گے جس وقت قضا آئے گی
راہ پُرخار میں جب کوئی بھی ہمراہ نہ ہو
ساتھ دینے کے لئے ماں کی دعا آئے گی

اختر صاحب پنڈال میں گرمی پیدا کر کے کامران پلٹ رہے ہیں دیکھا تو پدم خواند لیسہ تمام گندگی واضح تصویر۔ ملک زادہ جاوید آکر فرما رہے ہیں ؎

آگے بڑھنا ہو تو حوصلہ چاہیے
پیچھے مڑ کر نہیں دیکھنا چاہیے
ڈگریوں سے کہاں ملتی ہے نوکری
جس جگہ جائیے تجربہ چاہیے
گھر سے نکلو تو باہر صدا کے لئے
روز اخبار کو حادثہ چاہیے

واہ شباب پر ہے اور آپ اسی پُروقار انداز سے گرج رہے ہیں ؎

تم کو دولت سے محبت نہیں ملنے والی
زور تلوار سے طاقت نہیں ملنے والی
[illegible] سب سے الگ ہی رکھو
قتل ہونے سے شہادت نہیں ملنے والی

پہلی بار پنڈال میں ایک دھماکہ ہوا ہے۔ ارشاد ہوا ہے ؎

بے رخی اپنے بزرگوں کا رویہ ہے یہاں
ہم کو اس شہر میں عزت نہیں ملنے والی

دیوبند علم و حکمت کا مرکز ہے جاوید صاحب کی خوب خوب پذیرائی ہو رہی ہے شاعر کو اور کیا چاہیے لہٰذا آپ بھی جمے ہوئے ہیں فرما رہے ہیں ؎

نہ گھر نصیب ہو کوئی نہ سائبان رہے
یہی بہت ہے مرے سر پر آسمان رہے
مری غزل کے شوالے میں [illegible] بھی ہو
ترے [illegible] کی مسجد میں بھی اذان رہے

پھر دادِ بے ہنگامہ کا روپ دھار لیا ہے کئی بار دہرا کر جاوید صاحب اپنی جگہ آ رہے ہیں اور اس عالم میں گلابی ساری زیب تن کئے ترنم کا پودی آکر یوں ترنم سے رنگِ محفل بدلنے چلی ہیں ؎

ظرف ایک سودائی قہر کا سبب ٹھہرا
فرد نے خطا کی تھی قوم نے سزا پائی

شعلہ سی لپکتی آواز ——— گلابی ساری میں مجسم غزل ——— غزل میر اُدھر اہلِ ذوق اور اللہ والے بس کچھ نہ پوچھئے پنڈال میں کیا سماں بندھا ہے۔ خدا نظرِ بد سے بچائے۔ پھر پنڈال گونج رہا ہیں ؎

مظلوموں کے دل کا ہر نالہ تاثیر میں ڈوبا ہوتا ہے
ظالم کو خبر کردے کوئی انجامِ ستم کیا ہوتا ہے
[illegible] کے صدقے جن نے یہ سبق دنیا کو دیا
جو تیغ کے سائے میں ہوا وا سجدہ وہی سجدہ ہوتا ہے

یہ شہر حریت ہے مجاہد کہے جاتا ہے [illegible] اس شہر کے مجاہدوں نے جنابِ آزادی کے لئے جہاد کیا ہے۔ یہ شور [illegible] کم ہوا تو بہا رہی ہیں ؎

گلشن میں نشیمن کو میرے یہ کہہ کے جلایا مالی نے
جب کوئی نشیمن جلتا ہے گلشن میں اجالا ہوتا ہے

لیجئے یار لوگ تالیوں پر اتر آئے ہیں ایک اور ایک اور کا ہنگامہ ہے ؎

وہ دن بھی آجائے گا۔ لوٹنے والوں کو لوٹا جائے گا

کیا اشتراکی مطلع ہے ——— ہلال سیوہاروی ——— اس پر ایک قہقہہ بلند ہوا ہے اور آپ یوں پنڈال کو لوٹنے چلی ہیں ؎

آؤ طوفاں سے ٹکرا کے چلیں ——— بعد میں جو ہوگا دیکھا جائیگا

اور آپ محفل کا رنگ بدل کر تالیوں کی گڑگڑاہٹ مائیک سے جُدا ہو رہی ہیں دیکھا تو ٹھن بھارتی گرج رہے ہیں ؎

گوتم کے مہاویر کے گاندھی کے وطن میں
دعویٰ ہے کہ نفرت کا خدا پاش رہے ہیں
سچائی مگر یہ ہے اہنسا کے پجاری
وحشی کی طرح سب کا گلا کاٹ رہے ہیں

واہ اس قطعہ کا حق ہے لہٰذا داد تالیوں سے دی جا رہی ہے کہ

آپ نے ایک طویل نظم سنائی۔ آپ کے بعد صادق صابری نے ایک کامیاب اور طنزیہ نظم پیش کی اور پاپولر میرٹھی محفل کو قہقہہ زار بنا کر چلتے بنے۔ انور جلالپوری پنڈال کا رنگ یوں بدلنے چلے ہیں ؎

سکوں نصیب نہ ہوگا فضا کہیں کی بھی ہو
گھٹن ضرور ملے گی ہوا کہیں کی بھی ہو
وہ گیسوؤں سے اُٹھے یا سمندروں سے اُٹھے
برسنا اس کی ہے قسمت گھٹا کہیں کی بھی ہو
ہمارے زخم کریدے گی اور کیا دے گی
چمن کی دشت کی ، بادِ صبا کہیں کی بھی ہو
لہو کے رنگ سے رشتہ نہ توڑ پائے گی
ہتھیلیوں میں کسی کے حنا کہیں کی بھی ہو

انور صاحب تو ہر حال میں لے ہی لیتے ہیں داد و تحسین وصول کر کے ہمسر قادری کو دعوتِ سخن دے رہے ہیں۔ ہمسر صاحب فرماتے ہیں ؎

مجھ پر جو کوئی چشمِ عنایات نہیں ہے
شاید مری تقدیر مرے ساتھ نہیں ہے

میں نے نقادِ اعظم عرشی کاظمی سے دریافت کیا یہ چشمِ عنایات کوئی سے منسلک رہا ہے کہ نہیں نہ جانے کیوں اُنھوں نے اِس مرحلہ پر چشم پوشی کی ارشاد ہوا ہے ؎

مشکل ہے حقیقت پر کوئی تبصرہ کرنا
افسانہ بنانا کوئی مشکل بات نہیں ہے
تو پرسشِ حالات سے پہلے یہ بتا دے
کیا میری تباہی میں ترا ہاتھ نہیں ہے

میں نے عرشی صاحب کو حضرت احسان دانش مرحوم کا ایک شعر سنایا ؎

کس کس کی زباں رُو کے جاؤں تری خاطر
کس کس کی تباہی میں ترا ہاتھ نہیں ہے

دیکھا تو اب عالم مظفرنگری غزل الاپ رہے ہیں ؎

واعظ کو بھی شرمندۂ احسان کیا ہے
اک بُت نے ہمیں آج مسلمان کیا ہے

پھر عرشی صاحب شرمندۂ احسان پر صرف مسکرا دیئے اور عالم صاحب یوں خوش گلوئی کا مظاہرہ کر رہے ہیں ؎

پھر وعدۂ وفا کر کے کسی وعدہ شکن نے
پوچھو نہ ہمیں کتنا پشیمان کیا ہے

چھا گا رہے ہیں ـــــ ایک آواز ـــــ چھا گئے عالم ـــــ دوسری آواز ـــــ داد بھی شباب پر ہے لبیک رہے ہیں ؎

کیا سوچ کے ڈالا ہے مری لاش پہ آنچل
کمبخت نے احسان پہ احسان کیا ہے

عالم صاحب دوسری غزل بھی سنا کر خوب خوب داد وصول کئے اپنی جگہ آ رہے ہیں۔ اور اب فرحت احساس عنایت کر رہے ہیں ؎

ہمارے قتل پہ چپ کیوں ہے اے زمینِ وطن
تو کیسی ماں ہے جو بچوں کا سر کٹاتی ہے
جو حادثات پہ ڈر سے گھروں میں بیٹھے ہیں
انھیں بتاؤ کہ گھر میں بھی موت آتی ہے

اب داد کا عالم نہ پوچھئے اور آپ اُس سنجیدگی سے فرما رہے ہیں ؎

شہر میں امن کا دستہ جو ہوا ہے تشکیل
اُس میں شامل ہیں مرے گھر کے جلانے والے
آگ لگا دی جو سامان بچا تھا گھر میں
لوٹ کر لے گئے سب آگ بجھانے والے

لیجئے تالیوں نے پنڈال کا رنگ ہی بدل دیا ہے داد و تحسین پا کر مائک سے جدا ہو رہے ہیں اور علامہ انور صابری کے صاحبزادے اظہر صابری گرج رہے ہیں ؎

اس دور میں تم دولت کہاں ڈھونڈ رہے ہو
تپتے ہوئے صحرا میں اماں ڈھونڈ رہے ہو

مقامی سیاست اُبھر کر یہاں بار بار سامنے آئی پنڈال پھر سرمستی پر اُتر آیا ہے اور اظہر صاحب کھسک آئے ہیں یہ اچھا ہی ہوا ویسے آپ مشاعروں سے دور رہتے ہیں لیکن اصرار پر سنانے آ گئے تھے آئیے اب ساغر خیامی سے یہ قطعہ سنیئے ؎

مفلسی کے شکار ہوتے ہیں	ایک کمبل میں چار سوتے ہیں
کھینچ لے جائے پانچواں نہ کہیں	سب کے سب ہوشیار سوتے ہیں

یونہی قطعات رواں دواں سنا کر چلتے بنے آئیے دیوبند کے ایک ان پڑھ شاعر شمیم انصاری سے بھی کچھ سنیئے ؎

بڑھوے سے کہہ دیا تھا کہ مجھ کو خوشی ہوئی

بس پھر رہی ہے گردشِ دوراں چھنکی ہوئی

چھنکی ہوئی شعرا کرام والہانہ داد دے رہے ہیں اور شمیم صاحب یوں گلوخلاصی کر رہے ہیں۔ ؎

اپنی شبِ وصال ہو گئی اتنی مختصر
اُس نے نقاب اُٹھایا تو سورج نکل گیا

پھر دادِ شباب پر ہے اور آپ مائیک سے کھسک رہے ہیں دیکھا تو مونس بریلوی تالیوں کی جھنکار میں آکر سنجیدگی سے عنایت کر رہے ہیں ؎

اک سال عمر اور بڑھی، زندگی گھٹی
دیوار سے پُرانے کلینڈر اُتر گئے
مقتل میں میرے سر کی بلندی کو دیکھ کر
قاتل کے تیوَر چڑھتے ہوئے تیور اُتر گئے

جس متانت سے مونس صاحب سحرکاری کر رہے ہیں اسی شان سے داد کے ڈونگرے بھی برس رہے ہیں۔ ارشاد ہوا ہے ؎

ایسا ممکن تو نہیں ہے ایسا بھی ہو سکتا ہے
اب کے جو ساون آیا ہے پیاسا بھی ہو سکتا ہے
دروازہ دروازہ جا کر رُسوا بھی ہو سکتا ہے
کل کا راجہ آج بھکاری جیسا ہو سکتا ہے
پو چھ کر جس کو تم نے مار دیا بستی والو
وہ پردیسی میرا جیسا بھی ہو سکتا ہے

اب داد دینے والے تالیوں پر اُتر آئے ہیں اور آپ فرماتے ہیں ؎

اب کے مناسب دام لگے تو بیچ ہی دوں گا اپنا ضمیر
ورنہ اس سودے میں اک دن گھاٹا بھی ہو سکتا ہے

مونس صاحب محفل کو تحت سے گرما کر تالیوں کے شور میں مائیک چھوڑ رہے ہیں اور حفیظ میرٹھی تالیوں کی جھنکار میں آکر عطا کر رہے ہیں، ؎

اک اور بے ضمیر نے جینا سکھا دیا
حالات نے ہمیں بھی منافق بنا دیا

دادِ مشاعرہ شباب پر ہے اور آپ فرما رہے ہیں ؎

جینے تو دے مجھے نہ مرنے ہی دے مجھے
مجھ کو جلا دیا کبھی مرہم لگا دیا . . .

سامنے والے نوجوان حفیظ صاحب کی انا اور مقام نہ سمجھ سکے داد دینے کا انداز وہی بازاری قسم کا تھا لہٰذا حفیظ صاحب مائیک چھوڑ کر پلٹ آئے ہیں۔ ان دنوں محفلِ شعر و سخن چونکہ فار کا داخلہ ممنوع ہے آج مشاعروں میں صرف سازندوں کی کمی رہتی ہے۔ ورنہ نہ جانے کتنے مسخرے۔ بھانڈ۔ گلوکار اس صف میں شامل ہو گئے ہیں۔ دیکھئے بلال سیوہاروی فرما رہے ہیں ؎

بجٹ کے بعد جیسی ہم نے مہنگائی نہیں دیکھی
جو سچ پوچھو غریبوں کا تو سینہ چھن گیا یارو
سحر کیا ہے کہ راتوں کو بجلی ہی نہیں آتی
اندھیرے میں بجٹ بنتا ہے جیسا بن گیا یارو

ایک شور سا شور اور غل غپاڑہ ہے اور بلال صاحب داغ رہے ہیں ؎

کیوں مر رہے تھے لوگ الیکشن کے نام پر
کیا مل گیا عوام کو دونوں کے کھیل سے
دیکھا کیے تھے مرکزی جلیبوں کے روز خواب
محروم ہو کے رہ گئے منجن کے تیل سے

پھر ہاؤ ہو کا ایک پنڈال شکن دھماکہ ہوا ہے اور آپ ایک طویل نظم سنا کر فرمائشوں کو نظر انداز کر کے چلتے بنے ادھر دیو بند کے ایک اُبھرتے اور مترنم شاعر نواز خاں نواز غزل سرا ہیں ؎

رنج دے کے کیوں آخر مسکرا نہیں دیتے
تم سزا تو دیتے ہو، حوصلہ نہیں دیتے
منزلیں تو خود اپنے ہی عزم سے ملتی ہیں
رہنما مسافر کو راستہ نہیں دیتے
اب تو مان لیجئے وقت کا یہ فتویٰ ہے
حق طلب تو کرتے ہیں حق ادا نہیں کرتے

نواز صاحب پنڈال کو گرما کر داد لوٹتے اپنی جگہ آ رہے ہیں۔ ادھر ایک اور ایک اور کا ہنگامہ بپا ہے پھر پنڈال کو چونکا رہے ہیں ؎

تیغ اپنی جگہ دار اپنی جگہ ٭ ہر حقیقت کو ظاہر کرنے کے لئے
بھائی سے بھائی کی کچھ تقاضے بھی ہیں ٭ صحن کے بیچ دیوار اٹھنے لگے

لیجئے اب پنڈال میں بھونچال سا آیا ہے کئی بار دہرا کر خود بھی جھوم رہے ہیں ؎

اب کھنڈر میں کھنڈر ہی کہو دوستو ٭ شیش محلوں کے آثار اپنی جگہ

مختصر یہ تھا سرکیف کون تھا جو جیت اپنی گئی ہار اپنے جگہ
خمار صاحب تالیوں کے بے ہنگم شور میں شاداں لوٹ رہے ہیں
پھر اس رنگ کو دوآتشہ کرنے کے لئے ایک مخنی سی مترنم شاعرہ
بعد سلطانہ آکر یوں خوش گلوئی کا مظاہرہ کر رہی ہیں ؎

کوئی بھی ہنستا ہوا نظر نہیں آیا
گیا جب سے یہاں لوٹ کر نہیں آیا

دوسرے مصرعے پر یار لوگ اور من چلے زیادہ اچھل کود کر رہے ہیں
نئی بار دہرا کر اپنی دلکشی سے پنڈال کو گرمانے چلی ہیں ؎

وفا شعار تجھے جانتے ہیں سب لیکن
نہ جانے کیوں ترا مجھ میں اثر نہیں آیا
تم اپنے آپ کو الفت شناس کہتے ہو
یہی تو تجھ کو ابھی تک ہنر نہیں آیا
کسی نے خاک اڑائی ہے بدگمانی کی
زمانہ بیت گیا وہ ادھر نہیں آیا

یہ آداب مشاعرہ بالائے طاق رکھ کر داد کو ہنگامہ اور ہلڑ بازی کا
روپ دیا جا رہا ہے اور آپ لہک رہی ہیں ؎

گھروں میں کرتے ہیں عزم جوان کا سب اظہار
نظر کوئی بھی مگر وار پر نہیں آیا

تاج صاحبہ پنڈال میں نغمگی بکھیر کر کامران پلٹ رہی ہیں اور
لکھنؤ کے معتبر غزل گو شاعر کرشن بہاری نور اپنے مخصوص انداز
سے عطا کر رہے ہیں ؎

نظر ملا نہ سکا اس سے اس نگاہ کے بعد
وہی ہے حال ہمارا جو ہو گناہ کے بعد
میں کیسے اور کسی سمت موڑتا خود کو
کسی کی چاہ نہ تھی دل میں مری چاہ کے بعد
ضمیر کانپ تو جاتا ہے اب کچھ نہ کچھ
وہ ہو گناہ سے پہلے کہ ہو گناہ کے بعد

اب داد کا عالم نہ پوچھئے۔ ارشاد ہوا ہے ؎

لب کی ہنسی سے دیدۂ تر تک ایک کہانی بیچ میں ہے
اس منظر سے اس منظر تک ایک کہانی بیچ میں ہے
ایسے ہی حصوں میں بٹا ہوں جیسے کسی ناول کے بعد
عزم سفر سے ختم سفر تک ایک کہانی بیچ میں ہے

نور صاحب خوب خوب داد لوٹتے مائک سے جدا ہو رہے ہیں
اور حمیں صاحب کو مشیر صاحب پنڈال کو شاندار مغلیہ طرز پر بنانے
اور سجانے پر ایک شیلڈ عطا کر رہے ہیں اس پر تالیاں جاگ اٹھی
ہیں غالباً پہلی بار صلاحیت اور باشعور کمیٹی نے جہاں مشاعرہ کو
لہو لعب سے پاک و صاف کیا ہے وہاں پنڈال بھی مغلیہ طرز سے
آراستہ کرایا گیا ہے پھر اسی محفل غزل میں لوٹ چلئے اور ایک حسین
غزل الحاج شمیم جے پوری سے سنئے ؎

کچھ بھی ہو لیکن اے دل تیرا کہا نہ ہو گا
ہم لوٹ آئیں گے گر وہ در کھلا نہ ہو گا
اہل خرد نہ الجھیں اہل جنوں سے ورنہ
ہم ضد پہ آ گئے تو ہم سے برا نہ ہو گا
ہم نے تو اپنی کشتی طوفاں میں ڈال دی ہے
اب یہ خدا ہی جانے کیا ہو گا کیا نہ ہو گا

اس شعر پر پھر تمام قیود اور تمام بندشیں ختم۔ دوسرے مصرعہ پر شعرائے
کرام بھی جھوم رہے ہیں۔ شمیم صاحب بھی عالم کیف میں ہو کے
نغمگی بکھیرتے چلے ہیں ؎

اب تشنگی بجھا دے رندوں کی ورنہ ساقی
یا آج ہم نہ ہوں گے یا میکدہ نہ ہو گا

شمیم صاحب ایک تیر انداز غزل اور سنا کر پنڈال کو چونکا کر کامراں اپنی
جگہ آ رہے ہیں۔ ادھر شہریار غزل خمار بارہ بنکوی غزل سرا ہیں ؎

اب آنسو سنبھلتے نہیں ہیں سنبھالے
تمہاری امانت تمہارے حوالے
محبت سے انکار کرنے سے پہلے
لبوں کی یہ مجبوری گردش سنبھالے
خمار اب تکلف مجھے اپنا دل دو
بنے ہو جو کشش سے اشتہار والے

خمار صاحب اور داد لازم و ملزوم لہٰذا خوب خوب داد و تحسین
پا کر مائک سے جدا ہو رہے ہیں۔ ان کا نمبر کچھ ایسے وقت
آیا جب کسل اور غنودگی سامعین پر طاری ہے اب چار بج رہے
ہیں پھر فرمائشوں کا دور شروع ہو گیا ہے میں بھی تھک کر چور ہو چلا

ہوں لہٰذا اسٹیج چھوڑ رہا ہوں!

امسال [illegible] ہوا ایسے دیانت دار اور امانت دار و ذمہ دار حضرات کو پا لیا جو مسلم فنڈ کے منتظم ہیں جن کے امین ہونے کی قسم کھائی جا سکتی ہے۔ ظاہر ہے یہ اللہ والے اور قوم کے معتمد حضرات خیانت کے مرتکب نہیں ہو سکتے۔ مو شعراء کو اسٹیج سے جدا ہوتے ہوئے ان کے مطالبات فوراً ہی پورے کر دیئے گئے ہیں اس سے پہلے ہی اسٹیج پر مطالبات کے سلسلے میں جھڑپیں بھی دیکھی گئی ہیں اور یوں اس شہر علم و ادب کو بدنام کیا جاتا رہا جن پاک و صاف مشاعرہ کا نام لیا گیا ہے تو عرض کرتا چلوں امسال رند بلانوش شعراء سے واقعی آخری حد تک فہرست پاک بھی گئی یہ اس شہر پاکیزہ کے پرنور ماتھے پر ایک بدنما داغ تھا جیسے حبیب صاحب صدیقی۔ نواز دیوبندی۔ ڈاکٹر عزیز مشتاق، عمر دراز خاں، عبداللہ راہی۔ صادق صابری وغیرہ نے اس مشاعرہ کو اپنی پرخلوص کوششوں اور شب و روز کی محنت سے تاریخی اور یادگاری بنا دیا یہ حضرات لائق صد تحسین اور مبارکباد کے مستحق ہیں اہل شہر اور اہل ذوق و سخن فہم حضرات نے کسی بھی مرحلہ پر گستاخی یا غیر مہذب اور بداخلاقی کا مظاہرہ نہیں کیا سبھی کی متفقہ رائے ہے کہ امسال کئی سال کے بعد بڑا کامیاب اور لاجواب مشاعرہ ہوا کسی قسم کی ہلڑ بازی نہیں ہوئی۔ اب مجھے بھی اجازت دیجئے انشاء اللہ زندگی و صحت ایک اور آل انڈیا مشاعرہ پیش خدمت کرنے کی سعادت حاصل کروں گا خدا حافظ۔

چاہئے ہو سچا دوست تو کر کوئی ایسا
کام آئے گی برے وقت نگہباں ہو کر

ناقابل فراموش
سردار دیوان سنگھ مفتون ایڈیٹر ریاست کی دلچسپ ناقابل فراموش دستاویز جس کے متعلق متفقہ فیصلہ ہے کہ جس اردو داں نے یہ کتاب نہیں پڑھی اس نے اردو میں کچھ نہیں پڑھا قیمت مجلد [illegible] روپے علاوہ محصول ڈاک
دفتر شان ہند انصاری مارکیٹ فلیٹ ۵ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

بقیہ صفحہ ۱۶ کا

اب شرر صاحب کے کچھ مختلف اشعار اور سنیئے —

ظلمتیں چیر کے آواز دیتے جاؤں گا
موت کا خوف نہ فرعون کا کھٹکا ہوگا

ڈر ہے بچھڑ نہ جائے مرا یوں میں قافلہ
ہر شخص تیز دھوپ میں جھلسا ہے دوستو

ڈوب کر اپنے لہو میں آزمائش کے مزدور
دوستوں کی دوستی جو دشمنی تک لے گئی
آئی تھی جو بہار وہ آ کر گزر گئی
ویرانیوں میں قافلہ ٹھہرا ہوا تو ہے
پیکر شعر میں ڈھل جاتی ہے جب کوئی طلب
ہر غزل کو میں سجاتا ہوا مصور کی طرح

میں اکثر ٹوٹتے لمحوں کے دامن میں بکھرتا ہوں
ہزاروں اجڑا ہوں میں پہلے تو روشنی ہو گئی سے

اب قدموں کو چٹانوں کی طرح رکھ استوار
آندھیوں میں نرم ٹہنی کی طرح جھوما نہ کر

لوگ راہوں میں کھڑے ہیں تیر و خنجر تھام کر
شہر کی اونچی فصیلوں سے کسے آواز دیں
ہیں آندھیوں کے جبر مسلسل کی گود میں
پل کر جوان کیسے ہوا سوچتا رہا

میں وہ قدم قدم پہ نئی خون کی فصل بوتا ہوں
چلو تو میرے ارادوں کو ساتھ لے کے چلو

شرر صاحب بجا فرماتے ہیں
رُتوں کو دے رہی ہے دلاسے جو آج بھی
اے پاسبانِ قوم مری شاعری تو ہے

بقیہ ص ۱۸ پر

شاعرِ صیہون جناب گرفین جونز شرر گجرانوالوی

(جوزف انور)

"صیہون خدا کا وہ گھر ہے جس کا بنی اسرائیل کے ہاتھوں تعمیر کرنے کا پیغام دینے کے لئے خدا نے کوہِ سینا پر حضرت موسیٰ کو کہا تھا۔ داؤد بادشاہ نے خدا کے اس گھر کی تعمیر کا ارادہ کیا تو خدا نے اُسے روکا اور کہا اس کام کو تیرا بیٹا کرے گا۔ چنانچہ جب سلیمان بادشاہ نے یہ گھر بنوایا تو خدا سے دعا کی کہ جب بھی بنی نوعِ آدم اس گھر کی جانب رُخ کر کے دعا مانگیں اور اپنے گناہوں کا اقرار کریں تو اُن کی دعائیں سننا اور اُن کے گناہوں کو معاف کرنا اور انہیں تمام مصائب سے نجات بخشنا"

دنیا کے تمام مذاہب اپنے اپنے مختلف جغرافیائی انقسام [illegible] کے باوجود اپنے اپنے دور میں ہی نوعِ انسان کو ایک فلسفۂ حیات پیش کرتے رہے ہیں [illegible] سے آگاہ کرتے ہوئے ایک صراطِ مستقیم دکھانے کی سعیٔ جمیلہ کرتے رہے ہیں اس لئے کسی بھی مذہبی ادب یا مذہبی تعلیمات پر مبنی ادب پر جو ایک مکمل ضابطۂ حیات اپنے نظامِ فکر میں منضبط کئے ہوئے ہے کسی قسم کی رجعت پسندی کا لیبل لگا کر اس کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ کوئی بھی مذہب نہ تو قوتِ عمل کو ضعف پہنچاتا ہے اور نہ ہی قوتِ خیال پر معتقدات کی کھوکھلی بنیادوں پر توہمات تعمیر کرتا ہے بلکہ ہر ایک مذہب نیک و بد کے درمیان حدِ فاصل کھینچ کر انسان کی قوتِ متخیلہ کو دعوت دیتا ہے کہ وہ نیکی اور بدی کی شناخت کر کے اپنے لئے صحیح راستہ متعین کر لیا۔

منٹو اپنے مضمون "مذہبی ادب کے مسائل" میں فرماتے ہیں "جو لوگ مذہبی ادب کا نام لیتے ہیں وہ خدا کے کسی مخصوص مذہب یا مذہبی و دیگر مسائل کو ادب کے ذریعہ پیش کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ بلکہ زندگی سے متعلق مخصوص نقطۂ نظر کی تبلیغ کے لئے ادب کو استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ یہ اعتراض کہ مذہبی ادب ہو ہی نہیں سکتا، درست نہیں۔

اقبال نے اپنی شاعری سے اسلامی فلسفۂ حیات کی تبلیغ دقیق ہی نہیں بلکہ توہمات کی متزلزل بنیادوں پر کارفرما [illegible] مثالی ہیں۔

اردو شاعری سے جہاں مذہبی شاعری کی افادیت کو قبولِ ایجاب کی سند عطا کی ہے تو اردو کے شعراء نے [illegible] سے مذہبی علامات کو اپنے فکر و نظر کی اساس بنا کر [illegible] ہر قدم پر ان کو استوار کیا ہے وہیں ان علامات سے [illegible] شاعری کے گیسوؤں کی مشاطگی بھی کی ہے۔ اسی لئے ہمارے [illegible] و حرم کی کشمکش دیکھا، ناقوس، [illegible] برہمن، ابن آدم، جہاں اپنے مثبت معنوں میں بطور تلمیح استعمال ہونے لگے وہیں صلیب بھی محبت، ایثار، قربانی کی ایک ایسی مستقل علامت بن گئی کہ شاید ہی کوئی شاعر ہوگا جس نے صلیب کو اپنا موضوع نہ بنایا ہو۔ مشہور نقاد [illegible] کا کہنا ہے کہ شاعری کی افادیت بے پناہ ہے اس پُر آشوب دور میں جب کہ [illegible] اور سفاکانہ عقائد [illegible] ادیان و مذاہب تباہ کر دئے گئے ہیں [illegible] اور قلوبِ انسانی پر ایمان و یقین کی دعوت دینے کے لئے شاعر کو واعظ کے پہلو بہ پہلو کام کرنا چاہئے۔

اس نقطۂ نگاہ سے جب ہم جناب شرر صاحب کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو شاعر کو بطور واعظ ہی نہیں بلکہ ایک ایسے جرّاح کی شکل میں پاتے ہیں جو اپنی قوم کی بے حسی و زبوں حالی پر ایک دردمند دل کی تڑپ لئے ہوئے ان رِستے ہوئے ناسوروں

پر نشتر زنی میں معروف ہے جن کا مداوا [illegible] کے پند و نصائح کے مرہم سے ممکن نہیں۔

شتر صاحب لندن میں بود و باش رکھتے ہیں اور وہیں سے ایک اُردو کا سہ ماہی رسالہ کلیسا [illegible] نکالتے ہیں۔ شتر صاحب کا پہلا مجموعۂ کلام نقوشِ صلیب جب شائع ہوا تو نہ صرف ہندو پاک کے اُردو خواں حلقوں میں اُس کی خاطر خواہ پذیرائی ہوئی بلکہ غیر مسیحی اُردو داں حلقوں میں بھی کافی سراہا گیا یہاں تک کہ بہار اُردو اکادمی نے بھی انعام سے نوازا۔

شتر صاحب بلا شبہ شاعرِ قلبیات ہیں بائبل کے عقائد اور فلسفۂ حیات کو جس فنکارانہ چابکدستی سے اپنے اشعار میں ڈھال کر خفتگانِ قوم کو بیدار کرنے کے لئے پیش کرتے ہیں اس کا لطف وہی اُٹھا سکتے ہیں جو نصف پر کے سورج کی تمازت سے گھبرا کر جاگ اُٹھنے کے [illegible] [illegible] کا بات [illegible] ہر شے کو اپنے [illegible] سمجھتے ہیں غزل کا یہ نیا تیور یقیناً [illegible] ہے جو غزل کی تنگ دامانی کا شکوہ کرنے والوں [illegible] وحشی صنف قرار دیتے ہیں۔

آئیے اب بائبل کے واقعات اور فلسفۂ [illegible] کی روشنی میں شتر صاحب کے کچھ اشعار سے لطف اندوز ہوں۔

شتر صاحب کی شاعری میں مسیح کا ذکر اکثر آیا جس کی تفسیر ابتداء میں کی جا چکی ہے [illegible] مسیح کا فرمان ہے اپنی صلیب اپنے کندھوں پر اٹھاؤ اور میرے پیچھے چلو یعنی اپنے گناہوں کا بار اٹھا کر میرے نقشِ قدم پر چلو۔ [illegible] راحت دوں گا مگر جب قوم ہی خفتگی [illegible] [illegible] عمل [illegible] کیونکر ہو سکتا ہے۔ اسی خیال کو شتر صاحب نے کس خوبصورتی سے ادا کیا ہے دیکھئے ؎

مسیحؑ کو بیا میں گے دلی پہ اُٹھائیں گے

یہ عزم جواں ہو گا اس قوم کو چلنے دو

کلواری [illegible] انسان سے پیار کیا ہر اہل مقدس مقام ہے جسے بلندی پر بنایا گیا جس کے میناروں کی روشنی میں انسان گمگشتہ [illegible] بھٹک سکتا۔ مگر آج مسیحی قوم خدا کے اس عہد کو

بھول چکی ہے۔ تیرگی نے روشنی کی جگہ لے لی ہے اس فکر ہی پر شتر صاحب کا طنز ملاحظہ ہو ؎

مسیحوں کی منیاؤں کو نگلے کی تیرگی
آنکھوں میں آج دوستو منظر دیں تو ہے
مگر ؎ کس طرح سولی کو سینے سے لگا رکھو نگا
کس طرح اوپنچے یہ نظر طے کو اُٹھا رکھونگا ؟

شتر صاحب اُن نام نہاد مذہبی پاسبانوں سے بھی نالاں ہیں جو صلیب کو کسبِ معاش کا ذریعہ بنائے ہوئے ہیں۔ جو منبر پر بآوازِ بلند لمبے لمبے وعظ دیتے ہیں۔ مگر جن کے قول و عمل میں خود زبردست تضاد ہے۔ ایسے پاسبانوں پر شتر صاحب کا تازیانہ ملاحظہ فرمائیے ؎

رات بھر دلی کے جو سائے تلے سوتا ہے
اُبر سے مسیحوں سے وہ لوٹ کے آیا ہو گا

[illegible] کا پیغام واضح ہے اہلِ دیدہ و دل [illegible] جانتے اور سمجھتے ہوئے بھی اُس سے چشم پوشی کرتے ہیں۔ جب اہلِ نگاہ ہی [illegible] کا [illegible] ہو تو [illegible] چشم بصیرت [illegible] کے لئے شاعر کو اس کی نشاندہی کرنی پڑتی ہے اب شتر صاحب کا شعر ملاحظہ فرمایئے ؎

کوہ مسیحوں پہ کئی اہلِ نظر بیٹھے ہیں
دیدہ و دل کے نگہدار کہاں سے لائیں

جب ساری قوم ہی مسیحوں کی اس نفرت و پیغام سے بے خبر خوابِ غفلت میں سوئی پڑی ہو یہاں تک کہ اپنے حسین ذہن پر ان حقوق تک سے ناآشنا ہو جس کی آبیاری میں یقیناً اُن کا خونِ جگر بھی شامل ہے تو اس طلسم [illegible] کو توڑنے کے لئے شاعر ایک نعرۂ بیداری لگانے کے ساتھ بارگاہِ [illegible] تو کہہ سکتا ہے۔ شتر صاحب فرماتے ہیں ؎

[illegible] باغباں سے مسیحوں نیا نیا ہم
وا پچو قوم کی اُمید بارور کر دے

اس میں شک نہیں کہ شتر صاحب کی شاعری کا رجحان [illegible] طرف زیادہ ہے۔ یہی وجہ ہے اُن کی تقریباً تمام غزلیں غزلِ مسلسل کی خوبی کو اپنائے ہوئے ہیں تاہم چست تراکیب۔ الفاظ کا انتخاب حسنِ بیان کا سحر اُن کی شاعری کے سفر نو میں پختہ عزائم لئے ہوئے ہیں بلکہ اُس شمعِ فروزاں کی جلوہ آفرینیوں کو بھی اپنے جلو میں لئے ہوئے ہیں جو ایک دن یقیناً اُن کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کر کے رہیں گی۔

بقیہ صفحہ ۲۲ پر

[illegible]

وہ [illegible] اور انہیں
اور [illegible] میاں [illegible] ہیں۔ یہی
نام [illegible] اس وقت [illegible]
ہمارے [illegible] میاں حسین بخش بڑی اچھی خدمت کرتے ہیں
سنی [illegible] جاتی ہے۔

[illegible] مولوی عنایت اللہ صاحب قائل [illegible]
زمانے۔ انہیں سے میاں حسین بخش اپنے دوا جات کی کہانی کہہ
رہے تھے کہ کس طرح ایک ہی نسخے [illegible] غریب سے امیر
بنا دیتا۔ وہ کہانی سنا رہے تھے کہ میاں حسین بخش سے کہا۔ مولانا!
جی تو چاہتا ہے کہ ایک فریضے سے سبکدوش ہو جاؤں "

مرتبی

"یہ کہ رب کے مال [illegible] ہو [illegible] بس ابھی ایک
تمنا ہے جو دل ہی دل میں پیدا ہو کر بے چین کر دیتی ہے" حسین بخش
نے [illegible]

"آپ [illegible] پھر کچھ [illegible]
[illegible] آپ کو دولت دی ہے [illegible] عزت بخشی ہے
رعب و دبدبہ [illegible] ہوتے ہیں [illegible] آپ کی دولت سے
[illegible]

"[illegible] خدا نے ایک کو ایک پر فضیلت دی
ہے" کشن لال نے [illegible]

"وہ کافر [illegible]
جنت ہو وہ ایک [illegible] کے برابر نہیں
ہو سکتا [illegible] آپ سے بدظن کر
رکھا ہے"

[illegible]

[illegible] حسین بخش [illegible]

"مگر [illegible]
[illegible] مسلمانوں کی [illegible]
ایک [illegible] پاکستان [illegible]
گیا اور آپ کو معلوم ہے [illegible]
[illegible] اتنے میں [illegible] حسین بخش [illegible]

"کس نے ایسی حرکت کی؟"

"جنہیں آپ اپنا دوست سمجھتے ہیں انہیں کے [illegible]"

"کب کی بات ہے؟" تعجب سے حسین بخش نے پوچھا

"ابھی کوئی پانچ چھ روز ہوئے"

"واللہ مجھے کوئی علم نہیں"

"شہر میں آپ کی آمد و رفت بھی تو بہت کم ہے"

"کشن لال سے تو روز ملاقات ہوتی ہے"

"وہ کافر آپ سے کچھ کیوں کہے گا"

"اچھا کل صبح [illegible] خود ان سے دریافت کروں گا"

"ضرور دریافت کیجئے۔ مگر [illegible] میرا نام نہ لیجئے گا"

"آپ خاطر جمع رکھیں"

اتنے میں کشن لال کا ایک نوکر آیا اور اُن کے [illegible]
کہا: "آج سرکار کی دعوت ہے میرے مالک نے [illegible]"

"تمہارے مالک تو اب بڑے آدمی ہو گئے [illegible]"

"کل ہولی جو ہے"

"تو پھر آج دعوت کیوں؟"

"مالک کا خیال ہے مسلمان دوستوں کی دعوت آج [illegible]
جائے۔ ہولی کے موقع پر لڑکے [illegible]
آپ [illegible] پھینک دیا تو مالک [illegible]
[illegible] تمہارے مالک کو [illegible]
[illegible]

"یہ کیا"

"دال میں ضرور کچھ کالا ہے۔ آج ایک مہاشے سلیم کو لے کر انہیں کے دروازے سے پوچھا تھا"

"اچھا تو آج کچھ نہ کچھ ہو کر ہی رہے گا میں بھی ذرا دیکھ لوں کشن لال کون سی چال چلتا ہے"

"خدا آپ کی جان اور آبرو سلامت رکھے یہ ہندو روز بروز شیر ہوتے جا رہے ہیں۔"

"چھوڑیے ان باتوں کو مولانا۔ افراد کی غلطی جماعت کی طرف منسوب کرنا عیب نہیں ویسا موت اپنے وقت پر آئے گی قسمت کا لکھا کوئی مٹا نہیں سکتا۔ دشمن اگر قوی است نگہبان قوی تر است۔ میں تو دنیا میں صرف اللہ سے ڈرتا ہوں اور کسی سے نہیں۔"

"مگر حفاظت شرط ہے"

"بزدل کے لئے"

کچھ دیر تک دونوں خاموش رہے تھوڑی دیر کے بعد مولینا نے کہا ہاں تو جس غرض سے میں آیا تھا وہ تو میں نے کہا ہی نہیں اور باتوں میں وقت کافی گذر گیا۔

"فرمایئے"

"مولانا نے جیب سے ایک ڈبیا نکالی اور اس سے ایک گلوری نکال کر منہ میں رکھ لی

حسین بخش نے پوچھا۔ آپ شائد مشرق کے بارے میں کچھ کہنا چاہتے ہیں"

"بس بس آپ نے منہ کی بات چھین لی۔ میاں صاحب ایسی حسین لڑکی آپ کی نظروں سے شائد کبھی نہ گزری ہوگی۔ والدین امیر نہیں لیکن لڑکی میں لعل رکھتے ہیں۔ شباب و حسن نے مل کر مشرق کو دو آتشہ بنا ڈالا ہے۔ اگر آپ اسے ایک نظر دیکھ لیں تو کلیجہ تھام لیں۔ بس یوں سمجھ لیجئے شراب اور چاندنی مل کر انسانی سراپا بن گئی ہے"

"مگر وہ تو بیوہ ہے"

"نام کو صرف شادی ہوئی تھی ابھی رسم رخصتی باقی تھی کہ اس کا نامراد شوہر چل بسا۔ ایسی لڑکیاں قسمت والے ہی کو ملتی ہیں اگر آپ کہیں تو میں بات پکی کر لوں"

"ابھی عجلت کیا ہے میں حج سے پہلے فارغ ہو لوں"

"مگر شادی حج سے مانع نہیں ہو سکتی"

"اپنے خاص دوستوں کی بھی رائے لینی ضروری ہے"

"میں منع نہیں کرتا لیکن اتنی گزارش ضرور کروں گا کہ اگر آپ اجازت دیں تو کسی بہانے وہ لڑکی آپ کو ایک نظر دکھا دوں یوں سمجھئے جنت کی کوئی حور ہے وہ"

"کیا نامحرم کو دیکھنے کی اجازت شریعت دیتی ہے"

"کیوں نہیں اگر کہئے تو میں وہ حدیث پڑھ دوں کہ خود آنحضور نے اپنے بعض صحابہ کو انہیں شادی سے پہلے اپنی منگیتر کو دیکھنے کی اجازت دی تھی۔

"اچھا تو اگر کشن لال اس لڑکی کو دیکھ آئے تو کیسا ہے۔ کہیں میری خضاب آلودہ داڑھی نے غمازی کی تو۔۔۔؟

"میں آپ کے ارادے میں خلل اندازی تو نہیں کر سکتا مگر دیپ شنیدہ کے بود مانند دیدہ"

"میاں حسین بخش ہنس دیئے۔ بالشت بھر داڑھی ہوا میں ہل ہل کر اپنی نورانیت کا اظہار کرنے لگی۔ سامنے کے دانتوں نے راز فاش کیا کہ ہنسی جوان جیسی ہونی چاہیئے تھی۔ اور پھر خدا حافظ کہہ کر مولانا اٹھے اور اپنے گھر کی راہ لی اور حسین بخش ایک مرتبہ پھر نوشاہ بننے کا خواب دیکھنے لگے۔

اعلان بحکم پریس رجسٹرار حکومت ہند

فارم نمبر ۴ دیکھئے رول نمبر ۸

ایڈیٹر پرنٹر اور پبلشر کا نام :- ودیا پرکاش سرور

قومیت : ہندوستانی

پتہ : فلیٹ نمبر ۸۔ انصاری مارکیٹ دریا گنج

نئی دہلی نمبر ۲

نام اور پتہ مالک :- ودیا پرکاش سرور

فلیٹ نمبر ۸ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی نمبر ۱۱۰۰۰۲

میں ودیا پرکاش سرور تصدیق کرتا ہوں کہ جو حالات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم میں صحیح ہیں

یکم مارچ ۱۹۸۵ء

دہلی

ودیا پرکاش سرور

دستخط

کلینڈر

بابت ـــــــــــ سنہ ۱۹۸۵ء

طریقہ:- اس کلینڈر میں جس ماہ کی تاریخ معلوم کرنی ہو، اُس ماہ کے نیچے دن دیکھئے اور پھر دن کے مقابلہ میں بائیں سمت تاریخ دیکھ لیجئے!

نوٹ:- آپ کو یہ معلوم ہی ہے اگر ماہ فروری ۲۹ دن کا نہ ہو تو ماہ فروری، مارچ اور ماہ نومبر ایک دن شروع ہوتے ہیں۔ اور یکم اکتوبر کو ہمیشہ وہی دن ہوگا جو یکم جنوری کو ہوگا اور جس دن ماہ ستمبر شروع ہوتا ہے اُسی دن ماہ دسمبر کی پہلی تاریخ ہوا کرتی ہے۔ البتہ ماہ مئی، جون اور اگست الگ الگ دن سے شروع ہوتے ہیں اور کوئی "صدی" اتوار، بدھ اور جمعہ سے شروع نہیں ہوا کرتی اور صحیح معنی میں ایک سال ۳۶۵ دن ۵ گھنٹہ ۴۸ منٹ اور ۴۸ سیکنڈ کا ہوتا ہے۔

۰	۰	۰	فروری	۰	۰	۰					
جنوری	۰	اگست	مارچ	۰	ستمبر	جولائی					
اکتوبر	مئی	۰	نومبر	جون	دسمبر	اپریل					
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷					
منگل	بدھ	جمعرات	جمعہ	سنیچر	اتوار	سوموار	۱	۸	۱۵	۲۲	۲۹
بدھ	جمعرات	جمعہ	سنیچر	اتوار	سوموار	منگل	۲	[illegible]	۱۶	۲۳	۳۰
جمعرات	جمعہ	سنیچر	اتوار	سوموار	منگل	بدھ	۳	۱۰	۱۷	۲۴	۳۱
جمعہ	سنیچر	اتوار	سوموار	منگل	بدھ	جمعرات	۴	۱۱	۱۸	۲۵	۰
سنیچر	اتوار	سوموار	منگل	بدھ	جمعرات	جمعہ	۵	۱۲	۱۹	۲۶	۰
اتوار	سوموار	منگل	بدھ	جمعرات	جمعہ	سنیچر	۶	۱۳	۲۰	۲۷	۰
سوموار	منگل	بدھ	جمعرات	جمعہ	سنیچر	اتوار	۷	۱۴	۲۱	۲۸	۰

مرتبہ:- سلام ساگری — ساگر (ایم پی) ۴۷۰۰۰۲

کلینڈر

برائے .... سنہ ۱۹۸۶ء

طریقہ:- اس کلینڈر میں جس ماہ کی تاریخ معلوم کرنی ہو اُس ماہ کے نیچے دن دیکھئے اور پھر دن کے مقابلہ میں بائیں طرف مطلوبہ تاریخ دیکھ لیجیے۔

نوٹ:- آپ کو یہ معلوم ہی ہے کہ اگر ماہ فروری ۲۹ دن کا نہ ہو تو ماہ فروری، مارچ اور ماہ نومبر ایک دن شروع ہوتے ہیں اور یکم اکتوبر کو ہمیشہ وہی دن ہوگا جو یکم جنوری کو ہوگا اور جس دن ماہ ستمبر شروع ہوتا ہے اُسی دن ماہ دسمبر کی پہلی تاریخ ہوا کرتی ہے البتہ ماہ مئی، جون اور اگست الگ الگ دنوں سے شروع ہوا کرتے ہیں اور کوئی صدی اتوار، بدھ اور جمعہ سے شروع نہیں ہوتی اور یہ بھی معلوم ہے کہ ایک سال ۳۶۵ دن ۵ گھنٹے ۴۸ منٹ اور ۴۸ سیکنڈ کا ہوتا ہے۔

۰	۰	۰	فروری	۰	۰	۰					
جنوری	مئی	اگست	مارچ	جون	ستمبر	اپریل					
اکتوبر	۰	۰	نومبر	۰	دسمبر	جولائی					
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷					
بدھ	جمعرات	جمعہ	سنیچر	اتوار	سوموار	منگل	۱	۸	۱۵	۲۲	۲۹
جمعرات	جمعہ	سنیچر	اتوار	سوموار	منگل	بدھ	۲	۹	۱۶	۲۳	۳۰
جمعہ	سنیچر	اتوار	سوموار	منگل	بدھ	جمعرات	۳	۱۰	۱۷	۲۴	۳۱
سنیچر	اتوار	سوموار	منگل	بدھ	جمعرات	جمعہ	۴	۱۱	۱۸	۲۵	۰
اتوار	سوموار	منگل	بدھ	جمعرات	جمعہ	سنیچر	۵	۱۲	۱۹	۲۶	
سوموار	منگل	بدھ	جمعرات	جمعہ	سنیچر	اتوار	۶	۱۳	۲۰	۲۷	
منگل	بدھ	جمعرات	جمعہ	سنیچر	اتوار	سوموار	۷	۱۴	۲۱	۲۸	

مرتبہ:- سلام ساگری - ساگر (ایم پی) ۴۷۰۰۰۲

کویت بزمِ سخن کا طرحی مشاعرہ

پروفیسر [illegible] ابراہیم دی
جنرل سکریٹری کویت بزمِ سخن
کویت

کویت بزمِ سخن کے زیر اہتمام طرحی مشاعرہ جناب ایم۔ ڈی خاں کے دولت کدہ پر منعقد ہوا۔ علامہ سیاب اکبرآبادی کا مصرع

؏ فطرت بھی میرے ساتھ مسلسل سفر میں ہے

طرحی مصرع دیا گیا تھا۔ سفارت خانہ پاکستان کے کونسلر جناب عبدالحق صاحب نے طرحی مصرع کی صدارت فرمائی اور عبدالستار غزالی سابق ایڈیٹر ڈیلی نیوز کویت مہمان خصوصی تھے۔

مشاعرہ کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ اور راقم نے نعت رسول بارگاہ سرور کائنات پیش کی۔ اس کے بعد جن شعرائے کرام نے طرحی کلام پیش کیا اُن کے کلام کا انتخاب حاضر خدمت ہے

عبدالحمید ہوش

کس کا خیال کس کی تجلی نظر میں ہے
ہر ذرہ آفتاب ہے جو رہ گزر میں ہے
منزل سمجھ رہا تھا وہ منزل نہ تھی میری
خود ہوں سفر میں یا میری منزل سفر میں ہے

طاہر کیفی

تصویر تارِ زلف کی تارِ نظر میں ہے
کیا ربط باہمی مرے شام و سحر میں ہے

باقی احمد پوری

میں یہ کہوں گا میرے سفینے سے ہے بھنور
میں کیوں کہوں کہ میرا سفینہ بھنور میں ہے
آؤ جنوں کا ہاتھ پکڑ کر چلے چلیں
یہ عقلِ بدگماں اگر میں مگر میں ہے

محبوب امین انجمی

آسودہ حال اپنے وطن ہی میں کب تھا میں
گردش بھی اپنے ساتھ مسلسل سفر میں ہے

عبداللہ ساجد

موسم کا رنگ، خوشبو گردِ سفر میں ہے
کوئی نہ کوئی درد ہر اک رہ گزر میں ہے

عبدالستار عاصی

کہنے کو کام وقت کی مقراض کر گئی
اونچی اڑان پھر بھی مرے بال و پر میں ہے

فرید قریشی سحر اکبرآبادی

تیرے تصورات میں ہر پل حیات کا
گزرا ہے اس طرح کہ ابھی تک سفر میں ہے
ساحل کے شور و غل میں اداسی کبھی نہ تھی
یہ کس کی آرزو کا سفینہ بھنور میں ہے

محمد حسین صدیقی

جھاڑ گیا دامن ایہہ [illegible] پٹے کچھ دی بنیائیں
دردی درد رہ گیا دامن تر میں ہے
چاہن والے دامن دے لکھاں اے دی
مشاعرہ جیدی یاد و چ خان گے گھر میں ہے

حامد کرتارپوری

پی جا وہ اشک جو کہ تری چشم تر میں ہے
صد شکر چیز گھر کی ابھی اپنے گھر میں ہے

کمال اظہر

حسرت سے ایک صاحبہ یہ کہہ رہی تھی کل
بچوں کی ریل پیل تو قائم کے گھر میں ہے
کیوں شام ہی سے آج بجھا جا رہا ہے دل
کیا زیست کا چراغ ہوا کے اثر میں ہے

خورشید مظفر

بے چین برق گرنے کو کیوں چھت پہ ہے مری
معلوم ہر کسی کو ہے جو میرے گھر میں ہے

عبدالمجید نجم

صحرا میں ہے سکون میسر نہ گھر میں ہے
سودا عجیب اہلِ محبت کے سر میں ہے

. . . .

میں دربدر ہوں آج بھی وہ اپنے گھر میں ہے

نجم کاتی

گرچہ ہوا کے رُخ پہ ہے الزام بے رُخی
پروانے کی بساط کہاں لو نہ پہنچ سے ہے

نیئم پرکار

جکڑا گیا ہوں ایسے میں رسم و رواج میں
طاقت کہاں اُڑان کی اب بال و پر میں ہے

انجم کلیمی

میں نے تو اپنی کشتی بھنور میں اُتار دی

. . . .

گلشن حیدرآبادی

ضبطِ الم کی خامشی میرے گھر میں ہے
کتنا عجیب لطف ہے جو درگزر میں ہے

جدت الٰہ آبادی

افسانۂ وجود مرا ہر سطر میں ہے
میرا بیان قصۂ ہر مختصر میں ہے

طرحی دور کے بعد غیر طرحی دور میں جناب قمر پرکار، کنول جعفری اور رانا محمد حنیف نے اپنے غیر طرحی اشعار پر خوب داد پائی۔

مشاعرہ کے اختتام پر صدر مشاعرہ جناب عبدالحق صاحب نے فرمایا کہ میں منتظمین بزم شعراء حضرات نیز سامعین کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ مجھے آپ نے اچھے اچھے اشعار سننے کا موقع دیا۔ طرحی مشاعرہ شعراء حضرات کے لئے اُن کی ذہنی کاوش کو ایک قسم کا چیلنج ہوتا ہے۔ مگر یہاں یہ بات دیکھنے میں نہیں آئی بلکہ شعراء ایک دوسرے کو قدر و احترام کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ بڑی توجہ سے ایک دوسرے کا کلام سُنتے اور فراخ دلی سے داد دیتے رہے۔ ہر غزل میں اگرچہ قافیے وہی تھے لیکن خیالات جُدا جُدا تھے۔ جس کی وجہ سے غزل نئے تخیلات اور حرکات سے مالامال ہوتی ہے۔ لفظوں کی تکرار جسے غالب نے اپنے کلام سے قلم زد کر دیا مگر عاقل نے اسے قلم زد نہ کیا اور اُسے غزل کا حسن کہا۔ اس طرحی مشاعرہ میں لفظی تکرار اچھی لگی اور غزل کا حسن برقرار رہا۔

آج کا مشاعرہ سابقہ دو برسوں میں پہلا طرحی مشاعرہ ہے۔ جو سب مشاعروں سے زیادہ کامیاب اور مختلف نوعیت کا رہا۔

اچھے شعراء نے عمدہ اشعار بھی دوستانہ ماحول میں سنائے اور اس سے جو پُر کیف ماحول پیدا ہوا وہ کافی لمبے عرصے تک ذہنوں پر نقش رہے گا۔ آخر میں صاحب صدر نے پھر ایک سب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنی تقریر کا اختتام کیا۔ صاحب صدر کی تقریر کے بعد مہمان خصوصی جناب عبدالستار غزالی مشاعرہ پر اپنے خیالات کا اظہار فرماتے ہوئے کہا۔ کہ عبدالحق صاحب کی اتنی اچھی اور عمدہ نیز جامع تقریر کے بعد کچھ اور کہنے کی گنجائش نہیں پاتا۔ صرف اتنا کہوں گا کہ اس طرحی مشاعرہ میں شریک شعرائے کرام نے جو ذہنی اور فکری کاوشیں کی ہیں سب مبارک باد کے قابل ہیں۔ اس طرحی مشاعرہ کے انعقاد پر میں جناب ایم۔ ڈی۔ خاں صاحب کو بھی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

صاحب خانہ جناب ایم۔ ڈی۔ خاں صاحب نے فرمایا کہ ہم کو ادب کی جانب لے جاتا ہے اور ادب کا شعور سکھاتا ہے۔ سب کو مل جل کر رہنا چاہئے اور ادبی ماحول کو خراب نہیں کرنا ہمیں لازم ہے کہ ادبی محفلوں میں ذوق و شوق سے زیادہ سے زیادہ تعداد میں آئیں تاکہ چند لمحات خوشگوار ماحول میں گزار کر مسکراتے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو جائیں تاکہ ایسی ادبی محفلوں سے کچھ رہنمائی ہو۔

کویت بزم سخن کے صدر جناب طاہر کیفی نے اپنی تقریر میں کہا کہ میں تمام شعراء حضرات اور خاص طور پر عبدالحق صاحب عبدالستار غزالی صاحب کا شکر گزار ہوں۔ جنہوں نے بزم کی ہمت افزائی فرمائی۔ محمد حسین صدیقی کا بھی احسان ہے کہ انہوں نے استاد امن کو نذرانۂ عقیدت اپنے اشعار میں پیش کیا۔ طرحی مشاعروں سے حقیقت میں ادب کی خدمت ہو رہی ہے اس لئے ہماری بزم طرحی مشاعرہ جاری رکھے گی۔ طاہر کیفی صاحب نے خاں صاحب کی ادب پروری کا ذکر کرتے ہوئے اپنی تقریر ختم کی۔ اسٹیج سکریٹری کے فرائض راقم الحروف نے انجام دیئے۔ مشاعرہ کے اختتام پر تمام شعراء اور سامعین کے لئے خاں صاحب کی جانب سے خورد و نوش کا بہترین انتظام تھا۔

. . . .

بمبئی مرکنٹائل کوآپریٹو بنک لمیٹڈ

رجسٹرڈ آفس ۷۸، محمد علی روڈ بمبئی ۴۰۰۰۰۳

دہلی آفس ۲۶۵۵ نیتاجی سبھاش مارگ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

فون نمبر ۲۶۴۲۶۶ — ۲۶۴۳۶۲

- ہمارے یہاں شرح سود تمام نیشنلائزڈ اور شیڈولڈ کمرشیل بنکوں کے مقابلہ ایک فیصد زیادہ ہے
- ہندوستان کا پہلا کوآپریٹو بنک جس کو زرِ مبادلہ میں کاروبار کے لئے لائسنس جاری کیا گیا۔
- ہمارے بنک میں اوقاف کی جمع شدہ رقم کی آمدنی دفعہ ۱۲ (۵) (الف م) (iii) انکم ٹیکس ایکٹ ۱۹۶۱ کے تحت انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہے

اس کے علاوہ

- ہم آپ کے آرام و آسائش کی ضروریات مہیا کرنے کے لئے آسان قسطوں پر قرضہ فراہم کرتے ہیں۔ ایک فیصدی کا فرق بہت بڑا فرق ہے۔ یہ آپ کی رقم میں ہزاروں روپیہ کا اضافہ کرتا ہے۔ آپ بھی اس کا فائدہ اٹھائیں

زین جی رنگون والا	حسینی ایس۔ ڈاکٹر	شمیم کاظم
مینجنگ ڈائرکٹر	(چیرمین)	(اسسٹنٹ جنرل مینیجر۔ شمالی ہند)

غزل

جہاں میں فطرتاً ہر آدمی انساں نہیں ہوتا
چمن میں جس طرح ہر پھول عطر افشاں نہیں ہوتا

جو قطرہ اشکِ غم کا باعثِ طوفاں نہیں ہوتا
جنابِ خضر کے چشمے کے وہ شایاں نہیں ہوتا

گلستانِ جہاں کی آبیاری غیر ممکن ہے
اگر دریائے دل کا انساں کا بے پایاں نہیں ہوتا

رہے گا تا ابد محتاج وہ مہرِ درخشاں کا
اگر خود بڑھ کے ذرہ نیّرِ تاباں نہیں ہوتا

یہ وہ مے خانہ ہے جام و سبو جس میں نہیں ہوتے
شرابِ عشق کا پینا جہاں آساں نہیں ہوتا

وہ ہو جاتا ہے خود گُم دم بل کر موجِ مضطر میں
اگر قطرہ حریفِ بحرِ بے پایاں نہیں ہوتا

شرابِ آگہی ہر جام و مینا میں نہیں ڈھلتی
ہر اک خم جلوہ گاہِ بادۂ عرفاں نہیں ہوتا

مہ و خورشید ہوں، گل ہائے تر ہوں یا کہ انساں ہوں
بدلنا اُن کی فطرت کا یہاں آساں نہیں ہوتا

نہیں لگتی یہاں قیمت کسی کے گرمیٔ دل کی
کہیں بھی امتحانِ سینۂ سوزاں نہیں ہوتا

ترے دل کا گدا ہوتا ہے سلطانِ عالم دل کا
یہ مانا چشمِ ظاہر بیں میں وہ سلطاں نہیں ہوتا

حرارت اور حرکت ہی سے قائم بزمِ ہستی ہے
بغیر ان کے وجودِ عالمِ امکاں نہیں ہوتا

یہاں سر میں لئے سودائے آزادی جو آتا ہے
وہ دیوانہ اسیرِ گردشِ دوراں نہیں ہوتا

بدل دیتا ہے رنگِ بادہ رنگِ جام و مینا بھی
دلِ روشن نہ ہو تو چہرہ تاباں نہیں ہوتا

دیارِ عشق میں اس کو کبھی آنے نہیں دیتے
[illegible] کبھی جو صاحبِ ایماں نہیں ہوتا

صفِ انساں سے امجد ہم اُسے خارج سمجھتے ہیں
کسی انساں کے دل میں جب غمِ انساں نہیں ہوتا

غزل

دور میں جب تک دلِ زندہ کے پیمانے رہے
ہر طرف آباد میخانے کے میخانے رہے

ہم گزر جاتے تھے طوفانِ امید و بیم سے
بادۂ جرأت سے جب لبریز پیمانے رہے

دیدہ و دل کو جہاں سے روشنی ملتی رہی
اب کہاں وہ مدرسے وہ تربیت خانے رہے

آج کے انساں میں انساں کا دل ملتا نہیں
آئینے ناپید ہیں اور آئینہ خانے رہے

زلفِ عالم میں جب الجھی تھی تو سلجھاتے تھے ہم
ہاں نہیں ہاتھوں میں ایسے بھی کبھی شانے رہے

خاک و باد و آب و آتش تو گلے مل بھی گئے
اور ہم انسان باہم جنگ کی ٹھانے رہے

پرتوِ حسنِ ازل سے جل اٹھی جب کائنات
رہ گئی اک شمعِ نور اور چند پروانے رہے

ہم سمجھ سکتے نہیں رازِ درونِ کائنات
یہ حقیقت جاننے والے بھی انجانے رہے

اک چراغ ایسا بھی تھا جو بن جلے روشن رہا
جل رہے تھے اس پہ کچھ ایسے بھی پروانے رہے

میکشوں کی بزم یہ بزمِ سخن بن جائے گی
کچھ دنوں اس میں اگر امجد سے مستانے رہے

دیوان
ناصر کاظمی
قیمت: بارہ روپے پچاس پیسے

پیشاب گھر آگے ہے

اقبال مجید

ایک باقاعدہ بسے ہوئے شہر کی شاہراہ ایک اجنبی،
پیشاب کی اذیت ناک شدت اور پیشاب گھر کی تلاش!

جب سب کچھ بنتا ہے تو پیشاب گھر نہیں بنتے۔ جب پیشاب گھر بنتا ہے تو لوگ وہاں پاخانہ کر دیتے ہیں۔

پتلون کی فلائی پر بار بار ہاتھ جاتا ہے۔ ایک کشادہ سی صاف ستھری دیوار پر لکھا ہے - یہاں پیشاب کرنا منع ہے دیوار سے لگ کر سایہ ہے لاتعداد خونچے والے بیٹھے ہیں سامنے سیدھی بھاگتی ہوئی شاہراہ ہے۔ دائیں بائیں دکانیں ہیں مال سے لدی ہوئی چورا ہے اور فوارے ہیں۔ چاروں طرف دکانیں آئس کریم کینڈی، بھنے ہوئے چنے، ٹی اسٹال، چوڑے چوڑے فٹ پاتھ کہیں کہیں کنارے کنارے لوہے کی خوبصورت ریلنگ اور آدمیوں کی بھیڑ، صاف ستھرے، تیز تیز چلتے اپنے آپ سے باتیں کرتے، چھوٹے بڑے آدمی۔

پیشاب کے مقام پر جلن ہو رہی ہے۔ فضول کو پوری قوت سے اوپر کی طرف کھینچنے کا عمل نہ جانے کب سے جاری ہے۔
یہ شاہراہ کسی ویران علاقہ سے کیوں نہیں مل جاتی یا پھر کوئی زیر تعمیر عمارت ہی فٹ پاتھ کے کنارے مل جائے جہاں آس پاس جھاڑیاں ہوں۔

بہت دیر کا ٹھہرا ہوا پیشاب جب ایک بارگی بہہ نکلتا ہے تو جسم کے ایک ایک عضو کا تناؤ جس مسرت انگیز لذت کے ساتھ کم ہوتا جاتا ہے - وہ لطف، طمانیت، فراغت کا ایک عظیم تحفہ ہے۔

ایک باقاعدہ بسے ہوئے شہر کی شاہراہ، ایک اجنبی، اذیت ناک شدت اور پیشاب گھر کی تلاش۔

زندگی میں سب سے مبارک عمل کیا ہے؟ out way کی تلاش - ہمارے اندر بہت کچھ گرفتار بنا ہے ستایا کرتا ہے اور بے چین کر دیتا ہے ہم کو۔ جی چاہتا ہے کہ ہم اسے نوچ کر نکال دیں۔

بائیں طرف ایک سینما ہال ہے۔ بکنگ ونڈو پر سناٹا ہے پر سینما ہال میں پیشاب گھر ہوتا ہے۔ یک بارگی سارے جسم میں مسرت کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ اور اس کے ساتھ پیشاب کی شدت اور بڑھ جاتی ہے۔ لیکن ہال کے پھاٹک پر تالہ لگا ہے۔ شاید ابھی شو کا وقت نہیں ہوا۔

چوڑی چکلی سڑک اپنے پورے طمطراق سے جاری ہے۔ فٹ پاتھ کے دونوں طرف سونے چاندی کی دکانیں ہیں۔ سوال یہ کہ یہ سارے کے سارے لوگ کیا ان میں ایک بار بھی پیشاب نہیں کرتے۔ دکانوں پر کپڑا خریدتے ہوئے لوگ کوک پی رہے ہیں۔ ایک درخت کے نیچے گنے کا رس کچلا جا رہا ہے۔ ایک طرف ٹھنڈے پانی کا ٹھیلہ کھڑا ہے پانچ پیسے گلاس۔ جگہ جگہ چائے کی بھٹیاں۔ پینے کا اتنا سامان لوگوں کے پیٹوں میں جا رہا ہے اور لوگ بغیر پیشاب کیے گھوم رہے ہیں۔ کیا وہ دنیا کا واحد فرد ہے جو پیشاب کی شدت میں مبتلا ہے۔ شاید ایسا نہیں ہے بات صرف اتنی ہے کہ وہ اجنبی ہے۔ یہ سارے کے سارے دکاندار، سڑک کی یہ بھیڑ، فٹ پاتھ کے یہ تماشائی سب ہی ان جگہوں کو جانتے ہوں گے جہاں پیشاب کیا جا سکتا ہے۔

چہرہ تکلیف سے بار بار رنگ بدلتا ہے۔ آدمی میں برداشت کی قوت کی بھی ایک حد ہوتی ہے جب پیشاب اپنی پوری شدت سے لگا ہو۔ نہ کھڑے رہنے میں چین ملتا ہے اور نہ چلنے [illegible] میں جب بار بار آنکھیں ادھر ادھر آس پاس کہیں خلائی [illegible] کے بٹن کھول کر [illegible] سے ہو جانے کا سوال کرتی ہوں تو زندگی کا [illegible] - ماہر کی خوبصورت ترین شے۔ نیز [illegible] حیثیت کا واقعہ، خالی خالی

سالگرہ جاتا ہے۔

یہ جلن مار ے ڈال رہی ہے
نسیں جیسے اب ٹوٹ جائیں گی۔
کہیں کوئی پونڈ باہر نہ آجائے۔

اجنبی ہوتا تو ایک بہانہ ہے۔ آدمی کہیں اجنبی نہیں ہوتا ہے صرف WAY out کی بات ہے۔ کسی سے بھی پوچھا جا سکتا ہے

اے چھوکرے! یہاں پیشاب کرنے کی کوئی جگہ ہے آس پاس آگے ہے آگے ہے آگے!

ایک باقاعدہ بسے ہوئے شہر کی شاہراہ، ایک اجنبی، پیشاب کی اذیت ناک شدت اور پیشاب گھر کی تلاش!!!

کیوں سیٹھ جی؟ یہاں پیشاب کرنے کے لئے کوئی جگہ ہے آس پاس!
آگے ہے آگے۔

نیچے انڈر ویر بھی نہیں ہے لوگ لوٹے انڈر ویر پہن کر عقلمندی رہتے ہیں۔ شاید اسی لئے دیکھا گیا ہے کہ نیچے کے کپڑے اوپر کے کپڑوں سے کم بھیگے نہیں ملتے۔

کیوں بابو جی؟ یہاں پیشاب کرنے کے لئے کوئی جگہ ہے آس پاس؟
آگے ہے آگے۔

ہونٹ دانتوں کے نیچے دبانے دبائے، درد کو سہتے سہتے بار بار بھرنے والی بے معنی جھنجھلاہٹ کو بھگتے۔ کتنی دیر ہو گئی اور کتنا سفر کٹ گیا۔ نہ راستہ کہیں مڑا نہ کوئی نالہ ملا اور نہ کسی دکان کا پچھواڑہ کہیں۔ بند دکانوں کے پیچھے اکثر ایسا ہو جاتا ہے کہ کھڑے ہو جاؤ۔

کیوں سپاہی پوسٹ مین، ادھر کہیں پیشاب کرنے کی —
آگے ہے آگے۔

فٹ پاتھ پر پرانی کتابیں لگی ہیں۔ کبھی کبھی پرانی کتابوں کے ڈھیر سے نایاب کتابیں بھی مل جاتی ہیں۔ لیکن ٹھہرنے کا یارا کسے، پیشاب کا دباؤ ہو تو ہے اتنی مہلت کہاں۔

کیوں جا رہے ہو جی ادھر کہیں پیشاب —
آگے ہے آگے۔

یہ اسمبلی بھون ہے ٹھیک اس کے سامنے مختلف خیموں میں مختلف تحریکوں کا احتجاج کرنے والے بھوک ہڑتالی پڑے ہیں۔ سیاست زندگی کا ایک حصہ ہے۔ کہا۔ میں جمہوریت کی جڑیں مضبوط کرتا ہی ہوں گی۔

دادا یہاں پیشاب کے لئے —
آگے ہے آگے۔

نہرو کا سب سے بڑا حریف ہندوستان کا پروگریسو موومنٹ تھا۔ اس لئے انھوں نے سوشلسٹ ہندوستان کا چکر چلا کر سب کو بہکا دیا۔ ربط نہ جب ہو اور تبدیلی کی جلدی ہو تو سماجی ادارے TRANSFER تو کئے جا سکتے ہیں TRANSFORM نہیں کئے جا سکتے۔ سماج آگے ہو گیا اور فرد پیچھے۔ علاء الدین کا چراغ تو محض ایک کہانی ہے۔

بھیا! یہاں پیشاب ....
آگے ہے آگے۔

اردو کے ساتھ ۲۶ سال بڑی بے انصافی ہوئی علی سردار جعفری کا چیک دیر میں اور قاضی عبدالستار کا چیک بہت جلدی کیش ہو گیا۔ کتنی دیر ان میں ابھی اور کھڑے رہنا پڑے گا بھئی۔

پیشاب
آگے ہے آگے۔

آپا جان میں وہ آیا کی، بسم! کہا کر کہتی ہوں کہ میں سستے ہول رہی ہوں سارے جلے میں صرف آپا جان، بچا ہے۔ کیونکہ لوگ خود ہی ٹکٹ کی جلدی میں ہیں

لیکن وہ پیشاب گھر —
آگے ہے آگے۔

جہاں ہو وہیں کھڑے ہو جاؤ، جسم کا تناؤ اور اندر کے درد کو سہتے رہو۔ ایسی حالت میں چلنے سے مثانہ اور زیادہ IRRITATE ہوتا ہے سفر بند کرو۔

مٹھیاں بھینچی ہیں۔ بار بار رگ پٹھے اوپر کی طرف سکڑ رہے ہیں۔ کتنا درد ہو رہا ہے۔

جب پیشاب کی شدت ناقابل برداشت ہو تو اس کے بارے میں سوچتے نہیں رہنا چاہئے۔ نہیں تو IRRITATION اور بڑھ جاتا ہے لیکن ہر بات کی حد ہوتی ہے۔

چلتی سے کمال کو بار بار جسلنا، کوئی سیدھی بات پوچھے تو الٹا جواب دینا پیشاب کی شدت ذہن کو دیوالیہ اور سوچ کو مفلوج کر دیتی ہے

یہاں پیشاب گھر کہاں ہے؟
آگے ہے آگے۔

باقی صفحہ ۳۱ پر

کنوئیں میں گرا ہوا آدمی

مشتاق قمر

جانے منڈیر میں کوئی نقص تھا یا اس نے پاؤں ہی غلط رکھا تھا۔

وجہ کچھ بھی ہو وہ اس وقت کنوئیں میں تھا اور ٹھنڈے یخ بستہ پانی، سانپ، مینڈکوں اور رات کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں گھر چکا تھا۔ اندھیرا بڑی تیزی سے آنکھوں میں اترتا جا رہا تھا اور خنکی کے زہر سے شریانوں میں لہو منجمد ہو رہا تھا۔

وہ کنوئیں میں سر کے بل گرا تھا اور سیدھا تہہ تک چلا گیا تھا۔ خوش قسمتی سے وہ تیرنا جانتا تھا اور کنوئیں میں پانی بھی بہت تھا۔ اس لئے چوٹ سے محفوظ رہا اور سطح آب پر دوبارہ ابھرنے میں بھی کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اس کے گرتے ہی مینڈکوں نے ٹرا ٹرا کر آسمان سر پر اٹھا لیا۔ کنوئیں میں مینڈکوں کی اتنی بڑی تعداد میں موجودگی پر اسے حیرت ہو رہی تھی۔ اس کے خواب و خیال میں بھی کبھی یہ بات نہ آئی تھی کہ اتنے چھوٹے سے کنوئیں میں اتنے زیادہ مینڈک بھی ہو سکتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اس نے کبھی سنجیدگی کے ساتھ اس بارے میں سوچا ہی نہ تھا۔ اور اگر کبھی سوچا بھی تھا تو فقط اتنا کہ چند ایک مینڈک ہیں جو برساتوں کے دھارے میں خود ہی ٹرا ٹرا کر خاموش ہو جاتے ہیں۔ وہ انھیں ہمیشہ غیر اہم مخلوق تصور کرتا رہا۔ لیکن اب جب کہ زندگی کے محفوظ دائرے سے اس کا پاؤں پھسل چکا تھا اور وہ اپنے آپ کو ایک چھوٹے سے جان لیوا دائرے میں محبوس پا رہا تھا۔ یہی غیر اہم مخلوق اس کے لئے بہت [illegible] ناقابل عبور صحرا بن گئی تھی۔

مینڈک مسلسل ٹرا رہے تھے اور ان کے اس طرح لگاتار ٹرانے سے اس کے سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیتیں مفقود ہو گئی تھیں۔ کچھ بھی سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ چند لمحوں کی تنہائی میسر آ جاتی تو وہ شاید اس عذاب سے رستگاری پانے کی ترکیب نکال لیتا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس کا سابقہ کبھی مینڈک جیسی مخلوق سے پڑے گا۔ اس میں اتنی سکت یقیناً تھی کہ وہ مینڈکوں کی موجودگی اور ان کے مسلسل ٹرائے جانے کی تکلیف دہ حقیقت سے مانوس ہونے اور اپنی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کو مناسب ترتیب دینے تک کنوئیں کے یخ بستہ پانی کا مقابلہ کر سکے۔ لیکن کالے سیاہ ناگ پھن والے کی موجودگی کے احساس نے اس کے رہے سہے اوسان بھی خطا کر دیئے۔ مینڈک بذات خود کوئی بہت بڑا مسئلہ نہ تھے وہ ان سے کسی نہ کسی طور نبٹ سکتا تھا۔ لیکن مینڈکوں کی ٹرٹراہٹ سانپ کو متوجہ کر سکتی تھی۔ سانپ کا خیال آتے ہی خوف کا کوندا سا لپکا اور اس کے تن بدن کو چیرتا ہوا نکل گیا

وہ انتہائی ڈراؤنی اور غیر انسانی آواز میں چیخا —

"میں عبدالکریم ولد کرم داد کنوئیں میں گر گیا ہوں۔"

اور پھر متواتر "میں عبدالکریم ولد کرم داد کنوئیں میں گر گیا ہوں" کا ورد کرنے لگا۔

تھوڑے سے وقفے کے بعد، سانپ کو گردوپیش میں نہ پا کر اسے قدرے اطمینان ہوتا اس کے سوچنے سمجھنے کی قوتوں میں ترتیب سی آ جاتی تو اسے اس بات پر بڑا تعجب ہونے لگتا کہ آخر وہ اپنے نام کے ساتھ اپنی ولدیت کا اعلان بھی کیوں کر رہا ہے۔ صرف اپنا نام لینے پر اکتفا کیوں نہیں کرتا؟ لیکن پھر جب وہ لوگوں کو مدد کے لئے پکارتا تو بے ساختہ اس کے منہ سے "عبدالکریم ولد کرم داد" نکل جاتا جیسے کنوئیں میں گرے ہوئے آدمی کے لئے اپنی پہچان کروانا انتہائی لازمی ہو

اور اپنی پہچان ولدیت کے وسیلے سے ہی ممکن ہو سکتی ہو احساس کے بغیر لوگوں کو مدد کے لئے آمادہ کرنا بالکل ناممکن ہو اور پھر جوں جوں اس کے جبڑوں میں تھکن کا زہر سرایت کرتا چلا گیا اسے اپنی ولدیت کے بغیر اپنا نام اور گرد و پیش کی ہر چیز بے معنی سی محسوس ہونے لگی ۔ اس سے قبل کبھی اسے اپنی ولدیت کا اتنی شدت کے ساتھ احساس نہیں ہوا تھا ۔ ولدیت کے بارے میں اس کا تصور بے حد سادہ تھا وہ تو بس اتنا سمجھتا تھا کہ بچوں کی صورت میں اپنی تجدید کرنے، چند بیگھے زمین محفوظ کر رکھنے اور ایک بڑا سا مکان ۔ جس کے ایک کونے میں مویشی باندھنے کا انتظام ہو، تعمیر کرنے کے بعد ولدیت کی ڈور لپیٹ ہو جاتی ہے ۔ اس کی چمک دمک ماند پڑ جاتی ہے ۔ زندگی کی سیڑھی پر ایک نئے ، اپنی ہی ذات میں نکلے ڈرامے کا آغاز ہوتا ہے ۔ پردے اٹھتے گرتے رہتے ہیں اور زندگی نئی پھوٹی شاخوں کے سرسبز لفافوں میں رواں دواں رہتی ہے ۔ لیکن اب سے یہ سب کچھ بے معنی سا لگ رہا تھا جیسے اب تک وہ ہر قسم کے مفہوم سے عاری عام زندگی بسر کرتا رہا ہو ۔ اس کے ذہن نے زندگی کے تسلسل کو کبھی قبول نہیں کیا تھا ۔ لہر کی شکستہ لکیروں کو ہی اہمیت دی تھی اور یہ اس کے ہی تصور کا نتیجہ تھا کہ چھوٹے بھائی کی شادی ہوتے ہی اس نے نئے اور پرانے مکان کے درمیان دیوار کھینچ کر اپنی ولدیت کو دو ٹکڑوں میں بانٹ دیا تھا ۔ وہ ایک طرف، اس کا بھائی دوسری طرف اور ان کا باپ! وہ گویا کبھی پیدا ہی نہیں ہوا تھا ۔ مٹی کی دیوار دونوں بھائیوں کے درمیان مخاصمت کی بنیاد تو نہ بن سکی ۔ جیسا کہ اکثر لوگوں کا خیال تھا لیکن مل کی اکائی ٹوٹ گئی اور معاشرت کی دھند نے دونوں مکانوں کو پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا ۔ اس کے بھائی اور گاؤں کے دوسرے مکانوں میں کوئی امتیاز باقی نہ رہا ۔ سب ایک ہی رنگ میں رنگے گئے ۔ زندگی کی اس بے رنگی یک رنگی سے اس نے کبھی اکتاہٹ محسوس نہیں کی تھی مگر اب جب کہ وہ لحظہ بہ لحظہ گھلتا جا رہا تھا ۔ اسے شدت کے ساتھ اپنی غلطی کا احساس ہونے لگا ۔ اس نے خواہ مخواہ اپنے باپ کے دو ٹکڑے کر دیئے تھے ۔ وہ مرنے کے بعد بھی کافی عرصے تک زندہ رہا تھا اور جب تک زندہ رہا گھر بار پر رواں دواں زندگی کا جوبن چھایا رہا ۔ لیکن دو ٹکڑے ہونے کے بعد وہ زیادہ عرصہ تک زندہ نہ رہ سکا ۔ خون کی متوازی لکیروں کو چاٹتے ہوئے موٹے موٹے سروں والے کیڑوں کو اس کی لاش تک پہنچنے میں کسی مزاحمت کا سامنا نہ کرنا پڑا ۔ اور اب اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا باپ اس کی نگاہوں کے سامنے انتہائی کسمپرسی کے عالم میں ڈوب رہا تھا ۔ جس طرح اس کا باپ دو ٹکڑے ہونے کے بعد پھر کبھی زندہ نہ ہو سکا تھا ۔ وہ بھی ایک بار ڈوبنے کے بعد دوبارہ ابھر نہ سکے گا ۔

اعترافِ گناہ کرنے والے مجرم کی طرح اس کا چہرہ ڈھلے ڈھلائے آنسوؤں سے تر بتر ہو گیا ۔ پھر اسے خیال آیا اس نے بڑی دیر سے کسی کو پکارا نہیں تھا ۔ شاید کوئی راہگیر اس دوران میں قریب سے گزر گیا ہو ۔ کنواں بڑے راستے پر واقع تھا ۔ اور اتنی رات گئے بھی اُدھر سے کسی اِکا دُکا مسافر کا گزر کچھ ایسا بعید از قیاس نہ تھا ۔

وہ پوری قوت مجتمع کرتے ہوئے چیخا ۔ "میں ولد کرم داد کنوئیں میں گر گیا ہوں"

جانے وہ پوری طرح حواس کھو بیٹھا تھا یا اس کے حواس ضرورت سے زیادہ کام کرنے لگے تھے ۔ اس بار اسے اپنی آواز بالکل کھوکھلی سی لگی ۔ اتنی کھوکھلی اور حقیر کہ شاید منڈیر تک بھی نہ پہنچ سکی ۔ "عبدالکریم" کے بغیر "ولد کرم داد" کے الفاظ اتنے ہی بے معنی اور کھوکھلے تھے جتنا کہ "ولد کرم داد" کے بغیر "عبدالکریم"۔

"میں عبدالکریم ولد کرم داد کنوئیں میں گر گیا ہوں" وہ دوبارہ سے اپنی تصحیح کرتے ہوئے چیخا گویا وہ پرائمری کا طالب علم ہو اور کسی امتحانی اہم امتحانی سوال کے جواب میں اس کی زبان لغزش کا شکار ہو گئی ہو ۔

پہلے کی طرح اب بھی اس کی پکار کنوئیں سے باہر کی تاریک فضا میں بکھر گئی ۔ مگر اب اسے اطمینان سا ہونے لگا ۔ اس کا اعتماد بحال ہو گیا ۔ اور اسے لگا ۔ جب تک اس کی زبان میں "عبدالکریم ولد کرم داد"

اداکرنے کی سکت باقی ہے اس چھوٹے سے کنوئیں کا پانی تو کیا قطبین کی ساری برف بھی اس کی شریانوں میں دوڑنے والے لہو کو منجمد نہیں کر سکتی۔

مینڈک مسلسل ٹرا رہے تھے۔ وہ بدستور مدد کے لئے۔ "میں عبدالکریم ولد کرم داد کنوئیں میں گر گیا ہوں"۔ کا واویلا مچا رہا تھا۔ ابھی تک سانپ نمودار نہیں ہوا تھا۔ مگر سانپ کا کیا تھا کسی وقت بھی پھن پھیلائے حملہ کر سکتا تھا اور اس پر مستزاد یہ کہ پانی کی خنکی میں برابر اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور اس کی اپنی قوت مدافعت اسی تناسب سے جواب دیتی جا رہی تھی۔ اس کے جسم کا پانی کے اندر والا حصہ بالکل سُن ہو چکا تھا۔ اعتماد کی سوئی کو گرنے سے بچانے کے لئے بڑی جدوجہد کرنی پڑ رہی تھی۔ ذہن کی اسکرین پر ابھر آنے والے خدشات کے دھندوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

اسے یوں لگا جیسے کچھ ہی دیر میں وہ وزنی پتھر کی مانند پانی کی تہہ میں بیٹھ جائے گا۔ اور صبح سورج کی پہلی کرن کے ساتھ عورتیں گاگریں اٹھائے پانی بھرنے آئیں گی تو سطح آب پر اس کی تیرتی ہوئی لاش زندگی کے ہر منفی و مثبت عمل سے بے گانہ ہو چکی ہوگی، اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔۔۔ وہ زندہ رہنا چاہتا تھا اس نے اب تک بے معنی اور ادھوری زندگی ہی بسر کی تھی۔ اس نے مدتوں سے بھائی کو گلے نہیں لگایا تھا۔ اس نے بھتیجے، بھتیجیوں کے سروں پر بھی ہاتھ نہیں رکھا تھا۔ انھیں لے کر بوڑھے بزرگ کی چھاؤں میں نہیں بیٹھا تھا۔ دیوان پر الٹی پلتی مار کر ان سے باتیں نہیں کی تھیں۔ باپ کے دو ٹکڑے کرنے سے قبل وہ اپنے بھائی بہنوں، بیوی بچوں کے درمیان دیوان پر بیٹھتا۔ ان کی چھوٹی چھوٹی لغزشوں پر پیار کے دودھ میں دھلی ہوئی سرزنش کرتا۔ اچھے کاموں پر ان کی پیٹھ تھپکتا۔ ان کی کامیابیوں میں شریک ہوتا۔ تو اسے ایک عجیب سا فخر کا احساس ہوتا۔ پھر تفخر کے احساس کے الجھے سلجھے سے ایک چہرہ نمودار ہوتا۔ یہ چہرہ ہوبہو اس کے باپ کا چہرہ [illegible] اسے یوں لگتا اس کا باپ اس کے چہرے کے بطن میں چھپا بیٹھا ہے یہ چہرہ صدیوں سے اس گھر میں پل پل نمودار ہوتا رہا۔ اس کے باپ، اس کے باپ اس کے باپ اور جانے کس کس کو اسی طرح دکھائی دیتا رہا۔ اور وہ اس چہرے کے شعور سے زندہ رہنے کی توانائی حاصل کرتے رہے۔ مرنے کے بعد بھی زندہ رہے۔ اپنے باپوں کی طرح اپنے بیٹوں کے عمل میں بھی جاری رہے۔ گھر کی ایک ایک اینٹ، ایک ایک پتھر کی زبان سے بولتے رہے۔ دیواروں کی باہوں کے حصار میں ایک دوسرے پر سایہ بن کر پھیلے رہے لیکن جانے کیوں اس تک پہنچتے پہنچتے یہ جذبہ سرد پڑ گیا۔ چہرے کی چمک، دمک ماند پڑ گئی۔ لہو کی لکیر ٹوٹ گئی۔ اس نے ایسا کیوں کیا؟ ایسا کیوں کیا؟ اس چہرے کو کیوں مسخ کر دیا؟ اور تب اسے پوری شدت کے ساتھ احساس ہونے لگا کہ نہ منڈیر میں کوئی خرابی تھی۔ نہ پاؤں رکھنے میں کوئی چوک ہوئی تھی اسے اس مقدس چہرے کو مسخ کرنے پر یہ سزا ملی تھی۔

کنوئیں کا یخ بستہ پانی، مینڈکوں کی خوفناک، پُراسرار آوازیں اور ان آوازوں کی کوکھ سے جلد یا بدیر برآمد ہونے والا سانپ اس سزا کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے والے مختلف کردار تھے۔ وہ اس جان لیوا عذاب کے بھنور میں پوری طرح گھر چکا تھا اور اس کے لاشعور نے اس کے شعور، اور اس کے جسم نے اس کے ذہن سے بہت پہلے اس عذاب کی وجوہات کا کھوج لگا لیا تھا۔ اور اس کنوئیں میں گرتے ہی اس کی زبان نے پوری صدق دلی کے ساتھ اپنی ولدیت کا اقرار کر لیا تھا اپنی پہچان کا منبع دریافت کر لیا تھا۔

اچانک مینڈکوں نے ٹرانا بند کر دیا اور سارے کنوئیں میں بڑی خوشگوار خاموشی پھیل گئی۔ اب تک اس کی نگاہیں کنوئیں کی تاریکی سے مانوس ہو کر کچھ کچھ دیکھنے کے قابل ہو گئی تھی اس نئی تبدیلی پر وہ قدرے سکون سا محسوس کرنے لگا۔ کم از کم سانپ بے خبری میں تو حملہ نہ کر سکے گا۔ اسے اپنی مدافعت کے لئے کچھ تو موقع مل جائے گا۔

عین اسی وقت اسے سیاہ جسم والا ناگ دیوار کے ایک شگاف سے جھانکتا دکھائی دیا۔ اس نے ناگ کو کنوئیں کی منڈیر سے کئی بار دیکھا تھا اور کنوئیں کے مینڈکوں ہی کی طرح اس پر

بھی کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی۔ بس ایک بڑا سا غیر معمولی زہریلا کیڑا ہی سمجھا تھا۔ لیکن اب اپنے بالکل سامنے، اس حالت میں دیکھ کر کہ کسی وقت بھی وہ اس پر حملہ کر سکتا تھا۔ یہ سانپ اسے تاریک خلا سے بھی زیادہ بھیانک اور پُراسرار لگا۔ دونوں ایک دوسرے کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگے۔

اچانک سانپ میں عجیب و غریب تبدیلیاں پیدا ہونے لگیں پہلے اس کا پھن پھیلا پھر پھن میں بے شمار چھوٹے چھوٹے سر اگ آئے۔ ہر سر میں دو دو روشن چمکیلی آنکھیں اور ایک ایک زہر آلود لہراتی زبان تھی۔ اور ہر زبان میں جیتے جاگتے مینڈک پروئے ہوئے تھے۔

وہ بے اختیار چیخ اٹھا۔ اعتماد کی سوئی تیزی سے گرنے لگی۔ یک لخت سانپ بل سے باہر آگیا۔ اور بڑی سرعت کے ساتھ اس کے اردگرد پانی کی سطح پر ایک چکر کاٹا۔

وہ جانتا تھا سانپ پانی میں منہ نہیں کھولتا۔ اس نے لمبا سا سانس لیا اور پانی میں ڈبکی لگا دی۔

اسے اپنی داد فریاد کی ناکامی پر بے حد تعجب ہونے لگا۔ کنواں آبادی سے کچھ زیادہ دور نہیں تھا۔ تین چار کھیتوں کے بعد آبادی شروع ہو جاتی تھی۔ پہلا گھر اس کے باپ کے دوست بابا فضلو کا تھا۔ دونوں ایک ساتھ پلے بڑھے۔ زندگی بھر ساتھ ساتھ رہے ایک ساتھ فوج میں بھرتی ہوئے۔ ایک ساتھ پنشن پر آئے۔ اور اس دن جب اس کا باپ بابا فضلو اور ان سب کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھوڑ گیا تھا۔ بابا فضلو کی حالت دیدنی تھی۔ نہ آنکھ میں آنسو، نہ ہونٹوں پر آہیں۔ گم سُم لگتا تھا وہ خود مر گیا ہو۔ بابا فضلو۔ اس کے باپ کے جگری دوست کو علم ہو جائے کہ عبدالکریم یوں ڈوب رہا تھا تو وہ اسے بچانے کے لئے جان کی بازی تک لگا دے۔ اس کے گھر کے ساتھ ہی اس کے باپ کی منہ بولی بہن کا گھر تھا۔ اسے اس کا باپ ہی دور کے گاؤں سے بیاہ لایا تھا۔ بیاہ کے چند برسوں بعد ہی وہ بیوہ ہو گئی۔ اولاد تھی نہیں۔ میکے والوں نے واپسی کی تحریک چلائی مگر اس نے دو ٹوک انکار کر دی "کرم داد میرا بھائی ہے" بھائی کے پڑوس کو چھوڑ کر بہن بھلا کہاں جائے؟

اسے اپنے باپ کی وسعت کا بھرپور احساس ہونے لگا۔ رشتوں کی بند گٹھڑیاں ایک ایک کر کے کھلنے لگیں اور ہر گٹھڑی میں اسے اپنے باپ کی نئی، وسیع تر صورت ہی دکھائی دی۔ اگلا مکان اس کے باپ کے دوست بابا جانے کے بیٹے کا، اور اس کے ساتھ عبدالرحیم ولد کرم داد۔ اس کے چھوٹے بھائی کا گھر تھا۔ اور پھر خود عبدالکریم ولد کرم داد کا گھر تھا۔ اور اس کے ساتھ اس کے باپ کے باپ کے بیٹوں پوتوں کے گھر تھے۔ گاؤں کے ہر مکان کے منڈیر پر اسے اپنا باپ کسی نہ کسی شکل میں بیٹھا دکھائی دیا۔ اور پھر یہ سلسلہ آبادی سے باہر قبرستان کی ہر قبر کی لوح پر کندہ الفاظ۔ اور ان سے بھی پرے گاؤں میں داخل ہونے اور باہر نکلنے والے رستوں تک جا پہنچا تھا لیکن رشتوں کے اس سلسلہ کو مکمل کرنے والی ایک اہم کڑی غائب تھی اور جب وہ اس کڑی کی ٹوٹی ہوئی کڑیاں جوڑنے کی کوشش کرتا تو دو گھروں کو ایک دوسرے سے جدا کرنے والی کچی دیوار پر سولی نصب ہو جاتی۔ اور پھر دو ٹکڑوں میں بٹی ہوئی لاش اس پر لٹک جاتی۔ جس کے عین نیچے خون کی دو متوازی لکیریں اور بڑے سر والے کیڑے بڑی تیز رفتاری کے ساتھ ان لکیروں کو چاٹتے ہوئے لاش کی طرف بڑھتے دکھائی دیتے۔ اس کے تن بدن پر کپکپی چھا جاتی۔ اس کا سر ندامت سے جھک جاتا۔ لیکن عین اسی وقت لاش کے دونوں ٹکڑوں میں حرکت پیدا ہونے لگتی اور دونوں ٹکڑے آہستہ آہستہ ایک دوسرے کی طرف بڑھنے لگتے۔ تب اسے بے انتہا خوشی ہوتی۔ اس کا باپ مرا نہیں تھا۔ اس کا خیال غلط تھا۔ وہ ابھی تک زندہ تھا۔ صرف اس کا چہرہ مسخ ہوا تھا۔ یہ چہرہ خود اس نے مسخ کیا تھا۔ اور اب اسے دوبارہ اپنی اصلی حالت میں لوٹانے کی ذمہ داری بھی اسی پر عائد ہوتی تھی وہ ضرور اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو گا۔

اس کا اعتماد آہستہ آہستہ بحال ہونے لگا۔ کنوئیں سے باہر اسے قریب میں رشتوں، قرابتوں کا اس قدر وسیع جال پھیلا ہوا تھا۔ اور اس وسیع جال میں اس کے باپ کو مرکزیت کا درجہ حاصل تھا۔ وہ کبھی نہیں ڈوب سکتا۔ کنوئیں کا پانی ابھی

ساری خشکی کے باوجود اسے مفلوج نہیں کر سکتا۔ کالا ناگ اور تاریکی خلا کی مانند پھیلا ہوا اس کا خوفناک پُراسرار پَن اور اس میں اُگی ہوئی ان گنت چمکیلی آنکھیں، اور زہر آلود زبانوں میں پروئے ہوئے مینڈکوں کا دو زرخ۔ کنوئیں کی بڑی سے بڑی مصیبت بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ پھیرا اُٹھائے ہجوم میں وہ تنہا نہیں تھا۔ اس کا باپ بھی اس کی بے گناہی کی گواہی دینے کے لئے موجود تھا۔ اس کے باپ کی ہزاروں بانہوں نے اسے اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ اس کا باپ کنوئیں سے باہر اور اندر ایا بنے کٹے ہوئے جسم کے باوجود، اس کی رگوں میں خون بن کر دوڑ رہا تھا۔ اور اس کی رگوں میں دوڑنے والے لفظوں کی ندی افق سے پھوٹ نکلنے والی چاندنی کی طرح ہزاروں صدیوں پر پھیلی ہوئی تھی اور اس ندی کے ایک ایک قطرہ پر بڑی جاندار داستانیں رقم تھیں جن کا ایک ایک حرف قطبی تارے کی مانند دمک رہا تھا۔

اس نے پورے اعتماد کے ساتھ پانی کے باہر سر نکالا اور پوری قوت کے ساتھ چیخا "میں عبدالکریم ولد کرم داد ہوں"

اس نے نہ تو پانی میں دوبارہ ڈبکی لگائی اور نہ ہی اپنی پکار کے دوسرے حصے "کنوئیں میں گر گیا ہوں"، کو دہرانا ضروری سمجھا۔ اب کے اپنی پکار کا دوسرا حصہ اسے کچھ غیر ضروری سا لگا۔ اس کی آواز بھی خاصی بدلی ہوئی تھی جیسے اس نے کسی کو مدد کے لئے پکارنے کی بجائے صرف اپنے آپ پر بھروسہ کرتے ہوئے خطرہ کے مقابلہ میں نعرہ لگایا ہو۔ اور پھر وہ بار بار "میں عبدالکریم ولد کرم داد" کے نعرے لگانے لگا۔ سانپ کہیں پانی میں روپوش ہو چکا تھا صرف پانی کی سطح پر ہلکی ہلکی سی لکیریں رہ گئی تھیں۔ شاید سانپ نے اسے تاکنے کی کوشش میں متعدد چکر کاٹے تھے۔

"کون؟ کون ہو تم؟" اچانک کسی نے کنوئیں کی منڈیر سے آواز دی۔

"میں ― میں عبدالکریم ولد کرم داد ہوں" اس نے پھولے ہوئے سانس کے ساتھ جواب دیا۔

باہر سے ہلکا سا قہقہہ گونجا "ارے! تم کریم ہو"

"ہاں۔ میں عبدالکریم ولد کرم داد ہوں۔"

جواب میں طنزیہ قہقہہ اور موٹی سی گالی کے ساتھ ڈوبتی ہوئی آواز میں اسے سنائی دیا "سالا۔ جیسے عدالت میں کھڑا حلفیہ بیان دے رہا ہے۔"

اور پھر چند ہی لمحوں میں کنوئیں سے باہر، اس کا باپ اپنے مختلف رشتوں اور قرابتوں کے رنگ روپ میں آن موجود ہوا۔ کنوئیں میں ٹوکرا پھینکا گیا اور جھڑکی دینے کے سے انداز میں اسے ٹوکرے میں بیٹھنے کی ہدایت کی گئی۔ وہ بدستور "میں عبدالکریم ولد کرم داد" کے نعرے لگاتے ہوئے ٹوکرے میں بیٹھ گیا۔ اسے طنزیہ مسکراہٹوں کی برسات میں ٹوکرے کو کھینچ کر باہر نکالا گیا اس نے باہر قدم دھرتے ہی گرد و پیش میں نگاہیں دوڑاتے ہوئے پوچھا "عبدالرحیم ولد کرم داد کہاں ہے؟"

مجمع سے فلک شگاف قہقہہ بلند ہوا اور اس سے قبل کہ اس کا بھائی اس کے قریب آتا وہ دوزانو ہوتے ہوئے سجدہ میں گر گیا اور پھر بڑی دیر بعد سر اٹھاتے ہوئے بھیگی پلکوں کے ساتھ دعائیہ لہجہ میں بولا۔

"مولا تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے تو نے عبدالکریم ولد کرم داد کو کنوئیں سے نجات دلائی۔ اللہ تیرا لاکھ لاکھ۔"

اس بار مجمع سے کوئی طنزیہ قہقہہ بلند نہ ہوا۔ وہ سب حیران حیران نظروں سے اس کے چاروں طرف پھیلے ہوئے روشنی کے اجنبی ہالے کو دیکھنے لگے۔

بقیہ: پیشاب گھر آگے ہے

نہیں نہیں یہاں پر اسی جگہ پیشاب گھر بنانا ہے؟

آگے ہے آگے۔

نہیں نہیں ابھی ابھی ٹھیک اسی مقام پر پیشاب گھر کہاں ہے۔

آگے ہے آگے۔

نہیں نہیں میری خلائی کے بٹنوں سے بالکل جڑا ہوا پیشاب گھر کہاں ہے؟

آگے ہے آگے۔

دو بچوں کے درمیان
تین سال کا وقفہ رکھیے

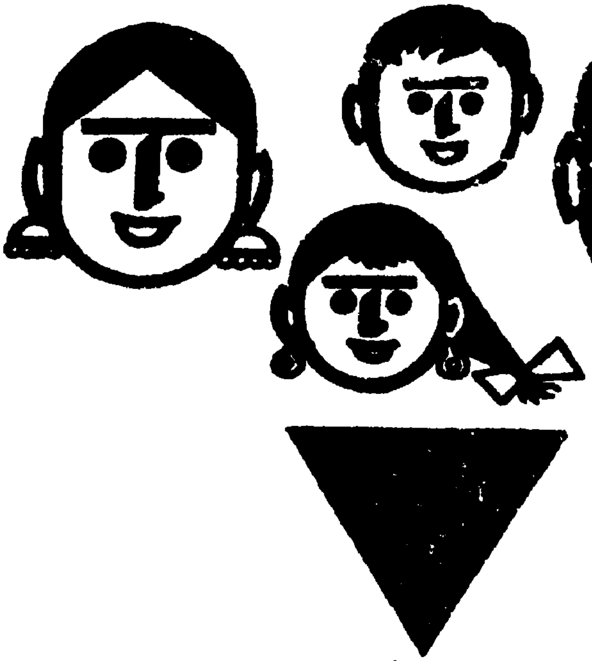

نرودھ کاپر ٹی کھانے کی گولی

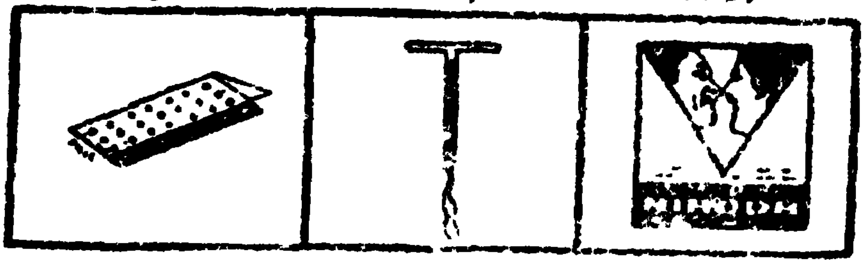

کوئی بھی طریقہ اپنائیے

davp 84/475

کیا آپ گلے کی تکلیفوں میں اکثر مبتلا رہتے ہیں اور اس کی وجہ سے سخت پریشان ہیں، لیکن یہ نہ سمجھئے کہ ایسی پریشان کن بیماری سے گلا کاٹ دینے سے ہی چھٹکارا مل سکتا ہے۔ ذرا ٹھہریئے! خالص دیسی ادویات سے تیار کیا ہوا "ٹونسلیکس" ایک بار، صرف ایک بار استعمال کر کے تو دیکھئے، پھر آپ کو گلے کے غدود بڑھ جانے، گلے کی سرسراہٹ، خراش، گلے کے ورم، زخم اور دوسرے تمام امراض کی شکایت نہیں رہے گی۔ اگر آپ کے علم میں کوئی ایسا مریض ہو جس کے گلے کے غدود (ٹانسلائٹس) کا آپریشن ہونا ہے تو اسے اس دوا کے بارے میں ضرور بتائیے کیونکہ پھر اسے آپریشن کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ چھوٹے بچے جو میٹھی میٹھی چیزیں کھا کر گلا خراب کر لیتے ہیں، ان کے لئے بھی یہ بہت کام کی دوا ہے۔ ہر گھر میں اس کا رہنا بہت ہی ضروری ہے۔

—— شرع (یونانی اینڈ آیورویدک) لیبارٹریز، لال کنواں، دہلی ۱۱۰۰۰۶

Phone: 275602

Regd·No D- (DN) 353

THE SHAN-E-HIND MONTHLY NEW DELHI-110002

APRIL 1985

Regd. with the Registrar of Newspaper at R. No. 644 57

خرید کر پڑھیے :

مانگ کر پڑھیے :

یا پھر

چوری کر کے پڑھیے

یہ ہے ہی اتنا خوب صورت ،

اتنا دل کش ،

اتنا مکمّل کہ اسے کسی طرح بھی

حاصل کریں کیوں کہ

یہ فیضؔ کی شخصیت اور فن پر ایک

شان دار ادبی دستاویز ہے ۔ اس میں شامل ہیں :

قیمت : پندرہ روپے

★ خلوت اور جلوت کے بھید کھولنے والے ذاتی نقوش ۔

★ نادر و نایاب تصویریں ۔

★ سدا بہار ، ہزار رنگ و منتخب کلام ۔

★ فیضؔ کی شخصیت کے وہ ڈھکے چھپے گوشے جن پر سے پہلی بار پردہ اُٹھایا گیا ہے ۔

★ ہندوستان ، پاکستان ، روس اور انگلستان کے دانش وروں کی مشترکہ کاوشوں کا گلدستہ ۔

ساری اُردو دنیا میں شبستان کے "فیض نمبر" کا چرچا ہے

اس سے پہلے کہ اسٹاک ختم ہو جائے آج ہی اپنے قریبی نیوز ایجنٹ سے طلب کیجیے یا براہِ راست ہم سے منگوائیے۔

شبستان اردو ڈائجسٹ آصف علی روڈ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

شانِ ہند

نئی دہلی

ایڈیٹر

سرور تونسوی

27 JUN 199
Dr. Zakir Husain Library
Jamia Nagar
J. M. I. New Delhi

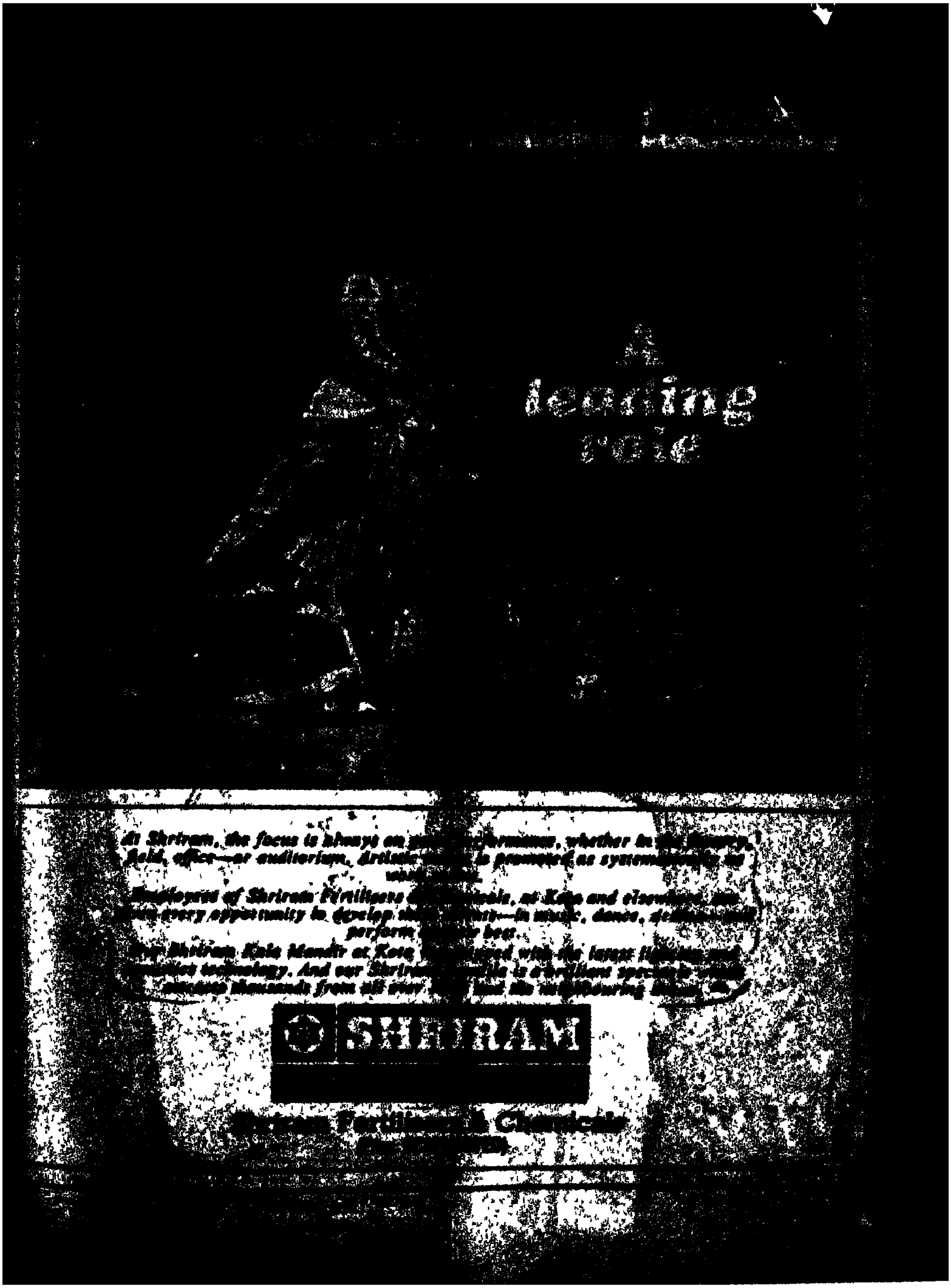
A
leading
role
SHRIRAM

ٹیلیفون نمبر ۲۷۵۶۰۲ | رجسٹرار آف نیوز پیپرز فار انڈیا کا رجسٹریشن نمبر ۵۷ / ۴۴۴۶ | رجسٹرڈ نمبر ڈی ۳۵۳ /ڈی

ہندو پرست ہوں نہ مسلمان پرست ہوں
دامن پرست ہوں نہ گریبان پرست ہوں
ہر ذرۂ وطن سے ہے فیاضؔ مجھ کو پیار
یعنی وطن پرست ہوں انسان پرست ہوں
فیاضؔ گوالیاری

ماہنامہ
شانِ ہند
نئی دہلی

ایڈیٹر
سرور تونسوی

فی پرچہ - ۲/۵۰ روپے
زرسالانہ - ۲۴/ روپے

جلد نمبر ۴۶ | مئی ۱۹۸۵ء | شمارہ نمبر ۵

الحاج حافظ یوسف دہلوی صاحب کا انتقال

دینی - ادبی، علمی، تعلیمی سماجی، قومی اور فلمی حلقوں میں یہ اطلاع یقیناً باعث صد ہزار افسوس ہوگی کہ ۴ مئی ۸۵ء مطابق ۱۳ رمضان المبارک بروز جمعہ سہ پہر کو "شمع" گروپ کے سربراہ اور ماہنامہ "شمع" اور شمع گروپ کے دیگر رسائل کے مدیر اعلیٰ عالیجناب الحاج حافظ محمد یوسف دہلوی کا انتقال ہوگیا - انا للہ وانا الیہ راجعون -

گزشتہ نصف صدی میں حافظ صاحب موصوف نے اُردو زبان کی جو خدمت کی وہ بڑی بڑی یونیورسٹیاں اور ہزاروں ادارے بھی نہ کر سکے - اُردو زبان کی تاریخ میں یہ واحد اور مسلمہ سچائی ہے کہ تمام روئے زمین پر جہاں بھی کوئی اُردو پڑھنے والا موجود تھا ماہنامہ "شمع" نے وہاں اُردو کے سفیر کی حیثیت سے اپنی روشنی پھیلانے میں مقدور بھر کوشش کی اور آج اس حقیقت کو جھٹلایا نہیں جا سکتا کہ اُردو ماہنامہ "شمع" اپنی اشاعت اور مقبولیت کے لحاظ سے اپنا ثانی نہیں رکھتا - حافظ صاحب دہلوی کے انتقال پُر ملال سے مدیر "شانِ ہند" اپنے ایک ایسے مُربی اور سرپرست سے محروم ہوگیا جس کی مثال ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتی -

عزیزانِ گرامی یونس دہلوی، ادریس دہلوی اور الیاس دہلوی نیز حافظ صاحب کے دیگر تمام لواحقین سے ادارہ شانِ ہند اظہار تعزیت کرتا ہے اور دُعا ہے کہ خدائے قادر مطلق حافظ یوسف دہلوی صاحب کے فرزندان ارجمند کو اپنی امان میں رکھے اور اس صدمہ کے برداشت کرنے کی توفیق عطا فرمائے - (آمین) - ماہنامہ شانِ ہند کی آیندہ اشاعت میں مرحوم حافظ صاحب سے متعلق یادوں پر مبنی سلسلہ یہ کوشش یار بے اندازہ تحریر کردہ مستقل عنوان کے تحت ملاحظہ فرمایئے - فقط

دلِ سوگوار
دو ماہر کاش سرور تونسوی

بلبل چہ گفت؟ گل چہ شنید؟ وصبا چہ کرد؟

دلی اُردو اکاڈمی کے سالانہ بجٹ میں تین گنا اضافہ

دلی اُردو اکاڈمی کے ایوارڈ دیتے وقت جناب ایم۔ ایم ولی صاحب لفٹیننٹ گورنر دلی نے فرمایا کہ دلی اُردو اکاڈمی کا ۱۹۸۴-۸۵ء کا سالانہ بجٹ دس لاکھ روپیہ تھا مگر اس میں پانچ لاکھ کا اضافہ کر دیا گیا تھا مگر اب سال ۱۹۸۵-۸۶ء کے لئے اس کا بجٹ تیس لاکھ روپے کر دیا گیا ہے۔

دلی کے ہر اُردو دوست کو خوش ہونا چاہئے کہ حکومت دلی اُردو کی بقا و حیات کے لئے کسی قسم کی مالی کنجوسی نہیں دکھا رہی بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جس قدر رقم اس سال دلی اُردو اکاڈمی کے لئے منظور کی گئی ہے شاید کسی دوسرے صوبے کی اُردو اکاڈمی کے لئے اتنی رقم منظور نہیں کی گئی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ دلی اُردو اکاڈمی نے اپنی سرگرمیوں کے باعث حکومتِ دلی اور دلی کے عوام پر ثابت کر دیا کہ وہ اپنے فرائضِ منصبی کو بطریقِ احسن انجام دے رہی ہے۔ اس سلسلے میں "شانِ ہند" کی اشاعت ماہِ مارچ میں تفصیلی طور پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

جناب ایم۔ ایم۔ ولی صاحب کے اس اعلان کے بعد اُردو اکاڈمی دلی پر اور بھی ذمہ داری عائد ہو گئی ہے کہ وہ اب ایسے کارہائے نمایاں انجام دے کہ حکومتِ دلی کے علاوہ عوام بھی یہ کہنے پر مجبور ہو جائیں کہ واقعی اُردو اکاڈمی دلی نے حکومت کی فراخدلانہ امداد کو اُردو کے لئے خرچ کر کے قابلِ تعریف کام انجام دئے ہیں۔

بے شک دلی اُردو اکاڈمی کے ممبران اور سکریٹری صاحب اس بات کا خاص خیال رکھیں گے کہ ان پر جو اعتماد حکومت نے کیا ہے اسے کسی طور بھی زک نہ پہنچے۔ اس کے باوجود ہر اُردو پرست کا حق ہے کہ وہ دلی اُردو اکاڈمی کو ایسے سجھاؤ دے جو واقعی اُردو کے لئے مفید ہوں لہٰذا اس ضمن میں "شانِ ہند" بھی لب کشائی کی جرأت کر رہا ہے

امید ہے کہ شانِ ہند جس اعتماد اور خلوصِ نیت سے چند معروضات پیش کر رہا ہے اُردو اکاڈمی کے ارکان بھی وسعتِ قلب و کشادہ دلی سے اسی نظر سے دیکھیں گے

اولین گزارش تو یہ ہے کہ ہمارے چیف ایگزیکیوٹو کونسلر جناب جگ پرویش چندر صاحب نے فرمایا تھا کہ اردو اکاڈمی کو ایک ایسی ڈائرکٹری شائع کرنی چاہئے جس میں ہر ایسے کتب فروش کا مکمل پتہ ہو جو اُردو کی کتابیں فروخت کرتا ہے ہر ایسی لائبریری کا نام اور پتہ ہو جس میں اُردو کتابیں موجود ہیں اور یہ لائبریری اُردو کتب خریدتی ہو ہر ایسے کالج اور یونیورسٹی کا نام اور پتہ بھی اس ڈائرکٹری میں ہونا ضروری ہے جس کی لائبریری میں اُردو کتب خریدی جاتی ہوں اور وہاں اُردو پڑھائی جاتی ہو۔ تاکہ اس ڈائرکٹری سے اُردو کی کتابوں کی نکاسی ہو سکے

جناب جگ پرویش چندر صاحب کے اس فرمان پر جناب شریف الحسن صاحب نقوی سکریٹری اردو اکاڈمی دلی نے اعلان کیا تھا کہ اس مالی سال میں ایسی ڈائرکٹری یقیناً شائع کی جائے گی خدا کرے کہ ایسا ہو مگر نقوی صاحب کی خدمت میں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ ممبران اُردو اکاڈمی میں اکثریت ایسے حضرات کی ہے جو اس کام کو انجام دینے کی اہلیت نہیں رکھتے لہٰذا انھیں اکاڈمی کے کچھ ممبران کے علاوہ دیگر افراد کی امداد بھی لینی ہو گی۔ اور اس ڈائرکٹری کو بہترین طور پر مکمل اور مفصل شائع کیا گیا تو یہ ڈائرکٹری کئی ہزار کی تعداد میں فروخت ہو سکے گی اکاڈمی اگر اسے کاروباری انداز سے شائع کرے تو اسے مالی فائدہ بھی ہو گا۔

دوسری عرضداشت اُردو اکاڈمی کی مرکزی لائبریری کے سلسلے میں ہے۔ کیونکہ اب اکاڈمی کے پاس اتنا روپیہ ہے کہ وہ اُردو کی

بہترین کتابیں مرکزی لائبریری کے لئے خریدنے کی سکت رکھتی ہے۔ اب تو یہ طریق کار رہا ہے کہ سیکڑوں بہترین کتابیں یہ کہہ کر واپس کر دی گئی ہیں کہ یہ لائبریری میں موجود ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ اگر اکادمی کا کوئی ممبر رکن اس سلسلے میں ثبوت چاہئے تو مہیا کیا جا سکتا ہے کہ کئی بہترین کتابیں یہ کہہ کر واپس کر دی گئیں کہ یہ کتابیں پہلے سے لائبریری میں موجود ہیں حالانکہ حقیقت اس کے خلاف ہے۔ مرکزی لائبریری کو ایسا ہونا چاہئے کہ کوئی بھی سکالر اپنی ضرورت کی اُردو کتاب اس لائبریری سے حاصل کر سکے۔ اگر محض ایک لاکھ روپیہ بھی اس ضمن میں (صرف مرکزی لائبریری پر) ہر سال خرچ کر دیا جائے تو قریب قریب اُردو کی ہر بہترین اور مفید کتاب جو اس وقت بازار میں میسر ہو گی خریدی جا سکتی ہے۔

۳۔ اگر مدھیہ پردیش اُردو اکادمی، مہاراشٹر اُردو اکادمی اور یو پی اُردو اکادمی اُردو کی بہترین اور مفید مطلب کتابیں شائع کر سکتی ہیں تو کیا وجہ ہے کہ دلی اُردو اکادمی اس ضمن میں خاموش رہے۔ یو۔پی اُردو اکادمی نے تو دو صد سے زائد ایسی کتابیں شائع کی ہیں کہ جن سے ہندوستان میں اُردو پھر سے زندہ ہو گئی ہے حالانکہ مدھیہ پردیش اور مغربی بنگال اُردو اکادمیوں کے بجٹ دلی اکادمی سے کم ہیں اگر یہ اکادمیاں یہ خدمت انجام دے سکتی ہیں تو دلی اُردو اکادمی کے لئے تو اب ذرائع کی کوئی کمی نہیں ہے لہذا اسے بھی ایسی اُردو کتابیں شائع کرنی چاہئیں جو واقعی اُردو کی آبرو ہوں۔ اس ضمن میں یہ احتیاط ضروری ہے کہ خویش پروری۔ دوست نوازی اور اقربا پروری سے اجتناب کیا جائے۔

۴ ـــ اُردو کے ماہنامے جو خالص طور پر اُردو کی خدمت کر رہے ہیں علمی، ادبی، روحانیات اور جاسوسی سیاست وغیرہ سے پاک ہیں ...۰۰ ... بند ہو رہے ہیں۔ اس ضمن میں سب سے پہلے جہار اختر اردو اکادمی نے رسائل کو جہار اختر کی اچھی لائبریریوں میں اکادمی کی طرف سے جاری کرنا شروع کیا۔ چنانچہ شان ہند بھی جہار اختر کی اکثر ... لیا ... جہار اختر اُردو اکادمی کی طرف سے خریدا گیا۔ اسی طرح اتر ناٹک اُردو اکادمی نے اردو کے ماہناموں کو مالی مدد دی جیسے ادب ... شاعر بمبئی کو بھی ... مدد دی گئی۔ چنانچہ دلی اُردو اکادمی کو اُردو کے ایسے ماہناموں کی طرف خصوصی توجہ مبذول کرنی چاہئے جو واقعی اُردو کی بے لوث خدمت کر رہے ہیں۔ اس سال جہار اختر اُردو اکادمی نے بھی رسائل کی مالی مدد کی ہے۔

۵ ـــ لال قلعہ کا مشاعرہ یا جو بھی اچھا مشاعرہ اُردو اکادمی کی جانب سے منعقد ہو اس کی رُوداد اور مشاعرہ میں سنایا گیا شعرائے کرام کا کلام مع تصویر ہر سال گلدستہ کی شکل میں شائع کیا جائے اور اس کی مناسب قیمت رکھی جائے۔ ہر گلدستہ کی ایک صد جلدیں شان ہند تاجرانہ نرخ پر خرید سکے گا۔ پچھلے سال اُردو اکادمی نے جو گلدستہ شائع کیا تھا اسے خریدنے کے لئے دفتر شان ہند میں کئی فرمائشیں موصول ہوئیں مگر اس کا کیا علاج کہ یہ گلدستہ محض مفت تقسیم کے لئے مخصوص کر دیا گیا اور جن لوگوں تک اسے پہنچنا چاہئے تھا وہ محروم رہ گئے جب کہ وہ اس کی مناسب قیمت بھی ادا کرنے کو تیار تھے۔

۶ ـــ دلی کے سینئر سکنڈری سکولوں کی لائبریریوں اور مرکزی لائبریری اُردو اکادمی کے لئے دلی اردو اکادمی تیس تیس کی تعداد میں کچھ کتابیں خریدتی ہے نہ معلوم ان کتب کا انتخاب کرتے وقت کون کون سی پابندیوں کا لحاظ رکھا جاتا ہے اور وہ کون حضرات ہیں جو ان کتابوں کا انتخاب فرماتے ہیں مگر یہ کہنے میں کوئی خدشہ نہیں کہ ان کتب کا انتخاب کرتے وقت یقیناً دھاندلی سے کام لیا جاتا ہے اور اقربا نوازی نیز بد دیانتی کو بروئے کار لایا جاتا ہے۔ ہائر سکنڈری کے طلبا تو درکنار ان کے اساتذہ کرام بعض کتب کے ناموں کے لغوی معنی بتانے سے معذور ہیں جو کہ ان لائبریریوں کے لئے خریدی گئی ہیں۔ ادارہ شان ہند قریباً ایک صد ایسی کتابوں کی فہرست مرتب کر کے اُردو اکادمی کو بھجوا رہا ہے جو واقعی سکنڈری سکولوں کے طالب علموں اور ان کے ٹیچرز کے لئے مفید ہیں اور یہ فہرست اس وثوق سے ترتیب دی جا رہی ہے کہ اُردو اکادمی دلی کا کوئی بھی ممبر کسی ایک کتاب کے بارے میں بھی یہ کہنے کی ہمت نہ کر سکے گا کہ وہ ان طالب علموں یا ان کے ٹیچرز کے لئے مفید نہیں ہے۔ اس مرتبہ یہ کتابیں جو اس وقت ترقی اُردو بورڈ کو یقیناً بڑی حد تک نوازا گیا ہے۔

۷ ـــ اُردو اکادمی دلی نے بھی کتابت سکھانے کا سکول کھول رکھا ہے۔ اُردو کتابت سکھانے کے لئے اسکول خواہ وہ ترقی

اُردو بورڈ کی جانب سے جاری کئے گئے ہوں یا مختلف صوبوں کی اُردو اکاڈمیوں کی جانب سے شروع کئے گئے ہوں دراصل اُردو کتابت کی قدیم اور مسلّمہ روایات کو مٹانے کی ایک ناپاک کوشش ہے۔ ان سکولوں میں کتابت لیتھو کی بجائے آفسیٹ سکھائی جاتی ہے جس میں حروف کی نوک پلک سنوارنے کی طرف قطعاً دھیان دینے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی جاتی کیونکہ آفسیٹ کتابت کی جب فلم تیار ہوتی ہے تو اس کی چھپائی اپنے آپ صاف آتی ہے۔ اُردو اکاڈمیوں اور ترقی اُردو بورڈ والوں کے پاس سرکاری روپیہ ہوتا ہے لہٰذا وہ چوہدوں کا مال اور لاٹھیوں کے گز کے مصداق جس قدر چاہے فضول خرچی کرلیں مگر عام طور پر اُردو کتابوں کو شائع کرنے والے ناشر جو چند سرمایہ داروں کو چھوڑ (کر) اور اُردو رسائل و اخبارات کے ادارے آفسٹ کی گراں کتابت کے متحمل ہو ہی نہیں سکتے۔ اب عام طور پر اُردو کی کتابیں اڑھائی صد اور پانچ صد کی تعداد میں چھپنی شروع ہو گئی ہیں اور اُردو کے رسائل و جرائد کی اکثریت بھی محدود اشاعت ہی رکھتی ہے۔ لہٰذا اس قدر کم اور محدود اشاعت میں شائع ہونے والی کتب۔ رسائل اور جرائد اتنی سکت ہی نہیں رکھتے کہ آفسٹ کی کتابت کا بوجھ برداشت کرسکیں۔ اور بازار میں لیتھو کی کتابت کرنے والے کاتبوں کا کال ہے اگر کوئی پرانا کاتب لیتھو کی کتابت کرنے پر رضامند بھی ہو جاتا ہے تو وہ اُجرت آفسٹ کتابت کے تناسب سے مانگتا ہے یعنی دوسرے لفظوں میں آفسٹ کتابت نے لیتھو لکھنے والے کاتبوں کو بھی یہ راستہ دکھا دیا ہے کہ وہ لیتھو کی بجائے آفسٹ کی کتابت کریں کیونکہ اس میں اُجرت زیادہ ملتی ہے اور محنت کم کرنی پڑتی ہے۔ کتابت کے یہ سکول کھولنے والوں میں سے کیا کوئی یہ بتا سکے گا کہ اڑھائی صد پانچ صد کی تعداد میں چھپنے والی کتابوں اور کم تعداد میں چھپنے والے رسائل و جرائد کس طرح آفسٹ کتابت اور پرنٹنگ کے اخراجات برداشت کرسکیں گے۔ کیونکہ کم سے کم پانچ ہزار کی تعداد میں کوئی کتاب یا رسالہ وغیرہ شائع ہو تو وہ آفسٹ کی کتابت اور آفسٹ پرنٹنگ کے اخراجات برداشت کرسکتا ہے۔ اگر واقعی اُردو کو زندہ رکھنا ہے تو لیتھو کتابت کو زندہ رکھنا ہی ہوگا اگر ترقی اُردو بورڈ۔ ساہتیہ اکاڈمی اور نیشنل بک ٹرسٹ اور کچھ سرمایہ دار ادارے ہی زندہ رہ سکتے ہیں دوسرے چھوٹے چھوٹے ادارے اور رسائل و جرائد ختم ہو جائیں گے اس لئے ہماری مؤدبانہ گزارش ہے کہ اُردو اکاڈمی لیتھو کتابت کو زندہ رکھنے کے لئے اکاڈمی کے زیر تحت چلنے والے اُردو کتابت سکول میں بجائے آفسٹ کتابت کے اُردو لیتھو کتابت سکھانے کا انتظام کرے۔ دلی اُردو اکاڈمی کے زیر اہتمام چلنے والے اُردو کتابت سکول کے انچارج جناب حافظ صاحب لیتھو کتابت کے بہترین استاد ہیں وہ یہ خدمت بخوبی انجام دے سکتے ہیں۔

پچھلے دنوں ترقی اُردو بورڈ نے ایک سیمینار کیا تھا جس میں ملک کے اُردو پبلشرز کو مدعو کیا گیا تھا۔ اس سیمینار پر کئی ہزار روپیہ برباد کر دیا گیا اور ہمیں افسوس ہے کہ کسی بھی اُردو پبلشر نے لیتھو کتابت کے بارے میں ایک لفظ تک بھی نہ کہا۔ اُردو ترقی بورڈ کا کیا۔ وہ چاہے تو آفسٹ کتابت کی بجائے بلاک بنوا کر بھی کتابیں شائع کرسکتا ہے کیونکہ عوامی روپیہ سرکار نے اس کے ہاتھ میں دے رکھا ہے وہ جس طرح چاہے برباد کرسکتا ہے مگر سوچنا تو یہ ہے کہ کیا اُردو ترقی بورڈ۔ ساہتیہ اکاڈمی یا نیشنل بک ٹرسٹ ہندوستان میں اُردو کو زندہ رکھ سکے گا؟

اس سلسلے میں ہم وزیر تعلیم سے بھی یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ وہ ان تینوں اداروں کو یہ ہدایات جاری کریں کہ اردو کی تمام کتابیں لیتھو پرنٹنگ میں شائع کی جائیں۔ اس سے کتابوں کی پرنٹنگ پر یقیناً بہت کم روپیہ صرف ہوگا اور کتابیں کم قیمتوں پر فروخت کی جاسکیں گی۔ آج کل اُردو ترقی بورڈ جو کتابیں شائع کر رہا ہے ان کی قیمتیں محض اس لئے زیادہ ہیں کہ انھیں آفسٹ پرنٹنگ سے چھپایا جاتا ہے۔ عوام یہ کتابیں قطعاً نہیں خرید سکتے ہاں لائبریریوں میں یہ کتابیں خریدی جاتی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اس مرتبہ اُردو اکاڈمی دلی نے زیادہ تر کتابیں ترقی اُردو بورڈ کی مطبوعہ ہی خریدی ہیں بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دلی اُردو اکاڈمی پر کوئی ایسا دباؤ ڈالا گیا ہے کہ وہ ترقی اُردو بورڈ کی مطبوعات خریدنے پر مجبور ہو گئی۔

۸۔ جب یو پی اُردو اکاڈمی۔ بنگالی اُردو اکاڈمی اور بہار اُردو اکاڈمی ملک بھر میں شائع ہونے والی اُردو کتب کا

ی مقابلہ میں شریک ہونے کی دعوت دیتی ہیں تو کیا وجہ ہے
دلی اُردو اکاڈمی صرف دلی تک ہی اپنے آپ کو محدود
، جبکہ اس کا بجٹ ہندوستان بھر کی اُردو اکاڈمیوں
مقابلہ میں زیادہ ہو گیا ہے - ہاں یہ ضروری ہے کہ اب
اُردو اکاڈمی بھی مجموعی اُردو خدمات وغیرہ ایسے انعامات
ع کرے اور انعامی مقابلہ میں شریک ہونے والی کتب کو
ام میں دی جانے والی رقم کا ۷۵ فیصدی دلی میں شائع ہونے
ی کتب کو دے -

۹ - اگر کسی کتاب کو کوئی اکاڈمی یا ادارہ انعام دیتا ہے
سی دوسری اکاڈمی کے بیٹ میں درد کیوں ہونے لگتا ہے
ایہ خبط بالکل ختم کر دی جانی چاہئے کہ اگر کسی کتاب پر کسی
رے یا دوسری اکاڈمی نے انعام دیا ہوگا تو دلی اُردو اکاڈمی
ے انعام نہیں دے گی -

۱۰ - اتر پردیش اُردو اکاڈمی نے اس سال ایک لاکھ
۵ ہزار روپیہ کے انعامات اُردو کتابوں کو دیئے ہیں
ب کہ اس کا بجٹ ۲۹ لاکھ روپیہ ہے اور اب دلی اُردو
ڈمی کا بجٹ ۳۰ لاکھ روپیہ ہو گیا ہے تو انعامی کتب
دی جانے والی رقم میں کافی اضافہ کیا جانا چاہئے -
وقت دہلی اُردو اکاڈمی ۲۸ ہزار روپیہ کتابوں کے
ام کے سلسلہ میں خرچ کرتی ہے اب اسے کم از کم سوا
ھ روپیہ اس سلسلہ میں تقسیم کرنا چاہئے تاکہ زیادہ سے
یادہ شعراء نئی نثیرو انیاں بنوا سکیں اور جو خراب کے عادی
ں انھیں چند روز راحت نصیب ہو -

۱۱ - آج سے چالیس پچاس سال پہلے جب کوئی کمزور فلم کسی
یا ہال میں نمائش کے لئے پیش کی جاتی تھی تو اس کے
تھ زندہ ناچ اور گانے کا پروگرام رکھ دیا جاتا تھا -
ی دو چار ریلیں چلنے کے بعد کسی بازاری عورت کا ناچ اور
ا ہوتا تھا جس سے فلم بین حضرات ایک ٹکٹ میں دو مزے
صل کرنے کی غرض سے اس کمزور فلم کو بھی دیکھنے میں نقصان
یں سمجھتے تھے - بالکل اسی طرح دلی اُردو اکاڈمی کے
پروگرام جن میں عوام کی شرکت کی زیادہ توقع نہ ہو تو عین

اسی طرح ایک پاس میں دو مزے" حاصل کرنے کے لئے عوام
کو لالچ دیا جاتا ہے کہ فلاں قوال کی قوالی ہوگی یا فلاں صاحب
غزلیں سنائیں گے -

قوالی - غزلوں وغیرہ کے پروگرام ضرور ہونے چاہئیں مگر
ایک پاس میں دو مزے کے طور پر نہیں بلکہ بالکل الگ تھلگ
پروگرام ہوں اور ایسے شاندار ہوں کہ جیسے اکاڈمی کے ادبی پروگرام
ہوتے ہیں - آرٹسٹوں کی بھیڑ اکٹھی کرنے کی بجائے صرف ایک
آرٹسٹ کا ہی پروگرام ہو مگر یہ آرٹسٹ واقعی آرٹسٹ ہو -
جیسے بمبئی کی مہ لقا بیگم - سجاتا فلم سٹار اور اسی طرح کی دیگر
بہترین موسیقی کا پروگرام پیش کرنے والی دیگر آرٹسٹوں کا پروگرام
کرایا جا سکتا ہے - چاربیت کا پروگرام خوب تھا اسے دوبارہ
رکھا جائے نہ کہ ہر بار صاحب سنگھ کو سٹیج کی زینت بنایا جائے
پاکستان کا ایرا غیرا آرٹسٹ جو بھی واگہہ کی سرحد پار کرتا
ہے وہ پاکستان کا مشہور اور مقبول آرٹسٹ بن جاتا ہے -
حالانکہ پاکستان کا ایک ہی آرٹسٹ غلام علی خاں ہندوستان میں
اپنے فن کا سکہ بٹھا سکا ہے - صابری برادرس نے اپنی ساکھ
کو خود نقصان پہنچایا - اس لئے ہر پاکستانی آرٹسٹ کو فن کی
معراج نہ سمجھ لیا جائے - کنور مہندر سنگھ بیدی سحر صاحب تو ایسے
فن کاروں کی دائی ہیں پھر نہ معلوم قابل ذکر آرٹسٹوں کو کیوں مدعو
نہیں کیا جاتا -

۱۲ - اُردو اکاڈمی ہو یا ترقی اُردو بورڈ یہ تب ہی قائم رہ
سکیں گے اگر اُردو کی تعلیم جاری رہ سکے گی - لہذا ہر اکاڈمی اور
خصوصاً دلی اُردو اکاڈمی کا یہ اولین فرض ہے کہ وہ سکولوں میں
اردو کی تعلیم کا سلسلہ جاری کرانے کی حتی المقدور کوشش کرے
اس کے علاوہ بالغوں کو اُردو پڑھانے کا انتظام معقول ہونا
ہونا چاہئے - انجمن ترقی اُردو ہند کے صدر دفتر میں اُردو
اکاڈمی کے تعاون سے بالغان کو اُردو پڑھانے کا سلسلہ
بڑے زور و شور سے شروع کیا گیا تھا مگر اب اس کا کہیں نام
بھی سننے کو نہیں آتا - جب اُردو پڑھنے لکھنے والے ہی نہ ہوں گے
تو پھر یہ اُردو اکاڈمیاں یہ اُردو ترقی بورڈ - یہ اُردو کی کتابیں -
یہ انجمن ترقی اُردو اور ادارہ و رسائل و جرائد کیاں رہیں گے -

مت بھولئے کہ اُردو پڑھنے والوں کی تعداد ہر سال کم سے کم ہوتی جا رہی ہے۔ اُردو کے نام پر لقمۂ تر حاصل کرنے والے۔ اُردو کے نام پر ہر قسم کے فائدے اٹھانے والے اور اُردو کو سرکاری زبان قرار دیئے جانے کے لئے شور مچانے والے سب اپنے بچوں کو ہندی اور انگریزی پڑھا رہے ہیں۔ جب ہم خود اُردو کے علمبردار اُردو کے سلسلے میں ایسا کر رہے ہیں تو پھر اُردو کیسے زندہ رہ سکے گی۔ اس لئے ہمیں اُردو کی تعلیم کو ابتدائی اسکولوں سے لے کر کالجوں تک شروع کرانے کے لئے ہر ممکن کوشش کرنی چاہیئے۔ خواہ اس کے لئے اُردو اکاڈمی کے سالانہ بجٹ کا زیادہ سے زیادہ روپیہ اسی کام پر ہی کیوں نہ خرچ کر دیا جائے۔

امید ہے کہ دہلی اُردو اکاڈمی کی تعلیمی سب کمیٹی اس سلسلے میں کوئی ٹھوس قدم اٹھائے گی تاکہ دہلی کے مدارس میں اُردو پڑھانے کے انتظامات معقول ہو سکیں۔

ہمیں یقین ہے کہ مندرجہ بالا معروضات پر دلی اُردو اکاڈمی کے ذمہ دار ارکان پوری پوری توجہ فرمائیں گے اور جس بے لوث خلوص کے ساتھ ہم نے یہ معروضات پیش کی ہیں اسی خلوص دل کے ساتھ ان پر عمل کیا جائے گا۔

سرمایۂ بلاغت

علم بلاغت، و عروض پر ایک شاندار ادبی دستاویز

پنڈت رتن پنڈوروی

۴۰/- روپے

کویت بزمِ سخن کی انعامی طرحی غزلوں کا فیصلہ

جناب سید وحید فرید قریشی سحرؔ اکبر آبادی جنرل سکریٹری کویت بزمِ سخن کویت اپنے گرامی نامہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ جوش اور ساحر ایوارڈز کے لئے جن طرحی غزلوں کا انتخاب کیا گیا ہے وہ اس خط کے ساتھ بذریعہ رجسٹری روانہ کی جا رہی ہیں۔ تاکہ آپ ماہنامہ شانِ ہند میں اس کا اعلان کر سکیں۔ انعامات کی تقسیم کے سلسلے میں ہم فخر الدین صاحب کے ساتھ پروگرام ترتیب دیں گے اور آپ کو باقاعدہ مطلع کریں گے۔

غزلوں کے اس انتخاب سے کویت بزمِ سخن کی انتظامیہ اور سرپرست جناب چکی والا صاحب کو بھی اتفاق ہے۔

۱- مصرعِ طرح: ع پہنچ کے منزلِ جاناں پہ آنکھ بھر آئی

۱- جناب نسیم حیرتی دہلی

۲- جناب اثر سرہندی سرہند (پنجاب)

۳- جناب ناز مانک پوری جون پور۔ یو پی

۲- مصرعِ طرح: ع دل کی چوٹوں نے کبھی چین سے رہنے نہ دیا

۱- جناب قمر مراد آبادی - مراد آباد - یو پی

۲- جناب فہیم انور بھوپالی - جہانگیر آباد دہلی

۳- جناب اثر سرہندی صاحب سرہند (پنجاب)

اس سلسلہ میں وزیر اعظم ہند یا پریذیڈنٹ آف انڈیا کی خدمت عالیہ میں بھی باقاعدہ درخواست کی جا رہی ہے تاکہ یہ انعامات ان مکینہ مقام ہستیوں میں سے کسی ایک کے ہاتھوں سے تقسیم کرائے جا سکیں۔ انشاء اللہ ماہ جون کے شمارے میں مفصل طور سے اعلان شائع ہو سکے گا۔

سترِ مغفرت

منظوم ترجمہ شریمد بھگوت گیتا

پنڈت رتن پنڈوروی

۱۲/- روپے

حضرت نازش حیدری دہلوی (مرحوم)

۱۴ فروری ۱۹۸۵ء کو نازش حیدری دہلوی مرحوم کی پہلی برسی کے موقع پر دفتر "شانِ ہند" میں نیازمندانِ نازش حیدری تشریف لائے اور نازش صاحب کی یاد میں شعری نشست کا اہتمام کیا گیا۔ ذیل میں حضرت نازش حیدری کی تین غزلیں ملاحظہ فرمائیے۔ جنھیں سلام ساگری نے بھجوایا ہے۔ (ادارہ)

شہر میں تنہا ہوں میں لذتِ کشِ آزارِ دوست
مجھ سے بڑھ کر اور کیا ہوگا کوئی شہکارِ دوست
مسکراہٹ کی ضیا کرنیں طلوعِ مہر کی
پھول کھلنے کا عمل آئینۂ گفتارِ دوست
اس حرارت سے ابھی تک ہے رگوں میں خون گرم
ہلکی ہلکی آنچ دیکھی تھی سرِ رخسارِ دوست
وقت تھک کر سو گیا ہے ٹھنڈی چھاؤں میں
گردشیں ٹھہری ہیں زیرِ سایۂ دیوارِ دوست
سوچیے تو کتنی صدیوں کا سفر درکار ہے
دیکھیے تو کس قدر نزدیک ہے دیوارِ دوست
وقت کا فرمان نازش ٹل نہیں سکتا کبھی
سب کی قسمت کا نوشتہ ہے سرِ دیوارِ دوست

ہر چیز حسین و رنگیں تھی ہر ذرہ یہاں تابندہ تھا
تھی اپنی جوانی پر دنیا دل میرا جب تک زندہ تھا
محرومِ ملاقات اس سے رہے نزدیک نہیں تھا جو خود سے
ہم جس کو اپنا کہہ نہ سکے شہرِ دل کا باشندہ تھا
کچھ خود سے زیادہ پا نہ سکا میں اسکے کسی کام آ نہ سکا
دنیا مجھ سے شرمندہ رہی دنیا سے میں شرمندہ تھا
الطاف قدم دیتا تھا جب پاؤ گے سکوں مستقبل میں
جب حال نے ماضی کو بدلا مستقبل پھر آئندہ تھا
ایسے میں بلاتا کوئی آفاق کی گردش کو ساقی
ہر جرعۂ صہبا دیدہ میں تھا ہر پیمانہ رقصندہ تھا

ملتا تو اسے ویرانے میں تو لالۂ صحرا ملتا
صحرا کی ہوا کا ہر جھونکا صحرا میں کیا جو شندہ تھا
تھا دردِ محبت کیف آور ہر سانس تھا موجِ نازش
ہر راہ ڈھلی موسیقی میں ہر جادہ تھا سازندہ تھا

✽

ماحول کے سکوت سے اکتا رہے ہیں لوگ
پھر کوئی حادثہ ہو کر گھبرا رہے ہیں لوگ
شاداب ہیں کہ غم کی ہوا کھا رہے ہیں لوگ
شعلوں میں رہ کے پھول بنے جا رہے ہیں لوگ
گھبرا کے دیدیا ہے ستاروں نے راستہ
عظمت سے آسماں کی طرف جا رہے ہیں لوگ
ٹوٹی ہیں آج شیوۂ تسلیم کی حدیں
ہنس ہنس کے حادثات سے ٹکرا رہے ہیں لوگ
افسردہ دھول سے چہروں کے باوجود
گلزارِ کائنات کو مہکا رہے ہیں لوگ
ہوتی ہے ہمکلام فضائے خموش بھی
فطرت کے ہر غرور کو ٹھکا رہے ہیں لوگ
یہ چلتے پھرتے عکس ہیں کچھ دیر کے لئے
فطرت کے آئینے میں نظر آ رہے ہیں لوگ
کیا غم رہِ طلب میں جو سر پر ہے آفتاب
قدموں میں اپنے سایہ لیے جا رہے ہیں لوگ
امید کے چراغ بھی نازش بھڑک اٹھے
کرنوں کی آرزو میں صداں پا رہے ہیں لوگ

پرنٹر و پبلشر و ایڈیٹر دیا پرکاش سرور نے خواجہ پریس جامع مسجد دہلی میں چھپوا کر شانِ ہند انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی سے شائع کیا

آم کے آم

اظہر علی فاروقی الہ آباد

(۱) رام لعل صاحب نابھوی لائق ستائش اور مستحق مبارکباد ہیں کہ وہ سرکاری ملازمت کی مصروفیتوں سے سبکدوش ہونے کے بعد تخلیقی کام کی طرف متوجہ ہوئے اور اس تیزی اور جانفشانی کے ساتھ کہ بہت ہی قلیل مدت میں دو مجموعے تبسم (مزاحیہ خاکے) اور آم کے آم (انشائیے) منظر عام پر آگئے اور پہلے مجموعے کا دوسرا ایڈیشن بھی شائع ہو گیا۔ اندازہ ایسا کچھ ہوتا ہے کہ قدرت نے اس کا صلہ ان کو دیر سے دیا جب منظر عام پر آیا جب کہ انسان بہت کچھ سہل پسند سا بن جاتا ہے اور اس کے قویٰ مضمحل سے ہونے لگتے ہیں اور وہ سعی و کاوش کی زحمت برداشت کرنا نہیں چاہتا مگر موصوف اس کلیے سے مستثنیٰ نظر آتے ہیں اور تبسم کا دوسرا ایڈیشن شائع ہو جانا اس کا بین ثبوت ہے کہ وہ سعی پیہم اور جد و جہد میں آج بھی منفرد شخصیت رکھتے ہیں اور مرد ساٹھا پاٹھا والی کہاوت کی پوری تصدیق بھی ہو جاتی ہے۔

(۲) جہاں اس وقت آم کے آم کے بارے میں کچھ باتیں کرنا ہیں وہ قاری کے تاثر کے لیے آج کل دیدہ زیب گیٹ اپ استعمال کرنے کا عام رواج ہو رہا ہے۔ چنانچہ آم کے آم کا گیٹ اپ نہ صرف دیدہ زیب اور بے پناہ دلکش ہے جس کا حسن کارانہ عمل قاری کو پہلی ہی نظر میں اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے مگر معذرت کے ساتھ گزارش ہے کہ ہرا رنگ غلط ہونے کے باعث جس چیز کو نمایاں ہونا چاہیے تھا وہ دب کر رہ گئی ہے۔ ہلکے زرد رنگ کے ساتھ سفید لفظ انشائیے ابھر نہیں پایا۔ اس کی جگہ اگر وہ رنگ ہوتا جو آم کے آم کا ہے یا پھر گہرا نیلا ہوتا تو اس کی خوبصورتی میں اضافہ ہو جاتا پھر بھی تمام نگاہوں کو کھینچنے والا گیٹ اپ بجا طور پر خوبصورت اور دیدہ زیب ہے۔

موصوف کا خط کیا ہے خود بہت پاکیزہ ہے اس کے پیش نظر انھوں نے جہاں کیادی صاحب جیسا باسلیقہ خوش نویس کا انتخاب کیا۔ کتابت اور کاغذ دونوں نہایت نفیس اور حسین ہیں۔

(۳) آم کے آم درج ذیل سولہ مضامین اور ایک ... پر مشتمل ہے۔ فیس، پوسٹ کارڈ، انتظار، سایہ، مسکرانا، حیرت، خوش آمدید، گالی، تنہائی، مسئلہ، تصویر، خواب، آرائش، صحت، ذلت، رام بیام۔ موضوعات دو ایک کو چھوڑ کر سبھی تخیلی اور تشریحی مضامین کے لیے زیادہ موزوں ہیں اور ان کو انشائیہ کی روش پر چلانا بڑا دشوار سا نظر آتا ہے۔

لیکن رام لعل صاحب نے بڑی کامیابی سے انھیں اس روش پر لا کر کھڑا کر دیا ہے اور یہ بات ان کی تمہید اور اختتام سے عیاں ہے "موت" جیسے خطرناک سنجیدہ موضوع کو پڑھتے قاری کی سوچ ابھی پس و پیش میں ہے کہ موت ... اور ... کی نظر ان سطروں پر پڑتی ہے اس کی سوچ میں حرکت ہوتی ہے اور مسکرا دیتا ہے:

"ایک استاد پہلوان اپنے شاگردوں کو سب داؤ پیچ سکھا دیتا ہے لیکن ایک داؤ اپنے لیے محفوظ رکھ لیتا ہے ورنہ کسے استاد کون مانے گا۔ ٹھیک اسی طرح اللہ میاں نے اپنے تمام راز اور حکمتیں آسمانی صحیفوں کے ذریعہ تقسیم کر دیے، لیکن موت اور زندگی کے دو نسخے اپنے پاس ہی چھوڑ رکھے ہیں۔" گالی کی ابتدا اس طرح فرماتے ہیں "گالی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ سکھائی نہیں جاتی۔ بچہ گھر میں ہو یا سکول میں اسے ہمیشہ یہی تلقین کی جاتی ہے کہ زبان سے کبھی گالی نہ نکالے لیکن پھر جب گھر میں والد کو اسکول میں استاد کو محلے میں لڑتے ہوئے لڑکوں کو گالیاں دیتے سنتا ہے تو اس کا نازک دماغ اصل سبق بھول جاتا ہے۔" لغزش کی یہ سطریں پڑھیے "ہمیں یہ تو پتہ تھا کہ لغزش کیا ہے، کیونکہ جب سے ہوش سنبھالا ہے تب سے اب تک ہمارا سابقہ لغزشوں سے ہی رہا ہے..."

کبھی کبھی زیادہ موصوف قاری کا ساتھ چھوڑتے چلے جاتے ہیں گویا اس سے بچ کر بھاگ رہے ہیں، لیکن انجام کار وہ خود ... جاتے ہیں۔ "سایہ" کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے "سایہ ہے تو چار حروف کا ایک لفظ مگر پوری کائنات اس ایک لفظ میں سمٹی ہوئی ہے کون ہے جسے سایہ کی ضرورت نہیں اور کون ہے جو زیر سایہ نہیں..."

پورا مضمون خطیبانہ ہے

محمد یوسف پاپا
24-C، جامعہ اسٹاف کوارٹرس
جامعہ نگر، نئی دہلی-۲۵-۱۱۰۰

ادبی طوائف اور طبلچی نقاد

(اس مضمون سے میرا منشا، کسی کی دل آزاری اور بے عزتی ہرگز نہیں۔ میں نے تعمیری اور اخلاقی جذبے کے تحت یہ مضمون لکھا ہے۔)

طوائف، رنڈی، کسبی یہ ایسے الفاظ ہیں جو ہر ادب اور زبان میں ملتے ہیں۔ یہ الفاظ ان عورتوں کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں جن کا ذریعہ معاش، ناچ گانا یا جسم فروشی ہے ناچ گانا ایک نمبر کا کام کہا جا سکتا ہے اور جسم فروشی دو نمبر کا۔ دو نمبر کا کام اب بھی بُرا مانا جاتا ہے۔ لیکن ایک نمبر کا کام (ناچنا گانا) اب تو فن بن گیا ہے۔ اس لئے ایک نمبر کا کام کرنے والی طوائفیں فنکار بن گئی ہیں۔ ممکن ہے کچھ انٹلکچولز INTELLECTUALS کے نزدیک دو نمبر کا کام بھی فن ہو گیا ہو۔ فن اس لئے ہو سکتا ہے کہ اس میں بھی مختلف آسن ہوتے ہیں جن کا ذکر کوک شاستر میں وضاحت کے ساتھ بالتصویر ملتا ہے۔ نمبر دو کا کام کرنے والی طوائفیں ہمیشہ گری نگاہ سے دیکھی گئی ہیں۔ لوگ اجالے میں ان کے محلے سے گزرنا بھی پسند نہیں کرتے۔ خیر اب تو گورنمنٹ نے دو نمبر کے کام پر پابندی لگا دی ہے اور اسے غیر قانونی قرار دے دیا ہے۔ صرف ایک نمبر والیوں کے محلے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دو نمبر کا کام پورے معاشرے میں پھیل گیا۔ اس کی دسترس چھوٹے بڑے ہوٹلوں سے لے کر گھر تک ہے۔ اس کام کو بڑھاوا دینے والے ہمارے کچھ نام نہاد دانشور ہیں۔ جو اسے بُرا نہیں سمجھتے۔ سادہ لوح عورتیں سمجھ رہی ہیں کہ نمبر دو کے کام سے ان کا رتبہ اونچا ہو رہا ہے اور وہ بھی سوسائٹی میں انٹلکچولز مانی جاتی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ گھریلو عورت اور نمبر دو کا کام کرنے والی عورت میں امتیاز مشکل ہو گیا ہے آج بھی معاشرے میں نمبر دو کا کام پردے میں ہوتا ہے۔

جو باقاعدہ طوائفیں ہوتی تھیں اور نمبر دو کا کام کرتی تھیں ان کا الگ ایک محلہ ہوتا تھا۔ ان کی اپنی ایک تہذیب تھی۔ ان کے اپنے اصول تھے۔ لیکن کہیں کسی محلے پر یہ بورڈ نہیں لگا رہتا تھا کہ یہ طوائفوں کا محلہ ہے یا یہ طوائف کا گھر ہے۔ بلکہ یہ کاروبار سینہ بہ سینہ چلتی تھی۔ ان کی زبان شستہ اور انداز بہت ہی شائستہ ہوتا تھا۔ آپ تشریف لے جاتے تو بڑے اہتمام سے آپ کو بٹھاتیں پان پیش کرتیں۔ آپ جس خواہش کے تحت جاتے وہ پوری کی جاتی ان کی شائستگی کا یہ عالم تھا کہ لوگ اپنے بیٹوں کو تہذیب سیکھنے کے لئے ان کے گھر بھیجتے تھے لیکن احتیاط کا یہ عالم تھا کہ کسی اخبار میں ان باتوں کا اشتہار نہیں نکلتا تھا۔ بڑی بڑی مشہور طوائفیں گذری ہیں جیسے جانکی بائی چھپن چھُری، گوہر جان، تخیلی طوائف امراؤ جان ادا وغیرہ وغیرہ۔ ان کے کام بیشک قابل ملامت اور نفریں تھے۔ اور ہیں۔ لیکن بہت ہی خاموشی اور سلیقے سے ہوتے تھے۔ بے حیائی حیا کے اندر تھی۔ سڑک پر نہیں آئی تھی۔

طوائفوں کا وجود معاشرے میں کیونکر ہوا۔ اس کی بہت سی وجوہات ہو سکتی ہیں مثلاً غربت، شادی کی دشواریاں، غنڈوں کے ذریعہ پیدا کی گئی مجبوریاں وغیرہ وغیرہ۔ یہ پیشہ کسی عورت نے آج تک شوق یا بابی کے طور پر اختیار نہیں کیا۔ طوائفیں اس پیشہ کو ہمیشہ گھناؤنا اور غلط سمجھتی رہیں۔ جب بھی انھیں موقع ملتا تھا فوراً اس پیشے سے تائب ہو کر معاشرے کی ایک شریف رکن بن جاتی تھیں۔ لیکن ان طوائفوں کے علاوہ اب ایک نیا گروہ پیدا ہو رہا ہے۔ جو شوق کے تحت اس پیشے میں آتی ہیں ان میں اکثر پڑھی لکھی ہوتی ہیں۔ شاعری کرتی ہیں۔ مشاعرے پڑھتی ہیں۔ مضامین لکھتی ہیں۔ کتابیں چھپواتی ہیں۔ انھیں ادبی طوائف کہتے ہیں۔ ادبی طوائفوں اور روایتی طوائفوں میں بہت فرق ہوتا ہے۔ روایتی طوائفیں نمبر دو کا کام پردے میں کرتی تھیں۔ ادبی طوائفیں سرِعام کرتی ہیں یا کرنے کی خواہش مند ہیں۔ روایتی طوائفیں شائستہ اور مہذب ہوتی تھیں۔ ادبی طوائفیں بدتمیز اور نک چڑھی ہوتی ہیں۔ بولتے وقت روایتی طوائفوں کے منہ سے پھول جھڑتے تھے ان کے منہ سے گالیاں جھڑتی ہیں۔ جن کو سن کر ... طبلچی نقاد

بدمست ہو جاتا ہے ۔ ان کا ملنے کا انداز نسوانی ہوتا تھا لوگوں کی طبیعت خوش ہو جاتی تھی ۔ ادبی طوائفوں سے ملئے تو ایسا لگتا ہے کہ کسی نا عورت سے مل رہے ہیں ۔ بظاہر عورتوں کی ساری جسمانی چیزیں ان کے پاس ہوتی ہیں لیکن انداز مردوں اور عورتوں کے بیچ میں آجاتا ہے ۔ ہمیشہ جملوں میں اپنے کو مذکر بولتی ہیں ۔ روایتی طوائفوں کے یہاں اپنے پیشے کی ترقی کے لئے کسی طرح کی پبلسٹی وغیرہ نہیں ہوتی تھی ۔ ادبی طوائفوں کے یہاں اشتہارات دئے جاتے ہیں کتابیں نکالی جاتی ہیں ۔ وہ اپنے پیشے سے متنفر تھیں ۔ انھیں اپنے پیشے پر گھمنڈ ہے ۔ روایتی طوائفوں کے یہاں تربیت کے لئے لڑکے بھیجے جاتے تھے تو مہذب ہو کر نکلتے تھے ۔ ادبی طوائفوں کے یہاں تربیت کے لئے کسی لڑکی کو دوپٹہ، قمیص اور شلوار پہنا کر بھیجئے تو چار دن کے بعد وہ لڑکی سڑک پر صرف چڈی پہنے سگریٹ پیتی ہوئی چیل قدمی کرتی دکھائی دے گی ۔ ہمارے طبلچی نقاد اس تبدیلی پر بہت خوش ہوں گے ۔ اور فرمائیں گے کہ چار دن میں لڑکی کی کایا پلٹ گئی ۔ کیا ڈھل کر نکلی ہے ۔ مرزا رسوا کی ہیروئن امراؤ جان ادا میں عورت کا دل تھا ۔ جب وہ گاتی تھی کہ

"مرتے مرتے نہ قضا یاد آئی
اس کافر کی ادا یاد آئی"

تو دل کھنچا تھا ۔ جب ادبی طوائف کچھ عجیب انداز میں اس طرح گاتی ہے کہ

"گولیاں کھا کے پاس آجاؤ
میرے دل کی لگی بجھا جاؤ"

تو دل کھنچنے کے بجائے کوئی اور چیز کھنچتی ہے ۔ روایتی طوائفیں اپنے ایک سے کہتی تھیں "حضور تشریف لائے سیج آراستہ ہے" یہ کہتی ہیں " آ بے آنچل کمرے میں" (اور کمرے کا بھی کیا قید ہے) وہ مجبوراً اس پیشے میں آتی تھیں ۔ ادبی طوائفیں خوشی خوشی سمجھ کر اس پیشے کو اختیار کرتی ہیں ۔ اور بے حیائی کی بنیاد پر اپنے کو بہت اونچا سمجھتی ہیں ۔ روایتی طوائفوں کے ساتھ غربت کی مجبوریاں ہوتی تھیں ۔ ان کے ساتھ دولت کی فراوانی ہے ان کے یہاں شادی کی مجبوری رہتی تھی ۔ کوئی شادی کرنے کو تیار نہیں ہوتا تھا

ادبی طوائفوں کے یہاں شادی کی کوئی مجبوری نہیں ۔ ہزاروں دولتمند تیار ہیں جس سے چاہیں شادی کریں ۔ یہ شادی کر بھی لیتی ہیں ۔ لیکن ان کے یہاں شوہر کی حیثیت اس زنجیر کی سی ہوتی ہے جو رولی گاڑی کے ڈبوں میں لٹکی رہتی ہے اور ایمرجنسی میں کھینچی جاتی ہے یعنی جس دن حسرت پوری کرنے کے لئے کوئی نہیں ملتا ۔ تو بہ کراہت اور مجبوری اس فرض کی ادائیگی شوہر نامدار کے ذمہ کی جاتی ہے ۔ روایتی طوائفوں کے یہاں پولیس اور غنڈوں کا بھی خطرہ رہتا تھا ۔ ادبی طوائفوں کے یہاں پولیس اور غنڈوں کا کوئی خطرہ نہیں بلکہ انتظار رہتا ہے اگر اتفاق سے مل گئے تو پھر ان کی بھی خیریت نہیں ۔ وہ دوبارہ اس گلی سے گزرنا چھوڑ دیتے ہیں اور ہر ایک سے کہتے پھرتے ہیں کہ اس گلی میں ایک خطرناک چیز رہتی ہے ادھر مت جانا ہم ذمہ دار نہیں ۔ روایتی طوائفیں موقع ملنے پر اس پیشے سے نکل آتی تھیں اور شرافت کی زندگی گزارتی تھیں ۔ ادبی طوائف کے یہاں واپسی نہیں ہے ۔ ان کے نزدیک اس پیشے سے واپسی کا مطلب جنت سے دوزخ میں جانا ہے ۔ روایتی طوائفیں ایک گوشے میں رہ کر اپنی عمر گزار دیتی تھیں ۔ ادبی طوائفیں، طوائف الملوکی پیدا کرتی ہیں ادھر سے ادھر پوری دنیا میں "لو دیہی لو دیہی" کہتی بھاگتی پھرتی ہیں روایتی طوائفیں اپنے گاہکوں سے اجرت لیتی تھیں ۔ ادبی طوائفیں اجرت لینے کے بجائے مناسب اجرت دیتی ہیں ۔ ان سے سب سے زیادہ طبلچی نقاد فائدہ اٹھاتے ہیں ۔ یہ کماتی ہے اور وہ کھاتے ہیں ۔ روایتی طوائفوں کے یہاں ایک معیار ہوتا تھا ۔ ادبی طوائفوں کے یہاں معیار صرف اتنا ہے کہ جس نے بھی تعریف کی اس سے فرمایا "آجائیے" ان کی ایک مخصوص بستی ہوتی تھی یہ گشتی ہوتی ہیں اور شہر شہر ہی نہیں ایک ملک سے دوسرے ملک کا سفر کرتی رہتی ہیں ۔ روایتی طوائفوں کی فطری خواہش NATURAL URGE مر سی جاتی تھی ۔ ادبی طوائفوں کے یہاں فطری خواہش اور زیادہ تندرست ہوتی ہے اور جب اٹھتی ہے تو اس وقت یہ اندھی ہوتی ہیں ۔ جو بھی ملتا ہے اس پر کود پڑتی ہیں ۔ یہ نہیں دیکھتیں کہ وہ کون ہے ۔ ان طوائفوں کے یہاں ایک خاص آدمی ہوتا تھا ان کے یہاں یہ فرض طبلچی نقاد ادا کرتا ہے ۔ روایتی طوائفوں کے

یہاں کام کے لئے ایک کمرہ مخصوص ہوتا تھا۔ ادبی طوائف کے یہاں روئے زمین کا ہر ٹکڑا کام کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے مثلاً سڑک، پارک وغیرہ وغیرہ۔ روایتی طوائفوں میں عورت پن ہوتا تھا۔ ان میں زنانہ پن ہوتا ہے۔ جیسے زنانے کے مزاج کے خلاف آپ نے کوئی بات کہی وہ فوراً ری ایکٹ (REACT) کرتا ہے اور لہنگا اٹھا کر کہتا ہے "لے دیکھ لے کیا رکھا ہے" "آپ کتنے بھی باہمت ہوں اُدھر دیکھ نہیں سکتے۔ اور اگر دیکھ لیں تو پتھر کے ہو جائیں گے۔ اس لئے بے حیا سے بے حیا بھی ان کے سامنے جانے سے ڈرتا ہے۔ ادبی طوائفیں بھی لہنگا اٹھا کر دنگ کر دیتی ہیں۔ کبھی تحریری لہنگا اٹھاتی ہیں کبھی تقریری۔ جس سے سارے اعضاء خفیہ سامنے آجاتے ہیں۔ جس طرح لوگ مصوّرِ غم اور مصوّرِ فطرت وغیرہ ہوتے ہیں۔ اسی طرح یہ مصوّرِ اعضاء نہانی ہوتی ہیں۔ روایتی طوائفیں پان کھاتی تھیں ان کے منہ سے خوشبو آتی تھی۔ یہ سگریٹ پیتی ہیں اور شراب سے شوق فرماتی ہیں ان کے منہ سے تمباکو اور شراب کی بدبو آتی ہے۔ روایتی طوائفوں کے یہاں جنسی بے حیائی تھی۔ ان کے یہاں چار دانگ بے حیائی ہے۔ روایتی طوائفوں کے یہاں صرف جسم فروشی تھی۔ ان کے یہاں جسم کے ساتھ ساتھ ضمیر فروشی بھی ہے۔

ہر دور میں تقریباً ہر شاعر نے دو طرح کی شاعری کی ہے۔ ایک نمبر ایک کی شاعری اور دوسری نمبر دو کی شاعری۔ نمبر ایک میں عام اور تہذیب کے اندر کی شاعری آتی ہے۔ نمبر دو میں غیر مہذب اور ریرنا قسم کی شاعری آتی ہے۔ جو چھاپی نہیں جاتی۔ خاص محفلوں میں سنائی جاتی ہے۔ جس کے اشعار سینہ بسینہ چلتے ہیں۔ نمبر دو کی شاعری کے مشہور شاعر لکھنؤ کے رفیع احمد خاں گزرے ہیں۔ جن کے درجنوں اشعار آج تک لوگوں کو یاد ہیں لیکن آج بھی کوئی انھیں چھاپنے کی جرأت نہیں کرتا۔ جوش نے بھی دو نمبر کی شاعری کی ہے۔ ایسے ایسے بلیغ اشعار کہے ہیں کہ یہ ادبی طوائفیں کیا کہیں گی۔ ادبی طوائفوں اور اچھے شاعروں میں یہ فرق ہے کہ یہ دو نمبر کی شاعری کو شوق سے چھپواتی ہیں۔ ہر جگہ سناتی ہیں اور طبلچی نقادوں سے داد تحسین وصول کرتی ہیں اچھا شاعر یہ کام نہیں کرتا اسے طبلچی نقاد کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بیوی اور شوہر کے تعلقات کو دنیا جانتی ہے۔ لیکن شب کی تنہائی میں بیوی اور شوہر کے درمیان جو کچھ بھی ہوتا ہے۔ شوہر یا بیوی میں سے کسی کو بھی جرأت نہیں کہ جو کچھ ہوا ہے اسے برسرِ عام بیان کرے۔ ممکن ہے اپنے بہت ہی قریبی دوستوں کے اصرار پر تنہائی میں کچھ باتیں بتائے۔ لیکن اس طرح کی شہوانی کیفیات کو اعلیٰ درجے کی شاعری بنا کر پیش کرنا کہاں کی انسانیت اور کون سا کمالِ فن ہے۔ ادبی طوائفوں کی شاعری کا محور یہی جنسی تشنگی اور بھوک ہے۔ جس کا ڈھنڈورا سرِ عام پیٹا جا رہا ہے۔ اگر کوئی لڑکی کم عمری میں جنسی بے راہ روی کا شکار ہو گئی ہے۔ تو اس کی جنسی پیاس عمر بھر تک نہیں ملتی۔ اس کے لئے انھیں فوراً اس سروس Twenty four hours service کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہی کیفیت ادبی طوائفوں کی ہے۔ یہ بے حیائی کے جس معیار تک پہنچی ہیں۔ سب جانور بھی اس بلندی تک نہیں پہنچ پاتے ہیں۔ کچھ بد جانور ضرور ایسے ہیں جو اس فعل کو سرِ عام کرتے ہیں اور انھیں ذرا بھی غیرت نہیں آتی۔ دوسرے جانور جیسے ہاتھی، شیر، سانپ وغیرہ کی حمیت کا یہ حال ہے کہ جفتی کے وقت کوئی آدمی پہنچ جائے تو اسے زندہ نہیں چھوڑتے۔

اب میں چند اقتباسات کے ذریعہ اپنی بات کی تصدیق کرنا چاہتا ہوں اور فیصلہ پڑھنے والوں پر چھوڑتا ہوں کہ جن کے یہ اقتباسات ہیں وہ کس کیٹگری میں آتی ہیں۔ ایک شاعرہ کہتی ہے۔

لاؤ ہاتھ اپنا لاؤ ذرا

. . . .

ناف کے اس طرف
اس کی جنبش کو محسوس کرتے ہو تم؟
بس یہیں چھوڑ دو

. . . .

میرے اندر اندھیرے کا آسیب تھا
زلیخا کے ذائقے کو ترستی ہوئی

. . . .

تو نے اندر مرا اس طرح بھر دیا۔

. . . .

اس نظم سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاعرہ حاملہ ہے۔ لیکن ایسا لگتا ہے

کہ دنیا میں پہلی مرتبہ صرف یہی معاملہ ہوئی ہے اور بقیہ ساری عورتیں بس یوں ہی ہیں۔ حاملہ ہر شادی شدہ یا غیر شادی شدہ عورت ہو سکتی ہے۔ لیکن شریف عورت سرِعام یہ فرمائش نہیں کر سکتی کہ "ڈالو ذرا تم اپنا زیرِ ناف ٹٹولو اور ایک خاص مقام پر لا کر روک دو" اس طرح کی فرمائش اگر ملک کی سب عورتیں کرنے لگیں اور مرد ان کی فرمائشیں پوری کرنا شروع کر دیں تو پوری قوم کے ہاتھ زیرِ ناف پھنس کر رہ جائیں گے۔ ملک کا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ رپورٹ آئے گی اخبار میں نکلے گا کہ "فلاں ملک کے سارے مرد عورتوں کے زیرِ ناف ہاتھ ڈالے بیٹھے ہیں۔ بہت ہی عبرت کا مقام ہے مدد کی ضرورت ہے" یو این او کی طرف سے ریزولیوشن آئے گا کہ "ہم آپ سے استدعا کرتے ہیں کہ اپنے ہاتھ وہاں سے ہٹائیے اور جہاں پہلے تھا وہیں لائیے" بہت سے ممالک سے عطیات آئیں گے اور یہ کیا جائے گا کہ "فلاں ملک کے سارے ہاتھ زیرِ ناف مصروف ہیں ان کی مدد ہر ملک کا فرض ہے ورنہ پوری قوم بھوکوں مر جائے گی۔ اب ہاتھ ناف کے نیچے سے باہر آیا تو جذبات سے مغلوب ہو کر وہ فرماتی ہے "ان انگلیوں کو مجھے چوسنے دو چاٹنے دو" آپ نے جانوروں کو چاٹتے ہوئے دیکھا ہوگا کتنی بھیانک شہوت ٹپکتی ہے۔ پوری قوم کو جانور بنانے کا نسخہ ہے۔ اس سے آگے کہتی ہے کہ "زیست کے ذائقے کو ترستی کتنی میں" یہ لائن چیخ چیخ کر کہہ رہی ہے کہ صرف شوہر سے کام نہیں چلے گا ہر روز وہی دال۔ وہی دال یہ کیا بات ہوئی جب تک دس بیس قسم کے ذائقے ہر روز حاصل نہ کئے جائیں بات نہیں بنتی۔ اس پر ایک واقعہ یاد آ رہا ہے۔ ایک فقیر تھے مانگ کر کھاتے تھے۔ ایک صاحب نے انھیں مدعو کیا۔ وہ گئے ڈٹ کر کھایا۔ کچھ دیر کے بعد میزبان نے دیکھا کہ میاں صاحب کسی دوسرے کے گھر بیٹھے کھا رہے ہیں۔ پہلے میزبان نے کہا کہ میاں ابھی تو آپ میرے گھر سے کھانا کھا کر آ رہے ہیں۔ یہاں پھر بیٹھ گئے کھانے کے لئے۔ میاں صاحب نے فرمایا "بھیا جب تک دس گھر کا چاشنہ لوں میری طبیعت نہیں بھرتی۔ کہیں چٹنی مل گئی۔ کہیں اچار مل گیا۔ کہیں گوشت مل گیا۔ کہیں دال مل گئی" یہی حالت ادبی طوائفوں کی ہے۔ ان کی شاعری بھی مختلف ذائقوں کی متلاشی ہے۔ ایک گھر سے انھیں تسکین نہیں ہوتی۔ آگے فرماتی ہے "تم نے اندر مرا اس طرح بھر دیا" اس لائن سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس کے اندر جو پہلا غار تھا جس کو بذریعہ ڈرل بھر دیا گیا ہے۔ اب وہ زمین کا حصہ ہو گئی ہے۔ اس مطلب کے علاوہ دوسرا پہلو یہ ہے کہ ہر پڑھنے والے کے دل میں یہ حسرت ہوگی کہ کاش وہ اندر بھرنے والا میں ہی ہوتا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہر نوجوان جس کو بندوق میں کارتوس بھر کر ملک کی حفاظت کرنی چاہیئے۔ وہ کسی نہ کسی کے اندر کچھ نہ کچھ بھرنے کا متمنی رہے۔ جب نوجوانوں کو اس طرح کی آسانیاں فراہم ہو جائیں گی تو وہ بندوق کی طرف کیوں جائیں گے۔ شاعرہ دوسری نظم میں فرماتی ہے۔

یہ کیسی لذت ہے جسم شل ہو رہا ہے میرا
یہ کیا مزہ ہے کہ جس سے ہے عضو عضو بوجھل
یہ کیوں لگا ہے کہ سانس رک رک کے آ رہا ہے
یہ میری آنکھوں میں کیسی دھوپ بھرے اندھیرے اتر رہے ہیں
لہو کے گنبد میں کوئی در ہے کہ وا ہوا ہے..... وغیرہ وغیرہ

ان لائنوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی شخص شاعرہ کے ساتھ مصروفِ کار ہے وہ لذت اندوزی کے ساتھ ساتھ کمنٹری بھی کرتی جا رہی ہے کہ اب یہ ہو رہا ہے اب وہ ہو رہا ہے۔ اور پڑھنے والے کو وہ لطف حاصل ہو رہا ہے کہ حقیقتاً وہی مصروفِ کار ہے۔ یہ طریقہ کارِ شہوت کے لئے انسٹیگیشن ہے اور اشتہار بھی۔ جو پڑھے گا سیدھا اس کے دروازے پر جائے گا۔ لوگوں کی لائن لگ جائے گی سب دل کو پکڑے ہوئے اپنے نمبر کے انتظار میں کھڑے ہوں گے جس کو فراغت کا موقع نہیں ملتا وہ میرا جی کا نسخہ استعمال کرتا ہے اس طرح یہ شاعرہ پوری قوم کو قعرِ مذلت کے ساتھ ساتھ اپنے ذاتی قعر میں دھکیلنے کی خواہشمند ہے۔

ایک شاعرہ کی ایک نظم "شبِ خون" میں چھپی تھی، جس کی پہلی اور آخری لائن ملاحظہ ہو کہتی ہے "میں اپنی شرمگاہ پر منہ رکھ کر سونا چاہتی ہوں" "شبِ خون" کو یہ نظم بہت اچھی لگی اور پوری نظم کو کاغذ پر محفوظ کر لیا۔ ان کو اس نظم کے ساتھ اس کا اسکیچ بھی چھاپنا چاہیئے تھا تاکہ پوری وضاحت ہو جاتی اور "شبِ خون" کی تنقیدی بصیرت میں چار چاند لگ جاتے۔ ایک صاحب نے ایک دفعہ ایسا ہی اکسپریشن دیا تھا۔ انھوں نے فرمایا کہ "مجھے ایسا محسوس

ہوتا ہے کہ جیسے پوری دلّی میری خوابگاہ میں گھس گئی ہے۔ ان کے ایک ساتھی نے اتنی نامناسب جگہ میں قیام کو تکلیف دہ سمجھتے ہوئے ان سے استدعا کی کہ "بھیّا مجھے نکال دے"۔ یہ بات ان کے ساتھی نے دوسرے ساتھیوں سے بھی کہہ دی۔ وہ بھی آئے اور درخواست کی کہ سنا ہے آپ نے فلاں صاحب کو نکال دیا ہے مجھے بھی نکال دیجئے۔ اس طرح درخواست گزاروں کی لائن لگ گئی جب وہ نکالتے نکالتے تھک گئے تو اپنے ساتھی پر بہت خفا ہوئے کہ یہ سب تمہارا کیا دھرا ہے اب میں کس کس کو نکالتا پھروں۔ اسی طرح اگر لوگ اس شاعرہ کے پاس ہمدردی کے تحت پہنچیں اور کہیں کہ آپ منہ ہٹا لیجئے ہم حاضر ہیں۔ دو چار حاضری تک تو کوئی بات نہیں لیکن اس کے بعد کیا ہوگا۔ اگر آپ سنجیدگی سے تجزیہ کریں تو یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ حیائی دلیلوں کا اس قسم کی شاعری کرنا اور طرہ یہ کہ اسے چھپوانا اور محفلوں میں پڑھتے پھرنا ذہنی دیوالیہ پن کے علاوہ اور کچھ نہیں ورنہ آپ بتائیے کہ پیشاب اور پاخانے پر منہ رکھ کر سو جانا ادب کی کون سی خدمت ہے مجھے اس قسم کی شاعری چھاپنے والے رسائل اور اس قسم کی شاعرات کی تعریف میں رطب اللسان طبلچی نقادوں پر اس لئے غصہ آتا ہے کہ وہ ذہنی عیاشی، غلیظ دماغی اور شاطرانہ سازشی چالوں کے ذریعہ ہر بات پر مغربی طبلے کی کتھا سیا کے ساتھ عورت اور اس کے توسط سے معاشرے کا استحصال کر رہے ہیں۔ اور عورت کی سادہ لوحی اور اس کے نام نہاد حامیوں کی کم عقلی پر رونا اور ترس آتا ہے جو عورت کے استحصال کا ڈھنڈورا ساری دنیا میں پیٹ رہے ہیں لیکن تعریف کا سہرا ان کے سر لگا کر استحصال کرنے والی ایجنسیوں کی جانب ان کی نظر نہیں جاتی، یہ کہیں ساز باز تو نہیں؟ اب آپ خود سمجھئے کہ یہ ایسا ایکسپریشن ہے جس کے تصور سے بہتوں کو ابکائی آ جائے اور بات قے تک پہنچے۔ ہمارے طبلچی نقاد اسے بڑی محنت سے سراہتے ہیں۔ اس لئے کہ انھیں بھی بدبو ہی پسند ہے۔ جیسے ایک صفائی کرمچاری کلائی میں غلاظت لئے ہوئے ایک عطار کی دکان سے گزرا تو خوشبو کے اثر سے گرا اور بے ہوش ہو گیا۔ جب اسی کے سامان سے تھوڑی سی چیز سنگھائی گئی تو پھر اسے ہوش آیا اور ناک بند کئے ہوئے بھاگا۔ طبلچی نقاد بھی غیر بدبو والی شاعری سن کر ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔

ایک شاعرہ فرماتی ہے

مجھے موج موج بدن کی بے چینیوں سے
مغلوب ہونے کی وحشت دیوانہ کئے ہوئے ہے
مگر ہمارے ملک میں انسانوں کو پیار کرنے اور پیار کرتے دکھانے
کی اجازت نہیں ہے۔
اسی لئے تو آستین سے ناک صاف کرتے بچے نالی پر بیٹھی لڑکی
کو دیکھ کر باولوں کی طرح ہنستے ہیں۔

اسی انداز کی باقی سب لائنیں ہیں۔ اس نظم سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شاعرہ کے ملک میں مرد، عورت، بڈھے بڈھیاں، لڑکے لڑکی جوان لڑکے جوان لڑکی کو سر عام سڑک پر سب کے سامنے مباشرت کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ اسے یہ تکلیف ہے۔ کوئی ملک ایسا نہیں ملے گا جہاں ماں باپ اپنے بیٹے اور بیٹیوں سے پیار نہ کرتے ہوں بھائی اپنی بہن سے نہ پیار کرتا ہو۔ بیوی اپنے شوہر سے پیار نہ کرتی ہو۔ جوان مرد، جوان عورت سے پیار نہ کرتا ہو۔ لیکن یہ پیار ان کے نزدیک پیار نہیں ہے۔ بلکہ اس کے نزدیک مرد کے ساتھ سر عام سڑک پر مختلف آسنوں کے ساتھ شہوانی جذبوں کی تشنگی دور کرنے کی نمائش کا نام پیار ہے ورنہ اسے یہ شکایت کیوں ہوتی۔ سڑک پر بھی لوگ دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن دکھانے کے لئے خاص اسٹیڈیم ہونا چاہئے جس میں داخلہ بغیر ٹکٹ ہو۔ اس اسٹیڈیم میں شاعرہ اپنے عشق کے طبلچی نقادوں کے ساتھ جائے اور کرتب دکھائے۔ اسٹیڈیم کی دیواروں پر کوک شاستر اور کھجراہو کے سب آسنوں کی رنگین تصویریں ہونی چاہئے۔ جس سے لطف دوبالا ہو جائے۔ یہ شاعرہ کے نزدیک انسان کا پیار ہے۔ لیکن شاید اسے نہیں معلوم کہ اس تصور پیار کا تصور تو جانوروں کے پیار سے مستعار لیا ہوا ہے۔ جب کہ جانور بھی نہیں کیونکہ ان میں کافی پیار دار بھی ہوتے ہیں۔ شاعرہ کی پیار کی برادری میں صرف بدجانور آتے ہیں جو اس کی منشاء کے مطابق سب کے سامنے پیار کرتے ہیں۔ ایک بدجانور زیادہ ایڈوانسڈ ہوتا ہے اس کے یہاں ایک پیار کرتا ہے چار

لائن میں کھڑے انتظار کرتے ہیں۔ شاعرہ بھی اسی تصور کی قائل ہے۔ یہ پیار کی مخصوص دعوت کی قائل نہیں۔ بلکہ پیار کا جھنڈا اڑانا چاہتی ہے۔ جھنڈا ارا - دعوتِ عام کو کہتے ہیں جس میں ہر کس و ناکس شامل ہوسکتا ہے۔ ادبی طوائفیں روسی تصور کی قائل معلوم ہوتی ہیں جن کے یہاں مباشرت کوئی خاص بات نہیں ہے۔ یہ تو صرف جلد کا رگڑنا ہے جس طرح آپ جاڑے میں ہاتھ گرم کرنے کے لئے دونوں ہتھیلیاں رگڑتے ہیں۔ اس سے بھی کم اہم ان کے یہاں شہوانی رگڑ ہے۔ اس تصور کا آدمی اسے کو انسان کہتا ہے اور اسے شرم نہیں آتی۔ اسی تصور کو لئے ہوئے طبلچی نقاد ادبی طوائفوں کے پیچھے دنیا و مافیہا سے بے خبر ان کا طبلہ بجاتا ہوا چلا جاتا ہے اور طبلے سے آواز آتی ہے۔

"رینگ آف اسکن - رینگ آف اسکن"

آگے یہ شاعرہ لڑکے اور لڑکیوں کو بھی اپنی گرفت میں لینا چاہتی ہے۔ یہ چاہتی ہے کہ بچپن ہی سے لڑکوں کی جنسی دسترس لڑکیوں پر بھرپور رہے۔ یہ لڑکوں کو آستین سے ناک پونچھ کر لڑکیوں کی طرف دیکھ کر پاگلوں کی طرح ہنسنا بالکل پسند نہیں کرتی ہے۔ بلکہ یہ چاہتی ہے کہ لڑکے نالیوں پر بیٹھی لڑکیوں کو دیکھ کر ہنسنے کے بجائے وہ حرکت کریں جو نر جانور مادہ جانوروں کی شرمگاہوں کو سونگھ کر کرتے ہیں۔

ان نظموں کے ہر ہر لفظ میں برہنہ اور گھناؤنی شہوت پرستی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ اس بے حیائی، بدکرداری اور حیوانیت کو طبلچی نقاد ادب عالیہ کہتے ہیں۔ اس موقع پر مجھے ساحر کی وہ نظم یاد آ رہی ہے جس میں اس نے ثنا خوان تقدیس مشرق کو للکارا ہے۔ لیکن وہ تو صرف چکلوں کی زندگی کو دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا جہاں عیاش طبقے کے لوگ اپنا کوڑا خود ڈالنے جاتے تھے جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں کہ ان چکلے والیوں کی سماج میں کوئی عزت بھی نہیں تھی لیکن ادبی طوائفیں تو گندگی انڈیل کر معاشرے کو اور نسلوں کی تباہی کا وسیلہ بننے کے باوجود حاشیہ برداروں کی بدولت باعزت ہیں طبلچی نقاد ان کی غلاظت کو فن کا نام دے کر مغرب میں ڈھ

جاتا ہے اور وہاں سے فراڈ کی دم پکڑ کر نمودار ہوتا ہے۔ اور ادبی طوائف کی بدبودار تحریر پر سر دھنتا ہے۔ "برایں عقل و دانش بباید گریست" ادب عالیہ کے اس تصور سے نوٹنکی کا ادب بھی یاد آجاتا ہے۔ ایک نوٹنکی میں جوکرا اور اس کے ساتھ ناچنے والی ڈھیٹ گاتے تھے۔ لڑکی گاتی تھی۔

بول ترا کیا ناؤں (نام) رے　　ندی کنارے گاؤں رے
پیپل جھومے مورے آنگنا　　ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں رے

پھر جوکر گاتا تھا۔

بول ترا کیا ناؤں رے　　ندی کنارے گاؤں رے
کھٹ پٹہ جب کھیلن لاگے　　لے گئے داؤں رے

"کھٹ پٹہ" "چارپائی کے تاش" کو کہتے ہیں۔ اب احساس ہوا کہ وہ جوکرا ادب عالیہ پیش کرتا تھا اگر یہ نظمیں ادب عالیہ میں آتی ہیں تو ان نظموں کو کہنے والیوں سے مدتوں پہلے نوٹنکیاں ادب عالیہ میں پیش کر چکی ہیں اور اب بھی پیش کر رہی ہیں۔ لیکن طبلچی نقادوں نے ان پر کبھی کچھ نہیں لکھا۔ ایسی شاعری اور تنقید دونوں جنسی ناآسودگی کا نتیجہ ہوتی ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اپنی بھڑاس نکالنے کے لئے آپ سب کے سامنے ننگی کھڑی ہو جائیں اور تماش بین کی بھیڑ لگ جائے۔

طبلچی نقاد ادبی طوائفوں کی شاعری کو باغیانہ شاعری کہتے ہیں میرے خیال میں یہ بغاوت انسانیت سے ہے اخلاقی قدروں سے ہے بلکہ اپنے آپ سے ہے۔ معاشرے کی کسی خرابی سے نہیں۔ اس بغاوت میں کوئی مثبت پہلو نہیں۔ یہ کیسی بغاوت ہے کہ جس چیز کو دیکھنے اور برتنے کے لئے لوگ ہزاروں روپے خرچ کرتے ہیں۔ وہ چیز آپ سرِ عام ساری دنیا کو بغیر ٹکٹ دکھانا چاہتی ہیں۔ اور دعوتِ عام دے رہی ہیں اس بغاوت سے تو ساری دنیا کا فائدہ ہے صرف آپ کا نقصان ہے۔ اس سبب سے کہ عادت پڑ جائے گی اور جب حسن ڈھل جائے گا۔ پھر کوئی نہیں پوچھے گا اور پیسے دینے کے باوجود گرفت میں نہیں آئے گا۔ پھر کیا ہوگا یہ صرف طبلچی نقاد ہیں جو ادبی طوائفوں کو ایسی شاعری پر اکسا رہے ہیں۔ اگر اس شاعری کے خلاف نعرۂ احتجاج

بلند نہ کیا گیا تو اس میں سیتا کی بیٹی کا سب سے زیادہ نقصان ہے۔ طبلچی نقاد قدم قدم پر مغرب کی مثال دیتے ہیں۔ بیشک مغرب بلکہ یورپ کے کچھ ممالک میں یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ لیکن ہمارے لئے تمام جانوروں کی پیروی ضروری تو نہیں ایک صاحب نے اپنا ذاتی تجربہ بیان کیا کہ سویڈن کے ایک صاحب اپنی بیوی اور اٹھارہ سالہ نہایت خوبصورت بیٹی کے ساتھ ان کو بھی لے کر چشمے پر غسل کرنے کے لئے گئے۔ جہاں حوض بنا ہوا تھا وہاں باپ، بیٹی اور بیٹی اور بیوی تینوں مادر زاد ننگے ان کے سامنے کھڑے ہو گئے اور فرمائش کرنے لگے کہ آپ بھی کپڑوں سے آزاد ہو جائیے۔ پھر نہائیں۔ اسے مغرب کی ترقی یافتہ تہذیب کہتے ہیں جو پتھر کے زمانے سے بھی پہلے کی ہے۔ مغربی لوگ دوبارہ جنگل کی تہذیب میں واپس چلے گئے ہیں۔ انسانیت سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان کے لئے وہ ٹھیک ہے لیکن جو معاشرہ ابھی تک بچا ہوا ہے۔ اسے تو بخش دو۔ لیکن طبلچی نقاد اس معاشرے کو بھی بد جانوروں کے معاشرے میں تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔ طبلچی نقادوں سے دست بستہ درخواست ہے کہ وہ ادبی طوائفوں سے کہیں کہ وہ یورپ میں جا کر اپنی "دکان" کھولیں وہاں آسانی بھی آسانی ہے۔ اس معاشرے کو انسانی معاشرہ ہی رہنے دیں۔ اگر ان طبلچی نقادوں کو ادبی طوائفوں کی جدائی شاق گزرے تو ان سے بھی یہی استدعا ہے کہ اپنے الفاظ کے طبلے بجاتے ہوئے انہیں کے ساتھ چلے جائیں۔ وہاں جا کے تو ننگی رچائیں۔ ہمیں امید ہے کہ دونوں کے فن کی صحیح داد وہی قومیں دے سکیں گی۔ پھر ہماری ادبی طوائف کو افسوس اور شکایت کا موقع نہیں ملے گا کہ

"ہمارے ملک میں انسانوں کو پیار کرتے اور پیار کرتے دکھانے کی اجازت نہیں۔"

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق

سردار دیوان سنگھ مفتوں کی سوانح حیات "ناقابلِ فراموش" کو ایک منفرد اور نمایاں مقام حاصل ہے۔ اس میں نہ صرف یہ کہ کسی صف شکن مجاہد کی زندگی بکھری ہوئی ہے بلکہ اسے اردو صحافت کے طالب علموں کے لئے ایک گرانقدر اضافہ کیا جا سکتا ہے کہ اس میں ایک قابلِ تقلید صحافی کی ساٹھ سالہ صحافتی زندگی اور تجربات کا نچوڑ پیش کر دیا گیا ہے۔ مفتوں صاحب نے اپنی اس طویل صحافتی زندگی میں مشکل سے مشکل حالات میں بھی کوئی ایسی تحریر پیش نہیں کی۔ جو ان کے ضمیر سے گذ کر نہ آئی ہو۔ آج کے ان نام نہاد صحافیوں کو ان کی زندگی سے سبق لینا چاہئے جو منگنیاں چھنتے ہیں اور دعوے کرتے ہیں کہ باوضو ہیں اردو صحافت کے طالب علموں کیلئے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ مفتوں صاحب کی زندگی تا ایک زمانے کے لئے چیلنج بنی رہیں۔

ناقابلِ فراموش کی قیمت ساٹھ روپیے

صحافیوں کو محصول ڈاک معاف۔

دفتر شانِ ہند۔ فلیٹ نمبر ۸ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی نمبر ۱۱۰۰۰۲

دریا گنج کاتب سردار تولسنوی ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے خواجہ پریس چھتہ شیخ منگلو جامع مسجد دہلی سے چھپوا کر دفتر شانِ ہند فلیٹ نمبر ۸ انصاری مارکیٹ دریا گنج دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا۔

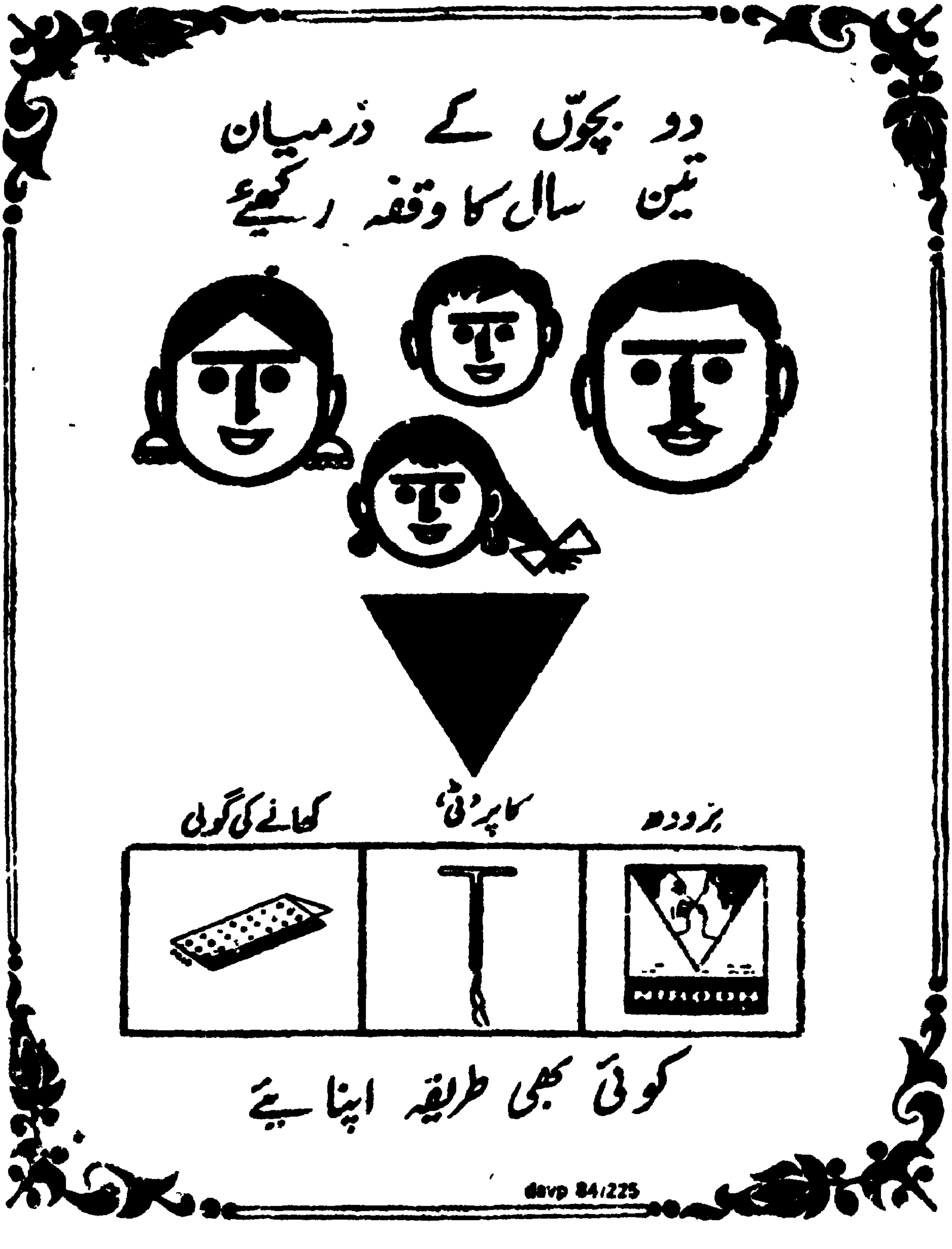
دو بچوں کے درمیان
تین سال کا وقفہ رکھیے
نرودھ
کاپر ٹی
کھانے کی گولی
کوئی بھی طریقہ اپنائیے
davp 84/225

بمبئی مرکنٹائل کوآپریٹیو بینک لمیٹڈ

جہاں آپ کی رقم دوسرے کسی بھی بینک کے مقابلے میں زیادہ تیزی سے بڑھتی ہے

* اب ۹٪ سالانہ سود حاصل کیجئے

چھ ماہ اور اس سے زائد لیکن ایک سال سے کم مدت کے لئے

* فکسڈ ڈپازٹ پر شرح سود

5	سال اور اس سے زائد مدت کے لئے	12٪	سالانہ
3	سال اور اس سے زائد لیکن 5 سال سے کم مدت کے لئے	11٪	" "
2	سال اور اس سے زائد لیکن 3 سال سے کم مدت کے لئے	۱۰٪	سالانہ
1	سال اور اس سے زائد لیکن 2 سال سے کم مدت کے لئے	9½٪	سالانہ

آپ اپنی رقم کو دوگنی اور تین گنی بھی کر سکتے ہیں -

آپ کے ایک ہزار روپے چھ سال میں =/2033 بن جاتے ہیں -

آپ کے ایک ہزار روپے دس سال میں =/3262 بن جاتے ہیں

یہ بینک دوسری کسی بھی تجارتی بینک سے کم نہیں -

یہاں سے غیر ملکی زرمبادلہ کا کاروبار بھی ہوتا ہے

تشریف لائیے

بمبئی مرکنٹائل کوآپریٹیو بینک لمیٹڈ

36 نیتاجی سبھاش مارگ ، دریا گنج ، نئی دہلی - 2

فون : 268266
264374

ٹیلیکس : 31-5453
ZAIN IN

* ریزرو بینک کے احکامات کے مطابق کسی بھی وقت تبدیل کئے جا سکتے ہیں -

گوشۂ عقیل صدیقی

آل انڈیا مشاعرہ مظفر نگر

کریم الاحسان فہمی

مظفر نگر کی سالانہ نمائش کی تقریبات کے سلسلے میں ایک آل انڈیا مشاعرہ بھی ہوتا ہے چونکہ مظفر نگر نے وجاہت جھنجھانوی مولانا الم مظفر نگری، احسان دانش، شباب کیرانوی، ڈاکٹر تنویر علوی کیرانوی، نظیر کھتولوی، مشیر جھنجھانوی، شوکت تھانوی ایسے اساتذۂ کرام اور مشاہیر شعراء کو اہل ملک کے سامنے پیش کئے وہاں جنگ آزادی کے مجاہد پیدا ہوئے، اور بہادر جیالے حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، حافظ ضامن علی شہید، مفکر شاطی قاضی عنایت علی بھی اسی سرزمین سے اٹھے جنھوں نے انگریزوں کے خلاف جنگ آزادی میں حصہ لیا آج اسی مقدس اور قابل احترام دھرتی پر یہ مشاعرہ منعقد ہو رہا ہے اس مشاعرہ کو کامیاب کرانے میں ضلع کے حکام اور افسران بالا تک دلچسپی لیتے ہیں دو سال سے یہ مشاعرہ ایسے بڑے لوگوں کو سونپا جا رہا ہے جو بخوشی اس کا جملہ بار اٹھا لیتے ہیں امسال عبدالقیوم اور محمد عرفان مالک مون سن انجینئر نے اس مشاعرہ کے تمام اخراجات خود برداشت کئے ہیں یعنی اردو دربار لی اور سرپرستی آج کارخانہ داروں، دھنا سیٹھوں کی سرپرستی میں پنپ رہی ہے لیکن یہ سرپرستی صرف مشاعرہ تک ہے یہ سب کاروباری باتیں ہیں ہر سرمایہ دار کسی مصلحت کے تحت اتنا خرچ برداشت کرتا ہے ورنہ اسے اردو کی تباہی و بربادی سے کیا دلچسپی۔!

آج ۳ر مئی ۸۵ء کی شب ہے میں ڈاکٹر عنوان چشتی تنویر چشتی اور برادرم نجم مظفر نگری کے ہمراہ عظمت باغ و تقسیم خانہ، یہ تمام جائداد وقف ہے اور کیا لطف ہے اس جائداد کا ایک حصہ نوے سال کے لئے پٹہ پر ایک سنیما کے مالک کو دے دیا گیا ہے اب یہ اللہ جانے یا کہنے والے کہیں یہ مائنکادر ساد کر دی گئی ہے کہ اشغال وقف کی جائداد کسی غیر شرعی کام کے لئے دینا جائز ہے۔؟ اور وہ بھی سینما کے لئے۔؟) سے نمائش کے لئے پیدل ہی چل دئے ہیں بمشکل تمام یہ حضرات رکشا پر چلنے کو رضامند ہو گئے ہیں جبکہ ویسے ہی دیر ہو چکی تھی دیکھا تو پنڈال کے دروازہ پر ایک جم غفیر ہے ادھر مشاعرہ شروع ہو چکا ہے اندر جانے کا کوئی راستہ نہیں ہے باہر سے چیخ چلا رہے ہیں لیکن کون سنتا ہے فغان درویش والا معاملہ درپیش ہے اس مشکل کو حل کرنے کے لئے ایک داروغہ بھی آئے انھوں نے ڈیوٹی پر تعینات ایک سپاہی سے کہا دروازہ کھولو اس طرح اندر جانے میں کامیابی ہوئی اسٹیج پر ابھی جگہ باقی تھی۔ میں نے اپنے لئے جگہ ساد ھنا کھوٹے کے قریب ہی تجویز کر لی نظامت کے فرائض انجام دے رہے ہیں پونے گیارہ ہو چکے ہیں جناب دیپک کمار اسٹیٹ منسٹر کو آپریٹو اترپردیش کا نام نامی صدارت پیش کیا جا رہا ہے اور ساتھ ہی ان کی گلپوشی بھی کی جا رہی ہے جواں سال با ہمت مون سن کے مالک عرفان صاحب کو بھی پھولوں کے ہاروں سے لاد دیا گیا ہے کیمرے والے حرکت میں آ گئے اختر گوالیاری نہ جانے کیوں مقامی شعراء کی طرح پڑھوا دئے گئے ہیں حالانکہ یہ ان کا مقام نہیں تھا جس نے بھی یہ فہرست ترتیب دی ہے مراتب کا لحاظ نہیں رکھا دیکھا تو سادھنا کھوٹے صاحبہ جو کر بمبئی۔ T.V. پر اناؤنسر ہیں اسی لباس میں شعراء کو مدعو کر رہی ہیں میں ان کے بہت ہی قریب بیٹھا ہوں وہ کیا کہہ رہی ہیں کچھ بھی تو سمجھ میں نہیں آ رہا لیجئے انصاری دیوبندی کیف بھوپالی جیسے متحرک رہتے ہیں یا ر

چاند سورج کو حسیں میں کہہ تو دوں
طیش میں ان کا جواب آ جائے گا
ہم نے بھی قاتل کو قاتل کہہ دیا
دیکھئے ہی کیا عتاب آ جائے گا

اس شعر پر یار لوگ آپ کو داد ہی نہیں دے رہے بلکہ بار بھی پہنا رہے ہیں ارشاد ہوا ہے۔ ؎

حالِ دل ان سے نہ کہنا اے شمیمؔ
روٹھ جائیں گے عتاب آ جائے گا

شمیم صاحب داد وصول کئے اپنی جگہ آ رہے ہیں اور اب اسلم الٰہ آبادی غزل سرا ہیں ؎

قاتلوں کے مجمع تک یہ خبر بھی پہونچا دو
میرے شہر میں بچے بھی جوان ہوتے ہیں
کچھ تو حالِ دل کہیے کچھ تو گفتگو کیجئے
راستوں کے سناٹے بدگمان ہوتے ہیں
بے غرض کسی سے بھی اب کوئی نہیں ملتا
مصلحت کے آئینے درمیان ہوتے ہیں

اسلم صاحب خوب خوب داد لوٹے مائک سے جدا ہوا رہے ہیں اب جواں سال جواں فکر اور مترنم شاعر نجم مظفر نگری آ کر غزل سرا ہیں ؎

جو دل شکن ہو وہی، صورت مفر ٹھہرے
یہ حال ہو تو کہاں نقطۂ نظر ٹھہرے
مرے لئے تو برابر ہیں رہبر و رہزن
میں بے نیاز ہوں کوئی ہمسفر ٹھہرے
اب ان کے ہاتھ میں جو بھی ہو فیصلہ دل کا
میں کم نگاہ ہوں وہ صاحبِ نظر ٹھہرے

نجم صاحب بھی داد و تحسین پا کر آ رہے ہیں دیکھا تو ایک نوجوان سر برہنہ بارِ ریش مبارک مائک پر آ کر رواں دواں سا کر چلتے بنے یہ مطلع عادل لکھنوی کا سن ہی لیجئے۔

ہے نہ ڈاڑھی اور نہ مونچھیں صرف سر کے بال ہیں
عورتیں او رینجل ہیں مرد سب نقال ہیں

وہ دیکھئے اس جمود کو توڑنے کے لئے حق کانپوری آ گئے ہیں فلاسفول کو نظر انداز کر کے محفل کو گرما رہے ہیں ؎

یہ ستارے سو نہ جائیں یہ سماں بدل نہ جائے
تری راہ تکتے تکتے مری جاں نکل نہ جائے
ذرا دیر کو ٹھہر جا یہی گردشِ زمانہ
میری زندگی بدل کے کوئی خود بدل نہ جائے

پنڈال پر وجدانی کیفیت طاری کر کے خود بھی جھوم کر فرما رہے ہیں ؎

حسن اپنا نہ بار بار دیکھئے　لگ گئی آئینہ کی نظر دیکھئے
پہلے اپنی قبا پر نظر دیکھئے　پھر زمانہ کے عیب و ہنر دیکھئے

لیجئے اب داد دینے والے پنڈال کو اڑانے کی ٹھان رہے ہیں اور آپ یوں سحر کاری کر رہے ہیں۔ ؎

اک نظر دیکھ لینا غضب ہو گیا　آپ ہی آپ ہیں اب جدھر دیکھئے

داد کا وہی عالم ہے اور آپ اسی سج دھج سے محفل کو گرما رہے ہیں ؏

دل یہ کہتا ہے اسی شوخ کو دیکھ کر

محترمہ ساد رضا صاحبہ ذرا ــــ حق صاحب مسکرا کر فرما رہے ہیں۔ شعر لکھ رہی ہیں ــــ مظہر صاحب ــــ ضرور لکھیں لیکن ؏

اک نظر کچھ نہیں عمر بھر دیکھئے

لیجئے تالیاں جاگ اٹھی ہیں اور حق صاحب ایک اور ایک اور کے شور کو اڑاتے ہوئے مائک سے کھسک آئے ہیں اور صادق صابری فرما رہے ہیں ؎

رزق اللہ دیا کرتا ہے سرکار نہیں
صرف سرکار اسے بانٹ دیا کرتی ہے
دوسروں کا جو ہڑپ جائے یہ اس کا فن ہے
ہاں جو چلاّئے اسے ڈانٹ دیا کرتی ہے

پنڈال قہقہوں کے نرغے میں ہے اور صادق صاحب زعفراں زار داد وصول کئے چلتے بنے چونکہ اس اطراف میں ساد رضا صاحبہ پہلی بار آئی ہیں نہ وہ ادھر کے عوام کے مذاق سمجھتی ہیں نہ عوام ان کی زبان اور انداز کو پسند کرتا ہے زبان کا وہی لب لہجہ ہے جو ٹی وی پر لیتے وقت ہوتا ہے یہ دیہاتی سامعین کا مشاعرہ ہے ان کی شخصیت سے کوئی بھی تو متاثر نہیں ہوا اور مشاعرہ ہوٹنگ کی نذر ہو گیا ہے اس نازک حالت میں انور جلالپوری کو یہ زحمت دی جا رہی ہے کہ وہ اس مشاعرہ کو ڈوبنے سے بچا لیں ان کا نام سن کر تالیوں سے ان کا خیر مقدم کیا جا رہا ہے ان کی گلپوشی کی جا رہی ہے ساد رضا صاحبہ کا انتخاب برا نہیں تھا لیکن دیہات کا میاب شہر نہیں ہر مشاعرہ کمیٹی یہی چاہتی ہے کہ ان کا مشاعرہ کامیاب ہو لیکن کبھی کبھی انتخاب غلط بھی ہو جاتا ہے آئیے پھر اسی محفلِ غزل میں چلئے اور عبدالحق سحر مظفر نگری سے یہ حسین غزل سنئے ؎

کرب کے رخ پہ آثار اپنی جگہ
درد سے پھر بھی انکار اپنی جگہ

رحمتوں کے طلب گار اپنی جگہ
اک پشیماں گنہگار اپنی جگہ

اب داد کا عالم کچھ اور ہوا ہے سحر صاحب یوں سحرکاری کر رہے ہیں

فصل گل کی جدائی بہارِ چمن ۔ پھول اپنی جگہ خار اپنی جگہ
آج بھی منتظر سرفروشوں کی ہے ۔ اے سحر عظمتِ دار اپنی جگہ

سحر صاحب خوب خوب داد سمیٹے اپنی جگہ آ رہے ہیں اور اب مشہور انقلابی شاعر کامل شفیقی جونپوری آ کر ایک نظم عطا کر رہے ہیں نظم پوری نہ کر سکے اور برہمی کے عالم میں مائک سے جدا ہو رہے ہیں اور راز الہ آبادی یوں گلوکاری کا مظاہرہ کر رہے ہیں ؎

میرے خون کی سرخی کیسا رنگ لائی ہے
آج میرے قاتل کی آنکھ ڈبڈبائی ہے
وقت کے خداؤں کی یہ بھی ناخدائی ہے
آج میں ساحل پر ناؤ ڈگمگائی ہے

ادھر داد شباب پر ہے ادھر خمار صاحب ہاتھ لہرا کر چیخے ع
یہ بھی میرا بھائی ہے وہ بھی میرا بھائی ہے

اس پر ایک قہقہہ بلند ہوا ہے اور راز یوں زور آزمائی کر رہے ہیں ؎

کل وفا پرستوں کو بیوفا جو کہتا تھا ۔ آج اس کے ماتھے پر داغ بیوفائی ہے
یہ بھی اک تماشا ہے عالم محبت کا ۔ جرم تھا اس آنکھ کا چوٹ دل نے کھائی ہے

راز صاحب کامران پلٹ رہے ہیں اور سرور بارہ بنکوی غزل الاپ رہے ہیں ؎

[illegible] ✣ جو ورق خانہ کا ہے تو اترائیے نہیں
بے پردہ میرے سامنے آ بیٹھیں ✣ یوں آئینہ سے آئینہ ٹکرائیے نہیں
وعدہ جو کیجئے تو خیال وفا رہے ✣ جھوٹی کسی کے سر کی قسم کھائیے نہیں
حضرت یہ ہم سے پوچھئے اس کی تہہ کا ✣ کم ظرف کیا بتائیں گے مستی شراب کی
حالت نہ پوچھئے دل خانہ خراب کی ✣ یاد آ گئی ہے جب بھی تمہارے شباب کی

سرور صاحب محفل کو گرما کر اپنی جگہ آ رہے ہیں اور شانتی صبا غزل سرا ہیں ؎

رازِ دل اپنا زمانے کو بتاتے کیوں ہو
میری تصویر زمانے کو دکھاتے کیوں ہو
لوٹ آؤ کہ در و بام بلاتے ہیں تمہیں
تم مرے شہر میں آئے ہو تو جاتے کیوں ہو

آپ اس بھونچال کا اندازہ نہیں کر سکتے جو دوسرے شعر پر پنڈال میں برپا ہوا ہے شگفتہ غزل پڑھنے والی تمام مجسم نغمہ ۔ ایک سماں بندھا ہوا ہے ۔ اور آپ اسی بانکپن سے لہرا رہی ہیں ؎

رو نے دھونے سے مقدر تو سنور نے سے رہا
بھیگی پلکوں پہ حسیں خواب سجاتے کیوں ہو
کوئی بھی شب مری قسمت میں سکون بخش نہیں
تم چراغوں کی طرح مجھ کو جلاتے کیوں ہو
جس کو پینے کا سلیقہ نہ پلانے کا شعور
ایسے کم ظرف کو محفل میں بلاتے کیوں ہو

اب یار لوگ پھولوں کی ورشا کرنے پر اتر آئے ہیں یہ تفریح بڑی دیر سے چل رہی ہے شاید انھیں معلوم نہیں ہے کہ اس مشاعرہ میں ایسی ناشائستہ حرکت کبھی نہیں ہوتی ہے اور یہ محفل ادب بھی ہے دیکھا تو منظر بھوپالی محفل کا جائزہ لے کر غزل چھیڑ رہے ہیں ؎

زلف کے سائے میں زندگی گزاری ہے
دھوپ بھی تمہاری ہے چھاؤں بھی تمہاری ہے
بچ کے ہم کدھر جاتے اس سیاسی جنگل سے
اک طرف درندہ ہے اک طرف شکاری ہے

اب داد پر ہنگامہ کا گماں ہو رہا ہے اور اسی اعتماد سے لہرا رہے ہیں ؎

باپ بوجھ ڈھوتا تھا کیا جہیز دے پاتا
اس لئے وہ شہزادی آج تک کنواری ہے
کہہ دو میر و غالب سے ہم بھی شعر کہتے ہیں
وہ صدی تمہاری تھی یہ صدی ہماری ہے

منظر صاحب صبا کے بعد خوب خوب جمے اور خوب خوب داد و تحسین لوٹے مائک سے جدا ہو رہے ہیں ادھر فرحت احساس دوران [illegible] سنا کر بیٹھ گیا اور وہ جا رہے ایک شعر آپ بھی سنتے چلئے ؎

میں اک ذرا سا دیا ہوں وہ تیز آندھی ہے
میں اس سے ہار بھی جاؤں تو میری ہار نہیں

آئیے اب سلیم کھتولوی سے سنی سنائی غزل سنئے ؎

ہمارا کسی جگہ ماتم نہیں ہے ۔ تمہاری آنکھ پھر بھی نم نہیں ہے

کوئی ساتھی کوئی ہمدم نہیں　　مگر خود اعتمادی کم نہیں ہے
شریفوں کا چلن اپنانے والو　　شرافت کی سزا بھی کم نہیں ہے
نقیبِ شہر سے پوچھو تو لوگو　　تری آواز میں کیوں دم نہیں ہے

سلیم صاحب داد وصول کئے اپنی جگہ لائے جا رہے ہیں اب کوئی بمبئی سے آئی ہوئی دیپا آ رہی ہیں میں نے محترم مظہر صاحب سے عرض کیا یہ دیپ سے دیپا بنا ہے غالباً دیکھا تو دیپا صاحبہ کچھ سٹپٹائی سی سرپٹا سنا رہی ہیں ؎

جب بھی دیپا مرا آشیانہ جلا　　اہلِ گلشن یہ سمجھے سحر ہو گئی

اسلام دریافت پر خطیر رقم برباد کی گئی ہے یہ بھی ساد صاحب کے ہمراہ بمبئی سے چلی آئی ہیں یہ بھی نہیں ہیں ہوٹنگ کی تاب نہ لا کر پلٹ آئی ہیں۔ ادھر مقرب حسین مقرب بھی آج کوئی خاص رنگ نہ جما سکے اور انور جلالپوری اس منظر کو دیکھ کر خود ہی سنانے کے لئے آ گئے ہیں فرما رہے ہیں ؎

نہ بام و در نہ کوئی سائبان چھوڑ گئے
مرے بزرگ کھلا آسمان چھوڑ گئے
تمام شہر کے بچے یتیم بھی تو نہیں
کھلونے والے جو اپنی دکان چھوڑ گئے
وہ جس کو پڑھتا نہیں کوئی بولتے سب ہیں
جنابِ میر بھی کیسی زبان چھوڑ گئے

انور صاحب داد و تحسین پا کر پھر زحمتِ سخن دے رہے ہیں مظفر رزمی کیرانوی کو ۔ رزمی صاحب غزل سرا ہیں ؎

چراغِ شہرِ محبت بجھا دئے کس نے
ہر ایک راہ میں شعلے سجا دئے کس نے
نہ زلزلہ ہے نہ طوفان ہے اور نہ آندھی ہے
تو پھر یہ پیڑ اچانک گرا دئے کس نے
ہمارے ساتھ نہ تھا کوئی راہبر کے سوا
تو پھر یہ راہ میں کانٹے بچھا دئے کس نے

رزمی صاحب بھی داد پا کر اپنی جگہ آ رہے ہیں اور اب ترنم کانپوری آ کر تھوڑے سے سکوت کے بعد لحن داؤدی میں غزل چھیڑ رہی ہیں ؎

کلیوں کو حسن اور گلوں کو نکھار دے
اجڑے ہوئے چمن کو مسلم بہار دے
گذر رہی ہے ایک عمر غموں کے حصار میں
دو چار دن خوشی کے بھی پروردگار دے
شایانِ اعتماد محافظ بھی اب نہیں
ایسا نہ ہو کسی کے سینے میں خنجر اتار دے

داد کا سابقہ ریکارڈ بھی اس ہنگامہ پر دیکھا رہا ہے کہ یہ کیا ہو رہا ہے کئی بار دہرا کر اسی سج دھج سے محفل کو لوٹتے چلی ہیں ؎

ہاں اے نیاز مند در بے نیاز پر
آواز دے رہا ہے تو پھر بار بار دے

ترنم صاحبہ کامران آ رہی ہیں اور اب تالیوں کے شور میں دیوبند کے جواں سال خوبرو خوش پوش خوش گلو شاعر نواز دیوبندی کیا آئے کہ فرمائشوں کا ایک عل غپاڑہ ہے اور آپ غزل سرا ہیں ؎

رنج دے کے کیوں آخر مسکرا نہیں دیتے
تم صدا تو دیتے ہو جو صدا نہیں دیتے
اب تو مان لیجئے وقت کا یہ فتویٰ ہے
حق طلب تو کرتے ہیں ہم دعا نہیں کرتے

دوسرے مصرعہ پر بھونچال سا آیا ہے اور نواز صاحب فاتحِ محفل بنے فرما رہے ہیں ؎

منزلیں تو خود اپنے عزم ہی سے ملتی ہیں
رہنما مسافر کو راستہ نہیں دیتے
کیا غضب کیا تو نے کمسنوں کے ہاتھوں میں
دل تو دل ہے آخر آئینہ نہیں دیتے

نواز صاحب داد لوٹتے مائک سے جدا ہو رہے ہیں اور حبیب ہاشمی ایک سنی سنائی غزل الاپ رہے ہیں ؎

سورج کے خداؤں کی یہ کور نگاہی ہے
محلوں میں اجالا ہے کٹیوں میں سیاہی ہے
محسوس یہ ہوتا ہے یہ دورِ تباہی ہے
شیشے کی عدالت ہے پتھر کی گواہی ہے
دنیا میں کہیں ایسی تمثیل نہیں ملتی
قاتل ہی محافظ ہے قاتل ہی سپاہی ہے

لیجئے ہمیر داد نے بھونچال کو جنم دیا ہے ایسا محسوس کر رہا ہوں اب حبیب صاحب تھے اور کچھ نہیں سنا جائے گا ادر

اس شعر کے بعد رد ہی کیا جاتا ہے ویسے وہ آٹھ جیسے سنیں میں۔ صرف اس شعر نے جمایا ہے - آپ جا رہے ہیں ایک غزل سنانے کے لئے کلکتہ سے آئے ہیں۔ دوسری غزل تو جب سنی جاتی جو پہلی غزل کا کوئی اثر چھوڑتے لیجئے ساغر خیامی وہی سنے سنائے قطعات سنا کر چلتے بنے آئیے تو اس جمود کو توڑئیے اور راحت اندوری سے سنئے ؎

کبھی دماغ کبھی دل کبھی نظر میں رہو
یہ سب تمہارے ہی گھر ہیں کسی بھی گھر میں رہو
ہے اب یہ حال کہ در در بھٹکتے پھرتے ہیں
غموں سے میں نے کہا تھا کہ میرے گھر میں رہو

داد کا یہ پنڈال شکن دھاکہ کم ہوا تو گرج رہے ہیں ؎

ہمیں چراغ سمجھ کر بجھا نہ پاؤ گے
ہم اپنے گھر میں کئی آفتاب رکھتے ہیں
یہ میکدہ ہے وہ مسجد ہے وہ ہے بتخانہ
کہیں بھی جاؤ فرشتے حساب رکھتے ہیں

پھر آہ اور واہ کا ایک شور سا شور رہے اور آپ للکار رہے ہیں ؎

ابھی تو صرف پرندے سے شکار کرنا ہے
یہ پھر بتائیں گے کس کو شکار کرنا ہے
بہت غرور ہے تجھ کو اے سر پھرے طوفان
مجھے بھی ضد ہے کہ دریا کو پار کرنا ہے

اب داد دینے والے ہاتھ لہرا کر اچھل کود پر اتر آئے ہیں اور آپ تالیوں کی گڑگڑاہٹ میں جا رہے ہیں اور زبیر رضوی تالیوں کی جھنکار میں آکر مجھے ترنم سے غزل الاپ رہے ہیں ؎

کہاں جاؤں گا میں عشق رائیگاں لے کر
یہ اپنے رنج یہ اپنی اداسیاں لے کر
کہاں برس گئیں کس کو بھگو گئیں جانے
چلے تو ہم بھی گھٹاؤں کا سائباں لے کر
سنے گھروں میں [illegible] اور نہ صحرا میں
پرندے لوٹ گئے اپنے آشیانے لے کر

غزل کے بعد گیت چھیڑ رہے ہیں سامعین میں سے کئی من چلے گیت کے بول پر تالیاں بجا رہے ہیں اور زبیر صاحب اسی ہنسی مذاق میں جا رہے ہیں دیکھا تو کوئی نذیر الہ آبادی آئے ہیں کیا سنایا کس نے کیا سنا اسے اللہ ہی جانے - آپ کو یار لوگوں نے اڑا دیا ہے لیجئے کل کے شعلہ اور گلوکار شاعر انور مرزا پوری کئی سال کے بعد منظر پر آئے ہیں اب تو ان کی عمر اور صحت کا تقاضا ہے کہ وہ گھر پر ہی آرام کریں - گھسے پٹے اور بوڑھے ترنم سے وہی عامیانہ اشعار سنا رہے ہیں ؎

میکدہ والے ہندو نہ مسلماں سمجھے
جو بھی میخانہ میں آیا اسے انساں سمجھے
آشیانے میں مرے آگ لگی تھی لیکن
دیکھنے والے گلستاں میں چراغاں سمجھے

انور صاحب زور آزمائی کر کے جا رہے ہیں اور افضل صدیقی فرما رہے ہیں ؎

کیا کیا نگاہ ناز بھی جادو جگا گئی
محفل میں اہل دل کو بھی بسمل بنا گئی
میری وفا کے تذکرے اس کی زبان پر
جنگل کی آگ جیسے شہر تک بھی آگئی

اس بار نفرتوں ہی سے لو دے رہے مجھے
فصل وفا تو اب کے برس جل جلا گئی

افضل صاحب داد وصول کئے جا رہے ہیں ادھر صدر مشاعرہ تشریف لے جا رہے ہیں ادھر جناب سعید مرتضیٰ صاحب کی صدارت کا اعلان کیا جا رہا ہے ادھر کیف بھوپالی عالم رویا میں تھرک رہے ہیں ؎

گیت گانے لگے شمسی تو خدا سے ڈرنا
شاعری چھوڑ دے بیکل تو ہمیں خط لکھنا
ماں نے آنگن میں لگائی تھی جو انگور کی بیل
اس میں پھوٹے کوئی کونپل تو ہمیں خط لکھنا

آپ لڑکھڑاتے چلتے بنے اور ہلال صاحب نے ایک پرانی نظم سنا کر رنگ محفل بدل دیا اب سادھنا کھوٹے غالباً میاں کی غزل سنا رہی ہیں ؎

ہم ادھر ہیں تو وہ ادھر تنہا   ہیں محبت میں کس قدر تنہا

میرے ہمراہ ساری دنیا ہے
ساری دنیا مری میں مگر تنہا
ہر مسافر کو راہ دکھلا کر
جل گئی شمع رہ گزر تنہا

ساد صفا صاحب جا رہی ہیں ادھر تالیوں کی جھنکار میں شمیم جے پوری آکر لحن داؤدی میں غزل سرا ہیں ؎

غیرتِ عشق اب ان کا گھر چھوڑ دے
جی نہیں چاہتا ہے مگر چھوڑ دے
عشق میں نارسائی بڑی چیز ہے
جس میں منزل ہو وہ رہگزر چھوڑ دے
میں سمجھ لوں گا سب کچھ مجھے مل گیا
میرا دستِ طلب تھام کر چھوڑ دے

شمیم صاحب محفل کو نغمگی میں ڈبو کر اپنی جگہ آ رہے اور پروفیسر عنوان چشتی عطا کر رہے ہیں ؎

جو خط لکھو تو ہمارا سلام بھی لکھو
پھر اس کی چھت پہ اترنے لگے کبوتر کیا
یہ کیسا شخص ہے کیوں جنگلوں کی بات کرتا ہے
کہ اس میں شہر کی شائستگی دیکھی نہیں جاتی

عنوان صاحب بجلی سے کام لے کر آ رہے ہیں اور محترم نذیر بنارسی رواں دواں سنا رہے ہیں ایک شعر سنئے ؎

ہم لوگ تو خود ہی طوفاں ہیں، اٹھتا ہوا طوفاں کیا دیکھیں
دیکھیں گے جو آپ کے قدموں پر جھکتا ہوا طوفاں دیکھیں گے

لیجئے شہریار غزل خمار بارہ بنکوی اسی دلکش ترنم سے غزل سرا ہیں ؎

غم چھپانے سے چھپ جائے ایسا نہیں
بے خبر تو نے آئینہ دیکھا نہیں
دو سیر ندے اٹھے آنکھ نم ہو گئی
آج سمجھا کہ میں تجھ کو بھولا نہیں
ترکِ مے کو ابھی دن ہی کتنے ہوئے
کچھ کہا ہے کو زاہد تو اچھا نہیں

اہلِ منزل ابھی سے نہ مجھ پر ہنسیں
پاؤں ٹوٹے ہیں دل میرا ٹوٹا نہیں
ہر نظر مری بن جاتی زنجیر پا
اس لئے جاتے ہوئے مڑ کے دیکھا نہیں

خمار صاحب نے ایک غزل اور سنائی اور خوب داد و تحسین پا کر کامران جا رہے ہیں اور ساتھ ہی مشاعرہ بوش شاہد مجبوری آکر شعراء کرام کی کاٹ چھانٹ کر کے مشاعرہ میں جان ڈال کر چار بجے مشاعرہ کا اختتام کر کے جا رہے ہیں اور مشاعرہ بھی ختم ہو رہا ہے۔

اس مشاعرہ کو اس سال کا سب سے مہنگا مشاعرہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا عام شہرت یہ ہے کہ اس مشاعرہ پر ساٹھ ہزار روپے خرچ ہوئے اور ساد صفا کھونٹے ہی پر کم از کم پندرہ (یہ بھی مشہور رہے) خرچ کئے گئے تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ لال قلعہ کے مشاعرہ کے بعد یہ سب سے عظیم مشاعرہ ہے اور جس طرح وہ ناکام ہوتا ہے اسی طرح یار لوگوں نے اسے بھی آتش رنج میں اڑا دیا۔ مقامی چپقلش اور سیاست کی کارفرمائی ہے ورنہ یہ مشاعرہ تاریخی اور یادگاری ہوتا ہے۔ جناب محمد عرفان - عبدالقیوم اعوان مسن انجینئر، معین عالم عثمانی وغیرہ نے اس مشاعرہ کو کامیاب کرانے میں ہر ممکنہ جدوجہد اور کوشش کی اگر چند پرکھنے والے اس مشاعرہ کو پسند نہیں آیا تو وہ کیا کریں اور ان کا قصور بھی کیا ہے وہ اس مشاعرہ کو کامیاب کرانے میں جنا ہی رہے ہو یہ بھی کر دیں دو سیتھوں کی کوئی بات [illegible] خلاف ہو گئے اور علاقہ پرو پیگنڈہ کرتے [illegible] ایک دھڑا [illegible] رو پر حاوی ہو جاتا ہے شعر ہے

دلوں میں [illegible] ہم نہیں سمجھے
اور کیا دشمن ہوں خدا حافظ سے

جو کر رہے ہیں پس پردہ دشمنی اب تک
بڑے خلوص سے آتے تھے وہ کسی کے لئے

قافلۂ حجاز
اسلامی تاریخی ناول
صادق سردھنوی
۴۰/- روپے

ماہِ صیام کا تحفۂ عظیم

کا سب سے اعلیٰ تحفہ

القرآن المنظوم

مرتبہ: کبیر کوثر

- قرآن پاک کا اردو، ہندی، انگریزی میں منظوم ترجمہ
- قرآن مجید کے ترجموں کی تاریخ ساز اولین پیش کش
- قرآن مجید کے متن کے ساتھ ساتھ اردو ہندی میں لفظ بہ لفظ کبیر کوثر کا منظوم ترجمہ
- قرآن حکیم کا متن اور عبد اللہ یوسف علی کا انگریزی ترجمہ جسے حکومتِ سعودی عربیہ کی سند منظوری حاصل ہے۔
- ہندوستان کے علمائے کرام جناب ابوالحسن، منت اللہ صاحب امیر شریعت بہار اور اڑیسہ، قاضی القضات مولانا نظام الدین، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی مرحوم وغیرہ کی اسناد پسندیدگی سے مرصع۔
- فوٹو آفسیٹ پر دو رنگی طباعت۔ رنگین سرورق
- ہدیہ دس روپیہ فی پارہ علاوہ محصول ڈاک۔ یا حسب حیثیت

کبیر کوثر کی دلکش، نظر افروز، سہل المفہوم مساعیٔ جمیلہ کا نادر و نایاب تحفہ

پہلا پارہ یکم جون ۱۹۸۵ء سے دستیاب ہے

تقسیم کار

ماہنامہ "شان ہند" فلیٹ ۵ انصاری مارکیٹ دریا گنج۔ نئی دہلی ۲

کل ہند مسیحی اردو مصنفین ایسوسی ایشن کی الہ آباد کے مشاعرہ اور کانفرنس کی سرگذشتِ برگشتہ

جوزف انور

جناب رشید احمد صدیقی کا خیال ہے کہ طنز و مزاح ایک ایسا مشغلہ ہے کہ ذرا سی چوک ہو جائے تو عامل خود اس کا شکار ہو جاتا ہے مگر ساتھ ہی جناب شکیل الرحمان کا کہنا ہے کہ طنز و مزاح خلوص و محبت کی انتہا بھی ہوتی ہے لہٰذا اس سرگذشتِ برگشتہ کو خلوص کی انتہا ہی سمجھا جائے گا کیونکہ ہم مزاح نگار ہیں نہ طنز نگار ہیں۔ ہم تو بقول اکبر الہ آبادی اتنا ہی جانتے ہیں کہ ؎

کیا ہے باقی جناب قبلہ میں
کچھ حدیثیں ہیں ایک ڈنڈا ہے"

بدایوں میں کل ہندمسیحی اردو مصنفین یعنی AICUWA کی کانفرنس ہوئی مگر ہم نہیں گئے۔ ایک تو تلاشِ بسیار کے باوجود ہم پتہ نہیں لگا سکے کہ بدایوں ہندوستان کے نظام میں کس مردم خیز خطہ میں واقع ہے اور کچھ ہم بیگم کے سوالات کے اطمینان بخش جوابات بھی نہ دے سکے۔

یہ بدایوں کہاں واقع ہے کیا وہاں کیمپٹی فال جیسا جھرنا ہے؟

نہیں۔

ڈل لیک جیسی جھیل تو ہوگی۔

نہیں۔

تو پھر وہاں ہے کیا؟

شعر و ادب کا گہوارہ ہے۔ اردو کے مشاہیر شعرا و ادبا کا گڑھ ہے۔

یہ چتورگڑھ فتورگڑھ جیسی جگہ میں نہیں جانے والی۔ یہ تمہارے ایسوسی ایشن والے بھی تمہاری طرح مٹھ بونجے ہیں۔ ارے تم لوگ سری نگر، اوٹی، کوڈائی کنال میں مشاعرے کیوں نہیں کراتے۔ بیگم چونکہ دور کی کوڑی لائی تھیں لہٰذا قہرِ درویش برجانِ درویش کے مصداق چپ رہنے میں ہی عافیت سمجھی۔

بدایوں کے بعد ۱۹۸۳ء کا اجلاس AICUWA نے بریلی میں منعقد کیا۔ اس مرتبہ بریلی کے بازار میں جھمکوں کی ترغیب سے بیگم کو بہ آسانی پھسلایا جا سکتا تھا مگر ہمارا ماتھا خود ٹھنکا۔ کہیں دھوکہ دھڑی تو نہیں۔ کیونکہ اہلِ جنوں کے لئے تو سرزمین ہند میں کتنی دشت و قبیل ہیں مگر اہلِ خرد کے لئے آگرہ اور بریلی کے سوا اور کہیں ٹھکانا نہیں۔ مبادا یہ دستِ قضا و قدر سے بچے تیس پینتیس مسیحی اردو شعرا بریلی کے بتھے چڑھ گئے تو ان تیس چالیس ہزار مسیحی قوالوں کا کیا ہوگا۔ جن کا شادی بیاہ کے موقع پر لت بجنے کے لئے ہمارے پاس فی الحال کوئی نعم البدل بھی نہیں۔ اسی دور اندیشی کے باعث ہم نے اپنے جیب و گریباں کو بچا لینے ہی میں اپنی عافیت سمجھی۔ آپ کہیں گے ہم فضول خائف تھے آخر یہ اردو شاعری کے خناق رفو گر کس کام آتے۔ مگر صاحب سچ پوچھئے تو ہمیں یہ جیب و گریباں کی ترکیب ہی سمجھ میں نہیں آئی۔ اللہ جانے کس جیب کترے کی ایجاد کردہ ہے۔

امسال یعنی ۱۹۸۴ء کے ماہ نومبر میں انجمن کی سالانہ کانفرنس الہ آباد میں منعقد ہونی تھی اور یہ معنت کی ذرہ دوسری ہمارے دیرینہ دوست پادری کیو۔ جے۔ زیدی صاحب نے اپنے سر لی تھی ایک عرصے سے کچھ ہم بھی سربکف گھر سے باہر نہیں نکلے تھے لہٰذا ایک دن رات کے پچھلے پہر ہم نے بیگم کا موڈ خوشگوار دیکھا تو دھیمے سے پوچھ ہی لیا۔

اب کے الہ آباد میں کانفرنس ہے۔ سنگم دیکھو گی۔

سنگم۔ ہاں سنگم تو ضرور دیکھوں گی

وہ مارا ہم نے دل ہی دل میں کہا اور دوسرے دن ہی زیدی صاحب کو لکھ دیا کہ حریم ناز سے بیگم صاحبہ بھی بعد ناز جلوہ فگن ہونا چاہتی ہیں لہٰذا حرم سرا کا انتظام کر رکھیں۔ گو جواب ندارد۔ سوچا اگر مرنا تو اسپتال ہی میں ہے مگر اکبر الہ آبادی کی روح کو ثواب پہنچانے کو عمر عزیز کے کچھ دن ہوٹل میں بھی گزار لئے جائیں تو کوئی مضائقہ نہیں لہٰذا

ہم بیگم کو ساتھ لے کر ۱۱، کی رات کے بارہ بجے الٰہ آباد پہنچ ہی گئے چونکہ طبعاً کچھ محتاط قسم کے ہیں چنانچہ یہ دیکھنے کہ زیدی صاحب نے حرم سرا کا انتظام کیا بھی ہے کہ نہیں، بیگم کو ویٹنگ روم میں چھوڑ کر سینٹ جانسن سکول جہاں مدعوین کے قیام و طعام کا انتظام کیا گیا تھا رکشا لے کر چل پڑے۔ سینٹر گرجہ کے قریب پہنچے تو عجیب ہو کا عالم تھا۔ نہ کوئی آدم نہ کوئی آدم زاد، بس جھینگروں سے رکشا والے کی صحت و نیت کا محاسبہ کیا۔ چابیوں کے گچھے کو مٹھی میں لے کر خواجی کا پنجہ بنا لیا کہ رکشا والا اپنے دھندے میں قابو کوئی تو آوارہ تھا۔ بخیریت تمام منزل مقصود یعنی جانسن سکول پہنچا دیا۔ گیٹ پہ دو کم عمر لڑکے کھڑے تھے شاعروں کو تو وہ کیا خاک سمجھتے۔ لہٰذا ہم نے اردوئے معلی میں پوچھا۔

کیوں بھیا یہاں کچھ الٹے سیدھے قسم کے لوگ آئے ہیں۔

ہاں، اور انھوں نے ایک کمرہ کی جانب اشارہ کر دیا۔

کمرے میں پہنچے تو عجب منظر دیکھا۔ پلنگ سے پلنگ سٹے پڑے تھے۔ یار لوگ لمبی تانے سو رہے تھے۔ فہیم شملوی اور شوق جالندھری جاگ رہے تھے

آ۔ ہا فہیم صاحب۔ اَر۔ ہو شوق صاحب۔ ہم نے نعرۂ بیداری لگایا۔

یار لوگوں نے کروٹ بدلی۔ کنکھیوں سے ہمیں دیکھا اور پھر آنکھیں موند لیں۔ یعنی پلنگ سلامت، صاحب سلامت تو صبح بھی ہو جائے گی۔ ہم بھی تاڑ گئے کہ یہاں حرم سرا تو کجا۔ زیدی صاحب بمشکل تمام خواجہ سراؤں کا انتظام کر پائے ہیں۔

رات ویٹنگ روم میں استراحت کیا اور صبح جب بیگم کے ساتھ جانسن سکول پہنچے تو یکے بعد دیگرے طالب، قربان، اختر کیفی اور دیگر شعرا حضرات سے بغلگیر ہوئے۔ طالب صاحب نے چھوٹتے ہی لوٹن کا بوجھ سر پر رکھ دیا۔

اماں انور صاحب کہاں چلے گئے تھے ہم لوگ تو آپ کو اور بھابی کو ڈھونڈنے سٹیشن آئے تھے۔ ہم بھی مسکرا دیئے۔ ظاہر ہے صبح کی چائے پینے ان حضرات کو سٹیشن تو آنا ہی تھا پھر بھی ہم نے دل برداشتہ اپنے جذبوں کو چوڑا کرتے ہوئے ان حضرات کے خلوص الاماں کو شرف قبولیت بخشی۔

چنانچہ ایک رکشا میں شعرا حضرات سے آئی اور آئیں تو زیدی صاحب بھی آ گئے۔ کچھ حضرات کے تیوری پر بل دیکھے تو زیدی معاملہ کی نزاکت کو سمجھ گئے۔ اظہار معذرت کرتے ہوئے فرمایا۔ سکول میں بچوں کے امتحانات چل رہے ہیں بارہ بجے ختم ہو جائیں گے سب کی رہائش کا خاطر خواہ انتظام کر دیا جائے گا۔ ظاہر ہے جانسن سکول پھر سکول ہے کوئی برلنگٹن ہوٹل یا سیوائے کینیڈا ہال تو ہے نہیں۔ قاقم و سنجاب میسر نہ ہو تو فرش گل پر قناعت کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

ہم دل ہی دل میں نادم ہو رہے تھے کہ ایک ہم ہی تنہا ہیں جو اپنی بیگم کو آوارگانِ عشق کی محفلوں میں لئے ڈولتے ہیں مگر معلوم ہوا قربان صاحب بھی اپنی چہیتی بیگم اور منظور صاحب بھی اپنی ڈارلنگ تمنا منظور کو ساتھ لائے ہیں ساتھ ہی جب دو تین اضلاع نظر آئے تو ہمارے منہ سے سبحان اللہ نکل گیا یعنی بقول اکبر الٰہ آبادی ؎

ترقی کی نئی راہیں جو زیر آسماں نکلیں
میاں مسجد سے نکلے اور حرم سے بیبیاں نکلیں

بارہ بجے تک تو اکا دکا بارہ بجائے بارہ رکشائیں اور آ گئیں۔ یادش بخیر لندن سے علامہ شرر گجرانوالوی صاحب اور ہندوستان کے مختلف صوبوں سے واقف جالندھری، اکبر آ سوشیل اختر، ساحل لدھیانوی، منظور لکھنوی، تمنا منظور العزیز جگت سنگھ، طالب، قربان شوق، ای پیڈر راز، راعنہ ثاقب، عشرت ادیب، مجبور، رضا لکھنوی، فہیم شملوی، میر کشی، ادیب میرٹھی، میگ اجمیری، ڈینس اجمیری، اختر کیفی یونس جالندھری، جولیس عثمان پرائس خاکسار کنجہ کا انچ میلہ لگا چکے تھے۔ مسیحی دانشوراں کا یہ جم غفیر اندو پاک نہیں تو انا انگلینڈ مشاعرہ تو یقیناً تھا۔ تاہم ہمارے نفس امارہ کو سکون نہ تھا۔ جس من موہنی کامنی کے دیدار کو آنکھیں ترس رہی تھیں کہاں ہے ۹ بائے دہ ۳۶ - ۲۴ - ۳۶ کے طلسمی اعداد کیا سے ضرب کیا ہوا مجسمہ حسن و جمال کہاں ہے۔ یہاں ہماری مراد حسینہ بانو پہلوان یا کرشنا کملوں سے نہیں بلکہ اس ہیما مالنی ہے جس میں سے پانچ عدد حور بہ آسانی نکالی جا سکتی

نے چیخا تو وہ ہما صاحب بھی آ گئے۔ ہما صاحب کا حال دیکھا تو سے توبہ کرنے کو جی چاہا۔ کہنی، ٹخنے، گھٹنے اور خدا جانے کہاں کہاں پٹیوں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ وصول وصبے اگرچہ ایا ناز کا شیوہ نہیں مگر مفت پاسباں کے قدم لیں گے تو یعنیہ حال ہوگا۔ بہرکیف محفل میں جان آ گئی۔

بارہ بجے سکول کی گھنٹی بجی تو بچے سکول کے باہر اور ہم لوگ سکول اندر بھاگے جس کو جہاں پلنگ نظر آیا، چادر تان لی، ایک پلنگ دیکھا تو ہم نے بھی یا اللہ کہتے ہوئے اس پر بستر پھینک دیا اور باقاعدہ پلنگ کے کسٹوڈین بن گئے تو اچٹتی نظروں سے اس ن کے مجاوروں کو دیکھا، ایک طرف تیور جالندھری اور دوسری منب پنجاب کے اور کوئی جیالے صاحب پٹھلو والے پڑے تھے مجھے ب کے بیچ میں دیکھا تو شوق صاحب پھیلے ہوئے تھے۔

"انور صاحب کہاں پھنس گئے؟"

"وہ کیوں کیا ہے"

مجبور صاحب گویا ہوئے "دراز بر ہے اور رات میں بہ آہنگ دہل بانگ درا کے اشعار پڑھتے ہیں اور دوسرے صاحب بھی بال جبریل کا مطالعہ فرما رہے ہیں یہ اقبالیات آپ کے بس کی نہیں" باتیں۔ ہم نے خوفزدگی کے عالم میں کہتے ہوئے اپنی رست سبا اپنی چادر لپیٹی اور ایک چھوٹے سے کمرے میں پلنگ کو سیدھا کرتے ہوئے اپنی پیٹھ سیدھی کرنے کا بندوبست کر لیا مگر آسمان سے گرے اور کھجور میں اٹکے کا محاورہ اس قدر فٹ بیٹھا کہ ہم اچھلا گئے کمرے میں چار پلنگ اور اس پر چار رندے یعنی طالب شاہ آبادی، شوق جالندھری، قربان مراد آبادی اور یہ فقیر حقیر۔

سوئے اتفاق دیکھئے کہ دلی کی ٹکسالی زبان والی حیدال جو لڑائی اور واقعی ایک چوکڑی میں جمع ہو گئی تھی۔ ہمیں اکبر الہ آبادی کا یہ شعر یاد آ گیا۔

کیسے چکر میں بزرگوں کے پھنسا رکھا ہے
حضرت پیر فلک بھی ہیں عجب ذات شریف

دفعتاً چائے کی طلب نے ستایا تو ہم چپ چاپ کمرہ سے نکل کر سٹیشن کے قریب ایک ہوٹل کی طرف لپکے ادھر حیرت الہ آبادی اور عاجز صاحب نے ہمیں دیکھا تو وہ ہماری جانب لپکے۔

"چائے پینے جا رہے ہیں انور صاحب؟"

"جی ہاں"

"چلئے ہم بھی چائے پی لیں"

"ضرور ضرور" ہم نے کہا۔

ہوٹل پر پہنچ کر چائے کا آرڈر دیا تو حیرت صاحب نے فرمایا "کچھ ناشتہ بھی ہو جائے"

"ضرور ضرور" اور ہم نے ناشتہ کا بھی آرڈر دے دیا۔ چائے اور ناشتے سے فارغ ہوئے تو حیرت صاحب نے پھر فرمایا۔

"پان کی دوکان پاس ہے چلو پان سگریٹ بھی ہو جائے"

"ضرور ضرور" کہتے ہوئے ہم قدرے حیرت میں پڑ گئے۔ ہمیں ایسا لگا جیسے حیرت صاحب اس وقت ہمیں جوزف انور کے بجائے اپنی ایسوسی ایشن کے جوائنٹ سکریٹری کے عہدہ سے عہدہ برا ہونے کا موقع عنایت فرما رہے ہیں۔ چہ جائیکہ ہمیں اب تک اس بات کا خود علم نہیں کہ ہم انکے جوائنٹ سکریٹری ہیں یا جائنٹ۔

ہم اپنے میزبان جناب زیدی صاحب سے یہ ہم کہتے کہ انہوں نے ہمارے خط کا جواب نہیں دیا۔ ہمارے کچھ کہنے سے قبل ان کو لنگڑاتے ہوئے اپنی طرف آتے دیکھا تو پائے من لنگ نیست کہتے ہوئے ہم بھی آگے بڑھے اور چھوٹتے ہی لنگی ماری۔

"کیوں بھائی میاں خط کا جواب نہ دینا کہاں کی شرافت ہے"

"قسم خدا کی آپ کا خط آج صبح کی ڈاک سے ملا ہے۔" یہ کہتے ہوئے انہوں نے دیگر خطوط کے ساتھ میرا خط بھی دکھایا یعنی الہ آباد سے الہ آباد خط پہنچنے میں پورے تین دن لگے۔ ہو سکتا ہے ہمارے خط کی اہمیت کے پیش نظر محکمہ ڈاک نے ہمارا خط پیدل قاصد کے ہاتھوں بھجوایا ہو۔ شاید ہمارے پیش رو عشاق اس معاملے میں بہت دور اندیش تھے کہ نامۂ محبت کو نامہ بر کبوتر ہی کے ذریعہ بھجواتے تھے۔

اس وقت کے لوگوں کو بھی اپنے فن میں ماہر ہوتے تھے جو خط کبوتر کس طرح لے جاتے بام یار تک کے راز باتے بہتے واقعی ... در و دیوار پر آ کر قینچیاں لگی ہوتیں مگر وہ لب بام محبوب کے شانوں پر اس طرح اترتے گویا شانہ نہیں آشیانہ ہو تا صدوں یعنی ڈاکیوں کو اس وقت بھی مشکوک نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ یہاں ایک لطیفہ سن لیجئے۔ ایک عاشق صاحب جو نامہ بردار لفیہ

محبوب کو خط لکھتے رہتے ایک سال تک۔ وہ بلا ناغہ ہر روز اپنے محبوب کو خط لکھتے رہے اور ایک سال کے بعد انھیں معلوم ہوا کہ ان کی محبوبہ ڈاکیہ کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ ابھی ہم زیدی صاحب کو کچا ور آڑے لیتے مگر ان کے اس آڑے وقت ایک معقول سی صورت دخل در معقولات کے مصداق ہمارے آڑے آگئیں نقش و نگار خمدار و ترشی زلفیں، لب لعلیں پر سرخی غازہ، ہم کوئی موزوں شعر گنگنانے ہی والے تھے کہ زیدی صاحب نے قصہ کو تاہ کر دیا۔

ان سے ملئے۔ یہ ہیں گرینس زیدی اور آپ ہیں آذر صاحب ہم نے سلام کیا اور بیگم زیدی نے دعا دی۔ سچ پوچھئے تو زیدی صاحب زاہد صد سالہ سے بھی گئے گزرے ہیں کہ ایسے زہد شکن کے ہوتے ہوئے ابھی شاعری تک شروع نہیں کی۔ ہمارا خیال ہے کہ غزل دیکھ کر میں غزل کہہ رہا ہوں کے آسان ترین فارمولے پر عمل کریں تو ماشاء اللہ دن میں پانچ غزلیں کہہ سکتے ہیں۔

لیجئے جناب عالی جناب بشیر دینا دیال صاحب نے کانفرنس کا افتتاح بھی فرما دیا۔

دوسرے دن دوپہر کے تین بجے مجلس عاملہ یہ الفاظ دیگر مجلس کاملہ کی میٹنگ ہونی تھی۔ غالب صاحب نے سوچا اگر کیا نہ سے پہلے اس دوا کو سے دور کر دیا جائے تو بہتر ہوگا۔ تجویز عمدہ تھی۔ سب متفق بھی تھے مگر ان پیدا آزار صاحب غائب تھے۔ ان کی عدم موجودگی میں آپ شمع معمہ کو حل کر سکتے ہیں مگر کوئی مسئلہ حل نہیں کر سکتے اور یہ بھی درست ہے کہ راز صاحب کی حیثیت ہمارے درمیان سنگ میل کی ہے خیر ہو کر چپت اکسی کو بڑے کنے ٹھہرا دیجئے۔ ورنہ جہاں تک ہمارا تعلق ہے آمین مرتبہ آمین ہی نہیں کہیں گے بلکہ اگر اکوا کی مجلس عاملہ الیا پر ستاؤ رکھے کی تو اکوا کی مجلس عاملہ یہ محسوس کرتی ہے کہ تاج محل چونکہ محبت کا لافانی شاہکار ہے اس لئے امسال کیوں نہ اسے خرید لیا جائے تاکہ اس کے کشادہ صحن میں بیٹھ کر ہمارے شعرا حضرات لافانی شاہکار غزلیں کہہ سکیں۔ تو ہم تو یہی کہیں گے اجی صاحب تاج محل ہی کیا ساتھ میں لال قلعہ کو بھی خرید لیا جائے۔ پھر ہم بھی دیکھیں ہمارے بغیر وہاں کے آل انڈیا مشاعرہ ہوتے ہیں لیجئے راز صاحب بھی آگئے۔

اکوا کی مجلس عاملہ کی بزنس میٹنگ بھی دیدنی ہوتی ہے

یہ ڈاکٹر طالب صاحب کے زیر صدارت ہوا کرتی ہے۔ یوں تو طالب صاحب اتنے حلیم الطبع واقع ہوئے ہیں کہ آپ چالیس دن سے لگا دیجئے اُف تک نہ کریں مگر بزنس میٹنگ میں وہ واقعی بزنس مین بن جاتے ہیں۔ یہ ان ہی کی دماغی پیداوار ہے کہ مجلس عاملہ کا ہر ممبر حسب حیثیت انجمن کے لئے عطیہ کا اعلان کرے۔ اس طرح بڑی خوبصورتی سے وہ مجلس عاملہ کے ممبران سے مال مسروقہ اسی وقت فراہم کرا لیتے ہیں اس دفعہ خواتین نے پہل کی اور رچھو ملتے ہی ترپ کا یکہ پھینکا یعنی ڈیڑھ صد کا اعلان فرما دیا۔ پھر کیا تھا چشم زدن میں تمام ترپ کے پتے میز پر آگئے اور تقریباً دو ڈھائی ہزار جمع ہو گئے۔ سبحان اللہ جس ایسوسی ایشن کے ممبران اس فراخ دلی کے ساتھ اپنے عطیات کا اعلان کرتے ہیں ایسی ایسوسی ایشن نہ کسی حکومت کی پشت پناہی کی محتاج ہو سکتی نہ کسی مشن کی دست نگری کی۔ یاروں کا عتاب سر آنکھوں پر مگر بندہ تو بقول اکبر الہ آبادی یہی کہے گا۔

مرے شکووں سے کیوں بھرتے ہیں وہ اخبار کے کالم
کوئی یہ شیخ سے کہہ دے کہ سنئے قبلۂ عالم
جدھر صاحب اُدھر دولت، جدھر دولت اُدھر چندہ
جدھر چندہ اُدھر آنر، جدھر آنر اُدھر بندہ

اب جہاں چندہ ہے تو کوئی چندہ زن بھی ہوگا۔ ہماری مراد ہمارے خازن شوق جالندھری سے ہے جو راسٹ لیور میں گلاس میموریل سنٹر کے ڈائرکٹر بھی ہیں۔ اس دفعہ ان کے ساتھ بھی عجیب لطیفہ ہو گیا۔ کانفرنس کے اخراجات کے لئے انھوں نے بینک سے ڈرافٹ بنوایا۔ بینک کلرک دور اندیش نکلا۔ اس نے سوچا راسٹ لیور میں گیس میموریل تو بن بھی نہیں سکتا کیونکہ G N O والوں نے ابھی تک وہاں گیس نکالا ہی نہیں البتہ گلاس یعنی کانچ کی کان ضرور ہو سکتی ہے چنانچہ اس نے ڈرافٹ پر گیس میموریل کو گلاس میموریل لکھ دیا یعنی G کے آگے L لگا دیا اب اتنی بدتمیزی تو کون برداشت کر سکتا تھا۔ شوق صاحب نے بڑی متانت و شرمندگی سے بینک کلرک کو سمجھایا کہ بھیا نہ تو یہ O A G C والوں کا گیس میموریل ہے نہ کسی کانچ کی کان والے کا گلاس میموریل ہے یہ تو کسی مشتری کے نام پر نامزد ایک ادارہ

نام ہے۔ بڑی دقت کے بعد شوق صاحب نے ہی کو آگے بڑھا کر خود کو اور ہمیں رسوا ہونے سے بچا لیا۔ بہرکیف ہم مینیک لڑکی کی اس غلطی کو بھی فال نیک سمجھتے ہیں۔

شوق صاحب ذرا ادھر دھیان دیں اور زور لگائیں تو ٹیس کے ساتھ کانچ کا نکل آنا بعید از قیاس نہیں کچھ بھی ہو ہمارے وزیر مال عرف علی بابا کا کبھی توڑ نہیں۔ یہ اچھے خازن ہی نہیں اچھے غزل گو شاعر بھی ہیں اور اللہ تعالیٰ نے انھیں خوش گلوی کے توڑ سے بھی نوازا ہے مگر جب یہ خوش گلوی یعنی اس ترنم کے توڑ کو منقبت یعنی خشوع و خضوع میں بھی استعمال فرماتے ہیں تو اکبر الٰہ آبادی کا یہ شعر یاد آجاتا ہے ؎

انھیں شوقِ عبادت بھی ہے اور گانے کی عادت بھی
نکلتی ہیں دعائیں ان کے منہ سے ٹھمریاں ہو کر

دوپہر کو ہم کھانے کی ٹیبل مدعوئین کا جائزہ لے رہے تھے کہ کیپٹن کیفی آئے اور فرمایا۔ کوئی صاحب آپ کو باہر یاد کر رہے ہیں۔ سوچا ہو سکتا ہے الٰہ آباد کی کوئی حسینہ آٹوگراف لینا چاہتی ہو۔ باہر آئے تو سخت مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ ڈاکٹر مسانڈرس (واضح ہو یہ انگریزی نام ہے کسی الٹے سیدھے لفظ کا ایکسپرشن نہیں) کھڑے تھے۔

آپ جوزف اگور ہندی کے رائٹر ہیں۔

"جی نہیں البتہ میری دو کتابیں ہندی رسم الخط میں ضرور چھپی ہیں"

ہمارے ہندی رائٹرز ایسی کانفرنس کیوں نہیں کراتے۔

"کراتے ہوں گے۔ ہو سکتا ہے icc N کی لٹریچر کمیٹی میں کوئی دخینت سنگھ نہ ہو"

آپ کے خیال میں ان اردو شعرا میں کتنوں کو دوام حاصل ہوگا بڑا پیچیدہ سوال تھا کیونکہ ان کا رنگ زلیست میں نہ نوح ہے نہ نارودی۔ پھر یہ مسیحی شعرا نہ جن کی زلفیں شانوں پہ جھولتی ہیں نہ جن کے بال گدی تک بڑھے ہوئے ہیں دوامی صورت کیسے حاصل کر سکتے ہیں بہرحال سوال کا جواب تو دینا ہی تھا۔

"دیکھئے اس سوال کا جواب تو ہم روز قیامت میں دے سکتے ہیں پھر ہمیں یہ بھی نہیں معلوم کہ قربان صاحب نے مسیحی اردو شعرا کی کتنی جلدیں چھپوائی ہیں فی الحال تو آپ ان شعرا حضرات کی درازیٔ عمر کی دعا مانگئے۔" کہتے ہوئے ہم اپنے آپ کو مختصر کر کے کھانے کی میز پر آبیٹھے۔

آئیے جب شعرا حضرات بدست خود دہانِ خود میں مصروف ہیں ہم کچھ دوستوں کا تعارف کرا دیں۔ سب سے پہلے ہمارے میزبان پادری کیو جے زیدی صاحب سے۔

گندمی رنگ مگر گندم نما جو فروش نہیں۔ سڈول جسم آنکھوں میں روایت شکنی کی غیر معمولی چمک۔ صدر الٰہ آبادی کی طرز (C.I.S.R.S) اللہ جانے کیا بلا ہے) کے معتمد ہیں۔ روایت سے بغاوت کی سزا بھگت رہے ہیں۔ میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر کے مصداق الٰہ آباد میں کانفرنس کے انعقاد کا بیڑا اٹھا لیا مگر راہ رو میں بمشکل تمام گھر کے افراد ہی جمع کر پائے۔ پھر All India Criminal یا ALLAHA under ground women association بھی نہیں ورنہ اہل ذوق سیکڑوں والنٹیر مل جاتے۔ بہرحال زیدی صاحب کے لئے اکبر الٰہ آبادی کا ایک شعر حاضر ہے حسب حالات شرح کر لیجئے۔

پرانی روشنی میں اور نئی میں فرق اتنا ہے
اسے کشتی نہیں ملتی اسے ساحل نہیں ملتا

آپ سے ملئے۔ آپ ہیں جناب ایم ایم خلف بیگ اجمیری تو چلیں مری آیا کی منزل میں قدم کر زیدہ کر زیدہ۔ کہنہ مشق کہنہ سال یعنی ہر اعتبار سے کہنہ کہنہ۔ راجستھان کے مسیحی قوالوں کے لئے ہدیہ تبرک، اچھا کہتے ہیں مگر پڑھتے اس طرح ہیں گویا اخبار پڑھ رہے ہوں۔ رموز امرتسری کی طرح بیگ صاحب کا تخلص بھی ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ واللہ علم بیگ صاحب اللہ بیگ ہیں مولا بیگ اے راے بیگ ہیں یا حیا بہارت کے لوکش والے بیگ ہیں۔ بہرکیف بیگ اور بیگم میں شبہ کی گنجائش نکل سکتی ہے مگر اس حقیقت سے انحراف نہیں کیا جا سکتا کہ بیگ صاحب سوریلزم آرٹ میں کافی مہارت رکھتے ہیں۔ مسیحی اردو شعرا کتاب کے دو صفحات کے ریویو

میں ڈیڑھ صفحے کتاب کے سرورق کے نذر کر کے ایسے ایسے راز ہائے سربستہ کا انکشاف کیا کہ ہم نے الماری سے کتاب نکال کر ڈیڑھ گھنٹے تک اس کے سرورق کو ہی الٹا سیدھا کر کے دیکھتے رہے اور اپنی کور ذوقی پر روئے مگر ہمیں نہ کاسۂ نظر آئی نہ گھاس۔

بہرحال ۱۹۸۸ء میں راجستھان کی صحت مند نمائندگی کر رہے ہیں مبارک ہو۔

آپ سے ملیے۔ آپ ہیں جناب ای پیڈر آزاد صاحب جت دہلی ملٹری کنٹریکٹ نونہیں۔ عمر تقریباً ساٹھ کے آس پاس مگر سرگرم اتنے کہ نوجوان سے نوجوان۔ شراب اور جنس کی لعنت پر عملاً تلملے کے خالق۔ انتظامیہ امور میں جتنا عمل رکھتے ہیں اتنا ہی دخل بھی۔ بلاشبہ مجلس عاملہ کے سنگ ماسٹر ہیں آپ کی موجودگی میں جو کسی فرد دشمن کے منہ میں اپنا سر دے سکتے ہیں ۱۹۷۸ء کے فعال رکن ہیں ہر سال دہلی کے میمبروں سے اکواکے لئے دو ڈھائی صد روپیہ جمع کرتے ہیں اس کارکردگی کی اہمیت کا اگر آپ کو اندازہ لگانا ہو۔ تو اپنے حلقۂ احباب سے دس دس روپے کی تین رسید میں ہی کاٹ کر لگا لیجیے۔ بجٹ کی بحث پر آپ کی موشگافیاں دیکھ کر ہم دنگ رہ گئے اور اکبرالہ آبادی کے یہ اشعار یاد آگئے۔

بابو کہنے لگے بجٹ پر لڑ دو
ملک کو دیکھو اپنے حق پہ لڑو
کہہ دیا ہم نے اے میرا آج
ہو مبارک تمہیں یہ کام یہ کاج

ان سے ملیے آپ ہیں حیرت بدایونی اور عاجز بدایونی دونوں بھائی ہیں۔ ہم مذاق، ہم وضع، وہم مکرتب خیال تاہم جڑواں نہیں۔ کالی ٹوپی، کالی شیروانی، سفید چوڑی دار پاجامے میں بالکل ایک دوسرے کی کاربن کاپی نظر آتے ہیں۔ صحت تلفظ میں وہ احتیاط کہ حلق کی ق حلق اور بلغم کی غین چھاتی ہی سے نکلے۔ مگر مندروایتی شاعر ہیں کہ وہ بانداز شاعر کہیں جاہلیت کے شب خوں بھی برسانے جائیں تو یہ حضرات یہی کہیں گے

بہارو پھول برساؤ مرا محبوب آیا ہے

شکیل بدایونی کی وراثت کے حق دار وارث، غیر مسیحی شعرا میں بے وجہ کہ ان دونوں کو یکجا اردو شعرا کی نمائندگی کے لئے پیش کیا جاسکتا ہے۔

مجلس عاملہ کی میٹنگ کی صدارت ہمیشہ انجمن کے صدر ڈاکٹر طالب شاہ آبادی ہی کرتے ہیں۔ پچھلے کئی سالوں سے اعزاز و خطاب سے کنی کاٹ رہے تھے۔ ہمارا ابھی یہ خیال ہے ان کا نام نامی کسی سابقہ لاحقے کا محتاج نہیں۔ کئی نام اپنی ہی میں بڑے پیارے لگتے ہیں جیسے ابرہ، ننگاد، بیچو، کین تر طالب شاہ آبادی بھی ان سے کم دلکش نہیں مگر جب علامہ رشد صاحب گرج کر بولے۔ آپ صدر ہیں تو کیا۔ آپ کو مجلس کی کثرت رائے کا احترام کرنا ہی پڑے گا۔ ہم سمجھ گئے ا ناممکن ہے انھیں باقاعدہ فریم کر لیا گیا ہے۔ لہٰذا اگرم میں لپیٹ کر آفتاب سخن کا خطاب (جو کسی طرح ایوارڈ یا بابائے اردو سے کم نہیں) انھیں جڑ دیا گیا۔

خطاب کے سلسلے میں شا کا کہنا ہے کہ خطاب اوسط کے انسان کو مشہور بنا دیتے ہیں۔ برتر کو پریشان کر دیتے کمتر ان کی بے حرمتی کرتے ہیں۔ یقیناً یہ خطاب طالب کی پریشانی میں اضافہ بھی کرے گا۔

دوپہر کے بعد اجلاس کی ادبی نشست کو ہم نے اپنی میں تار پیڈ کیا اور بیگم کو لے کر سنگم دکھانے نکل پڑے پردستی کی لیپا ندگی کا علم بہ ارر کشا والا جب پانچ کا میل کی مسافت کے بعد شہر کے ایک دورافتادہ کونے پر تو بیگم نے اپنی برگ نینوں سے آس پاس کی پگڈنڈیوں کا کچھ تذبذب کے عالم میں پوچھا۔

وہ کہاں چل رہا ہے سنگم۔

ہم نے ڈرتے ہوئے کہا۔ وہ دیکھو وہ سنگم ہے گنگا اور جمنا کا ملاپ ہوتا ہے۔ یہ دو ندیوں کا ملاپ اس سے پہلے کہ ہم کچھ اور کہتے۔ بیگم برس پڑیں۔

تو تم مجھے ایک ہزار میل دور ندیاں دکھانے لا گھر کے پاس سابرمتی ندی نہیں بہتی۔ ستیاناس وہ سنگم ہوگا کہ نہیں والے فلم سنگم کو دیکھنے آئی مقابلہ میں بدل گیا۔ اب ہم ہیں اور اکبرالہ آبادی کا

یہ تمہارے ہی دم سے ہے بزمِ طرب ابھی جاؤ نہ تم نہ کرو یہ غضب
کوئی بیٹھ کے لطف اٹھائے گا کیا کہ جو رونقِ بزم تمہیں نہ رہے

شام کو مشاعرہ تھا۔ کیپٹن اکیفی چونکہ منظور صاحب سے پہلے ہی راز و نیاز کی باتیں کر آئے تھے لہٰذا موڈ میں تھے۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی ان کی نظر قربان صاحب پر پڑی اور قربان صاحب کو قربان گاہ پر چڑھانے کا خیال ان کے ذہن میں داخل ہوا۔

ویل مسٹر قربان صاحب اردو کے مسیحی شعراء۔ آپ کو یوپی اکاڈمی سے انعام ملا ہے اگر ہم لوگوں کا ذکرِ خیر نہ ہوتا تو آپ کو یہ انعام نہیں ملتا۔ لاؤ ہمارا حصہ۔ اُدھر تہا صاحب بھی آگئے۔ شوق صاحب نے بھی وقت کی اہمیت کو بھانپ کر قربان صاحب کو محاصرہ میں لے لیا قربان صاحب بھی سمجھ گئے کہ اردو شعراء حاتم طائی کی قبر پر لات مارنے میں مہارت تامہ رکھتے ہیں۔ مبادا ان میں سے کوئی ہماری کمر ہی پر لات مار دے اور بلا پس و پیش تیس توڑے نکال کر دے دئے۔ نقر صاحب دور کھڑے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ انھیں بھی خوش نصیب پر ہمارا اکاڈمی سے انعام مل چکا ہے۔ لہٰذا گھبرائے ہوئے آئے اور از خود تیس توڑے مزید عنایت کر دئے۔ طالب صاحب اس منظرِ ہوش ربا کی تاب نہ لا کر چپ چاپ باہر نکل گئے۔ جبراً معمول لئے ہوئے یہ توڑے کچھ ہمیں بھی ناگوار گزرے اور ہم نے اٹھا کر انھیں بھٹی میں جھونک دئے اور اس کی رسید قربان صاحب کی بیگ میں رکھ دی۔

مشاعرے کی صدارت ڈاکٹر طالب صاحب کو اور نظامت تہا صاحب کو کرنی تھی۔ تہا صاحب کا حلیہ تو ہم پہلے ہی پیش کر چکے ہیں مگر اس دفعہ وہ نسخۂ حمیدیہ کی منہ بولتی تصویر بنے ہوئے تھے۔ سنا ہے کہ کنجڑیوں کے لہنگے دس گزے ہوتے ہیں کیونکہ وہ داڑھی پر پہنتے ہیں مگر دس گز کا پاجامہ آج دیکھنے کو ملا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اردو شاعری کی معشوق کی کمر اور ناڑہ باندھنے کے پیا زہائے سربستہ کا انکشاف کرنا چاہتے ہوں۔ بہر حال وہ شاعر ہی کیا جس کا کلام آزار دل اور آزار بند آزار نظر نہ ہو۔ لہٰذا تہا صاحب کا آزار بند بھی گھٹنوں تک لٹکا ہوا سامعین کے لئے آزار نظر بنا ہوا تھا۔ حسن اتفاق دیکھئے کہ مارو گھٹنا پھوٹے آنکھ کے مصداق جب تہا صاحب شاعر کو دعوتِ کلام دینے مائک پر آنے لگے تو ناڑہ گھٹنے سے

آ کر لوٹ گیا۔ اب تہا صاحب پیشہ ور ناظم مشاعرہ بھی نہیں کہ ایسے نازک حالات کو سنبھال سکیں چنانچہ اپنے دونوں ہاتھوں سے وہ جب حالات کے بجائے پاجامے کو سنبھالنے مائک پر آنے لگے تو ہم گھبرا گئے کہ آج تہا صاحب مائک کا نیا پرلوگ کرنے والے ہیں اور جب آپ اپنا دہنِ مبارک ہی مائک کے قریب لائے تو ہمیں اطمینان نصیب ہوا۔ بہرکیف منظر دیدنی تھا۔ آگے کی ستر پوشی کو تو قدرت نے ہاتھوں کے علاوہ اور بھی اسباب و علل پیدا کر رکھے ہیں مگر پیچھے کا حال خدا کے بعد طالب صاحب ہی دیکھ سکتے تھے۔ اور جب تہا صاحب کی چڈی طالب صاحب کو نظر آنے لگی تو انھیں اس بات کا پہلی دفعہ علم ہوا کہ صدرِ محترم کے فرائض کس قدر وسیع و عریض ہوتے ہیں۔ بہرکیف کسی نہ کسی جگر کے بجائے پاجامے کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر تہا صاحب نے اپنی عزتِ سادات کو بچا لیا۔

مشاعرہ کامیاب رہا۔ ہال میں سامعین کا یہ حال تھا کہ آپ تل بھی دھر سکتے تھے اور تل پھیلنے کی جگہ بھی۔

مشاعرے ہم نے پڑھے بھی ہیں اور سنے بھی ہیں یقیناً آپ نے بھی پڑھے اور سنے ہوں گے۔

شاعروں کی نازک مزاجیوں سے بھی سابقہ پڑا ہوگا۔ ایسے سند نشیں شعراء کو بھی دیکھا ہوگا جو پان کھا کر پان کی طشتری آگے بڑھانا اپنی توہین سمجھتے ہیں کچھ ان ترنم نواز شاعروں کو بھی دیکھا جو بطورِ خاص مائک پر آ کر پانی کا گلاس طلب فرماتے ہیں۔ مگر سبحان اللہ ہمارا خون سیروں بڑھ گیا جب ہم نے یونس جالندھری جیسے منکسر المزاج اور مجبور جالندھری جیسے فعال شاعر کو زیدی صاحب کو ہاتھ بٹاتے اور سامعین کو چائے اور پانی پلاتے دیکھا اور بلاشبہ یہ دونوں شاعر ہی ہماری دانست میں مشاعرے کے کامیاب ترین شاعر تھے۔

آخر میں اکبر الہ آبادی کے ان اشعار سے سرگزشت برگشتہ کا خاتمہ بالخیر کرتا ہوں۔

کہتا ہوں میں ہندو و مسلماں سے یہی
اپنی اپنی روش پہ تم نیک رہو
لاٹھی ہے ہوائے دہر، پانی بن جاؤ
موجوں کی طرح لڑو مگر ایک رہو

غزل

ناصر زیدی
راولپنڈی (پاکستان)

کسی کے لب پہ تیرا نام کیوں ہو؟
مری رُہ دادِ الفت عام کیوں ہو؟

شکستوں پر شکستیں کھا رہا ہوں
جنونِ عشق میرا خام کیوں ہو؟

مسافر ہوں سفر ہے کام میرا
مجھے راہِ طلب میں شام کیوں ہو؟

لب و رخسار چومیں گی نگاہیں
کوئی جلوہ فروزِ بام کیوں ہو!

جو لکھ لکھ کر مٹایا جا رہا ہے،
وہ اے ناصرؔ مرا ہی نام کیوں ہو؟

غزل

منظور کشمیری
خانیار۔ سری نگر

ساقی ہمارے لب تک اب تک نہ جام آیا
پر میکدہ جو آیا غیروں کے کام آیا

جب جب ستم کی اس نے ٹھانی ہے اپنے من میں
ان کی زباں پہ آخر میرا ہی نام آیا

یاروں کے وقتِ بد میں ہم کام آئے اکثر
ہم پر پڑی مصیبت کوئی نہ کام آیا

دن تو گزر گیا ہے فرقت میں پھرتے پھرتے
یہ شام کیا ہے آئی غم کا پیام آیا

بھولا ہوا نہ اس کو منظورؔ پھر کہو تم
بھولا ہوا سحر کا جو وقتِ شام آیا

غزل

الحاج الحافظ ڈاکٹر المحمود دیوان صاحب
دیوانؔ ۔ لندن

ایک دن موسیٰ گئے تھے طور تک
آئیے سوچیں ذرا اب دور تک

جانے والے عرش تک پہنچے مگر
حضرت موسیٰ گئے بس طور تک

حسن میں ہمسر کوئی ان کا نہیں
ماند پڑ جاتی ہے، زاہد۔ حور تک

بات بڑھ کر بولنا اچھا نہیں
آپ کم بولیں ذرا مقدور تک

مبتلائے غم ہمیشہ ہم رہے
آپ کو غم تھا فقط ناسور تک

میکشی کی تہمتیں دیوانؔ پر
وہ میاں کھاتے نہیں انگور تک

دھوم ہے دیوانؔ کے اشعار کی
اب غزل جاتی ہے کوسوں دور تک

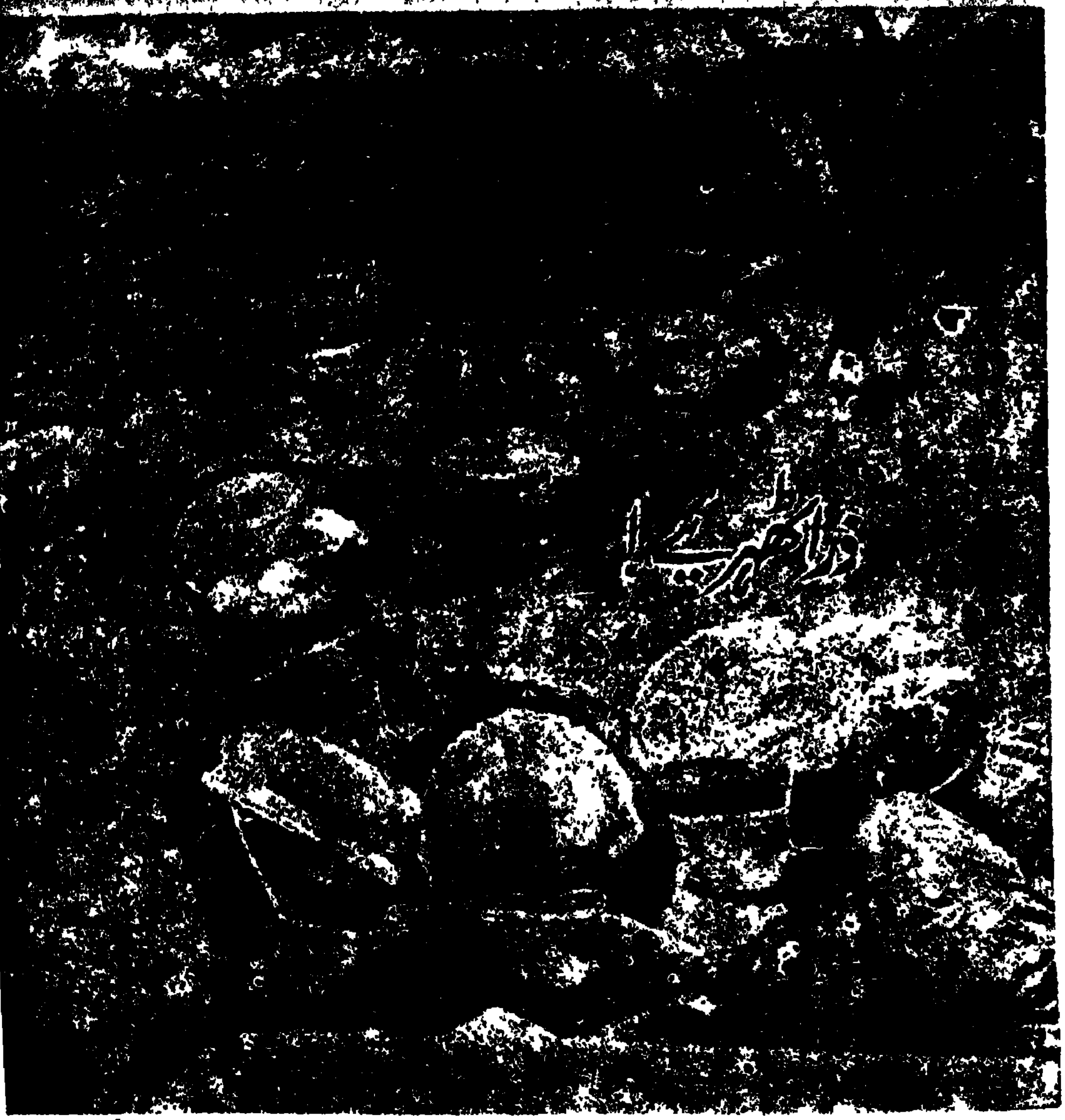

کیا آپ گلے کی تکلیفوں میں اکثر مبتلا رہتے ہیں اور اس کی وجہ سے سخت پریشان ہیں، لیکن یہ نہ سمجھئے کہ ایسی پریشان کن بیماری سے گلا کاٹ دینے سے ہی چھٹکارا مل سکتا ہے۔ ذرا ٹھہریئے! خالص دیسی ادویات سے تیار کیا ہوا "ٹونسلیکس" ایک بار، صرف ایک بار استعمال کر کے تو دیکھئے، پھر آپ کو گلے کے غدود بڑھ جانے، گلے کی سرسراہٹ، خراش، گلے کے ورم، زخم اور دوسرے تمام امراض کی شکایت نہیں رہے گی۔ اگر آپ کے علم میں کوئی ایسا مریض ہو، جس کے گلے کے غدود (ٹانسلائٹس) کا آپریشن ہونا ہے تو اسے اس دوا کے بارے میں ضرور بتایئے گا کیوں کہ پھر اسے آپریشن کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ چھوٹے بچے جو کھٹی میٹھی چیزیں کھا کر گلا خراب کر لیتے ہیں، اُن کے لئے بھی یہ بہت کام کی دوا ہے۔ ہر گھر میں اس کا رہنا بہت ہی ضروری ہے۔

—— شع (یونانی اینڈ آیورویدک) لیبارٹریز، لال کنواں، دہلی ۱۱۰۰۰۶

Phone: 275602 Regd·No D- (DN) 353
THE SHAN-E-HIND MONTHLY NEW DELHI-110002 MAY 1985
Regd with the Registrar of Newspaper at R. No. 644 57

خرید کر پڑھئے :

مانگ کر پڑھئے :

یا پھر

چوری کر کے پڑھئے

یہ ہے ہی اتنا خوب صورت ،

اتنا دل کش ،

اتنا مکمل کہ اسے کسی طرح بھی

حاصل کریں کیوں کہ

یہ فیض کی شخصیت اور فن پر ایک

شان دار ادبی دستاویز ہے ۔ اس میں شامل ہیں :

قیمت : پندرہ روپے

★ خلوت اور جلوت کے بھید کھولنے والے ذاتی نقوش ۔
★ نادر و نایاب تصویریں ۔
★ سدا بہار ، ہزار رنگ و منتخب کلام ۔
★ فیض کی شخصیت کے وہ ڈھکے چھپے گوشے جن پر سے پہلی بار پردہ اٹھایا گیا ہے ۔
★ ہندوستان ، پاکستان ، روس اور انگلستان کے دانش وروں کی مشترکہ کاوشوں کا گلدستہ ۔

ساری اردو دنیا میں شبستان کے "فیض نمبر" کا چرچا ہے

اس سے پہلے کہ اسٹاک ختم ہو جائے آج ہی اپنے قریبی نیوز ایجنٹ سے طلب کیجئے یا براہ راست ہم سے منگوائیے ۔

شبستان ۸/۲ ، ڈاکخانہ آصف علی روڈ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

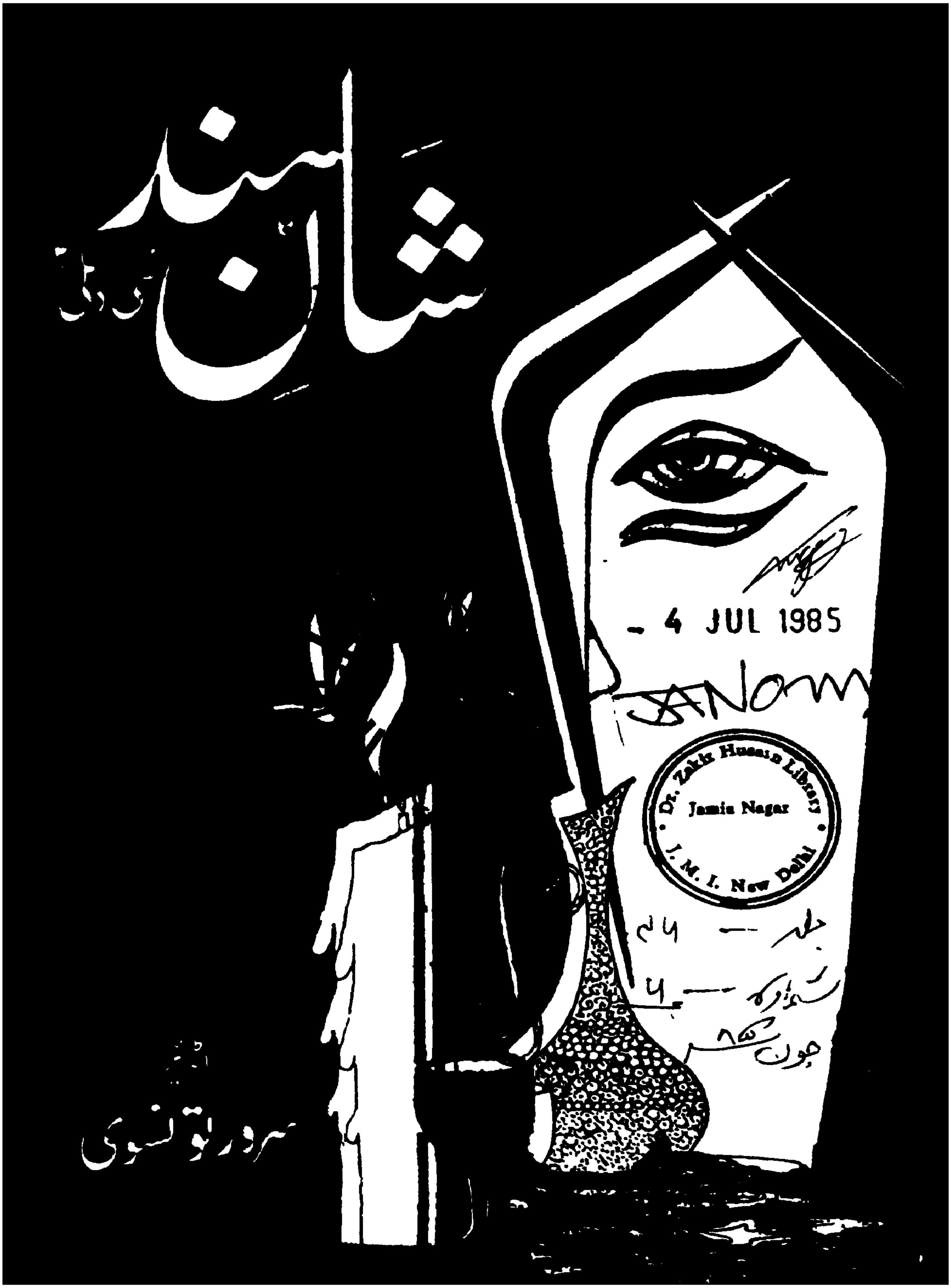

4 JUL 1985
Dr. Zakir Husain Library
Jamia Nagar
J. M. I. New Delhi

At Shriram, the focus is always on good performance, whether in the factory, field, office—or auditorium. Artistic talent is promoted as systematically as work talent.

Employees of Shriram Fertilisers & Chemicals, at Kota and elsewhere, are given every opportunity to develop their talents—in music, dance, drama—and perform at their best.

Our Shriram Kala Mandir at Kota is equipped with the latest lighting and acoustics technology. And our Shriram Ramlila is a brilliant spectacle which attracts thousands from all over Kota and the neighbouring areas.

SHRIRAM

PEOPLE GROWING TOGETHER

Shriram Fertilisers & Chemicals

(Prop DCM LIMITED)

ٹیلیفون نمبر [illegible]

رجسٹرڈ نمبر ڈی (DN) ۳۵۳ A

رجسٹرار آف نیوز پیپر آف انڈیا کا رجسٹریشن نمبر ۶۳۴/۵۷

ماہنامہ

شان ہند نئی دہلی

ایڈیٹر
سرور تونسوی

قیمت سالانہ
چوبیس روپے

فی پرچہ
ڈھائی روپے

شمارہ نمبر ۶	جون ۱۹۸۵ء	جلد نمبر ۲۶

مہکتی باتیں ، چہکتے جملے

- محبت میں مصائب اس لئے آتے ہیں کہ ہر سفلہ محبت کا دعویٰ نہ کر سکے۔ — حضرت نظام الدین اولیاء
- مرد عورتوں سے زیادہ عقلمند ہوتے ہونگے مگر یہ بات حقیقت ہے کہ کیا کبھی آپ نے کوئی ایسی عورت دیکھی ہے جس نے محض جسمانی خوبصورتی سے متاثر ہو کر کسی ان پڑھ ، احمق اور غریب مرد سے شادی کی ہو !
- پاکستان میں آج کل جو لطیفہ مقبولِ عام ہو رہا ہے وہ کچھ اس طرح ہے ۔ ایک روز اسلام آباد میں صدر ضیاء الحق سیر کو نکلے تو انھوں نے دیکھا کہ دوسرے ممالک کے سفارت خانوں کے آگے بڑی لمبی قطاریں لگی ہیں ۔ انھوں نے دریافت کروایا تو پتہ چلا کہ دوسرے ممالک جانے کیلئے ویزا حاصل کر رہے ہیں ۔
متفکر ہو کر صدر ضیاء بھی چپ چاپ ایک لائن میں لگ گئے تاکہ کچھ پتہ لگا سکیں کہ لوگ اتنی تعداد میں ملک چھوڑ کر کیوں جا رہے ہیں لیکن جلدی ان کو پہچان لیا گیا ۔ لوگوں نے ان سے پوچھا کہ آپ کیوں لائن میں لگے ہیں ۔ صدر نے کہا میں ویزا لے رہا ہوں دوسرے ملک جانے کا ۔ یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے تمام قطاریں ختم ہو گئیں صرف صدر رہ گئے ۔ اس نئے رد عمل کا پتہ لگانے کے لئے انھوں نے ایک سے پوچھا کہ آپ لوگوں نے کیوں ویزا لینے کا خیال چھوڑ دیا تو برجستہ جواب ملا ۔ ” جب آپ ہی جا رہے ہیں تو پھر ہم لوگ باہر جا کر کیا کریں گے ۔ “
- امریکہ کی فلم صنعت کا مرکز ہالی وڈ ہے وہاں کی ایک اداکارہ کسی دعوت کے بعد اپنی سہیلی کے گھر پہنچی ۔ سہیلی نے دریافت کیا کہ پارٹی میں کون کون تھا ؟
اداکارہ نے کہا زیادہ لوگ تو نہیں البتہ میرے پہلے خاوند سے دو لڑکیاں ، میرے دوسرے خاوند کی تیسری بیوی ، میرا چوتھا خاوند اپنی نئی بیوی سمیت اور میرا اپنا موجودہ خاوند تیسری دوست کے ساتھ ، اور بھی دو چار لوگ تھے ، بس
- نرس نے شوہر کو یہ خبر سنائی کہ اس کی بیوی کے جڑواں بچے ہوئے ہیں ۔ شوہر نے سرد آہ بھر کر کہا ” میں جانتا تھا یہی ہوگا ۔ وہ تو ہمیشہ کہتی تھیں خرچ ہے “

ادارہ پرکاشک سرور تونسوی نے خواجہ پریس چتلی قبر جامع مسجد دہلی سے چھپوا کر دفتر شان ہند فلیٹ نمبر ۲ ، انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۲ سے شائع کیا ۔

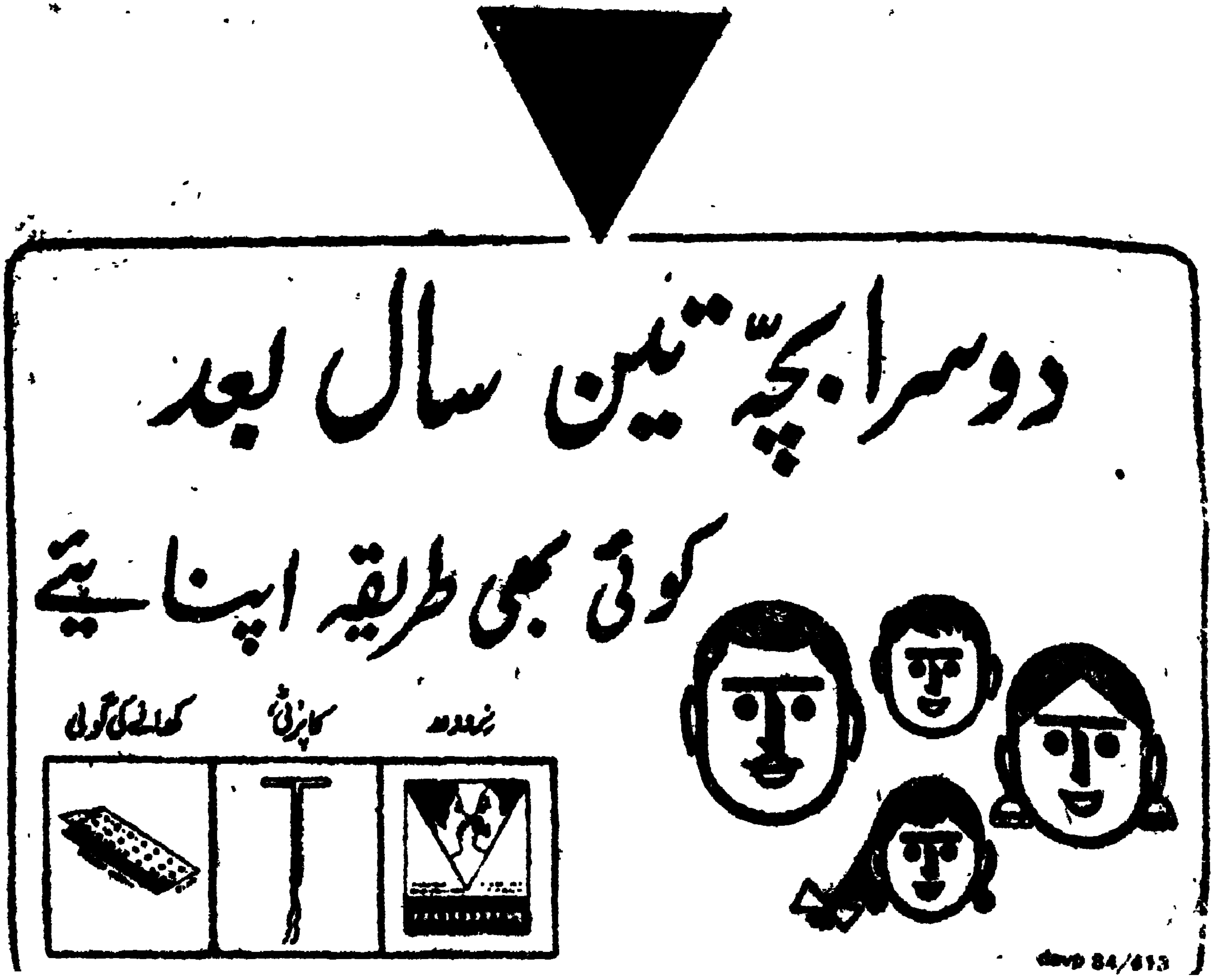
دوسرا بچّہ تین سال بعد
کوئی بھی طریقہ اپنائیے
نرودھ
کاپرٹی
کھانے کی گولی
davp 84/613

بلبل چہ گفت؟ گل چہ شنید؟ و صبا چہ کرد

ہوسِ لقمۂ تر

پاکستان کے ایک مشہور اردو دانشور اپنے مکتوب گرامی میں تحریر فرماتے ہیں۔

"محترم سرور بھائی۔ تسلیم۔ ہندوستان میں اردو دانشوروں کو جس بہتات سے اعزازات اور انعامات سے نوازا جا رہا ہے ان کی اطلاعات اخبارات میں نظر سے گزرتی رہتی ہیں۔ اور ہم پاکستانی اردو والوں کو دلی مسرت ہوتی ہے کہ ہمارے پڑوسی ملک میں جہاں کہ اردو کی کوئی سرکاری حیثیت نہیں ہے اردو دانشوروں کو ان کی تصانیف پر مختلف ادارے انعامات دیتے ہیں۔ اور اردو ادیبوں، شاعروں، نقادوں، اور صحافیوں کو خاصے ایوارڈ دیئے جاتے ہیں اور تو اور سرکاری طور پر بھی انہیں ایوارڈ اور اعزاز دیئے جاتے ہیں۔

آپ پچھلے پچیس سالوں سے اردو کی خدمت کر رہے ہیں۔ آپ کے ماہنامہ "شانِ ہند" نے تقسیم ملک کے بعد ہندوستان میں اردو شاعری کی جو تاریخ ترتیب دی ہے وہ آئندہ اردو شاعری کے محققوں کی رہبری کرے گی۔ آپ کے اداریے ہندوستان کے اردو دانشوروں کی حقیقی زندگی کے راز افشا کریں گے۔ اور آپ جس بے باکی اور سچائی کے ساتھ ملکی سیاست اردو فروشوں کی منافقت اور اردو کے نام پر "لقمۂ تر" حاصل کرنے کے بدترین مناظر کو پیش کرتے ہیں آئندہ صحافت کا پیشہ اختیار کرنے والوں کو نشان دہی رکھے گی کہ کسی صحافی کے لئے بے باک اور بلند ہونا کتنا ضروری ہے اور حق و انصاف کا ساتھ دینے کے لئے سچائی کا سہارا لینا کس قدر ضروری ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ پاکستان میں "شانِ ہند" کے ذریعہ ہی ہندوستان کے اردو سے متعلق مسائل اور وہاں کے اردو دانشوروں کی ہوس زر کی صحیح اطلاع ملتی ہے۔ اور جب بھی "شانِ ہند" موصول ہوتا ہے زیادہ تر دوستوں میں اس وقت تک گردش کرتا رہتا ہے جب تک کہ اگلا شمارہ نہیں آ جاتا۔

مگر حیرت ہے کہ آپ کو کسی سرکاری یا غیر سرکاری ادارے نے اب تک کسی ایوارڈ سے نہیں نوازا۔ کیا آپ کے ہندوستان میں بھی ہمارے پاکستان کی طرح ایسے ایوارڈ محض سفارشوں اور اندھا بانٹے ریوڑیاں والی مثل کے رہین منت ہیں۔؟"

یہ خط اگرچہ ذاتی نوعیت کا ہے مگر اس کی اشاعت اس لئے ضروری سمجھی گئی کہ اس قسم کے استفسار کئی دوسرے حضرات نے بھی بارہا کئے ہیں۔ ایسے استفسار کرنے والے کچھ حضرات تو واقعی ہمدردی اور اپنائیت کا جذبہ لئے ہوتے ہیں۔ اور زیادہ تر اصحاب محض "مشغلہ" کرنے کی غرض سے بڑے معصومانہ انداز میں اپنا مقصد پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لہٰذا یہی مناسب سمجھا گیا کہ اس سلسلے میں تفصیلی جواب انہی کالموں میں دیا جائے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو کے نام پر جو انعامات اور ایوارڈز ہندوستان میں سرکاری یا نیم سرکاری اداروں کی طرف سے دیئے جاتے ہیں وہ محض اس وجہ سے دیئے جاتے ہیں کہ اردو کو مسلمانوں کی زبان قرار دیا جاتا ہے اور سمجھا جاتا ہے لہٰذا ایسے ایوارڈز پچانوے فی صد مسلمانوں کو دیئے جاتے ہیں اور کبھی غیر مسلم کو بھی یہ اعزاز دیا جاتا ہے جب انتہائی مجبوری ہو۔ چونکہ انعام یا ایوارڈ کا فیصلہ کرنے والے حضرات نہ تو خدا کا خوف رکھتے ہیں اور نہ انہیں عوامی مخالفت کا ڈر ہوتا ہے لہٰذا وہ من مانی کرتے ہوئے اپنے مفاد کے پیش نظر ایسے فیصلے کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک سیاسی لیڈر کو کانگریس امیدوار کے خلاف الیکشن لڑنے کے لئے ایک صاحب نے مالی امداد دی اور یہ سیاسی لیڈر ایک ایسی کمیٹی کے ممبر ہیں جو ایوارڈز کا فیصلہ کرتی ہے۔ چنانچہ اس الیکشن ہارے ہوئے ممبر نے اپنے محسن کو ایوارڈ دلانے کی کوشش کی اور مستحق حقداروں کے مقابلہ میں انہوں نے ایک نااہل کو ایوارڈ دلوا دیا۔

فکر تونسوی اس وقت تک کیا برصغیر ہند و پاک میں طنز و مزاح میں اپنا جواب نہیں رکھتے مگر انہیں بھی نظر انداز کیا گیا "شانِ ہند"

نے اس دھاندلی کے خلاف آواز اٹھائی کہ صاحب موصوف پچھلے دوسرے
حق پرستوں سے "مہاراجہ ہند" کا ساتھ دیا۔ تو اس بد ذاتی پر [illegible] نے
[illegible] کو منہ توڑ جواب کا بدلہ پا کر دس ہزار روپے کا نہیں پانچ
ہزار روپے کا۔ اتر پردیش اردو اکاڈمی نے پنڈت تلک بندروی
کی مشہور زمانہ کتاب "ہندی کے مسلمان شعرا" کو انعام کے قابل
اس لئے نہ سمجھا کہ رشید حسن خاں صاحب کے خلاف "شاہی
ہند" میں بکثرت بہتر لکھا تھا۔ اور انعامی کمیٹی کے مسلمان ممبران کو
رشید حسن خاں نے کہا کہ اس کتاب کو ایک کونے میں رکھ دیا جب
کہ اس کتاب پر مغربی بنگال اردو اکاڈمی نے بعد میں دو ہزار روپے
اور بہار اردو اکاڈمی نے تین ہزار روپے کا اعلان کیا۔ اور دلی اردو
اکاڈمی نے اس کتاب کے ناشر کو سال ۱۹۸۲ء کی سب سے
بہترین کتاب شائع کرنے پر دو ہزار روپیہ انعام دیا۔ اسی طرح
صوبہ بہار کی انجمن ترقی اردو ہر سال تین تین ہزار روپے کے تین انعام
غیر مسلم اردو دانشوروں کو دیتی ہے۔ مگر اس کی ایمانداری کا
یہ حال ہے کہ وہ جناب جگناداس قمر اور راقم الحروف کے شاگرد
رشید جناب وشوناتھ طاؤس کو اس انعام سے نواز سکتی ہے
مگر اس کی نظر میں جناب جگناداس قمر اور راقم کی اردو خدمات
کی قدر و قیمت اس لئے نہیں ہے کہ ہم دونوں بہار انجمن ترقی اردو
کے ارباب بست و کشاد کی تعریف میں تحریری اور تقریری طور پہ
خاموش ہیں۔ کرناٹک کی اردو اکاڈمی کچھ رسائل و جرائد کی مالی
مدد کرتی ہے مگر بشرط انہیں رسائل و جرائد کو حاصل ہوتا ہے
جو کرناٹک کی اردو اکاڈمی کی تعریف کرتے ہیں۔

دراصل ہندوستان میں اردو دانشوروں کی تنظیمات پر انعامات
اور ایوارڈ محض اس لئے جاری ہوئے کہ مسلمانوں کو یہ شبہ ہوجائے
کہ حکومت اردو کی بقا اور حیات اور ترقی کے سلسلے میں بے تاب ہو
رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو اکاڈمیاں قائم کی گئیں۔ اردو فرقے
ہند بنایا گیا۔ اور ہر دور میں مگر فرقے کے مشرقی تک اردو کی تعریف
میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتے ہیں۔ اسے ملک کی
سب سے شیریں اور عام فہم زبان قرار دیتے ہیں۔ مگر یہ سب کچھ
زبانی زبانی ہی ہوتا ہے اس لئے کہ مسلمانوں کے ووٹ
حکومتی پارٹی کے لئے ضروری ہیں۔ ورنہ عملی طور پر اردو کے لئے یہ

[illegible] ہے کہ اتر پردیش کی حکومت اسمبلی میں کسی ممبر کو اردو میں
حلف لینے کی اجازت نہیں ہے۔
ڈاکٹر گوپی چند نارنگ بڑے [illegible] ہیں ٹھیک تو کیا اس وقت
دنیائے اردو میں اپنا حریف اس لئے نہیں رکھتے کہ اردو سے
متعلق کسی بھی موضوع پر ان سے بہتر تقریر کرنے والا کوئی دوسرا
اردو دانشور نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ اردو کا ہر مسلمان
دانشور در پردہ باطن ان کے خلاف ہے۔ اور یہ بھی ہے کہ کوئی
دانشور نہیں کہ ہر مسلمان اردو دانشور مذہبی تعصب رکھتا ہے اور
اس کا یہ مذہبی تعصب اردو زبان کی ترقی۔ اس کی بقا و حیات
کے لئے سد راہ ہے۔ جس سے غیر مسلم کو بھی کوئی ایوارڈ ملا
ہے تو وہ اسے اس لئے دیا گیا ہے کہ اس کے سوا کوئی دوسرا مستحق
نہ تھا۔ مثال کے طور پر جناب مالک رام۔ جناب ڈاکٹر گوپی چند
نارنگ۔ جناب کالی داس گپتا رضا وغیرہم۔ مگر مسلمان اردو دانشوروں
کے پیٹ میں مروڑ اٹھتے ہی رہتے ہیں کہ ہائے ان ہندوؤں کو
دنیائے اردو کیوں سراہتی ہے۔ لہذا اکثر و بیشتر مسلمان اردو
دانشوروں کی طرف سے آئے دن ان محترم ہستیوں کے
خلاف کسی نہ کسی بہانے زہر اگلا جاتا ہے اور بعض مخالفانہ تحریریں
تو بجز اس بغض کے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض اعزاز اور ایوارڈ مستحق
حضرات کو دیئے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں دلی اردو اکاڈمی
کا ذکر نہ کرنا یقیناً ناانصافی ہوگی جس نے سو فیصدی تو نہیں مگر کافی
حد تک مستحق حضرات کو ایوارڈ دیئے ہیں۔ اتر پردیش اردو اکاڈمی
بھی اس سلسلے میں اپنا جواب ہی نہیں رکھتی کہ خصوصی ایوارڈ زیادہ تر
اقربا نوازی کے مطابق ہی ہوتے ہیں اور اگر راجندر سنگھ
بیدی کو ایوارڈ دیا گیا تو وہ واپس حاصل کرنے نیز حاتم کی قبر پر لات
مارنے کے لئے اردو اکاڈمی کے چیئرمین صاحب بذات خود یہ
ایوارڈ دینے بیدی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور اردو
اکاڈمی کا کافی روپیہ آمد و رفت کے اخراجات پر ضائع کیا۔ جناب
نازش پرتاب گڈھی کی زندگی میں اتر پردیش اکاڈمی نے ہمیشہ
ان کے ساتھ نامناسب سلوک روا رکھا۔ بلرام پور ہسپتال سے
انتقال کے چند روز پہلے نازش صاحب نے ہفت روزہ "ترجمان ہند"

لکھا ہے ملک میں اتر پردیش اردو اکاڈمی کا رویہ قابلِ مطالعہ ہے۔ اس پہ عجب پر طرفہ یہ کہ اتر پردیش اردو اکاڈمی کو ہدفِ لعنت بنایا گیا تو نازش صاحب کو انتقال کے بعد خصوصی ایوارڈ کا حق دار قرار دیا گیا ہے۔ جب کہ نازش صاحب کی زندگی میں یہی اکاڈمی ان پر مقدمہ کر کے ان کی تصنیف پر دیا گیا انعام واپس لینا چاہتی تھی کیونکہ نازش صاحب نے کسی دوسری اکاڈمی کا انعام بھی اپنی اسی تصنیف پر حاصل کر لیا تھا۔

ہندوستان ہو یا پاکستان اردو کے نام پر جو ایوارڈ یا انعامات دیئے جاتے ہیں انہیں حاصل کرنے والوں کو نہ معلوم کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ بہت کم ادارے ایسے ہیں جو از خود ہر قسم کے دباؤ اور سفارشوں کو نظر انداز کرتے ہوئے صحیح فیصلہ کرتے ہیں جیسا کہ حال ہی میں دلی اردو اکاڈمی نے مفتی شوکت علی فہمی کو صحافت کا ایوارڈ دے کر ثابت کیا ہے کہ اگر کسی انعامی کمیٹی کے ممبران حق دانش سے کام لیں تو یقینی طور پر صحیح فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ رہا یہ کہ ایڈیٹر شانِ ہند اب تک کیوں ایسے ایوارڈ یا انعام سے محروم کیوں ہے۔ تو اس سلسلے میں اول وجہ تو یہ ہے کہ اس کی خدمات اسی قابل ہی نہیں کہ انہیں اس قابل سمجھا جائے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ایڈیٹر شانِ ہند زہر ہلاہل کو قند کہنے کا عادی نہیں۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ جو حضرات ایسے ایوارڈ یا انعامات کا فیصلہ کرنے والے ہیں ان کی نسبت شانِ ہند میں کسی نہ کسی وجہ سے ان کی اصلیت کی پول کھولی جا چکی ہے لہٰذا وہ کس طرح گوارا کر سکتے ہیں کہ مدیر شانِ ہند کو کوئی ایوارڈ یا انعام دے کر اپنے آپ کو فریبا خیدار کہلوا سکیں۔

ہم اپنے پاکستانی دوست کے ممنون ہیں کہ انھوں نے شانِ ہند کی خدمات کو سراہا ہے۔ ان کی اطلاع کے لئے یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ حال ہی میں پاکستان سے جناب محسن بھوپالی ہندوستان تشریف لائے تھے [illegible] ان کے قطعہ پر ہر مشاعرے اور نشست میں خوب خوب داد ملی۔

جاہل کو اگر جہل پہ انعام دیا جائے
اس حادثۂ وقت کو کیا نام دیا جائے

نذرِ اقبال

آتش بہاولپوری

علامہ اقبال مرحوم کی مشہور نظم "بلوچ" "باپ کی نصیحت بیٹے کو" کے چند اشعار پر تضمین ملاحظہ ہوں۔

ہمراہ لئے جوشِ عمل عزمِ جواں چل
بچتے رہے نہ یک گام بطرزِ دگراں چل
یہ بھی نہ تحقیق ہو کہ یہاں ہیں کہ وہاں ہیں
جس سمت میں چاہے صفتِ سیلِ رواں چل
وادی یہ ہماری ہے یہ صحرا بھی ہمارا

غیرت ہی سے ہے شوکتِ شاہانہ جلو میں
غیرت ہی سے دنیا میں سرافراز ہیں قومیں
غیرت ہی سے لہوتا سفینے ہوئے رو میں
غیرت ہے بڑی چیز جہانِ تگ و دو میں
پہناتی ہے درویش کو تاجِ سرِ دارا

جس قوم کے افراد میں ہے جذبۂ تعمیر
ملتی ہے زمانے میں اسے عظمت و توقیر
افراد کا کردار ہے اک بولتی تصویر
افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا

ہر چند بڑی چیز ہے آزادی کی نعمت
لیکن نہ فراموش ہو دل سے یہ حقیقت
انساں کو سرفرازی ہے ایماں کی بدولت
دیں ہاتھ سے دے کر اگر آزاد ہو ملت
ہے ایسی تجارت میں مسلماں کا خسارا

جوش ملیح آبادی کا تازہ ترین مجموعۂ کلام
آوازِ دل
شائع ہو گیا ہے۔ قیمت ۱۵ روپے مجلد
اپنی لائبریری میں اس مقبول مجموعۂ کلام کا اضافہ آپ کے باذوق ہونے کی دلیل ہے۔
دفتر شانِ ہند، فلیٹ ۸۹ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی نمبر ۱۱۰۰۰۲

طرحی مشاعرہ بزمِ سخن کویت کا انعامی فیصلہ

بزمِ سخن کویت نے گذشتہ سال جوش اور ساحر ایوارڈ دینے کے لئے دو طرحی مصارع دیئے تھے اور اعلان کیا تھا کہ جن شعرائے کرام کی طرحی غزلیں اولین قرار دی جائیں گی اُنہیں پانچ صد امریکی ڈالر انعام دیا جائے گا۔ لہٰذا اس سلسلے میں حسب ذیل شعرائے کرام کی طرحی غزلوں کو اولین قرار دیا گیا ہے

(۱) مصرعۂ طرح ؎ دِل کی چوٹوں نے کبھی چین سے رہنے نہ دیا۔

۱۔ جناب قمر مرادآبادی

۲۔ جناب آبد سرہندی

۳۔ جناب فہیم انور بھوپالی

(۲) مصرعۂ طرح ؎ ہنچ کے منزلِ جاناں پہ آنکھ بھر آئی

۱۔ جناب ناز مانک پوری

۲۔ جناب آبد سرہندی

۳۔ جناب بسیم میرٹھی

جناب پروفیسر فرید قریشی سحر اکبرآبادی جنرل سکریٹری بزمِ سخن کویت تحریر فرماتے ہیں کہ جن غزلوں کا انتخاب برائے ایوارڈ جوش وساحر کیا گیا ہے وہ اِس خط کے ساتھ بذریعہ رجسٹری روانہ کی جا رہی ہیں تاکہ آپ ماہنامہ شانِ ہند میں اس کی اشاعت کر دیں۔ انعامات کی تقسیم کے سلسلے میں ہم جناب فخرالدین چکی والا کے ساتھ پروگرام ترتیب دیں گے اور آپ کو باقاعدہ مطلع کریں گے

دستخط	دستخط
فخرالدین چکی والا	پروفیسر فرید قریشی سحر اکبرآبادی
سرپرست کویت بزمِ سخن	جنرل سکریٹری کویت بزمِ سخن
	۲۶ر فروری ۱۹۸۵ء

شبستان کا فیض احمد فیض نمبر

ہندوستان [illegible] میں شبستان ایک انفرادی مقام رکھتا ہے [illegible]

کا فیض نمبر شائع ہوا ہے۔ جناب ادریس دہلوی نے فیض نمبر کی ترتیب و تدوین جس اعلیٰ انداز میں فرمائی ہے اُس کی داد تو ہر قاری دے گا ہی۔ اس کے علاوہ شبستان کا فیض نمبر اعلیٰ طباعت کا ایک ایسا نادر نمونہ ہے کہ جسے اگر محکمہ ڈی۔ اے۔ وی۔ پی یا اکثر اُردو اکادمیوں کے وہ ارباب متعلقہ جو کتابوں اور رسائل و جرائد کی اچھی طباعت پر ایوارڈ دینے کا فیصلہ کرتے ہیں ایک نظر دیکھ لیں تو اُنہیں یقینی ندامت ہوگی کہ وہ کیسی کیسی کتابوں اور رسائل و جرائد کو اعلیٰ طباعت و کتابت پر ایوارڈ دے کر مذاق کا موضوع بنتے ہیں۔

"شبستان کا فیض نمبر" ایک ایسا دلکش اور جاذبِ نظر ادبی تحفہ ہے جسے آپ اپنے سخن فہم احباب کو فخر کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں۔ ساتھ ہی صفحات پر پھیلے ہوئے اس فیض نمبر کی کس کس خوبی کا تذکرہ کیا جائے۔ بس بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اب تک فیض صاحب پر ایسا جامع اور بہتر خصوصی نمبر شائع نہیں ہوا تھا۔ اس قابلِ قدر اور یادگاری فیض نمبر کی قیمت صرف پندرہ روپیہ ہے۔ جو یقیناً کم ہے یہ دیدہ زیب فیض نمبر دفتر شبستان۔ دو فاتر شمع آصف علی روڈ نئی دہلی ۲ کے علاوہ دفتر شانِ ہند سے بھی دستیاب ہو سکتا ہے۔

ساجدہ مرزا

ساجدہ مرزا فلمی نام سجا آنے اکثر فلموں میں اداکاری اور موسیقی میں جو شہرت پائی ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں پچھلے سال پاکستان میں ساجدہ مرزا المعروف سجاتا نے اپنے فن کا جو مظاہرہ کیا اُسے اہلِ پاکستان اب تک بھول نہیں سکے۔ پاکستان کے اکثر رسالوں اور اخبارات نے ساجدہ مرزا کے فن کے سلسلے میں خصوصی شمارے شائع کئے۔

ساجدہ مرزا کو اُردو شاعری سے خصوصی رابطہ رہا ہے اور اب وہ شاعرہ کی حیثیت سے دُنیائے شاعری میں اپنا سکہ بٹھا رہی ہیں۔ کئی کئی بند مشاعروں میں ساجدہ مرزا نے جو نمایاں کامیابی حاصل کی ہے

اس کے بارے میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ ترنم، کلام اور حسن کی یہ تثلیث اُردو مشاعروں میں بہت جلد ایسا مقام حاصل کرلے گی کہ بہت سی بے ہنگم، دھاندلی اور ناپسندیدہ شہرت کی شاعرات میدان سے باہر ہوجائیں گی۔ ایسے مشاعرے جن کے منتظمین واقعی اپنے مشاعروں کو کامیاب دیکھنا چاہتے ہیں وہ ساجدہ مرزا بمبئی سے رابطہ قائم کریں۔ ساجدہ مرزا کو دفتر شانِ ہند کی معرفت خطوط لکھے جاسکتے ہیں جو بہ حفاظت [illegible] اُن تک پہنچا دیئے جائیں گے۔

جن وانی

دلی دُوردرشن نے "جن وانی" نام سے ایک سلسلۂ پروگرام جاری کیا ہے جس میں ہر ماہ کسی نہ کسی مرکزی وزیر کو اپنے محکمے کی خامیوں کے بارے میں عوام کے سوالات کا جواب دُو بدُو دینا ہوتا ہے۔ یہ سلسلہ جناب راؤ بریندر سنگھ سے شروع ہوا۔ راؤ صاحب نے اپنے محکمے سے متعلق خامیوں کے جوابات اچھے انداز میں دیئے۔ اور اُن کے بعد سردار بوٹا سنگھ نے بھی بڑی توجہ اور تحمل سے معترضین کے اعتراضات کے جوابات خوش اسلوبی سے دیئے۔ مگر اس سلسلے میں ریلوے وزیر جناب بنسی لال صاحب نے کافی حد تک مایوس کیا۔ حالانکہ معترضین کے سوالات نہایت ہی اہم موضوعات پر تھے۔ مگر وزیر متعلقہ کے جوابات نہ محض نامکمل تھے بلکہ حماقت کی حد تک مضحکہ خیز بھی تھے۔ ہر سوال کا جواب ہمارے پاس روپیہ نہیں نہ صرف بھدے پن کا مظاہرہ تھا بلکہ حکومت ہند کی بے بسی کا بھی اعلان کر رہا ہے جب کہ ہمارے وزیر اعظم ہندوستان کو اکیسویں صدی میں نہایت تزک و احتشام کے ساتھ داخل کرنا چاہتے ہیں۔ ہم بنسی لال صاحب سے گزارش کریں گے کہ ذرا وہ کبھی کسی بھی گاڑی میں سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں خفیہ طور پر سفر کرکے تو دیکھیں تو انہیں پتہ چل سکے گا کہ انہوں نے عوام کے لئے کیا کیا راحتیں اور آرام مہیا کر رکھے ہیں۔

دُوردرشن کو چاہئے کہ وہ اتنے ہی معترضین کو مدعو کیا کریں جو آدھ گھنٹے کے پروگرام میں بہتر طور پر اپنے سوالات اور ضمنی سوالات کا جواب تسلی بخش پا سکیں۔

دیوراج ہوش گاندھی کا انتقال

جے پور کے جناب دیوراج ہوش گاندھی کا پچھلے دنوں ہارٹ فیل ہوجانے کے باعث انتقال ہوگیا۔ ہوش صاحب محکمۂ ٹیلی فون میں چیف اکاؤنٹنٹ تھے اور آپ نے اپنے عرصۂ ملازمت میں عوام کی جو خدمت کی اُسے اہلِ جے پور کبھی فراموش نہ کرسکیں گے۔ ایک معمولی سے بیوپاری سے لے کر وزراء تک ہوش گاندھی صاحب کی جو قدر و منزلت تھی اُس سے پتہ چلتا تھا کہ اگر کوئی شخص عوام کی خدمت اپنا نصب العین قرار دے لے تو اُسے مقبولیت عام و خاص حاصل تو ہوگی ہی وہ اپنی عاقبت بھی سنوار لیتا ہے۔ ہوش صاحب نے اپنی شرافت، خلوص اور اخلاق کے جو سکے اپنے جاننے والوں اور اہلِ جے پور کے دلوں پر بٹھاتے تھے وہ مدتوں اپنا نقش مٹنے نہ دیں گے۔

ہوش صاحب جہاں ایک اچھے انسان تھے اتنے ہی اچھے شاعر تھے اُن کی شاعری بھی مقصدی تھی اور شرافت و اخلاق کا درس لئے ہوئے تھی۔ ہمیں دلی افسوس ہے کہ ہوش گاندھی جیسے مخلص، بے ریا اور حقیقی دوست ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہوگئے۔ خدا انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

ڈاکٹر خلیق انجم کو پرویز شاہدی ایوارڈ

مغربی بنگال اُردو اکاڈمی نے سالِ رواں کا پرویز شاہدی ایوارڈ انجمن ترقی اُردو (ہند) کے جنرل سکریٹری جناب ڈاکٹر خلیق انجم کو دیا ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے انجمن ترقی اُردو کے لئے جو تاریخ ساز کام کیا ہے اُس کی تعریف اُن کے دشمن بھی کرتے ہیں۔ اور یہ گزشتہ چوتھائی صدی میں جن ادیبوں اور محققوں نے اپنے وقیع کام سے اُردو ادب میں نمایاں حیثیت حاصل کی ہے، اُن میں بھی ڈاکٹر خلیق انجم کا نام سرفہرست ہے۔

ڈاکٹر خلیق انجم کا حالیہ ادبی کارنامہ جس کی وجہ سے اُن کا شمار ماہرینِ غالب میں ہونے لگا ہے۔ چار جلدوں میں "غالب کے خطوط کی تدوین" ہے۔

پرویز شاہدی ایوارڈ دس ہزار روپیہ نقد اور توصیفی سند پر مشتمل ہے۔ ہم اس عزت افزائی پر ڈاکٹر خلیق انجم صاحب کو دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

مولانا سلیمان ندوی سیمینار

پچھلے دنوں انجمن ترقی اُردو (ہند)

کے زیرِ اہتمام مولانا سلیمان ندوی کی ادبی اور علمی خدمات کے اعتراف کے لیے ایک روزہ سیمینار کا انعقاد کیا گیا۔ اس سیمینار کا افتتاح محترم جناب سید مظفر حسین برنی گورنر ہریانہ نے فرمایا

ایڈیٹر شانِ ہند نے سیکڑوں سیمیناروں کا افتتاح ہوتے ہوئے دیکھا اور افتتاحی تقاریر سنیں۔ مگر مولانا سلیمان ندوی سیمینار کے لیے افتتاحی تقریر ایسی جامع اور دلکش تھی کہ اس تقریر کے بعد کسی مقالہ نگار کا مقالہ سننے کی ضرورت ہی نہ رہی۔ کیونکہ مولانا سلیمان ندوی کی زندگی کا کوئی بھی ایسا پہلو باقی نہ رہا تھا جس پر برنی صاحب نے سیر حاصل روشنی نہ ڈالی ہو۔ چنانچہ ایڈیٹر شانِ ہند نے افتتاحی تقریر کے فوراً بعد جناب برنی صاحب سے متعدد حضرات کی موجودگی میں ایسی جامع اور پُر مغز تقریر پر مبارکباد دیتے ہوئے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ آپ کی تقریر کے بعد مولانا سلیمان ندوی کے بارے میں اور کوئی کیا نئی بات کہے گا۔

ایسے سیمیناروں کا افتتاح اگر کسی موزوں ہستی سے کرایا جائے تو یقیناً سیمینار کی بسم اللہ بہتر انداز میں ہوتی ہے۔ جیسا کہ مولانا سلیمان ندوی سیمینار میں ہوا۔

انجمن ترقی اردو (ہند) مبارکباد کی مستحق ہے کہ اس نے سید سلیمان ندوی ایسی ہشت پہلو ہستی کی ادبی اور علمی خدمات کے اعتراف کے لیے ایسا سیمینار منعقد کیا ورنہ اردو والے تو مولانا سید سلیمان ندوی کو بھول ہی چکے تھے۔

آخری نظر

فرشِ نظر، عرشِ نظر، اندازِ نظر کے بعد ابوالبلاغت حضرت پنڈت رتن پنڈوری کا پانچواں دیوان "آخری نظر" حال ہی میں شانِ ہند نے بہترین انداز میں شائع کیا ہے۔ آخری نظر آپ کی ذاتی لائبریری کے لیے ایک ایسا انمول اضافہ ہے جسے آپ فخر کے ساتھ باذوق احباب کو دکھا سکیں گے۔

قیمت:- پندرہ روپیے

دفتر شانِ ہند، فلیٹ نمبر ۲، انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

تضمین بر غزل

(جام ساقی)

حضرت جگر مراد آبادی

عیش و عشرت کا ہجومِ عام ہے
[illegible] بادہ ہے جام ہے
موسمِ گل اور وقتِ شام ہے
حسن ہے، نغمہ ہے، مئے ہے، جام ہے
اب کسے فکرِ شبِ ایام ہے

پی رہی ہیں اُن کی آنکھیں بے حجاب
پا رہا ہوں اک شرابِ لاجواب
مجھ سا کوئی ہوگا کیا بندۂ شراب
پی رہا ہوں آنکھوں آنکھوں میں شراب
اب نہ شیشہ ہے نہ کوئی جام ہے

ہوں گی ظاہر عشق کی جب قدریں
خاک میں مل جائیں گی سب نازنیں
میری نظروں سے ہیں اُن کی لغزشیں
دیکھ لینا حسن کی بھی لغزشیں ...!
حسن کی برہم مزاجی عام ہے

پردہ داری ہے کبھی پردہ دری
ہو چکی تقسیم بھی ہو چکی
ہر طرف ہے دھوپ کی ڈھلتی ہوئی
میکدہ کیا اور مشربِ زندگی
کچھ سحر، کچھ دوپہر، کچھ شام ہے

ہے وہی [illegible] اور دستِ [illegible]
رات دن ہے وقفِ جامِ [illegible]
اے سلام آزاد ہے وہ بالیقیں
کیا جگر سے آپ بھی واقف نہیں
ایک ہی [illegible] نام ہے

گوشۂ عقیل صدیقی

شاگردِ سیماب

ڈاکٹر زینت اللہ جاوید

آبد سیمابی سرہندی کی شاعری

آبد ایک روایتی شاعر ہیں جن میں ایک اچھے شاعر کی بیشتر خوبیاں موجود ہیں ان کا شعور فن ماضی کے سرمایۂ ادب اور قدیم ادبی اقدار کا تربیت یافتہ ہے اسی لئے وہ اس دورِ علامات و تجرد میں پاسِ فن رکھنے کے لئے "چراغِ فکر" کو باندازِ کہن روشن رکھنا ضروری سمجھتے ہیں اس بات کا اظہار انھوں نے اپنے اس شعر میں کیا ہے جو ان کے مجموعۂ کلام "چراغِ فکر" میں بطور سرنامہ درج ہے۔

دریں دورِ علامات و تجرد پاسِ فن دارم
چراغِ فکر را روشن بہ اندازِ کہن دارم

چراغِ فکر کو باندازِ کہن روشن رکھنے کا یہ انداز انھیں ماضی سے پیوستہ کر دیتا ہے اور ان کی یہ وابستگی ان کے مزاج اور ان کے شعور کا نتیجہ ہے۔ ان کی فارسی دانی اور اساتذہ کے مطالعۂ کلام نے ان کے رنگِ سخن کی تشکیل میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ جس طرز کو اساتذہ اور اسلاف نے برتا تھا اسی کو آبد نے منزلِ مقصود سمجھا یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں قدیم روایات سے بغاوت اور ادبی گمرہی نہیں ملتی بلکہ قدیم روش کو اپناتے ہوئے اپنے تجربات، اختراعات اور جگر کاوی کی بدولت انھوں نے غزل کو زندۂ بزمِ سخن بنائے رکھا۔ اگرچہ انھوں نے نظمیں اور رباعیات بھی کہی ہیں لیکن غزل آبد کی محبوب صنفِ سخن، ان کے جذبات کی ترجمان اور ان کے ضمیر کی آواز ہے۔ اس آواز کو ایک مخصوص لہجہ اور ایک مخصوص آہنگ دینے میں ان کے شعورِ زبان و بیان کو بہت بڑا دخل ہے۔ فارسی روایت کے اثرات سے غزل میں ایک رچی ہوئی کیفیت پائی جاتی ہے۔ تزئینِ ظاہر کے ساتھ حسنِ معنی کا نکھار ان کے شعر کی جان ہے گویا شعرِ آبد ایک ایسا پھول ہے۔ جس میں رنگ اور خوشبو کا ایک حسین امتزاج ہے۔

بعض اوقات ان کی غزلوں کے قافیے روایتی پابندیوں اور مشاعرے کی مجبوریوں کا بھی پتہ دیتے ہیں لیکن ان کی قافیہ پیمائی کے پس منظر میں آبد کی انفرادی دلکشی ہمیشہ شریکِ غالب نظر آتی ہے قدیم اردو غزل کی اسی خصوصیت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے آبد نے ایک غزل میں ایسی زمین انتخاب کی ہے جس میں ردیف فعل ہے۔ پھر یہ کوشش کی ہے کہ اس فعل کے ساتھ مختلف لفظوں کے ملانے سے جتنے محاورات بنتے ہیں ان سب کو باندھ دیا ہے غزل کی ردیف میں ہے "پڑے"۔ آبد نے حسبِ ذیل محاورے کہہ ڈالے ہیں۔ کل پڑنا۔ شور و شر پڑنا۔ عقل پر پتھر پڑنا۔ راہ میں پڑنا۔ پیچھے پڑنا۔ سابقہ پڑنا۔ مثلاً ایک شعر ہے ؎

جب اٹھا جذبات میں طوفان بپا کر کے گیا
دل کے ہاتھوں آدمی کی عقل پر پتھر پڑے

عروضی نقطۂ نظر سے ان کی غزلوں میں چھوٹی بحروں اور سنگلاخ زمینوں کو خاص اہمیت ہے۔ بیشتر غزلوں کے مقطعے سوانح حیاتی اشارات کے حامل اور خود اعتباری کے گواہ ہیں جن کی مدد سے شاعر کی انفرادیت و خود اعتمادی، حقیقت نگاری و خود اعتباری کا پتہ چلتا ہے اور ان کی زندگی کے بعض گوشے بے نقاب ہو جاتے ہیں۔

گنگا رام آبد سیمابی سرہندی نے ۱۹۱۵ء میں موضع لکھن پور تحصیل سرہند ضلع پٹیالہ کے ایک متوسط درجہ کے خاندان میں آنکھ کھولی۔ زندگی کا کچھ حصہ سرکاری ملازمت میں بھی گذرا لیکن اب ایک عرصہ سے سرہند شریف میں قیام پذیر ہیں۔ والدِ محترم کا اسمِ گرامی لالہ دیوی دیال ہے۔ آبد کو طالب علمی ہی کے زمانہ سے سیاست میں دلچسپی رہی جس کے باعث انھیں زنداں کی مشقت بھی اٹھانی پڑی۔ موزونیِ طبع قدرت کی دین تھی۔ بچپن ہی سے شعر گوئی کا شوق تھا جسے معراجِ کمال پر پہنچانے کے لئے کسی قابل استاد کی ضرورت تھی۔ آبد کی نظر دنیائے شعر و ادب کے مشہور استاد حضرت سیماب اکبر آبادی پر پڑی۔ ۱۹۳۷ء میں وہ اپنے استادِ محترم کے دامنِ فیض سے وابستہ ہو گئے۔ اس بات کا اشارہ انھوں نے اپنے ایک شعر میں یوں کیا ہے ؎

کیا کم ہے یہ شرف کہ بہ فیضِ سخن آبر
رکھتے ہیں ربط شاعرِ ہندوستاں سے ہم

استاد کی ضرورت و اہمیت پر آبر نے اس طرح روشنی ڈالی ہے ؎

سخن گوئی کا جوہر ہر چند بہ فطرت ہے لیکن
کہاں کامل کوئی بے منتِ استاد ہوتا ہے

حضرت سیماب اکبر آبادی نے اپنے شاگرد میں سخن گوئی کا جوہر کمال دیکھ کر بہت جلد انھیں اصلاح سے بے نیاز کر دیا۔ لفظ سیمابی اسی رشتے کی مناسبت سے اختیار کیا گیا ہے۔

نظریۂ ادب

آبر سیمابی ادب کو زندگی کا آئینہ تصور کرتے ہیں اور فن کار کو دنیا میں ہونے والے تغیرات کا ترجمان۔ ان کے خیال میں کوئی فن کار عصری حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ایک اچھا فن کار وہی ہو سکتا ہے جس کا احساس بیدار ہو۔ جن فنکاروں کے یہاں افکار پہ باب سفر بند ہو جاتا ہے اس کی وجہ اپنے ماحول سے بے گانگی بتاتے ہیں۔ فن کار کے لئے اپنے ماحول سے وابستگی ضروری ہے۔ لیکن فن کار کی پرواز کو محدود نہیں کیا جا سکتا نگاہِ فن کی رسائی آسمان تک ہے اور تخلیقی عمل کے دوران فن کار کی نگاہِ بے خودی ایسے ایسے مقامات کی سیر کراتی ہے جس کا علم خود فنکار کو بھی نہیں ہوتا۔ مندرجہ ذیل اشعار تخلیقی عمل، فن اور فنکار کے متعلق آبر کے نظریۂ شعر و ادب کی ترجمانی کرتے ہیں۔

زمیں اوپر نہ نیچے آسماں ہے　　نگاہِ بے خودی جانے کہاں ہے
اُبھرا اس شان سے کہ ان کی بات ہی کیا　　فلک تک بھی نگاہِ فن گئی ہے

ترجمانِ صورتِ حالات کا ہر شخص نہیں　　جن کا احساس ہے بیدار وہی فنکار رہے
اثر تبدیلیِ حالات کا پڑتا ہے دنیا پر　　کوئی محفوظ رہ سکتا نہیں اس کے اثر سے
جو نہیں زندگی کا آئینہ　　وہ ادب بھی ہے کیا ادب کوئی

شاعر کا موضوع اس کی شخصیت اور شعور کا نتیجہ ہوتا ہے۔ آبر کا ادبی مذاق ہر مسئلہ کو تغزل کے انداز میں بیان کرنے کا عادی رہا ہے لیکن ان کے یہاں غزل کا تصور "سخن از زنان گفتن" نہیں اس تعلق سے لالہ بیروی کا یہ شعر حرف بحرف صادق آتا ہے ؎

وہی شعر میرے اسرار ہا ہے درد　　خط و خال کی بات ہے خال خال

آبر کی شاعری عشقِ مجازی کی آئینہ دار نہیں اسی لئے ان کے یہاں ظاہری حسن کا بیان، عشق و محبت کی بے باک مصوری اور بوالہو

عکاسی نظر نہیں آتی بلکہ بیشتر مضامین متصوفانہ ہیں۔ تمام واردات و جذبات کا تعلق عشقِ حقیقی سے وابستہ ہے۔ عرفانِ ذات، حق، معرفتِ نفس، وحدت الوجود، بے ثباتیِ دنیا، صبر و قناعت اور حسرت و غم جیسے مضامات پر طبع آزمائی کی گئی ہے۔ متصوفانہ اشعار میں ان کی اپنی شخصیت کا پرتو بھی جھلکتا ہے جس کے باعث شعروں میں خلوص و صداقت کی کمی محسوس نہیں ہوتی۔ انھوں نے جو کچھ کہا ہے ڈوب کر کہا ہے اور غزل کے مزاج کو ٹھیس بھی نہیں پہنچنے دی۔ وہ عشقِ حقیقی کی تمام کیفیتوں سے آشنا ہیں لیکن اسی کے ساتھ وہ مادی دنیا سے لاتعلق بھی نہیں ہوتے۔ ان کے یہاں دنیا اور انسان کے پیچیدہ مسائل پر غور و خوض کرنے کا شعور بھی موجود ہے۔ ان کے نظریۂ ادب سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ادب کو زندگی کا آئینہ تصور کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں بھلا وہ زندگی میں ہونے والے تغیرات سے کیسے محفوظ رہ سکتے تھے۔ وہ عارضی طور پر دنیاوی علائق سے جدا ہو کر دنیائے تصوف میں گم ہو جاتے ہیں

لیکن وہاں سے لوٹ کر وہ اپنے ساتھ زندگی گذارنے کا ایک لائحۂ عمل ساتھ لاتے ہیں اور عملی دنیا میں اعلیٰ قدروں کو فروغ دینا چاہتے ہیں۔

متصوفانہ اندازِ فکر

آبر کی زندگی صوفیانہ زندگی ہے۔ زندگی کا مادی پہلو ہی ان کے پیشِ نظر نہیں بلکہ روحانی زندگی بھی ان کے نزدیک اہم ہے۔ تصوف روحانیت تک پہنچنے کا ایک اہم وسیلہ ہے اسی لئے آبر نے اپنی شاعری میں تصوف اور اس کے مسائل کو پیش کرنے کی عظیم روایت کو برقرار رکھا ہے۔ وہ بادۂ تصوف سے سرشار ہیں۔ اسی تصوف نے ان کی شاعری کو حیات و کائنات کے مسائل سے آشنا کیا ہے جس کے باعث ان کی شاعری میں موضوعات کا تنوع اور خیال کی رنگا رنگی پیدا ہو گئی ہے اور ایک فلسفیانہ مزاج کا ظہور ہوا ہے۔ آبر نے زندگی اور اس کے متعلقات کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ جو فنکار روحانیت کو معراجِ زندگی سمجھتا ہو اس کے یہاں عشقِ حقیقی کا پیدا ہونا یقینی ہے یہی سبب ہے کہ آبر کو عشقِ مجازی سے کوئی خاص سروکار نہیں رہا۔ وہ حسنِ مطلق کے دلدادہ ہیں۔ ان کے عشق کا مرکز واجب الوجود کی ذات بنا رہتا ہے۔

۱۔ ماہنامہ اعتدال حضرت سیماب اکبر آبادی

صوفیا کے خیال میں یہ تمام کائنات آئینۂ وحدانیت ہے ہر طرف ذات باری ہی کا وجود ہے وہ نظر سے پنہاں ہے اس کے باوجود اس کا جلوہ دیکھا جا سکتا ہے لیکن اس کی تاب لانا انسان کے بس کی بات نہیں بلکہ اس کی ایک جھلک ہی انسان کی بصیرت کو زائل کر دیتی ہے۔ چاروں طرف خدا کا جلوہ ہے لیکن انسان اسے نظر بھر کر نہیں دیکھ سکتا۔ کیونکہ اس کا جلوہ حجاب اندر حجاب ہے اہل شوق پر خلوص بھی نت نئی بت گری کرتا ہے۔ ان کا ذوق نظر ذرے ذرے میں خدا کو جلوہ گر دیکھتا ہے۔ اس حسن لطیف کو حسن مجسم بنانے کی سعی لا حاصل کرتا ہے لیکن چشم تماشا کبھی بھی ایک مرکز پر نہیں ٹھہرتی۔ دیدۂ پر شوق منظر ہر سے مطمئن نہیں ہوتا اور حسن ازل کا جلوہ اسی طرح حجاب اندر حجاب ہوتا ہے جیسے ایک منظر کے پیچھے اور کوئی منظر بھی ہو۔ اس طرح نگاہ شوق فرط تحیر ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس آئین حسن کا محرم اتنا آسان بھی نہیں اور اگر رسائی ہو بھی جائے تو اہل دید خود بھی ایک تماشا ہو کر رہ جاتا ہے اور اپنی منزل مقصود کے قریب پہنچ کر اپنے حواس کھو بیٹھتا ہے ؎

کیا تماشا خیز ہے ذوق نظر　　ذرے ذرے میں ہے کوئی جلوہ گر
مطمئن دیدۂ پر شوق ہے منظر سے نہیں　　اور منظر بھی ہے کوئی پس منظر جیسے
پھرتی ہے نہیں چشم تماشا ایک مرکز پر　　خبر کیوں کر پہنچ پائے کہ دنیا میں نمایاں کیا
اہل شوق نے [illegible] کیا کیا نہ بت گری　　حسن لطیف جس مجسم نہ ہو سکا
کیا ارے کوئی اتری انجمن حسن کا محرم　　[illegible] خود بھی تماشا ہو آئے

لیکن انسان کی اس فطرت کا کیا کیجئے کہ وہ ہر وہ شے جو پردے میں ہوتی ہے اسے بے نقاب [illegible] کر دیتا ہے اور وہ اسرار [illegible] کی نقاب کشائی کئے بغیر چین سے نہیں رہتا۔ حسن کی پردہ داری اس کے شوق کو اور ہوا دیتی ہے اور وہ اس جلوۂ نادیدہ کو اپنی انجانہ بصیرت سے عریاں دیکھ ہی لیتا ہے اور عرفان حقیقت پر مرکز جلی کر ایک قطرہ ہونے کے باوجود اپنی آغوش میں ایک ہنگامۂ طوفان برپا کر لیتا ہے اور یہی وہ "فنا فی العشق" کی منزل ہے جہاں پہنچ کر عاشق حسن و عشق کی بنیادی وحدت کا راز پا لیتا ہے۔ اسے نظم کثرت، بساط وحدت نظر آتی ہے اور وہ کون و مکان کو اسی مستور کا آئینہ تصور کرتا ہے ؎

آئینہ اس نے کون و مکاں کو بنا دیا　　مقصود کچھ بھی تھا پس پردہ ظہور سے

حسن مستور کا ہے عکس ہماری دنیا　　ایک ہی نور سے مخلوق ہے سارا عالم
تیرے حسن نہاں کی حیرت افزائی نہیں جاتی　　ہجوم سا ہے پھر بھی یکتائی نہیں جاتی
نظم کثرت، بساط وحدت ہے　　یہ فسانہ نہیں حقیقت ہے

معرفت نفس

انسان معرفت الٰہی کے لئے ماسوا کا تجزیہ کرتا ہے لیکن اس کا دامن جستجو اس کی انتہائے طلب تحیر کے سوا اور کچھ نہیں ہوتی۔ خدا کی حقیقت ایسی ہے کہ اس کے حیرت میں اور اضافہ ہی ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس کے بارے میں جتنا غور کیا جائے اتنا ہی تخیل گھٹتا جاتا ہے اور یہ نتیجہ ہے خود اپنی ذات سے چشم پوشی کا۔ انسان کی ذات میں کئی پوشیدہ پہلو ہیں، اگر وہ اپنی ذات کے اندر ڈوب کر دیکھے تو محسوس کرے گا کہ اس کا باطن ایک عالم اسرار کا مرقع ہے لیکن کاوش خود آگہی اتنی آسان بھی نہیں۔ کائنات میں کوئی شے انسانی ذات سے اعلیٰ و برتر نہیں ہے۔ اگر وہ اپنے آپ کو پہچان لے تو اسے خدا کا صحیح عرفان حاصل ہو جائے کیونکہ معرفت نفس ہی معرفت ذات حق ہے۔ اپنے تئیں پہچاننا حق تعالیٰ کی معرفت کی کنجی ہے۔ صوفیا کا مشہور مقولہ ہے "من عرف نفسہ فقد عرف ربہ" (جس نے پہچانا اپنے نفس کو بے شک پہچانا اپنے رب کو) عرفان ذات سے متعلق انجم نے کئی اشعار کہے ہیں اور ان کے شعر سے بھی اسی خیال کا اظہار ہوتا ہے ؎

ہر جلوہ ماسوا کا تجزیہ کرتے رہے　　دور دیکھا نہ اپنی ذات کے اندر
دور کی بات رہی معرفت ذات خدا　　آدمی کوشش کرے اپنی ہی پہچان [illegible]
[illegible]　　[illegible]
پوشیدہ اپنی ذات ہے [illegible]　　خارج میں اپنے آپ سے ہم بھی [illegible]

انسان کو جب عرفان حقیقت حاصل ہو جاتا ہے تو وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کی ذات ذات خداوندی سے ملی ہوئی ہے اور اپنا وجود بھی [illegible] سب موجودات خدا ہی کے نور سے جلوہ گر ہیں۔ وہ بھی اسی آفتاب نور ہے۔ انسانی جسم ظاہری حجاب ہے اور اس کائنات کا ہر شے پردہ ایک فریب ہے اگر اس حجاب کو ہٹا دیا جائے تو خدا کے درمیان کوئی [illegible] ہر شے میں بھی خدا کی صورت دیکھ سکتا ہے۔ ایک قطرہ ہو کر اپنی آغوش میں سمندر سما سکتا ہے یہاں تک کہ خدا کے جلوؤں میں گم ہو کر خود سراپا حسن ہو جاتا ہے ؎

کہاں ہے بعد مجھ میں اور تجھ میں — حجاب نا سوا ہی درمیاں ہے
عرفاں حقیقت پر مرکز ہوں تجلی کا — آغوش میں قطرے کے بحر موجزن ہوا
انجام خود فراموشی کا حاصل کیا کہوں — اپنی صورت میں تیری صورت نظر آئی مجھے
تیرے جلووں میں یکھو کر رہ گیا ہوں — سراپا حسن ہو کر رہ گیا ہوں

مطالعۂ فطرت

جب عشق کی بدولت ہوش کو دیوانہ کر کے دل سے نظر کا کام لینے کی صفت انسان میں پیدا ہو جاتی ہے تو اس کی نظر ایسے ایسے رازہائے سربستہ فاش کر دیتی ہے کہ عقل انگشت بدنداں ہو کر رہ جاتی ہے ایسے انسان کے لئے کائنات کا ہر ورق صفت کردگار ہوتا ہے وہ فطرت کو خدا کا پرتو تصور کرتا ہے اور اس کے ذریعہ عرفان الہٰی حاصل کرتا ہے۔ اس کے لئے فطرت عارفانہ رموز کا ایک ذریعہ بن جاتی ہے۔ آبر نے فطرت کا مطالعہ ایک عارف کی نظر سے کیا ہے اسی لئے ان کی شاعری میں ایک ایسا انسان ابھرتا ہے جو اپنے وجدان کے طلسم کے باعث کائنات کی ہر شے میں خدا کا جلوہ دیکھتا ہے اسے شمس و قمر۔ صبح کی پہلی کرن، کلیوں کے چٹکنے اور ستاروں کی تب و تاب میں بھی وہی حسن شاہد معنی نظر آتا ہے۔ تاریک راتوں میں تاروں کی تابنا کی اسی حسن پنہاں کی ضیا بخشی کا صدقہ معلوم ہوتی ہے وہی حسن شبنم کو آب و تاب اور چمن کو بہار دیتا ہے اور کسی نہ کسی بہانے مائل جلوہ ہوتا رہتا ہے۔ اس کی بے زبانی بھی زبان ہوتی ہے لیکن اس کو سمجھنے کے لئے عارفانہ نظر اور سراپا گوش ہونا ضروری ہے۔

سراپا گوش ہے جو بھی ہے بزم دوست میں لیکن
سکوت حسن سے بھی کچھ نہ کچھ ارشاد ہوتا ہے
جلوہ گر ہونا پڑا شمس و قمر کے بھیس میں
حسن کیا چھپتا نگاہ پردہ در کے سامنے
دو کلی چٹکی وہ پھوٹی صبح کی پہلی کرن
مائل جلوہ ہوا وہ حسن پنہاں دیکھیے
کسی کے حسن پنہاں کی ضیا بخشی کا صدقہ ہے
شب تیرہ میں تاروں کی درخشانی نہیں جاتی
شبنم کو آب و تاب چمن کو بہار دی
سحر جمال یار نے دنیا نکھار دی

عقل و جنوں

زندگی کے حقائق کو اگر عقل و خرد کی نظر سے دیکھا جائے تو بہت سی ایسی حقیقتیں اور مسائل قدرت جو اپنے اندر ہمہ گیر رموز رکھتے ہیں ایک گتھی بن کر رہ جاتے ہیں زیادہ و فقت طلب اور پیچیدہ اس لئے بھی کہ شئے لطیف کو مادی کثافت میں تبدیل نہیں کیا جا سکتا دل کی تسلیم شدہ حقیقتیں عقل و خرد کے لئے بے معنی ہیں۔ اس کے باوجود اگر دل عقل و خرد کی مانے تو یہ اس کے دیوانے پن کے سوا کچھ اور نہیں۔ دل جو عشق کی کیفیات محسوس کرتا ہے بھلا اس تک عقل کی رسائی کہاں؟ عقل ہمیشہ سود و زیاں میں گرفتار رہتی ہے ایک الجھن کو ختم کر کے سو الجھنیں اور پیدا کر دیتی ہے اسی لئے عشق میں عقل کی جنوں کے مقابلہ میں ہمیشہ ہی سے مذمت کی گئی ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ جنوں کا جذبۂ عشق صادق اور جنوں کی طلب پختہ ارادوں کی حامل ہوتی ہے ان کے سامنے تو ان کا حقیقی رہنما جنوں ہی ہوتا ہے جو عاشق سوختہ کو آمادۂ سفر کر کے دشوار مرحلے گزار دیتا ہے۔ اس کے برعکس عقل سفر عشق میں طالب محبوب کو ہر گام پر روکتی اور ٹوکتی رہتی ہے۔ اور راہ سفر میں ہزاروں الجھنیں پیدا کر کے عازم سفر کو نا امید اور مایوس کر دیتی ہے لیکن جو انسان ہوش کو دیوانہ کرنا اور دل سے نظر کا کام لینا جانتا ہے اس کی پرواز محدود نہیں رہتی بلکہ وہ عرش بریں کو بھی خاطر میں نہیں لاتا اس لئے عشق و محبت میں وحشت اور جنوں کو اولیت حاصل ہے۔ آبر نے عقل و خرد کی مذمت میں کئی اشعار لکھے ہیں اور اسرار کی گرہیں کھولنے کے لئے ناخن وحشت کو ترجیح دی ہے

خرد گم گشتہ تحقیق پہلے بھی تھی اب بھی ہے
مگر ممکن نہیں پردہ اٹھے راز پنہاں سے
کھلے چشم بصیرت خاک اپنی
غلام دیدۂ بینا ہوئے ہیں
انتہائے عقل ہے وہم و گماں
عقل کیا اور عقل کی پرواز کیا
دماغ و دل میں جب سے ٹھن گئی ہے
حقیقت بھی معمہ بن گئی ہے
ناخن وحشت نے گرہیں کھول دی اسرار کی
عقل حیراں ہے جنوں معتبر کے سامنے

۔۔۔فۂ حیات و ممات

ابتدائے آفرینش ہی سے یہ کائنات انسان کے لئے ایک معمہ رہی ہے اور
۔۔۔ن سوالات نے اس کے دل و دماغ کو پریشان کر رکھا ہے
۔۔۔ئنات خود بخود وجود میں آگئی یا اس کا کوئی خالق بھی ہے؟
۔۔۔بذات خود کیا ہے؟ موت کے بعد کیا ہوگا؟ انسان کا وجود
۔۔۔لئے ہے؟ اس کی زندگی کا مقصد کیا ہے؟ سائنسدان اور
۔۔۔وں نے اپنی اپنی استعداد کے مطابق جوابات تلاش کئے۔
رہنماؤں نے انسانی شخصیت کے روحانی ارتقاء اور اس
۔۔۔صد حیات پر روشنی ڈالی۔ لیکن راز ہستی کبھی کھل کر بے
۔۔۔ب نہ ہو سکا۔ زندگی اور موت انسان کے سامنے سب سے اہم
۔۔۔ا۔ کسی نے زندگی کو ایک دیوانے کا خواب بتایا تو کسی نے
۔۔۔ر ایک حلقۂ دام خیالی تصور کیا۔ کسی کو موت زندگی کا
۔۔۔زما آئی تو کسی نے اسے سفر زندگی کا ایک درمیانی وقفہ
۔۔۔کیا۔ غرض اس بارے میں مختلف خیالات و عقائد
۔۔۔ے آئے لیکن کوئی ایسا مشترک نظریہ وجود میں نہ آیا جو
۔۔۔سان کے لئے قابل قبول ہو۔ بعض نے تو زندگی کو زندگی
۔۔۔ کے علاوہ اس قابل ہی نہیں سمجھا کہ اس پر غور و خوض
۔۔۔ئے۔ لیکن ایک حقیقت جو مشترک ہے اور سب کے
۔۔۔یا کا نشان کر سمجھتی رہتی ہے وہ موت ہے۔ ہر انسان
ضرور جانتا ہے کہ ایک روز اسے اس جہان سے اٹھ جانا
۔۔۔لیکن اس کے بعد کیا ہوگا اس کا کوئی جواب نہیں۔ ایک
۔۔۔انسان دنیا کی محبت کو دل میں جگہ نہیں دیتا بلکہ خالق
۔۔۔ت کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اور خدا کے سہارے اس کے
۔۔۔بر آلام زندگی کا کوئی نقش باقی نہیں رہتا۔ وہ اس کا اخذ
۔۔۔کی ہر شے سے عبرت حاصل کرتا ہے اور اس کی روشنی میں
۔۔۔زندگی گزارنے کا لائحہ عمل تیار کرتا ہے۔ اس کے لئے راز
۔۔۔کوئی بہت بڑا معمہ نہیں بلکہ اسے مذہبی عقیدے کی نظر
۔۔۔دیکھا جاتا ہے۔ عقل اس معاملہ میں درماندہ و عاجز ہے۔
۔۔۔کے خیال میں عقل اسرار ہستی و عدم کو بے نقاب نہیں کر سکتی
۔۔۔لئے خردمندوں کا تلاش حقائق میں رہنا الجھن ان کا دلواد
۔۔۔نظر آتا ہے اس لئے کبھی کہ عقل کی عقدہ کشائی وہم و گمان

سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی ؎

آگہ محدود ہے پرواز خرد ہے　　کھلے اسرار ہستی و عدم کیا
انتہا ہے عقل کی وہم و گماں　　عقل کیا اور عقل کی پرواز کیا
تلاش حقائق میں مصروف ہیں　　خردمند بھی ہیں　　کیا

آبد نے ہستی و عدم کو جس طرح سمجھا ہے اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ ایک موجۂ تخلیق ہے جو مد و جزر کے باعث نشیب و فراز سے گزرتی ہے۔ جب تخلیقی عمل فراز پہ ہو تو اسے ہم زندگی کا نام دیتے ہیں اور نشیب میں ہو تو اسے موت کہا جاتا ہے۔ ہر لمحۂ کائنات میں تخلیقی عمل جاری و ساری ہے موت کی ایک کروٹ شام عدم کو صبح ازل سے ملا دیتی ہے اور زندگی کا سفر کبھی ختم نہیں ہوتا یہ ایک نہ ختم ہونے والا تسلسل ہے البتہ دنیاوی زندگی کا دور نہایت مختصر اور بے اعتبار ہے۔

اس جہاں کی کیا حقیقت ہے بشر کے سامنے
ہو اگر انجام ہستی کا نظر کے سامنے

مد و جزر موجۂ تخلیق سے
دور ہستی و عدم کچھ بھی نہیں
عکس ہے تخیلات و احساس کا
ورنہ حقیقت کیف و کم کچھ بھی نہیں

شام عدم کو صبح ازل سے ملا دیا
جو تیر زندگی تھا اجل نے مٹا دیا

غرض کہ آبد کا فلسفۂ حیات ایک مذہبی انسان کا نقطۂ نظر ہے جس کی بدولت ان پر ؎

گرد حقیقت ہستی کی کھل گئی ہوگی
ورنہ اہل شعور نے ذکر حباب کیا ہے

مراجعت پسندی

ظاہری طور پر تو انسان کو دیوار زنداں میں قید کیا جا سکتا ہے لیکن اس کی روحانی آزادی اس کے تخیل کی رنگینی اور اس کے ماضی کی یادیں اسے خلوت میں بھی انجمن کا لطف دیتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے قیدی کو اسیری میں بھی غم زنداں نہیں ہوتا بلکہ وہ یاد چمن ہی سے اپنا دل بہلا لیتا ہے اور کہتا ہے روزن زنداں سے گلشن کا نظارہ کر کے اسیری میں بھی فصل بہاراں سے
[illegible]

آتا ہے اور چاروں طرف بہاریں رقص کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں جس کے نتیجہ میں وہ رہائی کا بھی آرزومند نہیں ہوتا بلکہ اس قدر مانوسِ زنداں ہو جاتا ہے کہ اگر اسے رہا کر بھی دیا جائے تو اس کے قدم سوئے گلستاں جلدی نہیں اٹھتے اور اسے اسیری کی لذت ستانے لگتی ہے

آبد کے یہاں ماضی کی طرف مڑ مڑ کر دیکھنے کا رجحان بہت قوی نظر آتا ہے۔ ان کا انسان اسیرِ قفس ہوتا ہے تو چمن کی یادوں کو سینے سے لگائے ہوتا ہے اور جب رہا ہوتا ہے تو اسے اسیری کی لذت ستانے لگتی ہے۔ ماضی کو یاد کرنے کے لئے ایک گوشۂ تنہائی بھی ضروری ہے اس لئے وہ گوشۂ قفس میں بھی زندگی گذار دینے کے لئے تیار نظر آتا ہے۔ ایسے حالات سے ایک طرح کا سمجھوتہ بھی کہا جا سکتا ہے جس کی رو سے ایک مجبور انسان لذت یابی کی پریشانیوں اور سعیٔ لاحاصل کی رنجشوں سے چھٹکارا ضرور پا جاتا ہے لیکن اپنی گردن میں غلامی کا طوق اس کا مقدر بن جاتا ہے۔ آبد کے یہاں اسیری میں دیوارِ قفس سے سر ٹکرا کر مر جانے یا دیوارِ زنداں توڑ کر فرار ہونے کا رجحان نظر نہیں آتا۔ بلکہ وہ جبر سے بھی اختیار کا پہلو نکال لیتے ہیں۔ اگر ان میں آزاد ہونے کی طاقت نہیں تو مجبوری میں گھٹ گھٹ کر دم توڑ دینے کا ارادہ بھی نہیں بلکہ میعادِ قید ختم کرنے کے لئے وہ حال کی تلخیوں پر ماضی کی خوشگوار یادوں کا نقاب چڑھا دیتے ہیں۔ آبد کے حسبِ ذیل اشعار سے صبر و قناعت اور ماضی پرستی کی تلقین ہویدا ہے ؎

اسیری میں بھی لذت یاب ہوں فصلِ بہاراں سے
نظر آتا ہے گلشن روزنِ دیوارِ زنداں سے

بہاریں رقص کرتی ہیں نظر میں
قفس آئینہ دارِ گلستاں ہے

بہل جاتا ہے دل یادِ چمن سے
اسیری میں غمِ زنداں نہیں ہے

کر دیا مانوسِ زنداں قیدِ بے میعاد نے
اُف یہ دل کہ آرزوئے رہائی تھا بہت
اگر اٹھیں قدم سوئے گلستاں کس طرح اٹھیں

آبد کے یہ رجحانات بھی تصوف ہی کی دین ہیں۔ ان کے لئے قفس اور چمن، آزادی اور اسیری سب برابر ہیں اس لئے کہ ؎

فصلِ خزاں ہی کچھ ہے نہ فصلِ بہار ہے
دنیا تمام شعبدۂ اعتبار ہے

صبر و قناعت

آبد کا مسلک تسلیم و رضا کا ہے۔ وہ جانتے ہیں انسان کو زندگی میں جو کچھ ملتا ہے وہ خدا ہی کی جانب سے ہوتا ہے۔ اس لئے اس کی دی ہوئی ہر شے عزیز ہو اور کمی و بیشی کی کوئی شکایت لب پر نہیں آنا چاہئے۔ سب سے بڑی تو صبر و قرار ہی ہے جسے یہ نصیب ہو جائے اس کے لئے کم کم زیادہ کے برابر ہو جاتا ہے اور دستِ طلب دراز کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ انسانی روح تو اسی حالت میں سرگرداں اور پریشان ہوتی ہے جب انسان اپنی آرزوؤں اور ضرورتوں کو بڑھا کر ان کے حصول کے لئے ہر جائز و ناجائز اسباب و وسائل کو اختیار کرتا ہے۔ اور ناکامیابی کی صورت میں مایوس اور رنجیدہ ہو کر اپنی محرومیوں پر خون کے آنسو بہاتا ہے۔ دل کا اطمینان تو اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے جب انسان کا دل صبر و رضا کی لذت سے آشنا ہو جائے۔ چونکہ آبد ہر شے کو خدا ہی کی ذات سے منسوب کرتے ہیں اس لئے ان کے یہاں غم و نشاط کی تخصیص نہیں اور اس بات سے وہ اندرونی آسودگی محسوس کرتے ہیں۔ آبد کی یہ فکر تصوف کی تابع ہے۔ ان ناسازگار حالات میں بھی وہ صبر و قناعت کی بدولت زندگی کی تلخیوں اور سختیوں کو خوشی خوشی قبول کر لیتے ہیں۔ یہی تصوف ان کے دنیا کے خلاف حصار کا کام انجام دیتا ہے ؎

غم و نشاط کی تخصیص تو ضرور نہیں
ملا ہے تیرے کرم ہی سے جو ملا ہے مجھے

کمالِ صبر کا حاصل نہ پوچھو
نظر آنے لگا ہے کم زیادہ

دستِ طلب دراز کرے بھی تو کیوں کرے
جس کو خدا نے دولتِ صبر و قرار دی

دل آشنائے لذتِ صبر و رضا نہیں
کیوں کر بشر کی روح کو آسودگی ملے

سفرِ زندگی

آبد صبر و قناعت کے عادی ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کا نظریۂ حیات منفی اور مجہول ہے۔ ان کے یہاں زندگی سے فراریت کا رجحان ملتا ہے۔ ان کے جذبۂ احساس کا دوسرا رخ یہ ہے کہ ان کے یہاں زندگی مہم سفر کا نام ہے اور وہ کسی منزل پر قیام کرنا نہیں چاہتے ؎

زندگی پیہم سفر کا نام ہے   رہروِ ہستی کہیں منزل بنا کر

وہ زندگی کو گہوارۂ عافیت تصور نہیں کرتے بلکہ ایک رزم گاہ اور ایک دار الامتحان سمجھتے ہیں جو باوجود مختصر ہونے کے ہر گام پر انسان کے عزم و حوصلہ کا امتحان لیتی ہے اور اس کے عقل و شعور کو پرکھتی ہے ؎

نگاہوں میں گذر جاتی ہے اکثر   حیاتِ مختصر بھی امتحاں ہے

جو اس راز سے واقف ہوتے ہیں وہ اس امتحان سے گزرنے کے لئے ہر مشکل سے مردانہ وار مقابلہ کرتے ہیں۔ اور مسلسل سرگرمِ عمل رہ کر زندگی کے مراحل طے کرنے کے لئے سر بکف آمادۂ سفر ہوتے ہیں ؎

سہل کر دی اشتیاقِ منزلِ مقصود نے
جادۂ ہستی میں پیش آئی جو دشواری کہیں

آبد کے یہاں خواب دیکھنا بھی کوئی بُرا نہیں۔ وہ انسانی زندگی میں خواب و خیال کو بھی اہمیت دیتے ہیں اگرچہ زندگی صرف خواب و خیال ہی کا نام نہیں لیکن عمل کا وجود بھی عزم و ارادے کے بغیر ممکن نہیں۔ جس انسان کے یہاں نہ کوئی خیال ہے نہ کوئی ارادہ، وہ ایک زنگ آلود شخصیت کا مالک تو ہو سکتا ہے کسی جاندار متحرک شخصیت کا نہیں ؎

گوہرِ مقصود حاصل ہو چکا
جستجو ہی میں جو دم کچھ بھی نہیں

خیالوں میں اگر روحِ عمل بھی پھونک دی جائے
حقیقت سے بدل جاتے ہیں خواب آہستہ آہستہ

ہوسِ منزل پہنچنے کی اگر دل میں لگن
حوصلہ افزا یقیناً سعیِ لاحاصل بھی ہے

مصائبِ زندگی میں سر بکف انسان کبھی کسی مشکل سے خوفزدہ اور اپنے مقصدِ حیات سے مایوس نہیں ہوتا۔ وہ جانتا ہے کہ یہ ہنگامۂ

ہستی درحقیقت جذبات کی گرمی سے ہے۔ اسی لئے دل کو ہمیشہ امید و ارمان سے بھرا ہونا چاہیئے ؎

ہنگامۂ ہستی ہے جذبات کی گرمی سے
کیا دل ہے وہ جس میں امید نہ ارماں ہے

آبد کی شاعری میں امید و ارماں، گرمیٔ جذبات، خوابوں کو حقیقت میں بدلنے کے لئے عزم و ارادہ، اشتیاقِ منزل، جد و جہد اور عمل کی تلقین ایک صحت مند رجحان کی نشاندہی کرتی ہے۔ اس اعتبار سے ان کا فلسفۂ زندگی نہایت جاندار اور توانا ہے اور ان کے اس انسان کی شخصیت کے دوسرے پہلو کو روشن کرتا ہے جو اپنی کمزوری کے باعث درِ زنداں توڑنے سے معذور ہے اور رہا ہونے کے بعد بھی جس کے قدم سوئے گلستاں اٹھنے سے قاصر ہیں۔

سماجی شعور

آبد اقدارِ ماضی کے پرستار ہیں اسی لئے جدید تہذیب اور نئی قدریں انھیں پسند نہیں۔ وہ سماجی رشتوں کو پرانی قدروں کی روشنی میں دیکھتے ہیں اور جب انھیں اپنے معیار پر پورا اترتے ہوئے نہیں دیکھتے تو ان اسباب پر روشنی ڈالتے ہیں جن کے باعث جدید سماج رو بہ زوال ہے۔ وہ جدید معاشرے پر کڑی تنقید کرتے ہیں اور قعرِ پستی سے نکال کر ارتقاء کی جانب راستہ دکھاتے ہیں۔ نیا سماج جس طرح مادہ پرستی کی دوڑ میں اپنی پرانی اقدار اور مذہبی و اخلاقی قدروں سے دور ہو گیا ہے وہ انھیں بے چین کر دیتا ہے۔ جدید انسان نے اپنے دل میں خواہشات کا ایک حشر برپا کر رکھا ہے جس کے باعث اسے تسکینِ دل حاصل نہیں۔ ایک طرف سائنس کی ترقی روز افزوں ہے تو دوسری طرف انسان فولاد سے بھی کمتر ہے۔ ایک طرف مساوات اور برابری کے دعوے ہیں تو دوسری طرف عوام پر جینا بارِ گراں ہے۔ سماج اخلاقی پستی میں اس قدر گر چکا ہے کہ اب اصلاح کی بات کرنا بھی ممکن نہیں۔ اسی لئے آبد ایک نئی دنیا کے خواہشمند ہیں ؎

نہ کر اصلاح کی باتیں قیامت کی گراوٹ ہے
نئی دنیا بسا دے تو اگر میرا کہا مانے

زندگی تسکین کیوں کر پا سکے گی
دل میں حشر اٹھتا ہے اچھا نہیں

صنعتِ تہذیب کا حسن کر سکے اللہ اماں
آدمی سے ہے گراں فولاد تیرے شہر میں
تہذیب کے افق پر تجلی کہاں سے ہے
اخلاق ڈوبتا ہوا تارا ہے ان دنوں

لیکن معاشرہ از خود اچھا یا برا نہیں ہوتا بلکہ افراد مجموعی طور پر اپنی معاشرتی زندگی اچھی یا بری بناتے ہیں۔ اگر انسان ذہنی طور پر زندگی کے متعلق غلط روی یا رجحان رکھتا ہو تو اس کی ظاہری شخصیت، سیاسی اور عمرانی تعلقات بھی بے راہ روی کا شکار ہوں گے جس کے نتیجہ میں انسان مجموعی طور پر معاشرتی زندگی کو کامیاب نہیں بنا پاتا۔ آفاقی قوتوں کے بجائے اس کا ایمان تخریبی عناصر پر زیادہ ہوتا ہے۔ اسے اپنے مآل کی خبر نہیں ہوتی وہ مختلف اشتہاروں کا لبادہ اوڑھ کر مختلف گروہوں میں بٹ جاتا ہے اپنی غرض پوری کرنے کے لئے توہینِ آدمیت بھی کر گزرتا ہے اور اپنے ہر فعل کو شعور و ہوش کی بیداری تصور کرتا ہے۔ حکمران بجو برائے تزئینِ بزمِ جہاں میں وہ اس قدر ڈوب جاتا ہے کہ پھر خدمتِ خلق اور انسان دوستی کا خیال تک اس کے دل میں نہیں آتا۔ دورِ جدید میں انسان کس قدر خود پرستی اور بد اخلاقی میں مبتلا ہے آبد نے اپنے شعروں میں اس کا اظہار برملا کیا ہے اور اس تاریکی کی طرف اشارہ کیا ہے جو اس پُر تصنع زندگی کی تابناکی کے پس پردہ انسان کے باطن میں مسلط ہے ؎

کیا کوئی سمجھے کہ دورِ حال کا
آدمی بے ربط سی تحریر ہے
کیا رنگِ زمانہ ہے کیا گردشِ دوراں ہے
انسان کے سائے سے انسان گریزاں ہے
تزئینِ بزمِ زیست میں گم ہو کے رہ گیا
انساں کو کچھ خبر نہیں اپنے مآل کی
کسی کی اصلیت کا لے سکے کیا جائزہ کوئی
بشر نے اوڑھ رکھا ہے لبادہ اشتہاروں کا
دکھاوے کے لئے ہنستی ہے دنیا
بتہ دل سے بشر شاداں نہیں ہے
اپنی منزل سے بہت دور ہے انساں ابھی
کارگر اسنے ارادوں ۔۔۔ مرشطالہ ۔۔۔ اکھ

مذہبی شعور مذہب دنیا میں انسان کے لئے سکونِ دل خاطر آیا لیکن انسانوں نے گنجائشِ تفریق ٹھہرا لیا اور مذاہب کے نام پر قتل و خونِ انسانیت کا وہ بازار گرم ہوا کہ شیطانیت بھی مات کھا گئی۔ مذاہب کے ٹھیکیداروں اپنی اغراض پوری کرنے کے لئے خدا کا نام لے کر دست و گریباں میں کوئی برائی محسوس نہیں کی اور اہلِ سیاست نے اس فائدہ اٹھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ آبد نے اس بات محسوس کیا ہے۔ ان کے سینے میں ایک ایسا ہمدرد دل ہے انسان کو صرف انسان کے روپ میں دیکھنا چاہتا ہے اور میں کسی تفریق کو تسلیم نہیں کرتا۔ ان کا خیال ہے کہ مذہبی فرائض کی ادائیگی بھی اب دل بہلاوے کی چیز ہو کر رہ گئی ہے مسجدوں میں تڑپ ہے نہ دعاؤں میں اثر۔ آبد مذہب اور اہمیت کو تسلیم تو کرتے ہیں لیکن مذہب میں سیاست اور مذہب نام پر تجارت انھیں پسند نہیں اس لئے انھوں نے اپنے اشعار قتلِ انسانیت پر اظہارِ افسوس کیا ہے اور محفلِ یاراں میں تفرقہ ڈالنے والوں پر کڑی تنقید کی ہے ؎

تکفیرِ غیر، جذبۂ انسانیت کا قتل
کیا کچھ نہیں ہوا ہے مذاہب کے نام پر
رواداری نظر آنے لگی خوابِ پریشاں کیا
تیرے بندے ہوئے آپس میں دست و گریباں کیا
گنجائشِ تفریق ہے دنیا میں ابھی اور
خلاقِ جہاں ہیچ سیاست کے دھن اور
بھی بھول جائے گا آبد در ستہ
حاصل سجدہ و دعا معلوم
جا بیٹھے کیوں لا ہوئے معابد کنجِ خلوت چھوڑ کر
ہر جگہ بیوپار ہوتا ہے خدا کے نام کا

سیاسی شعور آبد نے اپنی غزلوں میں ایسے اشعار بھی کہے ہیں جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ سماج میں انتشار اور ذہنی پریشانی کی ایک وجہ سیاسی شعور کی کمی ہے جس کی عدم موجودگی سے ہم نزاع و عنلیب میں اعتبار سے قاصر ہیں۔ گو ایسے اشعار میں آبد غزل کی ایمائیت اور رمز

[illegible] برقرار [illegible]
[illegible] کیا ہے۔ [illegible] سیاسی حقائق
[illegible] کو الفت [illegible] کا اپنا خیال کیا ہے۔
[illegible] ساغر [illegible] کے [illegible] کا پیمانہ
[illegible] سے کام [illegible] رنگ کو [illegible] رنگ عطا کیا ہے۔
[illegible] کے خیال میں جب انسان سیاست [illegible] خود غرض ہو جاتا ہے
تو پھر اس سے انسانیت کی توقع کرنا فضول ہے۔ بدات خود
آزاد ہو کر بھی [illegible] جانے والے وہ سیاسی لوگ ہیں جو سیاست
کے تحت [illegible] کو مجبور کر [illegible] آزاد رہتے ہیں
[illegible] نے ایسے ہی اہل سیاست پر کڑی تنقید کی ہے اور جس [illegible]
[illegible] اپنے جذبات و احساسات اور تجربات کا اظہار کیا ہے وہ
انتہائی تلخ ہے ؎

نیا رکار گاہ سیاست نہ پوچھئے
جو زاغ اس چمن میں ہے وہ عندلیب ہے
کس کو شرافت کی تلقین کیا
سیاست میں ایمان کیا دین کیا
آزاد ہوئے جشن مسرت منائیں کیا
گلزار پر تصرف زاغ و زغن ملا
[illegible] کے اجلے ہوئے [illegible] کے کالے دیکھیں
اس دور سیاست میں ہم نے تاریک اجالے دیکھیں
ہر منزل [illegible] ہے نہ پہنچیں گا کبھی
کاروان [illegible] کے پیچھے خود غرض رہبر پڑے
فائز منزل نہ ہو سفر کی شکایت کیا کریں
انتخاب رہنما میں ہم بھی سنجیدہ نہیں

عشق مجازی

[illegible] کا تصور عشق و محبت [illegible] ہونے کے باوجود
اپنے اندر ایک انفرادی حیثیت رکھتا ہے۔ ان
[illegible] محبوب [illegible] نہیں شاید اس لئے
[illegible] تصرف [illegible] ہے۔ [illegible]
[illegible] ہے۔ [illegible]
[illegible] محبت [illegible]
[illegible] ہے [illegible]

[illegible] محبوب [illegible] ہے اور اس قدر خوبصورت [illegible]
[illegible] کے جوش [illegible] جاتے ہیں۔ جب وہ بالا سے بام [illegible]
راہرو راستہ بھول جاتے ہیں۔ اس کی نیم نگاہی [illegible]
ہے کہ جہان شوق میں طوفان اٹھ کر رہ جاتا ہے۔ جہاں [illegible]
کے پیراہن کی خوشبو جاتی ہے وہاں وہاں سحاب [illegible]
ہے۔ وہ جہاں پاؤں رکھتا ہے وہاں چمن آباد ہو جاتا ہے

آسماں پر جو دماغ خاک تو ہے جا نہیں
وہ جہاں بھی پاؤں رکھتے ہیں چمن ہو جائے ہے
سحاب کیف امنڈا ہے، جہاں بھی
تیری خوشبو سے پیراہن گیا ہے
پھر کسی کی نیم نگاہی نے وہ فسوں
اٹھ کر جہان شوق میں طوفان رہ گیا
جب وہ بالا سے بام آتا ہے
راہرو راہ بھول جاتے ہیں
آپ کو دیکھ کر بھی کیا دیکھیں
ہوش رہتے نہیں بجا پیارے

اس قدر حسین و خوبصورت محبوب کا وفا [illegible]
بات ہے۔ وہ جور و ستم بھی کرے تو غنیمت ہے۔ [illegible]
زیبا بنا دیتی ہے اس لئے [illegible] اس کی بے نیازی کو [illegible]
اور [illegible] محبوب کو بھی عزیز رکھتے ہیں۔ اس کے جور و ستم سے بھی [illegible]
[illegible] ملتی ہے ؎

دل بے تاب کو تسکین سی ہے
کرم آمیز ہے تیرا ستم کیا

جب انسان میں جوش طلب انتہا کو پہنچ جاتا ہے تو اس کے
نتیجہ میں اس کا دل آہستہ آہستہ حسن کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے
اس مقام پر پہنچنے کے بعد ہر حسن کی کوئی ادا [illegible] نہیں [illegible]
ستم میں بھی لطف آتا ہے اور حرکت [illegible] اختیاری ہونے کے باوجود [illegible]
[illegible] ہو کر رہ جاتا ہے اور یہ ممکن بھی کیسے ہو سکتا ہے کہ انسان
[illegible] سے [illegible] کر ادھورا اور نامکمل رہ جائے۔ ایسا عاشق
شکست آرزو [illegible] نہیں ہوتا اور محبوب کے ناز اٹھانے میں
قوت محسوس کرتا ہے ؎

مرگِ بے وقت کا افسوس نہیں ہے مجھے
آپ کے ناز بھی جی بھر کے اٹھائے نہ گئے
جوشِ طلب سے عشق کا عالم بدل گیا
دل رفتہ رفتہ حسن کے سانچے میں ڈھل گیا

محبوب چاہے مہربان رہے یا نامہربان، آبرو اس سے مقصود اپنے صبر و ضبط کا امتحان لیتے ہیں۔ اس لیے وحشت کے عالم میں بھی وہ آدابِ عشق کو ملحوظ رکھتے ہوئے نہ محبوب کا دامن پکڑتے ہیں نہ اس کے ظلم و ستم سے پریشان ہو کر فریاد کرتے ہیں ؎

مقصود امتحان تھا کرتے بھی کیا گلہ
ہم پر ستم کسی کا برائے ستم نہ تھا
نامہربان تھا کہ کوئی مہربان تھا
مقصود صبر و ضبط کا ہی امتحان تھا

اس امتحان سے گزرنے کے لیے وہ کوئی گریز نہیں کرتے اور نہ ہی کسی انقلاب کی آرزو کرتے ہیں ؎

میرے مذاق سے امیدِ اجتناب نہ رکھ
نیازِ عشق کی فطرت میں انقلاب نہیں

ان کا محبوب جب انھیں نگاہِ غیر سے دیکھتا ہے تو وہ اس پر کسی قسم کا شک نہیں کرتے بلکہ انھیں خود اپنے خلوصِ عشق پر شک آنے لگتا ہے ؎

خلوصِ عشق میں آئے کمی خدا نہ کرے
نگاہِ غیر سے کیوں دیکھنے لگا ہے مجھے

محبوب کا تغافل اور اس کی بے رخی سے آبرو کے عشق میں اور توانائی آتی ہے اور اس طرح وہ بادۂ خام کو عشق جاوداں کے شیشے میں اور پختہ تر کرتے جاتے ہیں اور ان میں یاراے ضبط، پاسِ محبت اور شعورِ غم پہلے سے بیشتر ہوتا جاتا ہے ؎

انھیں سے توانائیِ عشق ہے
اداؤں میں تیری حیا تھی کیا
یاراے ضبط، پاسِ محبت، شعورِ غم
تیرے کرم نے جو بھی دیا وہ سوا دیا

عشق آدابِ سکھاتا ہے، ضبطِ الم کا احساس پیدا کرتا ہے جس کے باعث نہ آنکھوں میں اشکِ خون ہوتا ہے نہ لب پر فغاں ہوتا ہے۔ اس حالت میں بھی عاشق مسرور رہتا ہے ؎

آنکھوں میں اشکِ خوں نہیں لب پر فغاں نہیں
مسرور ہوں کہ ضبطِ الم رائگاں نہیں
گریۂ خاموش، داغِ دل، سکوتِ بے کسی
داستانِ غم کے عنوان دیکھیے

آبرو کا محبوب غیر سے اختلاط نہیں بڑھاتا لیکن اپنے عاشقِ زار کو بھی یاد نہیں کرتا اگرچہ آبرو اسے بار بار یاد دلاتے ہیں کہ بھولنا اچھا نہیں لیکن اس کا اثر اس پر کچھ نہیں ہوتا اور وہ ہمیشہ تغافل برتتا ہے اور کبھی لطف بھی کرتا ہے تو کھل کر نہیں۔ اس کے باوجود آبرو کے جذبۂ عشق میں کوئی کمی نہیں آتی۔ ایسے لگتا ہے جیسے محبوب ان کے لیے نہیں ہے بلکہ وہ محبوب کے لیے ہیں اسی وجہ سے گفتگوئے عشق و محبت میں ان کے لہجے میں سوز و گداز کا دھیما پن اور سریلا پن ہے ؎

بڑھ چلی ہیں عشق کی مایوسیاں
بھولنے والے کبھی تو یاد کر
تو بھول کر بھی مجھے یاد کر سکا نہ کبھی
میں بھول کر بھی تیری یاد کو بھلا نہ سکا
لطف اگر ممکن نہیں ہے داد کر
بھولنا اچھا نہیں ہے یاد کر
شکوۂ بے گانگی سے درگزر
رنج کی باتوں میں کچھ رکھا نہیں
اچھی ہی سی ہوتی ہے حیا عشق ہے کبھی ہم پر
زمانے کی نظر بھی رہ گئی تیری نظر ہو کر
شاید تیرے کرم سے بھی چارہ نہ بن پڑے
کیا کہیے دل میں درد کہاں ہے کہاں نہیں
درد کی برق گری آتشِ غم بھی بھڑکی
دل میں تبدیل تیری یاد کا موسم نہ ہوا

شیوۂ عشق و عاشقی میں آبرو نے فقرہ و غزل کی آوارگی و شورش کو نہیں اپنایا ہے بلکہ شعر کی تمام خوبی و سوزش اختیار

کی جو بات ہے یہ کہ ان کے یہاں ضبط و احتیاط کی پابندی ہے۔ چنانچہ ان میں یہ جرأت نہیں ہوتی کہ محبوب کا دامن پکڑ لیں، اس کی زلف و رخسار سے کھیلیں تو وہ خواب و خیال میں ایک نیا آباد کر لیتا ہے جہاں وہ اپنی آرزوؤں اور خواہشوں کی تکمیل میں کسی چیز کو مانع نہیں پاتا اور ہجر میں بھی لذت وصل سے فیض یاب ہوتا ہے ؎

کیا کہیں کیوں کر گزارا دورِ پر آشوب ہجر
ہم تصور میں رہے ان سے بہم اپنی جگہ

غمِ فراق بھی راس آگیا طبیعت کو
ترے وصال کا پُرکیف خواب کیا ہے

برنگ موجِ صبا مشک بار گزری ہے
خیال سے بھی جو زلفِ نگار گزری ہے

کس طرح سے کہ تعلق بن پڑے
خواب میں بھی کوئی دامن گیر ہے

آبر کے تصورِ حسن و عشق سے جس محبوب کا پیکر ابھرتا ہے وہ ایسا نہیں ہے جس کے زلف و رخسار سے کھیلا جائے، یا اس کے ظاہری خط و خال کی تعریف کی جائے۔ وہ تو ایک ماورائی ذات ہے جسے صرف خواب و خیال اور تصور ہی میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ آبر نے اپنے شعروں میں حسن مجازی کا بیان کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک ایسا بھیس ہے جو اردو غزل کی روایت نے انھیں بدلنے پر مجبور کیا ہے۔ وہ چاہے عشق میں جو بھی بھیس بدلیں ان کا طرزِ عشق چھپ نہیں سکتا اس بات کا خود انھیں اقرار ہے ؎

لوگ تو لوگ ہیں پہچان گئیں دیواریں
ہم گئے ان کی طرح بھیس بدل کر کتنے

وہ حسن مجازی کی طرف جاتے بھی ہیں تو اس لئے کہ شاید اس پردے میں وہ اپنے محبوبِ حقیقی کو دیکھ لیں۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ آبر کو جستجوئے حسن یوں ہی نہیں ہے بلکہ اس کے پس پردہ وہ محبوبِ حقیقی کا جلوہ دیکھتے ہیں اور بُعد کو قرب میں بدل کر اس کی آواز کو قریب سے سننا چاہتے ہیں ؎

چشم بینا کو نہیں جستجوئے حسن یوں ہی
ماسوا جلوۂ مستور کا پردا ہے مجھے

آواز دیجئے کبھی آ کر قریب سے
ہم دور کی صداؤں سے مایوس ہو گئے

آبر نے حسن و عشق کا جو تصور پیش کیا اور حسن و عشق کی مختلف واردات و کیفیات کو جس طرح شعر کے پیرائے میں ادا کیا ہے اس سے ان کی شاعری میں صرف غزل کا ڈھانچہ ہی تیار نہیں ہوتا ہے بلکہ غزل کی روح بھی دکھائی دیتی ہے اس طرح ان کی شاعری کی روایت اپنے آپ کو رونما کرتی ہے۔

شعورِ غم

آبر کا شعورِ غم بہت توانا اور جاندار ہے۔ وہ غم کو زندگی کا محرک اور ایک ایسا تازیانہ تصور کرتے ہیں جس کے باعث دلِ ناداں خوابِ غفلت سے جاگ پڑتا ہے اور مسائلِ زندگی و رازِ حیات کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے یہ اور بات ہے کہ انسان کا دل خوگر دۂ مسرت ہوتا ہے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ غم ایک پائندہ حقیقت ہے۔ انسانی زندگی کا ایک جزو لاینفک، اسی لئے اس کی خلش جاویداں ہوتی ہے۔ اس کے برعکس عیش و عشرت کے لمحے گریزپا اور ان کی چمک دمک عارضی ہوتی ہے خوشیاں تو لبوں کو چھو کر فوراً واپس چلی جاتی ہے لیکن غم حیات کا نشتر دل میں ہمیشہ کے لئے اتر جاتا ہے۔ بزمِ جہاں میں حیات و ممات کا رقص جاری ہے۔ اب ایسے ماحول میں خوش رہنا یا ملول رہنا انسانی طبیعت پر منحصر ہے کہ وہ کس حالت کو اپناتا ہے۔ جو غم کی قیمت کو جان لیتے ہیں وہ غم حیات کو مسرت پر ترجیح دیتے ہیں اور رنج و غم پر ان خوشیوں اور مسرتوں کو نثار کر دیتے ہیں جو بے اعتبار ہوتی ہیں اور انسانی ذات کی اوپری سطح پر کلام کرتی ہیں جب کہ غم روح کی گہرائیوں میں اتر کر انسان کو ایک فلسفیانہ نقطۂ نظر اور زندگی گزارنے کا ایک شعور عطا کرتا ہے۔

آبر کا ایذا پسند دل غم کی لذت سے آشنا اور اس کی عظمت کا قائل ہے۔ ان کے یہاں سنجیدہ تفکر اسی غم کی بدولت آیا ہے۔ وہ ایسی مسرت کے آبِ حیات کو پسند نہیں کرتے

[illegible] ہے جہاں پہنچا برعکس و ناکس کا کام نہیں بلکہ ایک [illegible] زندگی پر [illegible] اس تلخ حقیقت کی روشنی کو پایا [illegible] ہے۔ اب سکے یہاں فانوس ہیں کہ اس تلخ حقیقت کی حفاظت [illegible] جاری و ساری ہے۔ وہ خودکشی کو زندگی کا منشا قرار [illegible] کرتے [illegible] انسانی شخصیت کی تکمیل کے لئے احساس غم کو [illegible] ضروری سمجھتے ہیں ۔

زندگی کا خودکشی منشا نہیں
نامرادی غم نہیں ایسا نہیں
یاراں کم نگاہ کو حرمان غم نہیں
ورنہ غم حیات مسرت سے کم نہیں
[illegible] دیا دلِ ناداں کو خوب غفلت نے
کیا وہ کام غم نے تازیانے کا
خوشیاں اس کو چوم کے واپس چلی گئیں
نشتر غم حیات کے دل میں اتر گئے
غم زندگی ہے جو فانوس ہیں
وہ تلخ حقیقت کے فانوس ہیں

غرض کہ [illegible] کی شاعری کا مطالعہ قاری کو ایک ایسے [illegible] ہے جہاں تفصیل پسندی اور [illegible] کا [illegible] نہیں بلکہ موضوعات کا ستھراپن، انداز کی سادگی [illegible] ہے۔ زندگی کے متنوع پہلوؤں کا احساس [illegible] ہے۔ یہ فکر و فن ایک باشعور فنکار کی [illegible] سرمایہ ہے [illegible] شعر و ادب میں ایک [illegible] ہے اور دلکشی کا [illegible] ۔

[illegible] کیا جائے
وہ زمیں پہ خون کا استر ہے کیا کیا جائے؟
بہرہ بہار میں اُجڑا ہے گلستاں لوگو!
عجیب حال کا منظر ہے کیا کیا جائے
دل و ذہن میں تعصب ہے زہر آلود
عشق نفس پہ تجربہ کیا کیا جائے!
کیسے سنائے قمر اپنی داستانِ الم
ہر ایک دل یہاں پتھر ہے کیا کیا جائے!

[illegible] انوری

قطعات

جب کوئی بدحواس ہوتا ہے
غم کا احساس [illegible]

[illegible] کا [illegible]
[illegible] آزاد ہوتا ہے

[illegible]
[illegible]

[illegible] ماضی کا البم [illegible]
[illegible] قریب ہے

[illegible]
روشنی میں نئی زندگی مجھے دیدو

[illegible] غیب [illegible] کوثر
نسبت غیب اگر [illegible] مجھے دیدو

کوثر قریشی

غزل

[illegible] مسلسل توجہ بہ ہو گئی
دل بھی کہتا ہے اچھی سزا ہو گئی
آج آن کی ہنسی کیوں ہوا ہو گئی
[illegible] حرکت کوئی ناروا ہو گئی
پیار کرنا بھی کیا روگ ہے دوستو
زندگی اچھی خاصی بلا ہو گئی
تم رقیبوں کے ہمراہ کیا [illegible]
دوستی دشمنی ہمنوا ہو گئی
[illegible] ملاقات [illegible] کی
زندگی کیسے کیا کیا سے کیا ہو گئی
ملنے سے کیوں مگر آپ کرنے لگے
مجھ سے فرمایئے کیا خطا ہو گئی
[illegible] میں [illegible] اے شیخ جی
آج یہ [illegible] خطا ہو گئی
وہ سلامت رہیں وہ جہاں بھی رہیں
بس یہی آج کل کی دعا ہو گئی
کون سا کام [illegible] تونے کیا
زندگی آج تجھ پہ فدا ہو گئی

[illegible] ([illegible])

بمبئی مرکنٹائل کوآپریٹو بینک لمیٹڈ

رجسٹرڈ ہیڈ آفس : نمبر ۷۸، محمد علی روڈ بمبئی ۳ ....۴۰۰

دہلی برانچ :- دریا گنج، نئی دہلی

اعلان بسلسلۂ حج ۱۹۸۵ء

ہم بہ مسرت اعلان کرتے ہیں کہ سال گزشتہ کی طرح امسال بھی بفضلہ تعالیٰ حج کمیٹی نے حجاج کرام کی سہولت کے لئے زر مبادلہ (فارین ایکسچینج) جاری کرنے کی خدمت انجام دینے کے لئے

بمبئی مرکنٹائل کوآپریٹو بینک لمیٹڈ کو منتخب کیا ہے

جن حجاج کرام کی درخواست حج کمیٹی نے منظور کر دی ہے ان حضرات سے گزارش ہے کہ وہ ہندوستانی رقم مبلغ =/1428 روپے (جو کہ سعودی ریال چار ہزار کے برابر ہے) کا ڈرافٹ ہماری کسی بھی برانچ یا کوئی بھی شیڈولڈ بینک سے حاصل کریں جو

بمبئی مرکنٹائل کوآپریٹو بینک لمیٹڈ اکاؤنٹ

... حاجی کا نام .... کے حق میں ہو اور دہلی یا بمبئی پر جاری کیا گیا ہو

نوٹ :- دہلی سے بذریعہ ہوائی جہاز

جانے والے زائرین حج سے گزارش ہے کہ وہ برائے سہولت اپنے ڈرافٹ

صرف

دہلی پر ہی جاری کرائیں

ضبط کا پتھر

(ڈاکٹر اُدے سری ارمان بنارسی)

رما اپنے شوہر بابو کے ہاتھوں کی اُنگلیوں پر تِل کا تیل مل رہی تھی شاید اس طرح بابو کی اُنگلیوں کی سنسناہٹ جاتی رہے۔ مگر کئی روز ایسا کرنے کے باوجود کوئی افاقہ نہ ہوا تو اُس نے گاؤں کے کئی اصلی نقلی ڈاکٹروں سے اپنے شوہر کا علاج کرایا۔ مگر فائدہ نہ ہونا تھا سو نہ ہوا۔ اب حالت یہ ہو گئی تھی کہ بابو کی اُنگلیوں میں سُلگتی ہوئی بیڑی سُلگتے سُلگتے اُس کی اُنگلیوں کو بھی جلا ڈالتی تو اُسے گرمی کا احساس نہ ہوتا تھا اور اُس کے چہرے پر بھی ورم آ گیا تھا جو جذام کی ایک خاص علامت ہوتی ہے۔ بابو کے علاج معالجہ پر گھر کا سامان تک بک گیا تھا۔ اور اس پر مصیبت یہ کہ سارے گاؤں میں یہ مشہور ہو گیا کہ بابو کو کوڑھ ہو گیا ہے لہٰذا اُس کے گھر آنا جانا بند کر دینا چاہیے۔

گاؤں والوں کی باتیں بابو کے کانوں تک بھی پہنچ چکی تھیں اور وہ دل ہی دل میں یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ اب اس گاؤں میں اس کا رہنا مناسب نہیں ہے۔

اس پڑوس کی عورتوں نے بابو کی بیوی سے کہنا شروع کر دیا۔ بہن تمہارا آدمی کچھ برا نہیں ہے۔ مگر یہ بیماری چھوت کی ہے جو تجھے اور تیرے بچوں کو بھی لگ سکتی ہے لہٰذا بابو کو کہیں باہر بھیج دے۔ کیونکہ یہ روگ لاعلاج ہے اور تجھے مجبوراً بچوں کو لیکے در در بھٹکنا پڑے گا۔

رما کو یہ باتیں تیری طرح چبھتی تھیں مگر جب وہ تنہائی میں بیٹھتی تھی تو اس کو کسی بے غرض ناصح کے تلخ الفاظ کی طرح وہ ہی خیال آتا کہ لوگ ٹھیک ہی کہتے ہیں آخر دل پر پتھر رکھتے ہوئے اُس نے بابو سے کہہ ہی دیا کہ گھر چھوڑ کر اُسے کہیں چلے جانا چاہیے۔ رما نے کہنے کو تو اپنے شوہر سے یہ کہہ دیا مگر اصل میں اُسے اس حالت میں بھی اپنے شوہر کی جدائی ناقابلِ برداشت تھی اور وہ رات بھر سسکیاں بھرتی رہی۔

بابو نے بھی اپنی بیوی کے اس فیصلہ کو دل ہی دل میں قبول کر لیا تھا۔ مگر اُسے اپنی بیوی اور بچوں سے بچھڑنا کھل رہا تھا۔ لہٰذا اس نے رما سے روتے ہوئے کہا کہ مجھے باہر بھیجنے سے تو بہتر ہے کہ روٹی میں چوہے مارنے والی گولیاں ملا کر کھلا دو تاکہ میری بھی نجات ہو جائے اور تم لوگ کا بھی مجھ سے پیچھا چھوٹ جائے گا اگر میں گھر سے کہیں باہر روانہ گیا تو میری ... آپ کے کیسے گزرتے پھریں گے"

سُنتے ہی رما کو سانپ سونگھ گیا وہ اُداس اور مضمحل اُس کی خاموشی پر بابو بولا "تو چپ کیوں ہو گئی۔ جب زندگی اہمیت ہی نہیں رہی تو پھر اس طرح زندہ رہنے کی کیا ضرورت کبھی پیڑ کی شاخ سوکھ جاتی ہے تو مالی بھی اُس کو کاٹ گرا دیتا ہے۔"

رما اپنے شوہر کی اس بے بسی پر سوائے آنسو بہانے کے کیا کر سکتی تھی اور اُس نے آنسوؤں کی جھڑی میں کہا کہ ہندوستانی عورت اپنے پتی کو زہر نہیں دے سکتی۔ رما نے روتے روتے بابو کو سمجھایا کہ یہ کرنا بھی پاپ ہے اور کوئی استری اگر اپنے پتی کو زہر دے کر موت کے گھاٹ اُتار دے تو اُس کی بخشش بھگوان کے گھر بھی نہیں لہٰذا یہی اچھا راستہ ہے کہ تم گھر چھوڑ کر کہیں چلے جاؤ۔

بابو کے دل میں رما کی بات اُتر گئی وہ بولا۔ ٹھیک ہے مجھے یہاں سے جلدی جانا چاہیے۔ یوں کہتے کہتے بابو نے ٹیڑھی میڑھی اُنگلیاں پیار کے ساتھ رما کے سر پر پھیریں۔ اور آخری پیار کیا۔ پھر وہ اُٹھا اور بچوں کو پیار کرنے کے لئے اُن کی طرف بڑھا۔ مگر یکایک خیال آیا کہ مجھے کوڑھ کی بیماری ہے یہ چھوت کا روگ ہے۔ میرے اور سانسوں کا چھونا بچوں کو اس بیماری میں مبتلا کر سکتا ہے اِن کی خاطر گھر بار چھوڑ رہا ہے وہاں اپنی اس خواہش کو بھی مار کے دل کی بات مان لی۔ اور وہیں ٹھٹھک گیا۔ رما بیٹھی بیٹھی جائزہ لیتی رہی۔ آدمی بچوں کی بھلائی کے لئے کیا کچھ نہیں کرتا۔ بابو وہ کھڑا بچوں کو ٹکر ٹکر دیکھتا رہا جیسے کوئی اچھوت شیوجی کی مورتی کو دُور سے دیکھ سکتا ہے مگر اُسے چھو نہیں سکتا۔ اپنی پیاری بیوی کے ٹکڑوں کو وہ گوتم بدھ کی طرح چھوڑ کر جا رہا تھا۔ اس نے ایک بار رما کی طرف پھر دیکھا۔ رما نے اپنا منہ چھپا لیا تھا کہ اُس کو دیکھ کر کہیں بابو کا ارادہ بدل نہ جائے وہ کھڑا کھڑا سوچ رہا تھا کہ اُس کی عدم موجودگی میں اُس کی بیوی کی دیکھ بھال کون کرے گا؟ کون ہو گا اُس کی ...

سچے اُس کی جھونپڑی تک نہیں پہنچ کر آئے۔ اللہ ہی قدر لمبا ہے
بلکہ ان سب کا رکھوالا ہے۔ جنگل میں پھیلے ہوئے کھیتوں کی فصلیں
...دوں پر اُگنے والے سبزہ کو کون دیکھتا ہے۔ جہاں تک راما کا
...ہے وہ تو بہت ہی تیز ہے وہ کبھی بھی میری ناک نہیں کٹائے گی۔
...ہی دل میں کہتا ہوا بابو آگے بڑھا، اور دروازہ کی طرف چل دیا۔

راما کی ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی جیسے سُن کر بابو نے مڑ کر راما کی
...نری بھری نظروں سے دیکھا اور کہا "اب تم میرا دھیان چھوڑ کر
...میں من لگاؤ" یہ کہتے ہوئے بالکل اسی طرح بابو تیز تیز قدموں
راما کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اور راما چارپائی پر بیٹھی گھٹ گھٹ
...روتی رہی۔ کیونکہ اگر وہ اونچی آواز میں روتی تو سوئے ہوئے بچے اٹھ بیٹھتے
...مجبوری تھی کہ وہ کھُل کر رو بھی نہیں سکتی تھی۔

دن نکلے جب بچے سو کر اُٹھے اور انہوں نے اپنے بابو کو پوچھا تو ماں
...بناوٹی مسکان کے ساتھ جواب دیا "بیٹا وہ سرکاری کام پر کمانے چلے
...گئے ہیں وہاں سے خوب سارا روپیہ کما کر لائیں گے بہت دنوں کے بعد
...ئیں گے" یہ سُن کر بچے مطمئن اور خوش ہو گئے اپنے خوشنما مستقبل کے
...خواب دیکھنے لگے۔ جب کبھی بچوں کو اپنے باپ کی یاد ستاتی اور
...دیکھنے کو جی کرتا تو وہ ماں سے اُس کے آنے کی بابت پوچھتے جواب ملتا "
...ابھی بہت دن کہاں ہوئے ہیں؟" یہ سُنتے ہی بچے خاموش ہو جاتے،
...طرح راما بچوں کی دیکھ بھال کرتی رہی اور کھیتی بھی سنبھالتی رہی۔ بابو ورندا
...بن دکان بھیک مانگنے لگا۔ شام کو اسٹیشن پر جا کر سو جاتا جہاں کئی اور
...بھی رات بتانے جا سوتے تھے۔ بابو اِن کوڑھیوں سے گھِنیاتا تھا مگر
...دھیرے دھیرے یہ گھِن دور ہوتی گئی کیوں کہ وہ خود بھی تو انہیں کی طرح تھا
...تو یہی لوگ اُس کی برادری تھی یہی اُس کا سماج تھا، وہ انہیں دیکھتا کہ
...دن بھر کے مانگے تانگے پیسوں سے طرح طرح کی چیزیں خرید لاتے
...مزے لیتے لیکن بابو کچھ پڑھا لکھا بھی تھا۔ اُس نے اُن کی نقل نہیں کی
...پیٹ بھرنے کے لئے مناسب اخراجات کرتا۔ اور مہینے بھر میں
...بچتا راما کو منی آرڈر کر دیتا۔ منی آرڈر کوپن پر لکھوا دیتا کہ میں بالکل ٹھیک
...کام لگ گیا ہوں۔ اچھی نوکری مل گئی ہے تم بچوں کو سنبھال کر رکھنا۔ بابو
...اُس سے اِس طرح ہر ماہ پہنچنے والے منی آرڈروں اور سندیسوں سے
...والوں کو بھی یقین ہو گیا کہ بابو کہیں کام کر رہا ہے اِس طرح سے گو
...اپنے بچوں کی زیر خبر تو نہیں تھی مگر اُس کی خیریت بچوں کو ضرور مل جاتی
تھی جو بچی کو باعث راحت ہوتی تھی۔

بابو کے گھر سے جانے کے ٹھیک نو ماہ بعد راما کو بھگوان نے آخری
پیار کا پھل دے دیا اور وہ اب تین بیٹیوں کی ماں بن گئی۔ عورتوں میں طرح
طرح کی باتیں ہونے لگیں مگر نو ماہ کی مدت اور ہر ماہ منی آرڈروں کا آنا اُن
سب کا منہ بند کرنے کو کافی تھا۔ اور راما کی شرافت نیک چلنی اور کردار متعلق
اُس کے آڑے آئی اور وہ بدنام ہونے سے بچ رہی۔ ایک دن راما نے منی آرڈر
کی واپسی رسید کے پتہ پر بذریعہ خط بابو کو تیسرے بیٹے کی خوشخبری بھی مگر کوئی
جواب نہیں آیا اِس بیچاری کو کیا پتہ کہ منی آرڈروں پر لکھا ہوا پتہ فرضی ہوتا تھا
جب کوئی جواب نہیں آیا تو وہ حقیقت کو بھانپ گئی اور خاموش ہو کر بیٹھ گئی
کیسی مجبوری تھی کہ جس کے ساتھ زندگی کا ایک خوشگوار حصہ گزارا تھا اُس
کا منہ دیکھنا تو درکنار اُس کے قول سُننے تک کو محتاج ہو گئی تھی،

اِسی طرح سالوں بیت گئے۔ راما نے بڑے لڑکے نرائن کو آٹھواں
درجے تک پڑھا کر کپڑے سینے کی ٹریننگ دلا دی، اور سرکاری لون پر سلائی
کی مشین لے کر ایک دکان کھلوا دی۔ دھیرے دھیرے نرائن کی آمدنی
اچھی خاصی ہونے لگی۔ اور گھر کی حالت سدھر گئی۔ سب خوش و خرم ہو گئے اور کسی
نے اپنی لڑکی کا رشتہ بھی اُس کے ساتھ طے کر دیا۔ جب نئے رشتہ داروں
نے نرائن کے باپ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تو راما نے کہہ دیا کہ وہ باہر گئے
ہیں۔ اور ابھی چھٹی نہیں ملی ہے شادی کے موقع پر گھر آ سکیں گے منی آرڈر
کی رسیدیں دکھا کر اُس نے اپنی بات کی پختگی کر دی اِس طرح سب
مطمئن ہو گئے اور پھر کسی نے کچھ نہیں کہا۔

اب بچے سیانے ہو گئے تھے راما نے اپنے بچوں کو بابو کی بابت سب
کچھ بتا دیا تھا۔ شادی کے دن قریب آ گئے اب کی بار منی آرڈر نہیں آیا
پورا ڈیڑھ مہینہ ہو گیا راما کا ماتھا ٹھنکا اور وہ اُداس رہنے لگی۔ مگر
اپنی دلی حالت کسی پر ظاہر نہیں کی اور وہ ربڑ کی گیند کی طرح صبر و تحمل
دُکھ سکھ برداشت کرتی رہی۔ ایک دن شادی کا سامان لینے وہ شہر گئی،
اسٹیشن سے شہر تک کا راستہ بہت لمبا نہیں تھا۔ اِس لئے وہ پیدل ہی
چل دی۔ راستے میں کھوکھوں کے پاس گندے نالے کے کنارے ایک
لاش پڑی تھی جس کی ٹانگ پر ایک کُتا لپٹا ہوا تھا جس نے لاش
کی ٹانگ کا کچھ ماس بھی نوچ لیا تھا۔ کئی لوگ دیکھتے اور نفرت سے منہ پھیر
کر نکل جاتے کوئی کہتا "کوئی بھکاری مر گیا ہے مگر میونسپلٹی والوں کی
بے پرواہی تو دیکھو کہ اِس کو یہاں سے ہٹوایا تک نہیں ماس سڑ گیا ہے

گرو نانک، کلاوتی، مادھوی وغیرہ وغیرہ بے شمار نام آپ کو ملیں گے اگر ہم نے گوردھن گھی میں آدھا ڈالڈا ملا دیا اور اسی طرح اور چیزوں میں ملاوٹ کر دی تو کیا اُن ناموں کی بے حرمتی نہ ہوئی جن کے نام سے اُن کو منسوب کیا گیا ہے۔ عوام مذہبی جذبات کے تحت آ کے خریدیں گے۔ یوں ہم عوام کے جذبات کو ٹھیس لگاتے ہیں اور فریب دیتے ہیں۔ دوسرے ممالک میں محض ہسپتال یا تعلیمی اداروں کے نام مذہبی پیشواؤں کے نام پر رکھے جاتے ہیں جو عین مناسب ہے کیونکہ وہ تجارتی ادارے نہیں۔

۴۔ کاسٹ سسٹم:- یہ ایک خاص اور سب سے غریب اور پسماندہ انسانی طبقے کے لئے نفرت کا اظہار ہے۔ آزادی کال میں ٹوٹتے ہوئے یہ کانٹے اِس روشنی کے دور میں بھی ہمارے دامن کو اُلجھائے ہوئے ہیں۔ اِس سے نجات پانے کی کوشش میں ہم ناکام رہے۔ یہ محض اِس برِّ صغیر کے اِسی خطے میں ہی پائے جاتے ہیں۔ ہم اپنے دلوں کو یہ کہہ کر تسلی دے لیتے ہیں کہ دوسرے ملکوں میں کلاس سسٹم ہے۔ لیکن یہ کلاس سسٹم تو عالمگیر ہے یعنی امیر و غریب سب جگہ ہیں۔ ہمارے ملک میں کلاس سسٹم کے علاوہ کاسٹ سسٹم ایک زائد بُرائی ہے۔ جو اور کہیں نہیں اور کلاس سسٹم سے زیادہ بھیانک ہے۔ ہزاروں صدیوں کی مظلوم یہ پسماندہ قوم آج بھی قابلِ نفرت ہے۔ محض خدائے کریم ہی اِس داغ کو اپنے کرم سے دھو سکتا ہے۔

۵۔ ڈپلیکیشن:- نقالی میں ہم اُستادِ زماں ہیں۔ اِس آرٹ میں کوئی ہمارا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ مارکیٹ ہر قسم کے نقلی مال سے بھری پڑی ہے۔ محلے پڑی جو کوٹیج انڈسٹری کہلاتی ہے، اس میں بھی نقالی ہوتی ہے یہ بُرائی دنیا کے صرف اسی خطے میں پائی جاتی ہے۔ آپ کا اس میں کہاں تک ہاتھ ہے؟ اگر نہیں تو کیا آپ اس سلسلے میں کوئی امداد بہم پہنچا سکتے ہیں؟

چلتے چلتے ایک اور داغ پر نظر پڑ گئی۔ ماں کے ساتھ نیک اور پاک رشتے کو ملا کر ہم نے اِن دونوں رشتوں کے لئے ایک ایسی ذلیل ترین گالی کو منتخب کر لیا ہے جو بالکل غیر فطری اور ازحد انسانیت سوز ہے۔ اِن دونوں کے لئے بدترین گالی ہماری نوکِ زبان پر رہتی ہے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی اور کلاس اول آفیسر تک کو اس قباحت میں مبتلا دیکھا گیا ہے۔ تانگہ ہانکنے والے سے لے کر اعلیٰ تعلیم یافتہ اِس گالی کو نہایت بے باکی سے استعمال کرتا ہے اور کوئی شرم محسوس نہیں کرتا۔ حالانکہ اِس سے وہ کوئی غصے کا کسی سے اظہار نہیں کرتا محض عا ایسا کہتا ہے۔ یہ گویا اُن کا تکیہ کلام ہے۔ اِس پر طرّہ یہ کہ وہ اِس پر فخر محسوس کرتا ہے۔ گویا گندی گالی دینا محبت کا اظہار ہے۔ تعلیم ا کی ہر شئے کو جِلا دیتی ہے جس میں زبان بھی شامل ہے۔ لیکن اِن تانگے والے اور قلی اور تعلیم یافتہ میں کوئی فرق نہیں۔ مگر اِس کی ز میں کوئی خوبصورتی نہ پیدا ہوئی۔ اِس بات پر ایک بہت تعلیم یافتہ اور ۲۰ کتابوں کے مصنف دوست کہنے لگے کہ آپ کو معلوم ہے کہ عا اقبال ایسی فحش زبان کا استعمال نہایت بے باکی سے کرتے ت میں نے عرض کیا کہ اگر یہ بات ہے تو میں اُن کی ایسی زبان کے سبب نہایت بے باکی سے اُسی زمرے میں شامل کرتا ہوں۔ اگر کوئی بیت ا میں استعمال ہونے والے برتن میں پانی پی سکتا ہے تو اُسے ا کہیں گے۔ کافی گستاخی کر چکا۔ لیکن سچ تو سچ ہے۔ وقت آ گیا ہے ہم اِن خوش فہمیوں کے حصار سے باہر نکلیں کہ ہم مہذب لوگ ہیں جب تک ہم اِس آخری لعنت سے نجات نہ پا لیں خود کو مہذب ک محض خوش فہمی ہے۔

گناہ عالمگیر ہو رہا ہے۔ ہر قسم کے بُرے کام دوسرے مما بھی ہوتے ہیں۔ یہ بدکاریاں فردِ واحد یا چند افراد پر اثر انداز ہوتی ہ لیکن یہ پانچ بدنما داغ بلکہ چھ ہماری مادرِ وطن ہندوستان کے پر نمایاں نظر آتے ہیں۔ اور ان کا اثر تمام ملک پر ہوتا ہے۔ ک ہیں آج وہ انسانیت کے علمبردار اور محبت کے پرستار؟ کیا امن ک سے بسے ہوئے بے ضرر عوام کے مذہبی تعصب کو جگا کر آپس میں لڑ کے سوا اُن کے پروگرام میں اور کوئی حساب بھی ہے؟ مذہب جیسی دلفریب شئے کے غلط استعمال کے سوا انہوں نے محبت کے بیج کا کام بھی کیا؟ اگر خدا محبت ہے تو مذہب اِس محبت کا مظہر آج ضرورت ہے مادرِ وطن کو اِن جگت گُروؤں، ملاؤں، پاد اور گرنتھیوں کی کہ وہ اپنے بھَوَن۔ مسجدوں، گرجوں اور ا تختوں سے باہر نکلیں۔ اور ایک زبان ہو کر اپنی مادرِ وطن کے سے اِن بدنما داغوں کو دھو ڈالیں۔ آن کی آوازیں مذہب ستا میں نہیں گلی کوچوں اور بازاروں میں گونجیں۔ اُن کی آج تک کارگزاریوں کا محض ایک ہی نتیجہ نکلا ہے کہ ہماری موجودہ نسل ا جیسی اعلیٰ شئے سے متنفر ہو گئی۔ آؤ اپنی عاقبت سنوار لو۔ زرا ...

…ی جاتے محبت کے فوائد گناؤ۔ کیونکہ مذہب ای ایک قسم کا حامل … عوام محض اسی زبان کو سمجھتے ہیں۔ یہ فرشتوں کی زبان اور انسان … فرشتوں سے بلند ہے کیونکہ وہ شبیہہ اللہ ہے۔

کہاں ہیں میرے ملک کے بے باک صحافی اور حساس …؟ گل و بلبل کے نالے اور زلف یار کے پیچ و خم سے باہر نکل آنے … ہی وقت ہے۔ اپنی تانک بیانی کی سوچوں سے باہر آنے کا وقت ہے … نے سہاں نالوں سے باہر آؤ اور دیکھو کہ ان پانچ بلکہ چھ برائیوں … تمہارے ہرے بھرے گلشن کو پامال کر دیا ہے۔ تمہارے نغمے … کی کوچوں اور رہ گزروں پر گونجیں۔ کہاں ہیں وہ مجاہد اور رفاہ … عام کے کارگزار اور مصلح؟ اپنی کمیٹی کی میٹنگوں سے باہر آؤ۔ یہ وقت … درکار ہے۔ کہاں ہیں میرے ملک کے وہ نوجوان جن کے مضبوط … بازو اور سینے طوفانوں کو جھٹک کہتے ہیں۔ آؤ شیر قالین نہیں بلکہ شیر نیستاں بنو اور ان تند و تیز جھڑوں سے مادر وطن کو آزاد … کرو۔

سوچ کر ظلمتوں سے باہر
نسل انسانی پر التفات بھی کر
تیرے ماضی کے سُن لئے قصے
عہد حاضر کی کوئی بات بھی کر

… مشہور ہے کہ بہترین اور سچا دوست وہ ہے جو آپ کی کمزوریاں اور … برائیاں آپ پر ظاہر کرے نا کہ وہ ناعاقبت اندیش دوست جو آپ کی بے جا تعریف کر کے غلط فہمیوں اور خوش فہمیوں میں مبتلا کر دے۔ ایسا دوست خطرناک ہے۔ اگر ایک جراح یا سرجن پھوڑے کو چیر دینے کے بجائے بلکہ پلاسٹر لگا دے تو وہ بے وقوف سرجن ہے۔ اصلی سرجن ضرور چیرا لگائے گا تا کہ گندہ مواد باہر نکل جائے نا کہ اندر ہی اندر سارے جسم میں زہر پھیلا دے۔ ظاہر ہے کہ جراحی سے مریض کو تکلیف ہوتی ہے۔ خواہ وہ سرجن کو گالیاں دے لیکن سرجن اس کی بہبودی کی خاطر اپنے فرض نشتر زنی سے کوتاہی نہ کرے گا۔ بس … خوش فہمیوں کے حصار سے باہر نکلیں اور اس آئینے میں اپنی صورت دیکھیں۔

جوابی خط لکھا کیجئے تا کہ آپ کو جواب فوراً مل سکے جواب …

غزل

ڈاکٹر تفتہ
کوروکشیتر یونیورسٹی

سوز آشنا و مائل آہ و فغاں رہے
ہم بھی رباب عشق پہ نغمہ فشاں رہے
ہم بھی تپے ہیں ہجر کی آتش میں روز و شب
ہم پر بھی اہل ہجر بہت مہرباں رہے
اے دوست جب ہمارے دل و روح ایک ہیں
جسموں کا پھر یہ فاصلہ کیوں درمیاں رہے؟
راہ وفا میں گرم سفر ہو تو اس طرح
دل میں تیرے نہ خدشۂ سود و زیاں رہے
ہاں اور ظلم اور ستم اور آ ٹنیٹن
باقی کوئی بھی جور نہ اے آسماں رہے
بجھنے نہ پائے زندگی ہند یا کے دیپ کی
یہ لو خدا کرے کہ ہمیشہ جواں رہے
تجھ کو تو قید کر دیا خاکی مکان میں
اور آپ خوب ہے کہ تو لامکاں رہے!
جتنے بھی دل میں ولولے تھے روبرو حسن
آنسو کبھی ہوئے تو کبھی بن کر دھواں رہے
اڑنے لگے تو اڑ گئے مثل نسیم ہم
ٹھہرے تو بن کے ہو بہو کوہ گراں رہے
اپنا سراغ ہم کو بھی تفتہ نہ مل سکا
اپنی نظر سے ہر طرح ہم بھی نہاں رہے

ناقابل فراموش

سردار دیوان سنگھ مفتون ایڈیٹر ریاست کی واقعی ناقابل فراموش داستان جس کے متعلق متفقہ فیصلہ ہے کہ جس اردو داں نے یہ کتاب نہ پڑھی اس نے اردو ہی نہیں پڑھی قیمت مجلد رنگین سائز ساٹھ روپے علاوہ محصول ڈاک۔
دفتر شان ہند۔ انصاری مارکیٹ فلیٹ ۶ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

القرآن المنظوم

(مترجمہ :— کبیر کوثر)

- ◎ قرآن پاک کا اُردو، ہندی، انگریزی میں منظوم ترجمہ
- ◎ قرآن مجید کے ترجموں کی تاریخ ساز، اولین پیش کش
- ◎ قرآن شریف کے متن کے ساتھ ساتھ اُردو، ہندی میں لفظاً بہ لفظاً کبیر کوثر کا منظوم ترجمہ
- ◎ قرآن کلیم کا متن اور عبداللہ یوسف علی کا انگریزی ترجمہ جسے حکومتِ سعودی عرب کی سندِ منظوری حاصل ہے
- ◎ ہندوستان کے عُلمائے کرام جناب ابوالحسن امتّ اللہ صاحب امیرِ شریعت بہار اڑیسہ، قاضی القضاۃ مولانا نظام الدین مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی مرحوم وغیرہ کی اسنادِ پسندیدگی سے مزین
- ◎ فوٹو آفسیٹ پر دو رنگی طباعت۔ رنگین سرورق

ھدیہ :- دس روپے فی پارہ علاوہ محصول ڈاک۔ بااعتبارِ حیثیت

کبیر کوثر کی دلکش، نظر افروز، سہل المفہوم منظوم ترجمہ مساعیٔ جمیلہ کا

نادر و نایاب نمونہ

پہلا پارہ یکم جون ۱۹۸۵ء سے دستیاب

تقسیم کار

ماہنامہ شانِ ہند۔ فلیٹ نمبر ۸ انصاری مارکیٹ۔ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

اور دھرتی کانپ اُٹھی

احمد حسین شمس ایڈوکیٹ
(کشن گنج)

(پانچویں قسط)

بڑے تزک و احتشام کے ساتھ دعوت کا انتظام ہوا۔ سنا ہوٹل کے پسند کی ساری چیزیں کشن لال نے اپنی خاص نگرانی میں بنوائیں کشن لال ہندو ضرور تھے مگر کھانے پینے کے معاملے میں مسلمانوں سے کم فضول خرچ نہ تھے۔ آخر اُن کے یہاں دعوت صرف مسلمان دوستوں کی تھی گوپال گنج کے بھی تین چار احباب اس بے تکلف دعوت میں شریک تھے۔ ان مسلمانوں کے ساتھ صرف ایک ہندو کو بھی خصوصی دعوت دی گئی تھی اور وہ تھا منوہر

بیٹھک میں بڑی چہل پہل تھی گوپال گنج کے کئی احباب آ چکے تھے۔ گاؤں کے بھی دو تین معزز حضرات تشریف فرما تھے۔ ایک طرف منوہر بیٹھا ہوا کشن لال کے بڑے لڑکے شنکر سے خوش گپیاں کر رہا تھا۔ نندن اپنے پتا شنکر کی گود میں بیٹھ کر محفل کی ساری چیزوں کے بارے میں سوال پر سوال کئے جا رہا تھا ـــــ اتنے پیٹرو میکس کیوں جل رہے ہیں۔ ان کی روشنی سفید کیوں ہے۔ انڈے کی طرح گول گول کیا چیز پیٹرو میکس کے اندر ہے۔ اتنے لوگ آج کیوں آ رہے ہیں۔ آپ داڑھی کیوں نہیں رکھتے۔ میری ماں نے بنارسی ساڑی کیوں پہنی ہے میرا اَبوا بھی ساڑی کیوں نہیں پہنتی۔

باپو جی میرا اَبوا تمہاری کون لگتی ہے ؟

"میری بہن"

"اور منو کا کا کی"

"انہیں سے پوچھو"

"نہیں تم بولو"

"بس اب چپ بھی رہو" کمبخت مرے بڑبڑ بک رہا ہے

"منوہر نے کہا۔ نندن صبح کو آیا تو میں نے سمجھا بڑا شرمیلا ہے"

"شنکر نے کہا" مت پوچھو دماغ کھا جاتا ہے یہ"

"نندن نے پوچھا۔ آج دادا مجھے گود کیوں نہیں لیتے"

"اب تو تم بڑے ہو گئے"

نندن گود سے فوراً اُترا اور اپنے پتا جی کے بغل میں کھڑا ہو کر کہا۔ تم سے بھی بڑا ہوں کیوں بابا ؟"

تب اور کیا اب تو تم کام کرنے کے لائق ہو گئے نندن ..... ایک بات سنو تو بیٹا اندر جا کر چپ چاپ دو پان اپنی ماں سے بنوا لاؤ جاؤ جاؤ میرے ننھے" شنکر نے چمکارتے ہوئے کہا۔

"میری ماں لو تم کیا کہہ کر چمکارتے ہو بابا" اور پھر آپ ہی نقل اُتارتے ہوئے بول اٹھا۔ اے ادھر آ جی یہ سنو او نندن کی تم کہاں مر گئیں ......" اور منوہر کھل کھلا کر ہنس دیا شنکر جوا میں کہتا ہوں نندن" شنکر نے جھنجھلا کر کہا۔ اب خاموش بھی رہ۔ ذرا جلدی جا اور وہ گلوریاں بنوا لا۔ دیکھ تیرے منو کا کب سے یہاں بیٹھے ہیں اور تو سنتا ہی نہیں۔

"ماں سے پان نہ بنواؤں گا"

"کیوں ؟"

"ایک دفعہ اس نے منو کاکا کے پان میں مرچ ڈال دی تھی کاکا رونے لگے تھے"

"منوہر نے کہا ہاں نندن اپنی ماں سے مت بنوانا"

"میرا ابا سے کہوں گا وہ بڑی اچھی ہیں"

"منوہر نے پوچھا، نندن تمہیں تمہاری ماں زیادہ پیار کرتی ہے یا میرا ابا"

"میرا ابوا مجھے مارتی نہیں"

"شنکر نے کہا۔ اب جاؤ بھی"

"نندن کے جانے پر منوہر نے پوچھا" میرا کی بات کہیں پکی ہوئی؟ تاجی بر تلاش کر رہے ہیں مگر طبیعت کے موافق کوئی لڑکا ملتا ہی نہیں"

"آج وہ میرے ایک ساتھی کے بارے میں پوچھ رہے تھے"

"وہی منظور پور والا"

"ہاں"

"تمہارے خیال میں وہ لڑکا کیسا رہے گا۔"

"ہے تو بہت شریف مگر یہ معلوم نہیں کہ اس کی مالی حالت کیسی ہے"

"پتاجی کی خواہش ہے کہ وہ خود تمہارے ساتھ پٹنہ جاکے اُسے دیکھ آئیں۔"

"مگر قباحت یہ ہے کہ تمہارے پتاجی کو دولت مند لڑکا چاہیئے"

"اور شریف بھی"

"فرض کرو ان دونوں میں سے وہ ایک سے محروم ہوا اس وقت تمہارے پتاجی شرافت اور دولت میں سے کسے پسند کریں گے۔"

"بھئی میری مانو تو اگر پوچھو تو اس معاملے میں پتاجی سے اختلاف رکھتا ہوں اگر کوئی لڑکا شریف اور تعلیم یافتہ ہو تو دولت وہ خود پیدا کرے گا ورنہ ناکارہ لڑکے باپ دادا کی گاڑھی کمائی چشم زدن میں پھونک دیتے ہیں۔"

"میں بھی تو یہی کہتا ہوں مگر تمہارے پتاجی ہیں کہ کسی طرح قائل نہیں ہوتے۔"

"میں انہیں سمجھاؤں گا۔"

"اور میرے بٹیا کو بھی سمجھاؤ۔"

"کیا کہتے ہو" شنکر نے قدرے تعجب سے پوچھا۔

"نہ جانے نہیں تم لوگوں سے چڑ کیوں ہے حالانکہ تمہاری منگیتر کو بھی پتاجی نے تلاش کی تھی۔"

"تمہارے بٹیا کو آخر ہم لوگوں سے چڑ کیوں ہے۔"

"بھگوان جانے یہ تو تم انہیں سے دریافت کرو۔"

"تم کچھ کہنا چاہتے ہو منوہر بابو" اور اس نے مشکوک نظروں سے منوہر کو دیکھا۔

"کہنا تو بہت کچھ تھا مگر ڈرتا ہوں شاید تم میری بات کا بُرا مان جاؤ۔"

"بے دھڑک کہو۔"

"اپنے طلاقے ہی میں کوشش کیوں نہیں کی جاتی۔"

"اس کے ایک جملے نے شنکر کے سامنے ایک داستان کھول کر رکھ دی۔ شنکر کے ذہن میں ہزاروں خیالات یکے بعد دیگرے پیدا ہونے لگے ہر خیال نے ایک دائرہ بنایا جس کا مرکز خود منوہر تھا مگر ۔ ۔ ۔ ۔

"مگر پتاجی ــــــ"

"انہیں تو خود راضی کر سکتے ہو۔"

"وہ ایک ناستک کو شاید اپنی لڑکی دینا پسند نہ کریں۔"

"یہ کیا ضروری ہے کہ میرا کی شادی جس کے ساتھ ہو وہ زندگی بھر ناستک ہی رہ جائے"

"مگر جان بوجھ کر مکھی کھائی نہیں جاتی"

"تو تمہارے خیال کے مطابق ناستک انسان نہیں"

"جو دھرم سے بغاوت کرے وہ سماج اور دیش کا کھلا دشمن ہے۔"

"تو کیا تم ناستکوں کو اس لئے ملک اور سماج کا دشمن سمجھتے ہو کہ وہ ہندو مسلمان، شودر اور برہمن، حبشی اور انگریز سب کو انسان سمجھتے ہیں۔ کیا وہ اس لئے بُرے ہیں کہ وہ ان مذہبی لڑائیوں کو وحشت اور بربریت سے تعبیر کرتے ہیں یا وہ اس لئے نالائق ملامت ہیں کہ وہ ہر انسان کو انسان بننے کی تلقین کرتے ہیں۔ مذہب ایک افیون ہے شنکر، جسے مولوی اور پنڈت لوگوں کو کھلا کھلا کر مدہوش اور متوالا کر دیتے ہیں اور پھر ان سے وہ وہ کام لیتے ہیں کہ راون اور کنس کا دل بھی لرز اُٹھے" منوہر کے لہجے میں نفرت اور غصے کے ملے جلے آثار تھے۔

"نہیں اس لئے نہیں بلکہ اس لئے کہ بھگوان کے وجود کے تم لوگ قائل نہیں۔"

"یہی تو ایک لفظ ہے جس کی ایجاد بڑی مشکل سے ہوئی اسی ایک لفظ کے لئے بے شمار کتابیں لکھی گئیں۔ ہزاروں من گھڑت کہانیاں تصنیف کی گئیں اور حقیقت پر غور کرو تو بھگوان کا وجود سرے سے ہے ہی نہیں۔"

"تو کیا آسمان زمین آپ ہی آپ پیدا ہو گئے"

"اور بھگوان کیسے پیدا ہو گیا۔"

"تم بھگوان کا از خود پیدا ہو جانا تسلیم نہیں کرتے اور ان ساری مادی چیزوں کے وجود کو آپ ہی آپ مان لیتے ہو کیسی اُلٹی بات ہے"

"اور ٹھیک اس کے برعکس تم اس کائنات کا آپ ہی آپ وجود میں آنا تمہیں منظور نہیں مگر بھگوان آپ ہی آپ پیدا ہو گیا یہ تمہیں منظور ہے۔"

"میں پوچھتا ہوں کیا دنیا کے سارے سائنٹیسٹ مل کر ایک معمولی گھاس کی پتی بنا سکتے ہیں۔"

"اور کیا بھگوان اپنے سارے دیوی دیوتاؤں کی مدد لے کر ایک معمولی ٹوتھ برش بنا سکتا ہے۔"

"اس کی قدرت سے باہر نہیں۔"

"مگر تجربہ اس کے خلاف ہے"
"ہم ناستکوں سے کون منہ لگے"
"منہ لگنے کی بات نہیں سوال یہ ہے کہ ہم لوگوں کو کیسی زندگی گزارنی
چاہیئے۔ نفرت کی یا پریم کی ؛ ہر مذہب سے شانتی اور پریم کی تلقین
کی مگر مذہب کے ماننے والے ہمیشہ ایک دوسرے کے جان کے پیاسے
بنے رہے۔ ہندو مسلمان کو ملیش کہتا ہے۔ مسلمان ہندو کو کافر دونوں
نے ایک دوسرے پر جنت حرام کر دی ہے۔ محبت کا تعلق دل سے ہے
صرف زبانی دعویٰ فضول سی چیز ہے مذہب کو مان کر بھلا دل نفرت
سے پاک نہیں ہو سکتا ، محبت دل میں اس وقت پیدا نہیں ہو سکتی
جب تک مذہب کے تخیل سے دل پاک نہ ہو۔ اور یہی ناستک کہتے
ہیں۔ ساری دنیا کے انسان ایک ہی ہیں انسانیت کا پرچار کرنا
چاہیئے"

اتنے میں دروازے پر ایک فٹن آ گئی۔ اس سے میاں حسین بخش
اترے، کشن لال نے بڑھ کر اُن کا خیر مقدم کیا۔ ان کے آنے سے
مجلس میں ایک رونق آ گئی۔ گوپال گنج کے دوستوں سے ہنس ہنس کر
مصافحہ کیا سب کی خیریت پوچھی جس فہمی نے غالب کا شعر پڑھا ا ؎

ان کے آنے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

کب سے ہم لوگ آپ کے منتظر بیٹھے ہیں۔ معلوم ہوا ابھی تک
آپ آرائشِ حسن سے فارغ ہی نہیں ہوئے" کشن لال نے برجستہ
چٹکی لی ؎

ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا
آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا

فہمی نے کہا ان کا دامن دیکھو اگر آگے سے پھٹا ہو تب تو یہ
قصوروار اور اگر پیچھے سے ......" اس پر ایک فلک شگاف قہقہہ پڑا محفل
گونج اٹھی شنکر اور منوہر اپنی جگہ سے اٹھ کر اسی جگہ جا رہے تھے کہ
حسین بخش نے کہا۔ ارے صاحبزادو تم لوگ بچوں کی نقل میں کہاں
آ رہے ہو" کشن لال نے کہا تم لوگ دوسرے کمرے میں جا کر بیٹھو ضرورت
ہوئی تو میں بلا لوں گا"

یہ دونوں اُلٹے پاؤں واپس آ کر ایک کمرے میں جا کر بیٹھ گئے
اور پھر ادھر اُدھر کی باتوں میں مشغول ہو گئے۔

غزل ؎ نکہت شاہجہاپوری ایم۔ اے۔ بی ٹی

زندگی ہو گئی ہے بے نور انہیں کیا معلوم
دل غموں سے ہے بہت چور انہیں کیا معلوم

کچھ تو تقدیر نے بھی ہم کو سہارا نہ دیا
اور کچھ ہم بھی تھے مجبور انہیں کیا معلوم

وہ سماں جب لبِ ساحل ہی سفینہ ڈوبا
وہ تھے ساحل سے بہت دور انہیں کیا معلوم

آشیاں تھا رے شعلوں سے سنولا آئے قفس
اس جہاں کا یہ دستور انہیں کیا معلوم

اب وہ آئے جو مرے پاس تو کیا آئے ہیں
داستانِ دلِ رنجور انہیں کیا معلوم

کس قدر کی پہچان بتاتا ہے زمانہ نکہت
مٹ گئے ہم ہو گئے مشہور انہیں کیا معلوم

غزل ؎ (راٹھور بھنور سنگھ بھنور راجستھانی)

یہی ہے رات بھر کی مختصر روداد مے خانہ
نظر ساقی نے کی ہم کو زنشا گردش میں پیمانہ

کسی کی زیست کیسے بن گئی پُر درد افسانہ
اسے سمجھے گا دیوانہ نہیں سمجھے گا فرزانہ

مے الفت کو پی کر روح خوش ہے دل کی ہے مسرور
بڑھی ہے دستِ ساقی کے سبب توقیرِ میخانہ

یہ وہ شئے ہے کہ آسانی سے [illegible] ہو نہیں سکتی
یہ ملتی کب ہے بے مدوں کو طفیلِ نازِ رندانہ

بہار آئی ہے کہہ دے اُن سے کوئی اے بھنور اتنا
شکستہ دل لئے پھرتا ہے دَر دَر تیرا دیوانہ

[illegible]

محترمہ فاطمہ وصیہ جائسی

غزل

تسکین قلب کے لئے حسنِ یقین تو ہے
گو سنگِ در نہیں ہے ہماری جبیں تو ہے
یوں آسماں تلاش کریں اپنے واسطے
سجدہ کریں گے خاک پر ممکن زمیں تو ہے
اکثر اسی خیال سے راحت ملی مجھے
اپنا نہیں ہے پر وہ سلامت کہیں تو ہے
جانے یہ کیوں بھرم ہے اجڑنے کے بعد بھی
دیکھیں ذرا ہمارا نشیمن یہیں تو ہے
بے وجہ ہاں میں ہاں جو ملاتے تھے کل تلک
ان کی زباں پہ آج مکمل نہیں تو ہے
ہم بھی رہے ہیں اب بھی اسی اعتماد سے
آئے گی صبح نو یہ ہمارا یقیں تو ہے

ہے جس کی یاد اب بھی وصیہ کا آسرا
وہ دل کے پاس ہی پہلو نشیں تو ہے

توصیف علوی ناصی کیرالوی

نغمۂ اُردو

ہر عندلیب گل سے نغمہ ہائے اُردو
ہر صحنِ گلستاں میں گونجی نوائے اُردو
دامن میں اس کے گل ہیں ہر رنگ اور بو کے
ہے ریلا بابی کا مظہر فضائے اُردو
شاداب ہو گئے ہیں فکر و سخن کے گلشن
اک بار بھی جدھر سے گزری ہوائے اُردو
ہر اک زباں سے اس کی ہوتی ہے ترجمانی
ہر قوم کی صدا ہے گویا صدائے اُردو
ممنون بھی نا خدا کے معلوم ہیں نہ جن کو
بیٹھے ہیں آج بن کر وہ ناخدائے اُردو
شکوہ ہے دوسروں سے کیوں سرد مہریوں کا
خود تو دکھاؤ بن کر دل سے فدائے اُردو
ہر ایک کے لئے ہے دامن میں اس کے وسعت
سایہ فگن رہے گی ہر شو ردائے اُردو
پیغام عصرِ نو ہے للکار ہے دلوں کی
اک جرسِ کارواں ہے گویا صدائے اُردو
ہوتی گئی ہیں روشن فکر و نظر کی راہیں
پھیلی کچھ اس طرح سے ہر سو ضیائے اُردو
خونِ جگر دیا ہے جس نے کہ ہر قدم پر
بستے ہیں جس کو عاصی وہ ہے فدائے اُردو

"نذرانۂ عقیدت"

آر ڈی شرما تاثیر جالندھر شہر

تضمینات بر اشعار ابو الفصاحت حضرت جوش ملسیانی مرحوم

رنج و غم کا ہے ٹھکانہ کہیں کہیں
آسماں سے بڑھ کے دشمن ہے زمیں
(۱) موت سے ڈرتا ہے کیوں اے بےیقیں
موت بھی انساں کی دشمن نہیں
زندگی بھی جان لے کر جائے گی

جو بات میں تیرے یہ روانی نہ رہے گی
تو کیا ان کی نشانی نہ رہے گی
(۲) جو آج ہے کل وہ کہانی نہ رہے گی
اے مست رعونت یہ جوانی نہ رہے گی
اے حسن پہ نازاں یہ کہاں ڈھل جائے گا

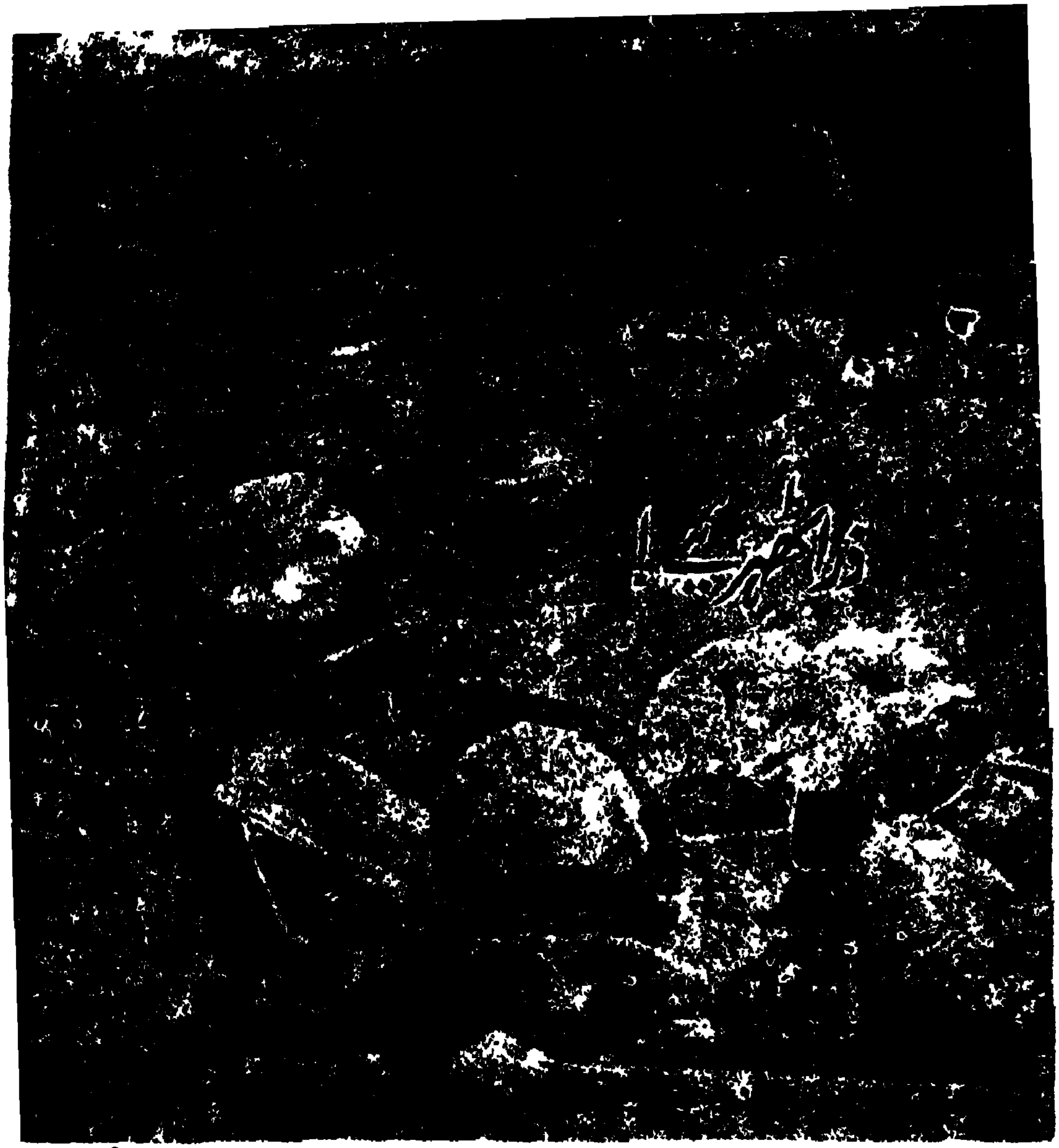

کیا آپ گلے کی تکلیفوں میں اکثر مبتلا رہتے ہیں اور اس کی وجہ سے سخت پریشان ہیں، لیکن یہ نہ سمجھئے کہ ایسی پریشان کن بیماری سے گلا کاٹ دینے سے ہی چھٹکارا مل سکتا ہے۔ ذرا ٹھہریئے! خالص دیسی ادویات سے تیار کیا ہوا "ٹونسلیکس" ایک بار، صرف ایک بار استعمال کر کے تو دیکھئے، پھر آپ کو گلے کے غدود بڑھ جانے، گلے کی سرسراہٹ، خراش، گلے کے ورم، زخم اور دوسرے تمام امراض کی شکایت نہیں رہے گی۔ اگر آپ کے علم میں کوئی ایسا مریض ہو، جس کے گلے کے غدود (ٹانسلائٹس) کا آپریشن ہونا ہے تو اُسے اس دوا کے بارے میں ضرور بتایئے گا کیوں کہ پھر اُسے آپریشن کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ چھوٹے بچے جو کھٹی میٹھی چیزیں کھا کر گلا خراب کر لیتے ہیں، اُن کے لئے بھی یہ بہت کام کی دوا ہے۔ ہر گھر میں اس کا رہنا بہت ہی ضروری ہے۔

—— شرع (یونانی اینڈ آیورویدک) لیبارٹریز، لال کنواں، دہلی ۱۱۰۰۰۶

Phone: 275602 Regd·No D- (DN) 353
THE SHAN-E-HIND MONTHLY NEW DELHI-110002 JUNE 1985
Regd with the Registrar of Newspaper at R. No. 644 57

خرید کر پڑھئے :
مانگ کر پڑھئے :
یا پھر
چوری کر کے پڑھئے

یہ ہے ہی اتنا خوب صورت،
اتنا دل کش،
اتنا مکمل کہ اسے کسی طرح بھی
حاصل کریں کیوں کہ
یہ فیض کی شخصیت اور فن پر ایک
شان دار ادبی دستاویز ہے ۔ اِس میں شامل ہیں :

قیمت : پندرہ روپے

- ★ خلوت اور جلوت کے بھید کھولنے والے ذاتی نقوش ۔
- ★ نادر و نایاب تصویریں ۔
- ★ سدا بہار، ہزار رنگ و منتخب کلام ۔
- ★ فیض کی شخصیت کے وہ ڈھکے چھپے گوشے جن پر سے پہلی بار پردہ اُٹھایا گیا ہے ۔
- ★ ہندوستان، پاکستان، رُوس اور انگلستان کے دانش وروں کی مشترکہ کاوشوں کا گلدستہ ۔

ساری اُردو دنیا میں شبستان کے "فیض نمبر" کا چرچا ہے

اس سے پہلے کہ اسٹاک ختم ہو جائے آج ہی اپنے قریبی نیوز ایجنٹ سے طلب کیجئے یا براہِ راست ہم سے منگوائیے ۔

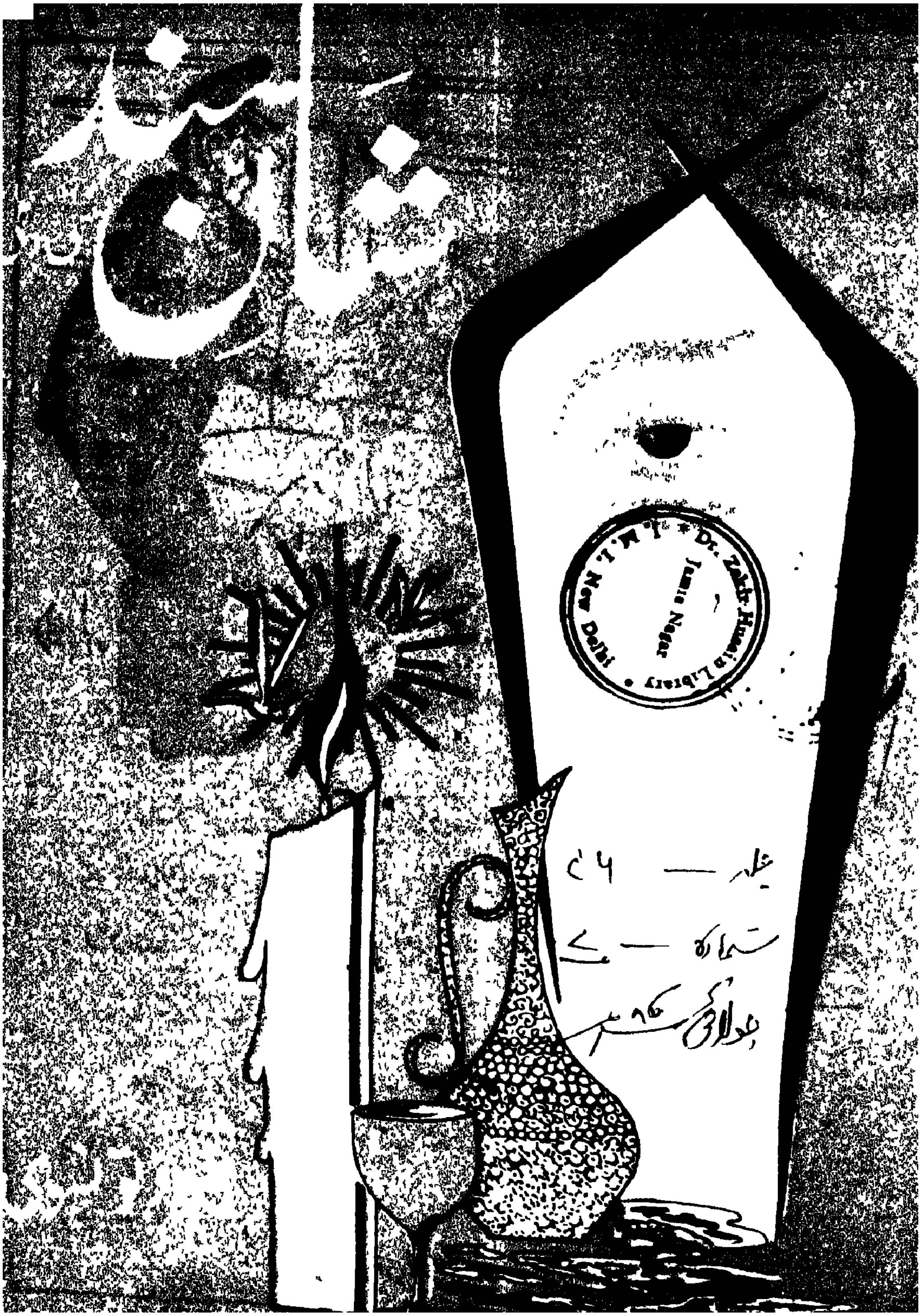
Dr. Zakir Husain Library
Jamia Nagar
New Delhi

بلا ٹکٹ

سفر کرنے والا
ایسا شخص ہے
جس کے کوئی
ضمیر نہ ہو!

بھارتی ریلوے آپ کی جائداد ہے بلا ٹکٹ سفر کرنے سے ریلوے کو جو نقصان ہوتا ہے، وہ کروڑوں روپے ہے جبکہ اس نقصان کی رقم سے ریلوے آپکو سفر کی بہترین سہولتیں مہیا کر سکتی ہے تاکہ آپ زیادہ آرام سے سفر کر سکیں، بہتر سروس مہیا کی جا سکے جو چیزیں خراب ہو گئی ہیں، ان کو بدلا جا سکے۔

اب یہ آپ کا کام ہے کہ آپ اس لعنت کو ختم کرنے میں ہماری مدد کریں۔
..... کیونکہ آخر کار اس سے آپ ہی کو فائدہ پہنچے گا۔

ناردرن ریلوے

ٹیلیفون نمبر ۲۷۵۰۰۲ | رجسٹرار آف نیوز پیپر فار انڈیا کا رجسٹریشن نمبر ۵۷/۳۴۴۶ | رجسٹرڈ نمبر ڈی DN ۳۵۳

ہندو پرست ہوں نہ مسلماں پرست ہوں
دامن پرست ہوں نہ گریباں پرست ہوں
ہر ذرۂ وطن سے ہے فیاض مجھ کو پیار
یعنی وطن پرست ہوں انساں پرست ہوں

فیاض گوالیاری

ماہنامہ

شانِ ہند نئی دہلی

ایڈیٹر
سرور تونسوی

فی پرچہ ۲/۵۰ روپے
زر سالانہ ۲۴/- روپے

جلد ۴۶ | جولائی ۱۹۸۵ء | شمارہ ۷

بلبل چہ گفت؟ گل چہ شنید؟ و صبا چہ کرد؟

مجاہدِ اردو ــــ رام لعل

کوئی تسلیم کرے یا نہ کرے مگر یہ حقیقت جھٹلائی نہیں جاسکتی کہ اردو پر جب بھی برا وقت پڑا ہے تو اس کے تحفظ اور بچاؤ کے لئے پنجابی ہندو ہی آگے آئے ہیں۔ بے شک اردو کو مسلمان اپنی زبان سمجھیں (حالانکہ یہ مسلمانوں کی زبان ہے ہی نہیں) اور اردو کے نام پر حکومت کے عطا کردہ لقمہ ہائے تر کو شیر مادر سمجھ کر ڈکار جائیں۔ مگر جب جب اردو پر برا وقت پڑا مسلمانوں نے اخبارات میں بیان چھپوانے یا تقاریر کرنے تک ہی اکتفا کیا مگر کوئی عملی قدم اٹھانے سے احتراز کیا کیونکہ ایسا کرنے سے انھیں مالی اور سیاسی طور پر نقصان کا خدشہ تھا۔ پچھلے دنوں جناب واسدیو سنگھ وزیر خوراک حکومت اترپردیش نے اردو اور اردو اکاڈمی کے بارے میں چند نازیبا کلمات کہے تو ان کے خلاف سب سے پہلے جناب رام لعل صاحب نے اترپردیش اردو اکاڈمی کی نائب صدارت کے عہدہ سے استعفیٰ دے کر عملی احتجاج کا اظہار فرمایا اور رام لعل صاحب کے تیاگ پتر نے اکاڈمی کے دیگر عہدہ داران انتظامیہ کے لئے یہ ضروری کر دیا کہ وہ بھی اپنے اپنے تیاگ پتر دے دیں۔ ورنہ ان کے لئے عوام کے سامنے آنا مشکل ہو جاتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان اجتماعی تیاگ پتروں کے تحت الشعور میں بعض ممبران کے ایک پتر میں کئی نشانے تھے۔ مثلاً عملی طور پر انتظامیہ کی مقررہ میعاد ختم ہو چکی ہے یا ایک آدھ ماہ میں ختم ہونے والی ہے اس لئے دیکھیں نہ مروت کرم داشتن کے مصداق جیتی کو کا

دیا پرکاش سرور تونسوی نے خواجہ پریس چتلی قبر جامع مسجد دہلی سے چھپوا کر دفتر شان ہند فلیٹ نمبر ۹ الفلاح مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی-۲ سے شائع کیا

میں ایک انگلی ہی ڈبو لی جائے۔ اور دوسرے یہ کہ یہ تیاگ پتر منظور تو ہونگے ہی نہیں کیوں نہ دوسری انگلی پر خون لگا کر شہیدوں میں نام لکھوا لیا جائے۔ اور تیسرے یہ کہ عنقریب نئی انتظامیہ کمیٹی کے انتخاب کے وقت تیاگ پتر دینے والوں کی قربانی کا خیال رکھتے ہوئے متعلقہ وزیر شاید پھر انھیں ممبر منتخب کر دیں۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ اتر پردیش کے وزیر اعلےٰ جناب تیواری صاحب نے کافی دنوں کے بعد اتر پردیش اردو اکاڈمی کے پریزیڈنٹ بیگم صاحبہ کو مدعو فرما کر تمام تیاگ پتر واپس کر دیئے اور وعدہ فرمایا کہ وہ کانگریس کے مینی فیسٹو کے مطابق یو پی میں اردو کے لئے سب کچھ کریں گے مگر وہ آرڈیننس کے بارے میں ہائی کورٹ میں داخل شدہ اپیل کے فیصلہ کا انتظار فرما رہے ہیں۔

ہمیں اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ جناب تیواری صاحب سے پوری پوری امید ہے کہ وہ اپنے وعدے کا پاس رکھیں گے مگر کیا کیا جائے۔ جب جناب وشوناتھ پرتاپ سنگھ صاحب ایسے مرد آہن اپنا وعدہ تو وعدہ مرد کی ایک بات پر قائم نہ رہ سکے۔ تو جناب تیواری صاحب کے فرمان پر عوام کو یقین کرتے ہوئے جھجک سی آ رہی ہے۔

بہر کیف اتر پردیش اردو اکاڈمی کی پریذیڈنٹ صاحبہ نے ایک سرکلر جاری فرمایا ہے جس میں تمام مستعفی ہونے والے حضرات کو ڈپلومیسی انداز میں اپنا اپنا استعفیٰ واپس لینے کی اپیل کی ہے۔ اور یو۔ پی کے وزیر اعلےٰ سے ہوئی بات چیت اور ان کے وعدے وعید کا بھی ذکر فرمایا ہے۔ معاف کیا جائے اگر ہم یہ کہنے کی گستاخی کریں کہ بیگم صاحبہ ہمیشہ حکومت پرست رہی ہیں اور ان میں یہ دل گردہ ہے ہی نہیں کہ حکومت کے خلاف کسی طرح بھی کوئی قدم اٹھائیں۔ ان کی بلا سے اردو یو پی کی دوسری زبان بنے یا سرے سے ہی اردو کو دیس نکالا دے دیا جائے۔ استعفیٰ کی رسم میں انھوں نے حصہ لینا تھا سو لے لیا مگر یہ ان کے بس کی بات نہیں کہ وہ وزیر اعلےٰ سے کہتیں کہ جب تک اردو اتر پردیش کی دوسری زبان قرار نہ دی جائے گی میں استعفیٰ واپس نہیں لوں گی۔

لہٰذا یہ قرعہ بھی بنام رام لعل ہی نکلا اور انھوں نے صاف الفاظ میں اعلان فرما دیا کہ جب تک اتر پردیش میں اردو زبان کو دوسری زبان تسلیم نہیں کیا جاتا وہ اپنا استعفیٰ واپس نہیں لیں گے۔ خدا کا احسان ہے کہ یہ سعادت بھی ایک پنجابی ہندو کو نصیب ہوئی ہے جس پر جناب رام لعل صاحب ہزاروں مبارکباد کے مستحق ہیں۔

اب اتر پردیش کے عوام کو بالخصوص جناب رام لعل صاحب کا ساتھ دینا چاہئے اور ہر وہ ادارہ جو سرکاری یا نیم سرکاری طور پر اردو کے مفاد کے لئے قائم کیا گیا ہے اس کے عہدہ داران کو اپنے اپنے تیاگ پتر اس شرط کے ساتھ بھجوا دینے چاہئیں کہ جب تک اردو کو اتر پردیش میں دوسری زبان قرار نہیں دیا جائے گا۔ تب تک ہم ان عہدوں پر کام نہیں کریں گے اگر استعفیٰ دینے والے حضرات کی جگہ حکومت دوسرے کارکنان کو مقرر کرتی ہے تو ان کا سماجی بائیکاٹ کیا جائے اور انھیں غداران اردو قرار دیا جائے۔

اخبارات میں بیانات شائع کرانے یا تقاریر کے ساتھ ساتھ ہم سب کو گھر گھر جا کر بچوں کے والدین سے کہنا چاہئے کہ وہ اپنے بچوں کو سکولوں میں اردو پڑھانے کے لئے سکولوں کے منتظمین سے تقاضا کریں۔ کیونکہ جب تک اردو پڑھنے والوں میں اضافہ نہیں کیا جائے گا تب تک ہمارے مطالبہ میں زور پیدا نہیں ہوتا۔ اتر پردیش کا کوئی اسکول ایسا نہیں ہونا چاہئے جس میں اردو پڑھنے والے بچے نہ ہوں حیرت تو اس بات پر ہے کہ اردو کے سب دانشور خصوصاً مسلمان اپنے بچوں کو اونچے درجے کے سکولوں میں تعلیم دلاتے ہیں اور ایسے سکولوں میں اردو پڑھائی ہی نہیں جاتی۔ انجمن ترقی اردو ہند۔ اردو اکاڈمیز کے عہدہ داران۔ ترقی اردو بورڈ اور دوسرے اردو کی ترقی و تحفظ کے دعوے دار اداروں کے کارکن سب نے اپنے بچوں کو ایسے سکولوں میں داخلہ دلاتے ہیں جہاں اردو پڑھائی ہی نہیں جاتی۔

ہم سب کو یہ عہد کر لینا چاہئے کہ ہر خط پر پتہ اردو میں لکھیں گے جب ہزاروں خطوط پر پتے اردو میں ہوں گے تو محکمہ ڈاک کو ایسا

انتظام کرنا ہوگا کہ وہ سارٹنگ سٹاف میں اُردو پڑھے ہوئے ملازمین کو رکھے - ہر سرکاری دفتر میں جو بھی درخواست پیش کی جائے وہ اُردو میں لکھی ہوتی چاہئے - ریلوے منسٹر سے مطالبہ کیا جائے کہ ہر اسٹیشن پر اُردو میں بھی اس کا نام ہو - بسوں پر بھی بس جہاں سے جہاں تک کے لئے ہو وہ اُردو میں بھی لکھا ہوا ہونا چاہئے - سڑکوں اور گلیوں کے ناموں کے بورڈوں پر اُردو میں بھی نام ہونا چاہئے - یہ بہت کچھ ہو سکتا ہے بشرطیکہ ہم اپنے آپ اس کا حلف لیں کہ اُردو کو زندہ رکھنے کے لئے ہم ایسا کریں گے - اُردو کے لئے آنسو بہانے سے یا قومی آواز میں جناب واسدیو سنگھ کے خلاف مراسلات شائع کرانے سے کچھ نہیں ہوگا -

ہم ایک بار پھر رام لعل صاحب کو مبارکباد پیش کرتے ہیں جنھوں نے اُردو کے بچاؤ کے لئے اُتر پردیش کے اُردو دانشوروں کے لئے ایک لمحۂ فکریہ اور ایک سوالیہ نشان ؟ ان کے سامنے پیش کیا ہے -

”قومی آواز“ سے مخلصانہ شکوہ

”قومی آواز“ ایک ایسا روزنامہ ہے جس کو اُردو صحافت کی آبرو کہا جا سکتا ہے - مگر ۲۲ جولائی ۱۹۸۵ء کی اشاعت میں ”ایوانِ غالب میں مرحوم یوسف دہلوی کو خراجِ عقیدت“ کے عنوان سے کسی گمنام لکھنے والے کا شائع شدہ مضمون پڑھ کر یہ سوچنے پر مجبور ہونا پڑا کہ ”قومی آواز“ اس آبرو کو گنوانے کی فکر میں ہے - اول تو یہ مضمون بغیر لکھنے والے کے نام سے شائع کرنا ہی ایک کھلی شرارت ہے جو قومی آواز ایسے باوقار اخبار کو زیب نہیں دیتا - دوسرے اگر کسی صاحب کو اُردو اکادمی اور ”شمع“ گروپ کے خلاف یہ سب کچھ لکھنا ہی تھا اور ”قومی آواز“ کو اسے شائع کئے بغیر صحافتی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہوئے بغیر نہ رہا جا سکتا تھا تو اسے مراسلات کے کالم میں لکھنے والے کے نام اور پتے کے ساتھ شائع کرنا چاہئے تھا تاکہ یہ سب کچھ لکھنے والے کی ذاتِ شریف کا حدودِ اربعہ ناپا جا سکتا کہ وہ خود کتنے پانی میں ہیں - تیسرے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ سب کچھ قومی آواز نے بطور خبر شائع کیا ہے اور خبریں تو نیوز ایڈیٹر ہی ترتیب دیتے ہیں اور وہ بغیر کسی لکھنے والے کے نام کے ہی چھپتی ہیں - اور اگر یہ مضمون بطور خبر ادارہ قومی آواز کی طرف سے لکھا گیا ہے تو ہمیں افسوس ہے کہ قومی آواز سے اس غیر صحافتی پن کی اُمید نہیں کی جا سکتی کہ وہ ۲۰ جولائی کی اشاعت میں مرحوم یوسف دہلوی کے بارے میں ایک بہترین مضمون شائع کرتا ہے اس سے ایک دن پہلے دلی کی ادبی ثقافتی ڈائری میں جناب رئیس مرزا نے مرحوم یوسف دہلوی کے بارے میں ۲۰ جولائی کے ماتمی جلسہ کی اطلاع اچھے انداز میں شائع کرائی - اور پھر وہی قومی آواز ۲۲ جولائی کی اشاعت میں اس رطب و یابس کو نمایاں طور پر شائع کرتا ہے جسے پڑھنے کے بعد ہر قاری یہ سوچنے پر مجبور رہا کہ قومی آواز اُردو کی روایتی صحافت پر آرہا ہے -

اُردو داں طبقہ کو اُردو اکادمی دلی کو سراہنا چاہئے تھا کہ اس نے ملک کے ایک ایسے صحافی کے انتقال پر ماتمی جلسہ (اور ایسا فقید المثال ماتمی جلسہ کیا کہ جس کی نظیر ایوانِ غالب کی تاریخ میں نہیں ملتی) کیا جس نے اُردو کو مقبول بنانے میں وہ کارنامہ انجام دیا ہے کہ اگر ملک کے وہ سب ادارے جو اُردو کے تحفظ اور ترقی کے لئے قائم ہیں مل کر بھی کوشش کریں تو ایسا کارنامہ انجام نہیں دے سکتے جس معمہ سازی کا قومی آواز میں خصوصی طور پر ذکر کیا گیا ہے انہی ادبی معموں کے باعث دُنیا (جو میں) اس زمرہ میں دیانتداری اور امانتداری کا وہ معیار قائم کیا گیا ہے کہ جس کی قسم کھائی جا سکتی ہے انہی ادبی معموں کے باعث لاکھوں ہندی جاننے والوں نے اُردو لکھنا پڑھنا سیکھا - تقسیم ملک کے بعد ہندوستان میں اُردو عملی طور پر ختم ہو گئی تھی - یہ شمع ادبی معموں کا ہی احسان ہے کہ ہندوستان میں لاکھوں ہندوؤں، عیسائیوں سکھوں اور مسلمانوں نے اُردو لکھنا پڑھنا سیکھا تاکہ شمع ادبی معموں میں حصہ لے سکیں قومی آواز بے شک اپنے آپ کو مسلمانوں کا اخبار سمجھتا ہے مگر

اسے ہزار ہا ہندو سکھ بھی پڑھتے ہیں۔ اگر شمع ادبی معمے نہ ہوتے تو آج ہندوستان میں اردو رسائل و اخبارات پڑھنے والے یقیناً کافی کم ہوتے۔ اگر "قومی آواز" کے نزدیک شمع ادبی معمے ایک برائی ہیں تو وہ شمع ادبی معموں کے اشتہارات کیوں شائع کرتا ہے اور اپنے پڑھنے والوں کے ساتھ ایسی برائی کو شائع کرکے غداری کا مرتکب بنتا ہے۔ "شمع" اردو کا ایک ایسا فلمی۔ علمی۔ ادبی ماہنامہ ہے جو روئے زمین پر جہاں بھی کوئی اردو لکھا پڑھا فرد موجود ہے وہاں دستیاب ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ برصغیر ہند و پاک میں کوئی ایسا فلمی اور ادبی ماہنامہ نہیں جو اس کی گرد کو بھی پہنچ سکے۔ کسی کو بھی یہ حق ہے کہ وہ شمع کو ہلکے پھلکے ادب کا کاروباری ماہنامہ کہہ سکے مگر ایسا کہنے والے کو ایسی رائے کا اظہار کرنے کا اہل ہونا ضروری ہے نہ کہ اپنے نام تک کو صیغۂ راز میں رکھ کر محض اپنی کم ظرفی اور احساس کمتری پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی جائے۔ دنیا کا نظام معاشرت صرف اور صرف کاروبار پر انحصار رکھتا ہے۔ قومی آواز بھی ایک کاروباری ادارہ ہے سرکاری اشتہارات اور جملہ صوبائی حکومتوں کے اشتہارات نیز ملک کے سرکردہ کاروباری اداروں کے اشتہارات کا حصول اس کے لئے بہت ہی آسان ہے کیونکہ یہ حکمران پارٹی کا اخبار ہے اور اگر ایک ایسا شخص جسے نہ تو حکومت کی سرپرستی حاصل ہوا اور نہ ہی اس نے کسی غیر کاروباری انداز کو اپنایا ہو اور محض اپنی خداداد قابلیت، ایمانداری، دیانت داری اور انتھک محنت سے اپنے کاروبار کو قابل رشک بلندیوں پر لے گیا ہو تو وہ یقیناً قابل تقلید ہستی ہے اور ایسی شخصیت کی تعریف نہ کرنا محنت، ایمانداری اور دیانت داری کی توہین کرنا ہے۔

حافظ صاحب نے اگر دواخانہ جاری کیا تو آج اسی "شمع لیبارٹریز" کو یہ فخر حاصل ہے کہ جس مریض کو یونانی اور آیورویدک اصلی اجزا سے بنی ہوئی ادویات درکار ہوتی ہیں وہ اس دواخانہ پر بلا خوف بھروسہ کر سکتا ہے۔

"آئینہ" اس لئے بند نہیں کیا گیا تھا کہ اس میں نفع کے امکانات بالکل نہیں تھے۔ بلکہ آپ کے چہیتے ڈاکٹر ط۔ انصاری صاحب کی لیڈرانہ ادائیوں کے باعث بند کرنا پڑا۔ اگر آئینہ جاری رہتا تو آج اس کے مقابلہ کا ہفت روزہ دنیائے اردو میں نہیں ہوتا مگر اسے آپ ایسے بدطینتوں کی نظر لگ گئی۔

"شمع" ہندی کا ایسا فلمی اور ادبی ماہنامہ ہے کہ جس کا کوئی بھی دوسرا ہندی فلمی ادبی ماہنامہ مقابلہ نہیں کر سکتا۔ "بانو" خواتین کا ایسا صاف ستھرا مہذب اور با اخلاق ماہنامہ ہے کہ برصغیر ہند و پاک میں ایسا نسوانی ماہنامہ نہیں ہے۔ "کھلونا" جسے بچوں کا رسالہ کہا جاتا ہے۔ وہ آپ کو بھی انسانیت سکھا سکتا ہے۔ اگر اس ماتمی جلسہ میں عوام کا ہجوم محض فلمی اداکار سنیل دت صاحب اور شتروگھن سنہا کے باعث تھا تو اس میں کیا برائی تھی۔ امریکن پریزیڈنٹ فلم سے آئے۔ ہمارے تامل ناڈو اور آندھرا کے وزرائے اعلیٰ فلم سے آئے۔ آج تین فلمی اداکار عوام کے منتخب نمائندے بن کر پارلیمنٹ میں آئے ہیں۔ فلم تو اب ہمارے بچوں کی نس نس میں سرایت کر چکی ہے۔ آپ اپنے گھر میں اپنی بہن، ماں، بیٹی (اگر خدا نے آپ کو ان نعمتوں سے نوازا ہے) سے پوچھئے تو آپ کو پتہ چل سکے گا کہ فلم اب ہماری سوسائٹی میں کہاں تک داخل ہو چکی ہے۔ فلمی شخصیتوں کو کسی ایسے صحافی کو خراج عقیدت پیش کرنے پر پابندی ہے جو آپ کے نزدیک قابل احترام ہو۔ مانا کہ عوام کا ہجوم ان فلمی شخصیتوں کے باعث تھا مگر کیا جناب ط۔ انصاری جناب گاڈگل، جناب غلام نبی آزاد، جناب خورشید عالم جناب جگ پرویش چندر اور جناب گورنر صاحب ہریانہ بھی ان فلمی اداکاروں کو دیکھنے آئے تھے۔ اگر دعوت نامے زیادہ تقسیم کئے گئے اور ایوان غالب میں چھ صد اشخاص سے زائد بیٹھنے کی جگہ نہیں ہے تو بھی معترض نگار کے پیٹ میں درد ہونے کی کوئی وجہ دکھائی نہیں دیتی عام طور پر جلسوں میں مدعوین چالیس فیصد سے بھی کم آتے ہیں اور ماتمی جلسوں میں تو یہ تعداد اور بھی کم ہوتی ہے اس لئے اگر زیادہ دعوت نامے جاری کئے گئے تو کون سی آفت برپا ہو گئی اور یہ تو حافظ یوسف دہلوی مرحوم پر خدا کی رحمت تھی کہ ان کے ماتمی جلسہ میں بھی عوام کا ویسا ہی ہجوم تھا جیسا کہ ان کے ہاں بیاہ شادیاں اور دوسری سماجی تقریبات میں ہوا کرتا تھا۔ باقی [illegible] پر

بہ کوئے یار بہ اندازِ محرمانہ گزر

سرور تونسوی

الحاج حافظ محمد یوسف دہلوی صاحب ۱۴ مارچ ۱۹۸۵ء کو اس دار فانی سے رحلت فرما گئے۔ حافظ صاحب سے متعلق کئی مضامین لکھے گئے ہیں اور ہر مضمون نگار نے حافظ صاحب کے کسی نہ کسی انداز حیات پر روشنی ڈالی ہے۔ راقم الحروف کا حافظ صاحب موصوف کے ساتھ نیاز مندانہ۔ عقیدت مندانہ اور دوستانہ تعلق مدتوں رہا جس کی وجہ سے حافظ صاحب کے متعدد اندازِ حیات کا میں نے بغور مطالعہ کیا۔ حافظ صاحب کی زندگی ایک کھلی کتاب تھی اور بلا شبہ ان کی ذات ایک ایسی انجمن تھی جو رنگا رنگ خوبیاں اپنے اندر سموئے ہوئی تھی اور یہ دعوٰے ہے کہ حافظ صاحب کے نقشِ قدم پر چلنے والا ہر شخص کامیابی کی منزل کو یقیناً پا سکتا ہے۔

"بہ کوئے یار بہ اندازِ محرمانہ گزر" میں حافظ محمد یوسف دہلوی مرحوم سے متعلق کچھ یادوں کو بالاقساط پیش کرنے کی سعادت حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں انشاء اللہ آپ ان یادوں کے ذریعہ حافظ صاحب کی قابلِ تقلید زندگی کے ایسے واقعات مطالعہ فرمائیں گے جن سے آپ بھی اپنی زندگی کی راہ ہموار کرنے میں آسانی محسوس کریں گے۔ (سرور تونسوی)

۱۹۴۷ء میں تقسیم ملک کے بعد ایک مہاجر کی حیثیت سے دلی آیا تو دیوان دریا ساگر چوپڑہ کے یہاں ایک ہفتہ مقیم رہنے کے بعد بازار سیتا رام کی ایک گلی میں ایک جلے ہوئے مکان کے قدرے محفوظ حصہ میں رہائش اختیار کی۔ ان دنوں دلی کے مسلمان شرنارتھیوں کو نہ تو اپنے مکانات کرایہ پر دیتے تھے اور نہ ہی پاکستان ہجرت کرنے والے مسلمانوں کے خالی مکانات میں شرنارتھیوں کو بسنے دیتے تھے بلکہ مسلمانوں نے ہجرت کرنے والوں کے مکانات پر کافی مدت تک قبضہ کر رکھا تھا تاکہ کوئی شرنارتھی ان میں مقیم نہ ہو جائے۔ سردار دیوان سنگھ مفتون ایڈیٹر ریاست کے ہاں میرا ہر روز جانا ہوتا اور انہیں اس سلسلے میں واقعی تشویش تھی کہ مجھے رہائش کے لئے ابھی تک کوئی مکان نہیں مل سکا لہٰذا سردار صاحب نے مفتی عبد القدیر صاحب سے تاکید فرمایا کہ سرور کو مکان دلانے میں وہ اپنا اثر و رسوخ استعمال کریں۔ مفتی عبد القدیر صاحب نے سردار صاحب کو بتایا کہ پھاٹک حبش خاں میں شمع کے مالک و ایڈیٹر حافظ محمد یوسف دہلوی نے متعدد شرنارتھیوں کو پھاٹک حبش خاں سے ہجرت کرنے والے مسلمانوں کے خالی مکانات کی نشاندہی کی اور شرنارتھی ان خالی مکانات میں بس گئے ہیں اور تو اور حافظ صاحب نے اپنے دفتر میں کچھ شرنارتھی خاندانوں کو بسا رکھا ہے اور دفتر کے نیچے والی دوکانیں بھی شرنارتھیوں کو دلوا دی ہیں لہٰذا اگر آپ حافظ صاحب سے رجوع کریں تو شاید سرور کے لئے وہ کسی مکان کا انتظام کر دیں۔ سردار دیوان سنگھ صاحب نے کچھ دیر تک سوچا اپنی بڑی بڑی سرخ آنکھوں کو سامنے کی دیوار پر جمایا اور سر کے ایک بال کو کافی دیر تک مسلتے رہے اور پھر اس زور سے کھینچا کہ بال ان کے ہاتھ میں تھا۔ یہ عکس اس بات کا مظہر تھا کہ سردار صاحب نے کوئی نتیجہ اخذ کر لیا ہے۔ فون کا چونگا اٹھایا اور میر مشتاق احمد جو ان دنوں سپیشل مجسٹریٹ تھے کا نمبر ملایا اور علیک سلیک کے بعد مندرجہ ذیل بیان کیا کہ میرے ایک دوست پاکستان سے شرنارتھی بن کر آئے ہیں ان کے لئے رہائش کا انتظام ضروری کرنا ہے سنا ہے کہ حافظ محمد یوسف صاحب شمع والے اس سلسلے میں مدد کر سکتے ہیں میری واقفیت حافظ صاحب سے نہیں ہے لہٰذا آپ ان سے کہہ دیں میں ہر طرح سے ذمہ دار رہوں گا۔ میر مشتاق احمد صاحب نے فون پر سردار صاحب سے کہا کہ سرور کو صبح میرے دفتر میں بھیجا

دیکھئے اگر میرے پاس وقت ہوا تو میں خود ساتھ چلوں گا ورنہ کسی کو ان کے ساتھ حافظ صاحب کے پاس بھجوا دوں۔ اور انہیں خط لکھ دوں گا۔

دوسرے دن میں صبح نو بجے ہی میر صاحب کے ہاں حاضر ہوا۔ اُن دنوں انتظامی معاملات میں میر مشتاق احمد کو پل بھر بھی فرصت نہ ملتی تھی۔ تین بجے تک ان کا انتظار کرتا رہا تشریف لائے اور فرمانے لگے دس منٹ بعد آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔ آنے جانے والوں کا تانتا لگا ہوا تھا۔ چنانچہ یہ دس منٹ شام کے پانچ بجے ہوئے۔ تب میر صاحب پھاٹک حبش خاں چل دئیے۔ مطبع ان دنوں بند تھا۔ جناب محترم کراچی ان دنوں جیسے ہی صدی کا دفتر شمع کے دفتر میں ہی جمائے ہوئے تھے۔ دفتر کے نیچے سے پتہ چل گیا کہ (یوسف جی اُر پھاٹک حبش خاں کا ہر جہود شہر تا کبھی اب تک حافظ صاحب کو یوسف جی ہی کہتا ہے) حافظ صاحب کا مکان دفتر سے بالکل قریب ہی تھا۔ میر صاحب ان دنوں ہر وقت ریوالور لگائے رہتے تھے۔ کارتوسوں کی پیٹی ان کے سینے پر خوب زیب دیتی تھی اور یہ ایک مانا ہوا تھا کہ میر صاحب سٹی مجسٹریٹ ہیں لہٰذا کافی اشخاص میر صاحب کے ارد گرد جمع ہو گئے جو آتا ان سے علیک سلیک کرکے مصافحہ کرتا ابھی ہم دفتر کے نیچے ہی کھڑے تھے کہ اتنے میں حافظ صاحب بھی تشریف لے آئے۔ میر صاحب سے علیک سلیک کرنے کے بعد ہم دونوں کو اوپر دفتر میں لے گئے۔ میر صاحب نے حرفِ مطلب حافظ صاحب سے بیان کیا اور حافظ صاحب نے بڑے افسوس کے ساتھ کہا کہ جناب مہاجرین کا سلسلہ اگست سے شروع ہے اور آپ اب نومبر میں تشریف لائے ہیں۔ مکان تو کیا غسل خانہ تک نہیں خالی ملنا محال ہے۔

حافظ صاحب کا نام اور مطبع رسالہ کو میں گزشتہ سات آٹھ سال سے جانتا تھا اور ملتان سے شانِ ہند بھی شمع کے تبادلہ کی غرض سے حافظ صاحب کو بھجوایا کرتا تھا۔ مگر بالمشافہ ملاقات حافظ صاحب سے میر صاحب کی وساطت سے ہوئی۔ حافظ صاحب نے فرمایا سرور صاحب آپ مجھ سے ملتے رہئے گا اگر کہیں بھی گنجائش نظر آئی تو میں ضرور کوشش کروں گا۔

سردار صاحب کی مہربانی اور ذاتی دلچسپی کے باعث جناب منشی عبدالقدیر صاحب نے چاندنی محل میں ایک بوسیدہ مکان پچاس روپیہ کرایہ میں دلوا دیا تو میں نے جلد سے جلد کنور جسونت سنگھ تحر جو ان دنوں دلی کے سٹی مجسٹریٹ تھے (خدا انہیں عمرِ خضر فرمائے) کی مہربانی سے ڈیکلریشن داخل کرکے چاندنی محل سے ہند کی ہفتہ وار اشاعت شروع کر دی۔ ہفت روزہ شان بالکل ریاست کے انداز پر جاری کیا گیا۔ مرحوم جناب جا... کا یہ احسان میں تا عمر نہیں بھول سکوں گا کہ انہوں نے میرے محکمہ ڈاک سے متعلقہ وزیر کو حکم دیا کہ سرور کا روپیہ ملتان ڈاکخ... ہیڈ آفس سے فوراً منتقل [illegible] دہلی کے ڈاکخانہ میں [illegible] لہٰذا روپیہ مل ہی چکا تھا چنانچہ شانِ ہند کو کروفر سے جاری... اچھے رائیٹر کو معاوضہ دیا جاتا تھا اگرچہ نسبت خاک را بعالم... ریاست تو ریاست ہی تھا اور شانِ ہند شانِ ہند۔ جب شانِ ہند کے چار شمارے چھپ چکے تو میں یہ چاروں شمارے حافظ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انہوں نے شماروں کو اُدھر سے دیکھا اور فرمایا کہ ایسے پرچے کے لئے پچاس ہزار سالانہ خسارہ کے لئے تیار رہئے اور اس کے بعد شاید یہ اخراجات نکال سکے۔ اور اگر دو سال اسی انداز میں پرچہ چلے تو تیسرے سال فائدہ رہے گا۔ پھر سوچ کر کہنے لگے کہ سردار نے آپ کو ہفت روزہ کی اشاعت سے منع نہیں کیا۔ بہتر تھا ماہنامہ شائع کرتے۔ عرض کیا کہ ملتان میں بھی شانِ ہند ہفتہ وار تھا اور وہاں اس سے اچھی خاصی آمدنی تھی۔ کیونکہ میونسپل کمیٹی، ڈسٹرکٹ آفس۔ سول سپلائز کے علاوہ عدالتی سمنوں کے اشتہار بھی مل جاتے تھے۔ اسی خیال سے اسے اب بھی ہفتہ وار جاری کیا گیا۔ حافظ صاحب فرمانے لگے کبھی سردار صاحب تو اس راستے کے راہرو ہیں کیا انہوں نے آپ کو نہیں بتایا کہ دہلی میں اشتہارات کا ملنا مشکل ہے یہاں تو مشتہرین اشاعت لکھتے ہیں اور پھر رسالے سائز کے لئے پانچ روپیہ فی ہزار اور اس سے دو گنے سائز کے اخبارات کے لئے دس روپیہ فی ہزار فی صفحہ دیتے ہیں۔ میرے خیال میں تو آپ اب بھی سردار صاحب سے مشورہ کرکے اسے ماہنامہ بنا دیجئے مگر مرحوم کی دھن شادمانی [illegible] ملز کا اشتہار چھ ماہ کے لئے دے دیا۔ اور اسی طرح کچھ جیسے [illegible] اشتہارات اِدھر اُدھر سے اکٹھے کر لئے جاتے۔ کچھ دنوں بعد

شمع" کے نشاۃِ ثانیہ کا دور شروع ہو گیا اور مہینہ میں ایک آدھ بار حافظ صاحب سے ملاقات ہو جاتی اور انھوں نے ہر بار یہی مشورہ دیا کہ شانِ ہند کو ماہنامہ بنا دیجئے۔ کچھ ماہ تک اشتہارات کا سلسلہ چلتا رہا اور کچھ ایجنٹ حضرات نے بھی بلوں کی ادائیگی کر دی (زیادہ تر نے ایک پائی تک ادا نہ کی) اور شانِ ہند آب و تاب کے ساتھ ہفت روزہ شائع ہوتا رہا۔ دن میں شو اور اخبار ہفتہ وار دن رات محنت کرنا پڑتی۔ رات کے بارہ بارہ بجے تک خطوط لکھنا جب کہ مکان میں بجلی نہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صحت جواب دے گئی اور بستر پر دراز ہونا پڑا۔ سردار دیوان سنگھ مفتون کے ہاں جب دو تین دن کی غیر حاضری ہوئی تو انھوں نے اپنا چپراسی بھجوایا تاکہ معلوم ہو سکے کہ میں دلی سے باہر ہوں یا کیا وجہ ہے کہ ان کے ہاں حسبِ معمول حاضر نہیں ہوا۔ چپراسی اوپر آیا اور مجھے نیم بے ہوشی کی حالت میں پاکر فوراً سردار صاحب کے ہاں واپس جاکر بتایا کہ سرور صاحب تو بہت بیمار پڑے ہیں۔ دیکھا تو سردار صاحب ہانپتے ہوئے میرے غریب خانہ پر تشریف لے آئے اور فوراً اپنے چپراسی کو بھیج کر ڈاکٹر کو بلوایا اور دوا دلوائی۔ مجھے نام تو یاد نہیں رہا مگر ایک ہندو صاحب کسی مذہبی رسالے کے ایڈیٹر تھے انھیں کسی معاملے میں ایک ایسے افسرِ اعلیٰ سے کام تھا جو میرا عزیز تھا لہٰذا ان ایڈیٹر صاحب نے کسی ذریعہ سے پتہ چلا لیا کہ افسر مذکور میرے رشتہ دار ہیں اور ان صاحب نے مجھ تک پہنچنے کا ذریعہ دریافت کیا کہ ایک تو حافظ محمد یوسف آف شمع کی بات سرور تونسوی کبھی نہیں ٹال سکتا اور دوسرے سردار دیوان سنگھ مفتون کی۔ یہ صاحب پہلے سردار دیوان سنگھ مفتون کے ہاں پہنچے تو انھوں نے دھتکار دیا کہ میں سرور سے ہرگز نہیں کہوں گا کہ وہ ایسی سفارش کرے۔ اب یہ صاحب حافظ صاحب کے ہاں گئے گرمی کا موسم اور دوپہر کو لنچ ٹائم میں حافظ صاحب ان کے ساتھ ہو لئے۔ نہ معلوم میرا غریب خانہ انھوں نے کیسے تلاش کیا ہوگا۔ گلی سے آواز آئی تو میری بیوی نے پہلی منزل سے نیچے جھانکا اور مجھے اطلاع دی کہ دو ایسے صاحب نیچے کھڑے ہیں جو ہمارے ہاں کبھی نہیں آئے۔ میں نے کہا ان کا نام تو پوچھئے۔ میری بیوی نے دریافت کیا کہ آپ کا نام کیا ہے "یوسف" یہ آواز میں نے کمرے میں پڑے پڑے خود بھی سُنی۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ "شمع" والے حافظ محمد یوسف اس تپتی دوپہر میں میرے غریب خانے پر تشریف لا سکتے ہیں۔ لہٰذا میں نے یہی سمجھا کوئی صاحب یا تو کتابیں خریدنے آئے ہوں گے یا شانِ ہند میں اپنا کلام شائع کرانے والے کوئی شاعر ہوں گے لہٰذا میں نے بیوی سے کہا کہ بُلا لیجئے۔ ایک منٹ بعد دیکھا تو شمع والے حافظ صاحب میرے سامنے کھڑے ہیں جو بڑی بے تکلفی سے میری چارپائی پر ہی بیٹھ گئے میری بیوی کرسی لائی جس پر انھوں نے دوسرے صاحب کو بٹھایا اور خود میرے پاس ہی بیٹھے رہے۔ فرمانے لگے کب سے بیمار ہو بتایا کہ دو ہفتے ہو گئے ہیں۔ کہنے لگے اطلاع تک نہیں دی۔ دفتر کا کمرہ نیچے تھا میں نے عرض کیا کہ یہاں آپ لوگوں کو تکلیف ہو رہی ہے نیچے دفتر میں چلتے ہیں فرمانے لگے ہرگز نہیں۔ پہلے یہ بتاؤ کہ میں تمہارے کس کام آسکتا ہوں میں نے مجسم نیازمندی سے شکریہ ادا کیا۔ فرمانے لگے ان صاحب سے ملو۔ اس کے بعد انھوں نے اپنے ساتھی کا تعارف کرایا اور یہ بھی بتایا کہ انھیں فلاں صاحب سے یہ کام ہے اور یہ کام آپ ہی کرا سکتے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ اگر یہ صاحب آپ کے خاص آدمی ہیں تو میں یہ خدمت ہر طرح سے انجام دوں گا فرمانے لگے نہیں۔ میں نے انھیں آج ہی دیکھا ہے انھوں نے کہا کہ سرور تونسوی آپ کی بات کو ٹال نہیں سکتے لہٰذا ان کے اس اعتقاد پر میں ان کے ساتھ ہو لیا چونکہ ان کا کام کوئی ناجائز نہیں ہے اس لئے اسے ضرور کرانا ہے اگر میری تھوڑی سی کوشش سے ان کا کام ہو جائے تو اچھا ہی ہے۔

میں نے بیوی سے لیٹر ہیڈ منگوا کر متعلقہ صاحب کو لکھ دیا کہ یہ صاحب حافظ محمد یوسف دہلوی ایڈیٹر شمع کی سفارش لائے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ معاملہ بالکل سچا ہے لہٰذا انھیں مایوس نہ کیا جائے۔ میں علیل ہوں اس لئے خود حاضر نہ ہو سکا۔ حافظ صاحب ان صاحب کو اپنے ہمراہ موٹر میں افسر مذکور کے دفتر لے گئے اور افسر مذکور نے حافظ صاحب سے کہا کہ سرور تو خیر میرا بھائی ہے مگر میں یہ کام اس لئے کر دوں گا کہ مجھے آپ سے مل کر دلی خوشی ہوئی۔ اتنے بڑے اور اچھے رسالہ کے مالک اور اس قدر سادگی لہٰذا آپ کا خود تشریف لانا اس امر کی ضمانت ہے

سے بھی غنڈہ گردی کی بنا پر برطرف کر دیا گیا۔ تب ہزار منت سماجت سے ریلوے میں ملازم ہو گیا اور وہاں پانچ برس تک پلیٹ فارم پر جھاڑو دیتا رہا مگر ایک دن دو ٹکٹ ادھر ادھر کرنے اور دو تین کلرکوں کے جرم کی پاداش میں دو برس تک جیل کی ہوا کھانے چلا گیا۔ وہاں بھی اس کی ڈیوٹی جھاڑو سے گرد و غبار سمیٹنا ہی ٹھہری۔ بچپن میں بھی اس کا پسندیدہ کھیل گھر میں جھاڑو سے دھول کی شکل میں ڈھیریاں بنانا تھا۔ اسی بنا پر اس کی ماں نے اس کی کئی مرتبہ مرمت بھی کی تھی مگر یہ لت اس سے نہ چھوٹی۔ شاید یہ شوق اس کی گھٹی میں پڑا تھا۔ جیل سے چھوٹنے کے بعد وہ کئی کوٹھیوں میں دو دو چار چار ماہ تک جھاڑو پونچھ کا حصہ کام کرتا رہا۔ اور وہیں کسی ایک کوٹھی میں اس کی اپنی گھر والی کی ماں سے پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ اور تب ایک رات وہ اسے ساتھ بھگا کر لے گیا اور پھر اس کے ساتھ دو بول پڑھوا لئے۔ وہ اپنے اس معرکے کا ذکر اپنے یار بیلیوں میں بیٹھ کر اکثر کیا کرتا تھا اور یہ قصہ دہراتے ہوئے اس کا چہرہ لالٹین کے شیشے کی طرح چمک اٹھتا تھا۔ شادی کے بعد کچھ مدت اس نے دل لگا کر کوٹھیوں میں کام کیا۔ لیکن بدقسمتی قسمت اس پر چوری کا الزام تھوپ دیا گیا اور اسے ایک بار پھر جیل کی یاترا کرنا پڑی۔ ایک برس کی قید کاٹنے کے بعد اس نے کوٹھیوں میں جھاڑو دینے کے کام سے توبہ استغفار کر لی اور اینٹوں کے بھٹے پر کام شروع کر دیا۔ روکھی سوکھی کھا کر گزارا کرتے ہوئے کئی سال گزر گئے اور پھر دمے کے مرض نے ایک دن بھٹے میں سے نکال کر اس کا گلا دبوچ لیا۔ اس کی آنکھیں ابل کر باہر آ گئیں۔

بڑی مشکل سے جان بچی مگر جو کر گئی دمے نے تو اس روز ماری پھر کبھی نہ چھوڑی۔ رات بیگم کی بیماری تھوڑی تھوڑی تو آ ہی بڑے برسوں سے تھی مگر کام کاج نے اسے بیلا رکھا تھا اب ایک دم میدان صاف پا کر وہ بھی اس پر چڑھ دوڑی۔

مگر آج نجانے کیوں اسے کچھ ایسا لگا کہ اس کے بیتے ہوئے دنوں کی دھول سی بن کر آنکھوں میں پھیلتے جا رہے ہیں اور وہ جھاڑو سے اس دھول کی ڈھیریاں سی بناتا جا رہا ہے۔ اور پھر ہر ڈھیری چار پائی میں سلگتی جاتی ہے جس پر اس کا بیٹا اور بچے علیحدہ علیحدہ تنکوں کی طرح بکھرے پڑے ہیں۔ وہ انہیں سمیٹنا چاہتا ہے لیکن بیچ میں ایک گندھا ہوا جوہڑ

آ جاتا ہے۔ اچانک اس کا پاؤں پھسلتا ہے اور وہ غڑاپ سے اس میں جا گرتا ہے۔ غوطے کھا رہا ہے۔ الٹے سیدھے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔ لیکن اسے کسی تنکے تک کا سہارا نہیں مل رہا ہے اور مل بھی کیسے سکتا ہے کیونکہ اس کا اپنا وجود بھی ایک ادھ مرا تنکا ہی تو ہے اور تنکا بھلا تنکے کو کیونکر سہارا دے سکتا ہے۔ تب اسے لگا کہ وہ جوہڑ سے نکل آیا ہے لیکن اب دھول سے اس کا دم رکنے لگا ہے جو حلق میں سے ہوتی ہوئی اس کے نرخرے میں جمع ہونے لگی ہے اور وہاں سے نکلنے کا نام نہیں لے رہی بلکہ وہاں اس کی تہ لمحہ بہ لمحہ موٹی ہوتی جا رہی ہے۔ اچانک اس نے دیکھا کہ دھول کے غبار نے اس کے منہ اور نتھنوں سے باہر آ کر ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لینا شروع کر دیا ہے اور سب کچھ اس کے میلے پیلے میں غیر محسوس طور پر لپٹتا چلا جا رہا ہے۔ یوں لگ رہا ہے کہ چہرے دھندلا گئے ہیں۔ رمضانی شاہ کے کھوکھے پر کھڑے لوگ تھوڑے سے فاصلے سے بھی اسے صاف دکھائی نہیں دے رہے۔ حتیٰ کہ بازاروں، گلیوں، چوباروں پر ہر جگہ باریک دھول تیزی سے پھیلنے لگی ہے۔ لوگ بار بار دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے خوب جھاگ بنا کر دھوتے ہیں۔ کپڑوں کو بار بار جھاڑتے ہیں تاکہ دھول سے خود کو نجات دلا سکیں مگر دھول پھر بھی ان کی آنکھوں، کانوں اور نتھنوں میں بے تحاشا گھستی چلی جا رہی ہے اور وہاں میل سا بن کر جمنے لگی ہے یہ دیکھ کر وہ نجانے کیوں مسکرا دیتا ہے۔ اب وہ ایک بڑی سی دکان کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا ہے جہاں پر رکھے ٹیلیویژن سیٹ پر دھول کے اس عذاب کے خلاف حفاظتی تدابیر اختیار کرنے کے طریقوں و قتوں سے متعلق بتائے گئے ہیں۔ اتنے میں ایک سائیکل سوار اخباروں کا بنڈل آگے ہینڈل پر رکھے اس کے پاس سے چلاتا ہوا گزر گیا ہے۔ آج کی تازہ خبر! کل کی تازہ خبر! دھول نے حملہ کر دیا! دھول نے حملہ کر دیا! اسمبلی کا ہنگامی اجلاس طلب کر لیا گیا ہے۔ اب حالت یہاں تک پہنچ گئی کہ عورتوں نے آنکھوں میں سرمہ اور چہروں پر سرخی پوڈر لگانا ہی چھوڑ دیا کیونکہ ان کے چہرے دھول کی موٹی تہہ سے اٹے رہتے تھے اور وہ اپنے اصلی روپ سے ہٹ کر اپنے دھندلے

گو دام کو پونچھتی رہتی تھیں۔ تب ایک جگہ اس نے ایک ہجوم دیکھا جس میں موجود کوئی شخص بھی کھل کر بات کرنے کے قابل ہی نہ رہا تھا اور اگر کوئی ہمت کرکے ذرا کی ذرا منہ کھولتا تو دھول کے نوکیلے ریزے اس کی زبان پر چھالے ڈال دیتے اور اسے ابکائیاں سی آنے لگتیں لوگ ایک دوسرے سے بات کرتے ڈرنے لگے تھے سب کچھ دھندلا دھندلا سا اسے شروع ہی سے نظر آنے لگ گیا تھا مگر اب تو یوں لگتا تھا جیسے دھول ان کی آنکھوں میں پوری طرح سے گھس گئی ہے وہ نہ بول سکتے ہیں، نہ دیکھ سکتے ہیں ہاں البتہ محسوس ضرور کر سکتے ہیں۔ رفتہ رفتہ حالت اس انتہا کو پہنچ گئی کہ اس نے دیکھا کہ ہر شخص نے اپنے منہ اور ناک پر رومال باندھ لیا ہے اور آنکھوں پر موٹے شیشے والی عینکیں چڑھا لی ہیں۔ لیکن کریچ کریچ کرتی دھول نجانے کس طرف سے راستہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان سب کی آنکھوں اور نتھنوں میں بیٹھ کے کر اسے زہر دھوئیں کی طرح گھستی چلی جا رہی ہے میں روڈ کے قریب واقع سبزہ زار کے فٹ پاتھ پر سے گزرتے ہوئے اس نے دیکھا کہ درختوں کی ساری سرسبزی اب تقریباً ختم ہو چکی ہے ان پر دھول کا ایسا غبار نما ڈل کی طرح بری طرح چھا گیا تھا یہاں تک کہ ہر سانس لینے والی اور بے جان چیز کا رنگ مٹیالا ہو آنے لگ گیا تھا۔ سب لوگوں کے چہروں پر اب بڑا دہ سا اڑنے لگا تھا اور پہچان والے نک نقشے غائب ہونے لگے تھے۔ حتیٰ کہ فٹ پاتھ کے کنارے کھڑی کاروں اور چھکڑوں میں تمیز کرنا بھی ناممکن ہو گیا۔ پانی کا استعمال بھی تو بے تحاشا بڑھ گیا تھا۔ اس لئے لاؤڈ اسپیکر پر بار بار اعلان ہو رہا تھا "خواتین حضرات! پانی کا استعمال کم کریں کیونکہ پانی کا ذخیرہ خطرناک حد تک کم ہو چکا ہے اور اگر پانی کا استعمال موجودہ رفتار سے جاری رہا تو آئندہ چند گھنٹوں کے اندر اندر پانی کی راشننگ کر دی جائے گی" پھر اس نے دیکھا کہ لوگ سراسیمگی کی حالت میں شہر کو خالی کر کے دریا کی طرف جا رہے ہیں بازار اور گلیاں دن دہاڑے سائیں سائیں کرنے لگے ہیں۔ وہ یہ سب کچھ دیکھ کر بے اختیار ہنس پڑا۔ لوگوں نے اس کے چمکیلے دانت دیکھ کر نفرت کے مارے منہ دوسری طرف کر لیے مگر وہ بچوں کی طرح ان کے پیچھے پیچھے چلتا دریا کے کنارے تک پہنچ گیا۔ جہاں ہر طرف خیمے لگے ہوئے تھے یوں لگتا تھا کہ رات ہی رات میں دریا نے کروٹ لے کے اپنے اندر کا سارا فساد شہر کی صورت میں

دھول کی تہوں کو گھول گھول کر دھونے لگے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے دریا کا پانی تیزی سے گدلا ہونے لگا۔ پانی میں کیچڑ کی آمیزش بڑھتی چلی گئی اور پھر ہر طرف ایک ہنگامہ سا مچ گیا۔ عورتیں رونے پیٹنے لگیں۔ بچے سہم کر ماؤں کے پلوؤں میں دبک گئے۔ کیونکہ دریا کا پانی خشک ہو چکا تھا اور وہاں پر دھول کی موٹی موٹی تہیں یوں ابھری ہوئی صاف نظر آ رہی تھیں جیسے کسی نے جھاڑو کی مدد سے بڑی بڑی ڈھیریاں بنا دی ہوں۔ فضا میں نمی کی مقدار تیزی سے گھٹ رہی تھی اور خبروں سے پتہ چلتا تھا کہ پہاڑوں پر برف باری کی جگہ دھول کے گالے گرنے لگے ہیں اور پہاڑ کیچڑ کے ڈھیر بنتے جا رہے ہیں۔ سورج بھی مٹی کی گول ٹکیا دکھائی دینے لگا تھا اور پھر مسجدوں میں اذانیں، مندروں میں گھنٹیاں، گوردواروں میں سنکھ اور گرجوں میں گھڑیاں مسلسل بجنا شروع ہو گئے۔ کھانے پینے کی ہر شے پر بھی دھول کا ورق تیزی سے لپٹنے لگا، لوگ مٹی مٹی ہونے لگے۔ یہاں تک کہ ہر چھوٹے بڑے امیر غریب کے چہرے مکمل طور پر ایک جیسے ہو گئے تھے ساری اونچ نیچ مٹ گئی تھی۔ وہ یہ سب کچھ دیکھ کر نڈھال ہو گیا۔ ایسے میں اچانک ایک طرف سے دھول کا سیاہ بادل پھیلتا کر اٹھا۔ لوگ ڈر کر سہم گئے اور خوف سے تھر تھر کانپنے لگے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے دھول کے سیاہ بادل میں روشنی کی دو لکیریں یکبارگی نمودار ہو گئیں اور اس کے پیچھے پھاڑ دینے والی گرج کا تڑاکا گونجنے لگا۔ اور پھر بجلی پل میں آسمان کا پیٹ پھٹا۔ لوگ ہاتھ اٹھائے آسمان کی طرف منہ کھول کر چلانے لگے مگر اس بار پانی کے قطروں کے بجائے دھول کی موسلا دھار بارش شروع ہو گئی اور ہوتی ہی چلی گئی۔

تب اس نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں جھاڑو ہے اور وہ زور زور سے گھر کے آنگن میں جھاڑو دئے جا رہا ہے۔ اس کی بیوی ڈھیلے کپڑے پہنے سیڑھی پر بیٹھی ہاتھوں میں شیشہ لٹکائے، آنکھوں میں سرمہ بھر بھر کر لگا رہی ہے اور پھر یکبارگی اس کی طرف قہر بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہتی ہے "جھاڑو آہستہ دے کیسی دھول اڑا رکھی ہے" وہ ٹھٹھک کر ہاتھ روک لیتا ہے اور پھر اس کی طرف حقارت سے دیکھتے ہوئے زمین پر تھوکتا ہے۔ دوسری بار پھر تھوکتا ہے اور پہلے سے بھی زیادہ زور شور سے دھول اڑانے لگتا ہے اور اپنے آپ پر

سارے زمانے پر

مرزا غالب — حیات اور شاعری

بعض لوگ اسم بامسمیٰ ہوتے ہیں۔ مگر دنیا میں ایسے لوگوں کو صرف انگلیوں ہی پر گنا جا سکتا ہے چنانچہ غالب کا شمار بھی ایسی شخصیات میں ہوتا ہے۔

غالب نے غالب ہو کر دکھایا اور لوگوں کو اس بات پر مجبور کر دیا کہ وہ اس عظیم شاعر کو ہمیشہ اچھے القابات سے یاد کریں یہی وجہ ہے کہ پروفیسر صدیقی کو کہنا پڑا کہ مسلمانوں نے برصغیر کو صرف دو چیزیں دیں ایک غالب اور دوسری تاج محل قسمت کا مذاق دیکھئے اردو زبان کا یہ عظیم غزل گو ایک ایسے دور میں اس دنیا میں آیا جب سلطنت ہند مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل رہی تھی۔ غم نہ صرف اس بات کا تھا کہ عہد مغلیہ اپنے زوال پر تھی بلکہ دکھ اس چیز کا بھی کہ اس وقت مسلمانوں کی ثقافت تعلیم، تہذیب و تمدن سسک رہی تھی کہیں کہیں شمع علم تو دم سحر کے ساتھ روشن تھی مگر پروانے علم اس کے نزدیک آنے کو تیار نہ تھے۔

ایسے دور میں کون خیال کر سکتا تھا کہ ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء کو آگرہ میں پیدا ہونے والا بچہ ایک دن اردو ادب میں ایک ایسا مقام حاصل کرے گا جس کی نظیر تاریخ پیش کرنے سے قاصر رہے گی تاریخی اوراق سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ترکی نسل سے تھے ان کے دادا اسلاف زادہ رستم خان مرزا کی پیدائش سے پچاس ساٹھ سال پہلے سمرقند سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے اور پھر ہمیشہ کے لئے یہیں کے ہو کر رہ گئے۔

ان کے والد ماجد جناب مرزا عبداللہ بیگ خاں پہلے لکھنؤ اور اس کے بعد کافی عرصہ تک حیدرآباد میں ملازم رہے مگر آپ کی تعلیم و تربیت آگرہ میں آپ کے نانا خواجہ حسین کی ان کی نگرانی میں ہوئی اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے والد اس دنیا سے اس وقت رحلت کر گئے تھے جب غالب پانچ سال کے تھے۔ والد کے انتقال کے بعد ان کے چچا مرزا نصر اللہ بیگ نے ان پر اپنا دست شفقت رکھا مگر شاید قدرت کو یہ بات پسند نہ آئی اور قسمت نے ان کا بھی زیادہ دیر ساتھ نہ دیا اور چار پانچ سال کے بعد نصر اللہ بیگ بھی انتقال کر گئے۔

ان کی وفات کے بعد غالب اپنے نانا کے زیر سایہ آ گئے جن کا خاندان آگرہ کے امیر گھرانوں میں شمار ہوتا تھا۔ چنانچہ مرزا کی پرورش بڑے ناز و نعم میں ہوئی۔ دنیا کی تمام آسائشیں آپ کو میسر تھیں اور ہر قسم کی مکمل آزادی تھی۔ لیکن اس عیش و عشرت کے ساتھ ساتھ غالب کے نانا نے ان کی تعلیم و تربیت کا بھی خیال رکھا۔ اور غالب کو اس دور کے عظیم اساتذہ سے اپنی علمی پیاس بجھانے کی سعادت نصیب ہوئی۔ ان کے اساتذہ میں نظیر اکبر آبادی بھی تھے۔ جو اردو ادب میں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ اکبر آبادی کے اشعار غزل گوئی ادب میں ایک خاص اور منفرد مقام رکھتے ہیں۔

غالب کو فارسی سے بھی قدرتی لگاؤ تھا۔ اس دور میں آگرہ میں فارسی کے مشہور و معروف عالم مولوی معظم تھے۔ مرزا میں فارسی زبان اور ادب کا شوق شاید آپ ہی کا مرہون منت تھا۔ فارسی زبان سے شغف کا اندازہ اس بات سے بآسانی لگایا جا سکتا ہے کہ غالب نے گیارہ برس کی عمر میں فارسی شعر کہنے شروع کر دیئے تھے۔ اور فارسی شعراء کا کلام پڑھنے اور سمجھنے لگے تھے۔ کسی طرح یہ صحیح طور پر نہیں بتایا جا سکتا کہ مرزا دہلی کب آئے۔ لیکن اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ پانچ چھ برس کی عمر سے ہی آپ کا دہلی آنا جانا تھا۔ آپ کے کچھ خطوط اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ پندرہ سولہ برس کی عمر میں آپ مستقل طور پر دہلی تشریف لائے۔ آگرہ سے دہلی کی طرف ہجرت غالب کی زندگی کا ایک اہم واقعہ ہے اگر آپ نقل مکانی نہ کرتے تو شاید آج ہم آپ کے نام سے واقف نہ ہوتے اور غالب میں وہ خصوصیات نہ ہوتیں۔ جن کی بدولت ان کا نام ادب میں لافانی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔

آگرہ سے دہلی روانگی کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہو کہ آگرہ میں شاعروں

اعری کو سمجھنے والوں کی تعداد بہت کم تھی اور لوگوں کو ویسے بھی شاعری سے کوئی خاص شغف نہ تھا یا شاید یہ وجہ ہو کہ اجتماعی آپ کا کلام بہت مشکل تھا اور آپ فارسی کے مشہور شاعر بیدل کی طرز پر اشعار کہتے تھے اس لئے آپ کے عجیب و غریب اشعار اکثر سخن فہموں کی سمجھ سے بالاتر تھے۔

شاعر اگر کسی کو اپنی غزل یا اشعار سناتا ہے تو صرف اس لئے کہ وہ اسے داد دیں۔ مگر جب داد کی جگہ اعتراضات ملیں تو وہ بڑا ہو جاتا اور پیچ و تاب کھانے لگتا ہے چنانچہ غالب بھی ان لوگوں کے اعتراضات سے چڑ گئے۔ ان ہی معترضین سے چڑ کر آپ نے اکثر یہ رباعی کہی تھی۔

مشکل ہے ز بس کلام میرا اے دل
سن سن کے اسے سخن ورانِ کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

تیسری وجہ جو شاید غالب کو دہلی لانے میں آمادہ کرتی نظر آتی ہے یہ ہو سکتی ہے کہ اس زمانے میں دہلی کا ماحول ادبی لحاظ سے بہت سازگار تھا۔ بڑے بڑے سخن فہم حضرات دہلی ہی میں سکونت پذیر تھے۔ ان میں شعراء میں شاہ نصیر، ابراہیم ذوق، مومن، علماء میں شاہ عبدالعزیز، شاہ اسماعیل، شاہ عبدالقادر، حضرت سید احمد بریلوی، مولانا فضل حق خیرآبادی حکماء میں حکیم محمود خاں، حکیم احسن خاں، حکیم رضا خاں اور رؤساء میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ موجود تھے۔

خوش قسمتی سے مرزا غالب کو مولانا فضل حق اور نواب شیفتہ جیسے صاحبان علم و فن کی دوستی اور قربت کی نعمت حاصل ہو گئی۔ ان بزرگوں نے ان کے کلام کی خوبیوں اور خامیوں سے انہیں آگاہ کیا۔ یہی وجہ تھی کہ آپ قلیل عرصہ میں شاعرانہ عظمت کے آسمان پر ستارے کی مانند چمکنے لگے۔

دہلی آنے کے بعد غالب کے کلام میں جو تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ اس کی وجہ شاید یہ بھی ہو کہ آپ نے یہاں آکر ہندوستان کے فارسی شعراء کے کلام کا مطالعہ کیا۔ یوں تو غالب کی شہرت کی اصل وجہ اردو کلام ہے جو ادب میں اپنا علیحدہ و منفرد مقام لئے ہوئے ہے لیکن پھر بھی ان کے کلام میں — بیدل اور عرفی اور نظیری کا عکس کہیں کہیں ملتا ہے۔ غالب جنگ آزادی کے بعد صرف دس برس مزید اس دنیا کو دیکھ سکے۔

آخری فروری ۱۸۶۸ء کو ۷۳ برس کی عمر میں اس دنیا سے رخصت ہو گئے اور حضرت نظام الدین اولیاء کی درگاہ میں مدفون ہیں۔

سرسید کو پرانے شعراء سے اس بات پر اختلاف تھا کہ وہ لالچی اور خودغرض ہوتے ہیں۔ مگر غالب پر یہ الزام لگانا ان کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ اس میں شک نہیں کہ انہوں نے ذاتی مصلحتوں کی بناء پر اپنے ممدوحین کی شان میں قصیدے لکھے لیکن ان کی قصیدہ گوئی بھی اپنے اندر ایک خاص شان لئے ہوئے ہے آپ نے بہادر شاہ کی مدح میں بھی ایک قصیدہ لکھا جس کی وجہ سے غالب کو بہت پریشانی اٹھانی پڑی۔ آپ اس بات سے تنگ آ گئے اور ایک قصیدہ لکھ کر دربار میں بادشاہ کے سامنے پیش کیا کہ مجھے ہر ماہ تنخواہ دی جائے۔ مگر درخواست کے انداز میں بھی اپنے بانکپن اور اپنی ظرافت کو نہ چھوڑا۔ کہتے ہیں۔

شاعر نغز گو و خوش گفتار — رزم کی داستان اگر
ہے زباں میری تیغ جوہر دار — بزم کا التزام گر کیجئے
ہے قلم میرا ابر گوہر بار — ظلم ہے گر نہ دو سخن کی داد
قہر ہے گر کرو نہ مجھ کو پیار

کچھ خریدا نہیں ہے اب کے سال — کچھ بنایا نہیں ہے اب کی بار
رات کو آگ اور دن کو دھوپ — بھاڑ میں جائیں ایسے لیل و نہار

آگ تاپے کہاں تلک انسان — دھوپ کھائے کہاں تلک جاندار
دھوپ کی تابش آگ کی گرمی — ربنا وقنا عذاب النار

اب اصل وجہ بیان کرتے ہیں۔

میری تنخواہ جو مقرر ہے — اس کے ملنے کا ہے عجیب ہنجار
رسم ہے مردہ کی چھ ماہی ایک — خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار
مجھ کو دیکھو تو ہوں بہ قید حیات — اور چھ ماہی ہو سال میں دو بار
بس کہ لیتا ہوں ہر مہینے قرض — اور رہتی ہے سود کی تکرار
میری تنخواہ میں تہائی کا — ہو گیا ہے شریک ساہوکار

اپنی مجبوریوں کا ذکر کرنے کے بعد بادشاہ کے سامنے اپنی درخواست پیش کرتے ہیں۔ مگر کن الفاظ میں!

آپ کا بندہ اور پھروں ننگا — آپ کا نوکر اور کھاؤں ادھار
میری تنخواہ کیجئے ماہ بماہ — تا نہ ہو مجھ کو زندگی دشوار
ختم کرتا ہوں اب دعا پہ کلام — شاعری سے نہیں مجھے سروکار

تم سلامت رہو ہزار برس ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

اس طرح اقبالؒ کے کلام کا بیشتر حصہ خودی، فلسفہ اور حرکت نفس کے گرد گھومتا ہے اسی طرح مرزا کے کلام کا بھی بیشتر حصہ عشاق اور محبوب حضرات کے گرد گھومتا ہے۔

غالب میں یہ خوبی تھی کہ آپ تصور کو اشعار کے ذریعے حقیقت کا ایسا رنگ دیتے کہ شاعر کا خیال بالکل حقیقت معلوم ہو۔ چنانچہ آپ نے کہیں تو ایک ایسے عاشق کی ترجمانی کی جس کا محبوب اسے بھول گیا ہو اور کبھی اسی کے انداز میں اپنی قسمت پر ماتم کرتے ہیں اور کہیں ناصح پر کہ عشق کا مذاق اڑایا ذرا ملاحظہ فرمائیے

تو مجھے بھول گیا ہو تو پتہ بتلا دوں
کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا

مجھ سے کیا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ
اس میں کچھ شائبۂ خوبی تقدیر بھی تھا

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل
کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

اگرچہ غالب میر درد کی طرح باعمل صوفی نہ تھے بلکہ رند مشرب تھے۔ لیکن پھر بھی آپ نے اپنے کلام میں متصوفانہ رنگ بڑی خوبی سے باندھا۔ ویسے یہ بات عجیب بھی محسوس ہوتی ہے کہ ایک طرف عاشقانہ انداز میں ثانی نہیں تو دوسری طرف متصوفانہ باتوں میں بھی خوب مہارت رکھتے ہیں۔ آپ کو اپنے متصوفانہ باتوں پر اتنا ناز تھا کہ خود فرماتے ہیں۔

یہ مسائلِ تصوف، یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

غالب نے تشبیہ، استعارہ اور تلمیحات کو اپنے کلام میں خوب جگہ دی۔ غالب کی فطرت میں جدت پسندی چونکہ کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ لہذا آپ نے اردو کو نئی نئی تلمیحات و تشبیہات سے آشنا کرایا۔

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش پر زنانِ مصر سے
ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہو گئیں

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

اک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک
اک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے

غالب نے اپنے کلام کو مزین کرنے کے لیے جا بجا تشبیہات و استعارات کا استعمال کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ اپنے کلام کو اور زیادہ ادبی بنانے کے لیے حسنِ تعلیل کا بھی خوب استعمال کیا۔

شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی جو پنہاں ہو گئیں

جب دو ایک جیسے مگر مختلف معنوں کے الفاظ ایک جگہ استعمال ہوں تو کلام میں کشش پیدا ہو جاتی ہے۔ شاید اسی لیے غالب اس میدان میں بھی عبور حاصل تھا۔ آپ نے تجنیس کا بھی بہتر طور پر استعمال کر کے اپنے کلام کے حسن کو نکھارا۔

یہی ہے جو مجھ کو شاہ جم جاہ نے دال
ہے لطف و عنایات شہنشاہ نے دال

چھوڑوں گا میں نہ اس بت کافر کا پوجنا
چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر

ایک رنگ و ایک نظیر الفاظ کا استعمال۔

مناسبت۔ ایک رنگ و ایک نظیر الفاظ کو اگر سلیقے سے استعمال کیا جائے تو عبارت قاری کے دل میں اتر جاتی ہے اور قاری پر فکر سا طاری ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مرزا کا کلام پڑھ کر قاری وجد میں آ جاتا ہے اور بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے جتنا زیادہ پڑھو اتنا ہی دل اور پڑھنے کو چاہے گا ذرا غور فرمائیے

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

پند و نصائح:۔

پند و نصائح اگرچہ غالب کا میدان نہیں لیکن پھر بھی کہیں کہیں ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں جو انسانی زندگی کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

غزل

اختر شاہجہانپوری

تیری الفت کا طلبگار نہ ہوگا کوئی
اور ہو بھی تو سردار نہ ہوگا کوئی

اے غم عشق مناسب ہے کہ باور کرے
اور مجھ سا ترا بیمار نہ ہوگا کوئی

کوئی پربت ہو کہ دریا ہو کہ صحرا کوئی
وصل شرط ہے دیوار نہ ہوگا کوئی

میری خاموشی کو کچھ نام نہ دینا لوگو
مجھ سا یاں صاحب گفتار نہ ہوگا کوئی

میرے احباب مجھے تلخ نوا کہتے ہیں
اس سے بڑھ کر بھی تو آزار نہ ہوگا کوئی

ہر طرف ہونگے جنوں خیز مناظر لوگو
موسم گل میں تو بیکار نہ ہوگا کوئی

اس کا غم دل سے لگائے ہوا کچھ سا اختر
ورنہ اس غم کا سزاوار نہ ہوگا کوئی

غزل

وجے پال سنگھ "وجے"
بی۔ٹی۔سی بسروعہ۔
(میرٹھ)

کفر و ایماں کو کہاں بات اٹھانے دے گا
شیخ دامن پہ کوئی داغ نہ آنے دے گا

لوگ چاہیں گے تہہ آب اترنا لیکن
یہ سمندر ہے کبھی تھاہ نہ پانے دے گا

یوں پریشان نہیں ہوتے بچھڑنے والو
وقت پھر ملنے ملانے کے بہانے دے گا

ایک احساس کہے گا کہ بھلا دے سب کچھ
ایک احساس مگر کچھ نہ بھلانے دے گا

شام کو لوٹ کے کر دوں گا حوالے تیرے
دن یہ اجرت میں جو دکھتے ہوئے شانے دیگا

جس میں تہذیب پھلے پھولے تمدن پنپے
ایسا ماحول نہ یہ ماحول بنانے دے گا

میری آنکھوں میں وجے خواب بہت ہیں لیکن
کون تعبیر کے سامان جٹانے دے گا

غزل

قمر الوتوی پال گھر

مصحف رخ یار کا یوں کھول کر پڑھتے رہے
خال و خال رخ کے سب زیر و زبر پڑھتے رہے

شکر کریں کیا کہ کبھی ہم منزل پہ پہنچے کامراں
کچھ لکھے مانند سنگ رہ گزر پڑھتے رہے

بھول کر فرد عمل دیکھی نہیں ہم نے کبھی
اپنی قسمت کا لکھا ہی عمر بھر پڑھتے رہے

میری سرگوشی کا اک اک لفظ ازبر تھا انہیں
صبح افسانہ مرا دیوار و در پڑھتے رہے

شامیانوں میں خیالوں کے رہے ہم خستہ حال
خواب میں ایوانوں کے دیوار و در پڑھتے رہے

جب کبھی دیکھی وفا کی لاش لٹکی دار پر
درس عبرت باوفا با چشم تر پڑھتے رہے

کس قدر تھا دلنشیں افسانۂ عالم نہ پوچھ
اپنا افسانہ سمجھ کر عمر بھر پڑھتے رہے

ایک عالم کا قصیدہ دل کے جام جم میں تھا
جی میں جب آیا اسے جو کھول کر پڑھتے رہے

چاندنی شب میں اندھیرا دیکھ کر ہم اے قمر
واقعات درد غم شام و سحر پڑھتے رہے

بمبئی مرکنٹائل کوآپریٹو بنک لمیٹڈ

رجسٹرڈ آفس ۷۸، محمد علی روڈ بمبئی ۴۰۰۰۰۳

دہلی آفس ۲۶۵۷ نیتاجی سبھاش مارگ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
فون نمبر ۲۶۸۲۶۶ — ۲۶۴۳۷۰

* ہمارے یہاں شرح سود تمام نیشنلائزڈ اور شیڈولڈ کمرشئیل بنکوں کے مقابلہ ایک فی صد زیادہ ہے۔
* ہندوستان کا پہلا کوآپریٹو بنک جس کو زرِ مبادلہ میں کاروبار کیلئے لائسنس جاری کیا گیا۔
* ہمارے بنک میں اوقاف کی جمع شدہ رقم کی آمدنی دفعہ ۱۳ (۲۵) (الف ۲ (iii) انکم ٹیکس ایکٹ ۱۹۶۱ء کے تحت انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہے۔

اس کے علاوہ

* ہم آپ کی تعلیم و آسائش کی ضروریات مہیا کرنے کیلئے آسان قسطوں پر قرضہ فراہم کرتے ہیں ایک فیصدی کا فرق بہت بڑا فرق ہے۔ یہ آپ کی رقم میں ہزاروں روپیوں کا اضافہ کرتا ہے۔ آپ بھی اس کا فائ
اٹھائیں

زین بی رنگون والا	حسینی ایس ڈاکر	شمیم کاظم
(مینیجنگ ڈائرکٹر)	(چیرمین)	اسسٹنٹ جنرل منیجر۔ شمالی ہند

رنگِ دوراں

توصیف علوی

عاصی کیرالوی

ہر طرف رقص میں بجلیاں بجلیاں
میں بھلا کیا کہاں فصلِ گل ہے کدھر
وہ فسانہ نہ [illegible] آہ ہو گئے
لٹنے والوں کو آواز تک بھی نہ دی
منزلوں کے نشاں خود چمکتے ہیں پھر
آج شاید کوئی [illegible] گل کھلے
جن سے [illegible] ہے [illegible] طرزِ سخن
کس لئے [illegible] رحم
سازِ رہبر کا [illegible] رہبر [illegible]
[illegible] ہاتھوں [illegible] کے
[illegible] چھڑا غزل نے ان کے جواب
ہم سے [illegible] کہ صبح تمنا [illegible]
[illegible] اوراق اٹھے ہیں تاریخ کے
[illegible] نہیں مطمئن

آگ ہی آگ ہے آشیاں آشیاں
ڈھونڈھتا ہوں یہی گلستاں گلستاں
جن کو رکھا گیا راز داں راز داں
یوں تو ہر سمت تھے پاسباں پاسباں
زخمِ دل ہو [illegible] اگر خونفشاں خونفشاں
پھر وہ نظریں ہوئیں مہرباں مہرباں
آج کیوں [illegible] ہی ہے زباں بے زباں
ایک ہی جلوہ ہے [illegible] آستاں آستاں
کیوں یہ لٹتے ہیں پھر کارواں کارواں
ان کے دامن ہے [illegible] خوں چکاں خوں چکاں
داغ ہم نے کئے خونفشاں خونفشاں
پھر اندھیرے ہیں کیوں درمیاں درمیاں
ایک ہی غم ملا داستاں داستاں
ہم نے کانٹے لئے شادماں شادماں

جرم ساقی کے [illegible] انتہا [illegible]
[illegible] بھی [illegible] ہیں [illegible] بیکراں

غزل

برج لال کپور دل دکونڈہ

ظرف [illegible] سے بڑھ کر سر اٹھانا بھول جا
جامِ خودداری کو بدنامی کی مستی سے بچا
دلبری کے ساتھ ہے اگر تو حسنِ دلنواز
[illegible] کچھ [illegible]
خواب ہے [illegible] نہیں کچھ آرزوؤں کا وجود
قوم کو تعمیر کر اب اس طرح سے اے بشر
کب زمانہ ساتھ دیتا ہے کسی کا بے عمل
اپنے دل میں کر کے پیدا تو خلوص کر [illegible]
اپنے [illegible] زندگی میں کر کے پیدا انقلاب
دل [illegible] نوازی بندگی سے کم نہیں دنیا میں [illegible]

[illegible] دنیا کو ستانا بھول جا
[illegible] جن سر جھکانا بھول جا
بھول جا [illegible] تمنا کا بہانہ بھول جا
[illegible] تفرقہ کا ترانہ بھول جا
زندگی میں آرزوؤں کا [illegible] بھول جا
دل شکستوں پر کرم کر اور ستانا بھول جا
[illegible] گنوانا بھول جا
[illegible] کا فسانہ بھول جا
[illegible] بیماری دل دکھانا بھول جا
[illegible] کا [illegible] بھول جا

طنزیہ

میری تعریف کرو

رام لعل نابھوی

یہ بات اس وقت کی ہے۔ جب ہم بچے تھے۔ دیسے بچے تو ہم اب بھی ہیں لیکن اس وقت تو ہم حقیقتاً بچے تھے کہ ہمارے کانوں میں ایک بھنک پڑی "تعریف اس خدا کی جس نے جہاں بنایا" جیسے اور بائیں سن کر ان سنی کر دیتے تھے۔ یہ بات بھی اسی طرح ان سنی کر دی۔ اسکول پہنچے۔ ہر صبح باقاعدگی سے وہاں حاضر ہو جاتے۔ ساتھی طلبا کے ساتھ ترنم سے اور لہک لہک کر ایک نظم ہر صبح پڑھتے جس کا پہلا مصرع یہی ہوتا تھا۔ یقین جانئے ہمیں اس وقت کسی نے خدا کا مطلب نہ بتایا اور نہ یہ فکر ہی کی کہ خدا کی تعریف کیوں کی جائے۔ ایک روز کرنا خدا کا کیا ہوا کہ ہمارے تجسس نے زور پکڑا اور ہم اپنے استاد سے پوچھ بیٹھے کہ خدا کون ہے۔ کہاں رہتا ہے۔ کیا کرتا ہے اور اس کی تعریف کیوں کی جائے۔ جو بھی جواب استاد سے اس وقت ملا۔ اس سے ہمیں بخوبی اندازہ ہو گیا کہ ہمارے استاد خدا کو جانتے تک نہیں تھے۔ نہ ان کی کبھی ملاقات ہوئی تھی۔ جو کچھ انھیں پتہ تھا وہ سن کر یا پڑھ کر ہی حاصل کیا تھا اور وہ ہی انھوں نے ہمیں بتا دیا۔ ہم نے معاملہ کی چھان بین کی اور بڑے بڑے ملاؤں، پنڈتوں کے پاس پہنچے تب پتہ لگا کہ یہ بات آسمانی صحیفوں میں کہی گئی ہے کہ خدا کی تعریف کی جائے یعنی خدا نے خود ہی اپنی تعریف کرانے کا سلسلہ چلایا۔ تاریخ کا مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ بہت لوگوں نے تو اپنی پوری زندگی خود خدا کی تعریف کرنے اور لوگوں سے تعریف کرانے میں گزار دی۔ انھوں نے اور کوئی کام ہی نہیں کیا۔

بڑے بڑے بادشاہ تخت پر بیٹھتے۔ لوگ انہیں ظل اللہ کہتے۔ تخت خداوندی بتاتے اور تعریف کے پل باندھتے۔ بادشاہ اپنی تعریف سن کر خوش ہوتے اور انعام دیتے۔ چنانچہ بادشاہ کی بڑھ بڑھ کر تعریف ہوتی اور جو شخص تعریف کرنے میں سب سے بازی لے جاتا وہ بادشاہ کے نزدیک ہو جاتا۔ شعرا قصیدے لکھنے لگے۔ جو شاعر سب سے عمدہ قصیدہ کہتا یا سب سے زیادہ بادشاہ کی تعریف کرتا وہ سب سے زیادہ انعام پاتا۔ دوسرے شعرا حسد کرنے لگ جاتے۔ اشعار میں خامیاں ڈھونڈتے اور بادشاہ کو بتاتے۔ شاعروں کی آپس میں چھیڑ چھاڑ اور چپقلشیں شروع ہو گئیں۔ معرکے ہونے لگے۔ استادوں کی حمایت میں شاگرد میدان میں کود پڑتے۔ جلسے ہوتے۔ جلوس نکلتے۔ انشا و عظیم، انشا و خالق، انشا و قتیل، انشا و مرزا غضب، جرأت و لونا۔ ناسخ و آتش۔ سودا اور مرزا جان جاناں۔ سودا اور مرزا فاخر، سودا اور میر ضاحک۔ سودا اور مکین۔ سودا اور بقا۔ انیس و دبیر وغیرہ ذوق۔ غالب، اور ذوق وغیرہ کے ادبی معرکے کیا تھے۔ یہی نہ کہ اپنی تعریف کی جاتی۔ مخالف کو گرانے کی کوشش کی جاتی۔ چونکہ یہ لوگ صحیح معنوں میں شاعر ہوتے تھے اور زبان و بیان پر پوری گرفت ہوتی تھی اس لئے جب بھی کوئی عمدہ شعر اپنے مخالف کا سنتے تو خوب تعریف کرتے تھے۔ مصنف "آب حیات" رقم طراز ہیں کہ سید انشا نے ایک مشاعرہ میں ۵ اشعار کی ایک غزل پڑھی۔ اس کا ایک شعر تھا۔

"لگا کے برف میں ساقی صراحی مے لا
جگر کی آگ بجھے جس سے جلد وہ شے لا"

اس مشاعرہ میں جرأت اور مصحفی تک سب موجود تھے مگر سب نے غزلیں اپنے ہاتھ سے رکھ دیں کہ اب پڑھنا لا حاصل ہے۔ ادب میں دلچسپی بڑھی تو ہم نے دیکھا کہ بہت جگہ شعرا نے اپنی کتاب خدا کی حمد سے شروع کی اور اس کے بعد اپنی تعریف پر اتر آئے۔ بہت جگہ یہ عالم دیکھا کہ خدا کا نام ہی نہیں یا اسے پس پشت ڈال دیا۔ جب ہماری نظر میر تقی میر کے اس شعر پر پہنچی۔

سارے عالم پہ ہوں میں چھایا ہوا
مستند ہے میرا فرمایا ہوا

تو ہمارے کان کھڑے ہو گئے اور ہم چوکنے ہو گئے۔ یہ کان آج تک اپنی صحیح جگہ پر نہیں لوٹے۔ ہم نے تو سنا تھا کہ اپنی تعریف تعریف ہی

نہیں کہلاتی اور یہاں دوسری بات ہی نہیں تھی ۔ چنانچہ بھاگم بھاگ پھر استاد کے پاس پہنچے ۔ انھوں نے وضاحت فرمائی کہ اسے تعلّی کہتے ہیں اور شعراء ادباء کو اس کی اجازت ہے ۔ ہم نے سوال کیا کہ یہ اجازت انھیں کس نے دی ۔ اس کا جواب جو استاد نے دیا وہ بھی ان کا سنا سنایا تھا ۔ آج کل ہم مختلف شعراء کے دیوان کھنگالنے میں لگے ہوئے ہیں تاکہ یہ دیکھیں کہ انھوں نے خدا کی تعریف میں کتنا کچھ کہا ہے ۔ دوسروں کی تعریف میں کتنا لکھا ہے اور اپنی تعریف میں کتنا ۔ ابھی تک تو جو کچھ ہمارے مطالعہ میں گذرا ہے اس کے مطابق تعلّی کا پلڑا بھاری ہے ۔

اپنے آپ کو مشاعروں ، مناظروں ، سمناروں ، جلسوں اور ادبی محفلوں کی دنیا میں لے چلیں ۔ یہ بات پہلے ہی مشاعروں کی ہے ۔ اس میں ایسے شعراء تھے جو جدید شاعری کے متوالے تھے اور قدیم شاعری کو بالکل پسند نہیں کرتے تھے ۔ ایسے بھی تھے جو قدامت پسند تھے اور جدید شاعری کے مخالف ۔ ان میں وہ بھی تھے جو قدیم اور جدید دونوں رنگوں کے امتزاج سے اپنے اشعار میں ندرت پیدا کرتے تھے ۔ مشاعرہ شروع میں ہم نے دیکھا کہ بعض بہت عمدہ اشعار پر خموشی رہتی اور بعض ناقص شعروں پر واہ وا ۔ پھر کہئے ۔ کیا شعر ہے ۔ یہ آپ ہی کا حصہ ہے کے نعرے بلند ہوتے ۔ اب جو غور کیا تو معلوم ہوا کہ جیسے دنگل میں پہلوان اپنے حریف کو ۔ داؤ پیچ سے شکست دیتے ہیں اسی طرح کچھ شاعر اپنے مداح اپنے ساتھ لاتے ہیں جو یہاں وہاں ۔ اِدھر ۔ اُدھر محض اس لئے رکھے ہیں کہ اپنے شاعر کی تحسین و آفریں کریں ۔ ماہرین حیران رہ جاتے ہیں ۔ لیکن کچھ بھی نہیں سکتے ۔

آج کل تعریف کرانے کے لئے پانچ حربے زیادہ مستعمل ہیں ۔

۱۔ مشاعرہ بازی
۲۔ رسم اجرا
۳۔ جشن بازی
۴۔ رسالوں کے نمبر یا گوشے ۔
۵۔ خاکہ نگاری ۔

مشاعرہ بازی ایک فن ہے ۔ کوئی نیا پرانا شاعر یا ادیب ایک انجمن بنا لیتا ہے ۔ اچھا پیڈ ۔ عمدہ لفافے لاتا ہے ۔ اردو کے نام پر سرکاری اداروں سے رقمیں لیتا ہے ۔ اشتہارات اکٹھے کرتا ہے اور پھر ایک سووینیر شائع کرتا ہے ۔ اس میں اپنی تعریف اپنے دوستوں کی تعریف میں مضمون چھپواتا ہے ۔ اور دوستوں میں ان کا ذکر زیادہ ہوتا ہے جو خود مشاعرہ باز ہیں اور امداد باہمی کے اصول پر اپنا کاروبار کرتے ہیں ۔ نہایت عمدہ کاغذ پر فوٹو چھپتے ہیں ۔ ناظم مشاعرہ اگر چاہے تو کسی معمولی شاعر کو کامیاب کرا دے اور چاہے تو مستند شاعر کو ہوٹ کرا دے اس لئے شعرا حضرات ناظم مشاعرہ کی طرف ملتجی نظروں سے دیکھتے رہتے ہیں

رسم اجرا کسی شاعر یا ادیب کی کسی کتاب کی رونمائی ہوتی ہے ۔ اس میں مصنف بہت محنت سے شاعر اور ادیب اکٹھے کرکے لاتا ہے اور ان کا کام صرف تعریف کرنا ہوتا ہے ۔ عام طور پر یہ کام مشاعرہ بازوں ، شعبدہ بازوں اور گروہ بازوں کو دے دیا جاتا ہے ۔

جشن بازی ایک نیا مرض ہے ۔ یہ بدعت اب عام ہوتی جا رہی ہے ۔

کچھ رسالوں اور پرچوں نے شعراء اور ادبا کے ضخیم نمبر نکالنے شروع کئے ہیں ۔ اسی طرح بہت رسالے اور پرچے گوشے نکالتے ہیں ۔ ان میں ایسے مضامین بھی ہوتے ہیں جو متعلقہ شاعر یا ادیب نے خود ہی لکھ کر دے دئے ہوتے ہیں اور کسی اور کے نام سے چھپ جاتے ہیں ۔ غرض ان کی بھی یہی ہوتی ہے کہ میری تعریف کرو ۔

اگر کوئی شاعر یا ادیب صحیح معنوں میں تعریف کا حقدار ہے تو اس کا ذکر ہونا ضروری ہے اور ذکر بھی ۔ اس سے دوسروں کو انسپریشن ملتی ہے ۔

خاکہ نگاری بہت مشکل فن ہے ۔ علماء نے اپنے دوستوں کے خاکے لکھے ہیں ۔ ان میں خوبیاں اور نقائص بتائی ہیں ۔ ہر شاعر اور ادیب اپنی تعریف چاہتا ہے ۔ اگر نہیں تو ذکر چاہتا ہے ۔ فکر جاتا ہے ۔ چنانچہ ایسے شاعروں اور ادیبوں کو اگر کسی ایسے خاکہ نگار کا پتہ چل جاتا ہے جو [illegible] لکھتا ہو تو وہ اس کی طرف کھنچے ہیں پہلے اس کی تعریف کرتے ہیں ۔ اس کا ذکر کرتے ہیں تاکہ خاکہ نگار ان کا خاکہ لکھے ان کی خوبی کا قصہ مختصر یوں کہ ہر شخص ہر ایسا حربہ استعمال کرنے کے چکر میں ہے کہ اس کی تعریف ہو یعنی میری تعریف کرو ۔ ہو سکے تو ابھی [illegible] وقت ۔ سائنس کا کمال ہے کہ آئے [illegible] ۔

غزل
شیلکھ چند جین قابل دہلوی

ہر اک داغِ جگر مہرِ درخشاں ہو کے رہتا ہے
تمہارا غم خدا رکھے نمایاں ہو کے رہتا ہے

اب اُس منزل پہ وحشت تیرے دیوانے کی آپہنچی
بیاباں بھی دکھائی دے تو گلستاں ہو کے رہتا ہے

رموزِ زندگی کو جب سمجھ لیتا ہے دیوانہ
تو فرزانوں کی دنیا میں بھی انساں ہو کے رہتا ہے

تسلّی تو مجھے دو دن بہت کچھ دے گئے ہمدم
مگر میں کیا کروں جب دل پریشاں ہو کے رہتا ہے

ہزاروں داغ دل پہ کھائے ہیں میں نے محبت میں
مری دنیا میں ہر موسم بہاراں ہو کے رہتا ہے

تماشائی ذرا پہلے نظر میں نور پیدا کر
پھر اس کے بعد تو دیدارِ جاناں ہو کے رہتا ہے

وہ جس دم جھوم کر انگڑائیاں لیتے ہیں مستی میں
تو میخانے پہ جوشِ ابرِ باراں ہو کے رہتا ہے

چلے آتے ہیں جس دم بن سنور کر وہ گلستاں میں
خزاں کا دور بھی دورِ بہاراں ہو کے رہتا ہے

کسی کا مسکرانا یاد آجاتا ہے جب قابل
تو ویرانِ دل رشکِ گلستاں ہو کے رہتا ہے

غزل
ڈاکٹر جے ۔ سی ودیا ساگر

[illegible] آ [illegible] تمنا [illegible] کچھ [illegible] یاں پر آ نہیں سکتا
شکایت [illegible] کوئی بھی نغمہ گا نہیں سکتا

کبھی بھر بے نہ پائے گا ہمارا [illegible] سینے کا
جسے سینے ہوا شعلوں نے وہ گل مرجھا نہیں سکتا

خدایا [illegible] دل یہ بھی اُسے کیوں پیار کرتا ہے
[illegible] نہیں [illegible] کو [illegible] میں پا نہیں سکتا

اس منزل کی جانب بڑھ رہا ہے ہر قدم میرا
جہاں [illegible] جو آساں ہے جہاں سے آ نہیں سکتا

[illegible] حسن پہ کرتے [illegible] انھوں نے بے وفائی سے
کسی پر بھی جوانی [illegible] اب آ نہیں سکتا

[illegible] آنکھوں سے تیرے خون کا دریا نہ پر نکلے
[illegible] افسانہ [illegible] جا نہیں سکتا

[illegible]
دوا کا [illegible] زبان پر آ نہیں سکتا

دمِ آخر جو آئے ہو تو اب آنے سے کیا حاصل
ترا [illegible] اب اور دھوکا کھا نہیں سکتا

بہاروں کی تمنا خام ہے اب اے قمر تیری
خزاں [illegible] میں جو موسم گل کی آ نہیں سکتا

غزل
ڈاکٹر ایس ۔ پی ۔ تفتہ کور وکھشیتر

بجنے کو ہے [illegible] ساون کا　خواب بھی آیا نہ میرے ساجن کا
من کے ساگر میں ڈوبنے والو!　بھید پایا ہے کس نے اس من کا؟
مرگ و شادی میں تھا نہ فرق کوئی　کیا زمانہ تھا کال بچپن کا!
آؤ پھولوں کو خون سے سینچو　بھیکا بھیکا ہے رنگ گلشن کا
لب پہ آہیں ہیں [illegible]　کوئی دیکھے تو حال دُبرہن کا
درد اٹھتا ہے دل میں رہ رہ کر　پیڑ برہا کی ڈستا ناگن کا
تفتہ دل کو اڑاتا ہے [illegible]　اس طرح اڑتا ان کے دامن کا

اُمّ ہانی لکھنؤ

غزل

صداقت گوئی کے لئے تلخیٔ آزاد ہے آج
پھر بھی مجبور ہے میرا دل بیدار ہے آج

صدیوں کے الجھی میرا خیال آیا ہے
اب فقط وقت میرا محرم اسرار ہے آج

آدمی ہی نے بنائے ہیں ہزاروں حلقے
اور پھر خود ہی وہ حلقوں میں گرفتار ہے آج

منزلیں دور بہت دور کھنچی جاتی ہیں
تیز تر کچھ مرا اک شخص کی رفتار ہے آج

دشت وصحرا کو کیا ترک جگر داسے نصیب
سیر گلستاں میں بھی پیرِ اخلاق خار ہے آج

مونس و ہمدم و احباب سبھی روٹھ چکے
ان کا بخشا ہوا اک غم کہ غمخوار ہے آج

ساری دنیا کے لئے امن بھی انداز میں میری
لذت پُر لطف صدا یا سینہ یار ہے آج

آشتی امن سبھی سو گئے گہری نیند میں
جس طرف دیکھئے اک فتنہ بیدار ہے آج

یا الٰہی کوئی اس درجہ گنہگار نہ ہو
جس طرح ہانیٔ مانوس گنہگار ہے آج

راز لائلپوری

غزل

مجھے دیوانہ نہ فرزانہ بنایا ہوتا
[illegible] بنایا ہوتا

حسن کو دیکھ [illegible] یا رب
ساری دنیا کو صنم خانہ بنایا ہوتا

[illegible]
[illegible] بنایا ہوتا

[illegible] حسن کی دولت یا رب
[illegible] تو میرا نہ بنایا ہوتا

[illegible]
مجھے مختار [illegible] بنایا ہوتا

[illegible]
[illegible] بنایا ہوتا

برق [illegible] اگر
میں نے بھی اک [illegible] بنایا ہوتا

[illegible] تھی مجھ سے یا رب
[illegible] بنایا ہوتا

[illegible]
میں نے [illegible] بنایا ہوتا

دور رہ کر بھی رہی تا دیر وہی منت ملے
یاس کو، حسرت کو، غم کو، بس کو ہی قاتل کہوں
ہاں اسی دن سے غلط راہوں پہ جاری ہے سفر
صرف اتنی بات پر پاگل ہمیں سمجھا گیا
شیشۂ دل توڑ نے والوں میں کسے الزام دوں
شام کو جیسے افق پر پھیل جائیں سرخیاں

دوستوں کے جذبہ میں میرے تذکرے اکثر ملے
سینۂ مقتول میں تو سینکڑوں خنجر ملے
[illegible] سے رہبر ملے
ہم کسی سے جب ملے کھل کر ملے ہنس کر ملے
مٹھیوں میں تو سبھی کے ہر شخص کی پتھر ملے
شہر کے کوچوں میں اکثر ویسے ہی منظر ملے

جن پہ کر سکتا تھا میں اپنے تحفظ کا یقیں
ساقی ایسے لوگ کب اس شہر کے اندر ملے

غزل

ڈاکٹر ساقی
[illegible] شہر
بلاسپور دہلی

غزل

شکیل شفائی - متھرا

اجل بخیر حسابوں کے سلسلے توڑے
بجانے کس نے حبابوں کے سلسلے توڑے

ہے اپنے آپ میں سیراب پیاس کا احساس
کبھو نظر نے سرابوں کے سلسلے توڑے

جواب دینے کا ہوگا سوال کب پیدا
اگر سوال، جوابوں کے سلسلے توڑے

چمن میں پھول بہت تھے، خزاں کو کیا سوجھی
کہ اب کے صرف گلابوں کے سلسلے توڑے

یقین جانیے کھٹکا وہ معتبر ہوگا
اگر حسین خوابوں کے سلسلے توڑے

قلم تھا ہاتھ میں، لکھ لی کتاب لوگوں نے
کہ جب خدا نے کتابوں کے سلسلے توڑے

شکیل گر ملی فرصت کریں گے کار ثواب
ابھی کریم عذابوں کے سلسلے توڑے

غزل

محشر افقانی
بانسواڑہ راجستھان

حوادثِ جہاں میں کہاں تک آزمائیں گے
ہمارے آگے ایک دن یہ اپنا سر جھکائیں گے

انھیں یہ ضد کہ وہ ہمارے خون سے نہائیں گے
ہمیں یہ شوق ہم انھیں جان و دل لٹائیں گے

حسین خد و خال پر جنھیں بہت غرور ہے
ملا جو وقت ہم انھیں بھی آئینہ دکھائیں گے

روایتوں کی بیڑیاں پڑی ہیں جن کے پاؤں پر
جدید رہ گزر تک وہ لوگ کیسے آئیں گے

وہیں تلک ہے دل ہی جہاں تک آنکھ ہے کھلی
نہ ہوں گے ہم تو پھر کسی کو یاد بھی نہ آئیں گے

یقیں تو ہے کہ مل سکے گی دادِ ضبطِ شوق کی
غزل کی طرح داستانِ دردِ دل سنائیں گے

چھپا لو محشرِ حزیں تو زخمہائے آرزو
بہار آئے گی تو گل ضرور مسکرائیں گے

منکسر المزاجی

بقیہ: مرزا غالب جب انسان شہرت کی بلندیوں پر پہنچتا ہے تو وہ عموماً اپنے آپ کو یکتا سمجھتا ہے لیکن آپ میں یہ بات قدرے نہ تھی آپ نے اپنے سے پہلے شعراء کے کلام کی خصوصیت کو تسلیم کیا۔ جن سے آپ خود فیض یاب ہوئے

ریختے کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب — کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا
غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ — آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

ابیات بحضور سرور کائنات

احمد فراز

مرے رسول کر نسبت تجھے اجالوں سے
میں تیرا ذکر کروں صبح کے حوالوں سے

نہ مری نعت کی محتاج ذات ہے تیری
نہ تیری مدح ہے ممکن مرے خیالوں سے

تو روشنی کا پیمبر ہے اور مری تاریخ
بھری پڑی ہے شب ظلم کی مثالوں سے

ترا پیام محبت تھا اور میرے یہاں
دل و دماغ ہیں پر نفرتوں کے جالوں سے

یہ افتخار ہے تیرا کہ میرے عرش مقام
تو ہمکلام رہا ہے زمین والوں سے

مگر یہ مفتی و واعظ یہ محتسب یہ فقیہہ
جو معتبر ہیں فقط مصلحت کی چالوں سے

خدا کے نام کو بیچیں مگر خدا نہ کرے
اغذیہ پیر ہوں خلق خدا کے نالوں سے

ہے ترش رُو مری باتوں سے صاحب منبر
خطیب شہر ہے برہم مرے سوالوں سے

نہ میری آنکھ میں کاجل نہ مشکبو ہے لباس
کہ میرے دل کا ہے رشتہ خراب حالوں سے

میرے ضمیر نے قابیل کو نہیں بخشا
میں کیسے صلح کروں قتل کرنے والوں سے

وہ سادہ دل ہیں کہ تشنہ بن جو رکھتے ہیں
امید آب بقا زہر کے پیالوں سے

میں بے بساط سا شاعر ہوں پر کرم تیرا
کہ باشرف ہوں قبا و کلاہ والوں سے

غزل

شاہد رتلامی

نہ کر خدا کے لئے التفات رہنے دے
مری حیات میں کچھ حادثات رہنے دے

فریب دیتا رقیبوں کو زیب دیتا ہے
رفیق بن کے نہ کر مجھ سے گھات رہنے دے

عجب نہیں کہ یہ کھنڈرات منہ سے بول اٹھیں
نہ چھیڑ گزرے ہوئے واقعات رہنے دے

مری حیات کی رنگینیوں کو توڑے جا!
اور اپنے رنج و الم میرے ساتھ رہنے دے

ابھی وجود و عدم کا شعور پیدا کر
ہنوز مرحلۂ جسم و ذات رہنے دے

تری حیات کا کھل جائے گا بھرم شاہد
نہ کہہ کسی سے کبھی دل کی بات رہنے دے

مسز مسعودہ اختر منظور
معمار واری سرینگر

وسعتِ امکاں

ظلمتِ انساں میں شمعیں جلا سکتی ہوں میں
زندگی کے مقبرہ کو [illegible] دکھا سکتی ہوں میں

سامنے میرے ٹھہر سکتے نہیں ماہ و نجوم
شمع [illegible] سکتی ہوں میں

اک اشارے سے میرے بدلی ہوئی عالم کا نقشہ
اک صدا [illegible] سکتی ہوں میں

بانیِ قسمت [illegible]
[illegible] انساں کو جتا سکتی ہوں میں

میرے شہپر پرواز تصور کا جہاں ہے عرش تک
آسماں پر [illegible] چھا سکتی ہوں میں

دست و بازو [illegible] دنیا ظلم کی
دھجیاں [illegible] اڑا سکتی ہوں میں

[illegible] تاریکیاں ڈرتی ہیں میرے نام سے
علم و فن [illegible] ہوں میں

[illegible] میرے [illegible] عزم طوفانی [illegible]
خود [illegible] بجلی [illegible] گرا سکتی ہوں میں

[illegible] ستارے جس کے سوز و ساز سے
[illegible] سنا سکتی ہوں میں

قائم کردار عزم و آسیہ لا تقنطوا
خار زار [illegible] سکتی ہوں میں

[illegible] آنکھوں سے آنسو پونچھ کر تسکین سے
زندگی [illegible] بنا سکتی ہوں میں

رحمتِ حق جوش میں آجائے میری آہ سے
باب رحمت [illegible] کلیوں کو کھلا سکتی ہوں میں

الغرض اس شور باقی ہی نہ رہنے پائے گا
جام کوثر تشنہ کاموں کو پلا سکتی ہوں میں

زہرہ و ناہید کے نغمے ہوں جس سے شرمسار
تیغ کے سائے میں وہ بھی گیت گا سکتی ہوں میں

یہ نہیں ممکن کہ دیکھوں ظالم و مظلوم کو
ہر زمانہ پر وقت پر خنجر اٹھا سکتی ہوں میں

ظلمتیں منظور چھا جائیں اگر ماحول پر
[illegible] جگمگا سکتی ہوں میں

چکبست کی شاعری

مس بدرجہاں علی گڑھ

پنڈت برج نرائن چکبست ۱۹ر جنوری ۱۸۸۲ء کو محلہ راٹھ حویلی فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ چکبست کے آباؤ اجداد نے پندرھویں صدی میں اپنے وطن کشمیر کو خیرباد کہہ کر لکھنؤ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ چکبست کی عمر صرف پانچ برس تھی کہ والد کا انتقال ہوگیا مجبوراً ان کی والدہ اپنے بھائی پنڈت لالتا پرشاد کے یہاں قیام پذیر ہوئیں۔ جو لکھنؤ میں ملازمت کرتے تھے۔ اور کشمیری محلہ میں جن کا قیام تھا۔ چکبست کی ابتدائی تعلیم اردو فارسی سے ہوئی۔ ۱۸۹۵ء میں کالون اسکول میں داخل ہوئے اور ۱۸۹۷ء میں مڈل پاس کیا۔ اس کے بعد گورنمنٹ جوبلی کالجیٹ سے ۱۹۰۰ء میں ہائی اسکول کیا۔ کیننگ کالج سے ۱۹۰۲ء میں ایف اے اور ۱۹۰۵ء میں بی اے اور ۱۹۰۷ء میں ایل ایل بی کیا۔ شہنشاہ حسین رضوی ایڈوکیٹ کے ساتھ ٹریننگ لینا شروع کی۔ اور انھیں کے ساتھ وکالت کرنی شروع کر دی۔

چکبست کو شاعری کا شوق بچپن سے تھا جو کبھی قوم کے نوحہ کی شکل۔ کبھی احباب کے مرثیہ کی شکل میں۔ کبھی غزل اور نظم کی صورت میں رفتہ رفتہ چلا آتا گیا۔ چکبست نے بہت ہی سنجیدہ و متین طبیعت پائی تھی لیکن ذرا ان کی شوخ مزاجی کی بھی ایک جھلک دیکھئے۔ اپنے ہم پیشہ وکیلوں کی حالت زار کیسے کر بیان کرتے ہیں۔

مرتے دم جب ملک الموت مقابل آیا
دل ناشاد یہ سمجھا کہ مؤکل آیا

وکیل صاحب کے دفتر کا بھی تو نقشہ ملاحظہ ہو:۔

کرسی سے عیاں لرزش یک پائی ہے
میز ایسی ہے گویا کہ پڑی پائی ہے
قانون کا غم ہے نہ مؤکل کا گزر
آفس بھی عجب گوشۂ تنہائی ہے

۱۲ر فروری ۱۹۲۶ء کو ایک مقدمہ کی پیروی کے سلسلہ میں رائے بریلی گئے۔ مقدمہ کی بحث کی۔ واپس لکھنؤ آتے ہوئے ٹرین ہی میں فالج کا حملہ ہوا۔ جو دوست ساتھ تھے۔ انہوں نے اسٹیشن پہ ہی اتار لیا۔ ڈاکٹر آئے مگر دل کی نبضیں چھوٹ گئیں اور چارہ گر دیکھا کئے۔

سات بجے شام کو رائے بریلی اسٹیشن پر ہی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ بڑے بھائی کو اطلاع کی گئی۔ تب رات کو گیارہ بجے موٹر سے ان کی لاش لکھنؤ لائی گئی۔ شہر میں کہرام مچ گیا۔ کچہریاں بند ہوگئیں۔ لوگوں نے قطعات کہے۔ وفات کی تاریخیں نکالیں۔ محشر لکھنوی نے انھیں کے مصرعہ سے تاریخ وفات نکالا ہے۔

کیسی بے وقت اجل آگئی محشرؔ افسوس
روح رخصت ہوئی ایک لفظ کہا اور نہ سنا
ان کے ہی مصرعہ سے تاریخ ہے ہمراہ عزا
موت کیا ہے انھیں اجزا کا پریشاں ہونا

تلوک چند محرومؔ یوں مرثیہ کناں ہوتے ہیں۔

خموش اگرچہ ہوا وہ فدائے حبِّ وطن
ہوا میں گونجتے ہیں نالہ ہائے حبِّ وطن
نہ کیوں مناظرِ حسرت دکھائے حبِّ وطن
کہ ماتمی ہے ہوائے فضائے حبِّ وطن
وطن کو تیری ضرورت تھی آہ اے چکبست
چلا ہے مر کے عدم کی تو راہ اے چکبست
سخنوری کا تری سب سے ہے جدا آئین
سخن کو رنگِ حقیقت سے کر دیا رنگین
اگرچہ ہیں شعر فصاحت میں تیری نسبت میں
تو شان تحریر میں کوہ گراں سے ہیں سنگیں
ملا جو فیض ازل اس کی قدر کی تو نے
سنوار لیا تجھ سے نظم اردو نے

زباں پہ جب کبھی آتا تھا لکھنؤ کا نام
تو اس خیال سے رہتا تھا خوش دلِ ناکام
کبھی تو آئے گی ایسی سعادتِ ایام
ملیں گے حضرت چکبست سے یہ شوق تمام
ملیں گے اب بھی مگر کب؟ کہاں، کیونکر؟
یہ راز اپنی نگاہوں سے ہے نہاں یکسر

شاعر نے آخری شعر میں درد کا سمندر سمیٹ لیا ہے۔

ملیں گے اب بھی مگر کب؟ کہاں؟ کیونکر!
یہ راز اپنی نگاہوں سے ہے نہاں یکسر

منشی دیا نرائن نگم لکھتے ہیں۔

"۱۹۲۶ء کے آخری مہینوں میں قومی بزم کے لئے میں نے ایک مناسب نظم کی فرمائش کی تو مرحوم نے ایک نظم جو بزرگ کا نام بابو گنگا پرشاد ورما مرحوم کی یادگار لائبریری کے افتتاح کے موقع پر لکھی گئی تھی۔ بدیہ ناظرین "زمانہ" کی اور لکھا چاہئے "زمانہ" مجھے بھول جائے مگر میں "زمانہ" کو نہیں بھول سکتا۔ اس وقت کس کو معلوم تھا کہ اب چکبست "زمانہ" پر مزید احسانات کے لئے اس دنیا میں باقی نہ رہیں گے۔ تاہم چکبست نے ہمیں قدر کلام چھوڑا ہے۔ وہ ابدالآباد تک آئندہ نسلوں سے خراج تحسین وصول کرتا رہے گا لوگ پڑھیں گے اور سر دھنیں گے۔

چکبست کی شاعری کے وہ کون سے عناصر ہیں جن پر لوگ سر دھنیں گے؟ اس سوال کا جواب پانے کے لئے چکبست کی شاعری کا جائزہ لینا ہوگا۔ کسی بھی شاعر کی شاعری کو اس کے عہد کے پس منظر میں دیکھنا چاہئے۔ چکبست کس عہد کے شاعر تھے۔ اس کی نشاندہی کرتے ہوئے سید احتشام حسین لکھتے ہیں۔

"۱۹۱۷ء تک ہندوستان برطانیہ کی محبت میں سرشار تھا۔ اس کے دامن سے لپٹا ہوا تھا۔ چکبست اسی دور کے شاعر تھے جب وطن سے مست و بیخود۔ ہندوستان کا بھلا چاہتے تھے۔ پرانی رسمیں ترک کرنے پر اکساتے اور معاشرت میں تبدیلیاں چاہتے تھے ان کے پاس ایک اثر انگیز زبان تھی۔ اور ایک دردمند دل اس لئے وہ اپنے پیاموں میں رنگا رنگ جلوے بھر دیتے تھے اپنے دل کی گرمی اور سینہ کا گداز منتقل کر دیتے تھے۔ ہماری غلطی ہوگی اگر ہم ان کے یہاں کوئی سیاسی فلسفہ تلاش کریں۔ اگر ہم ان سے عصرِ حاضر کے جمہوری نظریہ کا شاعرانہ بیان سننا چاہیں۔ ان کے خیالات و جذبات اس ہندوستان سے وابستہ تھے جس میں گوکھلے اور بپن چندر کی آواز گونج رہی تھی۔ جنہوں نے حب وطن کا درس دے کر ایک اصلاحی پروگرام ہندوستان کے سامنے رکھا تھا"۳۔

مندرجہ بالا نظریہ کی روشنی میں کلام چکبست کا جائزہ لینے سے قبل میں جگر بریلوی کا ایک اقتباس پیش کروں گی لکھتے ہیں۔

"دنیا کی قوموں کی قدر و منزلت ان کے اخلاق و تہذیب کرتی ہے۔ خزانوں سے نہیں۔ شاعری قوموں کے اخلاق و تہذیب کا بہترین معیار ہے اس لئے شاعر کا فرض ہے کہ اسے اپنی قوم کی ذاتی جوہر کا محافظ بنائے۔ اور مذموم اثرات سے بچائے رکھے۔

آگے چل کر لکھتے ہیں۔

"شاعر کا مشن یا مقصد کیا ہے؟ شاعر کا مقصد نہایت اہم اور عظیم ذمہ داری کے لئے ہوئے ہے۔ شاعر اپنی قوم کی قوت ہوا اخلاق اور تہذیب کا محافظ ہے۔ وہ اپنی قوم کا سپہ سالار معلم اور پاسبان ہے۔

وہ قوم کے بہادروں کو زندہ رکھتا ہے۔ ان کے کارناموں کے نغموں سے اپنی قوم کے دلوں میں قوت و جرأت قائم رکھتا ہے اخلاقی برائیوں سے قوم کو نفرت دلاتا ہے۔ ان کی اصلاح کرتا ہے دل و دماغ اور بیرونی دنیا میں نیکی تلاش کرتا ہے اور یہی سبق قوم کو سکھاتا ہے۔ سچے شاعر کی آواز سے جذبات اسفل ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں۔ طبیعت کو رفعت و پاکیزگی دل کو سرور روح کو کیف حاصل ہوتا ہے۔"۵

سچے شاعر کی جو تعریف جگر بریلوی نے کی ہے۔ ان خصوصیات کو مد نظر رکھتے ہوئے جب ہم کلام چکبست کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ تمام خصوصیات بدرجۂ اتم پاتے ہیں۔ وطن کی محبت شاعر کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ جس کا اندازہ سب سے پہلے اس بات سے ہوتا ہے کہ چکبست نے اپنے مجموعۂ کلام کا نام "صبح وطن" رکھا۔ اور "صبح وطن" کی ابتدا ترانہ اور روح سے ہوتی ہے۔ ترانہ روح مشہور حب وطن حضرت لبش نرائن در کا مرثیہ ہے۔ ایک کہتے ہیں

ترا ہندوستاں دل سے بھر گیا اُبھار
ماتم کر رہے ہیں چمن ترا

قدر کرنا حریتِ بیکس یہی ایمان رہا
یہی مسلک یہی مذہب یہی ایمان رہا

آبرو کیا ہے تمنائے وفا میں مرتا
دین کیا ہے کسی کامل کی پرستش کرتا

شاعر کو اپنے وطن کی ہر ہر شے سے پیار ہے۔ ان کا ذکر کرنے کے بعد وہ ماضی کا قصہ دلنشیں چھیڑ دیتا ہے۔

اس خاکِ دلنشیں سے چشمے ہوئے وہ جاری
چین و عرب میں جن سے ہوتی تھی آبیاری
سارے جہاں پہ جب تھا وحشت کا ابر طاری
چشم و چراغِ عالم تھی سرزمیں ہماری
شمعِ ادب نہ تھی جب یوناں کی انجمن میں
تاباں تھا مہرِ دانش اس وادیٔ کہن میں

شاعر گوتم، سرمد، اکبر، داتا ان سب کے کارنامے بیان کرتا ہے لیکن شاعر ایک بات سے بڑا غمگین ہو جاتا ہے کہ اپنے وطن میں سب کچھ ماضی جیسا ہے۔ مگر ایک اہم شے کا فقدان ہو گیا ہے۔ اور وہ ہے حبِ وطن۔

اگلی سی تازگی ہے پھولوں میں اور پھلوں میں
کرتے ہیں رقص اب تک طاؤس جنگلوں میں
سی اب تک وہی کڑک ہے بجلی کے بادلوں میں
آگئی ہے پر دل کے حوصلوں میں
گل شمعِ انجمن ہے گو انجمن وہی ہے
حبِ وطن نہیں ہے خاکِ وطن وہی ہے

حبِ وطن کی عدم موجودگی کے باعث ہر شعبۂ زندگی زوال آمادہ ہے۔

ع علم و کمالِ ایماں برباد ہو رہے ہیں

لیکن اہلِ وطن کی لاپرواہی اس درجہ بڑھ گئی ہے کہ اس حالت کو بدلنے کے لئے قطعاً کوشاں نہیں بالکل غافل ہے۔

ع عیش و طرب کے بندے غفلت میں سو رہے ہیں

اس لئے شاعر صورِ حبِ قومی سے لوگوں کو جگانا چاہتا ہے۔

اے صورِ حبِ قومی اس خواب سے جگا دے
بھولا ہوا فسانہ کانوں کو پھر سنا دے
مردہ طبیعتوں کی افسردگی مٹا دے
اٹھتے ہوئے شرارے اس راکھ میں دکھا دے
حبِ وطن سمائے آنکھوں میں نور ہو کر
سر میں خمار ہو کر دل میں سرور ہو کر

آخری بند میں شاعر کی آرزو اپنے درجۂ کمال کو پہونچ جاتی ہے۔

ہے جوئے شیر ہم کو نورِ سحر وطن کا
آنکھوں کی روشنی ہے جلوہ اس انجمن کا
ہے رشکِ مہر ذرہ اس منزلِ کہن کا
تکتا ہے برگِ گل سے کانٹا بھی اس چمن کا
گرد و غبار یاں کا خلعت ہے اپنے تن کا
مر کر بھی چاہتے ہیں خاکِ وطن کفن کا

پھول مالا کے عنوان سے جو نظم آپ نے لکھی ہے اس کے بارے میں جگر بریلوی یوں رقمطراز ہیں۔

یہ نظم اس قابل ہے کہ ہر ہندوستانی گھر میں تعویذ بنا کر رکھی جائے۔ اور اس کا مطالعہ ہر بچی پر فرض قرار دے دیا جائے۔

چکبست عورتوں کی تعلیم کے دل سے خواہاں تھے۔ اکتوبر ۱۹۱۱ء میں چکبست نے ایک رسالہ صبحِ امید کے نام سے نکالنا شروع کیا تھا۔ صبحِ امید کے اداریہ نوٹ میں عورتوں کے مسئلہ پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں۔

ہمارے تعلیم یافتہ نوجوان کالج کے ایوان سے مل (Mill) کے فلسفہ کی ہوا میں اڑتے ہوئے نکلتے ہیں۔ اور بعض ہربرٹ سپنسر کا دامن چھو آتے ہیں یہ آزادی و اصلاح کے فرشتے جلسوں اور کانفرنسوں میں معصوم اور بیکس عورتوں کی تصویر الفاظ کی رنگ آمیزی سے اس طرح کھینچتے ہیں کہ دیکھنے والے اور سننے والے مسکرا مسکرا کر تالیاں بجانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ مگر روز مرہ کا تجربہ بتلاتا ہے کہ ان حامیانِ آزادی کی زبان سے کتنا ہی امرت کیوں نہ ٹپکے مگر ان کے دلوں میں بیگانگی کے زہر میں بجھے ہوئے تیر و نشتر پوشیدہ ہیں۔ انہیں عورتوں کی ذات میں اعتبار نہیں۔ فارسی شاعر کے مقولہ میں ان کا عقیدہ باقی ہے کہ۔

اسپ، زن و شمشیر، وفادار کہ دید

اور وہ ابھی تک عورت کو نسلِ انسانی جزو ادنیٰ سمجھتے ہیں۔

عورتوں کو نمائش کا کھلونا بنا کر پردے سے باہر نکالنا رواج میں داخل ہو گیا ہے۔ لیکن وہ دردمند اور الفاف دل ابھی پیدا نہیں ہوئے جن میں عورت کی پاک اور روحانی ذات کی بھی وقعت گھر کر سکے۔ ان کی آنکھوں پر خودغرضی اور تعصب کی نقاب پڑی ہوئی ہے۔ جن کو ان معصوم فرشتوں کی پیشانی کے آئینہ میں نیکی اور حسن کا عکس نظر آنا چاہئے۔

اس طرز لڑکیوں سے یوں مخاطب ہوتے ہیں۔

روشِ خام پہ مردوں کی نہ جانا ہرگز
داغ تعلیم میں اپنی نہ لگانا ہرگز
نقل یورپ کی مناسب ہے مگر یاد رہے
خاک میں غیرتِ قومی نہ ملانا ہرگز
رخ سے پردہ کو اٹھایا تو بہت خوب کیا
پردہ کو دل سے ذرا اٹھانا ہرگز

آگے جب چل کر ان کا مقصدِ حیات یا ماں کے فرائض کی یاد دہانی کراتے ہیں۔

اپنے بچوں کی خبر قوم کے مردوں کو نہیں
یہ ہیں معصوم انھیں بھول نہ جانا ہرگز
پرورش قوم کی دامن میں تمہارے ہوگی
یاد اس فرض کی دل سے نہ بھلانا ہرگز
ان کی تعلیم کا مکتب ہے تمہارا زانو
پاس مردوں کے نہیں ان کا ٹھکانا ہرگز
ہم تمہیں بھول گئے اس کی سزا پاتے ہیں
تم ذرا اپنے تئیں بھول نہ جانا ہرگز

• بیوہ کی اصلاح ؛ ان کی ایک مشہور نظم ہے جو ایک کشمیری بیوہ کی شادی کے موقع پر کہی گئی تھی کس جوش کے ساتھ نظم شروع ہوتی ہے۔

مرحبا جرأتِ اصلاح دکھانے والو
قوم کے بار امانت کے اٹھانے والو
دل کی اجڑی ہوئی نگری کے بسانے والو
طورِ ہند کی بگڑی کے بنانے والو

کیسے طوفان میں دیا ہے یہ سہارا تم نے
خوب ڈوبی ہوئی کشتی کو ابھارا تم نے

• سہاگ کے بعد بیوگی خزاں بہار کے بعد خزاں نہیں تو کیا ہے! خزاں کے بعد جب دوبارہ بہار آجائے پھول کھل اٹھیں تو کیا منظر ہوتا ہے شاعر کتنی خوبصورت تشبیہوں کے پردے میں اس مدعا بیان کر رہا ہے۔

کل جسے حسن لطافت میں خزاں نے لوٹا
آج اس باغ کا شاداب ہے بوٹا بوٹا
بیڑیاں کٹ کے گریں قفلِ اسیری ٹوٹا
چاند معصوم کی قسمت کا گہن سے چھوٹا

تم بھی خود شاد ہوئے قوم کو بھی شاد کیا
دل کے ویران شوالے کو پھر آباد کیا

بیوہ کی شادی کی ہمت افزائی کن خوبصورت الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

آج اس ملک میں بیوہ جو بنی جاتی ہے
خاک میں بنتِ دیر نہ ملی جاتی ہے
رحم کا راج ہے ہمارا سنگدل جاتی ہے
یاں کلی دل کی محبت سے کھلی جاتی ہے

مرد قوموں کو سبق یوں ہی سکھا دیتے ہیں
دل میں جو ٹھانتے ہیں کر کے دکھا دیتے ہیں

آئینہ پیران طریقت یہ تماشہ دیکھیں
ہاں شیخ و فقیہ کا اٹھتا ہوا پردہ دیکھیں
جوش اصلاح کا بہتا ہوا دریا دیکھیں
پار ہوتے ہوئے مظلوم کا بیڑا دیکھیں

دیکھ لیں دھرم کی اس قوم میں غیرت باقی ہے
ان رگوں میں ابھی رشیوں کا لہو باقی ہے

لڑکا لڑکی کے عنوان سے جو نظم چکبست نے لکھی ہے۔ وہ علاوہ لطافت و پاکیزگی کی ایک عمدہ مثال ہے۔

تو وہ مخلوق ہے بے خلقت میں نہیں جن کی گناہ
لی ہے قالب میں ترے روح محبت میں پناہ
تری صورت سے عیاں ہوتی ہے انسان کی چاہ
رس بھری آنکھ ہے [illegible]

نقش ہے دل پہ مرے وہی صورت تیری
خوب دنیا کے شوالے میں ہے صورت تیری

اگلے بند میں شام کا کیا دلکش نقشہ کھینچا ہے۔

دیکھئے جنگل میں کوئی شام کو تیری رفتار
بے پئے جیسے کسی کو ہو جوانی کا خمار
مست کر دیتی ہے شاید تجھے قدرت کی بہار
وہ اترتی ہوئی دھوپ اور وہ سبزہ کا نکھار
ایک ایک گام پہ شوخی سے مچلنا تیرا
کھا کے جنگل کی ہوا جھوم کے چلنا تیرا

لہلہاتی ہوئی کھیتی کو گائے کے بچوں کے لہو اور پسینہ کی بہار کہنا کیا شاعرانہ تخیل ہے۔

تیرے بچوں نے کیا اپنے تئیں ہم پہ نثار
اپنی گردن پہ لیا پرورش قوم کا بار
نظر آتی ہے جو ہر فصل میں کھیتی تیار
ہے یہ سب اُن کے لہو اور پسینہ کی بہار
ان کو منظور نہ ہوتا جو مٹانا اپنا
ہند کی خاک اگلتی نہ خزانہ اپنا

ان کی منظور نظم ہے اور منظر نگاری کا لاجواب نمونہ ہے۔

سنا جو کرتے تھے وہ باغ پر فضا ہے یہی
اگر بہاڑ ہیں جنت تو راستہ ہے یہی
لباس پہنے ہیں گل سنگ و خشت سبزہ کا
بجائے خاک اڑاتا ہے رنگ سبزہ کا
کمی کبھی نہیں شادابیوں کے ساماں میں
ٹھہر گئی ہے بہار اس گلستاں میں
طلسم حسن کا بیچ میں یہ گلدستہ
کھڑے ہیں کوہ و شجر پہلوؤں میں صف بستہ
یہاں جو آکے مسافر مقام کرتے ہیں
یہ سنتری انھیں پہلے سلام کرتے ہیں
نگاہ کو دور سے پانی ہے جو نظر آتا
سپید ناگ چلا جا رہا ہے بل کھاتا

"راماین کا ایک سین" ایک بہت ہی خوبصورت نظم ہے۔ محمد حسین ادیب لکھتے ہیں۔

"چکبست کا سب سے روشن اور قابل یادگار کارنامہ راماین کا ایک سین ہے زبان کی صفائی، بیان کی رنگینی تشبیہ و استعارے کی لطافت و شیرینی درد و غم کے جذبات کی فراوانی کے لحاظ سے یہ نظم. میر انیس کے بہترین مرثیوں سے ٹکرکھاتی ہے۔ یہاں شاعر نے ہیرو بھی ایک عظیم الشان ہستی کو منتخب کیا ہے۔ جس کے ساتھ کروڑوں بندگان خدا کی مذہبی عقیدت وارادت وابستہ ہے۔ یہ پوری مسدس حد درجہ پُر درد و موثر ہے۔ مذہبی لگاوٹ کی وجہ سے ادب و اخلاق پر بھی اس کا زبردست اثر پڑتا ہے۔ فرزند کی اطاعت گزاری و فرمانبرداری، ماں کی دردمندی و بیقراری کی جو تصویر پیش کی گئی ہے وہ جذبات نگاری کا اعلیٰ نمونہ ہے اگرچہ واقعہ انفرادی و مقامی ہے مگر شاعر نے اسے عمومی رنگ میں پیش کیا ہے۔ جس سے ہر مصیبت زدہ شخص تسکین وتسلی حاصل کرسکتا ہے۔ کاش چکبست رامائن کی پوری داستان کو تفصیل سے نہیں تو اختصار کے ساتھ نظم اردو کے قالب میں ڈھال دیتے تو ان کا یہ ایک غیر فانی کارنامہ ہوتا۔ تلسی داس کی طرح ان کے سر پر بھی شہرت و مقبولیت کا زرنگار تاج ہمیشہ جگمگاتا رہتا ہے۔

اس نظم کے بارے میں جگر بریلوی یوں رقمطراز ہیں۔

رامائن کے اکثر واقعات چکبست سے پیشتر بھی شاعروں نے نظم کئے ہیں۔ مگر حق یہ ہے کہ جس خوبی سے چکبست نے یہ سین نظم کیا ہے۔

اس میں تصنیف کی بشان پیدا ہونے کے علاوہ آپ کی شاعری کے تمام جوہر اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ جگمگا رہے ہیں۔ سوز وگداز کا وہ عالم ہے کہ ہر مصرعہ پر ایک ہوک سی اٹھتی ہے

اول تو جذبات نگاری یوں ہی نہایت دشوار امر ہے۔ پھر یہ موقع تو ایسے لطیف جذبات سے مالا مال ہے۔ جن کا قلم کرنا تو درکنار سمجھنا بھی آسان نہیں۔ یہی اکیلی نظم مصنف کے کمال شہادت کی دلیل کافی ہے۔

جب رام اپنے والد سے اجازت حاصل کر کے ماں کی زیارت کے لئے گھر میں آتے ہیں تو اس وقت ماں کی کیا کیفیت ہے۔

دل کو سنبھالتا ہوا آخر وہ نونہال
خاموش ماں کے پاس گیا صورتِ خیال
دیکھا تو ایک در میں ہے بیٹھی وہ خستہ حال
سکتا سا ہو گیا ہے یہ ہے صورتِ ملال
تن میں لہو کا نام نہیں زرد رنگ ہے
گویا بشر نہیں کوئی تصویرِ سنگ ہے

سکتا سا اس لفظ "سا" نے مفہوم کی پوری تصویر ایک جنبشِ قلم کھینچ کر رکھ دی ہے۔ بیت میں تصویرِ سنگ سکتہ کا ایک بت پیش کر رہا ہے۔ اگلے بند میں ماں کے جذبات کی یوں تصویر کشی کرتے ہیں۔

کیا جانے کس خیال میں گم تھی وہ بے گناہ
نورِ نظر پہ دیدۂ حسرت سے کی نگاہ
جنبش ہوئی لبوں کو بھری ایک سرد آہ
لی گوشہ ہائے چشم سے اشکوں نے رخ کی راہ
چہرہ کا رنگ حالتِ دل کھولنے لگا
ہر موئے تن زباں کی طرح بولنے لگا

ڈاکٹر افضال احمد لکھتے ہیں۔
چکبست عورت کے صحیح جذبات جس طرح پیش کرتے ہیں۔ اس کو پڑھ کر میر انیس کا کلام یاد آجاتا ہے۔ عورت کی نفسیاتی کمزوری ہوتی ہے۔ وہ انتہائے غم کی حالت میں طنز و تعریض سے کام لیتی ہے رام کی ماں کوشلیا بھی بھرت کی ماں کیکئی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یوں گویا ہوتی ہے۔

دنیا کا ہو گیا ہے یہ کیسا لہو سفید
اندھا کئے ہوئے ہے زر و مال کی امید
انجام کیا ہو کوئی نہیں جانتا یہ بھید
سوچے بشر تو جسم ہو لرزاں مثالِ بید
لکھی ہے کیا حیات ابد ان کے واسطے
پھیلا رہے ہیں جال یہ کس دن کے واسطے

رام چندر جی ماں کو سمجھاتے ہیں

اسباب ظاہری پہ نہ ان پر کرو نظر
کیا جانے کیا ہے پردۂ قدرت میں جلوہ گر
خاص اس کی مصلحت کوئی پہچانتا نہیں
منظور کیا اسے ہے کوئی جانتا نہیں

لیکن رام کے سمجھانے کا ماں پر کیا اثر ہوتا ہے ملاحظہ فرمائیے

یہ گفتگو ذرا نہ ہوئی ماں پہ کارگر
ہنس کر بغور پاس سے لڑکے پہ کی نظر
چہرہ پہ یوں ہنسی کا نمایاں ہوا اثر
جس طرح چاندنی کا ہو شمشان میں گزر
پنہاں جو بے کسی تھی وہ چہرہ پہ چھا گئی
جو دل کی مردنی تھی نگاہوں میں آ گئی

پھر یہ کہا کہ میں نے سنی سب یہ داستاں
لاکھوں برس کی عمر ہو دیتے ہوئے ماں کو گیاں
لیکن جو میرے دل کو ہے درپیش امتحاں
سچ ہے جو اس کا علم نہیں تم کو بے گماں
اس درد کا شریک تمہارا جگر نہیں
کچھ مامتا کی آنچ کی تم کو خبر نہیں

آخر رام وہ زوردار دلیل پیش کرتے ہیں۔

کہتے ہیں جس کو دھرم وہ دنیا کا ہے چراغ
ہٹ جاؤں اس روش سے تو کُل میں لگے گا داغ
بے آبرو یہ بنس نہ ہو یہ ہراس ہے
جس گود میں پلا ہوں مجھے اس کا پاس ہے

یہ دلیل وزنی تھی ماں پہ کارگر ہو گئی مگر کتنے درد بھرے لفظوں میں اجازت دے رہی ہے کیا حسرت و یاس سے کیسی بے بسی سے، کیا لطیف ناراضگی کا پہلو بھی موجود ہے۔

ان آنسوؤں کی قدر نہیں کچھ ابھی نہیں
باتوں سے جو بجھے ۔ وہ دل کی لگی نہیں
لیکن تمہیں ہو رنج یہ میری خوشی نہیں
جاؤ سدھارو خوش رہو میں دکھی نہیں

دنیا میں بے حیائی سے زندہ رہوں گی میں
پالا ہے میں نے تم کو تو دکھ بھی سہوں گی میں

بقول ڈاکٹر افضال ا

ان کے کلام کا درد و اثر، الفاظ کی رنگینی اور اشعار میں جوش و خروش ان کو اردو ادب میں ایک خاص مقام پر لا کھڑا کر دیتے ہیں ان کے زمانہ کی حالت کا اگر مکمل اور واضح طور پر جائزہ لینا ہو تو ان کی شاعری اس کا آئینہ ہوگی ۔ اس لئے چکبست اپنے دور کے صف اول کے شعراء میں بھی ممتاز نظر آتے ہیں ۔

لالہ سری رام مصنف "خمخانۂ جاوید" کو چکبست ایک خط میں لکھتے ہیں ۔

"میرا عقیدہ یہ ہے کہ محض نئے خیالات کو توڑ موڑ کر نظم کر دینا ہی شاعری نہیں ہے ۔ میری دانست میں خیالات کی تازگی کے ساتھ زبان و بیان میں شاعرانہ لطافت اور الفاظ میں تاثیر کا جوہر ہونا ضروری ہے"

چکبست کے کلام کا جائزہ لینے کے بعد ہم اسی نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ شاعری کے متعلق چکبست کا جو خیال ہے ان کی شاعری اس خیال کا آئینہ ہے ۔

سید محمد حسین ادیب لکھتے ہیں ۔

چکبست نے اپنی شاعری کے دامن کو پست خیالات مبتذل مضامین، محاورہ بندی، عام بول چال کی زبان سے ملوث نہیں کیا ان کی زبان پر لکھنؤ کی ٹکسال کی مہر ہے ۔ کلام میں شعریت لطافت، پاکیزگی صحت صفائی اور روانی کے جوہر موجود ہیں تشبیہات و استعارات کی شگفتگی اور دلآویزی مسلم ہے خیالات نئے ضرور ہیں لیکن انداز بیان میں قدیم شاعری کی رنگینی و لطافت ملحوظ رکھی گئی ہے الغرض چکبست نے جدید شراب کو قدیم ابریق میں پیش کیا ہے اردو شاعری میں چکبست کس مقام کے مالک ہیں ۔

بقول سید محمد حسین ادیب

اگر چکبست کے اس حصہ شاعری سے قطع نظر کر لیا جائے جس میں انھوں نے قدیم مشائخ رسم کی پیروی کی ہے تو ان کا بقیہ کلام معیار زندگی کے معیار پر پورا اترتا ہے اگرچہ چکبست کو میر و مرزا آتش و ناسخ غالب و مومن جیسے باکمالوں کے پہلو میں جگہ نہیں پا سکتی تاہم جدید شاعروں کے زمرہ میں جہاں آج تک بجز اقبال کے اور کوئی شاعر قدیم اساتذہ سخن کا ہم پلہ پیدا نہیں ہو سکا ۔ چکبست ایک نمایاں حیثیت رکھتے ہیں ۔ شاعری کے آفتاب و ماہتاب نہ سہی لیکن ایک روشن ستارے ضرور ہیں ۔

بقیہ : اپنے دل گیر پیاروں سے شرمندہ ہوں

کیا خبر تھی کہ اے شہر کے زادگاں
کل بھی غاصب کے ہم تخت بردار تھے
ایک آمر کی دستار کے واسطے
جیسے برطانوی راج میں گورکھے
جیسے سفاک گورے تھے ویتنام میں
ہم نے دیکھے ہیں جمہور کے قافلے
پیڑیوں پر جمی پیڑیاں خون کی
کل تمہارے لئے پیار سینوں میں تھا

ہم علامت بنے گئے شب تار کی
آج بھی پاس داری ہے دربار کی
سب کی شہ رگ پہ ہے نوک تلوار کی
وحشتوں کے چلن عام ان کے بھی تھے
حق پرستوں پہ الزام ان کے بھی تھے
ان کے ہاتھوں میں پرچم بغاوت کے تھے؟
کہہ رہی ہیں کہ منظر قیامت کے ہیں
اب جو شعلے اٹھے ہیں وہ نفرت کے ہیں

احمد فراز

اپنے دلگیر پیاروں سے شرمندہ ہوں

میں نے اب تک تمہارے قصیدے لکھے
اور آج اپنے نغموں سے شرمندہ ہوں
اپنے شعروں کی حرمت سے ہوں منفعل
اپنے فن کے تقاضوں سے شرمندہ ہوں
اپنے دلگیر پیاروں سے شرمندہ ہوں

جب کبھی مری غم زدہ خاک پر
سایۂ غیر یا دستِ دشمن پڑا
جب بھی قاتل مقابل صف آرا ہوئے
سرحدوں پر مری جب کبھی رن پڑا
میرا خونِ جگر تھا کہ حرفِ ہنر
نذر میں نے کیا مجھ سے جو بن پڑا
آنسوؤں سے تمہیں الوداعیں کہیں
رزم گاہوں نے جب بھی پکارا تمہیں
تم ظفرمند تو خیر کیا لوٹتے
ہار نے بھی نہ جی سے اتارا تمہیں
تم نے جاں کے عوض آبرو بیچ دی
ہم نے پھر بھی کیا ہے گوارا تمہیں
سینہ چاکانِ مشرق بھی اپنے ہی تھے
جن کا خوں منہ پہ ملنے کو تم آئے تھے
مامتا کی تقدیس کو لوٹنے
یا بغاوت کچلنے کو تم آئے تھے
اس کا انجام جو بھی ہوا سو ہوا
شب گئی خواب ہائے پریشاں گئے
کس جلال و رعونت سے وارد ہوئے
کس خجالت سے تم سوئے زنداں گئے
تیغ در دست و کف در دہاں آئے تھے
طوق در گردن و پا بہ جولاں گئے
پھر بھی میں نے تمہیں بے خطا ہی کہا
خلقتِ شہر کی دلدہی کے لیے
گو مرے شعر زخموں کے مرہم نہ تھے
پھر بھی اک سعیِ چارہ گری کے لیے
اپنی بے آسرا خاک کے واسطے
اپنے بے آس لوگوں کے جی کے لیے
یاد ہوں گے تمہیں پھر وہ ایام بھی
تم اسیری سے جب لوٹ کر آئے تھے
ہم دریدہ جگر راستوں میں کھڑے
اپنے دل اپنی آنکھوں میں بھر لائے تھے
اپنی تحقیر کی تلخیاں بھول کر
تم پہ توقیر کے پھول برسائے تھے
میں نے اب تک تمہارے قصیدے لکھے
اور آج اپنے نغموں سے شرمندہ ہوں
اپنے شعروں کی حرمت سے ہوں منفعل
اپنے فن کے تقاضوں سے شرمندہ ہوں
اپنے دلگیر پیاروں سے شرمندہ ہوں

جب سے جنرلوں کو اپنوں کا خوں لگ گیا
ظلم کی سب حدیں پھاندتے آ گئے ہیں
مرگِ بنگال کے بعد بولان میں
شہریوں کے گلے کاٹنے آئے ہیں
آج سرحد سے پنجاب و مہران تک
تم نے مقتل سجائے ہیں کیوں غازیو
اتنی غارت گری کس کے ایما پہ ہے
کس کے آگے ہو تم سرنگوں غازیو

Phone: 275602 Regd-No D-(DN) 353
THE SHAN E-HIND MONTHLY NEW DELHI-110002 JLUY 1985
Regd with the Registrar of Newspaper at R No 644 57

خرید کر پڑھئے :
مانگ کر پڑھئے
یا پھر
چوری کر کے پڑھئے

Dr. Zakir Husain Library Jamia Nagar

یہ ہے ہی اتنا خوب صورت،
اتنا دل کش،
اتنا مکمل کہ اسے کسی طرح بھی
حاصل کریں کیوں کہ
یہ فیض کی شخصیت اور فن پر ایک
شان دار ادبی دستاویز ہے۔ اس میں شامل ہیں :

قیمت : پندرہ روپے

- ★ خلوت اور [redacted] کھولنے والے ذاتی نقوش۔
- ★ نادر و نایاب تصویریں۔
- ★ سدا بہار، ہزار رنگ و منتخب کلام۔
- ★ فیض کی شخصیت کے وہ ڈھکے چھپے گوشے جن پر سے پہلی بار پردہ اٹھایا گیا ہے۔
- ★ ہندوستان، پاکستان، روس اور انگلستان کے دانش وروں کی مشترکہ کاوشوں کا گلدستہ۔

ساری اردو دنیا میں شبستان کے "فیض نمبر" کا چرچا ہے

اس سے پہلے کہ اسٹاک ختم ہو جائے آج ہی اپنے قریبی نیوز ایجنٹ سے طلب کیجئے یا براہِ راست ہم سے منگوائیے۔

شبستان اردو ڈائجسٹ آصف علی روڈ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

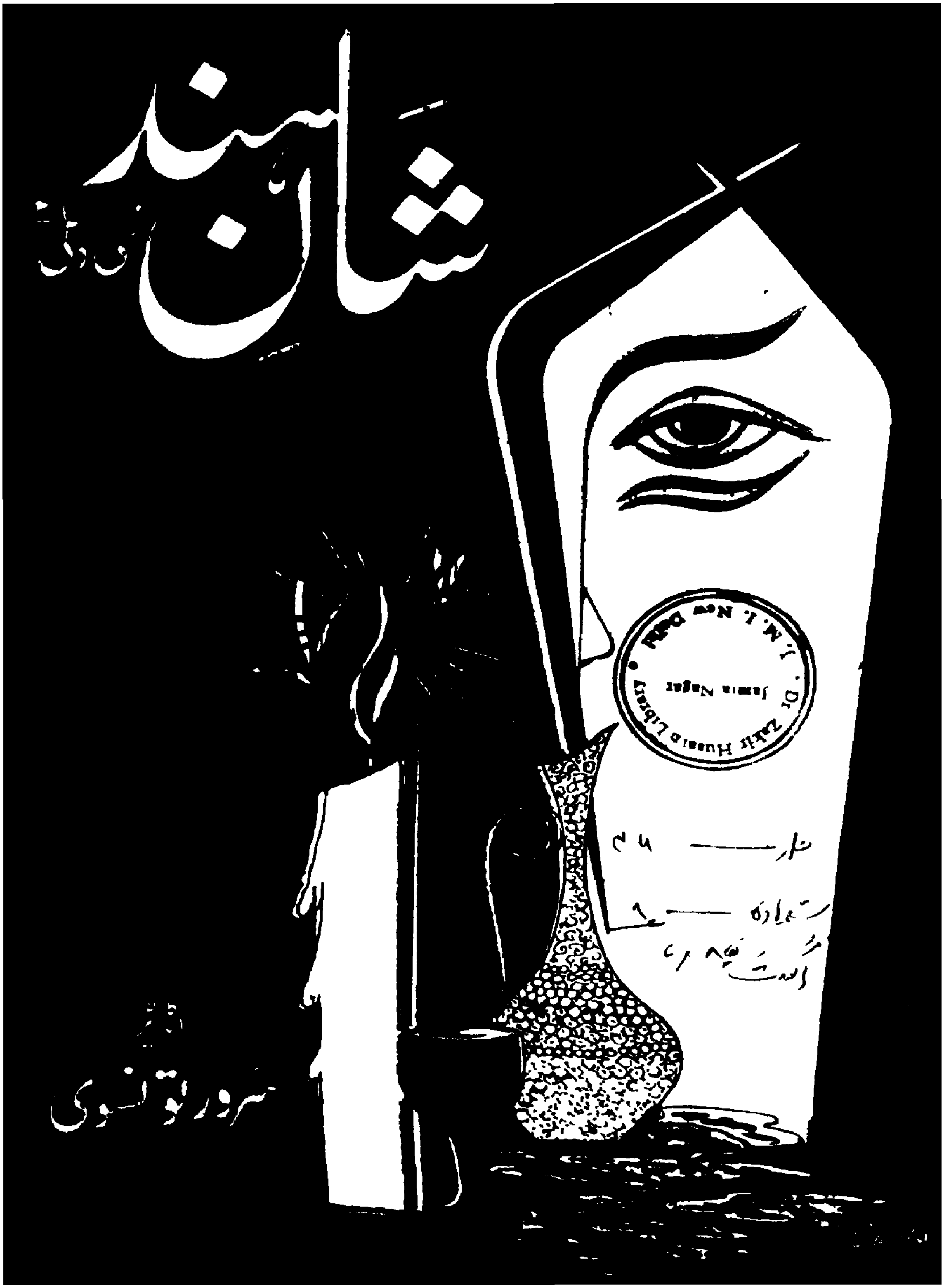

Dr. Zakir Husain Library
Jamia Nagar
J.M.I. New Delhi

غلط قسم کے
لوگوں کے
ہتھے
نہ چڑھیئے...
ریل ٹکیٹیں
دلالوں سے ہوشیار!
پبلک ریلیشنز،
ناردرن ریلوے

ٹیلیفون نمبر ۲۷۵۶۰۲ | رجسٹرار آف نیوز پیپرز انڈیا کا رجسٹریشن نمبر ۲۴۳/۵۷ | رجسٹرڈ نمبر ڈی (ڈی این) ۱۱۴

نہ ہندو پرست ہوں نہ مسلمان پرست ہوں
نہ من پرست ہوں نہ گریباں پرست ہوں

ہر ذرہ وطن سے فیاض مجھ کو پیار
یعنی وطن پرست ہوں انسان پرست ہوں
فیاض گوالیاری

ماہنامہ

شانِ ہند نئی دہلی

جشنِ جمہوریت ایڈیشن

ایڈیٹر
سرور تونسوی

فی پرچہ: تین روپے
زر سالانہ: -/۳۲ روپے

جلد نمبر ۳۶ | اگست ۱۹۸۵ء | شمارہ نمبر ۸

جان قربان کرینگے وطن کیلئے

دل میں ہیں ولولے، عزم بھی ہے جواں، اور ہمت بھی ہے ہمسفر دوستو
لاکھ خطرات ہوں شوق کی راہ میں ہم گزر جائیں گے بے خطر دوستو

جان قرباں کریں گے وطن کے لئے، ہم ہیں عاشق وطن کے وفادار ہیں
ہم کو پروا نہیں کچھ بھی انجام کی، ہم ہیں انجام سے بے خبر دوستو

آنے دیں گے نہ لغزش کبھی عزم میں سوئے منزل بڑھیں گے بصد شوق ہم
ہم نہ گھبرائیں گے آفتوں سے کبھی، ہے یہی اپنا عزم سفر دوستو

آشیانے کی بنیاد مضبوط ہے، اس کو نقصان پہنچے یہ ممکن نہیں
آئیں طوفان گو سینکڑوں سخت تر، لاکھ منڈلائیں برق و شرر دوستو

کام ہیں سب ادھورے وطن کے ابھی، جوشِ عزم و عمل کے سہارے بڑھو
شک نہیں اس میں یہ امتحاں ہے کڑا، آزمائش ہے یہ سخت تر دوستو

امتیازات کافور ہو جائیں گے، ہم نہ نفرت کریں گے کسی سے کبھی
یہ یقیں بلکہ عین الیقیں ہے ہمیں، ہند ہوگا محبت کا گھر دوستو

یہ صداقت کے سچے پرستار ہیں، ان کے دل میں ہے اخلاص و وفا کا لہو
ہیں محبت کی تصویر اہلِ وطن، پیکرِ صدق ہیں سر بسر دوستو

ہم نہ چھوڑیں گے راہِ وفا کو کبھی، ہم نہ گمراہ ہوں گے کسی طور سے
ہم ہیں نبضِ زمانہ سے بھی آشنا ہم ہیں حالات سے باخبر دوستو

پھر سے روشن کریں گے چراغِ وفا، ہر طرف نورِ راحت کا پھیلائیں گے
گلشنِ ہند میں لہلہائیں گے پھر مہر و الفت کے گلہائے تر دوستو

روشن پٹیالوی

۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء سے ۳۸ سال

۱۵ر اگست ہمیں یاد دلاتا ہے
کہ

ہم ایک ایسے آزاد ملک کے باشندے ہیں جو دنیا بھر میں اپنی کچھ روایات کے لئے مشہور ہے۔

آئیے آج ۱۵ر اگست ۱۹۸۵ء کو ہم پھر اس عہد کو دہرائیں کہ ہم اپنے ملک کی آزادی کو برقرار رکھیں گے اور کسی طور بھی ملک کا سر نیچا نہیں ہونے دیں گے

اور اپنے محبوب وزیر اعظم جناب راجیو گاندھی کے ہر ترقی پسند پروگرام کو کامیاب بنانے میں ہی اپنی ملک کی بہتری سمجھتے ہیں۔

ہندوستان زندہ باد اور ہماری آزادی پائندہ باد

نارنگ انٹرپرائیز

ایل - ۴ - کناٹ سرکس - نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

بلبل چہ گفت؟ گل چہ شنید؟ و صبا چہ کرد؟

دلی اُردو اکاڈمی

چوروں کا مال لاٹھیوں کے گز پر عمل پیرا

دلی کی آبادی ساٹھ لاکھ ہے جس میں خدا کے فضل سے اُردو کے شاعروں کی تعداد چھ صد سے زائد ہے اسی طرح ہندو
ستان میں ایک اندازے کے مطابق اُردو شعرا کی تعداد ایک لاکھ کے قریب ہے اور ملک بھر سے ہر روز [illegible] میں
کہ افراد آتے ہیں جن میں قریباً پچاس ساٹھ اُردو کے شاعر ہوتے ہیں۔
حال ہی میں دلی اُردو اکاڈمی نے دو مہمان شعرا جناب پورن سنگھ ہنر (امرتسر) اور جناب مضطرب نظامی (لکھنؤ)
از میں غالب اکیڈمی میں ایک تقریب منعقد کی۔ جس میں ان مہمان شعرا کے بارے میں تقریریں کی گئیں۔ ان شاعروں سے
ام سنا گیا اور گانے والوں نے بھی ان ہی شعرا کا کلام پیش کیا۔ ظاہر ہے کہ اس تقریب پر دلی اُردو اکاڈمی کا کئی
ہزار روپیہ صرف ہوا ہوگا۔ اور یہ دونوں شعراء بہ حیثیت مہمانِ خصوصی مدعو کیے گئے۔
جناب ہنر امرتسری اور مضطرب نظامی کے ہم پایہ شعرائے کرام کی تعداد ملک بھر میں ہزار ہا ہوگی۔ کیا اُن کا یہ مطالبہ
نہیں کہ جب وہ دہلی آئیں، تو ان کے اعزاز میں بھی اُردو اکاڈمی ایسی ہی اعزازی تقاریب کا اہتمام کرے۔
وہ کون سی مجبوریاں تھیں کہ جن سے اُردو اکاڈمی نے یہ باور کر لیا کہ اگر ان مہمان شعرا کی عزت افزائی نہیں کی
گئی تو اُردو کی نیا منجدھار میں ڈوب جائے گی۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ جناب پورن سنگھ ہنر کے بارے میں ماہنامہ
ہند میں تفصیلی طور پر (اشاعت دسمبر ۱۹۶۷ء میں)
"پورن سنگھ ہنر کی کہانی خطوط کی زبانی" عنوان سے ڈاکٹر منوہر سہائے انور کا چھ صفحات پر مشتمل ایک مضمون شائع کیا گیا۔ کچھ
اقتباس آپ بھی پڑھیے۔ یہ خطوط ہنر صاحب نے ڈاکٹر انور کے نام لکھے۔

۲۱ فروری ۱۹۵۹ء

جالندھر ریڈیو میں ۲۷ مارچ کو آل انڈیا مشاعرہ ہو رہا ہے۔ مجھے ایک تو یہ غزل جو بھیج رہا ہوں پڑھنی ہے۔ دوسرے ایک
اور ایک مطلع اس زمین میں چاہیے ..... میں بے بال ہوں۔ صرف آپ ہی مجھے پرواز بخش رہے ہیں تو اڑتا ہوں۔
ہنر صاحب: یہ بھی معلوم نہیں کہ اصل محاورہ بے بال و پر ہے (ایڈیٹر)

اپریل ۱۹۵۹ء

میں تو حضور آپ ہی کے سہارے اور رحم و کرم پر زندگی بسر کر رہا ہوں۔ آپ کے بغیر تو میری اپنی کوئی ہستی ہی نہیں ہے

مئی ۱۹۵۹ء

مانے وفا صاحب کو زمانہ طالب علمی میں دو چار غزلیں دکھائی تھیں .... مولانا تاجور کو میں نے کبھی اپنا
نہیں دکھایا۔ آپ کو تو میں صاف لکھتا ہوں کہ ۱۹۲۱ء سے آپ ہی کو کلام دکھاتا رہا ہوں جو کچھ میں لکھتا ہوں آپ

اسے بہت بلند کر کے مجھے بھیج دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ میرا کلام موزوں بھی نہیں ہوتا۔ پھر بھی آپ اپنا قیمتی وقت صرف کر کے مجھے نوازتے ہیں۔

۳ نومبر ۱۹۶۰ء

میں ماہ اکتوبر میں سرینگر کے ریڈیو مشاعرہ میں .... شامل ہوا تھا .... میرے بعد صرف ایک ہی شاعر نے کلام پڑھا۔ ۲۱ شعرائے کرام شامل تھے۔ علی گڑھ، کانپور، گورکھپور، لکھنؤ، دہلی۔ لیکن آپ کے نیازمند کو وہ داد ملی کہ توقع سے بڑھ کر تھی۔ شری کرشن موہن سے پوچھئے۔ یہ سب آپ کی توجہات بے کراں کا نتیجہ ہے۔ سرینگر کے اخبارات نے صرف میری ہی غزل کی تعریف کی ہے۔

۱۵ جنوری ۱۹۶۱ء

مجھے اسکول سے ریٹائر ہوئے ایک سال ہو گیا۔ خیال تھا کہ میں شعر و شاعری کو اپنا مشغلہ بنا کر روٹی کھاتا رہوں گا مگر آپ نے میری روٹی بند کر دی۔ اور مجھے ان ٹیوں سے محروم کر دیا جو کبھی کبھی آپ مجھے بھیج دیا کرتے تھے۔ ایک تازہ غزل بھیج رہا ہوں مہربانی کرم اسے دیکھ کر مجھے ۲۰ جنوری تک واپس کر دیں تو آپ کی بڑی مہربانی ہوگی کیونکہ یہ مجھے ریڈیائی مشاعرہ کے لئے ضروری چاہئے یہ میری عزت کا سوال ہے اور روزی کا بھی۔ میں تو آپ کے قدموں کی بدولت روٹی کھا رہا ہوں۔

نمونے کے طور پر بہزر صاحب کے چند خطوط بنام ڈاکٹر منوہر سہائے انور کے اقتباسات سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ بہزر صاحب کس پایہ کے شاعر ہیں۔ بہزر صاحب نے حضرت جوش ملسیانی پر جھوٹے اور رکیک حملے کئے جن کے جواب میں حضرت جوش ملسیانی کو قلم اٹھانا پڑا اور انھوں نے دلائل اور انور صاحب کے خطوط سے یہ ثابت کیا کہ بہزر صاحب نہ صرف جھوٹے ہیں بلکہ شاعر بھی نہیں ہیں۔ انور صاحب۔ جوش ملسیانی صاحب، نسیم فرخ نگری اور جناب برہم ناتھ دت نے بہزر صاحب کی شاعری کے حدود اربعہ کا جو نقشہ اپنے خطوط میں کھینچا ہے وہ من وعن "شانِ ہند" میں شائع ہوا اور ان خطوط نے وہ شہرت پائی کہ ان تمام خطوط کو ایک پمفلٹ کی شکل میں "قولِ فیصل" نام سے جناب محمد اسد صاحب امرتسری نے شائع کیا یہ پمفلٹ اب بھی دفتر شانِ ہند میں موجود ہے۔ اور تو اور ایک دیوانی مقدمہ بہزر شری چودھری برہم ناتھ دت بنام بھنڈاری صاحب ایڈیٹر "جانثار" امرتسر میں فاضل جج نے اپنے فیصلہ میں بہزر صاحب کو جھوٹا گواہ قرار دیا۔ فیصلہ کی مصدقہ نقل کا ترجمہ شانِ ہند میں ۱۹۷۰ء میں شائع کیا گیا۔ پورن سنگھ بہزر اس عمر میں بھی املائی کئی غلطیاں کرتے ہیں۔ ہم چیلنج کرتے ہیں کہ اگر ان سے دس سطر کی عبارت لکھوائی جائے تو اُس میں املا کی غلطیاں یقیناً ہوں گی۔ ایک ایسے شاعر جیسے کو ..... قابل ترین شعرا اور مستند اساتذہ جناب منوہر سہائے انور جناب جوش ملسیانی۔ جناب برہم ناتھ دت قاصر نے جاہلِ مطلق قرار دیا ہے اُسے دلی اُردو اکاڈمی مہمان شاعر بنا کر اس کے اعزاز میں ایک جلسہ کرتی ہے جو انتہائی افسوسناک ہے۔

دوسرے مہمان شاعر جناب مضطرب نظامی (لکھنؤ) ہیں۔ لکھنؤ میں مضطرب نظامی سے کہیں بہتر اور نامور شاعر موجود ہیں مگر ان بیچاروں کی رسائی دلی اردو اکاڈمی کے پروگرام کمیٹی کے ممبران تک نہیں ہے۔ مضطرب نظامی صاحب کا مجموعہ کلام "حرفِ شیریں" اردو بازار میں ایک ادارہ کے ہاں نظر پڑا تو سرسری طور پر ورق گردانی کرتے ہوئے ان کا حسب ذیل شعر نظر پڑا ؎

یوں کاروانِ وقت میں چلنا پڑا مجھے بہکے قدم کسی کے سنبھلنا پڑا مجھے

ایڈیٹر شانِ ہند بے شک پنجابی نژاد ہے مگر اُسے اتنا ضرور معلوم ہے کہ کاروان کے ساتھ چلا جاتا ہے کاروان میں چلنا شاید لکھنؤ میں بولا جاتا ہوگا۔ یہ تو نقاد ہی بتا سکتے ہیں کہ "کاروانِ وقت" کی ترکیب بھی صحیح ہے یا نہیں۔ اور پھر کاروان کے ساتھ چلتے ہوئے قدم بہکتے نہیں ہاں ٹھوکر لگ سکتی ہے دیکھئے جناب گوہر مراد آبادی نے کس ادا کے ساتھ سنبھلنا پڑا مجھے، کو نگینے کی طرح شعر میں جڑا ہے فرماتے ہیں ؎

یوں بھی بپا کی آگ میں جلنا پڑا مجھے — ٹھوکر لگی کسی کے سنبھلنا پڑا مجھے

بھٹو صاحب اور منظر بے نقاب کو جہاں منظر عام پر بنا کر ان کے اعزاز میں اُردو اکاڈمی دلی کا جلسہ کرنا اور ہزاروں روپیہ برباد کر دینا یقیناً اُردو کے ساتھ ظلم ہے۔ اگر دلی انتظامیہ نے دلی اُردو اکاڈمی کی گرانٹ دس لاکھ سے تیس لاکھ کر دی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ چوروں کا مال اور الیوں کے گو کے مصداق اس رقم کو یوں ضائع کیا جائے۔ ہم دلی انتظامیہ کے سربراہوں تک یہ استدعا احتجاجی انداز میں پہنچا رہے ہیں کہ دلی اُردو اکاڈمی کو اس قسم کی فضول خرچیوں سے روکا جائے اور یہ روپیہ جس مقصد کے لئے دیا گیا ہے اسے اُسی کاز کے لئے خرچ کیا جائے۔

جناب ہری دیو جوشی وزیر اعلےٰ راجستھان توجہ فرمائیں

راجستھان اُردو اکاڈمی کی بنیاد کسی ایسی ساعت بد میں رکھی گئی تھی کہ اسے ترقی کی راہ پر چلنا نصیب ہی نہیں ہوتا۔ خود اُردو والے ہی کسی بھی ایسے اُردو پرست کی کوششوں کو بارآور نہیں ہونے دیتے جو ہر ممکن طریق سے راجستھان اُردو اکاڈمی کو بہتر انداز میں اُردو کی بقاء حیات کی راہ پر لگانا چاہتا ہو۔

اس اُردو اکاڈمی کو ہمیشہ "ایسے ممبران انتظامیہ سے واسطہ رہا جو اُردو کی نسبت اپنی ذات کو اُجاگر کرنا اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہیں۔ خدا خدا کر کے جناب ڈاکٹر محمد علی زیدی کو راجستھان اُردو اکاڈمی کا چیئرمین مقرر کیا گیا تھا مگر یار لوگوں نے انھیں بھی کروٹ بھی نہ لینے دیا۔ اور آخر کار یہ اکاڈمی بھی سیاست کی بھینٹ چڑھا دی گئی اور ایک سرکاری افسر کو اس کی دیکھ ریکھ کے لئے مقرر کر دیا گیا جس کا دفتر راجستھان لریٹریٹ میں ہے اور اکاڈمی اُردو سے نابلد سٹاف کے آغوش میں سسکیاں لے رہی ہے۔

محترم جوشی جی۔ آپ بخوبی جانتے ہیں کہ ہمارے محبوب وزیر اعظم جناب راجیو گاندھی اُردو سے متعلق اداروں کو اُردو کی ترقی کے لئے رواں دواں دیکھنا چاہتے ہیں کیونکہ انھوں نے اپنے الیکشن مینی فیسٹو میں اُردو سے متعلق جو وعدے کئے ہیں انھیں وہ ہر حال میں پورا کرنا چاہتے ہیں۔ اور آپ اس سے بھی بخوبی واقف ہیں کہ راجستھان میں اُردو بولنے اور اُردو پڑھنے والوں کی تعداد اتنی بڑی ہے کہ جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ پھر نہ معلوم آپ نے راجستھان کی اُردو اکاڈمی کو کس وجہ سے قعر مذلت میں پھینک رکھا ہے۔

محترم جوشی صاحب آپ سے راجستھان کا کوئی بھی راز پوشیدہ نہیں ہے اور آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ اس وقت سارے راجستھان میں جناب ڈاکٹر محمد علی زیدی سے بہتر کوئی شخصیت ایسی نہیں ہے جو راجستھان اُردو اکاڈمی کو بہتر انداز میں کامیابی کی راہوں سے ہمکنار کر سکے۔ سیاسی جوڑ توڑ تو ہوتے ہی رہتے ہیں راجستھان پر ایک زمانے تک راجاؤں اور راجواڑوں کی دوہری غلامی میں رہا ہے اس لئے راجستھان کے عوام ابھی غلامانہ ذہنیت کو خیرباد نہیں کہہ سکے اس لئے کسی بھی اچھا کام کرنے والے شخص کو پست اور غلامانہ ذہنیت رکھنے والے لوگ اُبھرنے اور کام کرنے کا موقع نہیں دیتے۔ اور یہی وجہ ہے کہ جناب ڈاکٹر محمد علی زیدی کے بارے میں بھی ایسے خود غرض، مطلب پرست اور اُردو دشمن لوگ رد و بدل کا سہارا لیتے رہتے ہیں۔

جو نہایت ہی... اگر آپ چاہتے ہیں کہ راجستھان اُردو اکاڈمی بھی ملک کی دوسری اُردو اکاڈمیوں کی طرح اُردو کے لئے بہتر خدمات انجام دے تو آپ کو ڈاکٹر محمد علی زیدی کو اکاڈمی کا چیئرمین مقرر کرنا چاہئے اور اکاڈمی کی انتظامیہ کمیٹی میں ایسے اُردو پرست اصحاب کو رکھیئے۔ جو واقعی اُردو سے محبت کرتے ہوں۔ اور اکاڈمی کا سکریٹری کوئی اُردو داں غیر مسلم ہو۔

اُمید ہے کہ آپ اُردو اکاڈمی راجستھان کے مستقبل سنوارنے پر فوری توجہ دیں گے۔

فن و شخصیت بمبئی کا ساحر لدھیانوی نمبر پہلی فرصت میں طلب فرمائیے۔
لدھیانوی کا مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام بھی اس میں دیا گیا ہے۔ بہت کم تعداد میں رہ گیا ہے۔ قیمت اسّی روپے

ہر ہندوستانی کو

دل کی گہرائیوں سے اور

نیک خواہشات کے ساتھ

ہندوستان کی آزادی کی ۳۸ ویں

سالگرہ کی مبارک باد

اور

دعا ہے کہ ہمارے وزیر اعظم

جناب **راجیو گاندھی** کو

عمرِ خضر عطا ہو ۔ اور

ہندوستان کو دن دونی رات چوگنی ترقی حاصل ہو

موہن گولڈ واٹر

ڈالی گنج ۔ لکھنؤ (یو پی)

بہ کوئے یار بہ انداز محرمانہ گزر

سرور تونسوی

۱۹۵۵ء اور اس کے بعد ہندوستان میں معموں کی وبا اس شدت سے پھیلی کہ اکثر شہروں اور قصبوں سے سیکڑوں
معمہ ساز عوام کی جیبوں پر مہذب ڈاکہ ڈالنے میں سرگرم ہوگئے۔ معموں کے باعث عوام بری طرح لٹ رہے تھے مگر راتوں رات
بنتے بگڑنے کے سنہری سپنوں میں مست اور بے خود عوام اپنے ہاتھوں اور اپنی خوشی سے لٹنے میں راحت محسوس کر رہے تھے اور اکثر معمہ
داد عیش دے رہے تھے۔ یہ سب معمے "شمع معموں" کی کامیابی اور عالمگیر شہرت کو دیکھتے ہوئے جاری ہوئے مگر نقال
سازوں نے شمع معموں کی تو نقل کر لی مگر شمع معموں کی ایمانداری اور دیانت داری کو انھوں نے پاس تک نہ پھٹکنے دیا۔ اس کا
قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ عرصہ بعد معموں کا یہ سیلاب خشک سوتوں میں بدل گیا اور باقی رہے صرف شمع معمے جو اپنی ایماندارانہ ا
دیانت دارانہ روایات کے مطابق خدا کے فضل سے اب تک زندہ و سلامت ہیں، اور انشاء اللہ زندہ رہیں گے۔

اُن دنوں "شانِ ہند" معموں کا محاسبہ کرنے میں ایک امتیازی حیثیت رکھتا تھا لہٰذا اکثر معمہ ساز اپنی بددیانتی
کی پردہ پوشی کے لیے شانِ ہند میں اپنے معموں کا اشتہار چھپوا کر اپنے لیے راہ بنانے کی تلاش کرنے کی کوشش کرتے تھے
اور اس انعام خداوندی کا یہ عالم تھا کہ شانِ ہند میں ہر ماہ قریباً پینتالیس معمہ سازوں کے اشتہارات شائع ہوتے
تھے۔ اُن دنوں انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ کے جنرل سکریٹری قاضی عبدالغفار شانِ ہند کا شمارہ دیکھ کر کہتے
سرور صاحب شانِ ہند تو معموں کی انسائیکلوپیڈیا ہے۔

دلی کے کچھ معمہ سازوں نے شانِ ہند میں "شمع معموں" کے خلاف لکھوانے کے کئی جتن کیے مگر مجھ ایسا خدا
سے ڈرنے والا کسی دیانت دار ادارے کے خلاف لکھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا لہٰذا ان معمہ سازوں نے میرے اور
حافظ محمد یوسف دہلوی کے درمیان اختلافات پیدا کرنے کی کمینہ سازشیں بھی کیں۔ میں تو خیر حافظ صاحب کے نیاز مند
تھا لہٰذا مجھے حافظ صاحب سے بدظن کرنا ان معمہ سازوں کے بس کی بات نہ تھی بے شک یار لوگوں نے مرغ و ماہی ا
کاک ٹیل پارٹیوں میں متعدد بار مدعو کیا مگر یہ لوگ اپنی مطلب براری نہ کر سکے اور اُدھر حافظ صاحب کا خیال تھا کہ یہ لوگ
اُنھیں مجھ سے بدظن کرتے وہ اتنا ہی زیادہ مجھ پر بھروسہ کرتے۔ جو لوگ میری اور حافظ صاحب کی بے غرض دوستی
اور ایک دوسرے پر بھروسے اور یقین کے بارے میں چہ میگوئیاں کرتے رہتے ہیں اُنھیں اس کا علم ہی نہ تھا کہ حافظ
نے مجھے سالہا سال تک جانچا اور پرکھا تب کہیں جا کر یقین و اعتماد کی یہ حدیں قائم ہو سکیں۔ اور نارائن داس اور حافظ
یک جان دو قالب تھے۔ لالہ نارائن داس کے انتقال کے بعد حافظ صاحب ایک ایسی کمی محسوس کرتے تھے جو اُن کے
خاص پریشان کن تھی۔ ایک دفعہ بمبئی میں سمندر کے کنارے سیر کرتے ہوئے حافظ صاحب اپنے آپ ہی کہہ اٹھے کہ سرور
صاحب تم نے کسی حد تک لالہ جی کی کمی کو پورا کیا ہے۔

"شمع معموں" کا پہلا انعام ناجائز طور پر حاصل کرنے کے لیے کئی حضرات نے بڑے بڑے پروگرام بنا کر عدالتی چارہ جوئی
کا سہارا لیا اور پریشان کرنے کی غرض سے حافظ صاحب کے علاوہ عزیزان یونس۔ ادریس اور الیاس صاحبان کے نام بھی
سمن جاری کرا دیے جاتے تھے۔ ایسے مقدمات کی پیروی مولانا حلیم اختر صاحب کرتے تھے مگر جب ۱۹۶۸ء میں پٹیالہ کی

[illegible] میں ایک وکیل نے ایسا ہی مقدمہ دائر کیا اور حافظ صاحب [illegible] اس مقدمہ کی پیروی [illegible]
[illegible] سے متعلق مقدمہ کی پیروی کا اوّلین موقعہ تھا لہٰذا مولانا علیم اختر صاحب بھی میرے ساتھ چلے گئے۔ اس مقدمہ
کو شاندار انداز میں نپٹایا گیا اُس سے حافظ صاحب کے دل میں میرے لئے اور بھی اعتماد پیدا ہوا۔ اور مولانا علیم اختر صاحب
کے انتقال کے بعد ایسے مقدمات کی پیروی کلی طور پر میرے سپرد کر دی گئی۔ چونکہ سب مقدمات جھوٹ کی بنیاد پر محض بلیک میل کرنے
کی غرض سے دائر کئے جاتے تھے لہٰذا حافظ صاحب کا فرمان تھا کہ خواہ مقدمہ پر لاکھوں روپے لگ جائیں مگر بلیک میل کے آگے
ہرگز نہ جھکا جائے۔ جس کا قدرتی نتیجہ یہی ہوا کہ تمام مقدمات خارج ہوتے رہے۔ اس سلسلہ میں ان میں ایک کا مقدمہ بڑا ہی
دلچسپ تھا۔ مدعی کا کہنا تھا کہ شمع نے ایمانداری کی ایک مثال ہیں مگر جب ایک مفت نامہ ایک حل کے لئے ہے تو جس کی
مدد کی فیس دو روپے ہوتی ہے اس میں ایک مفت نامہ کیوں نہیں لیا جاتا۔ جب کہ ہر مفت نامہ کے لئے اقرار نامہ ضروری
ہے۔ ایک مفت نامہ ایک حل کی فیس ہے۔ اس مقدمہ نے بڑے دلچسپ موڑ لئے اور آخر کار مدعی نے عدالت میں شمع
معموں کی ایمانداری کا اقرار کرتے ہوئے مقدمہ کو ختم کرنے کی استدعا کی۔ حافظ صاحب نے شمع معموں کی ایمانداری اور
دیانت داری کو ایمان کی حد تک جان سے بھی عزیز رکھا اور خدا کے فضل سے اُن کے صاحبزادگان بھی اس ضمن میں یعنی
دیانت داری اور ایمانداری میں یوسف صاحب مرحوم کے نقش قدم پر اس طرح چل رہے ہیں کہ جیسے حکم الٰہی کی تعمیل کر رہے ہوں
معمہ سازی اور معمہ کا کاروبار عام طور پر بددیانتی کا دھندا سمجھا جاتا ہے مگر حافظ صاحب نے شمع معموں کو اس
بددیانتی کا الزام سے بچایا کہ ہزار ہا حضرات نے اردو پڑھنا لکھنا سیکھا تاکہ وہ شمع معموں میں حصہ لے سکیں اور ایمانداری اور
دیانت داری کی اس روشن شمع سے مستفید ہو سکیں۔ راجدھانی میں لاکھوں لوگ ملک اور بیرون ملک سے ہر روز آتے ہیں
ان میں سے چند حضرات ایسے بھی ہوتے ہیں جو دلی کی مشہور دیکھنے والی جگہوں میں دفاتر شمع اور شمع معموں کے انتظام و
انصرام کو دیکھنا چاہتے ہیں لہٰذا حافظ صاحب بعض اوقات ایسے حضرات کو خود دفتر اور شمع معموں کے شعبہ کے انتظام اور
طریق کار سے واقف کراتے تھے۔ اور یہ بیرونی حضرات دفاتر شمع کو دیکھنے کے بعد از خود اندازہ لگانے میں کوئی دقت
محسوس نہیں کرتے تھے کہ حافظ صاحب نے شمع کو یہ انداز بخشنے میں کس قدر محنت و کاوش سے کام لیا ہوگا کہ جس سے اس کی
روشنی تمام روئے زمین پر بکھر رہی ہے۔

غزل

شاہد رتلامی

جو اشک پلکوں پہ اپنی سجائے بیٹھا ہے — سیاہ رات کو دلہن بنائے بیٹھا ہے
مہک رہی ہے فضا زخمِ دل کے پھولوں سے — یہ کون دشت کو گلشن بنائے بیٹھا ہے
عبث ہے کوشش راہِ فرار ماضی سے — کہ ذہن و دل پہ سکہ جمائے بیٹھا ہے
اکیلا میں ہی نہیں تیری دید کا طالب — زمانہ راہ میں آنکھیں بچھائے بیٹھا ہے
یہ آرزو ہے تو پھر پوچھ مٹنے والے سے — فریب کتنے زمانے کے کھائے بیٹھا ہے
زمانہ اس پہ اٹھاتا ہے انگلیاں کیونکر — جو تیری یاد میں خود کو بھلائے بیٹھا ہے
یہ کس نے چھیڑ دیا ذکر کربلا شاہد — یزید وقت بھی گردن جھکائے بیٹھا ہے

دوریا پرکاش ستور ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے خواجہ پریس چتلی قبر شیخ منگلو جامع مسجد دہلی سے [illegible]
چھپوا کر دفتر [illegible] شائع کیا۔

گوشۂ عقیل صدیقی

میکش اجمیری

آل انڈیا مشاعرہ اودے پور

"کاروانِ ادب" اودے پور کی جانب سے ہر سال کل ہند مشاعرہ کا انعقاد ہوتا ہے۔ امسال یہ مشاعرہ ۲۴ جولائی ۱۹۸۵ء کی شب کو منعقد ہوا۔ بہادر جانباز راجپوتوں کی [illegible] دھرتی پہ پیپلیو ٹریننگ اسکول کے وسیع ہال کو منتظمین نے بڑے سلیقے سے برقی قمقموں سے آراستہ کیا ہے۔ مشاعرے کی ٹی۔ وی فلم ترتیب دینے کو ٹی۔ وی یونٹ، پریس رپورٹرس اور کیمرہ مینوں نے مشاعرے کے ڈائس کو حلقہ میں لے رکھا ہے۔ میں اور تمام مدعو شعراء و شاعرات کو ڈائس پر حسب مراتب پُرجوش خیر مقدم کے ساتھ بٹھا دیا گیا ہے۔ "کاروانِ ادب" اودے پور کے روحِ رواں اقبال ساگر صاحب بھی ڈائس پر رونق افروز مشاہیر شعراء حضرات و شاعرات کا تعارف حسب ترتیب کرا رہے ہیں جن میں حضرت ثقلین حیدر، ڈاکٹر ساغر اعظمی، راحت اندوری، [illegible]، محترمہ شانتی صبا، محترمہ ترنم کانپوری، جناب ارمان وارثی، نظر ایٹوی، جوشش رائے پوری، نیلو شمیم صاحبہ اور راقم الحروف کے نام شامل ہیں۔ ٹھیک وقت پر ۹ بجے شب شروع ہونے کے لئے یہ مشاعرہ ہمیشہ یاد رہے گا۔ اقبال ساگر صاحب نے مشاعرہ کی صدارت کے لئے جناب اے۔ کے چودھری صاحب کا نام تجویز کیا ہے جس کا تالیوں کے ساتھ خیر مقدم کیا گیا ہے۔ چودھری صاحب نے افتتاحی تقریر کے بعد مسندِ صدارت سنبھال لی ہے اور ساگر صاحب نے مشاعرے کی باگ ڈور آل انڈیا مشاعروں کے مشہور اناؤنسر ثقلین حیدر صاحب کے ہاتھوں سونپ اپنی جگہ لے لی ہے۔ لیجئے ثقلین صاحب اپنی تمام تر دلکشیوں اور حاضر دماغی کے ساتھ قومی ایکتا پر مختصر تقریر کے بعد مشاعرے کی کامیاب شروعات کے لئے جناب جمیل قریشی کو زحمتِ سخن دے رہے ہیں۔ جمیل صاحب اپنے اشعار کو اچھے انداز کے ساتھ سامعین تک تو پہنچا سکتے لہٰذا انھیں [illegible] شے الگ ہونا پڑا ہے۔ آپ بھی جمیل صاحب کے دو اشعار ملاحظہ فرمائیں۔ ؎

اپنی شادابی کو کل روئیں گے پھولوں کے بدن
وقت کو رو کو کہ یہ ان کی تازگی لے جائے گا
وقت کی اس تیز آندھی کا کوئی جھونکا جمیل
کیا خبر کس کس کے گھر کی روشنی لے جائے گا

اب ثقلین صاحب نے ایک لطیفہ چسپاں کرتے ہوئے مدھیہ پردیش کی مشہور شاعرہ شانتی صبا صاحبہ کو مائک سپرد کیا ہے۔ صبا صاحبہ تمام تر نسوانی روایات کے ساتھ دلنشیں ترنم میں سامعین پر اپنے کلام کا جادو جگا رہی ہیں ؎

رازِ دل اپنا زمانے کو بتاتے کیوں ہو
میری تصویر زمانے کو دکھاتے کیوں ہو

واہ واہ کے شور سے ہال گونج رہا ہے اور صبا صاحبہ یوں فرما رہی ہیں ؎

جس کو پینے کا سلیقہ نہ ہو نشے کا شعور
ایسے کم ظرف کو مستی میں پلاتے کیوں ہو

ڈائس کے لوگ شعر کا مصرعِ اول [illegible] ہونے کی کانا پھوسی کر رہے ہیں۔ وسیع ہال میں بیٹھے سامعین کی بھرپور بھیڑ اس حقیقت سے نا آشنا داد دینے میں مشغول ہیں۔ اور صبا صاحبہ نے نزاکت کو بھانپتے ہوئے مقطع پڑھ دیا ہے۔ مگر سامعین کی [illegible] فرمائش نے انہیں [illegible] مجبور کر دیا ہے۔ [illegible] اشعار آپ بھی ملاحظہ فرمائیے

کسی کے دل سے کسی کی نظر سے گزرے تھے
خبر نہیں ہمیں جانے کدھر سے گزرے ہیں
فلک کے چاند سے [illegible] تلاش کرو
بڑے حسین سفر کدھر سے گزرے ہیں

ثقلین صاحب نے دوسری غزل کے دو بہترین شعر پڑھ کر بریلوی کا یہ شعر سنا کر سامعین کو چونکا دیا۔

یہ مہر و ماہ و لیلیں ہیں برلتا کے لئے
کہ آسمان بچھا تھا کسی سفر کے لئے

اور لیجئے اب مشاعرے کے بانی اُودے پور کے مقامی شاعر جناب اقبال ساگر صاحب کو ثقلین صاحب نے پُراثر انداز سے سامعین کے سامنے کھڑا کیا ہے۔ اقبال ساگر صاحب نے ستھرا کلام پڑھ کر سامعین سے داد و تحسین وصول کی۔ ایک شعر آپ بھی ذہن نشین کرتے چلیں: ؎

دھوپ خوش ہے کہ ذرا دیر تو رہنے دو ابھی
ہم کو کچھ بھیگنے دے داد کی بوچھاروں سے

اور لیجئے اب ثقلین صاحب نے لطیفوں اور اشعار کی چاشنی سے سامعین کو قہقہہ زار بناتے ہوئے گیتوں کے مشہور شاعر ارمان وارثی صاحب کو زحمتِ سخن دی ہے۔

بے اثر کلام سننے کے بعد ارمان صاحب نے درمیانی ترنم میں ایک گیت سنایا ہے جس پر قدرے داد ملی ہے۔ گیت کا موضوع تھا بنجارا جس پر [illegible] کا سنے اور ٹولیوں کے گیت سامعین سُن چکے ہیں۔ لہٰذا ارمان صاحب کو زیادہ نہیں سراہا گیا۔ اور لیجئے اب ثقلین صاحب نے رائے پور سے تشریف لائی ہوئی ایک غیر معروف شاعرہ محترمہ نیلو نیلم کو اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کرنے کا موقع دیا ہے۔ نیلم صاحبہ نیلی رنگ کی زریں ساڑھی میں ملبوس ترنم میں چھوٹی چھوٹی غزلیں سنا رہی ہیں: ؎

ٹمٹماتے دئے کا کہنا ہے		روشنی تیرگی کا گہنا ہے

لیکن سامعین کلام سے زیادہ حسین لباس کی داد دے رہے ہیں۔ اور نیلم صاحبہ فرما رہی ہیں: ؎

بے تکلفی کا سبب کیا ہے		جب ہمیں ساتھ ساتھ رہنا ہے

نیلم صاحبہ ترنم میں شانتی صبا صاحبہ سے بھی دو قدم آگے بڑھ گئی ہیں۔ [illegible] کے مشہور شاعر جگر [illegible] کا شعر ہے ؎

[illegible]		جب [illegible] ساتھ ساتھ رہنا ہے
[illegible]

ہیں۔ اور نیلم صاحبہ نے دوسری غزل چھیڑی ہے ؎

ہم کو جو سامنا نہیں ہوتا		آدمی کام کا نہیں ہوتا
جب مرے روبرو وہ ہوتے ہیں		مجھ کو اپنا پتہ نہیں ہوتا

داد کے شور میں نیلم صاحبہ بیٹھیں تو ثقلین صاحب نے کچھ اشعار و لطائف سے سامعین کی "آہ" "واہ" لوٹتے ہوئے راقم الحروف کو دعوتِ سخن دی ہے۔ میں چند مختلف اشعار اور دو غزلیں سنا کر اپنی جگہ لوٹ آیا ہوں۔ میرے اشعار جمیل قریشی صاحب نے منتخب کئے آپ بھی ملاحظہ فرمالیں: ؎

میرے اشکوں نے فقط تیرا بھرم رکھا تھا
ورنہ کیا تجھ میں سوا دیدۂ نم رکھا تھا
ہم نے اُردو کی حفاظت کے لئے اے بیکس
اپنے ہی خون میں لبریز قلم رکھا تھا

ثقلین صاحب نے میرے اشعار کا بھی پوسٹ مارٹم لطائف سے کرتے ہوئے اب رائے پور سے تشریف لائے طنز و مزاح کے کوئی زیادہ شاعر کم جوشی صاحب کو مائک پر مدعو کیا ہے۔ جوشی جی نے بنا جوش دکھائے ہندی کی غالباً کویتائیں سنائی ہیں جن پر بہت کم سامعین نے داد دی ہے اور وہ اپنی جگہ لوٹ آئے ہیں۔ لیجئے اب ثقلین صاحب نے نہایت مناسب تعارف کے بعد گلشن بھارتی صاحب کو سامعین کے انقلابی جذبات کو اُبھارنے کی دعوت دی ہے۔ گلشن صاحب نے حسبِ دستور دلکش لباس اور اپنے پڑھنے کے قیامت خیز انداز کے ساتھ مائک پر اپنے کلام کی شروعات قطعات کے ساتھ کرنے کے بعد حالاتِ حاضرہ کی بے عنوانی پر نظم پڑھی جس نے سامعین پر ناقابلِ فراموش اثرات چھوڑے۔ ایک اسٹینزا آپ بھی ملاحظہ فرمالیں: ؎

درس گاہوں میں چلو حشر کا منظر ہے جہاں
اک نئی صبح کا امکان مقدر ہے جہاں
ڈگریاں ہیں تو فریموں میں سجائے رکھو
موت بانہوں کو جو پھیلائے ہے پھیلانے دو
"جشنِ جمہوریہ ہر حال منانا ہو گا"

گلشن صاحب اپنی جگہ آ گئے ہیں اور ثقلین صاحب نے

ان کے موجودہ انتشار پر اشعار و لطائف کی بارش کرتے ہوئے خوبصورت تعارف کے ساتھ محترمہ ترنم کانپوری صاحبہ کو مائک سپرد کیا ہے ترنم صاحبہ شائستہ لباس میں سمٹی سنوری مائک پر آکر دلگداز آواز میں یوں غزل سرا ہوئیں :۔

اپنا اپنا فرض وہ لوں یوں ادا کرتے رہے
ہم دعا کرتے رہے وہ بد دعا کرتے رہے
اے خطا پوشِ دو عالم یہ حقیقت ہے کہ ہم
تیری رحمت کے بھروسے پر خطا کرتے رہے

داد کا ریلا ہے کہ بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ لوگ کرسیوں سے اٹھ اٹھ کر والہانہ داد دے رہے ہیں۔ اور ترنم صاحبہ نہایت سادگی سے شعر سنا رہی ہیں :۔

کربلا کے واقعہ کے بعد بھی کتنے رفیق
اہتمام حادثاتِ کربلا کرتے رہے
ایسے منصف قاتلوں کے دوست ہیں منصف نہیں
قاتلوں کے حق میں جو ہر فیصلہ کرتے رہے

داد سے خوب خوب جھولیاں بھر کر ترنم صاحبہ لوٹیں تو دیکھا کہ ثقلین صاحب پُر وقار لہجے میں کربلا کے خوں آشام واقعہ پر اشعار سنا رہے ہیں۔ اور اس کے بعد پریم بھنڈاری صاحب جو ایک مقامی شاعر ہیں۔ مائک پر کلام سنا رہے ہیں۔ کچھ اشعار سے آپ بھی لطف اندوز ہو لیں :

شام ہوئی تو سورج سوچے
سارے دن بے کار جلے
بادل کے جنگلوں کی طرح دل کی آگ تھی
دو آنسوؤں سے جس کو بجھانے چلا تھا میں

اور اس کے بعد ثقلین صاحب نے مشہور و معروف شاعر نظر ایٹوی صاحب کو کلام سے سامعین کو محظوظ کرنے کی دعوت دی ہے اور لیجئے نظر ایٹوی اپنے مخصوص انداز میں غزل سرا ہو رہے ہیں۔ مطلع کے بعد کے اشعار ملاحظہ فرمائیے :

ساتھ میرے کوئی نہیں پھر بھی — میں اکیلا نظر نہیں آتا
وہ اک آئینہ بدلتا ہوں — صاف چہرا نظر نہیں آتا

آواز اور کلام نے مل کر سامعین پر وجدانی کیفیت طاری کر دی ہے۔ لوگ جھوم جھوم کر والہانہ داد دے رہے ہیں اور نظر صاحب داد وصول کرنے کے ساتھ ہی نغمہ سرا ہیں

میری آنکھوں میں جھانک کر دیکھو
تم کو کیا کیا نظر نہیں آتا
جانے یہ کیسے لوگ ہیں اے دوست
جن کا سایہ نظر نہیں آتا
صبح کا شور ہر طرف ہے دوست
اور اجالا نظر نہیں آتا
میرے چہرے کے حاشیے لکھ کر
کیا اضافہ نظر نہیں آتا
جن کو نظریں تلاش کرتی ہیں
وہی چہرا نظر نہیں آتا

نظر صاحب ہر ہر شعر پر داد وصول کرنے کے بعد بیٹھنے لگے تو سامعین نے پُر زور احتجاج کے ساتھ ایک اور غزل کی فرمائش کی ہے جسے نظر صاحب کو قبول کرنا پڑی ہے اور دوبارہ مائک پہ محو ترنم میں تازہ غزل پیش کر رہے ہیں :۔

راستہ فرار کا لیا اختیار کر
موت کی طرح نہ زندگی سے پیار کر
ہم ہی راہِ عشق میں کوئی نقش چھوڑ دیں
ٹھوکروں پہ چلے گئے زندگی گزار کر
میرے لب پہ آگئی ان کو دیکھ کر ہنسی
مطمئن ہے جو مجھے پتھروں سے مار کر
موسمِ بہار نے کس قدر غلط کہا
لوٹ کر میں آؤں گا میرا انتظار کر

دوسری غزل پر بھی قابلِ رشک داد وصول کرکے نظر رخصت ہوئے تو ثقلین صاحب نے ان کے کئی اشعار پر جھوم کے ساتھ نایاب اشعار اور لطائف کا سہارا لیا اور اب مشاعروں کے جادوگر جناب ساغر اعظمی صاحب کو نہایت مناسب الفاظ میں تعارف کا شرف بخشتے ہوئے مائک سپرد کیا ہے ساغر صاحب مشاعرے کے واحد شاعر ہیں جو حسبِ دستور شعر میں شرابور نظر آ رہے ہیں۔ اپنے مخصوص لب و لہجہ میں ماحول بنایا

ہے اور پھر لحنِ داؤدی میں قطعہ سنانے کے بعد غزل ارشاد فرما رہے ہیں ؎

ایسی نہیں ہے بات کہ قد اپنے گھٹ گئے
چادر کو اپنی دیکھ کے ہم خود سمٹ گئے
جب ہاتھ میں قلم تھا تو الفاظ ہی نہ تھے
اب لفظ مل گئے تو مرے ہاتھ کٹ گئے
صندل کا میں درخت نہیں تھا تو کس لئے
جتنے تھے غم کے ناگ مجھی سے لپٹ گئے
اب ہم کو شفقتوں کی گھنی چھاؤں کیا ملے
جتنے تھے سایہ دار شجر سارے کٹ گئے

آہ - واہ کے شور میں ساغر صاحب بیٹھنے لگے تو سامعین نے کہرام برپا کر دیا اور ساغر صاحب کو دوبارہ مائک سنبھالنا پڑا ہے اور دوسری غزل بھی اسی لحنِ داؤدی میں چھیڑ دی ہے ؎

پاؤں میں ہیں زنجیریں اور زباں پہ تالے ہیں
آج ہم نہ جانے کیا ان سے کہنے والے ہیں
مفلسی کی دھوپ اس کا گھر جلا کے چھوڑے گی
جس نے اپنے آنگن کے پیڑ بیچ ڈالے ہیں
ان کی لوریاں ان کو اب سُلا نہ پائیں گی
یہ اداس بچے تو وقت کے حوالے ہیں
جس نے کل ہزاروں کی قسمتیں خریدی تھیں
آج اس حویلی کے دام لگنے والے ہیں
جس کے واسطے اپنا گھر جلا رہا تھا میں
سن رہا ہوں وہ میرا گھر جلانے والے ہیں

غزل کے ہر شعر پر ساغر صاحب نے بھرپور داد وصول کی ہے اور سامعین نے سخن فہمی کا ثبوت دیتے ہوئے ہر ہر شعر کو پورے دل کے ساتھ سنا ہے - اس پر بھی ساغر صاحب کو نہیں بخشا گیا ہے اور گیت کی فرمائش کی گئی ہے - لیجئے ساغر صاحب نے گیت چھیڑا ہے -

نردھن کی بیٹی سے قیمت مانگ رہا ہے دھنوان
کہاں سے ہے کل جگ کا بھگوان

گیت نے بھی داد وصول کا وہی رخ اختیار کیا جو سابقہ کلام و غزلیات نے کیا تھا اور گیت ختم کرکے ساغر صاحب اپنے مقام پر بیٹھے تو ثقلین صاحب نے نہایت دلکش انداز میں ہر ہر شعر پر کمینٹری کرتے ہوئے اشعار سے آہ اور لطائف سے واہ کے شور کو جنم دیا ہے - اور لیجئے مشاعرے کے اس پہلے دور کے آخری شاعر راحت اندوری صاحب کو تعریفوں کے پلوں کے ساتھ ثقلین صاحب نے مائک سپرد کیا ہے - راحت کی ذات مشاعروں کی دنیا میں تعارف کی محتاج نہیں - تالیوں کے ختم نہ ہونے والے شور میں راحت صاحب نے مائک سنبھالا ہے اور اپنے مخصوص انداز میں غزل شروع کی ہے ؎

یہ نیا اک چاند سورج کے برابر کون ہے
روشنی کم ہو تو یہ دیکھوں کہ گھر پر کون ہے

تحت میں پڑھنے کا جو منفرد انداز جو راحت صاحب کا ہے، وہ شاید ہی ہند و پاک میں کسی شاعر کو میسر ہوا ہو، پھر اس پر زندگی کے عکاس اشعار، سامعین تڑپ تڑپ کر ہر شعر پر داد دے رہے ہیں اور راحت صاحب مختلف غزلوں کے کامیاب اشعار کامیابی کے ساتھ ڈرامائی انداز میں پیش کر رہے ہیں ؎

کبھی دماغ - کبھی دل - کبھی نظر میں رہو
یہ سب تمہارے ہی گھر ہیں کسی بھی گھر میں رہو
جلا نہ لو کہیں ہمدردیوں میں اپنا وجود
گلی میں آگ لگی ہو تو اپنے گھر میں رہو

داد اپنے عروج پر ہے اور مشاعرہ کو کامیابی کی بلندیوں پر پہنچاتے ہوئے راحت صاحب نہایت جذباتی انداز میں پڑھ رہے ہیں ؎

دلوں میں آگ لبوں پر گلاب رکھتے ہیں
سب اپنے چہروں پہ دوہری نقاب رکھتے ہیں
ہمیں چراغ سمجھ کر بجھا نہ پاؤ گے
ہم اپنے گھر میں کئی آفتاب رکھتے ہیں
یہ میکدہ ہے وہ مسجد ہے وہ ہے بت خانہ
کہیں بھی جاؤ فرشتے حساب رکھتے ہیں

پڑھنے کی ضرورت نہیں کہ داد کا کیا عالم ہوگا۔ لوگ کرسیوں سے اُچھل اُچھل کر داد کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ اور راحت صاحب اسی خود اعتمادی سے اشعار کی بوچھار کر رہے ہیں ؎

ابھی تو صرف پرندے شکار کرنا ہے
یہ پھر بتائیں گے کس کو شکار کرنا ہے

یہ تیری پیٹھ ہے اے میرے بے خبر دشمن
مگر مجھے ترے سینے پہ وار کرنا ہے

ہم اپنے شہر میں محفوظ بھی ہیں خوش بھی ہیں
یہ سچ نہیں ہے مگر اعتبار کرنا ہے

ہمارا شوق ہے دار و رسن کی پیمائش
تمہارا کام کبوتر شکار کرنا ہے

کس کس شعر کی داد دی جائے۔ سبھی اشعار قلم بند کر رہا ہوں ؎

ہوں لاکھ ظلم مگر بد دُعا نہیں دیں گے
زمین ماں ہے زمیں کو دغا نہیں دیں گے

روایتوں کی صفیں توڑ کر رہو ورنہ
جو تم سے آگے ہیں وہ راستہ نہیں دیں گے

راحت صاحب کے اشعار کا سلسلہ جاری ہے اور اب یہ شعر پڑھنے سے پہلے وہ تمہید فرما رہے ہیں کہ میں پہلے بے حد پیتا تھا اب چھوڑ چکا ہوں ؎

شراب پی کے بڑے تجربے ہوئے ہیں ہمیں
شریف لوگوں کو ہم مشورہ نہیں دیں گے

ہم اپنے دل سے تجھیں چاہنے لگے ہیں مگر
ہزار چاہیں گے لیکن پتہ نہیں دیں گے

اس سے پہلے کہ سامعین شور اور ہا کی آوازیں بلند کریں۔ راحت صاحب مائک ہی نہیں ڈائس بھی چھوڑ چکے ہیں اور ثقلین صاحب نے موقع غنیمت جان کر پہلے دور کے خاتمہ کا اعلان کیا ہے۔ رات کا ڈیڑھ بج رہا ہے قریب تھا ۲ بجے شب والیس دوسرا دور شروع ہوا جو ۵ بجے تک چلا جس میں پہلے دور کے تمام کامیاب شعراء و شاعرات کو سنا گیا۔

۵ بجے صبح ثقلین صاحب نے مشاعرے کے ملتوی ہونے کا اعلان کیا اور کہا کہ اُردو کے مشاعرے کبھی ختم نہیں ہوتے ملتوی ہوتے ہیں۔ لہٰذا مشاعرہ ملتوی کیا جاتا ہے اور اسی کے ساتھ میں بھی آپ سے رخصت لے رہا ہوں۔

غزل

کاوش قادری نظامی

آنکھوں سے جس کے خون ٹپکتا دکھائی دے
وہ شخص گفتگو سے مسیحا دکھائی دے

پردہ دکھائی دے نہ کہ جلوہ دکھائی دے
آؤ جو تم تو نور برستا دکھائی دے

ہرگز یقیں نہ کیجئے لوگوں کی بات کا
کیجئے وہی جو آپ کو اچھا دکھائی دے

اے دوست کیا یہی ہے مقام فنائے ذات
دیکھوں تجھے تو میرا سراپا دکھائی دے

سرمستیٔ حیات کا یہ فیض ہے کہ اب
وہ بھیڑ میں جائے تو تنہا دکھائی دے

چھوڑا ہے زندگی نے یہ لاکر مجھے کہاں
منزل کا کچھ نشاں ہے نہ رستہ دکھائی دے

کاوش کروں تو کیسے کروں زندگی سے پیار
جب جامۂ حیات ہی میلا دکھائی دے

۱۵ اگست

ہماری آزادی کا یادگاری دن ہے

آؤ

ہم سب مل کر عہد کریں کہ ہم سب ایک ہیں اور

ہمارا

ہندوستان ہم سب کا ہے اور اس کی حفاظت ہمارا فرض ہے۔ ہندوستان کا ہر باشندہ اپنے وطنِ آزادی آزادی کو برقرار رکھنے کا ذمہ دار ہے۔

لہذا

ہم سب بلا تفریقِ مذہب و ملت بھائی بھائی بن کر رہیں

اور

اپنے ملکِ عزیز کی آزادی کی حفاظت کریں

اسی میں ہم سب کا بھلا ہے۔ یاد رکھئے کہ جو شخص اپنے ملک کا وفادار نہیں ہوتا اسے کہیں بھی پناہ نہیں ہے اور ملک کا غدار دین۔ دنیا اور خدا کی نظروں میں قابلِ نفرت۔

ہوٹل راج دوت نئی دہلی

ڈاکٹر اودے سرن ار سن جلاری

برتھ ڈے

"میں ابھی ابھی تمہیں منع کر کے گیا ہوں کہ یہاں مت آؤ مگر تم پھر آگئے۔ بھاگو یہاں سے" گیٹ کیپر نے لیبر کالونی کے بچوں کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ بچے سہم کر کچھ دور ہٹ گئے۔ ... سڑک کنارے پر جا کھڑے ہوئے "کیوں نہیں یہ ہمیں اندر جھانک دیکھ لینے دیتا۔ تو پاس سے کیوں نہیں دیکھنے دیتا" ایک لڑکے نے دوسرے سے کہا۔

"ہم لوگ غریب ہیں اس لئے وہ ہمیں بھگا دیتا ہے ہمارے وہاں کھڑے ہونے سے سیٹھ جی کی بے عزتی ہوتی ہے دیکھو رئیسوں کے بچوں کو نہیں بھگا رہا ہے وہ بھی تو وہیں کھڑے ہیں" دوسرے لڑکے نے کہا۔ چوکیدار گیٹ چھوڑ کر اندر چلا گیا۔ اسی بیچ ایک ... رنگ کی کار کوٹھی جی کے دروازے پر آ کر رکی اور ایک تندرست حسینہ اس سے باہر نکلی۔ تھوڑی ہی دیر میں ایک ... پاس آ کر کار کے پیچھے کھڑی ہو گئی۔ اور اس میں سے کئی سپاہی معہ رائفلوں کے اترے اور اس خاتون کے پیچھے ادب سے کھڑے ہو گئے جو اس امر کی نشاندہی تھی یہ خاتون یا تو کسی افسر کی بیوی ہے یا خود کوئی اعلیٰ افسر ہے۔ تمام مہمانوں کی نگاہیں اسی خاتون پر مرکوز تھیں اور وہ تھی کہ اس شاہی سجاوٹ کا جائزہ لے رہی تھی۔ سیکڑوں رنگین بلب... کوٹھی جگمگا رہی تھی۔ چاروں طرف قناتوں سے گھرے لان میں شامیانے کے نیچے۔ ... کرسیاں پڑی تھیں۔ جن پر زیادہ مہمان بیٹھ چکے تھے۔ لاؤڈ اسپیکر فلمی نغمے فضا میں بکھیر رہا تھا بیرے ادھر ادھر ایسے گھوم رہے تھے جیسے طوفان میں پارہ کی نہریں چنچل ہو جاتی ہیں انگریزی پوشاکوں میں بچے تتلیوں کی طرح پھدک رہے تھے کسی کام سے کوٹھار کا باہر آئے ان کی نظر گیٹ پر کھڑی کار پر گئی تو وہ استقبال کو دوڑے آئیے آئیے ایس۔ ڈی۔ ایم صاحبہ آپ کا سواگت ہے" یہ سن کر آس پاس کھڑے لوگ ایک طرف کو ہٹ گئے وہ اندر گئیں تو ... ان ادب سے کھڑے ہو گئے وہ کرسی پر بیٹھیں تو سب مہمان اپنی اپنی کرسی پر بیٹھ گئے۔

"بھگوان کا شکر ہے ایک بار ... میز پر سجا رکھا تھا تو بیرے پلیٹیں اور ... پیچھے قرینے سے میزوں پر لگا رہے تھے۔

"کیا کوٹھاری جی ہر سال اسی طرح جنم دن مناتے ہیں" ایس ڈی ایم صاحبہ نے قریب بیٹھی عورت سے پوچھا۔ "میں پہلی بار آئی ہوں یہاں پچھلے سال کا مجھے پتہ نہیں" یہ سن کر وہ چپ ہو گئیں اور عالم تصور میں کھو گئیں ان کے تصورات کا سلسلہ ایک ملازم لڑکے کے ہاتھوں برتنوں کی ٹوٹ پھوٹ کرنے کی جھنکار نے توڑا تو انھوں نے دیکھا کہ کوٹھاری جی بھاگے بھاگے اس گرے ہوئے لڑکے کے پاس پہنچے۔ برتنوں کے ٹوٹنے سے ہونے والے نقصان کو شاید وہ برداشت نہ کر سکے اور دھڑا دھڑ ملازم لڑکے کو پیٹنے لگے۔ "اندھا ہے دیکھ کر نہیں چل سکتا اتنی روشنی میں بھی ٹھوکر کھا گیا۔ کوٹھاری جی چیختے ہوئے نہ جانے کیا کیا کہہ رہے تھے مگر ملازم لڑکا چپ چاپ کھڑا تھا اس کے ہونٹوں سے خون بہہ رہا تھا۔ برتنوں کے نقصان نے کوٹھاری جی کو اس احساس سے بے نیاز بنا دیا تھا کہ ان کی یہ حرکت نہ صرف افسوسناک ہے بلکہ گھٹیا بھی ہے اور ان کی اس حرکت سے مہمانوں نے کیسا برا اثر لیا ہے اور مہمانوں کے چہروں پر ان کی ... نمایاں جھلک رہی تھی۔ ایس ڈی ایم صاحبہ کرسی سے اٹھیں اور اس لڑکے کے پاس گئیں اس کا منہ پونچھا اور اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور کہا "بیٹے تمہارا نام کیا ہے۔"

"مکیش" لڑکے نے ڈرتے اور کانپتے ہوئے جواب دیا۔

"تمہارے باپ کیا کرتے ہیں؟"

"رکشہ کھینچتے ہیں"

"کتنے ... ہو؟"

"دو"

"دوسرا بھائی تم سے بڑا ہے"

"جی مگر آپ کو کیسے پتہ چلا کہ میرا بڑا بھائی مجھ سے بڑا ہے" انگلی سے خون پونچھتے ہوئے لڑکے نے جواب دیا

"تمہارے ڈھیلے ڈھالے کپڑوں سے اندازہ لگا لیا تم نے دھوئے اسی کے کپڑے پہن رکھے ہیں۔ ڈھیلا پائنچا بہنے کا

سے تمہارا پیار اسی میں ہے؟ اور نیا اور جگمگ کئے کپڑے فٹ ہو گئے تو ایسا نہ ہوتا۔ "آپ سچ کہہ رہی ہیں ماتا جی کل میں نے اپنی ماں سے میلے کپڑے دھو لینے کو کہا تھا مگر گھر میں صابن نہ تھا اور گاؤں میں کوئی دکان نہ تھی مجبوراً مجھے انہی کپڑوں میں آنا پڑا۔ سینکڑوں مہمانوں کے سامنے میلے کپڑے پہنے ہوتی تو سیٹھ صاحب کی بدنامی ہوتی"

"تم پڑھتی لکھتی ہو؟"

"نہیں۔"

"وہ وقت سے پہلے ... نصیب نہیں تھا تو میرے ماں باپ مجھے پڑھاتے کیسے؟" جمرت نے آہ بھرتے ہوئے کہا اور لوٹتے ہوئے پلیٹ پیالے اٹھانے میں لگ گئی۔ ایس ڈی ایم صاحبہ اس کے ننھے ننھے ہاتھوں کو جلدی جلدی سے بکھرے ہوئے ٹکڑے اٹھاتے ہوئے دیکھ رہی تھیں اور کچھ سوچ رہی تھیں۔ تمام کرسیاں بھر چکی تھیں قریب قریب سبھی مہمان آچکے تھے چنانچہ جشن ... کاٹنے کی رسم شروع ہو گئی۔ ... پانچ موم بتیوں کو ... تالیوں کی گڑگڑاہٹ کے درمیان پھونکوں سے بجھا دیا اور کیک کے وہ ٹکڑے کر دئے۔ ... کمیٹی کا لان میں رس گھول رہے تھے کیک کے ٹکڑے تمام مہمانوں میں تقسیم کرنے کے بعد میزوں پر سجے ہوئے کھانے پر سب مہمان ٹوٹ پڑے ہندو تہذیب کے مطابق کھانا کھانے کے بعد تھالی خالی نہیں چھوڑی جاتی۔ اگر اتنی جوٹھن اکٹھی ہو سکے کہ ... وغیرہ کے لئے پیٹ بھرنے کا وافر انتظام ہو سکے مگر منشی برج کشور ہی ایسے تھے جو اس رسم کو فضول بلکہ گناہ سمجھتے تھے لہذا انہوں نے اپنی پلیٹ وغیرہ میں قطعاً جوٹھن نہ چھوڑی۔ جب کہ ہر مہمان کے آگے پلیٹ میں کچھ نہ کچھ بچا ہوا رکھا تھا۔ بیرا آیا اور بغیر پوچھے منشی جی کے پلیٹ میں ... اور میٹھا پروسنے لگا۔ اس وقت منشی جی کی نظر کسی دوسری طرف تھی ذرا آہٹ سے وہ چونکے تو پلیٹ بھری رکھی تھی، منشی جی کا پارہ چڑھ گیا اور بیرے سے ذرا تلخی سے کہنے لگے۔

"تمہیں کسی نے کھانا کھلانا نہیں سکھایا ہے؟"

"غلطی سے آگاہ فرمایئے حضور میں اپنی کمی پوری کر دوں گا۔" نہایت عاجزانہ لہجے سے بیرے نے کہا

"بیٹے! پلیٹ میں کسی کے بن مانگے کچھ نہیں رکھنا چاہئے پوچھنے سے کھانے والے کی ضرورت کا علم ہو جاتا ہے اور ضرورت کے مطابق کھانا پلیٹ میں رکھنے سے کھانا ضائع نہیں ہوتا۔"

"آپ کا فرمانا ٹھیک ہے مگر۔"

"مگر مجھے استاد نے یہی سکھایا ہے کہ تھالی خالی ہونے ہی نہیں دینی چاہئے وہ کہتے تھے تھالی میں اتنا پروس دو کہ کھاتے کھاتے بچ رہے۔ تاکہ مہتر ان کو کافی جوٹھن ... اسی اصول کے تحت ایسا کرتا رہا ہوں ... آنکھوں کو کھول دیا مگر ... تو آج آپ نے۔"

منشی جی نے نرمی سے کہا بیٹے میں اس طریقے کو بدتمیزی سمجھتا ہوں جہالت اور تنگ نظری سمجھتا ہوں۔ مہتر ان کا اتنا ہی خیال ہے تو انہیں جوٹھن کیوں کھلایا جائے۔ کیوں نہ انہیں پیٹ بھر تازہ کھانا دیا جائے کھلانے والے کی رحم دلی اور غریب پروری یہ کیسے گوارا کرتی ہے کہ وہ کسی انسان کو خواہ وہ مہتر ہی کیوں نہ ہو جوٹھن کھلائے۔ یہ چھوت چھات جس سے اونچے درجہ والوں نے بستی میں رہنے والوں کو دور دور سمندروں میں جانے تک کے حقوق چھین لئے ان بیچاروں کے ساتھ ظلم کیوں کیا جاتا ہے راجہ رام ... اوتار کے بنانے میں ... ہو گئے کرشن ... کا ... اور ... دیار میں لگے رہے گاندھی جی ... ہم ابھی تک جوٹھن کھلانے میں فخر کر رہے ہیں۔ غرض یہ کہ اس غریب اچھوت طبقے کے لئے بھی کوئی انسانی جذبہ کا کام نہیں کیا یہی وجہ ہے کہ ... بن گیا کبھی ... کبھی مسلمان اور کبھی عیسائی

"منشی جی بات تو سچ ہے مگر اس مسئلہ کو سلجھایا کیسے جائے" ایس ڈی ایم صاحبہ نے پوچھا۔

منشی جی سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہنے لگے کہ جب ہندوستان آزاد ہوا تھا تب ہی قانون بنا دینا چاہئے تھا کہ کوئی بھی ہندو اپنے نام کے آگے اپنی ذات نہیں لکھے گا اور ... ایک اچھی قوم ہندوستانی کہلانے پر مجبور ہوتا اور ہر کسی کا مذہب ... کی چار دیواری یا مندر، مسجد، گرجا گھر اور گوردوارہ تک محدود رہتا۔ چند دنوں تک ... ہوتیں بعد میں سب ٹھیک ہو جاتا۔ فقط اچھوت ایک جرم قرار دیا۔ ملک کے تمام باشندے انسان کہلائے ... اور قومی یکجہتی فروغ پاتی۔ مگر ہماری سیاست خود غرضی اور کرسی کی لالچ نے ٹکڑوں میں منقسم کر دیا۔ کیا قومی یکجہتی کا جذبہ ... چاروں ... پریم کا سبق دیا اور اصلاحی ... کی بات ہے۔ غیر جانبدار پالیسی کے خلاف ہے مگر ہمارا ... نے

دیش کے لئے کیا کیا ہے وہ سب جانتے ہیں۔

"منشی جی آپ کے خیالات جمہوریت میں تو پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتے یہ تو کوئی ڈکٹیٹر ہی کر سکتا ہے۔"

"کرنے والے ہر حالت میں سب کچھ کر جاتے ہیں۔"

ایس۔ڈی۔ایم صاحب

"منشی جی آپ کیا کرتے ہیں؟"

میں ایک ریٹائرڈ اسکول ماسٹر ہوں۔ ایس ڈی ایم صاحب نے کچھ سوچا اور جو کچھ انھوں نے اپنی پلیٹ میں چھوڑ دیا تھا اسے کھانا شروع کر دیا۔ جن کی پیروی دوسرے مہمانوں نے بھی کی۔

منشی جی اپنی اس کامیابی پر دل ہی دل میں خوش ہو رہے تھے کہ انھوں نے کئی لوگوں کو ایک سیدھی راہ تو سمجھائی۔ سب مہمان اپنے اپنے گھر چلے گئے مگر ایس ڈی ایم صاحب کا قیام رات کو وہیں رہا۔

دن نکلا تو کوٹھاری جی ان سے ملنے آئے تو کہنے لگیں سیٹھ جی کھانا اور سجاوٹ قابل تعریف تھے کتنا خرچ ہو گیا ہو گا؟

"تقریباً پانچ چھ ہزار روپئے۔"

"کتنے مہمان" پوچھا

"پانچ سو کے قریب تھے"

ایس۔ڈی۔ایم صاحب فرمانے لگیں اگر مہمانوں نے اس تقریب میں دو گھنٹے بھی صرف کئے تو ایک ہزار گھنٹے یعنی چھتیس دن بیکار گئے جن کی آپ کے نزدیک کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ اور ملک کے لحاظ سے یہ بہت بڑا نقصان ہے اگر یہ لوگ اپنے گھر رہتے تو کچھ نہ کچھ ضرور کرتے جو قوم کی تعمیر میں معاون ہوتا آپ نے ایک ہزار کام کے گھنٹوں کا خون کیا۔

ساتھ ہی رات گئے تک زور زور سے لاؤڈ اسپیکر سے پڑوسیوں کی نیند حرام کی جس میں نہ جانے کتنے بیمار ہوں گے اور انھیں نیند تک نصیب نہ ہوئی ہوگی۔ اور انھوں نے دل ہی دل میں آپ کو برا بھلا کہا ہوگا۔

آپ کی حیثیت کو دھیان میں رکھتے ہوئے سبھی مہمانوں نے کچھ نہ کچھ تحفے بھی دیئے ہوں گے جو ان کی جیب پر ناجائز بوجھ تھا اور اور آپ پر اس کا کوئی اثر ہی نہیں ہوا ہوگا۔ اس بجلی کی کمی کے زمانے میں آپ نے کافی بجلی بیکار گنوائی اگر یہ بجلی کسی کسان یا کسی کارخانے کو دی گئی ہوتی تو کتنی مفید رہتی۔ ان تمام باتوں کو سوچتے ہوئے تو آپ ملک کے دشمن ہوئے پانچ چھ ہزار روپئے یوں ہی خرچ کر ڈالے مگر آپ نے اپنے گھر بلا کر ایک قیمتی سبق ہمیں دیا۔ پنڈت موتی لال جی جب جواہر لال جی کا برتھ ڈے مناتے تھے تو ان کے وزن کے برابر اناج تول کر غریبوں میں بانٹ دیتے تھے۔

"ایس ڈی ایم صاحب۔ آپ نے میری آنکھیں کھول دیں میں دل سے آپ کی اس قیمتی رائے کی قدر کرتا ہوں اور اگلے سال جب آپ جنم دن کی تقریب پر یہاں تشریف لائیں گی تو یہ تقریب کسی دوسری ہی طرح منایا جا رہا ہوگا جس کو دیکھ کر آپ یقیناً خوش ہوں گی۔"

غزل

کے۔ کے۔ سنگھ میکشؔ

اب نہ دل کو سکوں ہے نہ آرام ہے
یہ وفاؤں کا جاں سوز انعام ہے

اُن کے رُخسار و گیسو ہیں پیشِ نظر
کیا نئی صبح ہے کیا نئی شام ہے

حُسن نے سب کو بخشا ہے جوشِ جنوں
عشق تو بے سبب یارو بدنام ہے

کیوں بہکنے کا الزام دیتے ہیں وہ
روپ جن کا چھلکتا ہوا جام ہے

پھر کسی پر تبسّم کی بجلی گری
ہر طرف اب ہے میکشؔ ایک کہرام ہے

بمبئی مرکنٹائل کوآپریٹو بنک لمیٹڈ

رجسٹرڈ آفس ۷۸ محمد علی روڈ بمبئی ۴۰۰۰۰۳

دہلی آفس نمبر ۳۶۵۵ نیتاجی سبھاش مارگ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

فون نمبر: ۲۶۸۲۶۶ - ۲۶۴۳۷۲

- ہمارے یہاں شرح سود تمام نیشنلائزڈ اور شیڈولڈ کمرشیل بنکوں کے مقابلہ ایک فیصد زیادہ ہے
- ہندوستان کا پہلا کوآپریٹو بنک جس کو زرمبادلہ میں کاروبار کے لئے لائسنس جاری کیا گیا۔
- ہمارے بنک میں اوقاف کی جمع شدہ رقم کی آمدنی دفعہ ۱۲(۵)(الف)(iii) انکم ٹیکس ایکٹ ۱۹۶۱ء کے تحت انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہے۔

اس کے علاوہ

- ہم آپ کے تمام آرام و آسائش کی ضروریات مہیا کرنے کے لئے آسان قسطوں پر قرضہ فراہم کرتے ہیں

ایک فیصدی کا فرق بہت بڑا فرق ہے یہ آپ کی رقم میں ہزاروں روپیہ کا اضافہ کرتا ہے۔ آپ بھی اس کا فائدہ اٹھائیں۔

زین جی رنگون والا	حسینی ایس، ڈاکٹر	شمیم کاظم
(منیجنگ ڈائرکٹر)	(چیئرمین)	(اسسٹنٹ جنرل منیجر، شمالی ہند)

کون سنگسار ہوا

اقبال متین

لوگوں نے مجھے بتایا کہ خان گرفتار کر لیا گیا ہے۔ان بتلانے والوں میں سب سے اونچی آواز میں جو بول رہا تھا وہ گٹار بجانے والا جا ڈس تھا جس کا اصلی نام جان ڈیوس تھا۔ لیکن لوگ اس کو جاڈس ہی پکارتے تھے۔

اینگلو انڈینس کی چھوٹی سی کالونی میں تقاریب کے موقعہ پر ڈیوس گٹار بجایا کرتا تھا۔

چاندنی راتوں میں قلعہ کی فصیل سے باہر ندی کے پل پر نوجوانوں کی جو بھی ٹولی نظر آتی اس میں خان صاحب اور ڈیوس دونوں ہی کی شمولیت ضروری ہوتی اور ڈیوس کے گٹار پر خان جھوم جھوم جاتا ڈیوس نے انجیل مقدس کی یہ عبارت سنائی جو اسے ازبر تھی اور لوگ خاموشی سے سننے لگے "قانا میں ایک شادی ہوئی اور یسوع کی ماں وہاں تھی اور یسوع اور اس کے شاگردوں کی بھی اس شادی میں دعوت تھی۔شراب کے کئی دور ہو گئے تو یسوع کی ماں نے اس سے کہا کہ ان کے پاس شراب نہیں رہی۔یسوع نے اس سے کہا اے عورت تجھے مجھ سے کیا کام ہے؟ — ابھی میرا وقت نہیں آیا۔ اس کی ماں نے خادموں سے کہا۔ جو کچھ یہ تم سے کہے وہ کرو۔ وہاں یہودیوں کی طہارت کے دستور کے مطابق پتھر کے چھ مٹکے رکھے تھے اور ان میں دو دو تین تین من کی گنجائش تھی۔ یسوع نے ان سے کہا مٹکوں میں پانی بھر دو۔پس انہوں نے ان کو لبالب بھر دیا۔پھر اس نے ان سے کہا اب نکال کر میر مجلس کے پاس لے جاؤ۔پس وہ لے گئے۔جب میر مجلس نے وہ پانی چکھا تو وہ شراب بن گیا۔

ڈیوس نے یہ کہہ کر لوگوں کی طرف دیکھا۔

سب کے سب اسی کا منہ تک رہے تھے۔میں سمجھ رہا تھا کہ ڈیوس کسی اور نئی بات کا انکشاف کرنے والا ہے۔لیکن اس نے ٹھنڈی سانس لی جو زیادہ ہی تھی اور کہنے لگا۔

یوحنا رسول کی معرفت لکھی گئی انجیل مقدس کی قسم خداوند یسوع خان کی مدد کرے گا"

میری طرح شاید سبھی لوگ جانتے تھے کہ خان کو کیوں گرفتار کیا جا سکتا ہے۔اسی لئے کسی نے مجھ سے نہ پوچھا اور ان میں کچھ ایسے بھی تھے جنہیں یہ بات معلوم ہوئی تھی۔ لیکن اس پر کسی نے بھی کچھ نہ پوچھا۔

وہ ڈیوس مجھ سے بہت قریب ہو گیا۔کہنے لگا سردار رنجیت سنگھ سے خان نے کہا تھا۔

تمہاری رات اجالوں سے منور ہوگی اور تمہارے قہقہے سناٹوں کا سینہ شق کریں گے اور تمہاری شادی کی تقریب میں میرے جیتے جی ایک بوند شراب کی کمی محسوس نہ ہوگی۔لیکن میں وہ گوشت نہیں کھاؤں گا جس سے تم تقریب میں تواضع کرو گے۔میرے لئے ذبح کئے ہوئے دنبے کے گوشت کا علیحدہ انتظام کرنا ہوگا۔

اور سردار رنجیت سنگھ نے قصائی تک آ کر خود ہی گوشت خریدا تھا اور اس نے کسی دوسرے سردار پر بھروسہ تک نہ کیا تھا کہ خان کے آگے کہیں جھٹکے کا گوشت نہ پیش کر دے اور سردار رنجیت سنگھ نے یقیناً خان کے لئے اپنی نگرانی میں گوشت پکوایا ہوگا —— اور اس کا منتظر ہوگا۔لیکن اب خان وہاں نہیں جا سکتا اس لئے کہ وہ گرفتار ہو گیا ہے۔

اس ضلع کے "خشک" DRY قرار دیئے جانے سے پہلے خان کی وجاہت کے ساتھ ساتھ اس کی خوردی کا بانکپن بھی نہ صرف سارے صوبے میں مشہور تھا بلکہ جوار میں بھی اس کی بات ہوتی تھی۔

خاکی رنگ کی کلف چڑھی وردی اپنے تن پہ کئے جب خان بستی میں نکلتا تو آس پاس کے لوگ دور دور تک کھڑے کھڑے پہلے سے خان کی آمد کا پتہ چلا لیتے۔چمڑے کا بیلٹ جس سے خان کی کمر کسی رہتی تھی خان نے بڑے اہتمام سے دھرمو لیدر ورکس میں تیار کروایا

تھا۔ رم، ابرانڈی اور وہسکی کے ٹریپ کنڈسٹ کے سہارے سینے پر لگے ہوئے ترچھے بلیٹ میں وہ اس طرح رکھ لیتا جیسے تمغے سجا رکھے ہوں۔ یہ بلیٹ بھی چمڑے کا تھا جس کو خان نے اپنی نگرانی میں دھرم لیدر ورکس ہی میں بنوایا تھا۔ کمر کی بلیٹ میں سوڈے کے شیشے لگے رہتے۔ کمر کی بلیٹ اور سینے کی بلیٹ جہاں ایک دوسرے سے ملتے تھے وہاں ایک چھوٹا سا چمڑے کا بکس لٹکا رہتا جس میں ابلے ہوئے دس بارہ انڈے رکھے جاتے تھے۔ کسی اسنو کی خالی شیشی میں پسا ہوا نمک اور کالی مرچ بھرے رہتے۔ خان اس طرح ضلع کا چلتا پھرتا میخانہ تھا۔

چاندنی راتوں میں فصیل کے باہر ندی کے پل پر جب ڈیوس کا گٹار اس کے ساتھیوں کو مسحور کر دیتا تو خان کو اپنے مال کے اچھے دام وصول ہو جاتے۔

جو کوئی اس سے کہتا ساقیا کہ وہ اس کی طرف بڑھتا۔ سینے کے بلیٹ سے ایک تمغہ کم ہو جاتا اور خان رم کا ڈھکن جھٹکا کر کھول دیتا۔ پھر کمر سے گلاس نکال کر آدھا پیگ یا پورا پیگ آرڈر کے مطابق گلاس میں ڈال دیتا۔ پھر بلیٹ کی ہک سے سوڈے کی کنجی نکال کر اس طرح سوڈا کھولتا کہ گٹار کے سروں میں سوڈا بوتل کے کھلنے کی آواز مل کر نزاد سے جاتی۔ ہاتھ بڑھا کر جیسے کوئی رند گلاس اس کے ہاتھ سے لے لیتا تو خان کی انگلیاں ابلے ہوئے انڈے کو بڑی پھرتی سے چھلکے سے جدا کر دیتیں اور پل کے نیچے ندی کے شفاف پانی میں چاند کے عکس سے دور سفید چھلکے تیرنے لگتے۔

پل کے ساتھ بعض نوجوان ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈالے تھرکنے لگتے۔ یہ الشاسیہ صا ناچ صرف ان کے دلوں کی ترنگ اور خان کے مے خانے کے اثر کی غمازی کرتا۔ جب ان کے پاس خرابے ختم ہونے لگتی یا یوں کہئے کہ یہ چلتا پھرتا خانہ خالی ہونے لگتا تو خان آخری پیگ ڈیوس کی طرف بطور [illegible] کرتا۔ یہ گویا اس کے فن کی قدردانی ہوتی۔

لیکن جب یہ ضلع "خشک" (DRY) قرار دیا گیا تو ندی کے پل پر سجنے والی محفلیں جیسے یک لخت اجڑ گئیں۔

خان کے لئے بڑی مشکل آ پڑی تھی — وہ شے جو اس کی شخصیت کے ساتھ وابستہ ہو گئی تھی۔ وہ پہناوا جو اس کی انفرادیت بن گیا تھا۔ وہی یکلخت اسے ترک کر دینا پڑا تھا۔

دیسی خان کے کاروبار میں مے فروشی کا بھی ایک حصہ تھا لیکن اس کو اپنے اس کاروبار کے ترک کرنے سے زیادہ اس بات کا افسوس تھا کہ اس کی وردی کے تمغے چھین گئے تھے اور اب بغیر اس سامان کے اس کی وردی میں کوئی دلکشی نہیں رہتی تھی۔ وہ دو دن تک گھر سے نہ نکلا۔ لوگ بے چین تھے کہ خان کو دیکھیں۔ دو ایک جو قریبی دوست تھے وہ اس کے گھر پر پہنچے لیکن اس کی بیوی نے اندر ہی سے جواب دے دیا کہ خان گھر میں نہیں ہے۔ نامراد واپس ہوئے تو انھوں نے دوسروں کو بتلایا کہ خان گھر پر رہ کر بھی ملنے سے گریز کر رہا ہے۔ تیسرا دن بھی یوں ہی گزر گیا اور خان بستی میں نظر نہ آیا۔

دودھ گھر کی سرسوتی بائی کو سب سے زیادہ فکر لاحق تھی۔ روزانہ پاؤ بھر دودھ اور اتنا ہی دہی صبح سویرے وہ بائی کی دوکان پر کھڑا غٹار جاتا تھا۔ تین دن سے اس کے نہ آنے کی وجہ سے بائی جی کو نقصان ہو رہا تھا۔

ڈیوس سب سے زیادہ بے کل تھا۔ چاندنی راتیں قریب آ رہی تھیں۔ ایک رات گزرتی تو دوسری رات زیادہ چاندنی اپنے جلو میں لے کر چلی آتی۔ دمکتا ہوا چاند ہر شب ندی کے پانی میں نہانے کے لئے اترتا اور اس کا مکھڑا زیادہ ہی نکھر آتا۔ خان کے دوستوں کی ٹولی دو ایک بار سرِ شام فصیل کے باہر ندی کے پل پر گئی لیکن جلدی لوٹ آئی کیونکہ ڈیوس نے اپنا گٹار بھی ساتھ نہیں رکھا تھا۔

ڈیوس نے دل ہی دل میں سوچا — میں جاؤں گا تو خان ضرور مجھ سے ملے گا۔

اور رات گئے عام راستے سے ہٹ کر وہ چکر کاٹتا ہوا خان کے گھر پہنچا کیونکہ درمیان میں دو ایک دوسرے دوستوں کے گھر بھی ملتے تھے اور ڈیوس چاہتا تھا کہ وہ تنہا خان سے ملے۔

خان کی بیوی نے جب ڈیوس کا نام سنا تو اس کو باہر ہی روک کر وہ دروازے تک چلی آئی۔ اس نے بتایا کہ خان ابھی ابھی گھر سے نکلا ہے۔ وہسکی کی بوتل بھی اس کے ساتھ ہے۔ اس نے بہت منع کیا۔ لیکن وہ خان نہیں مانا۔ وہ ڈر رہی ہے کہ خان گرفتار نہ ہو جائے۔

ڈیوس لمحہ بھر خاموش رہا — پھر اس نے کہا۔

خداوند یسوع اس کی مدد کرے گا۔ خدا کا بیٹا جس نے جنم کے اندھے کو آنکھیں عطا کیں۔

اور ڈیوس سوار ہو گیا۔ اس نے بستی کا چکر کاٹ کر فصیل کے پیچھے کی اور سے ندی کا رخ کیا۔ اس کو خیال گزرا کہ خان یقیناً پل پر ہوگا اور تنہا بیٹھا ہوا شراب سے جی بہلا رہا ہوگا۔

ڈیوس لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا جب پل پر نمودار ہوا تو خان نے اسے پس و پیش کر کے اس کو پہچان لیا۔ ایک ثانیے کے لئے خوف کی پرچھائیں خان کے دل سے ہو کر گزر گئیں۔ لیکن اس نے ندی کے پانی میں پتھر پھینک کر چاند کے عکس کو درہم برہم کر دیا اور ڈیوس کو یہ جتانے کی کوشش کی کہ وہ اس وقت بھی نہیں ڈرا تھا جب کہ اس نے ڈیوس کو نہیں پہچانا تھا۔

خان نے گلاس بھر کر ڈیوس کی طرف بڑھایا
لیکن ڈیوس نے ہاتھ بڑھانے میں بہت دیر کی۔

"ڈرتے ہو؟" خان نے پوچھا۔

"ہاں ڈرتا ہوں ـــ اس لئے کہ تم اگر اسی راستے پر چلتے رہے تو ملنے جلنے والے تم سے کٹ جائیں گے۔ تمہارے دوست تمہیں پہچان کر بھی نہیں پہچانیں گے۔ اور ـــ اور اس طرح ہم ایک دوسرے کو کھو دیں گے۔"

"کیا تم ابھی ابھی انجیل پڑھ کر آ رہے ہو؟ تم انجیل مقدس کی تبلیغ بھی اسی ڈھب سے کرتے ہو جیسے اس وقت مجھ سے کلام کر رہے ہو ـــ" خان یہ کہہ کر ڈیوس کو تیز نظروں سے دیکھنے لگا۔

ڈیوس نے ایک ہی سانس میں سارا گلاس خالی کر دیا۔ "شراب کی قسم میرے بیٹے کا یقین نہ ہوا اگر میں تمہیں اس راستے سے ہٹا نہ لوں"

"کیا کہتے ہو" خان بھڑک گیا۔

"یسوع کا کوئی پیرو ایسی بات نہیں کرتا جو نیک ہے"

"ہاں لیکن جو کا نہیں ـــ اور یہ بات تم نے اس لئے کی کہ تمہارا اپنا بیٹا نہیں ہے"

"اور جو ہوتا تو بھی میں یہی بات کرتا" ڈیوس نے کہا۔

"لیکن میں کل تک برا نہ تھا۔ آج کیوں اتنا برا ہو گیا ہوں اور تم مجھے دوستوں سے کنارہ کرنے سے ڈراتے ہو"

"تم بھولے نہیں ہو ـــ میں نے کب کہا کہ تم برے ہو گئے ہو۔ لیکن

تمہیں یہ زمین چھوڑ دینی ہوگی۔ جس کی مٹی سے تم بنے ہو۔ یا پھر یہ راستہ چھوڑ دینا ہوگا جس پر تم چل رہے ہو اور جو اس زمین پر دور تک نہیں جا سکتا"

"میں سوچ رہا ہوں" خان نے کہا "کہ یہ زمین چھوڑ دوں گا"

"لیکن یہ وردی نہیں چھوڑو گے جو تم آج بھی پہنے ہوئے ہو اور جس میں آج بھی وہسکی اور رم کی بوتلیں تم نے لگا رکھی ہیں"

"یہی تو میں سوچ رہا ہوں۔ یہ وردی میرا اصلی روپ ہے۔ میں اپنے اس لبادے کو چھوڑ کر خود کو ننگا محسوس کرتا ہوں اور بستی میں نکلتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے۔"

"کہاں جاؤ گے"

"میرا ایک بھائی ہے ـ بہت قریب کے ضلع میں ـ جہاں ایسی کوئی پابندی نہیں ہے"

"اور ہم تمہارے کوئی نہیں ہیں ـــ یہ ندی ـ ندی میں نہاتا ہوا چاند تمہارا نہیں ہے" وہ قہقہے جو اس وقت تمہارے قریب نہیں ہیں لیکن کل تمہارا پیچھا کرنے والے ہیں کیا وہ بھی تمہارے نہیں ہیں۔ میرا گناہ جیسے میں نے تمہاری روایتوں کے بھید جانا تک نہیں ہے وہ بھی تمہارا نہیں ہے۔ تم یہ زمین آسانی سے چھوڑ سکو گے؟ ـــ تم سمجھتے ہو کہ جب تم جانے لگو گے تو یہ زمین تمہارے پیر نہیں پکڑے گی۔ شراب کی خواہش کس کو نہیں ہے۔ کیا میں اس کا رسیا نہیں ہوں؟"

خان کچھ کہے بغیر انڈا چھیلنے لگا۔ اس نے انڈا اپنے منہ میں ڈال کر گلاس کو شراب سے بھر دیا اور ڈیوس کی طرف بڑھا دیا۔ ڈیوس نے اب کی بار پس و پیش سے کام نہیں لیا۔ لیکن دونوں خاموش رہے۔ کسی نے ایک دوسرے سے بات نہیں کی۔ جب ڈیوس پی چکا تو انڈا اس کی طرف بڑھاتے ہوئے خان نے کہا۔

"تم مجھے عزیز رکھتے ہو؟"

ڈیوس نے کہا: "ہاں میں تمہیں بے حد عزیز رکھتا ہوں"

خان خاموش ہو گیا۔ اس نے گلاس بھرا اور غٹاغٹ پی گیا۔ انڈا چھیلتے ہوئے اس نے پھر پوچھا۔

"تو تم مجھے عزیز رکھتے ہو"

ڈیوس نے برا مانتے ہوئے کہا۔

"خداوند یسوع نے جب یہی سوال تیسری بار اپنے چہیتے شاگرد

ضرورت سے کیا تھا تو اس کے دل کو تکلیف ہوئی تھی ۔ تم اور میں تو ان کے پاؤں کی خاک بھی نہیں ہیں ۔ اور میں تو بہت چھوٹا آدمی ہوں ۔ پھر بھی تم اپنے جاندس پر بھروسہ تو کر سکتے ہو اگر نہیں کر سکتے تو زبان کیوں کھولتے ہو ۔ مجھے آزمائش میں مبتلا کیوں کرتے ہو ؟"

اسی لئے کہ میں تم پر بھروسہ کرتا ہوں "

"پھر بتاتے کیوں نہیں ؟"

"مجھے پہلے یہ بتاؤ کہ تم یہاں کیسے آگئے " خان نے ڈیوس سے پوچھا ۔

"جب تم اتنے دنوں سے نہیں ملے تو میں تمہارے گھر گیا تھا ۔ تمہاری بیوی نے مجھ پر بھروسہ کیا ۔ اس نے مجھ سے کہا کہ تم باہر گئے ہوئے ہو اور اسی طرح گئے ہو جس طرح تم روز ہی گھر سے نکلتے تھے ۔

خان کا چہرہ چمک اٹھا ۔ " اس نے اچھا کیا " وہ کہنے لگا ۔ "تم گویا میری مدد کو بھیجے گئے ہو "

"اب بتاؤ بھی ۔ میں تمہارے کیا کام آسکتا ہوں ؟"

"لو یہ بھی کچھ پی لیں " کچھ دیر توقف کرکے خان پھر کہنے لگا " رنجیت سنگھ میں نے زبان دی تھی ۔ اس وقت تک یہ نیا قانون نافذ نہیں ہوا تھا ۔ اس کے ہی گاؤں میں اس کی بیٹی کی شادی ہے ۔ اس کو نئے قانون کے نفاذ کی اطلاع بھی نہیں ہے کیونکہ وہ دور دراز گاؤں میں ہے ۔ مال اس تک نہیں پہنچے گا ۔ تو اس بڑی سبکی ہوگی ۔ میرا آدمی تمہارے ساتھ رہے گا ۔ جسے میں تمہیں شراب کے پیپے لے کے پہنچانا ہے ۔ اسے ساری باتیں بتلا دینا کہ صبح ہونے تک اگر شراب ختم ہو تو وہ نئے لے کر دے ۔ میں سرحد ہی پر رہوں گا تاکہ پکڑا جاؤں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ پولیس کو پتہ چل گیا ہے ۔ وہ مجھے گرفتار کریں گے تو پھر مطمئن ہوگی اور رنجیت سنگھ تک پہنچنے کی کوئی بھی زحمت نہیں کرے گا ۔

"تم خود کو گرفتاری سے نہیں بچا سکتے ؟"

"بالکل نہیں ۔ اور اگر بچا لوں تو رنجیت سنگھ کے رنگ میں بھنگ پڑ جائے گا مجھے کسی قیمت پر گوارا نہیں ہے ۔"

"تو پھر اٹھو ۔ خداوند یسوع ہماری مدد کرے گا "

ڈیوس خان سے پہلے کھڑا ہو گیا ۔

بچی کھچی انھوں نے ہاتھوں سے بہا لی ۔

خالی بوتلیں مٹی میں گرا کر انھوں نے ماچس کی تیلی میں پھینک دیں جو تھوڑا آدھا بچا گئیں پل پار کرکے جب وہ جنگل کی طرف روانہ ہوئے تو گھنے درختوں کے سائے میں پہنچے سے بعد ڈیوس نے کہا ۔

تم جانتے ہو کہ یہ چاندنی کیا ہے جو تمہارے لئے میرے طرف سے بچھی ہوئی ہے ۔ اور جو ہمارے دلوں کا راز جانتی ہے کہ ہم کیوں اس کا ساتھ چھوڑ کر گھنے جنگل کی گہری تاریکی میں غرور کر چھپ رہے ہیں ۔

"ہاں " خان نے سینہ تان کر کہا کہ میں جانتا ہوں ۔

"تو پھر مجھ سے وعدہ کرو کہ تم اس زمین کو نہیں چھوڑو گے جس پر تم نے جنم لیا مجھ سے وعدہ کرو کہ یہ چاندنی ہم پر حرام ہوگی اگر وہ کسی اور خطۂ زمین پر ہمیں ملے " خان نے ڈیوس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں کی گرفت میں لے لئے اور اتنے زور سے دبایا کہ ڈیوس مسکرا کر بھی تڑپ اٹھا ۔ اس نے اپنے ہاتھ خان کی گرفت سے کھینچ کر اس وقت تک جدا نہیں کئے جب تک کہ خان کی گرفت خود ڈھیلی نہ پڑ گئی ۔ اور پھر دونوں روانہ ہو گئے ۔

دیکھتے ہوئے چاند نے اور اس کی چھلکی ہوئی چاندنی نے انھیں تاریکیوں کو سونپ دیا اور پھر صبح کا سورج طلوع ہونے سے پہلے ڈیوس اپنے گھر لوٹ چکا تھا ۔

اور جب صبح کا سورج طلوع ہوا تو لوگوں نے مجھے بتایا کہ خان گرفتار کر لیا گیا ان بتلانے والوں میں سب سے اونچی آواز میں جو بول رہا تھا وہ گیارہ برس کا ننھا جاندس تھا جس کا اصلی نام جان ڈیوس تھا لیکن لوگ اس کو جاندس ہی پکارتے تھے ۔

اس نے مقدس انجیل سے ماخوذ قانا کی گلیل میں شادی کا قصہ سنایا تو سب کے سب اس کا منہ تک رہے تھے ۔ میں سمجھ رہا تھا کہ ڈیوس کسی نئی بات کا انکشاف کرے گا ۔ لیکن اس نے ٹھنڈی سانس لی جو زیادہ لمبی نہ تھی اور کہنے لگا ۔

یوحنا رسول کی معرفت لکھی گئی انجیل مقدس کی قسم خداوند یسوع خان کی مدد کرے گا ۔

صبح سویرے جب خداوند یسوع ہیکل میں آیا اور سب لوگ اس کے پاس آئے اور وہ بیٹھ کر انہیں تعلیم دینے لگا اور فقیہ اور فریسی ایک عورت کو لائے جو زنا میں پکڑی گئی تھی اور اسے بیچ میں کھڑا کرکے یسوع سے کہا ۔ اے استاد یہ عورت زنا میں عین فعل کے وقت پکڑی گئی ہے ۔ توریت میں موسیٰ نے ہم کو حکم دیا ہے کہ ایسی عورتوں کو سنگسار کریں ۔ پس تو اس عورت کی نسبت کیا کہتا ہے ...... یسوع جھک کر انگلی سے زمین پر لکھنے لگا ۔ وہ یہ سن کر بڑوں سے لے کر چھوٹوں تک ایک ایک کرکے سب نکل گئے ۔ اور یسوع اکیلا رہ گیا اور عورت وہیں بیچ میں رہ گئی یسوع نے سیدھے ہو کر اس سے کہا اے عورت یہ لوگ کہاں گئے کیا تجھ پر کسی نے حکم نہیں لگایا ؟ اس نے کہا اے خداوند باقی

اُردو زبان کی اہم اور مُفید کُتب

آبِ حیات	محمد حسین آزاد	۹/-
سخندانِ فارس	"	۱۲/۵۰
مبادی فلسفہ	عبدالماجد دریا بادی	۱۰/-
گنجینۂ تحقیق	بیخود موہانی	۱۰/۵۰
یادگارِ غالب	الطاف حسین حالی	۸/-
بیسویں صدی کے	مرزا جعفر حسین	
بعض لکھنوی ادیب اپنے تہذیبی پس منظر میں		۳/-
دلی کا دبستانِ شاعری	نورالحسن ہاشمی	۲۲/۵۰
اُردو مثنوی کا ارتقاء	سید عقیل رضوی	۱۵/-
اُردو مرثیے کا ارتقاء	مسیح الزماں	۲۰/۵۰
اُردو تنقید کا ارتقاء	"	۶/-
اُردو قصیدہ نگاری تنقیدی جائزہ	محمود الٰہی	۱۵/۵۰
ساغر نظامی شخصیت اور فن مع انتخاب کلام	ضامن مرادآبادی	۴۵/-
جگر مرادآبادی ایک مطالعہ	"	۲۵/-
خطبۂ صدارت سے	ضیاء فتح آبادی	۱۵/-
ہندی کے مسلمان شعراء	رتن پنڈوروی	۵۱/-
سرمایۂ بلاغت	"	۴۰/-
فنِ تاریخ گوئی	"	۱۵/-
سر مغفرت منظوم ترجمہ گیتا	"	۱۲/-
آخری نظر شاعری	"	۱۵/-
بہشتِ نظر "	"	۲۰/-
پیامِ نظر "	"	۱۵/-
اندازِ نظر "	"	۱۵/-
رباعیاتِ رتن "	"	۵/-
شفق شجر	باقی	۲۵/-
غزالانِ جمیل	جمیل مظہری	۲۵/-

انتخاب طلسم ہوشربا	حسن عسکری	۱۶/-
اُردو شاعری میں قومی یکجہتی کی روایت	سید مجاور حسین	۲۰/-
اُردو میں قومی شاعری کے سو سال	علی جواد زیدی	۱۷/-
خواب خواب سفر	رام لعل	۷۵/-
زرد پتوں کی بہار	"	۱۳/-
معصوم آنکھوں کا بھرم	"	۱۰/-
اُردو میں خود نوشت سوانح حیات	ڈاکٹر صبیحہ انور	۷۵/-
نئے افسانے کا سلسلۂ عمل	مہدی جعفر	۳۰/-
لو لیٹے	اوپندر ناتھ اشک	۱۵/-
انجو باجی	"	۳۰/-
گرداب	"	۱۵/-
جنت کی تلاش	"	۲۰/-
ننو میرا دشمن	"	۱۵/-
گرتی دیواریں	"	۷۵/-
چھپا بیٹھا	"	۱۵/-
سکھ دکھ	کوشلیا اشک	۱۵/-
پینترے	اوپندر ناتھ اشک	۱۵/-
پتھر الپتھر	"	۲۰/-
تبصرے	کریم الاحسانی	۳۰/-
ادب کی تلاش	ہیراج کومل	۳۰/-
صبح و شام	ل۔ احمد اکبرآبادی	۱۲/۵۰
زندگی کے کھیل	"	۱۲/۵۰
ملاحظاتِ نفسی	"	۷/۵۰
ادبی تاثرات	"	۱۷/۷۵

مشارق ادب	ساحل احمد	۲۰/-	نتھ کا غرور	واجدہ تبسم	۳۰/-
وہ فقیر اور	بسمل کرشن اشک	۱۰/-	نتھ اتروائی	"	۳۰/-
سحر حرف	ساحر ہوشیارپوری	۲۰/-	سنگسار کمرے میں	کرشنا کماری	۱۰/-
سحر نغمہ	"	۱۵/	اسلامی نام	مکتبہ دینیات	۱۶/-
اردو کی عشقیہ مثنویاں	شہناز سلطانہ	۱۴/-	روشنی کے مینار	بزرگوں کے حالات	۲۰/-
اپنا دامن اپنی آگ	کیول دھیر	۳۰/-	آئینۂ عملیات		۲۰/
بکھری ہوئی زندگی	"	۳۰/-	اندھیری رات کے مسافر	نسیم حجازی	۲۰/-
اعتراف	گوہر عثمانی	۲۵/-	داستان مجاہد	"	۲/-
غزل سالوری	بیکل اتساہی	۲۰/-	پاکستان ایکسپریس	خوشونت سنگھ	۳۰/-
چراغ منزل	دواکر راہی	۲۵/-	ذکالی	مظہر الحق علوی	۸/-
گلدستہ (مشاعرے)	عروج ادب	۱۵/-	سورج کا لہو	"	۳۶/-
روح نظیر	نظیر اکبرآبادی	۲۰/۵۰	اندر کا آدمی	الیاس سیتاپوری	۱۵/-
پل صراط	موسیٰ مجروح	۲۵/-	حرم سرا کا محبوب	"	۱۵/-
بے اسرار افسانے	سردار حسین	۲۰/-	حرم سرا	"	۱۵/-
کتاب غزل	حفیظ بنارسی	۲۵/-	چاند کا خدا	"	۱۵/-
لختِ جگر	جگر جالندھری	۱۰/۲۵	دیوی کے پرستار	"	۱۵/-
خونِ جگر	"	۲۵/-	راگ کا بدن	"	۱۰/-
شہید انسانیت	علی نقی نقوی	۴۰/-	شہزادی کا نیلام	"	۱۵/-
آدھا راستہ	کرشن چندر	۱۶/-	بالا خانے کی دلہن	"	۱۵/-
الجھی لڑکی کالے بال	"	۱۵/-	داستانِ حور	"	۱۵/-
جیسے دریا	واجدہ تبسم	۲۵/-	عجائب خانۂ عشق	"	۱۵/-
پھول کھلنے دو	"	۳۰/	کشمیر کی کلی	"	۱۶/-
اترن	"	۳۰/-	یادوں کی برات	جوش ملیح آبادی	۲۰/-
کیسے سمجھاؤں	"	۱۵/-	غبارِ شب	قاضی عبدالستار	۱۶/-
روزی کا سوال	"	۱۵/-	چار چہرے	سہیل عظیم آبادی	۱۲/-
کیسے کاٹوں رین اندھیری	"	۱۵/-	حرفِ زیر لب	عفت بانو زیبا	۶/-
نتھ کا بوجھ	"	۳۰/-	ہنوز شیشۂ گراں	کیسرہ کشور	۱۲/-
نتھ کی عزت	"	۳۰/-	ڈالی کا جوگ	حامد اللہ افسر	۱۵/-
نتھ کا زخم	"	۳۰/-	خودگزشت	برجیس طلعت	۱۵/-

دفتر ماہنامہ شان ہند - فلیٹ ۸ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

احمد حسین شمس ایڈووکیٹ
دکشن گنج،

اور دھرتی کانپ اٹھی

چھٹی قسط

لوگوں نے ہر شعر پر دل کھول کر داد دی، میاں فہمی پھولے نہ سمائے ہر شعر پر جھک جھک کر سلام کرتے ہیں اور داد طلب نگاہوں سے اپنے دوستوں کو دیکھتے ہیں مگر دوستوں کو شعر کے حسن و قبح سے کیا نسبت انھیں تو ایک مشغلہ ملنا چاہیئے خوب خوب داد دی گئی محفل کا رنگ بدل گیا کشن لال اپنی قسمت پر ناز کرنے لگے حسین بخش شعر سنتے جاتے اور اپنے ہاتھ فرش پر مارتے جاتے تھے چیخ چیخ کر داد دے رہے تھے وہ۔

تھوڑی دیر کے بعد محفل شانت ہوئی۔ نوکر نے آکر کہا سب ٹھیک ہے سب دسترخوان پر جا بیٹھے کھانا کھاتے وقت بھی فہمی شعرگوئی سے باز نہ آئے کھانے کے ہر ہر آئیٹم پر انھوں نے ایک ایک شعر فی البدیہہ کہا احباب لطف لے لے کر کھا بھی رہے تھے اور شعر بھی سن رہے تھے۔

کھانے سے فارغ ہوتے ہوتے دس بج گئے گوپال گنج کے احباب نے رخصت چاہی فہمی نے پھر آئندہ سنیچر کو ملنے کا وعدہ کیا اور پھر ایک ایک کر کے تمام دوست رخصت ہو گئے اب اس جگہ رہ گئے صرف میاں حسین بخش۔

حسین بخش نے کہا۔ کشن لال اب مجھے بھی جانے دو۔

"یار ٹھہرو بھی ابھی دعوت خصوصی تو ہوئی ہی نہیں"

"بیگم راہ دیکھ رہی ہوں گی"

"ٹھیک کہا تھا فہمی نے واقعی تم زن مرید ہو"

"مگر رات زیادہ ہو رہی ہے"

"ارے میاں شیر تو نہیں بیٹھا ہے کہو تو تمہاری فٹن واپس کرادوں اور کہلوا بھیجوں۔ کہ آج رات میاں صاحب یہیں قیام کریں گے حسین بخش؟ ارے اس سوال کو [illegible] میں ان دنوں تنہا ہوں میں بھی پریشان رہتا ہوں اور تم بھی خانگی معاملات میں الجھے رہتے ہو آج موقع ملا ہے ذرا دل کھول کر ہنس بول تو لیں۔

حسین بخش نے کہا۔ بات تو مجھے بھی تم سے کچھ کرنی ہے اچھا ذرا کوچوان کو آواز تو دینا۔

کوچوان کے آنے پر میاں حسین بخش نے اسے فٹن واپس لے جانے کو کہا وہ آج رات یہیں قیام کریں گے۔

بیٹھک سے اٹھ کر یہ دونوں دوست کشن لال کے خاص کمرے میں آ گئے یہ کمرہ تو عروس کی طرح موجودہ ساری آرائشوں سے مزین تھا حسین بخش پلنگ پر لیٹ گئے۔

کشن لال نے کہا۔ ذرا ٹھہرو میں بھی کھانے سے فارغ ہو لوں

"میں یہاں اکیلے بیٹھا رہوں"

"نہیں جناب دل بہلانے کے سامان بھی ہیں" کشن لال یہ کہہ کر واپس چلے گئے اور تھوڑی دیر کے بعد حسین بخش کے کانوں میں پائل کی سرور آمیز جھنکار آنے لگی وہ اٹھ بیٹھے اور گھبرا گھبرا کر دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔ ابھی وہ ادھر ادھر جھانک ہی رہے تھے ایک خوبصورت دوشیزہ زیوروں سے آراستہ پیراستہ ناک میں ایک بڑا سا نتھ پہنے دروازے پر کھڑی تھی میاں حسین بخش اچھل پڑے۔ پلنگ سے اتر کر دو قدم آگے بڑھے حسینہ نے جھک جھک کر سلام کیا۔

"اچھا تو آپ ہیں جس کے لئے کشن لال نے مجھے روک رکھا ہے" اور انھوں نے ہاتھ بڑھا کر اس حسینہ کا ہاتھ تھام لیا۔

"اک ادائے معشوقانہ کے ساتھ اس حسینہ نے کہا۔ آپ کی کنیز"

"کنیز نہ کہئے آپ تو حسن و شباب کی وہ دیوی ہیں جس کی پوجا کرنا عین ثواب ہے۔ آپ کنیز نہیں ملکہ ہیں کیا نام ہے آپ کا...؟" حسین بخش کے دل میں ایک عجیب گدگدی پیدا ہو رہی تھی وہ بے تحاشہ ہنسنا چاہتے تھے۔ مگر ان کا دل

ضبط سے کام لیا دل ہی دل میں کشن لال کے حسنِ انتخاب کی داد
دے رہے تھے۔

"مجھے زہرا کہتے ہیں"

ابھو گوپال گنج کی مشہور مغنیہ آئیے تشریف لائیے آپ کا میرے
پاس پلنگ پر بیٹھنے میں کوئی اعتراض تو نہ ہوگا۔

"آپ حد سے زیادہ میری عزت افزائی کر رہے ہیں کہاں آپ
بال میں" حسینہ مسکرانا چاہتی تھی۔

آپ کو دیکھ کر میں اپنی قسمت پر ناز کرتا ہوں آپ نے میرے
دل مردہ چمن میں بہار لادی ہے جی چاہتا ہے آپ کو سینہ سے لگا لوں"
سوا تین حسین بخش نے کچھ ایسا انداز دکھایا ظاہر کیا حسینہ ہاتھ چھڑا
کر جا کھڑی ہوئی وہ پشت سے سرک کر زمین پر آ رہا حسین بخش
خود جھک کر اسے اٹھایا اور حسینہ کو لے کر پلنگ پر بیٹھ گئے۔

"حسین بخش نے کہا۔ آپ کے حسن کی شہرت سنی تھی مگر
جو دیدار آج نصیب ہوا آپ انسان نہیں چاند کا ٹکڑا ہیں جیسے
شراب اور شہد میں گھول کر انسانی شکل صورت میں خدا نے پیش کیا
ہو قدرت کی کاریگریوں کا بہترین نمونہ اور پھر آپ کا شباب ماشاء اللہ
شراب کی چھلکتی ہوئی مینا"

"اب آپ شاعری کرنے لگے" زہرا مسکرائی اور ایک ایسا
انداز جو بالکل مصنوعی تھا اپنے چہرے پر لانے کی کوشش کی زہرا ایسے
روز ایسے ایسے تعریفی اور خوشامدانہ جملے سنتے سنتے بہرے ہو گئے
ہر عاشق نے اس کے حسن کی تعریف کی ہر شخص اس سے محبت
کا دم بھرتا تھا ہر رات زہرا کے خلوت کدے میں ایک
عاشق آتا اور چند گھنٹے دل بہلا کر رخصت ہو جاتا تھا ہاں جاتے
وقت چاندی کے چند سکے اس کی طرف پھینکتا بھی جاتا تھا زہرا
اپنی عصمت و شباب کا سودا چاندی کے چند سکوں پر کرتی ماحول
نے اسے یہ سمجھنے پر مجبور کر رکھا تھا کہ عصمت درحقیقت دولت ہی
کا دوسرا نام ہے مرد روپے لٹاتے اور وہ اپنی جوانی لٹاتی تھی اور
پھر ہر رات نئے ساتھی سے بے خبر دوسری شب کے انتظار میں سو رہتی تھی
ہاں وہ اپنے طوائف تھی اس پر ہر مرد کا حق تھا وہ اس قوم کی
ایک فرد تھی جسے سماج بری نظروں سے دیکھنے کے باوجود اس
کے قدموں پر سر رکھتا تھا اس کے خلوت خانہ راز شہر کے اوباش اور نو

اس قسم کے لوگ نہ تھے بلکہ ہر قسم کے انسان زمیندار سے لے کر
بیا پاری، مجسٹریٹ بھی اور چپراسی بھی، وکیل مختار ساہوکار اگر سے
لے کر لیڈران قوم تک ہر شخص اس کی شمع جہاں سوز کا پروانہ تھا
جس کو بھی جیب میں روپے ہوں وہ اس سے دل بہلا سکتا تھا اس
کے بڑے سے بڑے برہمن کی قید نہ تھی وہ ایک بہتی گنگا تھی جس میں
ہر شخص ہاتھ دھو سکتا تھا اور جو بھی آیا اس نے اس کے حسن کی
تعریف کی اس قسم کے تعریفی جملوں سے زہرا شروع شروع میں
بہت محظوظ ہوتی تھی مگر رفتہ رفتہ یہ جملے یاد ہو گئے کہ ہر مرد اسی
قسم کے جملے بولتا ہے اور اس کا مقصد صرف اس کے جسم سے لطف
اندوز ہونا ہوتا ہے وہ اپنا حسین موقع جو چند منٹوں کے بعد
بالکل عریاں ہو جاتا تھا ہر شخص کے پاس پیش کرتی تھی اور
جب مرد کی تشنگی اس کی پیش کی ہوئی شراب سے رفع ہو جاتی تو
پھر وہی مرد دوسرے دن طوائفوں کے خلاف تقریریں کرتا اور بڑے
بڑے مدلل مضامین شائع کراتا تھا چند برسوں کی اس متضاد
تجربوں نے زہرا کو بالکل بے حس بنا ڈالا تھا اب ایسے میٹھے میٹھے
جملے سے وہ قطعی متاثر نہ ہوتی تھی۔ مگر ان لالچی اور مغلوب
الشہوت مردوں کو خوش کرنے کے لئے وہ بھی انھیں جملوں کا اعادہ
کرتی جیسے وہ بار بار بول چکی تھی۔

میاں حسین بخش نے کہا۔ میں شاعری نہیں کرتا یہ ایک حقیقت
ہے جو بے ساختہ زبان پر آگئی۔ واقعی خدا نے آپ کو حسن دل
آویز بخشا ہے کہ بذات خود جان غزل ہیں آپ کے تو رشکن حسن کو
دیکھ کر فرشتوں کے منہ میں بھی پانی آ جائے۔ یہ کوئی غیر ممکن نہیں۔

حسین بخش نے اسے اپنی آغوش کی طرف کھینچا یہ فدان سے
دور کھسک گئی اور اس ادا سے ان کی طرف مسکرا کر دیکھا کہ حسین
بخش کلیجہ تھام کر رہ گئے۔ انھوں نے کہا۔ خدا جب حسن دیتا ہے
نزاکت آ ہی جاتی ہے"

"زہرا نے مسکرا کر کہا۔ آپ بہت جلد موج میں آ گئے"

"آپ کو دیکھ کر صبر کی تاب بھلا کسے رہ سکے"

"ذرا ٹھہریئے ابھی بابو کشن لال آئے ہوں گے"

"تو کیا آپ کو میرے صبر کا امتحان مقصود ہے"

"نہیں بلکہ بابو صاحب کا انتظار"

"تو یہ کہیے آپ کو کشن لال منظور نہیں۔ ہاں بھئی کیوں نہیں میرے چہرے پر بالشت بھر داڑھی جو ہے اور کشن لال تو سینگ کٹا کر بچھڑوں میں شامل ہو گیا ہے۔"

"کیسی بات کہتے ہو حسین بخش" کہتے ہوئے کشن لال کمرے میں داخل ہوئے "یہ زہرہ بائی تمہاری نذر ہیں رات بھر تم اس کوہ قاف کی پری کے ساتھ اڑتے رہو گے اس پری کی صحبت اٹھانے سے پہلے لال پری کی بھی صحبت از بس ضروری ہے کیوں؟"

"واہ واہ کیا بات کہہ دی کشن لال تم نے" حسین بخش بول اٹھے۔ "اب میں دعوتِ خصوصی کا مفہوم سمجھا واقعی کشن لال چراغ لے کر ڈھونڈو تو بھی تمہارے جیسا ہمدم و ہمراز نہ ملے ایک تو بذاتِ خود زہرہ بائی بھی شراب تھیں اس پر تم نے ..."

"شیمپین ہے" حسین بخش بیہوش ہو گئے تو سب جھوم اٹھے۔

"ارے بھائی کشن لال تم نے تو مجھے بے داموں خرید لیا اتنا نوازتے ہو کہ مجھے ...... شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔"

"بس تمہارا بجیوں آ گیا اسے بھی یہ دولت آخر کس دن کام آئے گی آج ہی سلیم سیٹھ کی ساری چیزیں میں نے ہڑپ کر لی ہیں تمہارا ڈیڑھ سو روپیہ بھی ادا ہو گیا اور نفع میں مجھے ...."

"اچھا تو ڈیوتا تم جیسے حسب کی تعریف میں وہ رطب اللسان ہے اسے یقینی نہیں سوداگری۔"

"میں نے کہا۔ آج اس خوشی میں ایک بہترین پارٹی ہو۔ ہاں تو شراب میں سوڈا ملا دوں؟" کشن لال نے پوچھا۔

"میں تو شراب میں سوڈا ملانا حرام سمجھتا ہوں اس کی ساری تلخی دور ہو جاتی ہے"

"اچھا تو یوں ہی سہی"

"اور پھر لو تیز کا گاگ کھلا سرخ سرخ شراب بلوریں ساغر میں لہرانے لگی زہرہ بائی ساقی بنی اور یہ دونوں دوست اس کے دستِ ناز سے شراب لے لے کر ایک دوسرے کے جامِ صحت پینے لگے

"کشن لال نے کہا۔ حسین بخش تم ایک شادی کر لو"

"کیا زہرہ بائی سے؟"

"زہرہ بائی تو خیر اپنی ہیں ان میں تو ہم دونوں کا حق مساوی ہے اگرچہ آج رات بھر کے لئے یہ صرف تمہاری ہیں مگر میرا مقصد ہے تم کسی حسین نوجوان لڑکی سے شادی کر لو شاید بھگوان خوش ہو کر تمہیں کوئی اولاد بخش دے آخر تمہاری جائداد کا وارث تو ہونا چاہیئے۔"

"آج مولوی عنایت اللہ نے بھی یہی بات کہی تھی"

"اسی لئے میں نے ہی تمہارے پاس بھیجا تھا عشرتی نام کی ایک لڑکی ہے۔ بس زہرہ بائی سے ذرا انیس ہوں گی۔ دیکھو گے تو رام قسم لٹو کی طرح ناچنے لگو گے"

"ایک گھونٹ پی کر حسین بخش نے کہا۔ سیر دم بتوما یہ خوشی یہاں شراب پی کر جب دونوں دوست کافی نشے میں آ گئے تو دونوں زہرہ کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر ناچنے لگے زہرہ ان دونوں کی حرکت دیکھ کر دل ہی دل مسکرا رہی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد کشن لال شب بخیر کہہ کر لڑکھڑاتے ہوئے کمرے سے نکل گئے زہرہ نے اندر سے دروازہ بند کر لیا اور پھر وہ حسین بخش کی آغوش میں تھی رات کی تنہائی اور زہرہ کے شباب فرشتوں نے آنکھیں موند لیں عزازیل مسکرا اٹھا۔

غزل

سوز باندوی

سرمایۂ حیات ہیں میری غزل کے شعر
محتاجِ التفات ہیں میری غزل کے شعر

اک ربط خاص ہے جنہیں فکر و نگاہ سے
وہ روحِ کائنات ہیں میری غزل کے شعر

یہ ختم کر دیں گے دعوتِ نظارۂ جمال
حسنِ تخیلات ہیں میری غزل کے شعر

تعمیرِ زیست بھی ہیں یہ تخلیقِ زیست بھی
اک شرحِ کائنات ہیں میری غزل کے شعر

سُنئے گا آپ ان میں صدائے شکستِ دل
عکسِ غمِ حیات ہیں میری غزل کے شعر

اے سوز اہلِ زیست کو معلوم ہی نہیں
گنجینۂ حیات ہیں میری غزل کے شعر

اُتر پردیش اُردو اکاڈمی کا ایوارڈ یافتہ اور مُلک بھر کی لائبریریوں میں، نیز ممالک غیر میں اُردو دانشوروں سے خراجِ تحسین پانے والا۔ قومی یکجہتی کے مقبول ترین اُردو افسانوں کا مجموعہ

مان سروور

(مصنف: ڈاکٹر اودے سرن ارمان بلاروی)

جس کا ہندی ایڈیشن شائع ہو کر داد و تحسین کے مراحل سے گزر رہا ہے۔ اب مان سروور کا انگریزی ایڈیشن بھی ہندوستان میں جلوہ گر ہو گیا ہے۔ انگریزی ایڈیشن میں انگلینڈ کے دو مشہور انگریز دانشوروں کی تقاریظ مطالعہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ جن میں ان انگریز مصنفین نے مان سروور کے دیہاتی ماحول کے آئینہ دار قومی یکجہتی پر مبنی افسانوں کو خوب خوب سراہا ہے۔

ڈاکٹر ارمان خالص دیہاتی ماحول میں جہاں دُور دُور علم کے بارے میں خاموشی ہی خاموشی ہے، رہ کر اُردو کی شمع جس انداز میں جلائے ہوئے ہیں وہ اپنی جگہ پر قابلِ داد ہے۔ ڈاکٹری اور کاشتکاری ایسے مصروف ترین پیشے سے متعلق ہونے کے باوجود ارمان صاحب اُردو کی جو خدمت کر رہے ہیں اُسے اُردو کے دشمنوں نے بھی تسلیم کیا ہے۔ بہت جلد ڈاکٹر ارمان صاحب کے اُردو افسانوں کا دوسرا مجموعہ

ہر بار کہا دل نے

ادارہ شانِ ہند شائع کر رہا ہے۔ یہ مجموعہ ظاہری و باطنی خوبیوں کے باعث انشاءاللہ اس سال کا بہترین افسانوی مجموعہ ہوگا۔

مان سروور اُردو	ہندی ایڈیشن	انگریزی ایڈیشن
۲۱ روپے	۱۵ روپے	۲۵ روپے

دفتر شانِ ہند فلیٹ ۸ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

مظفر حنفی

الماس کا محبوب!

اتنے دن انتظار کرنے کے بعد مجھے محبوب کا خط ملا لیکن بجائے شادی کی دعوت کے اس نے کچھ اور ہی لکھا تھا۔

لیکن نہیں، میرا خیال ہے یہ داستان میں نے غلط طور پر شروع کر دی ہے۔ پہلے مجھے آپ کو محبوب سے متعارف کرانا چاہئے۔

ان غدار شہروں سے دُور، گنگا کی شاداب وادی کے دامن میں ایک بہت چھوٹا سا موضع ہے جس کا نام ہے الماس۔ پورا نام تو پورہ الماس تھا جسے ایک زمیندار نے اپنی اکلوتی بیٹی الماس کے نام پر آباد کیا تھا لیکن آج کل وہ صرف الماس ہی کہلاتا ہے۔ یہ درحقیقت ایک ایسا رومان پرور مقام ہے کہ شہر کے ہیجان آفریں ماحول سے گھبرائی ہوئی مضطرب روحیں اگر وہاں پہنچ جائیں تو انھیں وہ شئے، وہ سکون دل میسر آ جاتا ہے اور جو ان شہروں میں عنقا ہے۔ بہ افراط وہاں دستیاب ہوگی۔

ذہن میں ایک ایسے مقام کا تصور کیجئے جو پہاڑوں — نیلے نیلے سبزہ پوش ٹیلوں سے گھرا ہوا ہو۔ چمکیلے آبشار جن کی بلندیوں سے کود کر زمین کو چومتے ہوں، خوشبودار خود رو پھولوں کے تختے جن کی فضا کو رنگین و معطر رکھتے ہوں۔ شفاف میٹھے پانی کی جھیلیں جن کے سینے پر نگینوں کی طرح جڑی ہوں، خوش رنگ خوش گلو پرندے جہاں چہچہاتے پھرتے ہوں۔ ندی کے سنگ ان خوبصورت سبز پودے حسین دوشیزاؤں کی طرح پانی میں جھک جھک کر اپنا عکس دیکھنے کی کوشش کرتے معلوم ہوتے ہوں۔ جہاں قوس قزح اپنے تمام رنگ فراخدلی سے بکھیر دیا کرتی ہو اور گلابی شفق اپنے سہاگی رنگ میں رنگ کر فضا کو ایک نئی نویلی شرمیلی دلہن بنا یا کرتی ہو۔ جہاں ستارے اپنی نوری تابانی سے جگمگا کر لوگوں کے دلوں میں سنہرے سپنوں کی جوتیں جگاتے ہوں اور مہتاب اپنی چمکیلی کرنوں سے وادی کو نور میں نہلائے رکھتا ہو اور جہاں سورج چمک چمک کر جھرنوں کے نیلے پانی میں اپنی جھلملاتی سنہری کرنوں سے چاندی گھولا کرتا ہو۔ لطیف عطر بیز ہوائیں جہاں دلوں کو تازگی اور طراوٹ بخشتی ہوں۔ مزیدار لطیف اور رسیلے پھلوں کی بو سے آسودگی حاصل ہوتی ہو۔ اور حدِ نگاہ تک ہری بھری لہلہاتی ہوئی کھیتیاں اور پکے ہوئے اناج کی سنہری بالیاں بھولے بھالے کسانوں کے دلوں کو پھول کی طرح کھلائے رکھتی ہوں۔ سنہرے چاند والے شوخ ہرنوں کی ڈاریں کلیلیں کرتی پھرتی ہوں جہاں کے باشندے مکر و ریا کے نام سے بھی ناآشنا ہوں۔ محبت جن کی زندگی ہو، جن کے دل خلوص سے معمور ہوں، جہاں ہندو مسلمان نہیں صرف انسان بستے ہوں۔ جہاں کی بھولی بھالی البیلی دوشیزائیں، محبت، عفت اور پاکیزگی کے زندہ مجسمے ہوں جہاں ہر چہار طرف خوشی ہو۔ محبت و مسرت، [illegible] اور زندگی ہو اور راحت ہو۔

اگر آپ کے تخیل میں ایسا کوئی گوشہ ابھر سکے تو وہ الماس کا ایک دھندلا سا عکس ہوگا۔ اور محبوب اسی موضع کا ایک بھولا بھالا نوجوان ہے۔

میری اس سے ملاقات بھی بہت عجیب و غریب حالات میں ہوئی۔ گزشتہ سال مجھے بھی شکار کا خبط سوار ہوا تھا اور میں اپنی بندوق لے کر انجانی منزلوں کی طرف چل پڑا تھا اور پھر بھٹکتے بھٹکتے اس فردوس مقام پر جا نکلا تھا۔

وہ ایک بڑا ہی حسین دن تھا۔ ڈاک بنگلے سے نکل کر اپنی بندوق لئے ہوئے میں ان نیلی پہاڑیوں میں سے ایک کی چوٹی پر کھڑا ہوا میٹھے پانی کے آبشاروں کی روانی سے آنکھیں سیراب کر رہا تھا۔ نہ جانے اس پر فضا اور لاپرواہ چشمے کو کس شئے کی جستجو ہے کہ جس کے لئے یہ پہاڑیوں کو کاشانہ چٹانوں پر سر پٹکتا گہرائیوں میں کودتا، لپکتا، پیچ و تاب کھاتا ہوا، پھر کہیں گنگناتا، اٹکھیلیاں کرتا، خودرو حسین پودوں کو چھیڑتا ہوا ایک نامعلوم منزل کی طرف رواں دواں ہے۔ میں یہ محویت

اس وقت ٹوٹی جب سامنے والی گہری چمکیلی نیلی جھیل میں سفید چمکدار پروں اور گلابی پیروں والے نازک نازک چہروں کا ایک جھرمٹ نظر آیا۔ اور میں اپنی بندوق سنبھالے جلدی جلدی ڈگ بھرتا جھاڑیوں سے الجھتا۔ چھوٹے چھوٹے جھنڈوں کو پھلانگتا اس جھیل کے قریب پہنچ گیا۔ جیسے کچھ چوکنے سے ہو گئے تھے مجھے ڈر تھا کہیں اڑ نہ جائیں۔ جھیل کے آس پاس کوئی مینڈھ بھی نہ تھی جس کی آڑ لے کر میں ان کی نظروں سے پوشیدہ رہتا۔ پاس ہی دو کانٹے دار ہری جھاڑیوں کے بیچ کچھ خالی جگہ نظر آئی اور دوسرے لمحے میں ان کے درمیان تھا۔ میری قمیض پر جس جگہ جگہ سے پھٹ رہی تھی جلد پر بھی کہیں کہیں خراشیں آ گئی تھیں لیکن مجھے اس کی چنداں پرواہ نہ تھی۔ سوچتا تھا اس شاندار غول کے سات آٹھ پرندے بھی اگر ہاتھ لگ گئے تو ساری محنت وصول سمجھوں گا۔ جلدی سے بندوق لوڈ کی نشست لی اور دھائیں۔!

بندوق کی آواز سے آس پاس کی ساری پہاڑیاں گونج اٹھیں، جھیل کے کنارے کھڑے ہوئے تناور درختوں پر بیٹھے ہوئے پرندے سہمی ہوئی آواز میں پیدا کر کے فضا میں منڈلانے لگے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا اس پگھلے ہوئے سونے کی جھیل کے کنارے کھڑے ہوئے یہ پہریدار درخت ایک اجنبی شکاری کی گستاخی پر آپس میں سرگوشیاں کر رہے ہوں کہ اس کی کیا سزا ہو سکتی ہے --- آسمان پر شفق پھیلی ہوئی تھی۔

جھیل میں سات آٹھ زخمی چہے پھڑپھڑا رہے تھے یا ان کے باقیماندہ ساتھی فضا میں ادھر ادھر پرواز کرتے ہوئے جھیل کے گرد چکر کاٹ رہے تھے۔ بندوق وہیں کنارے چھوڑ کر میں نے جھیل میں چھلانگ لگا دی اور تیرتا ہوا اس خشک مقام پر پہنچا جو جھیل کے عین وسط میں تھا۔ چہوں کو ادھر ادھر سے نکال کر ذبح کیا اور بیگ میں رکھ لیا اور پھر دوبارہ کنارے پر پہنچنے کے لئے پانی میں اترا۔ دو ہی چار قدم چلا تھا کہ کوئی چیز ٹانگوں سے لپٹ گئی غوطہ لگا کر چھڑانے کی کوشش کی تو ہاتھ بھی پھنس گئے۔ پھر میں نے جتنے زیادہ ہاتھ پیر پھینکے پانی کی اس بیل میں اتنا ہی الجھتا چلا گیا۔ جلدی میں ڈبکیاں لگانے اور پانی پینے لگا۔ بمشکل تمام سر پانی سے نکال کر ابھرنے کی کوشش کی لیکن پیٹھ پر لدے ہوئے وزنی چہوں نے اور جم ہوئی بیل نے اجازت نہ دی۔ ڈوبتے ہوئے آسمان تو پھیلی ہوئی شفق خون برساتی ہوئی پھر میری آنکھوں کے آگے پھیلا اور اندھیرا چھاتا گیا ---!

پیٹھ میں سوئیاں سی چبھ رہی تھیں اور سینے پر بوجھ ہوتا تھا۔ بمشکل تمام آنکھیں کھولیں، کوئی دھندلی سی شے سینے پر جھکی بیٹھی تھی۔ پہلا خیال جو اس وقت میرے آیا۔ یہ تھا کہ میں مر چکا ہوں اور یہ وہی مشہور داروغہ اور نکیر ہیں جو مرنے کے بعد براہ راست مردے سے شروع کرتے ہیں۔ آنکھیں جھپکاتے ہوئے میں نے ڈ ڈالا اور کلمہ پڑھنے لگا۔

"شکر ہے تمہیں ہوش آ گیا۔ مجھے متواتر ایک گھنٹے تک پیٹ کے پانی نکالنے کی کوشش کرنی پڑی ہے۔ میرے آواز آئی اور بوجھ میرے سینے پر سے ہٹ گیا۔ اس بار میں طرح آنکھیں کھول کر دیکھا۔ اور میرا دل احساس مسرت سے آہ میرے خدا! میں تو اپنی اسی جیتی جاگتی رنگین اور حسین د شاید مجھے ڈوبنے سے بچا لیا گیا تھا۔

چاند نکل آیا تھا اور پوری رعنائیوں کے ساتھ آسمان تھا۔ اس کی نورانی شعاعوں کے درمیان میں نے اپنے اوپر اس سڈول بدن والے شکیل نوجوان کو دیکھ لیا جو سفید چادر ہوا کسی دوسری ہی دنیا کی مخلوق معلوم ہوتا تھا۔ میں نے گرم ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر دبایا۔

"تم نے مجھے ڈوبنے سے بچا لیا ہے دوست! --- میں تمہارا شکریہ ......" اس نے بیچ ہی میں میری بات کا

"تم [illegible] میں [illegible] جانے والی [illegible] تو خراب ہوتی اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو کیا" تمہیں ڈوب جانے دیتے --؟! شکریے کی بات ہے؟"

میں اس کی سادہ لوحی پر مسکرا دیا۔ قدرے توقف کے پھر بولا۔

"بہت دنوں کے بعد یہاں بندوق کی آواز سنائی دی وقت اپنے کھیتوں میں بیٹھا ہوا تھا۔ دیکھنے کے لئے بھاگ کر

ے جانور کا خون پیا ۔ اور یہاں آکر دیکھا تو جناب ڈبکیاں
ر ہے تھے ۔ خیر تمہیں تو نکال لایا لیکن افسوس تمہارا جھولا
ت بھاری تھا اسے وہیں پھینکنا پڑا ۔ اچھا تم یہ تو بتاؤ ۔ میری
ر لاد کر گاؤں چل سکتے ہو ـــــ ؟ یا گھوڑی لینے گاؤں جاؤں
ی تو اس علاقے میں نہیں آسکے گی ۔"

"دلہن کی طرح ڈولی میں بیٹھ کر یا بچے کی طرح پیٹھ پر لد کر تو میں جا
یں سکتا میں نے اسی کے بے تکلف لہجے کی نقل کی ۔

"تو پھر کیا چار پائی پر لیٹ کر چلنے کا ارادہ ہے ؟"

"برادرے بے تکلف بیہودہ دوست !" میں نے کہا اس کے چہرے پہ
ت کے آثار جھلکنے لگے تو مجھے پھر کہنا پڑا ـــــ "کسی ایسے ہی مخلص
ست کی مجھے عرصے سے تلاش تھی ۔"

اس کے لبوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی ۔ میں نے اسے سہارا دینے
وق اٹھالانے کو کہا اور پھر اُس کا سہارا لے کر اُٹھ کر کھڑا ہوا ۔
کل تمام گھسٹتے ہوئے ہم اس جھونپڑے سے خوبصورت گاؤں میں
ے ۔ دوسرے میں نے اپنا سامان جو کچھ ایسا زیادہ نہ تھا پرچہ
کر ڈاک بنگلے سے منگوالیا ۔ وہاں پہنچ کر نقاہت اور زیادہ پانی
انے کی وجہ سے میری طبیعت خراب ہوگئی ۔ اور پانچ دن تک مسلسل
ی بستر علالت پر پڑا رہا ۔ اسی دوران میں اس نوجوان اور اس کے
ے باپ نے جس تندہی سے میری تیمارداری کی اسے میں تمام عمر
بھلا سکوں گا ۔ جب تک میری حالت سنبھلے ۔ میں اس کا بے حد
بے تکلف دوست ہو چکا تھا ۔

وہی نوجوان الماس کا محبوب تھا !

ہم دونوں تین چار دن تک ایک ساتھ خوب گھومے ۔ کبھی اس
ے دور تک پھیلے ہوئے لہلہاتے کھیتوں میں سرسبز بیلوں سے
ڈھکی ہوئی جھونپڑی میں بیٹھے غروب آفتاب کا عجیب نامنظر
یکھا کرتے اور چیڑ پھلوں کے گچھے ہمارے اوپر برسا کرتے ۔
بھی گھنے درختوں کے سائے تلے بیٹھ کر لومڑیاں اور خرگوشوں ،
ہرنوں اور پرندوں پر نشانہ بازی کرتے کبھی جھیل میں پیر لٹکا کر
یب چاپ بیٹھ جاتے اور گھنٹوں مچلتے ہوئے چاند کا عکس دیکھا
رتے جو جھیل کی عمیق گہرائی سے ہماری طرف جھانکتا جھانکتا
سکرایا کرتا اور اگر ہم پانی کو ذرا سا ہلکورا دے دیتے

تو اس طرح بل کھا کھا کر دوہرا ہو جاتا جیسے کسی نے چاند کو زور سے
گدگدا دیا ہو اور اس کے ساتھ ہی ساتھ کائنات پر پھیلی ہوئی
چاندنی بھی مسکرایا کرتی ۔

اور ایک ایسی ہی سرور انگیز خواب آلود رات میں محبوب نے
مجھ سے اپنی محبوبہ کا ذکر کیا تھا ۔ مجھے لڑکیوں کے ذکر میں دلچسپی نہیں
اس لئے میں شاید صحیح طور پر بیان نہ کر سکوں گا کہ اس نے اپنی
الماس محبوبہ کی کون کون سی خوبیاں میرے سامنے بیان کی تھیں ۔

"اس کی رنگت میں شفق کی ہلکی ہلکی سی سُرخی اور چاندنی کی منور
سپیدی کا حسین امتزاج ہے ۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں جیسے
کسی گہری نیلی جھیل میں کھلے ہوئے دو سپید کنول ہوں ۔ اس کی
چال میں غزال کا رعنا کا سا الھڑپن اور جسم میں چھوئی موئی کی سی
نزاکت ہے حوروں کی سی معصومیت اور پاکیزگی ہے اس میں ۔
اس کی پانہوں میں روئی کے گالوں کا سا گداز ہے ۔ اور اس کی
سیاہ زلفیں برسات کی گھنیری تاریک راتوں سے زیادہ سیاہ
اور مسحور کن اور کسی کنواری ناگن کی طرح چمکیلی ہیں ۔ وہ دُنیا
کی سب سے زیادہ حسین اور شرمیلی دوشیزہ ہے !"

کبھی وہ کہتا ۔

"وہ ۔ اس حسین وادی کی معصوم شہزادی ہے ـــــ میری
روح ہے وہ !"

اور اسی طرح وہ نہ جانے کتنی دیر تک اُس دوشیزہ کی تعریف
و توصیف میں زمین و آسمان کے قلابے ملایا کرتا جو کسی قریبی گاؤں
کے زمیندار کی اکلوتی لڑکی تھی جسے اُس نے چھپ چھپ کر تو کئی
بار اچھی طرح دیکھا تھا لیکن جس کے ساتھ بات چیت کرنے کی اُس نے
آج تک ایک بار بھی ہمت نہ کی تھی کیونکہ یہ ان کے یہاں معیوب
سمجھا جاتا تھا اور پھر وہ خود بھی بے حد شرمیلا تھا اور پھر جب ریحان
کا ذکر آتا تو وہ چاروں طرف دیکھ کر ہولے سے کہتا ۔

"مجھے اُس ریحان سے بہت ڈر لگتا ہے شکاری ! وہ کہیں
میری محبت کا گلا نہ گھونٹ دے وہ میری روح کو مجھ سے چھین نہ
لے کہیں ۔ !"

ریحان اس کی محبوبہ ہی کے گاؤں کا ایک نوجوان تھا اور
محبت کے میدان میں محبوب کا کامیاب رقیب تھا ۔ یہ تمام باتیں

مجھے محبوب ہی سے معلوم ہوئیں لیکن ایک عجیب بات یہ تھی کہ رحمان اس بات سے ناواقف تھا کہ محبوب بھی ریشماں کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہے اور یہ بات تھی بھی تقریباً ناممکن سی۔ محبوب نے ہر ممکن احتیاط برتی تھی کہ ریشماں کے متعلق اس کے خیالات کا کسی کو علم نہ ہو۔ وہ صرف تصور ہی تصور میں پیکر جاناں سے اٹھکیلیاں کر لینے پر قناعت کرتا تھا۔ اس سے آگے دست درازی کرنا اس کے تئیں معیوب بات تھی۔ برخلاف اس کے رحمان کئی بار ریشماں کے سامنے اظہار محبت کر چکا تھا گو کبھی ریشماں نے اپنی زبان سے اس کی ہمت افزائی نہ کی تھی۔

محبوب کے لئے وہ لمحات انتہائی بروح فرسا اور صبر آزما ہوتے تھے جب رحمان اپنے گاؤں سے چل کر اس کے پاس آتا اور ریشماں کے بارے میں اپنے خیالات اس کے سامنے پیش کرتا۔ مانی ہوئی بات ہے ایسا شخص جس سے ہمیں خفیہ عناد ہو جب اپنا دوست جان کر اپنی مسرتوں اور عیش کی گھڑیوں کا ذکر ہمارے سامنے کرتا ہے اور ہمیں مجبوراً اس کی ہاں میں ہاں ملانی پڑتی ہے تو دل ایک انجانی آگ میں سلگنے لگتا ہے۔ رحمان بظاہر اپنے لنگوٹیے یار محبوب کے روبرو جسم کے ساتھ اس نے پرائمری اسکول کی چار جماعتوں میں پڑھا تھا۔ اپنی محبت کی داستانیں سنا کر دل کی بھڑاس نکالا کرتا تھا۔ اسے کیا خبر کہ اس کا معصوم دوست خود اسی آگ میں جل رہا ہے اور چپ چاپ سینے سے لگائے ہوا دیتا رہتا ہے اور وہ آ کر اس کی سوزش میں کئی گنا اضافہ کر جاتا ہے۔

پھر ایک دن محبوب نے مجھے رحمان سے بھی ملا دیا جو ایک معمولی خدوخال کا تندرست نوجوان تھا جسے محبوب جیسے خوبرو اور متمول نوجوان کے مقابلے میں کسی دوشیزہ کے متعلقین عام حالات میں ہرگز پسند نہ کر سکتے تھے اس دن تالاب کے کنارے خنک و شفاف نیلے پانی میں روپہلی مچھلیوں کا رقص دیکھتے ہوئے میں نے محبوب کو دلاسہ دیا۔

"نہ گھبراؤ دوست! وہ کوئی بہت ہی نادان باپ ہوگا جو اپنی لڑکی کے لئے تمہاری جگہ رحمان کو منتخب کرے گا!" اس نے میری طرف ایسی ممنون نگاہوں سے دیکھا جیسے میں نے اس پر کوئی بہت بڑا احسان کیا ہو۔

"تم ہمت کر کے ریشماں کے روبرو اپنی محبت کا اظہار کیوں نہیں کرتے؟" میں نے اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں شکاری! شادی سے قبل یہ نہ ہوگا۔" اس نے آخری جواب دیا۔ "یہ تو سچی محبت کی توہین ہوگی!"

میں خاموش ہو رہا۔

پھر کچھ دن بعد الماس سے واپس آتے ہوئے میں نے راستے میں محبوب کے باپ کو تاکید کی کہ وہ کسی دن ریشماں کے باپ سے مل کر اپنے لڑکے کے لئے محبوب کا پیغام دے۔

"اور تم محبوب!" میں نے اسے اپنا پتہ لکھ کر اسے دیتے ہوئے کہا۔ "اپنی شادی میں مجھے تو بلاؤ گے ہی!" اور اس نے کسی لڑکی کی طرح شرما کر اپنا سر جھکا لیا تھا۔

اور اب میرے سامنے اس کا خط پڑا ہوا ہے۔

لیکن یہ شادی کا دعوت نامہ نہیں ہے۔ مجھے عرصہ سے ان کی شادی کے دعوت نامے کا انتظار ہے خیال تھا اس سلسلے میں ایک بار پھر اس حسین وادی کی سیر کا موقع ملے گا لیکن محبوب نے لکھا ہے۔

"شکاری!

ابا ریشماں کے باپ سے ملے تھے وہ تو شادی کے بارے میں بڑے بڑے اونچے خیالات رکھتا ہے اس نے ابا سے کہا وہ اپنی بیٹی کی شادی کسی معمولی کسان سے نہ کرے گا۔ شہر کے بابو سے کرے گا جو سرکاری دفتر میں نوکر ہو۔ اس کی بیٹی کو عیش و آرام سے رکھ سکے۔ رحمان آج کل شہر گیا ہوا ہے اور سرکاری نوکری کی تلاش میں لگا ہوا ہے۔ میں نہ کہتا تھا شکاری! کہ یہ رحمان میری دولت کو مجھ سے چھین لے گا۔

محبوب"

خط پڑھ کر مجھے کچھ خوشی ہی ہوئی۔ شاید اس لئے کہ اس طرح مجھے اس احسان سے سبکدوش ہونے کا موقع مل رہا تھا جو محبوب نے مجھے ڈوبنے سے بچا کر مجھ پر کیا تھا۔ ہم شہری لوگ اس انداز

سے سوچنے پر مجبور رکھتی تو ہیں

میرا کلاس فیلو قیوم محبوب کے ضلع میں ڈپٹی کمشنر تھا۔ میں نے اُس کے نام ایک پُرزور خط لکھا کہ وہ حاملِ رقعہ ہٰذا کو کسی سرکاری دفتر میں کوئی مستقل ملازمت دلوا دے اور یہ رقعہ محبوب کو ایک خط کے ہمراہ بھیج دیا۔ اُس خط میں میں نے محبوب کو لکھا تھا کہ گھبرانے کی ضرورت ہے وہ میرا پرچہ لے کر اپنے ضلع کے ڈپٹی کمشنر کے پاس چلا جائے اور ملازمت ملنے کے بعد دوبارہ پھر ریشاں کے لئے پیغام بھیجے۔

یہ خط محبوب کو بھیج کر میں ایک ماہ انتظار کرتا رہا لیکن اس کی طرف سے کوئی اطلاع مجھے موصول نہ ہوئی، دو تین خط بھی لکھے لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ قیوم کو خط لکھ کر دریافت کیا تو اس نے لکھا کہ میری سفارش لے کر آنے والے نوجوان کو اس نے اپنے ہی دفتر میں جمعدار مقرر کر دیا ہے اور وہ آج کل رخصت لے کر اپنی شادی کرنے گیا ہے۔

میں حیران تھا۔ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟ کیا محبوب مجھے دعوت دئے بغیر ہی شادی کر لے گا! آخر ایک دن میں الماس کے لئے روانہ ہو گیا۔ بس موضع سے دو میل جنگل کی پگڈنڈی پر مجھے اتار کر آگے چلی گئی اور تحائف وبندوق وغیرہ سے لدا پھندا اُس پتلی سی پگڈنڈی پر ہو لیا جو اونچے نیچے ٹیلوں کے دامن سے لپٹی ہوئی الماس کی طرف جاتی تھی۔ دور مشرق میں ماہتاب ایک تناور درخت کے عقب سے طلوع ہوا اور بتدریج اس کی تابانی بڑھتی گئی۔ چھوٹی چھوٹی جھیلوں میں چاندنی کی سو پہلی کرنیں چاندی کی مچھلیوں کی طرح اِدھر اُدھر جھلمل کرتی تیرتی رہی تھیں اور پھر میرا دل خوشی سے لبریز ہو گیا۔ دور سے آتی ہوئی شہنائی کی آواز نے میرے دل کو گدگدا دیا تھا۔ میری کوشش شاید بارآور ہوئی تھی شاید محبوب کی شادی ہو رہی تھی۔

الماس بالکل قریب آ گیا تھا میں نے لمبے لمبے ڈگ بھرنے شروع کئے۔ ایک ٹیلے سے نیچے اترتے ہوئے الماس کے [illegible] کے سائے تلے مجھے ایک سایہ نظر آیا۔ میں اس کے پاس جا پہنچا۔

"یا خدا! وہ تو محبوب تھا!

وہ یونہی کھڑا خلا میں جانے کیا دیکھ رہا تھا۔ دریافت کرنے پر اس نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ مجھے بتایا کہ اس نے اپنی جگہ پر رحمان کو نوکر کروا دیا تھا کیونکہ وہ واقعی ریشاں سے محبت کرتا تھا۔ سچی محبت، اور اس نے اپنی پریشانیوں کا ذکر محبوب سے کیا تھا جسے وہ اپنا دوست اور سچا رفیق سمجھتا تھا۔

اور اب ریشاں اور رحمان کی شادی ہو رہی تھی۔ میں نے اس کے پُرسکون چہرے پر نگاہ ڈالی۔ اُس پر عجیب سی چمک تھی۔ نہ جانے اس ظاہری سکون کے پردے میں کتنے ارماں دم توڑ رہے تھے۔ کتنی آرزوئیں مچل رہی تھیں۔ میں نے سوچا کتنا بڑا دل ہے اس دیہاتی نوجوان کا۔ وہ بدستور خلا میں نظریں جمائے کھڑا رہا۔ ٹھنڈی ہوا کے ساتھ ملی جلی شہنائی کی آواز اس طرح سنائی دے رہی تھی جیسے کوئی زخمی روح کراہ رہی ہو۔ آس پاس کی چیزوں کو سپید چاندنی نے اس طرح اپنی آغوش میں لے رکھا تھا جیسے کسی نے انہیں سفید کفن پہنا دیا ہو۔ آسمان سے زمین تک فضا میں درد ہی درد تھا۔ میں نے بے چین ہو کر کہا۔

"محبوب! یہ تم نے کیا کر دیا بے وقوف آدمی" وہ مسکرا دیا۔ بہت پھیکی سی مسکراہٹ۔

"مجھے یہی کرنا چاہئے تھا شکاری! میں ریشاں سے ملا تھا۔ وہ بھی رحمان سے محبت کرتی تھی!"

بقیہ: سگِ لیلیٰ

تمہارے صحن میں لا کر ہڈیں ڈال دے تو میرا بھی نام نہیں۔ یکدم چچا یہ وارننگ دے کر چلے گئے۔

آج ہم بھی [illegible] بیگم بھی وہی ہیں اور سگ ارلنگ بھی وہی ہے۔ ان کی حرکات بھی وہی۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ آج کل انہوں نے کرفیو ایریے میں جانا ترک کر دیا ہے مگر ہم اس بلائے ناگہانی والے دن کا انتظار کر رہے ہیں جب ہمارا صحن انواع و اقسام کی ہڈیوں سے بھر جائے گا۔

کالیداس گپتا رضا کی

تاحال مطبوعہ تصانیف

"شعلۂ خاموش" مجموعۂ کلام قیمت ۵۰ روپے	"ہندوستان مشرقی افریقہ میں" (تاریخ) قیمت ۱۰ روپے ۵۰ روپے	"انتخاب آتش و غالب" چکبست قیمت = ۳۰ روپے
"شورشِ پنہاں" مجموعۂ کلام قیمت ۲۰ روپے	"مکتوبات جوش ملسیانی" بنام رضا (خطوط) قیمت ۱۹ روپے ۵۰ پیسے	"چکبست اور باقیاتِ چکبست" قیمت ۴۰ روپے
"شاخِ گل" مجموعۂ کلام قیمت ۱۵ روپے	"ملفوظات جوش ملسیانی" قیمت ۲۰ روپے	"کلیاتِ چکبست" (نظم) قیمت ۶۰ روپے
"اُجالے" نعت اور سلام قیمت ۱۰ روپے	"متعلقاتِ غالب" قیمت ۲۰ روپے	"سہو و سراغ" مجموعۂ مضامین قیمت ۳۵ روپے
"شورِ غم" سلام وغیرہ قیمت ۳ روپے	"دعائے صباح" غالب کی ایک مثنوی قیمت ۱۵ روپے	"مقالاتِ چکبست" قیمت ۷۵ روپے
"شارعِ جاوید" مجموعۂ کلام رباعیات قیمت ۲۰ روپے		
"دی سائیلینٹ فلیم" THE SILE'T FLAME قیمت ۱۰ روپے	"غالبیات ۔ چند عنوانات" قیمت ۵۰ روپے	غیر مطبوعہ تصانیف کا اعلان طبع ہونے پر کیا جائے گا

وِش پبلیکیشنز

۳۰۵ چرچ گیٹ چیمبرز نیو میرین لائنز
چرچ گیٹ بمبئی ۴۰۰۰۲۰

ہلدی گھاٹیاں

کندن گوڑ گانوی

شمع جلنے پر پتنگے آہی جاتے ہیں قریب
ابنِ مریم شوق سے خود چوم لیتے ہیں صلیب
یاد پھر دار و رسن کی تازہ کرنے کے لئے
سرمد و منصور خود آتے ہیں مرنے کے لئے
تیرگی سے پھوٹتی ہے صبح کی پہلی کرن
پھولتے ہیں بعد خزاں کے بعد اشجارِ چمن
تخت اکثر ٹوٹتے ہیں نالۂ مجبور سے
تاج اُترتے ہیں عموماً نعرۂ جمہور سے

جب کبھی بھی نہ تھی کوئی زباں تقریر تک
حدِ آزادی فقط تھی وسعتِ زنجیر تک
گردنوں میں طوق تھے اور پاؤں میں زنجیر تھی
جاں نثارانِ وطن کی بس یہی جاگیر تھی
اہلِ گلشن کو بھلا موقع کہاں تھا سیر کا
گلستانِ ہند پر تو تھا تسلط غیر کا
خون تھا پانی نہیں تھا جوش میں آہی گیا
جذبۂ جمہور سلطانوں سے ٹکرا ہی گیا

سرفروشانِ وطن میدان میں آہی گئے
اہلِ طاقت سے وہ خالی ہاتھ ٹکراتے گئے
خارزاروں میں چلے آغوشِ مادر چھوڑ کر
اور تڑپتی بہنے ماں ! گھر چھوڑ کر
وار پر آہی گئے وہ مسکرانے کے لئے
بازوئے قاتل کا ہر زور آزمانے کے لئے
سر گئے اور پاؤں میں زنجیر ہوتی رہ گئی
داورِ افرنگ کی تقریر ہوتی رہ گئی

خواب ادھورے رہ گئے کھل کھل کے جوڑے رہ گئے
اور کلائی کو ترستے لال جوڑے رہ گئے
ہاں مگر وہ خواب سب تعبیر تک آ ہی گئے
نالے دیوانوں کے سب تاثیر تک آ ہی گئے
رنگ آخر لے ہی آیا خونِ اربابِ وفا
بس ہے یہ آزادی فقط رہونِ اربابِ وفا
تم شہیدوں کو نہ بیگانہ سمجھ لینا کہیں
اس حقیقت کو نہ افسانہ سمجھ لینا کہیں

لاکھوں ہلدی گھاٹیاں ہیں اپنے ہندستان میں
کوئی ستلج کے کنارے کوئی راجستھان میں

"سگِ لیلیٰ"

جو زمت انور

بندو چچا نے جب اپنی چہیتی بیگم کے اصرار پر ایک خوبصورت سی کتیا کسی نامور کے ٹورسٹ سے خریدی تو محلے میں مشہور کر دیا کہ اس کا شجرہ سگِ لیلیٰ سے ملتا ہے چنانچہ کتیا کا نام بھی لیلیٰ رکھ دیا۔ رفتہ رفتہ یہ بات شہر میں پھیل گئی اور کئی ماڈرن مجنوں سگِ لیلیٰ کے مشتاقانِ دید ہو گئے۔

ایک دن بندو چچا نے دیدار یار کے لئے ہمیں بھی گھر بلایا۔ کتیا واقعی بلا کی حسین تھی سر تا پا ایک مرصع غزل۔ ہمیں ذرا بھی پیر خوبال سوجھی تو پاسبان کے قدم لیتے ہوئے ہم نے بندو چچا سے پوچھا۔

"حضور آپ اس کا شجرہ تو سگِ لیلیٰ سے ملا رہے ہیں مگر آج تک اس راز کا انکشاف نہیں ہو سکا کہ لیلیٰ کے پاس کتیا تھی کہ کتا۔

"تم بے وقوف ہو یہ نہیں معلوم کہ لیلیٰ کے پاس کتیا تھی۔ بندو چچا نے تیوری پر بل ڈالتے ہوئے کہا۔

"ابھی خاکسار کا کیا اس کا تصفیہ تو ابھی تک ہمارا مسلک بھی نہیں کر پایا کہ لیلیٰ کے پاس کتیا تھی کہ کتا۔

"نہیں کتیا ہی تھی۔ بندو چچا نے بڑے اعتماد سے کہا

"اس کے جواز میں آپ کے پاس کیا ثبوت ہے۔ ہم نے پھر کھٹی ماری۔

بندو چچا نے غصے سے ہمیں دیکھتے ہوئے کہا "یار تم ذہین و ادیب بنتے ہو مگر تمہیں اپنے ملک کی تہذیب و معاشرہ سے قطعاً واقفیت نہیں۔ ارے میاں یہ مغربی بدعت اس وقت [illegible] معاشرے میں موجود تھی۔

ہمیں خاموش ہونا پڑ گیا۔ لیلیٰ ہمارے سامنے ہی کھڑی تھی۔ ذرا سا لیلیٰ سے کام لیتے ہوئے ہم نے پچ کیا تو وہ اچھل کر ہماری آغوش میں آ بیٹھی اور وفورِ محبت سے اس طرح چاٹنے لگی کہ ہم بے ساختہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ کتیا بھلے سگِ لیلیٰ ہو یا نہ ہو ہم یقیناً مجنوں کے وفادار جانشین ہیں۔

کہتے ہیں کہ عورتوں میں حسد کا مادہ زیادہ ہوتا ہے۔ ہماری بیگم جب بندو چچا کی بیگم کی کتیا کے بارے میں علم ہوا تو انھیں بھی نوبیا ہو گیا۔ ایک دن جب آفس سے گھر لوٹے تو ایک عجیب و غریب مخلوق کو اپنے پلنگ کے نیچے سوتے پایا۔

"ارے یہ کیا بلا ہے؟" ہم نے بیگم سے چونک کر پوچھا۔

"یہ ڈارلنگ ہے ہمارا۔ تمہاری دوست ڈی سوزا جنگل سے لائی ہیں۔ کہتی ہیں سگِ تازی ہے۔ راستہ بھٹک گیا تھا۔

"مگر۔ مگر یہ کتا ہے کہ بندر!"

"ڈی سوزا کہتی تھیں کہ ایلشیئن کی تازہ ترین نسل ہے۔ یہ بھی کہا ہے کہ اگر اسے ڈاگ شوز کے مقابلے میں رکھو گے تو دو تین سال میں گھر ٹرافیوں سے بھر جائے گا۔"

ہم نے احتجاج کرتے ہوئے کہا بیگم اول تو ہمیں اسے کتا تسلیم کرنے سے عار رہے ہے اور اگر یہ فرض محال یہ مان بھی لیا جائے کہ یہ ایلشیئن ہے تو یاد رہے اس کی خوراک ایک انسان کے برابر ہوگی اور اگر ہمارے بجٹ میں ایک انسان کی گنجائش ہوتی تو ہم دوسری پر ہی قناعت فرماتے تین کے لئے نوٹ پر عمل نہیں فرماتے۔ کتے نے غالباً اپنی ڈاگ سینس کے ذریعہ ہمارے ارادے کو بھانپ لیا اور ہم پر قہر آلود نظر ڈالتے ہوئے ہماری بیگم کو بنا یہ مسکین چہرہ بنا کر کنکھیوں سے دیکھا اور دُم ہلاتا ہوا اس طرح اُن کے قدموں میں جا کر لیٹ گیا کہ بیگم کا دل جو صلابت و برداشت کے اعتبار سے پتھر کا تھا موم کی طرح پگھل گیا۔

"ہائے کتنا پیارا کتا ہے۔ رکھ بھی لو ۔ گھر کی چوکسی کرے گا۔ میں روز صبح بندو چچا کی دکان سے راتب لے آیا کروں گی۔

بندو چچا کا نام سنتے ہی ہم لرز [illegible]۔ ہم اُن کو [illegible] یاد [illegible] سے

خوب واقف تھے۔ اُن کے کارِ ثواب کے چرچے محلے کے زنان خانوں میں بہت مشہور تھے۔

"[illegible] نہیں راتب میں [illegible] ہونا گا" ہم نے کتے کو حقارت آمیز نظروں سے دیکھا کتے نے ہمیں غضب آلود نگاہوں سے گھورا ہم دل ہی دل میں بڑبڑائے۔ یا اللہ یہ رقیب رو سیاہ سے کہاں پالا پڑ گیا۔ کم بخت ایک ہی [illegible] اندر سے وہ کام کر گیا جو ہم زندگی بھر آنکھوں کی کماسیاں دبا دبا کر نہیں کر پائے۔ لگتا ہی نہیں کہ گرگِ باراں دیدہ تھا یا کسی پیشہ ور سیاست داں کی روح اس میں حلول کر آئی تھی۔

وہ دن ہے کہ آج کا دن۔ یہ خبیث المعرفین [illegible] کی زنجیریں کر پڑا ہوا۔ روزانہ صبح تقدم مچائی دو کان [illegible] راتب لانا ہمارا معمول بن چکا ہے۔ ڈرتے ہیں کہیں اس کا [illegible] دیگران کو بیگم اپنے ہاتھوں میں لے کر ہم دیگیاں نہ ہو جائیں۔

اس حرامزادے کو بیگم نے گھر کی چوکسی کے لیے رکھا تھا مگر کمبخت کرتا ہے ہماری چوکسی۔ اول تو ہم رات گئے گھر [illegible] کھانا تو شام ہی ہو لیتا۔ اگر بھولے بھٹکے دن میں آ بھی جاتا تو ہمارے پلنگ کے نیچے [illegible] ہو دم [illegible] کر سوتا کہ دیکھ کر [illegible] شرم آنے لگتی۔ رات کو تو اُس کا یہ عالم رہتا جیسے دس ملی گرام [illegible] کی گولیاں کھا کر سو گیا ہو۔ چور اسے کر اچکا اس کی بلا سے۔ اس کے باوجود ہمارا یہ سال تھا [illegible] جا [illegible] ہم نے کروٹ بدلی کہ اُدھر اس نے [illegible] کسی ضرورت کے لیے ہم اٹھے کہ یہ بھی اٹھا۔ [illegible] اس طرح بیٹھ جاتا کہ [illegible] سا خوف طاری ہو جاتا۔ ہمیں یاد نہیں کہ کبھی ہم نے [illegible] ہو کہیں شناسا [illegible] کل رات کو اس سے [illegible] بھی وہ [illegible] ہی سے [illegible] بات یہ ہے کہ ہماری نوجوانی [illegible] ریاضت گئے اور شام کرکے وظیفہ [illegible] باقی تھی مگر اس خبیث کی آمد سے یہ سلسلہ روز گار [illegible] منقطع کر کے رکھ دیا [illegible] بعد [illegible] اور شام [illegible] رات کے دو بجے ہم جیسے [illegible] صبح [illegible] ساتھ

[illegible] اُٹھے [illegible] دروازے [illegible] تیز ساتھ نعرہ لگایا کہ [illegible] کا دروازہ کھلا چھوڑ کر جاؤ گی تو اِدھر [illegible] گھروالے تو کیا اڑوس پڑوس کے سب جاگ گئے۔ بیگم نے بڑبڑاتے ہوئے ہمارے اوپر سے لحاف کھینچا۔

"اجی دیکھو تو ڈارلنگ کیوں اتنے زور زور سے بھونک رہا ہے۔"

"بھونک رہا ہوگا" کہہ کر ہم نے بے نیازی سے کروٹ بدل لی۔

"اجی کوئی آیا تھا کیا؟ باہر کا دروازہ بھی کھلا پڑا ہے۔ سنا ہے [illegible] دلی والی شہر میں آئی ہوئی ہے۔ [illegible] کوئی میرے کو اٹھا لے گیا تو میں کیا کروں گی۔"

"[illegible] ہم سے تمہارے مُنّے کو کوئی اٹھا کر نہیں لے جا سکتا" ہم نے [illegible] ہوئے کہا اور لحاف کا دروازہ بند کر لیا۔

اور [illegible] ہماری [illegible] بعض جنبش [illegible] وہ والا [illegible] ہیں کہتے کو اس کی [illegible] لڑائی [illegible] ہم تسلیم کرنے کو تیار نہیں [illegible] صنفِ نازک میں [illegible] کی تعریف [illegible] اس [illegible] شہر کی انتہاؤں کو ڈارلنگ تھا۔ شاذ ہی کوئی ایسی لڑکی ہوگی جو اس [illegible] حالت [illegible] دیوانی کی حالت بنا [illegible] سنگ باری [illegible] تازہ دم۔ البتہ [illegible]

[illegible] کوئی ملی ہو نظر آئی [illegible] سے [illegible] دروازہ کھلا پاتو بیگم [illegible] پڑے تھے۔

[illegible] راتب لانے میں آپ کو [illegible] انھوں نے [illegible] راست بیگم سے پوچھا "بی جان ڈارلنگ کے لئے لاتے ہیں۔"

"اچھا تو وہ بدنام زمانہ ڈارلنگ کتا آپ ہی کا ہے۔" بیگم خاموش رہیں۔

گندم چچا کچھ سوچتے ہوئے سامنے کی کرسی پر بیٹھ گئے۔

"کہو میاں آج کل شاعری کیسی چل رہی ہے۔ سنا ہے کہ آج کل آزاد ..." ابھی وہ جملہ بھی مکمل نہیں کر پائے تھے کہ ان کی ہمارے پلنگ کے نیچے کسی چیز پر پڑی تو اچھل کر کھڑے ہو گئے

"ارے یہ تم نے کوئی سا تھیان پال رکھا ہے" گندم چچا کے چہرے سے خوف کے آثار نمایاں تھے۔

"اجی یہی ڈارلنگ کتا ہے"

"ارے یہ کتا ہے کہ گیدڑ" یہ سنتے ہی ڈارلنگ کی بھی پلک جھپکی اور اس نے نہایت تیکھے انداز سے گندم چچا کی طرف دیکھا۔

"حضور یہ کتا ہی ہے السیشن کی تازہ ترین قسم ہے"

"لاحول ولا قوۃ مجھے تو یہ گیدڑ ہی نظر آتا ہے"

ڈارلنگ نے اس بار یہ دونوں آنکھیں کھول کر گندم چچا کو کچھ ایسی غضب ناک نگاہوں سے دیکھا کہ اچھا اب چلیں کے جملے ہی میں گندم چچا کو اپنی عافیت نظر آئی۔

ایک دن جب ہم صبح گندم چچا کی دوکان پر پہنچے تو ان کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا ان کے ایک ہاتھ میں چمڑے کی لگام نما کوئی چیز تھی۔ ہمیں دیکھتے ہی برس پڑے۔

"اتور صاحب اس سور کی اولاد کو سنبھال لیجیے سالے کو تمام اپنے جیسے طور اطوار سکھا دئے ہیں آج کل وہ گھر کا طواف کر رہا ہے۔"

ہم نے مسکراتے ہوئے کہا "اماں اس میں مضائقہ ہی کیا ہے اگر آپ کی کتیا لیلیٰ ہے تو ہمارا کتا بھی فرہاد ہے"

"میں ایک ڈنڈے میں سالے کی مجنوں کی شیر نکال دوں گا" گندم چچا بھڑک گئے۔

"خیر چھوڑئیے یہ بتائیے آپ کے ہاتھ میں یہ چمڑے کی کیا چیز ہے"

"تم احمق ہو نہیں سمجھو گے"

"مگر حضور کچھ بتائیے بھی"

"چیسٹٹی بیلٹ ہے دورِ قدیم میں جنگجو سپہ سالار جب میدانِ جنگ میں لڑنے جاتے تھے تو اپنی بیگمات کو پہنا کر جاتے تھے۔ میں نے یہ لیلیٰ کے لئے بنوایا ہے"

اور واقعی جب یہ بیلٹ پہن کر گندم چچا کی کتیا باہر نکلتی ایسا لگتا کہ کوئی شادی کی گھوڑی کاٹھی لگام سے آراستہ ٹھمک ٹھمک کر چل رہی ہے۔

ساون کیا بیتا کہ ڈارلنگ کے جوشِ جنوں پہ پتھر آ بیٹھا۔ شاید ہی کوئی دن ایسا ہوتا کہ حضرت پٹے پٹائے گھر واپس نہیں آتے۔ ادھر بیگم دیدہ و دانستہ چشم پوشی اختیار کئے ہوئے تھیں ایک دن ہم نے خفگی کا اظہار کرتے ہوئے کہہ ہی دیا۔

"اس لفنگے کو زنجیر سے باندھ کر کیوں نہیں رکھتیں۔ جانتی ہو اس کے کارنامے"

"ہاں ہاں جانتی ہوں اور تمہاری جراٰت کے کارنامے بھی خوب جانتی ہوں۔ تم نے کون سے کم گل کھلائے ہیں" بیگم الٹے ہمارے گلے پڑ گئیں۔

ایک دن شام کو ڈارلنگ معمول سے زیادہ لنگڑاتے ہوئے گھر لوٹے ہم سمجھ گئے کہ حضرت آج کوئی غیر معمولی کارنامہ انجام دے کر گھر لوٹے ہیں ابھی ڈارلنگ ہمارے پلنگ کے نیچے بیٹھ کر اپنے زخموں پر اپنی سینک اپنا لعاب لگا ہی رہے تھے کہ دھڑاک سے کمرے کا دروازہ کھلا۔

"کہاں ہے وہ سگِ مادر زاد۔ سالے کی ٹانگیں توڑ دوں گا۔" گندم چچا غصے سے کانپ رہے تھے ان کے ایک ہاتھ میں ڈنڈا اور دوسرے میں ٹوٹا ہوا چیسٹٹی بیلٹ تھا۔

بیگم بھی سہم گئیں۔

"کیا بات ہے حضرت کچھ کہو تو" ہم نے معاملے کی نزاکت کی تہہ تک پہنچتے ہوئے پوچھا۔ "تم چپ رہو جی۔ کہاں ہے وہ سور کا بچہ" گندم چچا نے ہمارے پلنگ کے نیچے دیکھا مگر ڈارلنگ ندارد گندم چچا نے گھر کا چپہ چپہ چھان مارا مگر ڈارلنگ خدا جانے کہاں جا کر [illegible] ہو گئے تھے۔

کوئی بات نہیں کہاں جائے گا [illegible] حرامی ادھر ہاں [illegible] تم بھی [illegible] کر تش لو سارے کے سارے باقی [illegible] پر

یومِ آزادی پر

توصیف علوی عاصی کیرانوی

دعوتِ فکر و عمل

آؤ پھر لے کر جہاں میں امن کا پرچم اُٹھیں
زندگی کے ساز کی لے کر نئی سرگم اُٹھیں

ہوں عمل پیرا جہاں میں کامرانی کے لئے
دیں نئے فکر و نظر پھر زندگانی کے لئے

عزمِ محکم سے ہوا کرتی ہے تعمیرِ حیات
خونِ دل سے بنتی ہے رنگین تصویرِ حیات

استقامت ہے ضروری عزمِ منزل کے لئے
جوشِ طوفاں چاہیئے تعمیرِ ساحل کے لئے

زندگی میں سُرخ رُوئی کا نشاں جدوجہد
ہے ہر اک ذوقِ نظر کی داستاں جدوجہد

محنت و کاوش ہے روحِ کاروانِ زندگی
فکرِ پیہم ہے بہارِ گلستانِ زندگی

قوم کی راہوں میں ہے ایثار شرطِ اوّلیں
حُبِّ قومی سے ملا کرتی ہے عظمت بالیقیں

بڑھ کے دو انساں کو پھر پیغامِ صلح و آشتی
دو جہاں والوں کو پھر آئینِ ربطِ باہمی

فکر کی یکرنگیوں کا پھر اُٹھو لے کر پیام
دو زمانہ کو محبت سے بھرے مینا و جام

اتحادِ باہمی کی پھر سے کھائی ہے قسم
پھر سے ہم آہنگ کرتے ہیں ہمیں دیر و حرم

ہیں مساوات و اخوت جوہرِ انسانیت
«آب» پاتا ہے انہیں سے گوہرِ انسانیت

اس جہاں کا گوشہ گوشہ عدل سے معمور ہو
ہر طرف پھیلا مسرت کا حقیقی نور ہو

ہو صداقت آئینہ انساں کے کردار کا
عکس ہو انساں ہی انساں کے اطوار کا

ہے ضروری جذبۂ قومی بنے رازِ حیات
ہو نئے نغمات کا حامل ہر اک سازِ حیات

قوم کی تعمیر ہوتی ہے بلند افکار سے
زندگی بنتی ہے عاصی فکر کے انوار سے

تعارفی رباعیات — سلام ساگری - ساگر

ستارے

جو ایک غیر معمولی مشاعرہ منعقدہ "ساگر" کے موقع پر "ساگر" کی خنک و لطیف لہروں پر جھلملائے اور اپنی دلآویز جھلملاہٹ کا عکس اہالیانِ "ساگر" کے دلوں پر ہمیشہ کے لئے مرتسم کر گئے۔ (سلام ساگری)

جناب وکیل بھوپالی

محفل میں وکیل آئے کہ آئی توقیر ہر لفظ ہے جن کے ادب کی تعمیر
الفاظ وہ ہو جائیں جو دل میں پیوست اللہ رے یہ ان کے سخن کی تاثیر

جناب صہبا قریشی

یہ حضرت صہبا ہیں کہ آیا ہے شباب اٹھتی چلی جاتی ہے تخیل کی نقاب
ہر مصرعہ ہے ترکیب و سرور افزا ہے ہر شعر ہے بل کھائی ہوئی موجِ شراب

جناب باسط اوجینی

پہنچے ہیں سب اردوئے معلی کے قریب پیاسوں کو لے آئے ہیں دریا کے قریب
یہ ان کے خیالات کی رفعت ہے سلام باسط کا ٹھکانا ہے ثریا کے قریب

جناب محمد حسین خاں مہر

اے مہرِ سخن حضرت مہر آتے ہیں اشعار سے اک نور سا برساتے ہیں
بجلی ہے کہ ہر مصرعۂ تر ہے ان کا دل بزم میں پُر نور ہوئے جاتے ہیں

جناب شاہد بھوپالی

اشعار سے ظاہر ہے طبیعت ان کی اسلوبِ بیاں ان کا ہے جدت ان کی
شاہد ہی کا حصہ ہے نگاہِ غائر روشن ہے ہر اک شعر سے فطرت ان کی

جناب کلیم سرونجی

اب لیجئے کلیم آپ کا نام آیا ہے اترے جو دلوں میں وہ کلام آیا ہے
ہے خالقِ جذبات محبت لا رہے محفل میں نرالا یہ پیام آیا ہے

جناب گلزار ساگری

آئندہ ترقی کے ہیں ان میں آثار الفاظ ہیں معقول مناسب معیار
الفاظ ہیں یا پھول کھلے ہیں یہ سلام گلزار کی اک اک غزل ہے گلزار

جناب آذر جبلپوری

شورنگ ہیں اک جذبۂ خوش منظر میں ہر لفظ ہے نہلایا ہوا کوثر میں
اشعار میں ان کے کہ شبابِ رنگیں جلوے ہیں عیاں بارگہِ آذر میں

جناب نور محمد قمر

دیکھو انہیں محفل میں قمر آئے ہیں یہ عرش سے مضمون اڑا لائے ہیں
ان پر کرمِ خاص ہے قدرت کا سلام گُر ان کو سخنگوئی کے سمجھائے ہیں

جناب امتیاز انجم

معنی میں نہاں حسنِ تکلم ان کا الفاظ سے ظاہر ہے تبسم ان کا
موسیقیت اشعار میں انجم کے ملی سونے پہ سہاگہ ہے ترنم ان کا

جناب تبسم صہبائی

ہر چند کہ مدھم ہے تکلم ان کا ہے طرزِ بیاں جیسے ترنم ان کا
پُر لطف ہیں اشعار تبسم بائی سونے پہ سہاگہ ہے تبسم ان کا

جناب کوثر ساگری

ہر چند کہ کوثر ہے نیا شاعرِ "ساگر" ظاہر میں نظر آتا ہے سب سے کم تر
آثار نظر آتے ہیں لیکن ایسے ہو جائے گا یہ صاحبِ موجِ کوثر

بقیہ صفحہ ۲۲ سے

کون سنگسار ہوا

کسی نے نہیں۔ یسوع نے کہا میں بھی تجھ پر حکم نہیں لگاتا — جا۔ پھر گناہ نہ کرنا۔
سب کے سب اب بھی اس کا منہ تک رہے تھے۔ مجمع اب یہ سوچنے کا، [illegible] کہ لوگوں نے کیسے [illegible] کا انکشاف نہیں کیا۔

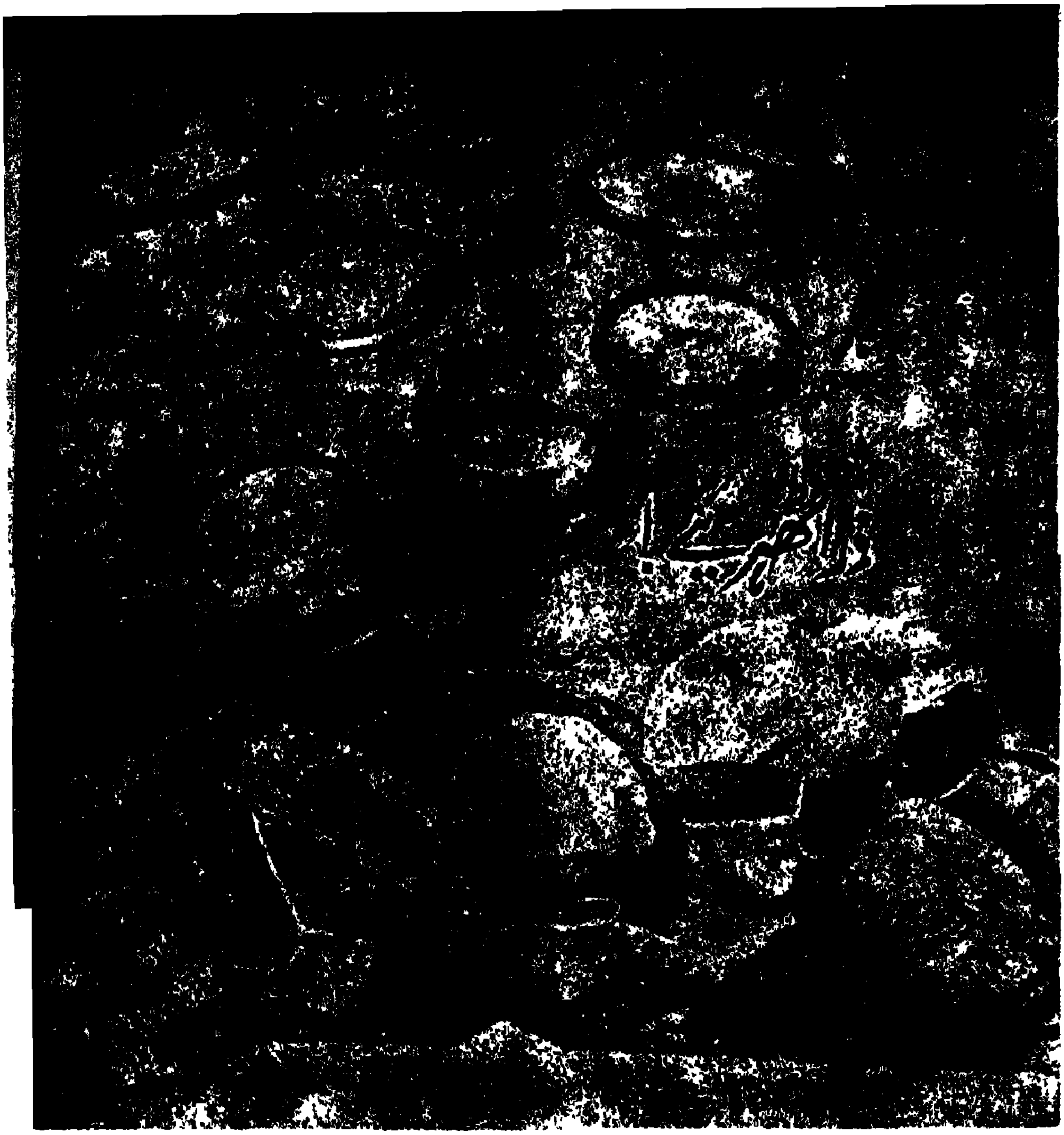

کیا آپ گلے کی تکلیفوں میں اکثر مبتلا رہتے ہیں اور اس کی وجہ سے سخت پریشان ہیں، لیکن یہ نہ سمجھئے کہ ایسی پریشان کن بیماری سے گلا کاٹ دینے سے ہی چھٹکارا مل سکتا ہے۔ ذرا ٹھہریئے! خالص دیسی ادویات سے تیار کیا ہوا "ٹونسلیکس" ایک بار صرف ایک بار استعمال کر کے تو دیکھئے، پھر آپ کو گلے کے غدود بڑھ جانے، گلے کی سرسراہٹ، خراش، گلے کے ورم، زخم اور دوسرے تمام امراض کی شکایت نہیں رہے گی۔ اگر آپ کے علم میں کوئی ایسا مریض ہو، جس کے گلے کے غدود (ٹانسلائٹس) کا آپریشن ہونا ہے تو اُسے اس دوا کے بارے میں ضرور بتائیے گا کیوں کہ پھر اُسے آپریشن کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ چھوٹے بچے جو کھٹی میٹھی چیزیں کھا کر گلا خراب کر لیتے ہیں، اُن کے لئے بھی یہ بہت کام کی دوا ہے۔ ہر گھر میں اس کا رہنا بہت ہی ضروری ہے۔

—— شمع (یونانی اینڈ آیورویدک) لیبارٹیریز، لال کنواں، دہلی ۱۱۰۰۰۶

Phone: 275802 Regd No D- (DN) 353
THE SHAN-E-HIND MONTHLY NEW DELHI-110002 AUGUST 1985
Regd with the Registrar of Newspaper at R No. 644 57

خرید کر پڑھیئے :
مانگ کر پڑھیئے :
یا پھر
چوری کر کے پڑھیئے

یہ ہے ہی اتنا خوب صورت ،

اتنا دل کش ،

اتنا مکمل کہ اسے کسی طرح بھی

حاصل کریں کیوں کہ

یہ فیض کی شخصیت اور فن پر ایک

شان دار ادبی دستاویز ہے ۔ اِس میں شامل ہیں :

پندرہ روپے

★ خلوت اور جلوت کے بھید کھولنے والے ذاتی نقوش ۔
★ نادر و نایاب تصویریں ۔
★ سدا بہار ، ہزار رنگ و منتخب کلام ۔
★ فیض کی شخصیت کے وہ ڈھکے چھپے گوشے جن پر سے پہلی بار پردہ اُٹھایا گیا ہے ۔
★ ہندوستان ، پاکستان ، رُوس اور انگلستان کے دانش وروں کی مشترکہ کاوشوں کا گلدستہ ۔

ساری اُردو دنیا میں شبستان کے "فیض نمبر" کا چرچا ہے

اس سے پہلے کہ اسٹاک ختم ہو جائے آج ہی اپنے قریبی نیوز ایجنٹ سے طلب کیجئے یا براہ راست ہم سے منگوائیے ۔

شبستان اُردو ڈائجسٹ آصف علی روڈ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

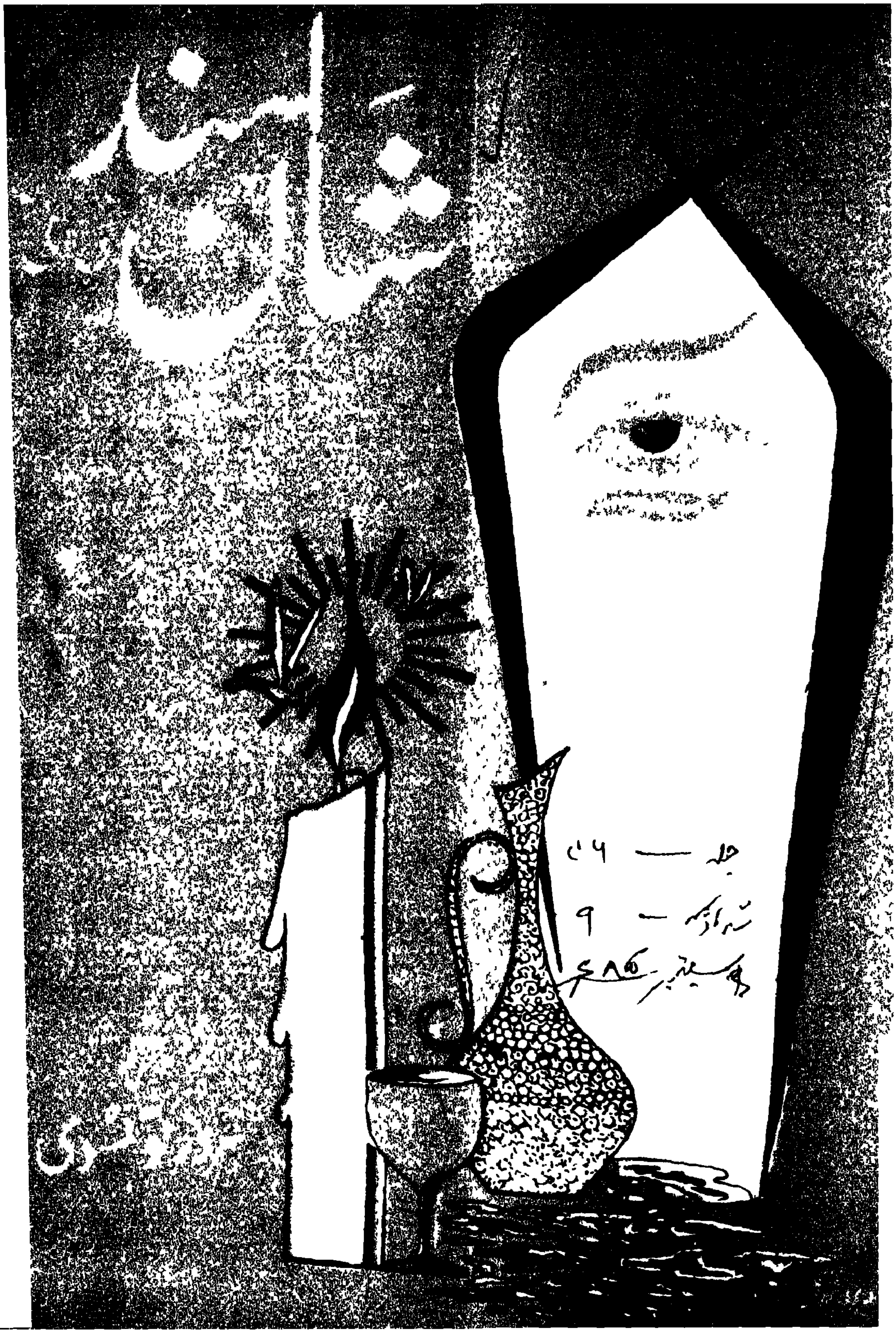

شب خون
جلد —
شمارہ — ۹
دسمبر ۸۵ء

ٹیلیفون نمبر ۲۷۵۶۰۲ | رجسٹرار آف نیوز پیپر فار انڈیا کا رجسٹریشن نمبر ۲۲۴۶/۵۷ | رجسٹرڈ نمبر ڈی (ڈی این) ۳۵۲

ہندو پرست ہوں نہ مسلماں پرست ہوں
دامن پرست ہوں نہ گریباں پرست ہوں
ہر ذرۂ وطن سے ہے فیاضؔ مجھ کو پیار
یعنی وطن پرست ہوں انساں پرست ہوں
فیاض گوالیاری

ماہنامہ

شانِ ہند نئی دہلی

ایڈیٹر سرور تونسوی

فی پرچہ ۲/۵۰ روپے
زر سالانہ ۲۴/- روپے

جلد ۲۶ | ستمبر ۱۹۸۵ء | شمارہ ۹

عندلیب شادانی

لاہور میں جب تھے تو اچکن ہوتی تھی۔ نیچے بنیان، قمیص یا کرتا وغیرہ نہیں ہوتا تھا۔ دہرہ دون بازار دھامان والا کے قریب ایک صاحب کی بیوی کا نام عندلیب تھا اور عندلیب نام سے انہوں نے رسالہ اپنی بیوی کو خوش رکھنے کے لئے شائع کرنا شروع کیا۔ وہ اپنی بیوی کا نام بطور مدیرہ شائع کرتے تھے۔ عندلیب شادانی اس لڑکی سے ملنے گئے، پردہ اپنے آپ گر گیا۔ اتنے میں لڑکی کا خاوند آ گیا۔ اس وقت لڑکی عندلیب شادانی کی عاشقانہ غزل پڑھ رہی تھی جو کہ ماہنامہ "عندلیب" میں طبع ہوئی تھی۔ بس پھر کیا تھا، شوہر کو شک ہوا اور عندلیب شادانی صاحب کا حال جو ہوا ہے وہ عندلیب کے شوہر کی زبانی سننے کے قابل تھا۔ اور یہ انکشاف انہوں نے کیا کہ جب مارا پیٹا ہے عندلیب شادانی کی اچکن کے چیتھڑے اڑ گئے تو وہ صرف پاجامے اور بنیان میں ہی بھاگ رہے تھے۔ یعنی دہرہ دون میں بھی اچکن کے نیچے قمیص یا کرتا وغیرہ نہیں تھا۔

عندلیب شادانی صاحب نے ہر شاعر پر تنقید کی۔ سیماب اکبرآبادی نے انہیں اُدھیڑ کر رکھ دیا تھا۔ آرزو صاحب نے عندلیب سوال سے ان کے بارے میں مضمون لکھ کر ان کے بخئے اُدھیڑ دیے۔

ادیب پبلشر سرور تونسوی ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے خواجہ پریس چتہ شیخ منگو جامع مسجد دہلی سے چھپوا کر دفتر شان ہند فلیٹ نمبر ۲ انصاری مارکیٹ دریا گنج دہلی [illegible] ۱۱ سے شائع کیا۔

تابندہ اور پائندہ مشعل

بلبل چہ گفت؟ گل چہ شنید و صبا چہ کرد؟

"روزنامہ قومی آواز" قومی ملکیت ؟ یا

دو چار ذہنی طور پر اپاہج اور نااہل ادیبوں کی ذاتی ملکیت ؟

آزادی کے بعد سے دہلی میں ایک اچھے اردو روزنامہ کی کمی شدت سے محسوس کی جا رہی تھی کیونکہ وہاں سے اکثر روزنامے [illegible] شائع ہوتے تھے اور بہ لحاظ طباعت ہیت، اور مواد ان کا معیار خاطر خواہ نہ تھا اور ہر اخبار کسی نہ کسی خاص مقصد کے لئے تھا۔

ہر اردو پرست الیوسی ایٹڈ جرنلس لمیٹڈ کا تہہ دل سے شکر گزار ہے کہ اس نے اس کمی کو پورا کرتے ہوئے "قومی آواز" کا دہلی ایڈیشن جاری کیا۔ اور یہ روزنامہ طباعت، خبروں، سیاست۔ اداریوں غرض ہر اعتبار سے ہر طرح سے [illegible] ہے۔ اس کی مقبولیت کا یہ عالم ہوا کہ راقم الحروف جو گزشتہ سالہا سال سے روزنامہ "پرتاپ" کا مستقل [illegible] "قومی آواز" کو اپنانے پر مجبور ہو گیا۔ اور ایمانداری کی بات یہ ہے کہ جناب حضرت علی صدیقی کی فن کارانہ ادارت اور جناب موہن چراغی کی معاون ادارت اور تجربہ جناب لیشپال کپور کی انتظامیہ صلاحیتوں کی تثلیث نے قومی آواز کو اردو صحافت کی آبرو کا ضامن بنا دیا۔

ہمیں افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ کچھ عرصہ سے دو تین کم علم نااہل، جاہل مطلق اور ذہنی طور پر اپاہج نام نہاد ادیبوں نے قومی آواز کو اپنی جاگیر بنا رکھا ہے اور اس اخبار کے ذریعہ شرفاء اور نامور لوگوں کی پگڑیاں اچھالنے کا کام لیتے ہوئے سستی شہرت حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جب حضرت علی صدیقی یا موہن چراغی دہلی میں ہوتے ہیں تو قومی آواز کا وقار برقرار رہتا ہے۔ اور اخبار سستے قسم کی انتہائی گھٹیا زرد صحافت سے محفوظ رہتا ہے لیکن ان [illegible] کے دہلی سے باہر جاتے ہی ان نااہلوں کی چاندی ہو جاتی ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ان نااہلوں کے سارے حملے دہلی اردو اکادمی اور اس کے بعض ذمہ دار افراد پر ہوتے ہیں اکادمی کے سکریٹری جناب شریف الحسن نقوی۔ ایوارڈ کمیٹی کے چیرمین پروفیسر گوپی چند نارنگ اور [illegible] کے چیرمین خلیق انجم خصوصی طور پر ہدف ملامت ہیں۔

اس سلسلے میں ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اکادمی دہلی حکومت کا قائم کردہ ادارہ ہے۔ اس کا بنیادی مقصد اردو کی ترقی ہے تاکہ اردو والوں کو یہ اطمینان ہو کہ حکومت ان کی زبان کی ترقی کے لئے بھی کام کر رہی ہے۔

دوسری طرف اگرچہ قومی آواز براہ راست کانگریس کا اخبار نہیں ہے لیکن اس ٹرسٹ کے سارے ذمہ دار [illegible] کیا مضحکہ خیز لگتا ہے کہ کانگریس کے کچھ لوگ تو اردو والوں کا دل جیتنے کی کوشش کر رہے ہیں اور کچھ لوگ [illegible] کے ٹرسٹ کے ہی اخبار قومی آواز کے ذریعہ اردو والوں کو حکومت سے بدظن کرنے میں مصروف ہیں [illegible] جیسی [illegible] چند نام نہاد [illegible] جب اکادمی ان کی توقعات پورا نہیں کرتی تو قومی آواز

کے ذریعہ اُردو اکادمی اور ان کے ذمہ داران پر کیچڑ اُچھالی جاتی ہے۔ ہمیں یہ جان کر بے حد مسرت ہوئی کہ اُردو اکادمی کے کسی بھی ذمہ دار نے بلیک میل کرنے والوں کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے۔

قومی آواز کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہے۔ بلکہ ایک ٹرسٹ کی ملکیت ہے اس لئے پوری قوم اس کی مالک ہے چونکہ قومی آواز کے ذریعے شرفاء کی پگڑیاں اُچھال کر اپنا مالی مفاد پورا کرنا چاہتے ہیں وہ اس اخبار کے ایک ادنیٰ سے ملازمین ہیں۔ اس لئے ان کو ایسی حرکتوں کی اجازت نہیں دی جا سکتی ہم یش پال کپور صاحب سے بہت اچھی طرح واقف ہیں وہ انتہائی نیک۔ شریف۔ مہذب اور اُردو دوست ہیں انہیں یقیناً اپنے ان ملازمین کی کالی کرتوتوں کا علم نہیں ہے۔

ہم یش پال کپور صاحب سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ کچھ غیر جانب دار حضرات پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دیں۔ یہ کمیٹی پچھلے ڈیڑھ سال کے قومی آواز کے فائیل کا مطالعہ کر کے یہ معلوم کرے کہ کس کس کے خلاف لکھا گیا اور کس کس نے لکھا ہے اور کیا مخالفانہ تحریریں اخبار کی پالیسی کے مطابق تھیں یا نہیں۔

ہمیں یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ ادبی تقاریب کی رپورٹیں جن لوگوں کے نام سے چھپتی ہیں وہ ان لوگوں کی لکھی ہوئی نہیں ہوتیں بلکہ باہر کے کچھ لوگوں سے لکھوائی جاتی ہیں کیونکہ یہ نااہل لوگ تو ایک پیراگراف بھی صحیح نہیں لکھ سکتے۔

اگر اس کمیٹی ان مکتوبات کا بھی جائزہ لے جن میں شرفاء کی پگڑیاں اُچھالی جاتی ہیں کیونکہ ایسا مشہور ہے کہ یہ ایسے مکتوبات قومی آواز کے دفتر میں ہی لکھے جاتے ہیں۔

اگر یہ الزامات درست ہیں تو پھر ان نااہلوں کو قومی آواز کے دفتر میں بیٹھ کر شرفاء اور نامور حضرات پر کیچڑ اچھالنے کی بجائے سڑکوں کی پیمائش کرنے کے لئے ان کی چھٹی کر دینی چاہیئے۔ دراصل ان لوگوں کی روٹیاں لگ گئی ہیں۔ ہم یہ دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ لکھنؤ سے بھی قومی آواز شائع ہوتا ہے لکھنؤ ایڈیشن میں اس طرح کی حرکتیں کیوں نہیں کی جاتیں اسی لئے کہ عشرت علی صدیقی صاحب خود نگرانی کرتے ہیں۔ قومی آواز کے ذمہ داروں کو چاہیئے کہ وہ ادبی جلسوں کی رپورٹیں لکھنے کے لئے فوراً کسی ایسے پڑھے لکھے آدمی کا تقرر کریں جسے لکھنے کا سلیقہ ہو اور جو دوسروں سے رپورٹیں نہ لکھوائے۔

ہم یش پال کپور صاحب کا بہت احترام کرتے ہیں لیکن چونکہ یہ معاملہ اُردو کی فلاح اور بہبود کا ہے اس لئے ہماری گذارش ہے کہ انہیں فوری طور پر اس طرف توجہ کرنی چاہیئے .... ۱۶ ستمبر کے قومی آواز کے آخری صفحہ پر چھپی خبر اکادمی کا تمثیلی مشاعرہ یا .... میں جو الزامات ڈاکٹر خلیق انجم پر لگائے گئے ہیں اگر انہیں ڈاکٹر خلیق انجم صاحب عدالت میں ثابت کرنے کے لئے چارہ جوئی کریں تو قومی آواز یہ کیسے ثابت کرے گا کہ مشاعرہ میں ڈاکٹر خلیق انجم نے اپنے عزیزوں دوستوں اور جاننے والوں کو ناجائز طور پر مالی فائدہ پہنچانے کی کوشش کی۔

اگر قومی آواز جو ایک قومی ملکیت ہے اسے اسی طرح نااہلوں نے اپنا آلۂ کار بنائے رکھا تو ہم اس اداریہ کا انگریزی ترجمہ پارلیمنٹ کے تمام ممبران کو بھیجیں گے۔ اور سینکڑوں کی تعداد میں ادیبوں کے دستخط کرا کے ایک میمورنڈم وزیر اعظم کی خدمت میں بھیجیں گے اور ایک وفد ان سے ملاقات کرے گا۔ کیونکہ ہم کسی صورت میں بھی یہ نہیں چاہتے کہ قومی آواز کو جو اُردو صحافت کا وقار بن چکا ہے اسے کچھ نااہل اپنے مطلب براری کے لئے بازاری سطح پر لے آئیں۔

ترقی اُردو بورڈ

[illegible] سے ہم پریشان ہیں کہ ڈائریکٹر صاحب ترقی اُردو بورڈ سے ہماری ملاقات ہو سکے [illegible] انہیں تفصیلی طور پر بتا [illegible] اصلاح طلب ہیں مگر ہماری بدقسمتی ہے کہ [illegible] کیا گیا [illegible]

...گئے تو ان کا جواب دینے کی ضرورت نہ سمجھی گئی - اس لئے مجبوراً ڈائریکٹر صاحبہ کی توجہ بذریعہ شانِ ہند مبذول کرائی جا رہی ہے - آپ کے حوالے سے اُردو دنیا ایک مجلہ شائع کیا جاتا ہے جو بغیر قیمت دیا جاتا ہے اس کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ جو بھی ترقی اُردو ...جاتا ہے تھیلا بھر کر لے آتا ہے اور کسی پرچون دکاندار کے ہاں ڈیڑھ روپیہ کلو کے حساب سے فروخت کر دیتا ہے ترقی اُردو ...کے اکثر کارکنان بخوبی جانتے ہیں کہ اُردو دنیا کون کون حضرات ردی میں فروخت کرتے ہیں - جب کہ اس کی اشاعت پر ہزاروں روپیہ ...برباد کیا جاتا ہے - حالانکہ اُردو دنیا کے ایک شمارے پر جو روپیہ ضائع کیا جا رہا ہے اس سے ایک بہترین کتاب شائع ہو سکتی ہے -

۲- اسی اُردو دنیا کے تازہ شمارہ میں اُردو ترقی بورڈ کے زیر اہتمام مختلف شہروں میں کتابت مراکز کے کچھ طلباء کی کتابت کے ...نمونے شائع کئے گئے ہیں - ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ یہ سب نمونے ان اساتذہ کے ہیں جو ان مراکز میں کتابت سکھاتے ہیں ...چیلنج کرتے ہیں کہ جن جن طلباء کے نام سے یہ نمونے شائع ہوئے ہیں انھیں عوام کے سامنے لایا جائے تو ڈائریکٹر صاحبہ کو پتہ ...چل سکے گا کہ ان کتابت مراکز کے سربراہ محض تنخواہ پانے کی خاطر اپنی کارکردگی کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں ورنہ حقیقت یہ ...ہے کہ یہ طلبا کتابت کی الف - ب سے بھی واقفیت نہیں رکھتے -

۳- ہم نے ایک نوجوان کو جناب ابوالفیض سحر اسسٹنٹ ڈائریکٹر ترقی اُردو بورڈ کے پاس بھجوایا کہ یہ صاحب اُردو میں ...اے ہیں اور اُردو کی پروف ریڈنگ بہترین کرتے ہیں چونکہ یہ ضرورت مند ہیں اگر آپ بورڈ کی چھپنے والی کسی کتاب کی پروف ریڈنگ ان سے کرائیں تو جہاں آپ کو ایک بہترین پروف ریڈر مل جائے گا وہاں اس نوجوان کی گزر بسر ہو جائے گی - مگر ابوالفیض صاحب نے جس بے رخی کا مظاہرہ اس نوجوان سے فرمایا وہ کسی طور بھی شرافت کے دائرہ میں نہیں آتا - سحر صاحب ...نے یہ بھی فرمایا کہ ہم کوالیفائڈ لوگوں کو پروف ریڈنگ کا کام دیتے ہیں - ان کوالیفائڈ پروف ریڈنگ کرنے والوں کی کوالیفکیشن ...کا عالم ہے کہ بورڈ کی کتابوں اور تو اور اُردو دنیا کے تازہ شمارہ میں ہی کتابت کی سینکڑوں غلطیاں ہیں (پچپن کو پچھن ...لکھا گیا ہے) حالانکہ سحر صاحب کو یہ کہنا چاہئے تھا کہ ہم اپنے دوستوں کو یہ کام دیتے ہیں -

۴- ترقی اُردو بورڈ کی مطبوعات کی فروختگی جس قدر ماہنامہ شانِ ہند کے ذریعہ ہوتی ہے ملک بھر کے کسی بھی روزنامے، ہفت روزہ ...ماہنامہ کے ذریعہ نہیں ہوتی اس کا ثبوت خود ترقی اُردو بورڈ کے سیل ڈپو میں موجود ہے - مگر ترقی اُردو بورڈ کی مطبوعات کے ...اشتہارات جو D.A.V.P کی معرفت شائع ہوتے ہیں بورڈ کی طرف سے جن رسائل و جرائد میں یہ اشتہار شائع کرنے کی فہرست ...دی جاتی ہے اس میں شانِ ہند کا نام نہیں ہوتا - ہم نے دو مرتبہ اس ناانصافی پر احتجاج کیا تو ہمیں زبانی بتایا گیا کہ ہم نے تو ...شانِ ہند کا نام بھجوایا ہے مگر D.A.V.P والوں نے آپ کو اشتہار نہیں دیئے - اس مرتبہ بھی ایسا ہی ہوا ہے - جو ...فہرست بورڈ کی طرف سے DAVP کو دی گئی ہے اس میں شانِ ہند کا نام نہیں ہے - شانِ ہند کی اسی اشاعت میں بورڈ ...کا اشتہار چھپ رہا ہے تو یہ شانِ ہند کو DAVP والوں نے از خود دیا ہے - کیا ڈائریکٹر صاحبہ اس ناانصافی کی وجہ ...بتا سکتی ہیں -

۵- ترقی اُردو بورڈ کی نئی مطبوعات اخبارات و رسائل کے مدیران کرام کو تبصرہ کی غرض سے بھجوائی جاتی ہیں - ...فہرست میں شانِ ہند کا نام شامل تھا - مگر نہ معلوم کس وجہ سے شانِ ہند کا نام اس فہرست سے خارج کر دیا گیا ہے جب کہ ...سلسلے میں ماہنامہ شانِ ہند ہی ایک ایسا ماہنامہ ہے جس کے ذریعہ سے بورڈ کی مطبوعات کی فروختگی دیگر رسائل و جرائد ...کے مقابلہ کئی گنا زیادہ ہوتی ہے - ہاں یہ بات دوسری ہے کہ شانِ ہند میں محض تعریفی تبصرے ہی شائع نہیں ہوتے - کہا جاتا ہے کہ یہ سب کچھ ابوالفیض سحر صاحب کی مہربانی کا نتیجہ ہے کیا ڈائریکٹر صاحبہ بتا سکیں گی کہ ایسا کیوں ہوا ہے -

(باقی پھر)

بہ کوئے یار بہ اندازِ محرمانہ گزر

سرور تونسوی

مرحوم حافظ محمد یوسف صاحب دہلوی کو اپنے واقف کاروں، دوستوں اور مخصوص طور پر ایسے احباب جن پر انھیں اعتماد ہوتا تھا کا یوں خیال رکھتے تھے جیسے اُن پر ان کی خبر گیری فرض کر دی گئی ہو۔ اگر ان کا کوئی جاننے والا بے کار ہوتا تو اسے مشورہ دیتے کہ کوئی کام کر لو اور اگر تمہارے پاس کام شروع کرنے کے لئے روپیہ نہیں ہے تو مجھ سے لو اور جب کام چل نکلے تو واپس کر دینا۔ حالانکہ وہ جانتے تھے کہ جو روپیہ وہ دیں گے شاید ہی واپس ملے مگر وہ بطور عطیہ روپیہ دینا اس لئے پسند نہیں کرتے تھے کہ روپیہ لینے والے یہ نہ سمجھیں کہ اُسے خیرات دی جا رہی ہے بلکہ قرض دیا جا رہا ہے اور یہ قرض عام طور پر [illegible] دیتا۔

ایک صاحب ان کے ہاں ہر روز حاضری دیتے تھے۔ چنانچہ [illegible] بیکار دیکھ کر حافظ صاحب فرمانے لگے ابھی تم کوئی کام کیوں [illegible] لیتے۔ یہ حضرت کہنے لگے حافظ صاحب کیا کروں روپیہ نہیں ہے [illegible] کا ملون بنانے کا کام شروع کر لوں تو ایک ہزار [illegible] بہت ہو سکتی ہے۔ حافظ صاحب فرمانے لگے کتنے روپیہ سے [illegible] ہو سکتا ہے۔ بڑی مشکل بنا کر مینا کی بولی میں [illegible] شروع میں تو دس ہزار روپیہ چاہئے گا اور چند [illegible] ہزار روپیہ مزید لگانا پڑے گا۔ بس پھر نوٹ چھپنا شروع [illegible] اور میں آپ کا روپیہ ہر ماہ کچھ ادا کر دیا کروں گا۔

[illegible] صاحب نے چیک سے دس ہزار روپیہ دے دیا اور چند دنوں بعد [illegible] بیس ہزار روپیہ لے گئے۔ [illegible] حافظ صاحب نے [illegible] کیا کبھی تمہارے کام کا کیا حال ہے۔ بس اسی دن سے انھوں نے حافظ صاحب کے ہاں حاضری دینا بند کر دیا اور حافظ صاحب خاموش ہو رہے۔ اور بیس ہزار روپیہ ہضم کرنے والا آج بھی دانے دانے کو محتاج ہے۔

ان صاحب کے دیکھا دیکھی ایک اور صاحب نے حافظ صاحب کے ہاں آنا جانا شروع کیا ہر شام کو وہ آ جاتے اور دو تین گھنٹے حافظ صاحب کے ساتھ گزارتے۔ حافظ صاحب انھیں کار میں سیر بھی کرا[تے] اور دفتر میں بھی خاصی خاطر مدارات ہوتی۔ حافظ صاحب نے ان [سے] کبھی پوچھ ہی لیا بھائی تم جوان ہو محنت کر سکتے ہو کوئی کام کر لو۔ حضرت پہلے صاحب کی رُوداد جانتے تھے لہٰذا انھوں نے بھی آنکھوں [میں] پانی بھر لاتے ہوئے لرزتی ہوئی آواز سے کہا حافظ صاحب کیا کر[وں] چھ سات بچے ہیں بیوی ہے اور اس پر یہ مہنگائی۔ کام کچھ نہیں اور کام کروں بھی کیسے روپیہ کے بغیر تو آدمی کا مُردہ پڑا رہے کوئی بھی نہیں آئے گا۔ حافظ صاحب نے یہ درد بھری داستان [سنی] تو عادت کے مطابق پوچھ بیٹھے کیا کام کرنا چاہتے ہو اور اس پر [کتنا] روپیہ لگے گا۔ یہ صاحب اپنے پیشرو سے بھی اُستاد تھے۔ [کہنے] لگے نہیں حافظ صاحب میں تو سید زادہ ہوں قرض لے کر واپس [نہ کیا] تو گناہ سر پر رہے گا۔ میں قرض لے کر کام نہیں کروں گا جب [اللہ] میرے ہی انعام دلوا دیگا تو کام کر لوں گا۔ بہر کیف اسی طرح [کی] افسوز باتیں کر کے اپنا اعتماد جماتے رہے اور آخر کار انھوں نے [بھی] پانچ ہزار روپیہ چار مرتبہ لے کر کام شروع کر دیا۔ کام [جو] انھوں نے شروع کرنا تھا۔ جس کام کے لئے انھوں نے روپیہ لیا تھا۔ [وہ] ان کا ایک دوست کرتا تھا۔ روپیہ کو سمجھا دیا گیا کہ میں حافظ [صاحب] کو آپ کے کارخانے میں لاؤں گا تو [illegible] کر نا کہ مالک مجھے ہی ظا[ہر کرنا] اور خود کارخانے کے منیجر کی حیثیت سے انھیں کارخانے کا معائنہ [کرانا]۔ چنانچہ یہ صاحب حافظ صاحب کو دوست کے کارخانے میں لے [گئے] [illegible] صاحب نے خوب اداکاری دکھائی اور عرصہ [illegible] طور پر ان لوگوں نے حافظ صاحب کے دل و دماغ پر یہ اثر چھوڑا کہ ان کا کام تسلی بخش ہے لہٰذا انھیں مزید روپیہ دیا جائے تو بھی ترقی کریں گے۔ لہٰذا چار قسطوں میں بیس ہزار روپیہ حافظ [صاحب نے] انھیں دیا۔ اس کے بعد اصلیت کھل گئی کہ وہ کارخانہ دراصل ان [illegible]

کہتا تھا کہ حافظ صاحب نے اتنی [illegible] اور صاحب
کہتے رہے کہ اللہ دے گا تو ضرور قرض ادا کروں گا۔ مگر اللہ کے
اصحاب تو اپنی قسم کا الگ ہی ہوتا ہے۔ اور اللہ نے ان صاحب
کو بیس ہزار روپیہ یکمشت دے دیا جس میں بڑی ہی مشکل سے
صاحب سے پانچ ہزار روپیہ نکل سکا باقی پندرہ ہزار روپیہ ہضم کر گئے۔
ایک لالہ جی بھی حافظ صاحب کے یہاں قریب روزانہ
آ دیتے تھے۔ یہ صاحب کھاتے پیتے ہیں مگر کسی کی نیت کا کیا
ہے انھوں نے حافظ صاحب سے دس ہزار روپیہ قرض لیا۔
مشکل سے انھوں نے سات ہزار روپیہ کئی سالوں میں ادا کیا کیونکہ
لالہ جی کا کہنا ہے کہ ان کی آتما کسی کا قرض ادا کرنے کے لئے کبھی ہی
[illegible]۔ لہذا ان کی یہ عادت گویا اکثر شام کی محفل کو قہقہوں میں بدل دیتی
اس حقیقت کا خود حافظ صاحب کو تجربہ تھا کہ ان لالہ صاحب سے
وصول کرنا بھینسا دوہنے کے مترادف ہے۔ مگر ایک شام کو
کہنے لگے سیٹھ صاحب آج ہم سے پھر غلطی ہو گئی۔ عرض کیا کہ کیا پھر
قرض دے دیا ہے۔ مسکرائے اور فرمانے لگے لالہ اپنے لڑکے
کو لایا تھا کہنے لگا کہ کل شام کو لڑکے کی برات چڑھنی ہے اور
ایک پیسہ بھی نہیں ہے اگر آپ دس ہزار روپیہ دے دیں تو
اچھا خاصا روپیہ ملے گا پہلے آپ کا روپیہ ادا کر دوں گا اور شادی
ہو جائے گی۔ فرمانے لگے مجھ سے اس کی بے بسی نہ دیکھی گئی
دس ہزار روپیہ دے دیا۔ لالہ جی کا لڑکا اب غالباً تین بچوں کا باپ
ہے مگر لالہ جی یا ان کے صاحبزادے نے ایک پیسہ تک ادا نہ
کیا۔ ان واقعات کو میں نے محض تذکرہ کے طور پر قلم بند کر دیئے ہیں
میرے علم میں ابھی کچھ اور ایسے واقعات بھی ہیں کہ اگر ان کو تحریر میں
لاؤں نہ معلوم کس کس کے راز افشا ہوں گے اور کون کون بے نقاب
حافظ صاحب نے اپنی زندگی میں ان لوگوں کی عزت رکھی اور
[illegible] تک کو علم نہ ہونے دیا لیکن اب ان کے انتقال کے بعد
[illegible] کہ ایک تو یہ حضرات [illegible]
[illegible] سے تعلقات [illegible] انشاء اللہ کسی آئندہ
[illegible] ایسے ہی کچھ اور حضرات کا ذکر کروں گا۔ [illegible] نے حافظ صاحب
[illegible] ان بے وفا حضرات کے برعکس۔ ایک صاحب تھے
[illegible] پاکستان میں کئی سال ہوئے انتقال ہو گیا ہے، جن پر حافظ

صاحب کو اعتماد تھا مگر یہ صاحب بے کار تھے اور بے کاری میں بھی
ایمان کو کام رکھے ہوئے تھے۔ بیچارے تھے ان پڑھ۔ ایک دن
حافظ صاحب سے کہنے لگے کہ آپ کا اتنا بڑا کاروبار ہے آپ کے
سیکڑوں ملازم ہیں۔ کیا آپ میرے لئے کوئی جگہ نہیں نکال سکتے
حافظ صاحب فرمانے لگے بھائی تم لکھنا پڑھنا جانتے نہیں ہو
ایک صحافتی ادارے میں تمہیں کیا کام دیا جا سکتا تھا۔ یہ صاحب
حافظ صاحب سے خاصے بے تکلف تھے کہنے لگے کہ رسالے کے دفتر میں
کیا چپراسی بھی ان پڑھ نہیں ہو سکتا۔ حافظ صاحب فرمانے لگے بھائی
میں تمہیں دوست سمجھتا ہوں اور تمہاری خدمت ویسے ہی کرنا چاہتا
تو تم مجھ سے کچھ لینا قبول نہیں کرتے۔ دفتر میں چپراسی رکھوں تو یہ
گوارا نہیں ہے۔ مگر یہ صاحب دھن کے پکے تھے کہنے لگے دوستی اور
تعلقات اپنی جگہ مگر ڈیوٹی اپنی جگہ۔ حافظ صاحب چونکہ ایک اعلیٰ
درجہ کے منتظم تھے فرمانے لگے اگر آپ چپراسی کی نوکری کرنا ہی چاہتے
ہو تو پھر دفتر میں ہمارے تمہارے تعلقات ویسے ہی ہوں گے جیسے
مالک اور ایک چپراسی کے ہوتے ہیں۔ ہاں دفتر کے اوقات کے بعد
ہم ایک دوسرے کے لئے وہی ہوں گے جو اب تک رہے ہیں غرض
دوسرے ہی دن یہ صاحب دفتر میں چپراسی مقرر ہو گئے اور انھوں نے
واقعی اپنے فرائض اس خوبی سے نبھائے کہ جس کی تعریف کی جانی
چاہئے پھر یہ صاحب پاکستان چلے گئے اور جب کبھی حافظ صاحب
پاکستان گئے تو یہ صاحب ہر وقت حافظ صاحب کی حضوری میں
اور اپنے آپ کو حافظ صاحب کا چپراسی ہی سمجھا۔ یہ صاحب اپنی
ایمانداری اور دیانت داری کا سکہ حافظ صاحب کے دل پر ایسا بٹھا
چکے تھے کہ حافظ صاحب نے ہمیشہ ان کی تعریف کی۔

گیتا

کا اردو منظوم ترجمہ "سر مغفرت" کے نام سے ادارہ شان ہند
نے شائع کیا ہے مترجم جناب [illegible] نے سر مغفرت
کا جو دیباچہ لکھا ہے اس میں گیتا کے بارے میں جو انکشافات
کئے ہیں وہ آج تک اردو یا ہندی میں شائع نہیں ہوئے
مسلمان حضرات کے مطالعہ کی بہترین کتاب قیمت بارہ روپیہ
دفتر شان ہند انصاری مارکیٹ نئی دہلی ۲

ترقی اردو بیورو کی نئی مطبوعات

کتاب کا نام	مصنف / مترجم	قیمت
۱- پریم چند	پروفیسر قمر رئیس	۱۱-۵۰ روپے
۲- میر تقی میر	ڈاکٹر نثار احمد فاروقی	۱۸-۰۰ روپے
۳- ہندوستان دور وسطیٰ کے مورخین	محب الحسن / مسرور علی ہاشمی	۲۵-۰۰ روپے
۴- فرہنگ سیاسیات	محمد محمود فیض / محسن علی جعفری	۳۸-۰۰ روپے
۵- کلیات سودا جلد اول	پروفیسر محمد حسن	۴۸-۰۰ روپے
۶- [illegible]	ایچ سی گپتا / جی پرشاد	۳۵-۰۰ روپے
۷- اردو صرف و نحو	ڈاکٹر اقتدار حسین خان	۱۶-۰۰ روپے
۸- عہد وسطیٰ ہندوستان کے سیاسی اور سماجی افکار	ڈاکٹر [illegible]	۴۶-۰۰ روپے
۹- کلاسیکی برق و مقناطیسیت	[illegible]	۵-۰۰ روپے
۱۰- علم الاعداد	حکیم [illegible]	۲۲-۰۰ روپے
۱۱- ابتدائی نفسیات	الفریڈ ایم اوزان / ذکیہ مشہدی	۲۶-۰۰ روپے
۱۲- تجارت و بین الاقوامی معاملات عامہ	اے پی نصابی کتاب	۱۶-۰۰ روپے
۱۳- تجرباتی سائنس	لیسلی [illegible] / طاہرہ [illegible]	۳۵-۰۰ روپے
۱۴- تعلیم کی نفسیاتی اساس	مترجم عبداللہ ولی بخش قادری	۹۵-۰۰ روپے
۱۵- اورنگ زیب کے عہد میں مغل امرا	محمد اطہر علی	۲۸-۰۰ روپے
۱۶- ہندوستانی سیاست میں مسلمانوں کا عروج	رفیق ذکریا	۳۹-۰۰ روپے

ان کے علاوہ مندرجہ ذیل کتابیں دوبارہ شائع ہو گئی ہیں

کتاب کا نام	مصنف / مترجم	قیمت
۱- ادب کسے کہتے ہیں؟	اطہر پرویز	۱-۸۵ روپے
۲- تاریخ شاہجہاں	بنارسی پرساد / اعجاز حسین	۱۳-۰۰ روپے
۳- تاریخ جہانگیر	بینی پرساد / رحیم علی الہاشمی	۱۸-۴۵ روپے
۴- تعلیمی تشکیل نو کے مسائل	خواجہ غلام السیدین / [illegible]	۱۲-۴۵ روپے
۵- شمالی ہندوستان کے مسلم عہد حکومت میں	ایس ایم جعفر / سعید انصاری	۸-۲۵ روپے
۶- اقبال کی کہانی	جگن ناتھ آزاد	۲-۵۰ روپے
۷- قومی تہذیب کا مسئلہ	ڈاکٹر عابد حسین	۹-۶۰ روپے
۸- اصول معاشیات	رضیہ نظامی	۱۰-۰۰ روپے
۹- شعریات	ارسطو / شمس الرحمن فاروقی	۵-۲۵ روپے
۱۰- تیمارداری	حسین فاروقی	۱۲-۵۰ روپے

بیورو کی تمام کتابوں سے متعلق ضروری معلومات بیورو کے سہ ماہی جریدے "اردو دنیا" میں درج کر دی گئی ہیں جسے مفت حاصل کیا جا سکتا ہے۔

بیورو کی تمام کتابیں اردو کے تمام کتب فروشوں سے حاصل کی جا سکتی ہیں۔

شعبۂ فروخت و اشاعت، ترقی اردو بیورو، ویسٹ بلاک ۸، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۶۶

۱۶ لاکھ صارفین کو فائدہ

دلی انتظامیہ کی طرف سے شروع کی گئی "چلتے پھرتے بازار" کی اسکیم کے تحت گزشتہ دو برسوں کے اندر ۱۶ لاکھ سے بھی زیادہ صارفین کو فائدہ پہنچا ہے۔

اس اسکیم کے تحت صارفین کو ان کے گھروں کے نزدیک روزانہ استعمال میں آنے والی ضروری اشیاء مناسب داموں پر دستیاب کرائی جاتی ہیں۔

یہ اسکیم اکتوبر ۱۹۸۲ میں شروع ہوئی تھی اور اس کے تحت اب تک چار کروڑ ۱۵ لاکھ روپے سے زیادہ قیمت کی اشیاء فروخت کی جا چکی ہیں۔

یہ اسکیم بہت ہی کامیاب اور مقبول ہو رہی ہے۔ اس سے عام لوگوں کو اور خاص طور سے کمزور طبقوں کے لوگوں کو فائدہ پہنچا ہے۔

اس اسکیم کی اہم خصوصیات یہ ہیں

- ۳۴ گاڑیاں۔ جن میں ۲۳ دلی ریاستی شہری رسد کارپوریشن کی اور ۱۱ دلی کنزیومرز ہول سیل سٹور کی ہیں۔ ان کے ذریعہ ضروری اشیاء کی فروخت جاری ہے۔
- شہر کے مختلف حصوں میں ۹۹ مقامات پر تقسیم کا انتظام۔
- چینی، چائے، دالیں، کاپیاں، سبزیاں، سرسوں اور ناریل کا تیل اور ونامری تیل، کنٹرول کا کپڑا، صابن، مصالحے، آلو اور پیاز وغیرہ ضروری اشیاء کی فروخت جاری ہے۔
- چائے، چینی اور دالیں جیسی چیزیں ایک کلو سیل بند پلاسٹک کی تھیلیوں میں دستیاب ہیں ... ایک کلو کی خصوصی تھیلیوں میں دستیاب ہیں۔

دلی انتظامیہ صارفین کے مفادات کے تحفظ کے لئے تہیہ کئے بیٹھی ہے

محکمہ اطلاعات و اشاعت، دلی انتظامیہ دلی

توصیف علوی عاصی کیرانوی

اُردو شاعری میں فنِ تاریخ گوئی

اُردو شاعری میں تاریخ گوئی ایک نہایت ہی اہم اور مشکل ترین صنعت ہے اور جتنی مشکل ہے اس سے زیادہ دلچسپ اور عجیب بھی ہے۔ اگرچہ یہ صنعت اردو شعر و سخن میں خاصی پرانی ہے اور اس کی بنیادیں کافی دور تک ہیں اور قدیم دور سے آج تک برابر ہمارے شعراء اور ادیبوں میں اس سے ربط اور دلچسپی موجود ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس میدان میں قدم بڑھانا اور قلم اٹھانا بھی ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ اس فن کی تاریخ شاہد ہے کہ اس میں انہیں فنکاروں نے کاوش کی جرأت کی ہے جن میں اس کے لئے فطری صلاحیت بھی موجود تھی اور جو شاعرانہ فکر و فن پر بھی کافی عبور اور دسترس رکھتے تھے۔

تاریخ گوئی کا تعلق ایک خاص قسم کے حساب سے ہے جس میں ابجد، ہوز، کی تحتی کے مطابق حروف تہجی کے مقررہ اعداد کی روشنی میں کسی خاص مادہ تاریخ سے جو عام طور سے مصرعہ شعر یا فقرے کی صورت میں ہوتا ہے کسی اہم واقعہ کی تاریخ نکالی جاتی ہے اس طریقہ حساب کو "حساب جمل" کہتے ہیں۔ تاریخ گوئی کی اصطلاحی تعریف جناب آزاد بلگرامی کے الفاظ میں یہ ہے۔

"اصطلاح میں تاریخ اس کو کہتے ہیں کہ کوئی لفظ، فقرہ، مصرعہ، بیت، یا عبارت ایسی تجویز کریں کہ اس کے مکتوبی حروف کے اعداد سے بحساب جمل کسی خاص واقعہ، مثلاً شادی، وفات، تولید یا تصنیف کا سن معلوم ہو جائے۔"

جلال لکھنوی نے کچھ تھوڑے رد و بدل کے ساتھ اس صنعت کی تعریف اس طرح کی ہے۔

"جاننا چاہیے کہ تاریخ لغت میں کسی چیز کے وقت ظاہر کرنے کو کہتے ہیں اور تاریخ گوئی کی اصطلاح میں کسی امر عظیم اور واقعۂ قدیم مانند کسی بادشاہ کی سلطنت یا کسی فتنہ، فساد، جنگ و کارزار، شادی و مرگ یا بنائے عمارت و باغ وغیرہ یا دیگر سوانح کے وقوعہ کی مدت معین کرنے کو بولتے ہیں۔"

اگرچہ اس دور میں اس فن کو ہماری شاعری میں پہلے جیسی مقبولیت حاصل نہیں رہی۔ تاہم اس کی دلچسپی سے اب بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی خاص وجہ اس فن کی وہ افادیت ہے جس کی بنا پر اس کے ذریعہ اپنی ضرورت کی تاریخ کو آسانی سے محفوظ بھی رکھا جا سکتا ہے اور قابل یاد واقعات کی تاریخوں کا تحفظ بھی ایک دلچسپ اور آسان طریقہ سے ہو جاتا ہے۔ اسی لئے فنِ تاریخ گوئی اردو شاعری میں ہمیشہ ہی ایک خاص صنعت کے طور پر زندہ و تابندہ چلا آ رہا ہے۔ ویسے تو یہ فن شاعری کی مختلف صنائع بدائع میں سے ایک صنعت ہے۔ تاہم یہ ایک باضابطہ ایسا وسیع علم بھی ہے۔ جس کے بڑے اصول و ضوابط موجود ہیں۔

فن تاریخ گوئی کی بنا دراصل عربی کے حروف تہجی پر ہے اور یہ حروف اسی ترتیب سے اُردو میں آ گئے ہیں تاہم یہاں فارسی اور ہندی کے کچھ حروف مل کر ان کی تعداد میں تھوڑے سے اضافہ ہو گیا ہے لیکن کسی زمانہ میں عربی میں ان حروف تہجی کی ترتیب موجودہ سلسلہ سے مختلف "ابجد" کی تحتی کے مطابق تھی۔ اسی لئے اسی ترتیب سے ان کے حساب جمل میں اعداد مقرر کئے گئے ہیں ان حروف اور ان کے اعداد کو آسانی کے لئے ان آٹھ کلمات میں مرتب کر دیا گیا ہے۔

ابجد ہوز حطی کلمن

(ا-ب-ج-د) (ہ-و-ز) (ح-ط-ی) (ک-ل-م-ن)

(۱-۲-۳-۴) (۵-۶-۷) (۸-۹-۱۰) (۲۰-۳۰-۴۰-۵۰)

سعفص قرشت ثخذ ضظغ

[illegible] (ث-خ-ذ) (ض-ظ-غ)

[illegible]

ان آٹھ کلمات کی ایجاد کے بارے میں بھی مختلف تاریخی روایات ہیں تاہم علامہ نیاز فتح پوری کا اس ایجاد کے متعلق خیال ہے کہ اس سلسلہ میں تمام تاریخی روایات بے بنیاد ہیں حقیقت یہ ہے کہ عربوں نے یہ حروف ہی عبرانی زبان سے لئے اور چونکہ وہاں ان کی ترتیب "حروف ابجد" کے مطابق تھی اس وقت عربی زبان میں یہ حروف بعینہٖ اسی ترتیب سے آگئے بعد میں اگرچہ اسلوب تحریر اور ضرورت کے اعتبار سے زبان میں ان کی ترتیب بدل کر موجودہ انداز سے ہو گئی لیکن جمل کے قاعدہ میں ان کی ترتیب بدستور وہی چلی آرہی ہے۔

ابجد کے ان کلمات کے اپنے معانی بھی ہیں جو ان کی ایجاد کو ایک ٹھوس بنیاد فراہم کرتی ہے اگرچہ مختلف لغت نویسوں نے انہیں الگ الگ لکھا ہے۔ لیکن متفقہ علیہ صورت یہ ہے۔

ابجد = ابتدا کی، ہوز = ملا یا، حطی = واقف ہوا۔ کلمن = سخن گو ہوا۔ سعفص = جلد سیکھا، قرشت = ترتیب دیا۔ ثخذ = دل میں بٹھایا۔ ضظغ = تمام کیا

عربی زبان میں فارسی کے مخصوص حروف پ، چ، ژ، گ نہیں ہیں اور یہی صورت حال ہندی کے خاص حروف ٹ۔ ڈ۔ ڑ کی ہے جبکہ اردو کے حروف تہجی میں عربی کے حروف ہجا کے ساتھ دونوں زبانوں کے یہ مخصوص حروف بھی شامل ہیں اس لئے اردو میں ان حروف کے اعداد فن تاریخ گوئی کے مطابق وہی ہیں جو حروف تہجی کی ترتیب میں ان حرفوں سے پہلے آنے والے حروف کے مقرر ہیں جیسے پ = ب = ۲، ٹ = ت = ۴۰۰، چ = ج = ۳۔ ڈ = د = ۴، ڑ = ر = ۲۰۰، ژ = ز = ۷، گ = ک = ۲۰، تاریخ گوئی یا کسی حروف کی قیمت لگانے کے سلسلہ میں یہ قاعدہ بھی خاص طور سے ملحوظ رکھا جاتا ہے کہ ان حروف کے اعداد شمار کئے جاتے ہیں جو مکتوبی ہوتے ہیں یعنی تحریر میں آتے ہیں خواہ وہ بولنے میں نہ آتے ہوں جیسے عبدالرشید میں ا۔ ل۔ اور خواجہ میں "و" اگرچہ بولنے میں نہیں آتے ہیں مگر چونکہ مکتوبی ہیں اس لئے حساب جمل میں شامل کئے جائیں گے۔

تاریخ نکالنے کے جو اصول اور طریقے مقرر ہیں ان میں بنیادی اصول دو ہیں۔

(۱) صوری (۲) معنوی

صوری طریقہ سے مراد وہ اسلوب ہے جس میں مطلوبہ تاریخ یا سن، واضح الفاظ میں مادہ تاریخ میں بیان کر دیا جاتا ہے اور حروف کے اعداد محسوب کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ جیسے شیخ سعدی نے گلستان کی تصنیف کی تاریخ بھی ۶۵۶ھ ہجری اس طرح بیان کی ہے

؎ در آں مدت کہ مارا خوش ہمی بود ۔ ز ہجرت ششصد و پنجاہ و شش بود

اس شعر کے دوسرے مصرعہ میں "گلستاں" کا سن تصنیف ۶۵۶ھ ظاہر کیا گیا ہے۔ معنوی طریقہ سے کسی مادہ تاریخ کے حروف کے اعداد جمع کرکے ان کے مجموعہ سے مطلوبہ تاریخ برآمد ہوتی ہے۔ دراصل یہی طریقہ تاریخ گوئی کی بنیاد ہے اور اسی پر اس فن کے تمام بنیادی ضابطے مرتب کئے گئے ہیں۔ جیسے سرکشن پرشاد نے داغ دہلوی کی تاریخ وفات اس مصرعہ سے برآمد کی ہے۔ ؎ دلی کا چراغ بجھ گیا۔ آہ
۱۳۲۲ھ۔

معنوی طریقہ سے سن تاریخ نکالنے کے بہت سے اصول اور قاعدے ہیں اور درحقیقت فن تاریخ گوئی کی تمام تر بنیاد انہیں پر قائم ہے اور اسی محور پر یہ فن گھوم رہا ہے پھر ان قاعدوں سے جو شاخیں پھوٹتی ہیں انہوں نے اس فن کو اور بھی مشکل ترین اور گورکھ دھندا بنا دیا ہے۔ معنوی تاریخ گوئی کی قسموں کا دائرہ یوں تو کافی وسیع ہے مگر اردو کے فنکاروں نے جن میں قلم فرسائی کی اور فن پارے بکھیرے وہ قابل ذکر اقسام یہ ہیں۔

(۱) صنعت معجمہ یا منقوطہ (۲) صنعت مہملہ یا غیر منقوطہ (۳) صنعت تعمیہ (۴) صنعت تدخلہ (۵) صنعت تخرجہ (۶) صنعت تذاعون (۷) صنعت تضارب (۸) زبر بینہ (۹) توشیح (۱۰) صنعت ترجیح ۔ اردو شاعری میں تاریخ گوئی بجائے خود بھی ایک خاص فکر و فن کا مظہر ہے اور پھر اس کی صنائع بدائع تو اور بھی دماغی موزونی اور ذہنی کاوشوں کی آئینہ دار ہیں۔ اسی لئے اس فن نے اردو شاعری کو ایک ممتاز اور منفرد درجہ دے دیا ہے۔ اگرچہ اس کی اصل بنیاد عربی میں ہے وہیں سے یہ فارسی میں آئی مگر اردو شاعری نے جو اس میں چار چاند لگائے وہ بالکل انفرادی حیثیت ہے جو اس سلسلہ میں ہر صنعت کے تجزیہ اور جائزہ سے ظاہر ہے۔

(۱) صنعت معجمہ میں شاعر کسی خاص مادۂ تاریخ سے اس کے صرف منقوط حروف کے اعداد سے تاریخ نکالتا ہے اور غیر منقوط کو چھوڑ دیتا ہے جیسے کلیات قدر بلگرامی کی تاریخ طباعت قیام الدین نیر نے اسی صنعت میں اس طرح نکالی ہے۔

نظم قدر بلگرامی بہتر از درِّ یتیم

اس مصرعہ کے صرف منقوط حروف ن۔ ظ، ق، ب، ی۔ ب، ت، ز، ی، ت، ی سے تاریخ مطلوبہ ۱۸۹۱ء بنتی ہے

۵۰ + ۹۰۰ + ۱۰۰ + ۲ + ۱۰ + ۲ + ۴۰۰ + ۷ + ۱۰ + ۴۰۰ + ۱۰ = ۱۸۹۱

(۲) جب فن کار کسی مادہ تاریخ میں صرف غیر منقوط حروف لاتا ہے یا مادہ میں سے غیر منقوط حروف لے کر ان اعداد کے حساب سے تاریخ نکالتا ہے تو وہ صنعت مہملہ یا غیر منقوط کہلاتی ہے جیسے جلال لکھنوی کے ایک شاگرد نے ان کے پہلے دیوان کی طباعت کی تاریخ اس صنعت سے یوں نکالی ہے۔

سرورِ ہر دل والا گہر کر، اس کو کہہ سنہ ۱۳۰۰ھ

(۳) جب کوئی تاریخ کو سادہ انداز سے حروف تہجی کے مقررہ اعداد کے مطابق تاریخ نکالتا ہے اور کسی اور فنکاری کا دخل نہیں ہوتا تو وہ "صنعت تعمیہ" کہلاتی ہے جیسے حضرت عادل کیرانوی نے اپنے پیر و مرشد مولوی فیض اللہ صاحب کے مزار شریف پر کندہ قطعہ میں ان کا سال وصال اس طرح نکالا ہے۔

فکرِ تاریخ ہے کیا فیض طلب کر عادل - مجھے ہاتف
نے کہا "فیض کا گلشن ہے یہی"

اس شعر کے آخری مصرعہ میں مادہ تاریخ "فیض کا گلشن ہے یہی" سے بالکل سادہ طریقہ سے سن تاریخ ۱۳۵۱ھ بنتا ہے

(۴) اگر کسی مادہ تاریخ کے اعداد مطلوبہ عددوں سے کم رہ جاتے ہیں تو شاعر باہر سے کسی حرف یا لفظ کے اعداد کو اس میں داخل کر کے اصل تاریخ بناتا ہے اس کے لئے تخلیق کار شعر ہی میں یہ اشارہ بھی کرتا ہے کہ کون سے حروف یا لفظ کے عددوں کو جمع کرتا ہے جیسے سودا نے مظہر جان جاناں کی شہادت پر جو رباعی کہی تھی اس میں اسی صنعت سے کام لیا گیا ہے ۔

مظہر کا ہوا جو قاتل اک مرتد شوم ✻ اور ان کی ہوئی خبر شہادت کی عموم
تاریخ وفات ان کی کہی ہو کے درد ✻ سودا نے کہ ہائے جانِ جاناں مظلوم

اس شعر میں مادۂ تاریخ "ہائے جانِ جاناں مظلوم" کے اعداد = ۱۱۹۱ ہیں جو مطلوبہ تاریخ سے کم ہیں۔ چنانچہ "ہو کے درد" میں یہ اشارہ موجود ہے کہ "درد" کے پہلے حرف دال کے عدد = ۴ کو ۱۱۹۱ میں داخل کر کے صحیح سن وفات ۱۱۹۵ھ نکلتا ہے۔

اسی طرح قربان علی بیگ سالک نے مومن کی وفات پر جو قطعہ کہا اس کے آخری شعر میں یہی صنعت استعمال کی ہے شعر ہے،

کیا دل نے کہ داخل ہو گئے سب - "ارم" میں عارف و تسکین و مومن

اسی شعر میں یہ اشارہ دیا گیا ہے کہ "ارم" کے عددوں میں عارف و تسکین و مومن کے اعداد جمع کر کے مطلوبہ تاریخ ۱۲۶۸ھ برآمد ہوتی ہے جو مومن کا سن وفات ہے۔

(۵) جب کسی مادۂ تاریخ کے اعداد مطلوبہ عددوں سے زیادہ ہو جاتے ہیں اور شاعر باہر کے کسی حرف یا لفظ کے اعداد کو ان میں سے خارج کر کے تاریخ نکالی جاتی ہے تو صنعت تخرجہ ہے جیسے استاد داغ دہلوی کی تاریخ وفات ان کے ایک شاگرد نے اسی صنعت میں اس طرح کہی تھی

"دم" نکلتا ہے سن کے یہ تاریخ - آج راہی جہاں
داغ ہوا ۱۳۶۶ھ

۴۴ = ۱۳۲۲ھ اس شعر کے دوسرے مصرعہ کے اعداد ۱۳۶۶ مطلوبہ تاریخ سے زیادہ ہیں۔ اس لئے اس شعر میں بڑی خوبصورتی سے یہ اشارہ دیا ہے کہ "دم" کے اعداد (۴۴) کو ان اعداد میں سے کم کیجئے تو اصل سن تاریخ ۱۳۲۲ھ جو نکل آئے گا

(۶) بعض مادہ تاریخ کے اعداد کو دوگنا کرنے سے اصل تاریخ برآمد ہوتی ہے اسے صنعت تضاعف کہتے ہیں "تضاعف" کے معنی بھی دوگنے کے ہیں جیسے ضیا حیدرآبادی نے ایک شادی کی تاریخ اسی صنعت سے نکالی ہے اور اس کے لئے شاعرانہ انداز سے اشارہ بھی موجود ہے

مبارک ہو دلہن کی رونمائی ✻ حبیب اللہ مسرت سے ہیں مخمور
ضیا نے عرض کی جلوہ کی تاریخ ✻ مضاعف ہو گیا نور علی نور

اس شعر میں اصل مادہ تاریخ "نور علی نور" ہے جس کے اعداد ۶۲۲ ہیں انہیں دوگنا کر کے ۱۲۴۴ھ مطلوبہ تاریخ بنتی ہے

(۷) اس طرح جب کسی مادہ تاریخ کے اعداد کو کسی عدد سے ضرب کر کے تاریخ نکالی جاتی ہے تو صنعتِ تقارب کہلاتی ہے حضرت داغ کے شاگرد الم نے "مہتابِ داغ" کا سالِ طباعت سن فصلی میں اس انداز سے نکالی ہے۔ ؎

سالِ فصلی یوں بھی نکلے اے الم ÷ تین چکر گر لگائے روزگار

اس کے معنی ہیں کہ "روزگار" لفظ کے اعداد ۴۳۴ کو تین سے ضرب کر کے اصل تاریخ ۱۳۰۲ھ ف نکل آتی ہے۔

(۸) صنعتِ توشیح میں شاعر قطعہ تاریخ کے پہلے اور دوسرے مصرعہ کے حرفِ اول کے اعداد لے کر الگ الگ تاریخ نکالتا ہے یہ بھی ایک مشکل صنعت ہے اور بوجہ طوالت اس کی مثال پیش کرنا مشکل ہے۔

(۹) صنعتِ ترصیع میں شاعر کچھ دوسرے ہی انداز سے فنِ تاریخ گوئی کا مظاہرہ کرتا ہے اس صنعت کے قطعہ تاریخ میں ہر مصرعہ سے الگ الگ تاریخ نکالی جاتی ہے۔ ایک مصرعہ سے سن ہجری نکلتا ہے تو دوسرے مصرعہ سے سن عیسوی برآمد ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس صنعت میں دماغ سوزی اور ذہنی کاوش زیادہ ہوتی ہے اس لئے اشعار میں لفظی بھرتی کے ساتھ شعریت و معنویت قائم رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ حال مولانا حامد حسن قادری نے علامہ اقبال کی وفات پر جو قطعہ تاریخ کہا تھا وہ اسی صنعت کا نمونہ ہے۔ یہ قطعہ عنوان سے لے کر مرصع اور مسجع ہے۔ اس کے ایک مصرعہ سے سالِ ہجری اور دوسرے سے سن عیسوی برآمد ہوتا ہے۔ عنوان، پیشانی اور چند شعر بطور تمثیل اس طرح ہیں۔

سحر بہائے آگاہ دل ڈاکٹر سر محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ

۱۹۳۸ء

در نظرِ عقیدت

۱۹۳۸ء

رفت اقبال، آفتابِ جہاں ÷ رفت اقبال وقت بد رآیات

فخرِ اسلام و نازِ عالمِ علم ÷ تاز مشرق بہتریں صفات

۱۹۳۸ء　　۱۳۵۷ھ　　۱۹۳۸ء

آں قلندر صفت سخن پیرائے ÷ آں مثالِ کلیم، وقفِ نکات

(۱۰) تاریخ گوئی کی صنعتوں میں "زبر بینہ" ایک عجیب سی صنعت ہے اس کے بنیادی اصول کچھ تھوڑا سا بدلا ہوا ہے اس صنعت میں حروفِ تہجی کے تلفظ کو ملحوظ رکھا جاتا ہے اور ہر تلفظ کو بجائے خود ایک لفظ تصور کر کے اس صنعت سے کام لیا جاتا ہے۔ اسی اعتبار سے حروفِ تہجی کی تین قسمیں بنائی گئی ہیں۔

(الف) ایسے حروف جن کے تلفظ کے آخر میں الف آتا ہے اور تلفظ صرف دو حرفی ہوتا ہے جیسے ب، ت، ث، ح، خ، ر، ز، ط، ظ، ف، ہ اور ی ان کا تلفظ با، تا، ثا، حا، خا، را، زا، طا، ظا، فا، ہا اور یا ہے ان کو حروفِ ملفوظی کہتے ہیں۔

(ب) وہ حروف جن کے تلفظ میں اُن کی آواز کے ساتھ دوسری آوازیں یا حروف میں شامل ہو جاتے ہیں حروفِ ملفوظی کہلاتے ہیں جیسے ا۔ ج، د، ذ، س، ش، ص، ض، ع، غ، ق، ک اور ل ہیں جن کا تلفظ الف، جیم، دال، ذال، سین، شین، صاد، ضاد، عین، غین، قاف، کاف، کیا جاتا ہے۔

(ج) م، ن اور و، یہ تین حروف مکتوبی کہے جاتے ہیں ان کے تلفظ کی صورت میں اول، آخر گھوم پھر کر وہی حرف آ جاتا ہے۔ جیسے میم، نون اور واؤ۔

حروفِ تہجی کے تلفظ کے اعتبار سے یہ اقسام ہی "زبر بینہ" کی بنیاد ہیں اس صنعت میں تلفظ کے لحاظ سے جو لفظ بنتا ہے اس کا پہلا حرف "زبر" اور باقی حروف "بینات" کہلاتے ہیں۔ جیسے "ج" حرف کا تلفظ "جیم" ہے اس کا پہلا حرف "ج" "زبر" ہے اور باقی ی، م بینات ہیں اور "زبر بینہ" صنعت کی بنیاد پر اس کے اعداد ہوتے ہیں ۳ + ۱۰ + ۴۰ = ۵۳، اگر اس صنعت کے اعتبار سے ہر تلفظ کے پہلے حرف کے عدد سے تاریخ نکالتے ہیں تو صنعت "زبر" اور باقی حروف کے اعداد سے کام لیتے ہیں تو صنعت "بینہ" کہلاتی ہے اگر دونوں اقسام کو کام میں لایا جاتا ہے تو صنعت "زبر بینہ" ہوتی ہے جیسے داغ کے دیوان "مہتابِ داغ" کی تاریخ میر مہدی مجروح الم نے اسی صنعت سے ایک قطعہ میں اس طرح نکالی ہے۔

چھپ چکا اُستاد کا دیوان جب ÷ عیسوی تاریخ الم نے یوں کہی
بینات و زبر میں دیکھو عدد ÷ گلشن بے خارہ ہے دیوان یہی

۱۸۹۸ء

یہاں گلشن بے خارہ ہے دیوان یہی " مادہ تاریخ میں حروف "زبر" کے اعداد ۱۳۲۹ اور بینات کے عدد ۵۶۹ ہوتے ہیں اور دونوں کو ملا کر ۱۸۹۸ء سن تاریخ بنتا ہے۔

فن تاریخ گوئی کے اس اجمالی جائزہ سے ظاہر ہے کہ یہ صنعت ایک خاص دماغ سوزی اور ذہنی کاوش کی حامل ہوتی ہے اور اس میں معنوی صفات کی بہ نسبت شعر کے ظاہری حسن و جمال پر زیادہ زور دیا جاتا ہے اس لئے اس میدان وہی ارباب فکر و فن آتے ہیں جو شاعرانہ صنائع بدائع سے زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں جہاں تک اردو شاعری کے مختلف ادوار میں فن تاریخ گوئی سے دلچسپی کا تعلق ہے اس سلسلہ میں دیکھیے تو اردو شاعری اس صنعت کے نمونوں اور فن پاروں سے بھری پڑی ہیں اور تقریباً ہر دور اور ہر حلقہ میں اس کے دلدادہ ملتے ہیں مگر استادان سخن کے یہاں اور صنعتوں کے مقابلہ میں اس طرف توجہ نسبتاً کم ہے اور جو کچھ ہے وہ لفظی صنعتوں اور ظاہری حسن و صفات سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے یہاں ہے اور وہ بھی نہایت سادہ انداز سے۔ جس سے یہی معنی نکلتے ہیں کہ اس صنعت کو بطور فن معدود سے چند اساتذہ نے اپنایا ہے۔

پرانے دور میں اُستاد سودا کے یہاں اس صنعت کے اچھے خاصے گوہر پارے موجود ہیں نواب حسن خاں ان کے خاص ممدوح معلوم ہوتے ہیں ان کے نذرانوں کے سلسلہ میں جو اُن کے قطعات ہیں، ان میں سے کئی تاریخ سے متعلق ہیں۔ حضرت واس کے علم کے نذرانہ کے جشن پر جو انھوں نے قطعہ تاریخ رقم کیا وہ اس طرح ہے۔

شادر رہ کہ محشر تک ÷ کیا تمازت کی تجھ کو پروا ہے
مصرع تاریخ اس علم کی ہے یہ ÷ سر ترا سایہ اس علم کا ہے

۱۱۷۴ھ

حسن خاں صاحب کی شادی کی مبارکباد کے سلسلہ میں دو قطعات کے اقتباس ہیں۔

بندگی میں وہ آپ کی کرتے ہیں ÷ دیں ہم کو یہ نوید ہوئی قرض الہی
پایا اس بیاہ کا ہم دیکھ کہا تاریخ ÷ مہر و ماہ سے یہ ایک قرآن الملا

۱۱۹۱ھ

وہ مودا اپنے سے جو ہم آغوش ÷ ہو کے بیٹھا بجوش دل گھر ہر
برا اُٹھا ہاتف از سر شادی ÷ ہے یہ مہ آفتاب کے بر بر

۱۹۱ + ۱۰۰۰ = ۱۱۹۱ھ

سودا کا ایک قطعہ مظہر جان جاناں کی شہادت کے سلسلہ میں کہا گیا۔ تحلیلات میں دے دیا گیا ہے

متوسطین میں مومن خاں مومن کے یہاں بھی اس صنعت سے دلچسپی نسبتاً زیادہ ملتی ہے ان کے قابل ذکر قطعات میں کچھ تو ان کے اہل خانہ سے متعلق ہیں البتہ شاہ عبدالعزیز کی وفات پر کہا گیا قطعہ اس صنعت کا ایک خاص نمونہ ہے جس میں صنعت تخرجہ سے ایک انداز میں کام لیا ہے۔ مومن کا اپنی دادی کی وفات اور اپنی دختر کی ولادت پر کہے گئے قطعات ہیں دادی کی وفات کا قطعہ ہے۔

جبکہ اس غم سرا سے کی رحلت ÷ جدہ مومن پریشاں نے
سال تاریخ حسب حال کہا ÷ "دخلت بالتعظیم رضواں نے"

۱۲۰۸ھ

دختر کی ولادت سے متعلق سن

فال کلنے کے ساتھ ہاتف نے ÷ کہی تاریخ "دختر مومن"

اس شعر میں "دختر مومن" کے اعداد میں سے "فال" کے عدد خارج کر کے صنعت تخرجہ میں سن تاریخ ۱۲۵۹ھ بنتا ہے
شیفتہ کے گلشن بیخار پر جو تاریخ کا قطعہ کہا اسی کا اقتباس
مومن نے جب اس میں دیر تک کی ÷ سیر گل ضمیر اہ معنی
ہاتف نے کہی ہے اس کی تاریخ ÷ گلدستۂ گلستان معنی

۱۲۵۰ء

حضرت شاہ عبدالعزیز کی وفات پر کہے گئے مومن کے مشہور قطعہ کا اقتباس ہے

انتخاب نسخۂ دیں مولوی عبدالعزیز
بے نظیر و بے مثال و بے مثل
ہے ستم اسے چرخ تو کس کو یہاں سے لے لیا
کیا کیا یہ ظلم تو نے ہے کسو قضا سے اجل

مجلس درد آفریں تعزیت میں میں بھی تھا
جب پڑھی تاریخ مومن نے یہ آ کر بے بدل
دستِ بیدادِ اجل سے بے سر و پا ہو گئے
فقر و دیں ، فضل و ہنر ، لطف و کرم ، علم و عمل

اس قطعہ کے آخری مصرعہ میں آنے ہوئے الفاظ فقر و دیں فضل و ہنر وغیرہ کو بے سر و پا کر کے یعنی پہلا اور آخری حرف الگ کر باقی حروف ق ۔ ی ، ص ، ن ، ط ، ل ، اور ر کے اعداد جمع کر کے سن تاریخ ۱۲۶۹ھ نکل آتا ہے

اس سلسلہ میں غالب کے یہاں تاریخ گوئی کے شگوفے پڑھتے ہیں مگر خال خال اس لئے کہ وہ دراصل فکر و معانی کے فنکار تھے ۔ اس لفظی گورکھ دھندے سے دلچسپی نہیں تھی تاہم مرزا جعفر کی شادی پر ان کا قطعہ ہے ۔ ؎

ہوئی جب مرزا جعفر کی شادی
ہوا بزم طرب میں رقص ناہید
کہا غالب سے تاریخ اس کی کیا ہے
تو بولا "انشراحِ جشنِ جمشید"

۱۲۷۰ھ

اُستاد ذوق کے یہاں بھی تاریخ کے نمونے نایاب سے ہیں ۔ تاہم اُن کے دیوان کے طبع ہونے پر اُن کے شاگردوں نے جو قطعات کہے ان میں کئی تاریخی ہیں سالک کے ایک شاگرد داغ نے جو قطعہ کہا ہے وہ اس طرح ہے ؎

جب کہ اُستاد کا کلام چھپا ÷ فکرِ تاریخ میں تھی طبعِ سلیم
یک بیک داغ مجھ کو ہاتف نے ÷ دی ندا ہے یہ نظمِ ابراہیم

۱۲۷۹ھ

لکھنؤ کے شعراء میں ناسخ کو فن تاریخ گوئی کا ذوق زیادہ نظر آتا ہے ۔ کلام اس سلسلے کے متعدد قطعات سے بھرپور ہے البتہ خاص خاص ہستیوں کے وفات پر کہے گئے قطعے اس ضمن میں قابلِ ذکر ہیں ۔

شاہ عالم کی وفات پر کہا گیا قطعہ ہے ۔

نجمِ سلطنت تیمور امروز ÷ کرد ملکِ عدم آباد شہنشاہ کشورِ ہند
سالِ تاریخ پئے رحلتِ شاہ عالم ÷ گفت دل زیرِ زمیں رفت شہ کشورِ ہند

۱۲۲۱ھ

تاریخ وفات نواب آصف الدولہ :-

الٰہی آصف الدولہ بہادر ÷ بحقِ نائبِ تو بادِ مغفور
نوشتم تاریخِ وفاتش ÷ بود با حیدرِ کرار محشور

۱۲۱۲ھ

تاریخ وفات مرزا قتیل :-

شاعرِ معجز بیاں مرزا قتیل ÷ رفت ازیں عالم سوئے باغِ بہشت
کلکِ ناسخ سالِ تاریخِ وفات ÷ سعدیٔ شیرازیٔ ثانی نوشت

۱۲۳۳ھ

تاریخ وفات میر یعقوب عباس :-

افسوس ، افسوس امیر یعقوب صد افسوس ÷ از مردنِ خود دارِ سلیمہ آلام
تاریخِ وفاتِ او نوشتم یا رب ÷ عباس بفردوس کند عیشِ دوام

۱۲۳۷ھ

سعادت علی یار خاں رنگین بڑے شوخ مزاج اور رنگین طبع شاعر تھے اس صفت سے ان کی دلچسپی فطری ہے چنانچہ اس موضوع پر ان کے دو قطعے ہیں ۔

نواب معتمد الدولہ کی وفات پر کہا ہے ؎

معتمد الدولہ چوں رفت از دنیا ÷ گشت زیں حادثہ دلہا افسردہ
ہاتفِ غیب بہ گفت رنگیں ÷ معتمد مردہ زدہر گردد

رنگین نے اپنی تصانیف کی تعداد اسی فن میں بتائی ہے ۔ ؎

کہا اک شخص نے رنگیں یہ مجھ سے ÷ تیری تصنیف کے نسخے ہیں کتنے
اشارہ لب کی جانب کر کے اس کو ÷ کہا میں نے عدد "لب" کے ہیں جتنے

۳۲

موجودہ دور میں بھی اُردو شعراء کو تاریخ گوئی سے دلچسپی ضرور ہے لیکن چونکہ یہ دور شاعری برائے زندگی کے تحت شاعرانہ فکر و فن سے زیادہ سماجی عکاسی اور انقلابی موشگافیوں کا دور ہے ۔ اس لئے تاریخ گوئی پر بطور فن اور صنعت کے توجہ نہیں دی جاتی بلکہ اس صنعت سے دلچسپی رکھنے والے اہلِ سخن عام روش کے مطابق کسی بڑی اور عظیم شخصیت کے انتقال ، یا کسی مجموعۂ کلام کی اشاعت یا کسی بڑے حادثہ اور سانحہ کی تاریخ کو محفوظ رکھنے کے لئے اس سے کام لیتے ہیں اور وہ بھی بڑا سادہ اسلوب اور انداز ہوتا ہے ۔ جس سے معنوی

ہیں کہ اس دور میں تاریخ گوئی برائے تاریخ "زندہ ہے برائے فن" نہیں۔ اس لئے آج کل کے اس فن کے کچھ تازہ نمونے نذرِ قارئین ہیں۔

محترمہ اندرا گاندھی کے عظیم سانحۂ ارتحال پر کچھ شعراء کے فن پارے قابلِ ذکر ہیں۔

شمیم امروہوی کا قطعہ :-

نئی منزل کی جانب بڑھ رہا ہے ÷ دیارِ ہند کی وہ رہنما اب
برائے امنِ عالم جان دی ہے ÷ نہ بن جائے تصادم کی فضا اب
تقاضائے شانتی بن کا یہی ہے ÷ کوئی مصرعہ کہو تاریخ کا اب
صدا آئی لحد تکلیف کہہ دے ÷ ہوا ہے ختم عہدِ اندرا اب

۱۴۰۵ھ
۱۹۸۵ء

شریکِ صدمہ و آلام شمیم امروہوی

منظر عمر آبادی کے قطعات :

۱۔ یاد کریں گے اسے رو رو کے زمانہ برسوں ÷
چھپ گئی خاک میں جو روحِ چمن جانِ چمن
ہائے محروم ہوئے اس کی ضیا پاشی سے
رات کو گل ہو گئی جو شمعِ شبستانِ وطن
۱۴۰۵ھ

۲۔ بھول سکتے نہیں وطن والے
بلکہ اس واردات کا منظر
کاش ہم کو خدا نہ دکھلاتا
اندرا کی وفات کا منظر
۱۹۸۴ء

حضرت احسان دانش کی وفات پر صابرین ذوقی حیدرآباد دسنہ کا قطعہ

اک فرشتہ نے کہا انعام اپنا ÷ پا چکے ہیں حضرت احسان دانش
مرحبا، صد مرحبا، جنت میں دیکھو ÷ آ چکے ہیں حضرت احسان دانش
۱۹۸۲ء

احسان دانش کی وفات پر شہرت بسالی حیدرآباد (سندھ) کا قطعہ۔

تھا زد آتش کی اموات پر کھا ÷ بہت امرو نگین احسان دانش
شہرت ان دونوں کی ہی جستجو میں ÷ گیا اہلِ ادب احسان دانش

جوہر دیوبندی کے تحقیقی شاہکار "موج گنگ" پر پروفیسر بخش ناز امر قیسری کی رباعی۔

اے مصحفِ موجِ گنگ ÷ ہر شام دگیاہ ÷ تو اہلِ ہنود کے سخن کا بھنگار
تاریخ کی فکر تھی کہ آئی آواز ÷ اختر یہ شاہکار جوہر ہے ہندا

بہر صورت "فنِ تاریخ گوئی کے آئینہ میں اردو شاعری کے اس جائزہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہماری اردو شاعری نے جہاں فکر و فن اور علم و ادب کے دوسرے بے شمار اور بیش قیمت فن پاروں سے مالا مال ہے وہاں تاریخ گوئی جیسے مشکل اور اہم فن کے سرمایہ بھی اس میں بدرجہ اتم موجود ہیں اور اس فن کو بھی اردو شاعروں نے چار چاند لگائے اور نئے گلہائے ہزارہ نے اس چمن کی تزئین کی۔ اس سلسلہ میں یہ حقیقت بھی باعثِ فخر ہے کہ ہندوستانی زبانوں ہی میں نہیں بلکہ بین الاقوامی زبانوں میں بھی یہ فن فارسی اور عربی کے علاوہ کسی دوسری زبان میں موجود نہیں۔

غزل

نورجہاں بیگم نور
حیدرآباد دکن

دل کی جدائی نظر سے ملاقات ہو گئی
دامن کی چشمِ تر سے ملاقات ہو گئی

تنہائی کے ہجوم میں گھر سے چلے
رستے میں ہمسفر سے ملاقات ہو گئی

جب بھی ترا خیال بسا درمیان سے
آہوں کی خود اثر سے ملاقات ہو گئی

ہے کتنی دلفریب تبسم کی روشنی
جیسے نئی سحر سے ملاقات ہو گئی

ہے جس کی رہبری میں بیگانہ جستجو
یہ کیسے راہبر سے ملاقات ہو گئی

ہم دو قدم بھی چل نہ سکے اپنے ہوش میں
جب ان کی رہگذر سے ملاقات ہو گئی

اے نور اب سنبھال رکھو عظمتِ جبیں
سجدوں کی سنگِ در سے ملاقات ہو گئی

اپنے ہوئے پرائے

قمر جہاں

آج صبح سے ہی اس کا دل اداس تھا۔ لیکن رات کی تاریکی میں تو اس کی اداسی اور بھی گہری ہو گئی تھی وہ بھی کیا دن تھے جب اس کے دل میں کیسے کیسے حوصلے تھے۔ زندگی گذارنے کے لئے کیسے کیسے بلند خواب تھے۔ تمنائیں اور خواہشات تھیں۔ وہ زیرِ لب گنگنانے لگی ؎

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

اس نے بتی جلائی اور ایک بار آئینہ کے سامنے پھر سے اپنے سراپا کا جائزہ لیا اور کچھ دیر خاموشی سے آئینہ کو دیکھتی رہی کہ دیکھیں آئینہ کیا کہتا ہے۔

آئینہ بھی کیا شے ہے اپنی گونگی زبان میں کیا کیا بات کہہ جاتا ہے۔ اس کا دل چاہا کہ وہ آئینہ پر نقاب ڈال دے یا خود اپنے اوپر یا وقت کی بے رحمی کے اوپر .... لیکن رات کی تنہائی میں تمام چیزیں برہنہ تھیں۔ اس کا دل بھی برہنہ تھا اور تمام زخم جاگ چکے تھے۔ لوگ کہتے ہیں۔ ٹائم از دی بیسٹ ہیلر آف آل سوروز ....

لیکن اس کے ساتھ تو الٹا ہی ہوا۔ گذرتے لمحوں کی چاپ سے گذرتے اس کے تمام زخم اور بھی گہرے ہو گئے ہیں۔

ماضی کے جھروکے میں اس نے جھانکا تو ایک خوبصورت مگر زرد زرد کمزور سا چہرہ اس کے سامنے تھا۔ اسے اس چہرے سے کبھی بے حد پیار تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ ایک دن یہ چہرہ پھول کی طرح کھلے گا۔ اس کی زردی گلابی رنگت میں بدل جائے گی اور دور دیس کا کوئی اجنبی آکر اس چہرے کی صحیح قدر و قیمت لگائے گا اور وہ مسکراتی ہوئی پیا ملن کے گیت سنتی ہوئی بابل کے گھر سے ایک اجنبی کے گھر چلی جائے گی ......

اجنبی .... اجنبی نہیں رہے گا بلکہ وہ تو اس کی زندگی بن جائے گا۔ وہ ٹوٹ کر اس سے پیار کرے گی اور اپنے گھر کو جنت کا نمونہ بنا دے گی۔ اسے اس بات کا یقین تھا کہ ؎

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

وقت دبے قدموں گذرتا گیا ــــ زرد زرد چہرہ تھوڑا کھِل گیا اور اس کی رنگت پہلے سے بھی زیادہ نکھر گئی۔ آنکھوں سے شراب چھلکنے لگی ــ لیکن اس کے سپنوں کا وہ اجنبی شہزادہ نہ جانے کن راستوں میں بھٹک گیا تھا ــ وہ انتظار اور ابھی، اور ابھی .... اور ابھی کے بے سود نغمے سناتی رہی۔ شروع میں وہ اپنے تصوراتی شہزادہ کے لئے ہر سال چھ ماہ میں دلہن کی طرح سجتی سنورتی رہی اور ہر بار آئینہ دیکھ کر خود ہی شرما جاتی۔ کوئی اس کے کانوں میں چپکے سے کہتا:

" ہاں بہت خوب لگ رہی ہے تو ......"

لیکن دوسرے ہی لمحے تلخ اور کڑوی صداقتوں کا سامنا ہوتا اور اس کے تمام سپنے ایک ...... ایک کر کے بکھر جاتے سپنوں کے اس سنورنے اور بکھرنے کا سلسلہ طویل سے طویل تر ہوتا گیا۔ بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ ساتھ اس کے دل کی دھڑکنیں بھی تیز سے تیز تر ہوتی گئیں اور اس کے سجنے اور سنورنے کا وقفہ بھی جلد جلد آنے لگا۔ کبھی کبھی تو وہ ہر ہفتہ تماشہ بننے پر مجبور

کی جاتی ـــــ تماشائی آتے، کھاتے پیتے اور مسکراتے ہوئے چلے جاتے ۔ لیکن جاتے جاتے اس کے دل پر وار لگا جاتے ۔

کوئی کہتا :۔

"سب کچھ تو ٹھیک ہے مگر لڑکی کا قد چھوٹا ہے"

کوئی کہتا :۔

لڑکی کا نقشہ تو بہت اچھا ہے مگر چارم نہیں ہے"

کہیں سے کوئی آواز ابھرتی :۔

"لڑکی دبلی بہت ہے"

"اور بعد میں تو لوگ یہ بھی کہنے لگے کہ :۔

"لڑکی کی عمر بہت زیادہ ہے"

غرض ہر تماشائی ایک وار لگا جاتا ـــــ کسی نے بھی تو یہ نہیں سوچا کہ اس ننھے سے دل پر کتنے وار لگ چکے ہیں اور اب جبکہ اس نے اپنی عمر کے پینتیس سال گذار لئے ہیں اور تماشہ بنتے بنتے تھک چکی ہے تو اسے اپنی حماقت پر افسوس ہو رہا ہے ـــــ کاش ! اس نے بہت پہلے ہی یہ فیصلہ کر لیا ہوتا ۔ کیا ہوتا اس کی شادی نہیں ہوتی ۔ لیکن اس طرح بے حساب زخم تو اس کے ننھے سے کلیجہ کو چھلنی نہ کرتے ۔

آج صبح سے ہی اس کے گھر والے بضد تھے کہ ایک بار صرف ایک بار وہ تماشہ بن جائے لیکن وہ بھی اپنی ضد پر اڑی تھی اب وہ ایک بار بھی ..... بن کر خود کو مذاق کا موضوع بنانا نہیں چاہتی تھی ۔ وہ جانتی تھی کہ ہر بار کی طرح اس بار بھی ناکامی اس کا منہ چڑائے گی ۔ لہٰذا وہ اپنی ضد پر قائم رہی ۔ لوگ آئے اور اس کو دیکھے بغیر ہی چلے گئے ۔

مہمانوں کے جانے کے بعد اس کے گھر والے ایٹم بم کی طرح اس پر پھٹ پڑے ۔ اس کے بوڑھے والد نے بڑی بے رحمی سے اسے کمرے سے گھسیٹتے ہوئے آنگن میں لا پٹخا اور دو چار زبردست تھپڑ اس کے رخسار پر لگاتے ہوئے بڑبڑانے لگے ۔

کمبخت ضدی لڑکی ! اب یہ عمر بھر کنواری، کتنے منسوب تھی ، لیکن کمبخت کی ضد نے سب چوپٹ کر دیا گھر کے دیگر افراد بھی کھا جانے والی نظروں اسے دیکھ رہے تھے ۔

رات گہری ہو چلی تھی ، سارا سنسار سو یا پڑا لیکن .... وہ جاگ رہی تھی ...... ا کے دل کا ہر زخم جاگ اٹھا تھا اور وہ سسکیوں کے سوچ رہی تھی ! ـــــ

"اب تک تو اس نے غیروں سے ہی زخم کھائے لیکن آج .... آج تو اپنے بھی پرائے ہو

غزل

بسمل نقشبندی رتلا

حادثے ایسے بھی ہوں گے یہ کبھی سوچا نہ تھا
زخم دل گہرے بھی ہوں گے یہ کبھی سوچا نہ

بیٹھ کر تنہائیوں میں رو لیں گے ہم زار زار
نیند پر پہرے بھی ہوں گے یہ کبھی سوچا نہ

آنسوؤں میں آگ کی تاثیر بھی آ جائے گی
شبنمی شعلے بھی ہوں گے یہ کبھی سوچا نہ

لمحہ بھر کو بھی سکوں حاصل نہیں ہوگا ہمیں
روز و شب ایسے بھی ہوں گے یہ بھی سوچا

ہمنشیں آپ کی محسوس تو ہوگی مسکراہٹ
درمیاں پردے بھی ہوں گے یہ کبھی سوچا

اپنی بربادی کے افسانے بنیں گے اور پھر
کو بکو چرچے بھی ہوں گے یہ کبھی سوچا نہ

غیر تو پھر غیر ہیں غیروں کا کیا شکوہ مگر
ہر گماں اپنے بھی ہوں گے یہ کبھی سوچا

دل سے نازک شیشے کے ہر گوشے میں بسمل کبھی
آتشیں چھالے بھی ہوں گے یہ کبھی سوچا نہ

بمبئی مرکنٹائل کو آپریٹیو بنک لمیٹڈ

رجسٹرڈ آفس ۷۸ محمد علی روڈ بمبئی ۴۰۰۰۰۳

دہلی آفس نمبر ۲۳۵۵ نیتا جی سبھاش مارگ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

فون نمبر ۲۶۸۲۶۶ — ۲۶۴۳۷۲

- ہمارے یہاں شرح سود تمام نیشنلائزڈ اور شیڈولڈ کمرشیل بنکوں کے مقابلہ ایک فیصد زیادہ ہے
- ہندوستان کا پہلا کوآپریٹیو بنک جس کو زرمبادلہ میں کاروبار کے لئے لائسنس جاری کیا گیا۔
- ہمارے بنک میں اوقاف کی جمع شدہ رقم کی آمدنی دفعہ ۱۳ (۵) (الف xiii) انکم ٹیکس ایکٹ ۱۹۶۱ء کے تحت انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہے۔

اس کے علاوہ

- ہم آپ کے آرام و آسائش کی ضروریات مہیا کرنے کے لئے آسان قسطوں پر قرضہ فراہم کرتے ہیں۔ ایک فیصدی کا فرق بہت بڑا فرق ہے۔ یہ آپ کی رقم میں ہزاروں روپیہ کا اضافہ کرتا ہے۔ آپ بھی اس کا فائدہ اٹھائیں۔

زین جی رنگون والا	حسینی۔ ایس ڈاکٹر	شمیم کاظم
منیجنگ ڈائرکٹر	(چیرمین)	(اسسٹنٹ جنرل منیجر۔ شمالی ہند)

غزل

سوز بانڈوی

جب بھی کسی کے ظلم و ستم یاد آگئے
ہم جو بھلا چکے تھے وہ غم یاد آگئے

جلتے ہوئے گھروں کی طرف دیکھ کر ہمیں
ہنگامہ ہائے دیر و حرم یاد آگئے

اپنی تباہی کا جو سبب یاد آگیا
وہ بھی ہمیں خدا کی قسم یاد آگئے

شرمائے اور آئینہ ہاتھوں سے رکھ دیا
شاید کسی طرح انھیں ہم یاد آگئے

رسنے لگے ہیں پھر سبھی زخمِ دل و جگر
پھر آج مجھ کو تیرے کرم یاد آگئے

آئی جو یاد مجھ کو تمہارے شباب کی
جتنے بھی سر ہوئے تھے قلم یاد آگئے

بھٹکانا چاہا سوز اگر رہنماؤں نے
ہم کو ترے نقوشِ قدم یاد آگئے

غزل

اختر شاہجہاں پوری

بیش قیمت ہیں ترے افکار بھی
علم و فن کا دیکھ لے بازار بھی

اب نہیں بکتا کوئی یوسف کہیں
دیکھ آئے مصر کا بازار بھی

اب یہ چاہوں ہوں روزِ شب دیکھوں تجھے
تھا کبھی ملنے سے لیکن عار بھی

میں تمہارے خیر مقدم کے لئے
بھول بیٹھا عظمتِ دستار بھی

یوں بھی ہم جیتے ہیں کس آرام سے
کاش ہوتا عشق کا آزار بھی

ہم قتیلِ دستِ قاتل ہی ایک دن
رو کے لیں گے وقت کی رفتار بھی

بڑھ گیا دیوانہ پن اختر مرا
کم ہوا جب التفاتِ یار بھی

غزل

[illegible]

اس شہر میں ملتے ہیں شباب اور طرح کے
چہروں پہ ہیں غازوں کے نقاب اور طرح کے

یہ وہ نہیں شاہین کہ ہو پرواز فلک پر
اڑتے ہیں فضاؤں میں عقاب اور طرح کے

مشکل ہے نہ تلوار نہ تو دار و رسن سے
اس بار کئے اس نے عتاب اور طرح کے

ڈرتا ہوں مری طرح نہ رسوا ہو ملا ارب
یہ شیخِ حرم تو ہیں جناب اور طرح کے

خوشبو ہے نہ جگنو ہے نہ آنکھوں میں ہے آنسو
اس فصل میں دیکھے گئے خواب اور طرح کے

ملتے ہیں کھلے دل سے وہ اپنا ہو کہ ہو غیر
ہم وہ نہیں جو رکھیں حساب اور طرح کے

در پہ آئی کہاں لوٹے وفا ڈھونڈنے نکلے
اس فصل میں کھلتے ہیں گلاب اور طرح کے

غزل

ڈاکٹر حقیر آستانی
ڈبل ایم اے - ایل ایل بی،
پی ایچ ڈی (ڈی ایس سی اے)

سبان حقوق آدمی بیدار ہیں
ٹ لوٹنے والو کہ ہم ہشیار ہیں

ایک ہی منظر ہے سب کا ایک سے اطوار ہیں
کون اب پیر مغاں ہے کون پیرِ یار ہیں

ی ہے مروت رہ کر خوابِ زندگی
خود کیوں فکرِ حیاتِ نو کے دعویدار ہیں

ہو چکا ہے ایک عرصہ سے ہمارا انہدام
ک رہے ہیں ہم آج تک لیکن سرِ بازار ہیں

م جاناں غم دوراں کی ہجرت کر گئے
رہ جانے کس سے اب تک برسرِ پیکار ہیں

آج اس رنگ آج اس رنگ میں رنگے جاتے ہیں ہم
کس قدر رنگیں طبع اس دور کے معمار ہیں

رہا اپنی ذات سے بھی اب یقیں اٹھنے لگا
ت کی مانند اپنے ہی عجیب آزار ہیں

ساری اپنا پن اخلاص ہمدردی تھی ناں
سب کے سب بھٹکے ہوئے سے مفلس و نادار ہیں

ون اپنا اپنے ہی سر ہو تو کوئی کیا کرے
ہم بھی ناسمجھے مجبور ہیں ہم بھی بیمار ہیں

آج کل ہم سے جہاں تک ہو سکے کچھ گریز
آج کل دوستو کرتی ہوئی دیوار ہیں

گرا نصیبے دشمناں ہو دشمنوں کی دوستی
ہر کہاں لاچار و لاوارث و ذلیل و خوار ہیں

لگ رہا ہے یا ملیں گے اب علاجِ غم سے بچا
جی ہمارا بھر گیا ہے دیر سے بیزار ہیں

مل گئی یا معلوم اب پوچھو ان سے حقیر
مجھ کو اس بار ان کے کیسے انکار ہیں

غزل

درپن اندوری

ساتھ میں تو اگر نہیں ہوتا
تو سفر بھی سفر نہیں ہوتا

توڑ لوں میں تعلقات ان سے
سوچتا ہوں مگر نہیں ہوتا

ایک در پہ جو بیٹھ جاتا ہوں
آدمی یوں ہی در بدر نہیں ہوتا

میری حالت پہ رو دئے پتھر
ان کے دل پہ اثر نہیں ہوتا

ہم جو آکر اسے بسا دیتے
میرا آباد گھر نہیں ہوتا

جو ہر اک کی سمجھ میں آ جائے
وہ پیارا نظر نہیں ہوتا

ہم بھی پتھر کو پوج ہی لیتے
تو جو پیشِ نظر نہیں ہوتا

مجھ کو فاقوں کی پڑ گئی عادت
بھوک کا اب اثر نہیں ہوتا

خوف رہتا ہے دوستوں سے مجھے
دشمنوں کا تو ڈر نہیں ہوتا

جو کسی کے نہ کوئی کام آئے
ایسا کوئی شجر نہیں ہوتا

کیوں پیوں وہ شراب میں یارو
جس سے دامن بھی تر نہیں ہوتا

کل ہند مشاعرہ

ادبی سنگم اندور کی جانب سے ایک کل ہند مشاعرہ کا انعقاد بتاریخ ۵ اکتوبر ۸۵ء بروز سنیچر بوقت ۸ بجے شب بمقام رابندر ناتھ ٹیگور ہال کیا جا رہا ہے جس میں ملک کے مشہور شعراء و شاعرات مدعو ہیں۔

دنیش کمار درپن اندوری کنوینر مشاعرہ

غزل

نوشاد مونس اعظمی تو ڑیل (راے گڑھ)

خاموش کیوں ہیں آپ سزا کچھ تو دیجئے
اُف تک نہ میں کروں گا یقین میرا کیجئے

یہ راز کھل نہ جائے ذرا سوچئے حضور
غیروں کے سامنے نہ مرا نام لیجئے

یہ آتشِ حسد ہے بجھے گی نہ آب سے
حاضر ہے میرا خونِ جگر اس کو پیجئے

غیروں سے بات کیجئے میں روکتا نہیں
لیکن نہ میرے سامنے یہ جرم کیجئے

پختہ تعلقات اگر چاہتے ہیں آپ
مجھ کو کسی بھی شکل میں کچھ تحفہ دیجئے

آداب میکدہ کا بھی ساقی خیال کر
پہلے کسی سے کہئے نہیں آپ پیجئے

مونس یہ زندہ رہنے کا محکم اصول ہے
کم ظرف دوستوں پہ بھروسہ نہ کیجئے

غزل

محمد مبین نغمہ

اُن کے سر سے جو ڈھل گیا آنچل
دل کی دُنیا بدل گیا آنچل

چہرہ کیوں ہے دُھواں دُھواں اشانہ
چاندنی سے بدل گیا آنچل

جس کے ہاتھوں کی چوڑیاں ٹوٹیں
اس کے سر کا ہی جل گیا آنچل

اُف یہ غیرت قریب آنے پر
سر پہ تیرے سنبھل گیا آنچل

میری قسمت نے یاوری کی ہے
اب خیالوں میں ڈھل گیا آنچل

ہر خوشی زندگی سے دُور ہوئی
ہاتھ سے جب نکل گیا آنچل

بات کچھ ایسی آپڑی نغمہ
سرخیاں رخ پہ مل گیا آنچل

غزل

ریحانہ اکمل خواجہ
سرونج

غمگسار و انتہائے دردو غم ہو جائے گی
میں نہ رویا تو تمہاری آنکھ نم ہو جائے گی

یہ وفا کی اتنی قسمیں کچھ خبر بھی ہے تمہیں
کل تمہاری ہر قسم عہد ستم ہو جائے گی

طے کیا جو ہم نے تنہا تھا محبت کا سفر
راہ میں لغزش کی دُنیا ہم قدم ہو جائے گی

جانتا ہوں اس محبت کو تو مجھ سے کچھ نہ پوچھ
گر بہت ہوگی ترا رحم و کرم ہو جائے گی

اس قدر تیری محبت اس قدر تیرا خلوص
اس طرح تو تشنگی اے دوست کم ہو جائے گی

فکر ناحق ہے تجھے میری اُداسی کی "دوست"
کھل کے رو لوں گا اگر پل بھر تو کم ہو جائے گی

غزل

پروفیسر ایس۔ پی شرما تفتہؔ (کوروکشیتر)

اے جانِ جہاں! تیرا جہاں نقشِ قدم ہے
ہر لمحہ وہاں خلد ہے ہر لحظہ اِرم ہے

ہم فاصلہ رکھتے نہیں دل اور زباں میں
جو نوکِ زباں پر ہے وہی دل پہ رقم ہے

کیا کیا نہ ستم ڈھائے مری جان پہ سب نے
زندہ ہوں اگر تو یہ تیری شانِ کرم ہے

دُنیا کے مناظر نظر آتے ہیں برابر
آئینۂ دِل کیا ہے مرا ساغرِ جم ہے

قدریں کبھی دُنیا میں برابر نہیں ہوتیں
جو زہر کو امرت ہے وہی بکر کو سم ہے

فنکار زر و سیم کے پیچھے نہیں پھرتا
فنکار کا سرمایہ فقط اُس کا قلم ہے

یہ امرِ مُسلّم ہے کہ احسان بھلانا
اِنسان کے کردار میں سب سے بڑا غم ہے

یہ طرزِ ادا کوئی دُنیا گُل نہ کھلا دے
"کیا جانیے کیوں آج وہ مائل بہ کرم ہے"

اِنسانوں میں اِنسان کے اوصاف ہیں عنقا
اس دور اے تفتہؔ یہی ایک ستم ہے

غزل

نور ریوانی

دل لگانے کی بات کرتے ہو
کس زمانے کی بات کرتے ہو

توڑ کر پھول سا ہمارا دل
مسکرانے کی بات کرتے ہو

قید کر کے قفس میں پنچھی کو
آب و دانے کی بات کرتے ہو

توڑ کر آئینہ محبت کا
منہ دکھانے کی بات کرتے ہو

فاصلہ بڑھ رہے ہوں جب دل کے
پاس آنے کی بات کرتے ہو

جان دیتا جو وفا پہ اُسے
آزمانے کی بات کرتے ہو

یوں ہی کیا کم ہیں غم زمانے کے
دل دُکھانے کی بات کرتے ہو

اپنے گھر کی نہیں خبر تم کو
تم زمانے کی بات کرتے ہو

بجلیوں کے چمن میں تم اے نورؔ
آشیانے کی بات کرتے ہو

غزل

[illegible]

وحشتِ مجنوں و لیلیٰ کے حوالے، پتھر
ہم کو بر قابِ و تمازت سے نہیں کوئی ضرر
چوٹ اس دل پہ لگی درد بھی محسوس ہوا
ان میں اخلاق و محبت کی جگہ سختی ہے
خرق پربت پہ کسی طور نہیں پڑ سکتا

موتی ساگر سے نہیں ہم نے نکالے پتھر
پتھروں پر کوئی کس طرح اُچھالے پتھر
جتنے آئے مرے ہاتھوں میں سنبھالے پتھر
دورِ حاضر نے بشر تو نہیں، ڈھالے پتھر
جتنے چاہے مری تقدیر اُچھالے پتھر

جو بھی مشتاق محبت کا طلبگار ملے
اس سے کہئے کہ کلیجے سے لگالے پتھر

درسِ عبرت

ڈاکٹر اودے سرن اساں

شہر میں ایک معمولی سی ملازمت خدا خدا کر کے ملی۔ تنخواہ معمولی اور بالائی آمدنی کا کوئی امکان ہی نہ تھا اس لئے اپنے اہل و عیال کو گاؤں میں ہی رکھنے پر مجبور تھا۔ فٹ پاتھ پر سردار جی کے ڈھابے پر دوپہر کا کھانا کھا لیتا اور شام کو جاتے وقت بسکٹ پر اکتفا کرتے ہوئے سوجاتا۔ ایک دن ڈھابے سے کھانا کھا کر دفتر کی طرف جا رہا تھا کہ سڑک پر ایک بٹوا پڑا ہوا دیکھا اور ایک راہگیر چند قدم کے فاصلے پر جا رہے ایک سائیکل سوار کو زور زور سے آوازیں لگا رہا تھا سائیکل والے بھائی صاحب تمہارا بٹوا گر گیا ہے۔

سائیکل سوار نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور سائیکل سے اتر کر دائیں بائیں اور آگے پیچھے دزدیدہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اطمینان کر لیا کہ کوئی نہیں ہے اور یہ اچھی طرح جانتے ہوئے کہ اس کا بٹوا نہیں گرا مگر یہ سمجھتے ہوئے کہ ہاتھ آئی لکشمی کو کیوں ٹھوکر ماری جائے۔ راہگیر تو بے وقوف ہے جو مجھے آواز دینے کی بجائے چپ چاپ بٹوا اٹھا کر اپنی راہ لیتا۔

سائیکل سوار نے پھرتی سے سائیکل سڑک کے کنارے کھڑی کی اور بٹوے کی طرف اس تیزی سے لپکا جیسے مرے ہوئے چوہے پر چیل جھپٹتی ہے۔ جونہی سائیکل سوار بٹوے کی طرف لپکا راہگیر نے اس کی سائیکل لی اور یہ جا وہ جا سائیکل والا بٹوا کھول کر مالِ غنیمت کی جانچ کر رہا تھا اور راہگیر سائیکل اڑاتے جا رہا تھا سائیکل سوار کو بٹوے میں صرف ایک کاغذ ملا جسے اس نے پڑھ کر پھر بٹوے میں ہی ٹھونس دیا اور بٹوے کو انتہائی بے اعتنائی کے ساتھ وہیں پھینک دیا۔ اور جونہی اس نے اپنا رخ سائیکل کی طرف کیا تو سائیکل اس راہگیر کو اٹھائے اسے کافی فاصلے پر دکھائی دی اور وہ ٹھگے جانے کے افسوسناک تاثرات کے ساتھ فوری طور پر ایک سائیکل رکشا جو اس کے پاس سے گزر رہی تھی پر سوار ہو گیا اور رکشہ والے سے کہنے لگا کہ جلدی کرو اس سائیکل چور کا پیچھا کرنا ہے جو سامنے کچھ فاصلے پر دکھائی دے رہا ہے۔

گرے ہوئے بٹوے کا لالچ دلا کر ٹھگی کی اس واردات پر دل ہی دل میں راہگیر کے اس فنکارانہ ڈھنگ کی داد دیتے ہوئے اس طرف بڑھا تاکہ یہ دیکھ سکوں کہ بٹوے کے اندر ٹھونسے ہوئے پرچے پر کیا لکھا ہوا ہے۔ میں نے بٹوے کو اٹھا کر اس میں سے پرچہ نکال کر پڑھا۔ لکھا تھا۔

جب یہ بٹوا تیرا تھا ہی نہیں تو اسے حاصل کرنے کے لئے اپنی سائیکل چھوڑ کر ادھر کیوں لپکا تھا۔ بے ایمان کمبخت جس کی نیت پرائے مال پر خراب ہوتی ہے بھگوان اس کو اسی طرح کی سزا دیتا ہے۔

میں اس کاغذ کو پھر بٹوے میں ٹھونس کر وہیں پھینک آیا تاکہ اسی طرح کچھ اور لوگوں کو بھی نصیحت مل جائے۔ کیونکہ ہمارے ہاں لوگوں کی کمی تھوڑے ہی ہے جن کی نظر دوسروں کے بٹوے پر [illegible]

نئی دریافت

مکمل علمِ عروض ہندی میں

نہایت آسان اور دلچسپ

مصنف: مہرشی

ہندی۔ اردو دونوں زبانیں جاننے والوں کے لئے یکساں طور پر مفید

(ماہر العروض ڈاکٹر آر علامی)

قیمت مع رجسٹری -/17 (پیشگی)

پانچ پر کتابوں -/25% ۔ دس یا اس سے زائد پر 35% کمیشن۔

پتہ:۔ آر۔ پی شرما۔ 6/12 بورلا سوسائٹی چمبور۔ بمبئی ۔ 400074

ساتویں قسط

اور دھرتی کانپ اٹھی

احمد حسین شمس ایڈوکیٹ (کشن گنج)

شباب ہو گا تو دوسرا نام حسن ہے پھر ہیرا کو حسین کیوں نہ
…ے یہ چودھویں بہار تھی جو اس پر نثار ہو رہی تھی باد نسیم کے خوشگوار
…پُرکیف جھونکے کلی کو پھول کی صورت بخشنے کے لئے بیقرار تھے ہیرا کا
…ایک عضو سانچے میں ڈھلا ہوا تھا۔ گالوں میں اگر شراب کی سرخی دوڑ
…رہی تھی تو اس کی چال میں ایک شرابی کی ساری مستیاں لہرا رہی تھیں
…کشن لال نے اس کی تعلیم و تربیت میں کسی قسم کی کمی نہیں کی ہیرا جب
…دہ سال کی ہوئی تو اسے بلا ضرورت گھر سے نکلنے کو منع کر دیا گیا اور
…اب ہیرا کا چودھواں سال تھا۔ پُر رعنائی کا چاند! چودہ منازل
…طے کرنے کے بعد یہ شبِ گھڑی نصیب ہوتی ہے

ہولی اپنی ساری رعنائیوں کے ساتھ آئی اور سب کو بیخود بنا کر
…گئی ہیرا نے اگرچہ بہت کوشش کی کہ ہولی کے موقع میں کسی صورت
…سے اپنے بچپن کے ساتھی شوہر سے دو باتیں کرے مگر اس کا موقع
…اسے نہ ملا ہولی کے تیسرے روز کشن لال اور منوہر پٹنہ چلے گئے
ہیرا اپنے پتاجی کی پریشانیاں آج سال بھر سے دیکھ رہی تھی گھر کے
…کام کاج سے اس کے پتاجی کو کوئی سروکار نہ تھا دن رات وہ
ہیرا کی سگائی ہی کی فکر میں لگے رہتے جہاں کہیں پتہ چلا وہیں دوڑ پڑے
اور اب کی دفعہ وہ پٹنہ گئے ہوئے ہیں۔

آج صبح ہیرا اپنے کمرے میں بیٹھ کر نندن کے لئے ایک سوتی بنیاین
…رہی تھی کروشیا کی رفتار کے ساتھ اس کے خیالات میں بھی
…ہیجان پیدا ہو رہا تھا جوانی کی مستیاں ہیرا کو اپنے قابو میں رکھنا چاہتی
…تھیں ہر سمے اس کے خیالات میں نئے نئے ولولے اور نئی امنگیں پیدا
…ہو رہی تھیں ہر لمحہ اس کے تخیلات کی رنگینیاں بڑھتی جاتی تھیں
…اور ہیرا چاہتی تھی کہ وہ اپنے ان جذبات و خیالات کو کتابوں اور
…دستکاریوں کی نذر کر دے وہ لاکھ کوشش کرتی تھی کہ کسی طرح وہ
…اپنے کو بہلائے رکھے مگر شباب نے اس کے دل و دماغ کو مسحور
…کر رکھا تھا رات کی تنہائیوں میں وہ اکثر سوچتی کاش اس سے
اس وقت کوئی میٹھی میٹھی باتیں کرتا اور اس کے امڈتے ہوئے جذبات
کو تھپکیاں دے دے کر سلا دیتا۔ مگر وہ صرف کروٹیں بدل کر رہ جاتی
تھی اور جب اضطراب کچھ زیادہ بڑھتا تو وہ بارہ ایک بجے رات کو بھی
اٹھ کر کسی کتاب کے مطالعہ میں محو ہو جاتی تھی۔ آخر یہ جوانی چاہتی
کیا ہے؟ سکون؟ مگر وہ سکون کہاں ہے؟ دل کے گوشے سے
ایک نحیف و نزار آواز آتی ایسی آواز گویا کوئی اس سے سرگوشیاں کر
رہا ہو۔ مرد کی آغوش میں۔ مگر وہ مرد کون ہے؟

ہیرا شرما جاتی چھوئی موئی کی طرح اسے کاش وہ منوہر ہو تا منوہر
نے اسے بچپن میں بہت دق کیا ہے پھر بھی نہ جانے کیوں منوہر کی
طرف دل کھنچا جا رہا ہے۔ سات دن پہلے منوہر گاؤں آیا مگر
اس سے ملاقات نہ ہو سکی صرف اس روز اسے ذرا ایک نظر دیکھ لیا
تھا اور بس۔

اتنے میں اس کی بھاوج نندن کو گود میں لئے ہوئے آئی اور
ہیرا کے سامنے ایک..مونڈھے پر بیٹھ گئی۔

ہیرا نے کہا "نندن نے ذرا آ نا تو ایک دفعہ اور تیری ناپ لے لوں"
نندن ماں کی گود سے اتر کر تن کر اپنی پھوپھی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔
ہیرا نے اس کی ناپ لے کر پوچھا "صرف کھیلتے ہی ہو" گرو جی کے
پاس جی لگا کر پڑھتے بھی ہو"

"واہ پڑھتا کیوں نہیں۔ اب شلوک وغیرہ ختم بھی کر رہا ہوں"
اس کی ماں نے کہا نندن ذرا وہ بلی والا دوہا اپنی پھوپھو کو سنا
تو دے"

ہیرا نے ہاتھ روک کر کہا "ہاں ذرا پڑھو تو منو"
اور نندن نے پڑھنا شروع کیا۔ "دیکھو لڑکو بلی آئی کر میاؤں میاؤں کرتی
کیسی بھاگی"۔ اور پھر اس نے پوری کی پوری نظم زبانی سنا دی

"واہ منو" ہیرا نے کہا۔ "اب تو تم بہت پڑھ گئے"
نندن نے اپنی ماں سے پوچھا "ماں ہیرا پھوپھو مجھے منو کیوں

کہتی ہیں ؟

"مجھو نے پوچھا کہ منوہر کہتے ہیں"

"اور منوہر کاکا ۔ کاکی تو اس کے بھیا منو کہتے ہیں"

"تو وہ اپنے بھیا سے چھوٹے جو ہیں"

ہیرا نے پوچھا "منوہر کاکا کے گھر تو کب گیا تھا"

"ہولی کے دن" اور پھر اس نے ماں سے کہنا شروع کیا "بڑی کاکی ہیں جو تاں ماں انھوں نے منو کاکا کے سر پر ایک موٹا رنگ ڈال دیا منوہر کاکا کھسیانے ہو کر اس کی طرف دوڑے وہ چلیں بھاگ منوہر کاکا نے مجھ سے کہا ۔ نندن ذرا اپنی کاکی کو پکڑ تو میں دوڑا اور پکڑ لیا اور میں ساڑی پکڑ کر اسے کھینچ لایا وہ ساڑی بھی سنبھالتی جا رہی تھیں اور مجھے ڈانٹتی بھی جا رہی تھیں اور ادھر منو کاکا نے وہ پچکاریاں چلائیں ماں وہ پچکاریاں چلائیں کہ کاکی رنگ سے شرابور ہو گئیں اور پھر ایک مٹھی عبیر لے کر اس کے منہ پر یوں مل ڈالا ۔ اور واقعی نندن نے اپنی ماں کے چہرے کو ملنا شروع کیا ۔

— اور ادھر ہیرا کے دل میں ایک عجیب گدگدی پیدا ہونے لگی ۔ اس کی ماں نے جھنجھلا کر کہا "بڑا پاپی ہے اے تو یہ کیا کرتا ہے"

"ماں منوہر کاکا میرے یہاں ہولی کھیلنے کیوں نہیں آئے ؟"

"وہ [illegible] وہ کس کے ساتھ ہولی کھیلتے"

"کیوں ! تم جو ہو پھوپھی جو ہیں"

ہیرا کی آنکھیں اضطراری طور پر نندن کی طرف اٹھیں اور آپ ہی آپ جھک گئیں ۔ ہیرا شرما گئی ۔ چہرے پر ایک ایسا رنگ آیا جسے اس کی بھاوج نے دیکھا اور اس کے دل نے کچھ محسوس کیا

نندن کی ماں نے کہا ۔ "وہ دیکھ تیری پھوپھی شرما رہی ہیں ۔"

"ارے واہ ۔ بھلا اس میں شرمانے کی کون سی بات ہے ہولی تو سبھی کھیلتے ہیں"

"مگر ہیرا کو رنگ سے نفرت ہے"

"تو کل میں پھوپھی کی ساڑی میں رنگ لگا دوں" اور نندن نے باہر جانا چاہا ۔

ہیرا نے ڈانٹ کر کہا "کہاں جاتا ہے ۔"

نندن وہیں کھڑا ہو گیا اور کبھی ہیرا کی طرف کبھی ماں کی طرف دیکھنے لگا ۔

ہیرا بولی ۔ "دیکھتی ہوں تو روز بروز بدمعاش ہوا جا رہا ہے ماروں گی ۔" وہ چپ [illegible] بیٹھ چپ چاپ کی گود میں" اور نندن اپنی ماں کی گود میں دبک کر بیٹھ رہا

نندن کی ماں نے کہا "ہیرا ! اب کی تم منوہر دلہن بن

"چپ بھی رہو بھابھی ۔ تم بھی کیا بات لے بیٹھیں"

"اتنی شرماتی کیوں ہو ایک دن میں بھی تمہاری طرح کنواری ۔ مگر تمہیں تو میرے بھیا سے ساز باز تھا بھیا گئے اور بیاہ کر لے آئے"

تم بھی کسی کی گود میں بیٹھ کر رنگ رلیاں مناؤ گی اور ہوا ہو گی اپنے ساجن کی کہ سال چھ مہینے میں خط سے بھی ہمیں کو یاد نہ کرو گی دل تو تڑپ رہا ہو گا ہیرا کیوں" اور بھابھی "میں شادی نہ کروں گی بھابھی"

"ہاں" منہ بنا کر بھابھی نے کہا ۔ ہر لڑکی شادی کے پہلے یہ کہتی ہے اور دل سے جو پوچھو تو وہ پاگل ہو رہا ہے ۔

"اب اپنے دل کی بات مجھ سے نہ بولو"

"یہ اچھی کہی" بھابھی نے ذرا سہلایا

"مجھے تو مردوں سے چڑ ہے بھابھی" ہیرا نے مسکرا کر کہا ۔

ہاں چڑ کیوں نہ ہو ۔ اس دن دروازے پر منوہر بابو آئے جھانک کر میں ہی تو دیکھ رہی تھی ۔

ہیرا نے بھابھی کی طرف دیکھا اور پھر مسکرا کر نظریں نیچی کر لیں ۔

"لو چور پکڑا نہ گیا ۔"

"بھابھی" اور ہیرا شرما گئی

"تو یہ کیوں نہ کہو ہیرا کہ تمہیں سارے مردوں سے چڑ ہے ایک منوہر بابو کو چھوڑ کر"

ہیرا نے بھابھی کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور گھبرا کر "بھابھی بھگوان کے لئے ذرا دھیرے بولو کوئی سن لے گا تو کیا کہے گا"

"دیکھے گا کیا ؟ لو پرواہ ہے" نندن کی ماں نے کہا ۔

"اب چپ بھی رہو ۔ بھابھی ورنہ میں بھاگ جاؤں گی ۔"

اس کی بھابھی نے نندن سے کہا ۔ بیٹا ذرا دوڑ کر اپنے

تو دے آئے"

سندن وہاں سے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد بھابی نے
پراوہ دعوت کی رات تمہیں یاد ہے؟
"کیوں کیا ہوا؟"
"اس دن منوہر اور تمہارے بھیا سے بہت سی باتیں ہوئیں
ارے بھیا وہ ساری باتیں آج مجھ سے کہہ رہے تھے"
شاید وہ شاعر صاحب کی بکواس کے بارے میں کہہ رہے ہوں گے
یہ عین وشین کی کیا کہہ گئے کشش بھیا۔ اور دوسرا مصرعہ کیا پڑھا
اس بھی نے بڑا زندہ دل آدمی معلوم ہوتا ہے یہ بھی بھی۔ جب
حسین بخش آئے تھے تو انھیں دیکھنے کے لئے میں بھی دروازے
گئی تھی بھابی نے نہ جانے کیا کہا کہ بھی صاحب نے عین وشین
دیتا پڑھ دی یہ عین وشین کون ہے بھابی؟ یہ بڈھے بھی
دل بیٹھتے ہیں تو جوانوں کو بھی مات کر دیتے ہیں"
"ہوگی کوئی ایسی ویسی"
"اور سنا کچھ بھابی تم نے" آہستہ سے ہیرا نے کہا۔
"کیا؟"
"یہ بڈھے بھی بڑے رنگین ہوتے ہیں"
"کیا کہہ رہی ہو تم"
"قریب ایک بجے رات کو میری آنکھ کھلی تو باہر سے گھنگھرو
آواز آرہی تھی"
"حویلی میں تو یہ سب ہوتا ہی ہے"
"میاں صاحب وحسین بخش، اس رات کو کہیں لدے گئے تھے
یا مکان چلے گئے تھے"
"مجھے معلوم نہیں" اس کی بھابی نے کہا۔
"بھابی تم بڑی بھولی ہو"
"اسی سے تم مجھے باتوں میں بہلا رہی ہو۔ میں کیا کہنے آئی اور
تم نے کیا بات چھیڑ دی"
"تم منوہر کے بارے میں کہو گی" منہ بنا کر ہیرا نے کہا
"ہاں"
"میں منوہر کے بارے میں کچھ سننا نہیں چاہتی بچپن میں وہ مجھے
بہت دق کرتا تھا"

"اور اب اس نے زندگی بھر دق کرنے کا تہیہ کر لیا ہے"
ہیرا کا دل دھڑک اٹھا وہ چاہتی تھی کہ دن بھر کوئی منوہر کے
بارے میں اس سے باتیں کرتا رہے مگر زبان اس کے دل کی مخالفت
کر رہی تھی جب جب منوہر کا نام اس کی بھابی کی زبان پر آتا ہیرا
شرما جاتی تھی۔ ممکن ہے مرد عورت کے اس انداز کا صحیح اندازہ نہ
لگا سکیں مگر ایک عورت عورت کے دل سے اچھی طرح واقف
ہوتی ہے بعض باتوں میں جس طرح تمام مرد یکساں ہوتے ہیں اسی طرح
ناز و نخرہ انداز و ادا دنیا کی تمام عورتوں میں قدر مشترک ہے انکار و
اقرار عورتوں کی لغت میں بالکل برعکس مفہوم رکھتے ہیں اس کی بھابی
اس کے جذبۂ دل کو تاڑ گئی جس بات کا اسے شبہ تھا یقین کی صورت
اختیار کر گئی سندن کے بیاہ کی بات نے جو بات منوہر کی طرف سے اس
سے کہی تھی ہیرا کی ادائیں اس کی تصدیق کر رہی تھیں منوہر مرد تھا
اس کے دل کی بات اس کی زبان پر آگئی۔ ہیرا عورت تھی اس
کی آنکھوں نے جذبات دل اپنے اندر ہمیشہ لئے مگر دونوں کا مفہوم
تو ایک ہی تھا عورت کا دل سمندر ہے سمندر کا راز سمندر ہی جانتا ہے
باہر سے ہلکی ہلکی لہریں دیکھ کر یا تلاطم خیز طوفان دیکھ کر سمندر کی
تہہ کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جا سکتا ہے ہیرا کو جتنا کرنا تھا اس
سے زیادہ کہہ گئی مگر یہ مسئلہ حل کیسے ہو سندن ہیرا کے بھیا کی خواہش
اس کے بیاہ کی خواہش نہیں بن سکتی تو کیا اس کے معنی یہ
ہوئے یہ دو معصوم روحیں زندگی بھر آپس میں مل ہی نہ سکیں۔
"اس کی بھابی نے کہا۔ ہیرا سچ کہو اگر منوہر سے تمہاری شادی
ہو جائے تو کیسا رہے"
"اب چپ بھی رہو بھابی۔ اس وقت سے تم میرا سر کھا
رہی ہو"
"اور دل تو چاہتا ہوگا" اس کی بھابی نے چٹکی لیتے ہوئے
کہا۔ کہ منوہر کی گود میں کب جا بیٹھیں
"تمہیں جا کر بیٹھ رہو۔ اگر وہ اس قدر پیارا ہے"
"مجھے تو یقیناً وہ پسند ہے مگر اپنے لئے نہیں تمہارے
لئے آج میں منوہر کے گھر جاؤں گی اور اس کی بھابی سے ساری
باتیں کہہ دوں گی کہ دونوں کس طرح ایک دوسرے کے لئے
ہیں"
(جاری ہے)

دِلّی اُردو اکادمی، دلّی دُوردرشن۔ آکاشوانی دلّی اور جولیس نحیف دہلوی

مسیحی شعراء میں جولیس نحیف دہلوی بہ لحاظِ کلام، شاعرانہ ترنم اور ایک اچھے انسان کے اپنی مثال آپ ہیں۔ مسیحی شعراء اور ادیبوں میں عام طور پر یہ عیب پایا جاتا ہے کہ وہ اپنے دوسرے مسیحی شعراء اور ادیبوں کی تخلیقات پر حرف گیری کرتے رہتے ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ خدا واسطے کی دشمنی رکھتے ہیں۔ مگر جولیس نحیف دہلوی خدا کے فضل سے کسی کو اپنا دشمن نہیں سمجھتے اور نہ ہی کسی کی شعری یا نثری تخلیق میں کیڑے نکالتے ہیں۔ بلکہ جو بھی ان کے قریب گیا اس کی مقدور بھر خدمت کرتے ہیں۔ عام مشاعروں میں یہ اپنے مخصوص ترنم اور عام فہم کلام کے لئے مشہور ہیں۔

دلی اُردو اکادمی کو آج تک یہ شرف حاصل نہ ہو سکا کہ وہ اپنے مشاعروں میں کسی مسیحی اُردو شاعر کو مدعو کر سکے۔ ہم کنور مہندر سنگھ بیدی سحر صدر پروگرام کمیٹی دلی اُردو اکادمی سے منصفانہ مطالبہ کریں گے کہ وہ مشاعروں میں جہاں کئی متشاعر اور خوشامدی شاعروں کو بار بار مدعو کرتے ہیں وہاں دلی اُردو اکادمی کے مشاعروں میں جولیس نحیف دہلوی ایسے مسیحی شعراء کو بھی مدعو کیا کریں کیونکہ جب ہم یہ دعوے کرتے ہیں کہ اُردو سب کی زبان ہے پھر کیا وجہ ہے کہ کسی مسیحی شاعر کو اُردو اکادمی کے مشاعرے میں مدعو نہیں کیا جاتا جبکہ اُردو اکادمی دلی جناب جولیس نحیف دہلوی کے مجموعۂ کلام "آوازِ دل" پر انعام بھی دے چکی ہے۔ ہم آکاشوانی اور دلی دُوردرشن کے ذمہ دار ارکان سے بھی گذارش کریں گے کہ وہ کنوئیں کے مینڈک بن کر نہ رہیں بلکہ انھوں نے اپنے ارد گرد جو خوشامدیوں کا دائرہ بنا رکھا ہے اس سے باہر بھی نکلیں اور اُردو کے مسیحی شعراء کو بھی اپنے مشاعروں وغیرہ میں شرکت کی دعوت دیں اور اس ضمن میں ہم جولیس نحیف دہلوی کے لئے پُرزور مطالبہ کرتے ہیں۔ حال ہی میں مکتبہ جامعہ دلی نے ایک کتاب "جائزے" شائع کی ہے جن میں تقریباً دو صد اُردو کی اچھی کتابوں پر تبصرے کئے گئے ہیں۔ "جائزے" میں جناب نحیف دہلوی کے مجموعۂ کلام آوازِ دل پر حسبِ ذیل تبصرہ جناب [illegible] نے کیا ہے جو اُردو اکادمی دلی اور دوردرشن دلی نیز آکاشوانی دلی کے اُردو پروگراموں کے ذمہ داروں کے لئے باعثِ شرم ہے کہ ایسے شاعر کو مدعو نہیں کیا جاتا۔

آوازِ دل شاعر:- جولیس نحیف دہلوی۔ ناشر: ماہنامہ شانِ ہند نئی دہلی ۲۔ قیمت [illegible] روپے

مسیحی اہلِ قلم نے اردو ادب میں قابلِ لحاظ اضافہ کیا ہے۔ ان میں جولیس نحیف دہلوی شامل ہیں۔ ان کا شعری مجموعہ "آوازِ دل" ماہنامہ شانِ ہند دہلی نے شائع کیا ہے۔ "آوازِ دل" میں بلدیات، قطعات، غزلیات درج ہیں۔ ان کے علاوہ وطنی نظمیں ہیں۔ تیوہاروں پر نظمیں ہیں۔ شخصیات پر نظمیں ہیں۔ یسوع مسیح پر عقیدت مندانہ نظم ہے۔ مروجہ زمینوں میں نحیف نے بعض اشعار اچھے نکالے ہیں۔ مثلاً ؎

گوشے گوشے میں مرے دل کے نظر آئیں گے آپ ⁂ چیر کر دل کو اِدھر سے یا اُدھر سے دیکھیے

شاعر نے اپنے حالاتِ زندگی اور شاعری کے بارے میں جو لکھا ہے وہ موجِ زیبائی کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہیں۔ جولیس نحیف کے یہاں بعض انسانی تجربوں کو پیش کیا گیا ہے۔ وارداتِ قلبی کی سرگزشت بھی ہے نفسیاتی عنصر بھی۔ اس کے ساتھ زندگی میں روشنی پر مکمل اعتماد یا رجائی پہلو قابلِ قدر ہے۔ درج ذیل اشعار میں ان اوصاف کی تلاش کی جا سکتی ہے۔

یادِ محبوب ترا ساتھ دیا ہے میں نے ⁂ کس خطا کے لئے تو مجھ کو سزا دیتی ہے

رفتہ رفتہ حیا جائے گی ⁂ پہلی پہلی ملاقات ہے

ہزاروں بار تاریکی نے حملہ تو کیا لیکن ⁂ چراغِ آرزو کی روشنی مدھم نہیں ہوتی

([illegible])

لال شہزادہ

محمد احسن فاروقی

نواب منصور علی خاں عرف چھوٹے مرزا صاحب کے خاندانی قبرستان میں ایک قبر سب سے الگ تھی اور سب سے زیادہ نمایاں اس وجہ سے تھی کہ وہ سرخ پتھر کی بنی ہوئی تھی جو بھی اس قبرستان میں پہنچ جاتا وہ بے ساختہ یہ سوال ضرور کرتا " یہ قبر کس کی ہے ؟" اس سوال کے جواب میں جو کوئی بھی نواب صاحب کے خاندان کا فرد موجود ہوتا وہ ایک عجیب قصہ سناتا۔ میں ایسے موقع سے وہاں پہنچا تھا کہ نواب صاحب جن کا سن نوے برس کا تھا خود ساتھ تھے اور میرے سوال کے جواب میں انھوں نے کہنا شروع کیا۔

" یہ میری بہن تھی، مجھ سے چھوٹی تھی۔ ہم دو بھائی تھے۔ بڑے مرزا صاحب جن کی وہ سفید قبر دیکھ رہے ہو اور چھوٹے مرزا یعنی میں اور تیسری اولاد والد مرحوم کی یہ لڑکی تھی۔ کس قدر خوبصورت تھی۔ ایسا صاف رنگ کہ پان کھاتی تھی تو گلے میں پیک دکھائی دیتی تھی بال اتنے بڑے کہ ٹخنوں تک آتے تھے۔ کاندھے میں رکھ کر دھوئے جاتے اور ایسے سیاہ اور ایسے چمکدار کہ ناگن معلوم ہوتے تھے۔ بڑی بڑی آنکھیں اور دکھائی ایسی کہ دیکھتے آدمی نشے میں آجائے۔ فریب نرگس مستانہ جو آتش نے کہا نہیں ہے ؎

مگر اس کو فریب نرگس مستانہ آتا ہے
الٹتی ہیں صفیں گردش میں جب پیمانہ آتا ہے

تو وہ عالم تھا۔ ستواں ناک۔ کتابی چہرہ، چوڑا ماتھا۔ بھرے بھرے سرخ گال۔ اللہ نے اپنے ہاتھ سے خاص طور سے بنایا تھا۔ شہر بھر کی بیگمات اسے دیکھنے کے لئے آتیں اور اکثر دیکھ کر غش کھا جاتیں۔"

" کسی غیر مرد نے تو کبھی دیکھا نہ ہوگا ؟" میں نے سوال کیا۔

" کیا مجال جو پرندہ پر مار جاتا۔ بس اک لوگوں کا سامنا ہوتا تھا جن سے شرع نے پردہ جائز رکھا۔ والد تھے۔ بھائی جان اور میں۔ چچا ماموں کے لڑکوں سے بھی پردہ تھا۔"

" پڑھی لکھی بھی نہ ہوں گی ؟"

" لکھی تو تم جانتے ہو کہ ہمارے یہاں لڑکیوں کو لکھنا نہیں سکھایا جاتا۔ ہاں پڑھی ضرور تھی اور اس پڑھنے ہی سے اس کا قصہ شروع ہوتا ہے۔ یہی کوئی آٹھ نو برس کی ہوگی، استانی پڑھا رہی تھی استانی کہا کرتی تھی کہ قیامت کا ذہن پایا ہے صاحبزادی نے آپ سے آپ نکال لیتی ہیں اور ایک دفعہ پڑھنے میں حفظ اور پڑھنے کا لہجہ وہ قیامت کہ جن سننے لگیں۔ اور یہی تو قیامت ہوئی کہ ایک جن عاشق ہو گیا۔

" جن ؟ یہ کیسے معلوم ہوا آپ کو ؟"

" ایک دن استانی پڑھاتے پڑھاتے اٹھ کر بھاگی اور امی جان کے پاس آکر بولی " میں نہیں پڑھا سکتی صاحبزادی کو۔ ان پر کسی جن کا سایہ ہے۔" یہ کہہ کر وہ برقعہ اوڑھ بگ ٹٹ بھاگی اور پھر ہمارے گھر کا رخ نہیں کیا۔ امی جان نے دیکھا۔ ماشاء اللہ بیگم کو۔ اس کا نام ماشاء اللہ بیگم رکھا گیا تھا، سمجھے ؟ تو سرخ ہو رہی تھی۔ آنکھیں تک سرخ ہو رہی تھیں۔ بس اپنے کمرے میں جا کر پلنگ پر پڑ گئی اور کمرے کے دروازے اندر سے بند ہو گئے۔ سب کھٹکھٹایا گئے بالکل نہ کھلے میں گھر میں آیا۔ امی جان مرحومہ نے مجھ سے کہا۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ کوئی جواب نہیں۔ اس کمرے کی دو کھڑکیاں باغ کی طرف تھیں، ہوا آنے کے لئے اور عورتوں کے باغ دکھانے کے لئے۔ میں ادھر جا کر دیکھا۔ دونوں کھڑکیاں بھی پٹ بند تھیں۔ کھڑکیاں زیادہ اونچی نہ تھیں اور ان کے پاس درخت تھے ان پر چڑھ کر میں نے زور زور سے کھڑکیوں پر ہاتھ مارے مگر معلوم ہوتا تھا پتھر ہو گئی تھی وہ کھڑکیاں۔ ہاں آیا جان مرحوم کے کہنے پر آواز آئی " پریشان نہ ہوجئے لال شہزادے آئے ہیں۔ جب چلے جائیں گے تو دروازے کھل جائیں گے۔"

" یہ آواز کیسی تھی، آپ نے سنی تھی ؟"

" وہی ماشاء اللہ بیگم۔ میری بہن کی آواز تھی۔ جب بھی جواب آیا امی

کی آوازیں۔ وہ لال شہزادہ کبھی خود نہیں بولا۔ اباجان پلٹے تو عجیب طرح سے نظر آئے۔ امی جان یہ سن کر رونے لگیں۔ امام باڑے کے سامنے جاکر گر پڑیں اور دعائیں کرنے لگیں ہم دونوں بھائیوں نے کہا یہ سب کچھ نہیں۔ لال شہزادہ ویزادہ کچھ نہیں۔ اس لڑکی کا دماغ کچھ پھر گیا ہے۔ امی جان نے کہا کچھ جھاڑ پھونک ہو مگر اباجان نے کہا کہ غیر مرد کا سامنا ہوگا ایسا ہرگز نہ ہوگا۔ کوئی گھنٹہ بھر کے بعد کمرے کے تینوں دروازے اور دونوں کھڑکیاں آپ سے آپ کھل گئیں۔ ہم سب کمرے میں گئے۔ دیکھا ماشاءاللہ پلنگ پر تھکی ہوئی پڑی ہے بڑے بڑے بال کنڈلی مارے ایک طرف رکھے ہیں۔ ہم کو دیکھ کر اس نے آنکھیں کھولیں۔ شرمائی۔ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ سر سے دوپٹہ اوڑھا اور منہ چھپا لیا۔ ماں پاس بیٹھ گئیں۔ لونڈیاں پاس کھڑی ہو گئیں ہم مرد لوگ چلے آئے۔ یہ پہلا واقعہ تھا۔

"تو کیا ایسے واقعے روز ہوتے؟"

"نہیں ہر جمعرات کو۔ کمرہ آپ سے آپ کیوڑے گلاب سے دھل جاتا۔ لوبان اور اگربتی کی وہ خوشبو کہ میں کیا کہوں۔ ایسی خوشبو کبھی سونگھی نہیں۔ مگر کسی کی ہمت نہیں کہ کمرے کے اندر جائے۔ بیگم کے پلنگ پر چادر، تکیہ، غلاف، چھت گیری، پردے سب چمکنے لگتے۔ ماشاءاللہ بیگم بیٹھے بیٹھے ایک دم سرخ ہو جاتی، لال بھبھوکا ہوتی اور اٹھ کر بھاگتی۔ کمرے میں چلی جاتی۔ ایک ایک کر کے سب دروازے پھٹ پھٹ بند ہو جاتے ہم سب دیکھتے رہتے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ تعجب کے عالم میں آجاتے۔ پہلے پہلے تو مجھے رات رات بھر نیند نہ آتی مگر پھر عادت پڑ گئی کیونکہ ہر جمعرات کا تو یہ ورد ہو گیا تھا۔

"آپ نے باہر لوگوں سے یہ ذکر نہیں کیا؟"

"نہیں اباجان نے کہا کہ لوگ کہیں گے کوئی مرد آتا ہوگا۔ جن کا فریب بنایا اور پھر لال شہزادے کی یہ تاکید تھی کہ راز گھر سے باہر نہ جائے نہیں تو سارے خاندان کو راندھ دیں گے۔

"یہ تاکید آپ کو کیسے معلوم ہوئی؟"

اباجان مرحوم کی آواز پر جواب ضرور آتا۔ ایک دن انھوں نے دروازے کے پاس جاکر کہا "آخر آپ جن بھی تو ہماری شرع محمدی کے پابند ہیں۔ نافر جن تو جناب امیر کا غلام ہو گیا تھا۔ آپ بھی تو انہی کے خاندان سے ہیں۔ آپ کا مطلب کیا ہے؟ مجھے باپ کی حیثیت سے دریافت کرنے کا حق پہنچتا ہے" تو وہی لڑکی کی آواز میں جواب آیا۔ "ہمارا مطلب کسی کو تکلیف دینا نہیں ہے ہم اس پر عاشق ہو گئے ہیں۔ اس کو قرآن پڑھتے سنا اور اس کی آواز دل میں اتر گئی اور پھر دیکھا تو ایک جان چھوڑ ہزار جان سے عاشق ہو گئے۔ ہمارا اس کا نکاح ہو گیا ہے۔ ہم ہر جمعرات آیا کریں گے۔ آپ نے اگر سانس لی تو پھر خاندان بھر کی خیر نہیں ہے۔ آپ جو بھی مانگیں ہم آپ کو دیں گے اور اگر راز کھلا تو سب کو راندھ دیں گے" ڈر کے مارے امی جان تک نے کسی سے کچھ نہ کہا اور ہم لوگ دم سادھ گئے۔ لونڈیاں اگر کہیں کہنے بیٹھتیں تو آپ سے آپ منہ بند ہو جاتا ہر جمعرات کو یہ ہوتا رہا اور سب کمال سکوت میں رہے۔"

"اچھا، آپ کے والد صاحب مرحوم نے ان لال شہزادے سے کبھی کچھ مانگا بھی؟"

اباجان کی ایک بڑی تمنا تھی کہ انھیں سچے ہیرے الماس کی انگوٹھی پہننے کو ملے۔ ویسی ہی جیسی انھوں نے جانِ عالم حضرت واجد علی شاہ کے ہاتھ میں دیکھی تھی اور کوئی تمنا نہ تھی۔ خدا کا دیا سب کچھ گھر میں تھا۔ تو ایک رات انھوں نے دروازے کے پاس جاکر کہا "اگر آپ جو چاہیں لا سکتے ہیں تو مجھے ایک ہیرے کی انگوٹھی لا دیجئے، ویسی ہی جیسی جانِ عالم پہنتے ہیں" جواب آیا "اس سے بہتر مگر ایک شرط ہے۔ کل رات آدھی رات کے بعد آپ گومتی میں جاکر گھٹنے گھٹنے پانی میں کھڑے ہوں اور آنکھیں بند کر لیں اور جب آواز آئے تو ہاتھ پھیلا دیں اور انگوٹھی لے لیں" والد مرحوم یہ شرط پوری کرنے کو تیار نہ ہو سکے۔ میں نے کہا "میں کروں گا ایسا" دوسری جمعرات کو انھوں نے لال شہزادے سے اجازت مانگی تو جواب ملا "اگر آپ نہیں تو بڑے مرزا یا چھوٹے مرزا ہی آجائیں مگر تیسرا کوئی نہیں" تو صاحب دوسری ہی رات کو میں گھوڑے پر سوار ہو کر گومتی پہنچا۔ چاند ماہ کامل ہو رہا تھا، لہریں بڑی ناز سے کھیل رہی تھیں۔ ادھر حسین آباد کے پاس گومتی کا موڑ نہیں ہے؟ گومتی کا نام ہی گومتی ہے کیونکہ وہ گھومتی بل کھاتی جاتی ہے۔ اس موڑ پر ہم لوگ سیر کیا کرتے تھے اور چلتے وقت مجھے وہی یاد آیا۔ میں وہاں پہنچا۔ گھوڑے کو چھوڑ دیا۔ سدھا ہوا جانور، کیا مجال جو جگہ سے ہلے۔ ساکت کھڑا ہو گیا۔ میں جوتا اتار پائنچے چڑھا گھٹنے گھٹنے پانی میں پہنچ کر کھڑا ہو گیا

آنکھیں بند کئے کافی دیر کھڑا رہا۔ دل مضبوط کئے رہا۔ اکدم سے آواز آئی "لیجئے چھوٹے بھائی انگوٹھی" بالکل ماشاء اللہ بیگم کی آواز تھی۔ میں نے ہاتھ بڑھایا اور انگوٹھی ہاتھ میں آگئی۔

"آگئی؟" تعجب سے میرے منہ سے نکلا۔

"جی ہاں صاحب سچ مچ کی چاندی کی انگوٹھی اور اس میں وہ ہیرا لگا ہوا کہ کسی نے کبھی خواب میں نہ دیکھا ہو"

"اس کو دوسروں کو دکھانے کی اجازت تو نہ ہوگی؟"

"کیوں نہیں' بالکل اجازت تھی صاحب۔ ابا جان نے جوہریوں کو دکھائی۔ پچیس ہزار اور تیس ہزار کی آنکی گئی۔ کہا گیا کہ جانِ عالم کی بھی انگوٹھی اس تک نہیں پہنچتی۔ وہ والد پہنتے رہے اس کے بعد بھائی جان پہنے رہے۔ لوگ اسے دیکھنے آتے۔ میری انگلی میں رہی۔ غدر کے بہت بعد جب ہم سب لُٹ لٹا گئے اور کچھ پاس نہ رہا تو میں نے تیس ہزار کی ایک مہاراجہ کے ہاتھ بیچی۔ ان کے یہاں اب تک ہے"

"یہ سب سے زیادہ تعجب کی بات ہے"

"ارے آپ اسی پر تعجب کرتے ہیں۔ اب دنیا میں گناہ بہت بڑھ گئے ہیں۔ اس لئے جناتوں نے بھی اپنا تعلق توڑ دیا ہے ورنہ ہماری جماعت میں یہ بات بڑی عام تھی اور لال شہزادے تو گھر کے داماد تھے جو فرمائش کی جاتی پوری ہوتی"

"وہیں گومتی میں گھٹنے گھٹنے پانی میں کھڑے ہو کر؟"

"نہیں بعد میں یہ شرط بھی نہیں۔ صبح ہوتی دروازے کھلتے، ماشاء اللہ بیگم ادھر شاہ نشین میں اماں جان کے پاس آتی۔ ہم کمرے میں جاتے اور جو چیز مانگی ہوتی وہ وہاں رکھی ملتی۔ اور سنئے بھائی جان نے ایک دفعہ جاڑے میں اصلی سفیدہ آم مانگے۔ یہ ناممکن بات تھی مگر صبح کو وہ بھی رکھے ملے اور وہ مزے کے سفیدے کہ کیا کہوں ایسا مزہ تو کبھی ملا ہی نہیں۔ اماں جان کی تاکید تھی کہ داماد سے مانگنا بڑی سُبکی ہے اس لئے ہم لوگ زیادہ مانگتے نہیں تھے۔ یہ چیزیں بھی امتحاناً مانگی تھیں اور صاحب گھر میں جب کسی چیز کی ضرورت ہوتی جیسے مسندیں، تکئے گلدان، پردے وغیرہ وہ آجاتے۔ ایک دفعہ ابا جان نے کہا کہ یہ سب پردے پرانے ہوگئے۔ نئے کمخواب کے ہوتے۔ ادھر دن نئے کمخواب کے پردے ہر جگہ کے لئے کمرے میں رکھے ملے۔ امی جان کا چاندی کا پاندان پرانا ہوگیا تھا۔ کہا گیا جتنی خاصدان پیچ گیا تھا وہ سب نئے آگئے اور پہلے والوں سے وزن میں کم گئے اور صاحب کٹھیوں میں اناج غلہ جو بھرا جاتا تھا وہ ختم ہی نہیں ہوتا تھا گائے بھینسوں کا دودھ بڑھ گیا۔ بکریوں کے تین تین بچے ہونے لگے تھے گھوڑے بڑے چاق و چوبند ہو گئے تھے لال شہزادے کے سائے کا عجب اثر تھا۔ میاں آپ لوگوں سے بیان کرتا ہوں تو یقین نہیں کرتے۔ کیسے یقین آئے۔ اسی شیطانی دجالی دور نے دماغ کو چوپٹ کر دیئے ہیں۔ امی جان کہتی تھیں کہ صندوقچہ آپ سے آپ روپوں سے بھر جاتا ہے۔ لونڈیوں کے سرہانے تکیہ کے نیچے اشرفیاں نکلیں۔ کیا کیا بتاؤں پھر سات برس تک یہی ہوتا رہا ماشاء اللہ بیگم کوئی سولہ برس کی تھی" اور یہ کہہ کر ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور وہ ہاتھ سے آنسو پونچھنے لگے

پھر وہ قبر کے پاس آکر اس پر ہاتھ ٹیک کر فاتحہ پڑھنے لگے۔ اب وہ زار و قطار رو رہے تھے۔ رومال سے آنکھیں پونچھ کر بولے اچھا ہوا مر گئی۔ جانِ عالم ہی کے زمانے میں مر گئی ورنہ نہ معلوم کیا حال ہوتا اور آج کل کلجگ میں کیا معلوم کیسے جیتی۔ آنکھوں کے سامنے اس کا نقشہ آجاتا ہے جی تڑپنے لگتا ہے۔ مگر جو اللہ کی مرضی۔

میں تھوڑی دیر خاموش رہا۔ وہ قبر سے الگ ہو کر پھر اسی جگہ آکر بیٹھ گئے جہاں پہلے بیٹھے تھے۔ میں نے سوال کرنے کی جسارت کی "آخر ان کا انتقال کیسے ہوا"

انھوں نے افسردہ آواز میں کہا "اب کیا بتاؤں میاں۔ انگریزوں کا زمانہ اس معنے میں اچھا ہے کہ کوئی کسی سے زبردستی نہیں کرسکتا مگر اودھ غدر سے پہلے پولیس کا یہ انتظام نہ تھا۔ جس کا زور ہوا بس جو چاہا کر لیا۔ ماشاء اللہ بیگم کے حسن کا چرچا ہر بڑے گھر میں تھا۔ مشاطائیں مہریاں دوڑتی تھیں جب سے وہ بارہ برس کی ہوئی ہر روز ابا جان کے پاس پیغام آتے تھے وہ کہتے ابھی بچہ ہے ابھی اس کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی ابھی دائیاں منع کرتی ہیں یہاں تک کہ کہہ دیا کہ وہ عورت ہی نہیں ہے میاں اس کی شادی نہ ہو سکے گی۔ مگر لوگ کہاں ماننے والے تھے۔ چار برس تک دن رات

پیغام پر پیغام رقعے پر رقعے آتے رہے۔ ہم سب رد کرتے رہے مگر منہ سے یہ نہیں نکال سکے تھے کہ اس کی شادی لال شہزادے سے ہوگئی ہے ورنہ راندے جاتے۔ آخر کو شہزادے دارا قدر جو ایک کشتی سے اس کا حال پڑا سن کر عاشق ہو گئے تھے اس قدر ضد کی کہ کیا کہا جائے آخر میں دھمکی دی کہ گھر پر حملہ بول دیں گے اور اٹھا کر لڑکی کو لے جائیں گے۔ آج کل انگریزی حکومت میں ایرے غیرے شریف کیا چھوٹے سے چھوٹے آدمی کے ساتھ ایسا کرنا ممکن نہیں۔ بس ایک صورت تھی کہ جانِ عالم تک رسائی ہو مگر یہ معاملہ ایسا تھا کہ ان پر بھی اعتبار کرنا عبث تھا۔"

"لال شہزادے سے کوئی مدد نہ مانگی؟ آخر ان کا ہی معاملہ تھا۔"

"سنئے تو۔ ان سے ابا جان نے کہا۔ کوئی جواب نہ آیا۔ بار بار کہا کوئی جواب نہیں اور پھر ابا جان نے بھی تو غضب کیا ارے انتظار کرتے۔ دارا قدر کے سپاہیوں کو آنے تو دیتے مجھے تو یقین تھا کہ وہ سب دھوئیں کی طرح اڑ جاتے مگر ابا جان ڈر گئے اور کہہ بیٹھے " اس کی شادی لال شہزادے سے ہو چکی۔

"بس پھر کیا تھا۔ ماشاء اللہ بیگم کے سخت بخار چڑھا۔ ایسا سخت کہ جسم پر چنے ڈال دو تو بھن جائیں۔ کسی حکیم کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا ہوا۔ امی جان قلق سے بے بس ہو کر زمین پر گریں اور جانِ بحق تسلیم ہو گئیں۔ ماشاء اللہ بیگم سوتی کی سوتی رہ گئیں۔ اس کو یہاں لا کر دفن کیا۔ ابا جان نے سنگ سرخ کی قبر بنوائی مگر تھوڑے ہی دنوں میں وہ بھی مر گئے جانِ عالم کو انگریزوں نے قید کر کے کلکتے بھیج دیا۔ بھگدڑ پڑی دارا قدر نادار ہو گئے۔ ہمارا بھی سب کچھ لٹ گیا ہم دو بھائی رہ گئے بھائی جان بھی گزر گئے۔ میں اکیلا رہ گیا ہوں۔ بال بچے پوتے نواسے سب ہی ہیں۔ ماشاء اللہ گھر بھرا ہے۔ دو شعر ملتا ہے آرام ہے مگر جینے کو جی نہیں چاہتا۔ عمر ہے کہ شیطان کی آنت ہو گئی ہے۔ سانپ ہو گیا ہوں۔ خدا آنکھوں کے سامنے کھڑا ہو گیا اب کوئی ستر برس ہو گئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کل کی بات ہے۔ ماشاء اللہ بیگم اس قبر سے نکلی ہوئی سامنے دکھائی دیتی ہے۔ ویسی ہی لال جیسی لال شہزادے کے اس پر آنے کے وقت ہو جایا کرتی تھی۔

نواب صاحب پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے تھے اس لئے میں نے آگے کوئی سوال کرنا مناسب نہ سمجھا۔ ہم دونوں قبرستان سے چلے آئے۔ اب میرے لئے یہ قصہ نواب صاحب کے خیال کے ساتھ وابستہ ہو گیا تھا اور جب ایک دن پھر اطمینان سے لگے دن پھر ان سے ملا تو میں نے پوچھا " لال شہزادے والا قصہ روحانی اور مادی تعلقات کا کچھ ایسا قصہ ہے کہ میری سمجھ میں نہیں آتا "

وہ بگڑ کر بولے " قصہ۔ قصہ کیسا؟ یہ سب ان آنکھوں کا دیکھا واقعہ ہے آج کل کے آپ لوگ گھڑی ہوئی کہانی سمجھتے ہیں میرے لئے عین الیقین سے عین الیقین۔ اور رہا یہ کہ لال شہزادے غائب ہی رہے اور چیزیں سب ملتی رہیں۔ ماشاء اللہ بیگم کی روح لے گئے جسم چھوڑ گئے۔ تو میاں جنات لوگ ایسا ہی کرتے تھے۔ یہ یہ آپ لوگوں کے سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے۔ مشاہدہ محض مشاہدہ۔ میں نے آنکھوں دیکھی آپ بیتی آپ سے بیان کی "

نقوشِ داغ

جہاں استاد فصیح الملک داغ دہلوی کے دبستان سے متعلق شعراء حضرات کا ایک تذکرہ نقوشِ داغ کے نام سے مرتب کیا جا رہا ہے۔ جو شاگردانِ داغ کے شاگردوں اور آگے ان کے شاگردوں کے حالات اور نمونہ کلام پر مشتمل ہوگا۔ اس تذکرہ کی مجوزہ ضخامت تقریباً ۵۰۰ صفحات ہوگی۔ حالات اور نمونہ کلام کے ساتھ تصویر بھی شامل تذکرہ کی جائے گی۔ اس سلسلے میں متعدد حضرات سے مطلوبہ مواد فراہم ہو چکا ہے اور زیرِ کتابت ہے۔ خانوادۂ داغ سے نسبت رکھنے والے شعراء حضرات سے التماس ہے کہ اگر وہ اس تذکرہ میں شامل ہونے کے متمنی ہوں۔ تو درجِ ذیل پتہ پر خط لکھ کر تفصیلات طلب فرمائیں۔

ساحر ہوشیارپوری
۲۲۶۹ سیکٹر ۲۸ فرید آباد 121003

کیا آپ گلے کی تکلیفوں میں اکثر مبتلا رہتے ہیں اور اس کی وجہ سے سخت پریشان ہیں، لیکن یہ نہ سمجھئے کہ ایسی پریشان کن بیماری سے گلا کاٹ دینے سے ہی چھٹکارا مل سکتا ہے۔ ذرا ٹھہریئے! خالص دیسی ادویات سے تیار کیا ہوا "ٹونسلیکس" ایک بار، صرف ایک بار استعمال کر کے تو دیکھئے، پھر آپ کو گلے کے غدود بڑھ جانے، گلے کی سرسراہٹ، خراش، گلے کے ورم، زخم اور دوسرے تمام امراض کی شکایت نہیں رہے گی۔ اگر آپ کے علم میں کوئی ایسا مریض ہو جس کے گلے کے غدود (ٹانسلائٹس) کا آپریشن ہوتا ہے تو اسے اس دوا کے بارے میں ضرور بتائیے گا کیوں کہ پھر اسے آپریشن کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ چھوٹے بچے جو کھٹی میٹھی چیزیں کھا کر گلا خراب کر لیتے ہیں، اُن کے لئے بھی یہ بہت کام کی دوا ہے۔ گھر میں اس کا رہنا بہت ہی ضروری ہے۔

—— شرع (یونانی اینڈ آیورویدک) لیبارٹریز، لال کنواں۔ دہلی ۱۱۰۰۰۶

Phone: 275602
THE SHAN-E-HIND MONTHLY NEW DELHI-110002 Regd·No D-(DN) 353
Regd with the Registrar of Newspaper at R. No. 644/57 SEPTEMBER 1985

خرید کر پڑھئے:
مانگ کر پڑھئے:
یا پھر
چوری کر کے پڑھئے

یہ ہے ہی اتنا خوب صورت،
اتنا دل کش،
اتنا مکمل کہ اسے کسی طرح بھی
حاصل کریں کیوں کہ
یہ فیض کی شخصیت اور فن پر ایک
شان دار ادبی دستاویز ہے۔ اِس میں شامل ہیں:

قیمت: پندرہ روپے

★ خلوت اور جلوت کے بھید کھولنے والے ذاتی نقوش۔
★ نادر و نایاب تصویریں۔
★ سدابہار، ہزار رنگ و منتخب کلام۔
★ فیض کی شخصیت کے وہ ڈھکے چھپے گوشے جن پر سے پہلی بار پردہ اُٹھایا گیا ہے۔
★ ہندوستان، پاکستان، رُوس اور انگلستان کے دانش وروں کی مشترکہ کاوشوں کا گلدستہ۔

ساری اُردو دنیا میں شبستان کے "فیض نمبر" کا چرچا ہے

اس سے پہلے کہ اسٹاک ختم ہو جائے آج ہی اپنے قریبی نیوز ایجنٹ سے طلب کیجئے یا براہِ راست ہم سے منگوائیے۔

شبستان اردو ڈائجسٹ آصف علی روڈ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

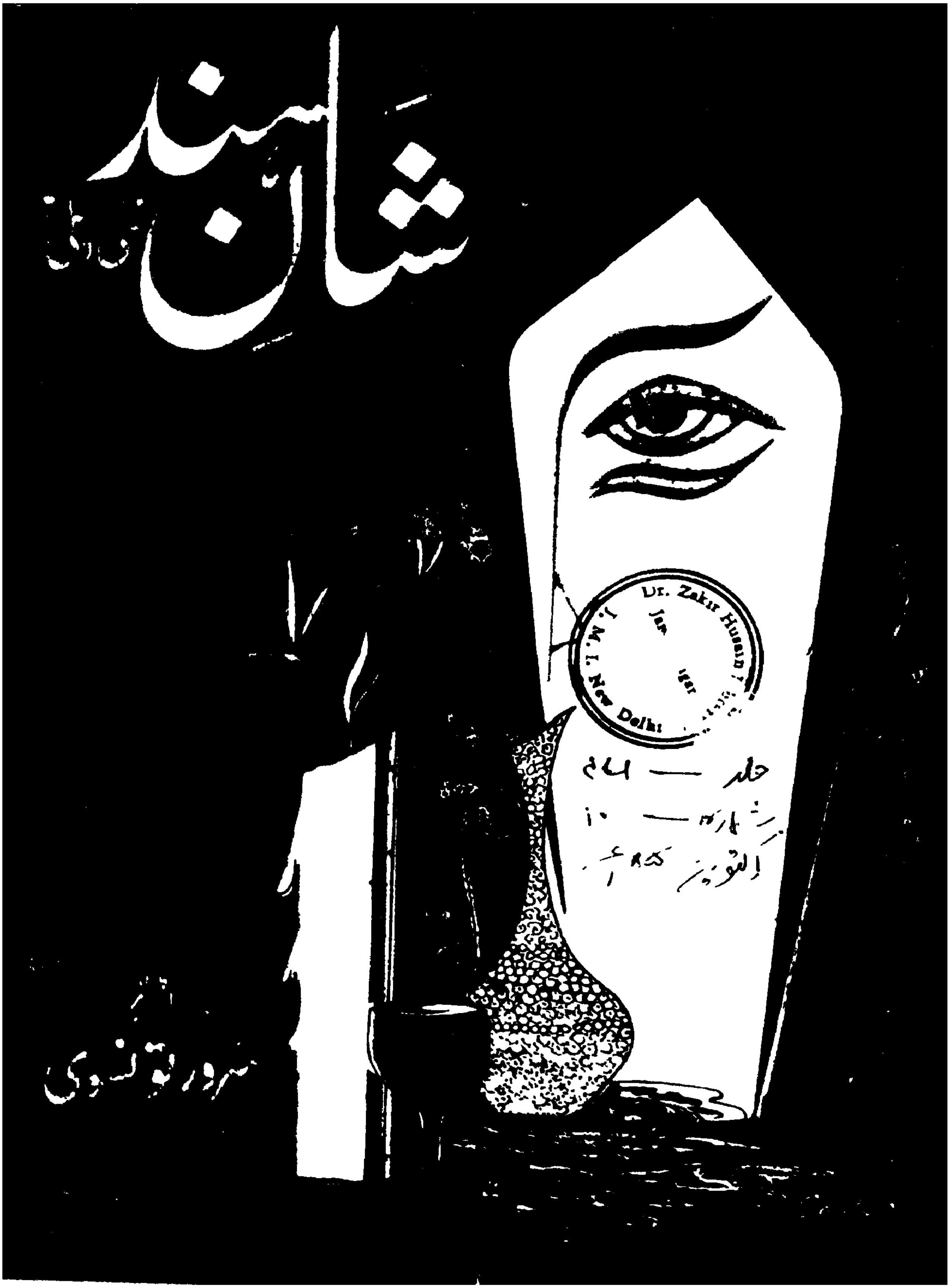

شانِ ہند
نئی دہلی
سرور تونسوی
Dr. Zakir Husain
J.M.I. New Delhi
شمارہ — ۱۰

ٹیلیفون: ۲۶۵۰۲۳ رجسٹرڈ آفس نیوز پیپر فار انڈیا کا رجسٹریشن نمبر ۵/۴۴/۶ رجسٹرڈ نمبر ڈی (ڈی این) ۱۳۳

ہندو پرست ہوں نہ مسلماں پرست ہوں
دامن پرست ہوں نہ گریباں پرست ہوں

ہر ذرۂ وطن سے ہے فیاضؔ مجھ کو پیار
یعنی وطن پرست ہوں انسان پرست ہوں
فیاض گوالیاری

ماہنامہ

شانِ ہند نئی دہلی

ایڈیٹر
سرور تونسوی

فی پرچہ: ۲/۵۰ روپے
زر سالانہ: ۲۴/- روپے

جلد ۲۶ — اکتوبر ۱۹۸۵ء — شمارہ ۱۰

مرحومہ وزیر اعظم

شریمتی اندرا گاندھی

کی یاد میں

اُن کے پہلے یوم شہادت پر

ادارہ شانِ ہند

اپنی دلی عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے ہزاروں سلام

پیش کرتا ہے

ودیا پرکاش سرور تونسوی ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے خواجہ پریس چتلی قبر مٹکو جامع مسجد دہلی سے چھپوا کر دفتر شانِ ہند قطب گنج انصاری مارکیٹ دریا گنج دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا۔

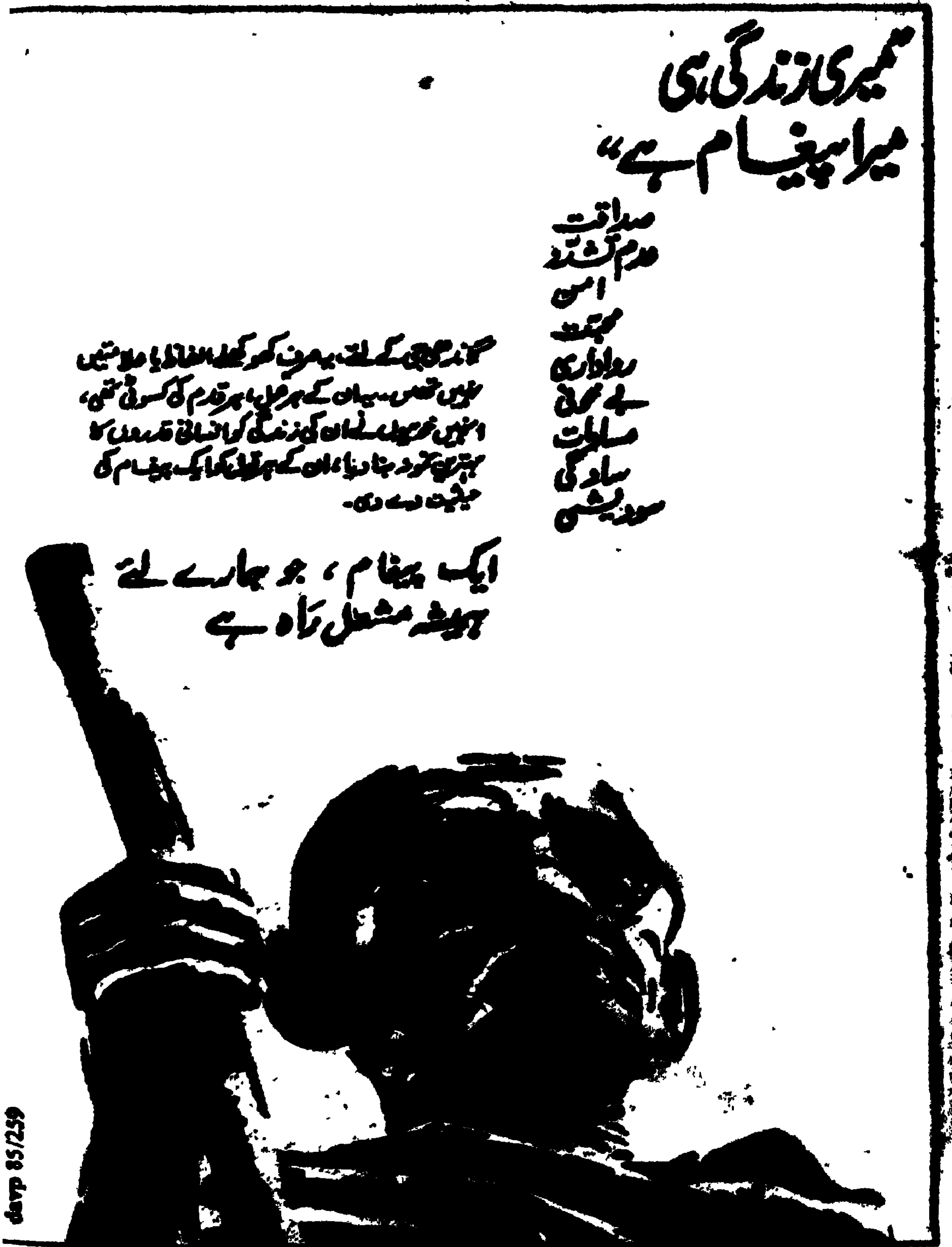
"میری زندگی ہی
میرا پیغام ہے"
صداقت
عدم تشدد
امن
محبت
رواداری
بے خوفی
مساوات
سادگی
سودیشی
ایک پیغام، جو ہمارے لئے
ہمیشہ مشعل راہ ہے
davp 85/259

بلبل چہ گفت؟ گل چہ شنید؟ و صبا چہ کرد؟

اردو رابطہ کمیٹی "بدست اطفال"

اردو رابطہ کمیٹی کے چیرمین رام لعل صاحب تین دن ہوئے ماسکو سے تشریف لائے ہیں۔ دفتر شان ہند میں پ کی تشریف آوری پر جب انھوں نے اردو رابطہ کمیٹی کی علامتی بھوک ہڑتال ۱۱ اکتوبر ([illegible]) کے بارے میں راقم الحروف راسے دریافت فرمائی تو انھیں بتادیا گیا کہ یہ علامتی بھوک ہڑتال جو بظاہر کامیاب نظر آرہی تھی در اصل ناکام تھی ور اس کی وجوہات حسب ذیل تھیں۔

۱۔ اردو رابطہ کمیٹی کے نائب صدر اور کنوینر ردولوی صاحب دلی میں کئی دن تک ڈیرا ڈالے رہے مگر انھوں نے اپنا دائرہ ں محض مسلمانوں جماعتوں تک ہی محدود رکھا۔ اور ماسوائے روزنامہ "قومی آواز" کے انھوں نے ایسے خالص مسلم خیالات کی سرپرستی میں رہنا پسند کیا جو مسلمانوں کو مذہب کی افیون پلاکر ان کی جیبیں خالی کرنے میں ماہر ہیں۔

۲۔ علامتی بھوک ہڑتال کے لئے مولانا ابوالکلام آزاد کے مزار کی بجائے مہاتما گاندھی کی سمادھی موزوں اور بہتر تھی۔ کیونکہ مولانا آزاد نے اردو کے حق میں ایک جملہ کہنے کے علاوہ اردو کے لئے کیا ہی کیا تھا؟ حالانکہ وہ خود مختار وزیر تعلیم تھے۔ پنڈت جواہرلال نہرو پر ان کا اثر تھا اور حکومت ان کی رائے کی قدر کرتی تھی مگر انھوں نے اردو کے لئے کچھ نہ کیا۔ اگر یہ کہا جائے کہ مولانا آزاد کی بہ نسبت بہار کے سابق چیف منسٹر جگن ناتھ صاحب نے اردو کے لئے کچھ تو کیا اور بہار کے کچھ اضلاع میں اسے بہار کی دوسری سرکاری زبان قرار دے دیا) اور مہاتما گاندھی نے اردو کے لئے ہمیشہ ہی حقیقت رویہ اپنایا ان کی ہندوستانی ایک طرح سے اردو ہی تھی۔ اور پھر بھوک ہڑتال کا جو تاثر مہاتما گاندھی کے نام سے پیدا ہوتا ہے وہ مولانا آزاد کے نام کے ساتھ بے اثر ہو کر رہ جاتا ہے

۳۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بارش نے سارا پروگرام تحس نحس کر کے رکھ دیا مگر اس میں دو رائیں نہیں ہو سکیں کہ انتظام نہایت ہی خراب تھا اور ہر کوئی اپنے آپ کو اس علامتی بھوک ہڑتال کا روح رواں سمجھتا تھا اور جو جس کے دل میں آتا تھا وہ بغیر سوچے سمجھے زبان سے نکال دیتا تھا۔ گیسو دراز مخدوم زادہ مختار رشتانی جناب خواجہ حسن نظامی ثانی سے [illegible] تقریب کے کاغذ پر دستخط کرانے پہنچے اور خواجہ صاحب دستخط فرما ہی رہے تھے کہ اسٹیج سے آوازیں آنی شروع ہوئیں۔ انھیں نکال دو انھیں نکال دو۔ خواجہ صاحب نے مختار رشتانی صاحب سے پوچھا بھئی یہ کسے نکالنے کے لئے کہا جا رہا ہے تو انھوں نے بتلا کر گلزار دہلوی اور کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کے لئے یہ کہا جا رہا ہے۔ خواجہ صاحب نے قلم وہیں رکھ دیا اور [illegible] رہ گئے۔ یہ آوازیں لگانے والوں سے کون کہے کہ عزیزو تم جب پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ تب سے گلزار دہلوی اور کنور مہندر سنگھ بیدی سحر اردو کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے ہوئے ہیں۔ اور اگر دہلی میں اردو کی کسی بھی تقریب سے گلزار دہلوی اور کنور مہندر سنگھ بیدی صاحب موصوف کا نام نکال دیا جائے تو پھر باقی کیا رہے گا؟

۴۔ اردو رابطہ کمیٹی کے نائب صدر جناب ملک زادہ منظور احمد صاحب نے اپنی افتتاحی تقریر میں روزنامہ "قومی آواز" کا نام تک نہ لیا بلکہ صرف ایسے خیالات کا نام لیا جو قومی آواز کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے اور حقیقت یہ ہے کہ اردو رابطہ

کمیٹی کا ذکر جس قدر قومی آواز نے کیا اتنا کسی دوسرے اخبار نے ایسا نہیں کیا۔ ملک زادہ صاحب کی اس خوشگوار اختتامی تقریر کو دو دوستوں نے محسوس کیا۔
۵۔ تقریر کرنے والوں میں سے اکثر ایسے اصحاب تھے جنھیں شاید پہلی بار تقریر کرنے کا موقع ملا تھا۔ لہٰذا انھوں نے جذباتی انداز میں اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کے مسئلہ کو خالص اسلامی قرار دیتے ہوئے جو ان کے منہ میں آیا بولتے رہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ لکھنؤ کے عاطف صاحب علی گڑھ کے حیرت بن واحد۔ جناب آحر ہوشیار پوری اور دیگر ایک دو حضرات کی تقاریر قابل تعریف تھیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ۱۶ اکتوبر کو سارا دن بارش ہوتی رہی۔ اور پنڈال کی یہ حالت تھی کہ اوپر سے شامیانے بری طرح ٹپک رہے تھے۔ اور نیچے میدان میں چھ چھ انچ پانی کھڑا تھا۔ مگر ایسی حالت میں سارا دن اردو کے شیدائی اُس جلسے میں اور کسی بھی وقت پانچ چھ سو سے کم کی تعداد میں حاضرین نہیں رہے ہوں گے۔ جناب غلام ربانی تاباں صاحب نے علامتی بھوک ہڑتال میں شرکت فرمائی اور جناب رحمٰن نیر صاحب ایڈیٹر و مالک بیسویں صدی و روبی نے دلی اردو اکادمی کی ممبری سے استعفیٰ دے کر اس تقریب کو چار چاند لگا دیئے تھی۔ مگر یہ کہنے میں باک نہیں کہ در حقیقت یہ ساری تقریب بدست طفلاں رہی۔ کاش کہ اسے مناسب اور منظم ڈھنگ سے منایا جاتا۔ اور پھر دس بجے تک اچھی طرح سے پیٹ بھر کر شام کے پانچ بجے تک علامتی ہڑتال محض بھوک ہڑتال کا منہ چڑانے والی بات تھی۔ اور اگر انگریزی اور ہندی پریس نے خصوصاً اور اردو پریس نے عموماً اس تحریک کا ساتھ نہیں دیا تو اس میں بھی اردو رابطہ کمیٹی کے کارکنان کا قصور ہے۔ انھیں چاہئے تھا کہ ۵ اکتوبر کو پریس کانفرنس بلائی جاتی اور اس علامتی بھوک ہڑتال کی غرض و غایت پر روشنی ڈالی جاتی۔ مگر نہ معلوم اس کی ضرورت کیوں نہ سمجھی گئی۔ اب چونکہ اردو رابطہ کمیٹی کے صدر جناب رام لال صاحب یورپ کے دورہ سے واپس آگئے ہیں اس لئے امید کی جا سکتی ہے کہ وہ اس تحریک کو سنجیدگی سے جاری رکھیں گے۔

"قومی آواز کے قلم تراش صاحب اپنی پگڑی سنبھالئے"

روزنامہ قومی آواز کے شمارہ ۱۵ اکتوبر ۱۹۸۸ء کے صفحہ ۶ پر قلم تراش نے بات نکلے گی تو پھر... عنوان کے زیر تحت راجہ صاحب کے کسی گمنام اور غیر معروف ماہنامہ کا جس بھونڈے پن سے ذکر کیا ہے وہ چغلی کھا رہا ہے کہ قلم تراش نے اس گمنام اور غیر معروف ماہنامہ کی مذمت کے پردے میں اپنی کم علمی۔ جاہلیت اور گنوار پن کو چھپانے کی ناکام کوشش کی ہے۔ اگر یہ ماہنامہ اتنا ہی غیر معروف اور گمنام تھا تو پھر قلم تراش نے قومی آواز ایسے مشہور و معروف اور نیک نام روزنامہ میں اس کا تذکرہ کرنے کی بھیک کیوں مانگی؟

قلم تراش کو شاید یہ معلوم نہیں کہ یہ گمنام اور غیر معروف ماہنامہ اس وقت سے مشہور و معروف ہے۔ جب کہ قلم تراش کئی برس بعد وجود میں آئے۔ اس گمنام اور غیر معروف ماہنامہ نے نہ معلوم آپ ایسے کتنے غبی اور نا اہل صحافیوں کو صحافت کے نفلی معنوں سے روشناس کرایا۔

قلم تراش صاحب آپ نے اپنے اسی نام نہاد مزاحیہ شذرہ میں جس طرح طنز و مزاح کا منہ چڑایا ہے وہ قومی آواز ایسے بلند مقام روزنامہ کے معیار کا حامل نہیں ہے۔

اور مزید یہ کہ کسی ادبی موضوع پر کچھ کہنا آپ کے بس کی بات نہیں ہے۔ آپ نے اپنے مزاحیہ شذرہ میں پگڑی اپنی سنبھالئے گا کو غیر ادبی انداز میں [illegible] ہے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کا ادبی شعور [illegible] ہے [illegible]

رع بتایا ہے - جو صریحاً غلط ہے - معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے کبھی کلیاتِ میرؔ کی ورق گردانی بھی نہیں کی ہوگی مطالعہ تو
تو دور کی بات ہے کیا آپ یا "قومی آواز" ادارے کا کوئی اور باذوق رکن کلیاتِ میرؔ سے اس مصرع کا حوالہ دے سکتے ہیں -
دراصل یہ مصرع سرے سے میرؔ کا ہے ہی نہیں - یہ دراصل بقاؔ اللہ خان بقاؔ کا مصرع ہے جو میرؔ کے خلاف لکھا گیا تھا - آپ کی
تفنیت کے لئے یہ عرض کر دیا جائے کہ یہ مصرع ایک قطعہ میں آیا ہے جو درج ذیل ہے:-

توبۂ زاہد کی توبہ تلی ہے
چلتے بیٹھتے تو شیخ چلی ہے
پگڑی اپنی سنبھالئے گا میرؔ
اور بستی نہیں یہ دلی ہے

اگر آپ کو مزید ثبوت درکار ہے تو "آبِ حیات" مطبوعہ لاہور ۱۹۵۰ء کے صفحہ ۲۲۰ پر اس قطعہ کو ملاحظہ فرما کر اپنی مبانی
دفن کر سکتے ہیں اور پھر خدا لگتی کہئے کہ آپ کی اپنی ہی ڈیڑھ آنکھ ہے کسی دوسرے کی نہیں
آپ کی اس حماقت کا تذکرہ ہم نے ایک مراسلہ بعنوان قلم تراش صاحب اپنی پگڑی سنبھالئے" قومی آواز میں اشاعت
کے لئے بھجوایا تھا اور یہ مراسلہ نورجہاں صاحبہ ثروت کے ہاتھ میں دیا گیا تھا - مگر قومی آواز" ایسے مشہور و معروف
روزنامہ کا اعلیٰ صحافتی معیار یہ کہاں گوارا کر سکتا ہے کہ قلم تراش ایسے کم علم و جاہل عشق کی ... نے: ایسا مراسلہ
اشاعت پذیر ہو -

دلی اُردو اکاڈمی کی حاتم طائی کی قبر پر ......

دلی اُردو اکاڈمی اپنی کارکردگی کی بعض کارروائیوں کو اس طرح پردہ راز میں رکھتی ہے جیسے اُس نے کوئی گناہ
کیا ہو اور جس کی تشہیر سے اسے ذہنی کوفت ہونے کا اندیشہ ہو - ماہنامہ "شاعر" بمبئی کے حالیہ شمارہ میں اعلان کیا
گیا ہے کہ دہلی اُردو اکاڈمی نے ماہنامہ شاعر کی تاریخ ساز ادبی اور صحافتی خدمات کو سراہتے ہوئے دو ہزار روپے کی خصوصی
گرانٹ دی ہے -
اُردو اکاڈمی کا یہ اقدام ایسا نہیں تھا کہ جس کی پریس ریلیز جاری کرنے میں اُسے کسی مخالفت کا اندیشہ تھا یا اُس سے
کسی بازپرس کی اُمید کی جاسکتی تھی - کیونکہ اُسے دلی حکومت نے جو تیس لاکھ روپیہ کی گرانٹ دی ہے وہ دی ہی اسی لئے گئی ہے
یہ ایک اچھا اقدام تھا اس لئے اُس کی کوئی اطلاع دفتر اکاڈمی سے جاری نہیں کی گئی - جبکہ پورن سنگھ ہنر ایسے غیر شاعر اور مطرب
نما ایک ... ایسے اوسط درجہ کے شاعر کو مہمانِ خصوصی کے طور پر امرتسر اور لکھنؤ سے مدعو کر کے اُن کی عزت افزائی کے لئے
اکاڈمی کی قابل ذکر رقم ضائع کر دی گئی اور اس تقریب پر جو دعوت نامے جاری کئے گئے محض اُن پر ہی ایک ہزار سے زائد روپیہ
خرچ ہوا -
مزید شاعر راجد صافی میں یہ نفس نفیس اکاڈمی کے مقرر کردہ ممبران اور دیگر افراد سے مل کر اور کئی سفارشیں کرانے کے بعد
یہ گرانٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکے - اس سلسلے میں ہمیں ایک واقعہ یاد آرہا ہے وہ یوں کہ پٹیالہ کے مشہور سابق مہاراجہ
بُرومن سنگھ آنجہانی اپنے اے - ڈی سی کے ساتھ ایک شام کو سیر کے لئے نکلے تو راہ میں سڑک کے کنارے ایک سیخ
کباب بیچنے والے سے پیٹ بھر کے سیخ کباب کھائے - مہاراجہ کے اے ڈی سی پانچ روپے کا نوٹ کبابی کو دینے لگے
تو مہاراجہ صاحب نے پنجابی میں ایک موٹی سی گالی دیتے ہوئے کہا کہ اگر تمہیں اپنا نہیں تو ہم اور ہماری
عزت کا تو خیال کیا ہوتا اور مزید گالیاں دیتے ہوئے حکم دیا کہ کبابی کو پانچ صد روپیہ دیا جائے - ہم پنجابی کی موٹی گالی
لکھ کر مہاراجہ کے اے - ڈی سی کی نذر کرتے ہوئے یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ اگر دلی اُردو اکاڈمی کے متعلقہ ارباب کو

اتنی جرأت کا خیال نہیں تھا کہ کم از کم ماہانہ مشاعرہ کی تاریخ ساز [illegible] علمی و ادبی اور ثقافتی خدمات کا تو لحاظ رکھا ہوتا اور کم از کم دس ہزار روپیہ گرانٹ [illegible] جاتی۔ دو ہزار سے تو مشاعرہ کا ایک شمارہ بھی نہیں چھپ سکتا جب کہ اکادمی کے ایک ممبر جناب ڈاکٹر کامل قریشی صاحب ایک ماہ میں ہی بطور شاعر۔ ایکٹر، تمثیل نگار اور ناظم [illegible] روپیہ تا [illegible] وصول کرچکے ہیں۔

جناب سکریٹری اردو اکادمی دلی سے مودبانہ گذارش ہے کہ جہاں وہ اکادمی کی دیگر کارروائیوں کے بارے میں پریس ریلیز جاری کرتے ہیں۔ اسی طرح ایسے اچھے اقدامات کے بارے میں بھی پریس ریلیز جاری کیا کریں۔ چاہے یہ اچھے اقدام محض حاتم کی قبر پر لات مارنے کے مترادف ہی کیوں نہ ہوں۔

بابا ہرودت سنگھ بیدی کا انتقال

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کے [illegible] بزرگوار بابا ہرودت سنگھ جی بیدی ۱۵ ر اکتوبر کو رات کے پونے دس بجے اپنے صاحبزادے کنور [illegible] سنگھ صاحب [illegible] کی رہائش گاہ پر چنڈی گڑھ میں انتقال فرما گئے۔ بابا جی نے ایک سو دو سال عمر پائی اور اس عمر میں بھی وہ ہشاش بشاش اور تندرست تھے، [illegible] اپنے روزمرہ کے فرائض خوش اسلوبی سے ادا فرماتے تھے۔

مدیر شان ہند بابا جی کے فرزندان ارجمند عالیجناب کنور جگجیت سنگھ جی بیدی، کنور مہندر سنگھ صاحب سحر بیدی، کنور سریندر سنگھ جی بیدی اور کنور [illegible] سنگھ جی بیدی کے اس صدمہ میں برابر کا شریک ہے اور دعا گو ہے کہ واہگورو جی بابا جی کی آتما کو شانتی بخشیں اور انھیں اپنے چرنوں میں جگہ دیں۔

"قومی آواز" بھگوان شری رام کی توہین کا مرتکب

پہلے یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔

"قومی آواز" مورخہ ۱۵ ر اکتوبر صفحہ ۵ "بات نکلے گی تو پھر" کے عنوان کے تحت قلم تراش فرماتے ہیں "مشاعرے کے نواب شاعروں سے زیادہ رام لیلا کے اداکار نظر آرہے تھے۔"

قومی آواز ۲۲ ر اکتوبر۔ مراسلہ بعنوان تمثیلی مشاعرہ از شوکت مریم۔ ۵/۳۔ گووند کھنڈ۔ وشوکرما نگر۔ شاہدرہ دہلی
"ایک کمی ہو تو گنواؤں یہاں تو کمیوں اور کمزوریوں کا ایک ضخیم مجموعہ ہے۔ کرداروں کے ملبوسات کو دیکھ کر رام لیلا اور نوٹنکی کے کردار یاد آگئے۔"

قومی آواز ۱۷ ر اکتوبر۔ صفحہ ۳۔ مراسلہ بعنوان تمثیلی مشاعرہ از تسلیم الدین۔ ۵/۳۔ جعفر آباد شاہدرہ۔
اس تمثیلی مشاعرے میں جو لباس شعراء حضرات کو پہنائے گئے ہیں۔ ان کو دیکھ کر گمان ہوتا ہے کہ رام لیلا یا نوٹنکی والوں سے کام چلانے کے لئے ادھار لئے گئے۔

حال ہی میں اردو اکادمی دلی کے تحت ایک تمثیلی مشاعرہ ہوا ہے۔ یہ مراسلے اور جناب قلم تراش کا مضمون اس تمثیلی مشاعرہ کے خلاف اظہار ناپسندیدگی کے طور پر قومی آواز میں شائع ہوئے ہیں۔

"رام لیلا" کا جس انداز میں مذاق اڑایا گیا ہے وہ ہر ہندو کے لئے باعث توہین ہے۔ کیونکہ رام لیلا بھگوان رام کی چودہ سالہ بن باس کی وہ غیر فانی داستان ہے جو ہر ہندو کا ایمان ہے اور مذہبی طور پر بھگوان رام کو ایشور کا اوتار [illegible] والوں کے لئے یہ یقیناً ناقابل برداشت ہے۔

غیرت تو یہ ہے کہ قومی آواز جسے ہندو حلقوں میں ایک گمنام روزنامے کی حیثیت رکھتا ہے اور اگر راقم الحروف ایسے دس پانچ غیر مسلموں کے ہندوؤں سے یہ اخبار گزرتا بھی ہے تو وہ اسے اس لئے اہمیت نہیں دیتے کہ یہ محض قلم تراشی ایسے کچھ ناسمجھ اردو داں متعصب ہندو اور بعض مسلم نوجوانوں کی کمینہ حرکت ہے لہٰذا اسے درگزر ہی کر دیا جائے تو بہتر ہے۔ مگر ہر دوسرے تیسرے سال رام لیلا کو نوٹنکی کے ہم پلہ لکھ کر اس طرح سے "رام لیلا" کی توہین کرنا کہاں کی انسانیت ہے۔ رام لیلا بھگوان رام سے متعلق نام کہتا ہے اور نوٹنکی محض حسن و عشق کی داستانوں پر ہی مشتمل ہوتی ہے۔ روزنامہ قومی آواز جو سیکولرازم کا دعوے دار اور قومی یکجہتی کا علمبردار ہونے کا دم بھرتا ہے اس کی نظر میں رام لیلا اور نوٹنکی ایک ہی چیز ہیں۔ حالانکہ رام لیلا کروڑوں ہندوؤں کا ایک ایسا دھارمک اتسو ہے جو ہزاروں سالوں سے منایا جا رہا ہے۔ شری رام ہندوؤں کے لئے ایشور کا اوتار ہیں۔ اور رام لیلا انھیں سے متعلق ایک ایسا حقیقی اور ناقابل تردید مذہبی فریضہ ہے جو کروڑوں ہندوؤں کے لئے راحت جاں ہے۔

قومی آواز کے آئینی سربراہ جناب یشپال کپور ایک ایسی اعلیٰ کھتری گوت کے رکن ہیں جنھیں "ڈھائی گھرا" کہا جاتا ہے کیا وہ ایمان سے کہہ سکتے ہیں کہ رام لیلا کو نوٹنکی کا ہم پلہ بتایا جانا رام لیلا۔ بلکہ شری رام چندر جی کی توہین نہیں ہے۔ اور اگر واقعی یہ رام لیلا۔ شری رام چندر جی اور کروڑہا ہندوؤں کے مذہبی جذبات کی توہین ہے تو پھر قومی آواز کا یہ دعوے کہ وہ سیکولرزم اور قومی یکجہتی کا علمبردار ہے قطعاً جھوٹ اور فریب ہے بلکہ وہ ہندوؤں کی اور ساتھ ہی ایشور اوتار شری رام چندر جی مہاراج کی توہین کا مرتکب ہو کر محض مسلمانوں کو خوش کر کے اپنی اشاعت کی توسیع کے لئے کوشاں ہے۔ اور ہندوؤں کو کانگریس سے متنفر کرنے کی ایک کوشش۔ کیونکہ قومی آواز کو کانگریس کا بھی اخبار کہا جاتا ہے۔

ہم جناب یشپال کپور سے درخواست کریں گے۔ کہ وہ قومی آواز کو مذہبی طور پر متنازعہ اخبار نہ بنائیں یعنی اپنے عملہ کو نصیحت کریں کہ وہ مذہبی رواداری کا خاص خیال رکھیں اور عملہ کے دو ایک حضرات اپنی ذاتی دشمنی کے تحت "قومی آواز" کو ڈھال نہ بنائیں۔ اور ان ناتجربہ کار صحافیوں کو سمجھائیں کہ اگر انھوں نے جھک ماری ہی تھی تو رام لیلا کی جگہ "اندر سبھا" لکھ دیا ہوتا۔

ڈاکٹر ہیرا لال چوپڑہ کو صدمہ

پچھلے دنوں مشہور دانشور ڈاکٹر ہیرا لال چوپڑہ کی اہلیہ محترمہ شریمتی راج کماری کا انتقال کلکتہ میں ان کے صاحبزادے کی رہائش گاہ پر ہوا۔ گزشتہ ۵۳ سالوں میں چوپڑہ صاحب کی تمام علمی، ادبی، سماجی مصروفیتوں اور کامیابیوں میں مرحومہ کا تعاون نہ صرف معین و مددگار رہا تھا بلکہ حصہ دار بھی تھا۔ ان کو ادب میں گہرا شغف تھا۔ شان ہند کے مطالعہ نے ان کو مشاعروں کا شیدا اور مشتاق بنا دیا تھا۔ غیر مسلم خواتین میں اردو ادب کے مطالعہ کا جو ذوق و شوق مرحومہ کو تھا ویسا کم ہی خواتین میں دیکھنے میں آتا ہے۔

گزشتہ نصف صدی سے راقم کے برادرانہ تعلقات چوپڑہ فیملی سے ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ایک شفیق اور ہمدرد بہن کا سایہ سر سے اٹھ گیا ہے۔

چوپڑہ صاحب، ان کے دونوں صاحبزادگان اور صاحبزادی نیز جملہ متعلقین سے اس صدمہ میں ہم برابر کے شریک ہیں اور دعا ہے کہ سرشتی مان پرماتما مرحومہ کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

ضروری اعلان

جو حضرات اپنا مجموعہ کلام یا افسانوں کا مجموعہ شائع کرانا چاہتے ہوں وہ دفتر شان ہند سے مراسلت فرمائیں۔ مجموعہ انتہائی دلکش شائع کیا جائے گا اور دیگر کئی ایسی سہولیات مصنفین کو بہم پہنچائی جاتی ہیں جو کسی دوسرے ادارے کے بس کا روگ نہیں ہیں۔ تفصیلات کے لئے جوابی لفافہ بھجوائیے۔ (ادارہ)

اپنے اسٹیشن کو صاف رکھئے

- اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ صاف ستھرا ماحول ایک طرف کسی شخص کے کردار کا آئینہ ہوتا ہے اور دوسری طرف اس کردار کو نکھارتا ہے۔ صاف ستھرا گردوپیش خوشی اور مسرت بکھیرتا رہتا ہے۔
- ہم اپنے گھر صاف ستھرے رکھتے ہیں تو پھر ان جگہوں کو صاف و شفاف کیوں نہ رکھیں جنھیں ہم سب استعمال کرتے ہیں۔
- ریلوے پلیٹ فارموں، ویٹنگ روموں، سواری ڈبوں اور درحقیقت ان تمام جگہوں کو جہاں بڑی تعداد میں لوگ اکٹھے ہوتے ہیں گردوپیش کو صاف شفاف رکھنا بہت ہی ضروری ہے۔

ریلوے نے صفائی مہم شروع کی ہے جس کے بہت اچھے نتائج نکلے ہیں اب ریلوے صاف ستھرے نظر آتے ہیں لیکن ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس سلسلے میں بھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ ہم زیادہ صفائی کے لئے اپنی کوششوں کا سلسلہ جاری رکھیں گے۔

آپ بھی اس سلسلے میں ریلوے کی مدد کر سکتے ہیں آپ صرف اتنا ہی خیال رکھیں کہ آپ کے آس پاس کی جگہ بالکل صاف و شفاف حالت میں رہے۔ اس طرح اسٹیشن اور منسلکہ مقامات صاف ستھرے رہ سکتے ہیں اور ہاں آپ ریلوے صفائی عملہ کے کارکنوں کی خدمات سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ وہ صرف آپ کی خدمت کے لئے ہی رکھے گئے ہیں۔

آپ بھی ذرا خیال رکھئے کہ کوڑا کرکٹ آپ کے ہاتھ سے ادھر ادھر نہ بکھرنے پائے بلکہ کوڑا دان میں پھینکا جائے۔ آپ کا یہ معمولی سا کام ہمیں آپ کی بہتر خدمات کرنے میں کافی مدد دیتا ہے۔

ریلوے آپ کی پراپرٹی ہے اسے صاف شفاف رکھئے

ناردن ریلوے

اور دھرتی کانپ اٹھی

قسط ۸

انعم حسین ... ایڈوکیٹ (کشن گنج)

"ہاں ہاں بھابھی ہرگز ایسا ظلم نہ کرنا پتاجی سن پائیں گے تو پھر اپنی شامت ہی آجائے گی۔"

"انہیں تو منوہر سے خواہ مخواہ کا بیر ہے بھلا ایسا لڑکا کہیں اور مل سکتا ہے دوڑے دوڑے گئے ہیں پٹنہ ہو کر واپس آئیں تو منہ دل نے پایا ہے کہ کر اس رشتے کو توڑ دوں گی گھنٹوں لڑکا رہتے باہر مارے مارے پھرا ... آیا۔"

"انھیں تو دولت مند گھرانا چاہیئے،" دبی زبان ... نے احتجاج کیا۔

منوہر بالکل قلاش ہے؟ وکیل بن کر آئے گا تو ... نہیں سنے روپے گھر میں؟"

"بھابھی کیوں خواہ مخواہ مجھے چھیڑتی ہے بھیا اور پتاجی جہاں چاہیں وہیں مجھے جانا ہوگا۔"

"نہیں میرا اچھا ل جا سکتی نہیں یہ شادی ہو کی۔"

ارے کی بھابھی، وہاں نہ چلی کبھی میرا کے دل میں دو متضاد خیال ٹکرائے پتاجی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے مظفرپور بھیجا جایا - بھیا نے دوسرا ہاتھ تھام لیا - سامنے منوہر کا حسین مکھڑا مسکرا رہا تھا میرا شرما گئی اس نے تکیے میں اپنا سر چھپا لیا جذبات انگڑائیاں لینے لگے آنکھیں منوہر کی آنکھوں میں جاکر گھوم رہی تھی دل اس کے دل کی طرف تیزی سے دوڑتا چلا جارہا تھا۔

"بڑی دیر لگا دی سرکار آپ نے"

"ہاں دیر تو ہوئی پٹنہ سے مظفرپور اور مظفرپور سے موتیہاری جانا پڑا۔"

"مگر بات تو طے ... "

... زبان پوچھا

"ہاں تھوڑا ادھوری۔"

"بابوجی! بڑا ... طرح ہو۔"

منگلو کشن لال کا بہت پرانا نوکر تھا ... اکو اس نے گود میں کھلایا تھا میرا اس سے ... منگلو ... اپنی بیٹی سے کم نہیں سمجھتا تھا گھر باہر اس کی پوزیشن بالکل ... جیسی تھی اگرچہ منگلو کشن لال کا نوکر تھا مگر برتاؤ نوکروں جیسا نہ تھا ہر طرح کا آرام منگلو کو میسر تھا منگلو نے بھی اپنی وفاداری کی حد کر دی تھی وہ کون سا راز تھا جو منگلو پر ظاہر نہیں وہ کون سی حرکت تھی جو منگلو کے بغیر کشن لال عمل میں لاتے ... رشتہ نوکر اور مالک کا ضرور تھا مگر تعلق دوستی کا تھا دونوں ایک دوسرے کی ... کرتے ... کشن لال کو اگر کوئی بڑی مہم سر کرنی ہوتی تھی تو منگلو سے ... کئے بغیر وہ ایک قدم آگے نہ بڑھاتے ... خطرناک سے خطرناک کام منگلو ہی انجام دیا کرتا اگرچہ ... پچپن سال کی تھی مگر وہ ہر روز کشتی لڑتا اور ... نوجوانوں کو لڑاتا تھا۔ گاؤں کا کوئی آدمی اس سے پنجہ ملانے کی ہمت نہیں کرتا تھا ہاں ... دلاور خاں تھا جسے منگلو بہادر اور جانباز سمجھتا تھا اس کے مقابلے میں اگر کوئی شخص آسکتا تھا تو وہ تھا صرف دلاور خاں - میاں حسین کا برق انداز۔

دوپہر سے منگلو گوپال گنج اسٹیشن بیل گاڑی لے کر جاتا اور دن بھر ... کو دیکھ کر واپس آجاتا تھا آج دو بجے والی ٹرین سے کشن لال اترے اور سامنے اپنی گاڑی دیکھ کر بہت خوش ہوئے انھیں امید نہ تھی کہ تیسرے روز بھی گاڑی اسٹیشن پر آئی ہوگی منگلو انھیں دیکھ کر دوڑا پلیٹ فارم پر آیا اور سب سامان اٹھا کر گاڑی میں رکھ دیا ... اور تھوڑی دیر کے بعد گاڑی رام پور کی طرف روانہ ہوئی۔

کچھ دور جانے کے بعد کشن لال نے منگلو سے پوچھا "... خیریت تو ہے نا؟"

"بھگوان کی کرپا سے ٹھیک ہے" منگلو نے ایک چٹکی تمباکو منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔

"گاؤں کی حالت؟"

"گاؤں میں تو ہر کار غضب ہو گیا۔"

"کیا ہوا؟" کشن لال نے چونک کر پوچھا۔

"میاں صاحب نے آگ لگی کا مقدمہ تھانے میں دائر کر دیا ہے جو اسے پر تھانہ پولیس سب موجود۔"

"حسین بخش کے ساتھ کس لالن نے ایسی حرکت کی؟"

"میاں صاحب کا کہنا ہے سلیم میاں علاقے کے چند ہندو اور مسلمانوں کو ورغلا کر ان کی عمارت کو آگ لگا کر خاک کر دینا چاہتے تھے وہ تو خیریت ہوئی آگ زیادہ بھڑکنے نہ پائی تھی کہ لوگوں نے پہنچ کر آگ بجھا دی" اور پھر منگلو نے منہ سے ایک گندی سی پیک پھینکی

"سلیم کا سر پھر گیا ہے کیا؟"

"سرکار یہ مقدمہ بالکل جھوٹا ہے"

"کیا کہتے ہو"

"جی ہاں آگ لگتے وقت تو میں خود وہاں موجود تھا۔ میاں صاحب نے میرا نام بھی گواہی میں دے دیا ہے۔"

"آخر بات کیا ہے"

"بابو جی! میاں صاحب کا دل بہت کالا ہے گاؤں میں کچھ ہندو مسلمان اب کھاتے پیتے ہیں تو وہی میاں صاحب کو پھوٹی آنکھ نہیں بھاتی اور سلیم کا تو صرف بہانہ ہے"

جب تم وہاں موجود تھے تو پھر آگ لگنے ہی کیوں دی۔

"بڑوں کے کام میں کون دخل دے"

"آخر آگ لگی کیسے؟"

"آگ کہاں لگی ہے؟ گاؤں میں دلاور خاں نے آگ لگائی اور میں نے جا کر بجھا دی ادھر میں آگ بجھانے میں مصروف تھا ادھر دلاور خاں گھوڑے پر سوار گوپال گنج تھانے چلا گیا اور پھر تو دو گھنٹے کے اندر اندر ایک ہنگامہ میاں صاحب کے دروازے پر برپا ہو گیا سلیم، جھینو، دکھن، کلوا، بھیم۔ [illegible] سب کے سب گرفتار کر لیے گئے تیل کا ایک ٹین اور

رام پرشاد کی ایک بوتل بھی سامنے رکھی گئی۔ پولیس مار پیٹ کے ذریعہ ان بے قصوروں سے اقبال جرم کرانا چاہتی تھی دلاور خاں کہتا ہے کہ وہ چہرے سے سب کو پہچانتا ہے اب دیکھیے کس کس کی شامت آتی ہے یہ تو گھورا نیا ہے سرکار۔" اور منگلو نے پھر بیلوں کو ٹھوکا مارا۔

کشن لال نے پوچھا "آتے وقت تم میاں حسین بخش کے دروازے ہو کر آئے تھے"

"جی ہاں"

"داروغہ صاحب واپس چلے گئے یا وہیں موجود ہیں"

"ابھی تک وہیں ہوں گے"

"اچھا تو سیدھے وہیں چلو"

ایک گھنٹے کے اندر اندر رام پور جہاں ٹولی میں گاڑی پہنچ گئی بستی کے لوگ ہراساں پریشان نظر آرہے تھے بچے بوڑھے سب سہمے ہوئے تھے چار گھروں سے رونے کی آواز آرہی تھی عورتیں چیخ چیخ کر رو رہی تھیں جب گاڑی سلیم میاں کے دروازے پر آئی تو وہاں کا سماں دیکھ کر کشن لال بھی اپنے کو ضبط نہ کر سکے معلوم ایسا ہوتا تھا کہ جیسے ابھی ابھی کسی کا انتقال ہوا ہو اور لاش ابھی گھر کے اندر ہی ہے لڑکے الگ رو رہے ہیں اور عورتیں الگ واویلا مچا رہی ہیں۔ کشن لال نے گاڑی روک کر ایک لڑکے سے پوچھا۔ "کیا ہوا ہے؟"

وہ لڑکا دوڑ کر اندر گیا اور تھوڑی دیر کے بعد سلیم میاں کی بیوی اپنے گود کے بچے کو لیے آئی اور دروازے پر کھڑی ہو کر بلک بلک کر رونے لگی۔

کشن لال نے پوچھا "کون سی آفت آگئی"

سلیم کی بی بی بیاہی ہو چلی اور آج تک وہ کشن لال کے سامنے نہیں آئی تھی مگر آج اس ضعیفہ کو بے پردہ دیکھ کر کشن لال بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے ایک دفعہ ان کا دل بھی اپنے دوست حسین بخش کی طرف سے متنفر ہو گیا صرف ایک حسین بخش کے باعث آج بستی کی بستی تباہ و برباد ہو رہی تھی۔

منگلو نے کہا "اب تم صرف روتی رہو گی! کچھ لوگ بھی بیکار بیٹھے ہیں اور تم خاموش ہو۔"

سلیم کی بی بی نے آنچل سنبھالتے ہوئے کہا "ان کو پولیس نے گرفتار کرلیا ہے بھلا کہئے بابو صاحب دن دہاڑے وہ جائیں گے میاں صاحب کی عمارت کو آگ لگانے کیا اندھیر مچا رکھا ہے انھوں نے بھی"

"مگر اب تو سلیم گرفتار ہو چکا" کشن لال نے کہا۔ "اسے چھڑانے کی تدبیر کرنی چاہیئے صرف رونے سے کیا فائدہ۔ تم خاطر جمع رکھو ابھی میں میاں صاحب کے دروازے ہی پر جاتا ہوں"۔

"بابو صاحب" اس ضعیفہ نے روتے ہوئے کہا "خدا آپ کو دن دونی رات چوگنی ترقی دے آپ غریبوں کے سہارا ہیں وہ بالکل بے گناہ ہیں انھوں نے ہرگز کوئی ایسی حرکت نہیں کی وہ تو کئی روز سے بیمار گھر میں پڑے کراہ رہے تھے آج ظالم سپاہی آئے اور گھر میں گھس کر انھیں پکڑ لے گئے" اور پھر وہ عورت آنچل میں منہ چھپا کر سسکیاں بھرنے لگیں۔

کشن لال کی گاڑی دیکھ کر محلے کے چند اور اشخاص وہاں جمع ہو گئے مردوں سے زیادہ عورتیں تھیں سب نے آکر اپنا دکھڑا رونا شروع کیا۔ کشن لال کی دہائی دینے لگیں کشن لال نے سب کو اطمینان دلایا انھیں گھر میں چپ چاپ بیٹھنے کو کہا اور پھر منگلو سے کہا جلد چلو۔

تھوڑی دیر میں گاڑی میاں حسین بخش کے دروازے پر آ لگی حسین بخش اپنے کمرے میں آرام کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے ان کے پاس ہی ایک کرسی پر تھانے کا ایک انچارج داروغہ بیٹھا ہوا ان سے سرگوشیاں کر رہا تھا سامنے صحن پر دونوں محلوں کے پانچ چھ ہندو مسلمان ہتھکڑیاں پہنے ہوئے کھڑے تھے تین چار سپاہی ایک طرف چوکی پر بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے تھے دلاور خاں کچھ دور پر دو تین چوکیداروں کے ساتھ خوش گپیاں کر رہا تھا۔

منگلو نے گاڑی کھڑی کی اور کشن لال اس سے اترے عین وقت پر انھیں دیکھ کر میاں حسین بخش اچھل پڑے کرسی سے اٹھے اور آگے بڑھ کر کشن لال سے معانقہ کیا داروغہ صاحب بدستور اپنی کرسی پر بیٹھے سگریٹ نوشی سے جی بہلا رہے تھے دلاور نے دوڑ کر اندر سے ایک کرسی لاکر میاں صاحب کی کرسی کے بغل میں رکھ دی دونوں دوست اپنی اپنی کرسی پر آ بیٹھے۔

حسین بخش نے پوچھا "پٹنہ سے آ رہے ہو شاید؟"

"ہاں ابھی دو بجے والی ٹرین سے اترا ہوں اور سیدھے تمہارے یہاں آ گیا۔"

"بڑی مہربانی کی میں دل ہی دل میں تمہیں یاد کر رہا تھا دروازے کا نقشہ دیکھ رہے ہو۔ یہ رہے ہمارے داروغہ صاحب بڑے گھر کے چشم و چراغ ہیں جب سے آئے ہیں علاقے کے بدمعاشوں کی نانی مر گئی ہے آپ کا نام ہے بی کے اگروالا"

داروغہ صاحب نے تصحیح کی کے پی اگروالا۔

"ہاں بھئی کے پی اگروالا" اور پھر داروغہ صاحب سے مخاطب ہو کر کہا داروغہ صاحب ان کا نام آپ نے سنا ہو گا مگر پہچانتے نہ ہوں گے یہ ہیں میرے دوست کشن لال رئیس اعظم"۔

داروغہ صاحب نے رسمی جملہ ادا کیا۔ "بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر" اور پھر دونوں نے ایک زوردار شیک ہینڈ کیا۔ داروغہ صاحب نے سگریٹ پیش کیا اور کشن لال نے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ لی۔

حسین بخش نے کشن لال سے کہا "اچھے وقت آئے کشن لال ان غنڈوں نے تو آج تباہ ہی کر ڈالا ہوتا وہ تو خیریت ہوئی منگلو عین وقت پر کہاں سے آ نکلا۔ اور پھر حسین بخش نے اختصار میں ساری روداد کہہ سنائی اور ان ساری بدمعاشیوں کا سرغنہ سلیم ہی کو ثابت کرنے لگے۔ سلیم نے ایک دفعہ اپنی مایوس ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں اوپر اٹھائیں اور کشن لال کی طرف دیکھا سلیم کی آنکھیں صاف کہہ رہی تھیں یہ کہانی بالکل جھوٹ ہے۔ صرف ہم لوگوں کو تباہ کرنے کی چال چلی گئی ہے۔

(باقی)

غزل

ڈاکٹر کے۔ رشی

دِل میں اِک دردِ بدستور گوارا کرنا
اتنا آساں نہیں یادوں پہ گذارا کرنا

جان دینی ہے ترے عشق میں یاد مجھے
بھول جاؤ بھی اگر میں تو اشارا کرنا

بھول سے آنا ہوا اُن کو چمن کے سارے
ان کے گھر جاؤ تو یہ کام ہمارا کرنا

دوستی ہو گئی آسان زمانے میں بہت
شکوہ میں پاس آ نا مصیبت میں کنارا کرنا

[illegible] اور نہ راتوں کے اندھیروں کی [illegible]
ا سرِ شام نہ زلفوں کو سنوارا کرنا

یاس اور کیف کی ہم اتنی حقیقت سمجھے
اک تمہیں بھول کے دھیان تمہارا کرنا

[illegible] تو سوچتا ہے ترکِ وفا کی باتیں
[illegible] یہ کہتا ہے رشیؔ یہ نہ گوارا کرنا

غزل

ایم۔ آر۔ قریشی سوزؔ۔ بیلا

جب بھی کسی کے ظلم و ستم یاد آ گئے
ہم جو بھلا چکے تھے وہ غم یاد آ گئے

جلتے ہوئے گھروں کی طرف دیکھ کر ہمیں
ہنگامہ ہائے دیر و حرم یاد آ گئے

اپنی تباہی کا جو سبب یاد آ گیا
وہ بھی ہمیں خدا کی قسم یاد آ گئے

شرمائے اور آئینہ ہاتھوں سے رکھ دیا
شاید کسی طرح اُنھیں ہم اُنھیں یاد آ گئے

رِسنے لگے ہیں پھر سبھی زخمِ دل و جگر
پھر آج مجھ کو تیرے کرم یاد آ گئے

آئی جو یاد مجھ کو تمہارے شباب کی
جلتے ہوئے بھی سر ہو گئے قلم یاد آ گئے

[illegible] سوزؔ اگر راہنماؤں نے
ہم کو ترے نقوشِ قدم یاد آ گئے

غزل

محمد نقی خاں اثرؔ اندوری۔ جھابوہ

محبت کہتا ہے سنوار دو تو سنور جاؤں گا
میں ہوں فن کار مرا موت سے رشتہ کیا ہے
ظلم کی آگ برستی ہے چاروں سے ابھی
گرمیٔ جبر سے دُنیا کو بچا لینے دے
[illegible] مجھے شوق سے کر [illegible]
ذکرِ ساحل کا جو ہوتا [illegible]
یوں بھی پھرتا ہوں پئے لطف زمانے بھر میں

میں کوئی خواب نہیں ہوں جو بکھر جاؤں گا
یہ غلط فہمی [illegible] ہے کہ مر جاؤں گا
امن کے پھول کھلانے میں اِدھر جاؤں گا
پھر تری زلف کے سائے میں بکھر جاؤں گا
کل میں تاریخ کے دامن میں بکھر جاؤں گا
یہ غلط ہے کہ تلاطم سے میں ڈر جاؤں گا
اُن کے کوچے میں بھی کچھ دیر ٹھہر جاؤں گا

جب کوئی ذکرِ وفا بزم میں چھیڑے گا اثرؔ
نقش بن کے میں ذہنوں پہ اُبھر جاؤں گا

غزل

نسیم شاہجہانپوری

ا کا نام اب احساں ہے دیکھئے کیا ہو
و ا سرِ بگریباں ہے دیکھئے کیا ہو

خرد، جنوں کی نگہباں ہے دیکھئے کیا ہو
جنوں خرد سے گریزاں ہے دیکھئے کیا ہو

ن کو لوٹتے گزری ہے زندگی جس کی
اب حسن کا نگہباں ہے دیکھئے کیا ہو

نہ اُن کا غم، نہ زمانے کا غم، نہ اپنا غم
حیات بے سروساماں ہے دیکھئے کیا ہو

م نصیب ہیں مجبور مسکرانے پر
ال میں جشنِ بہاراں ہے دیکھئے کیا ہو

نہ عشق اس کا ہے مسلک نہ ہے وفا مذہب
ہوس پرست اب انساں ہے دیکھئے کیا ہو

عشق و ہوس اُٹھ گئی زمانے سے
کفر تھا وہ اب ایماں ہے دیکھئے کیا ہو

اُداس پھولوں کے چہروں پہ بھی ہے رنگِ امید
خزاں، بہار بداماں ہے دیکھئے کیا ہو

خلوص سے شیخ حرم کعبی آج نسیم
شریکِ محفلِ رنداں ہے دیکھئے کیا ہو

جو فن شناس ہیں ان ناقدوں کی محفل میں
نسیم آج غزل خواں ہے دیکھئے کیا ہو

غزل

قمر الیوی (پال گھر)

درد کی داستاں نہیں معلوم
کس نے کی تھی بیاں نہیں معلوم

کیا کوئی دیدہ ور ہوا رخصت
رو رہا تھا جہاں نہیں معلوم

جانتے ہو تو دو بتا یارو!
دو ستی تھی کہاں نہیں معلوم

ہر قدم خارزار میں اُلجھا
تھا وہی گلستاں نہیں معلوم

تھی صدائے جرس یا وہ لوری؟
سو گیا کارواں نہیں معلوم

برق تھی یا تھی سازشِ مالی؟
کیوں جلا آشیاں نہیں معلوم

مر گئے آرزو میں جینے کی
زندگی تھی کہاں نہیں معلوم

حیف زر نے کیا ہمیں گونگا
ہم بھی تھے کب بے زباں نہیں معلوم

کس لئے سُن کے طنز رندوں کے!
چپ تھا پیرِ مغاں نہیں معلوم

مٹ گئے پھر بھی دل سے مٹ نہ سکا
کون تھا مہرباں نہیں معلوم

تیرے اشعار کی ضیا تھی قمر
یا تھی وہ کہکشاں نہیں معلوم

غزل

اختر شاہجہانپوری

کیا کوئی پھر کسی بشر سے ملے
جو ملے بھی وہ کم نظر سے ملے

مہر و مہ سے جبیں پہ روشن ہیں
زخم جو دستِ بے ہنر سے ملے

کر رہے ہیں طواف اہلِ خرد
اے جنوں کچھ تو تیرے در سے ملے

اس کو کہتے ہیں عشق کی معراج
میرا ہونا تری خبر سے ملے

انتہا ہے یہ نارسائی کی
لفظ بھی ہم کو بے اثر سے ملے

اس کے سائے سے دھوپ بہتر ہے
زخم سر ہم کو جس شجر سے ملے

[illegible] سے ملے

غزل

سلام سانگری ساگر (ایم پی)

بدلتے ہی مرے کیا کیا نہ رنگِ آسماں بدلا
زمیں بدلی، زباں بدلی، مکیں بدلا مکاں بدلا

مری تقدیر بدلی اور دورِ آسماں بدلا
جو میں بدلا حقیقت میں نظامِ دو جہاں بدلا

وہیں پائے خرد نے لغزشوں پر لغزشیں کھائیں
جنونِ عشق نے اپنے ارادے کو جہاں بدلا

زمین و آسماں کا فرق ہے حسن و محبت میں
نہ خوئے عاشقاں بدلی نہ رنگِ مہوشاں بدلا

خزاں کے بعد فصلِ گل بہار اپنی دکھائے گی
اسی امید پر ہم نے نیا آشیاں بدلا

رہا محروم سجدہ سے تو بن گیا کعبہ
جبیں میں نے جہاں رکھ دی بس وہ آستاں بدلا

بتوں کی یاد ہم کو کھینچ لائی صحنِ کعبہ سے
سلامؔ! اپنا ارادہ دیکھئے جا کر کہاں بدلا

غزل

فخر واصدی (قنوجی)

ساقی کے فیضِ عام کا جب یہ اثر نہیں
محفل میں آج کوئی بھی یوں باخبر نہیں

جس کی نظر تغیرِ حالات پر نہیں
بے شک وہ کامیاب رہِ خیر نہیں

اتنے فریب کھائے ہیں راہِ حیات میں
میری نظر میں آج کوئی معتبر نہیں

واعظ کے قول و فعل میں خود اک تضاد
اس کی نصیحتوں میں تبھی تو اثر نہیں

وہ ذاتِ پاک جب سے مری ناخدا ہوئی
طوفانِ زندگی کا مجھے کچھ خطر نہیں

دنیا کے سامنے جو کبھی خم نہ ہو سکا
اس سر سے بڑھ کے فخرؔ کوئی اور سر نہیں

"ایک شعر دو رنگ"

کشن لعل گرز ھر

رنگِ قدیم تضمین

کفر و ایماں کا کبھی دام بچھا لیتی ہے
جامۂ زہد میں گرد "ریا" لیتی ہے
علم و حکمت کا کبھی طرہ سجا لیتی ہے
عقل عیار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے
عشق بے چارہ نہ ملا ہے نہ زاہد نہ حکیم

رنگِ جدید

بھاشنوں سے کبھی جنتا کو بھا لیتی ہے
بن کے ممبر کبھی "کرسی" کا مزا لیتی ہے
کبھی دربارِ "وزارت" کا لگا لیتی ہے
"عقل عیار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے"
عشق بے چارہ نہ لیڈر ہے نہ ممبر نہ وزیر

ایلورا

ڈاکٹر [illegible] آستانوی
ڈبل ایم اے۔ ایل ایل بی۔ پی ایچ ڈی
(ڈی پی ایس اے)

پتھروں کو جب زباں دینے لگا تھا بُت تراش
اُس کی خاموشی میں کتنے راز ہوں گے مضطرب
منجمد ہوں گی نگاہوں میں ہزاروں بجلیاں
دستِ صنّاعی میں کتنے ساز ہوں گے مضطرب

۲
جب تراشے ہوں گے دیوی دیوتاؤں کے نقوش
ایک سراپا عقیدت بن گیا ہوگا کوئی
پایۂ تکمیل تک پہنچا کے نصب العینِ زیست
کارفرمائے مشیت بن گیا ہوگا کوئی

۳
جلوتوں میں لا کے اپنی خلوتوں کا اضطرار
اپنی تشنہ کامیوں کو صورتِ میخانہ دی
پھونک کر گمنام سے بے جان سے ذرّوں میں روح
اپنی ساکن زندگی کو گردشِ پیمانہ دی

۴
عہدِ رفتہ کا مقدس ذات فنکارِ عظیم
پتھروں میں ڈھل گئی ہے زندگی جس کی تمام
عہدِ رفتہ کا نہیں ہر عہد کا فنکار ہے
وقت سے اٹھکھیلیاں کرتا ہے کا جو [illegible]

۵
گردشِ دوراں نہ چھو پائے گی فن جس کا کبھی
آنچ نہ پائے گا کبھی جس کی ترنگوں میں جمود
ارتقائے نسلِ آدم کا نمایاں سنگِ میل
منبعِ سرمستیٔ انوار ہے جس کا وجود

۶
پتھروں میں اس طرح ڈھالا ہے اپنا حسنِ ظن
مل گئی ہے پتھروں کو تا ابد گویا ثبات
کوئی دیکھے تو کرشمہ سازیاں تاثیر کی
بہہ رہا ہے پتھروں سے دمبدم آبِ حیات

۷
دیکھ کر اُس ماہرِ فن کے نقوشِ ذی کمال
کس قدر ہر آنکھ ہے حیران دیکھے تو کوئی
ڈھونڈنے والے اُسے ہر حال میں پا لیتے ہیں
ہے بتوں میں بھی خدا کی شان دیکھے تو کوئی

۸
پتھروں میں بھی خدا آنے لگا گویا نظر
جب عقیدت کی یہاں کچھ آنچ [illegible] ہوئی
مٹ گئی تفریق تھی جو خالق و مخلوق میں
[illegible] ہستی سے بھی [illegible] [illegible]

Dr. Zakir Husain Library Jamia Nagar New Delhi

بے آواز روشنی

ڈاکٹر اُدے سرن ارمان

اپنے مکان کے پیچھے قلعی سے پتی ہوئی دیوار پر نظریں
...ے منشی جی بہت دیر سے ٹھہرے تھے۔ شاید دیوار پر لکھی کسی
بات کو پڑھنے کی کوشش میں۔ مگر نہیں وہ تو ہندی اچھی خاصی
...تے تھے اور پھر عبارت بہت صاف تھی۔ چیچک کی سب سے
...ی سوچنا دینے والے کو ایک ہزار روپے نقد انعام۔ راہ سے
گزرتے سیکڑوں بار اس فقرے پر میری نگاہ پڑی ہوگی مگر میرے
... اس میں دلچسپی کا کوئی پہلو نہ تھا۔ بے ربط اور اوٹ
پٹانگ سی بات تھی۔ ایسی غیر اہم باتوں پر میں کوئی دھیان
نہیں دیتا۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی ارے بھائی چیچک کوئی
ایسا چھپا مرض تو ہے نہیں ہماری آنے کی تو مریض خود اسپتال
پہونچ جائے گا۔ پھر منشی جی کو بھلا اس معمولی سے فقرے میں
کیا خاص بات نظر آگئی۔

میں انھیں خیالات میں گم تھا کہ میری نگاہ منشی
... چہرے پر پڑی کتنے اداس تھے وہ اس وقت خاموش
... ہے کسی سوچ میں گم "جرچل کی طرح" مجھ سے رہا نہ گیا
وہ قریب جاکر پوچھ ہی دیا۔ منشی جی بہت دیر سے کیا پڑھ
رہے ہیں آپ؟ ایک دم چونک کر انھوں نے میری طرف دیکھا
پھر سنبھل کر بولے ــــــ "میں سوچ رہا تھا کہ انسان نے
پلیگ اور طاعون کی طرح چیچک پر بھی قبضہ پالیا کتنی بڑی بات
ہے" یہ کہہ کر وہ چپ ہوگئے۔

میں منتظر تھا کوئی نئی بات سننے کا جب بہت دیر تک وہ کچھ
نہیں بولے تو میں نے ان کی طرف بغور دیکھا ان کی آنکھوں
میں آنسو تھے وہ رو رہے تھے مجھے تعجب ہوا کہ وہ ایکدم کیا
سوچ کر رونے لگے۔ میں نے پوچھا۔ منشی جی آپ بلا وجہ کیوں
رو رہے ہیں۔

وہ آہستہ سے آنسو پونچھتے ہوئے بولے۔ بہت دنیا میں
کوئی کام بلا وجہ نہیں ہوتا۔ میرے رونے کی بھی ایک خاص وجہ
ہے جسے تم نہیں سمجھ سکتے۔ اسی چیچک نے میری بیوی مجھ سے
چھین کر میری زندگی ہی تباہ کردی میرے تمام سکھوں پر پانی
پھیر دیا"

یہ کہتے کہتے وہ پھر سسک سسک کر رونے لگے۔ میں اب
جان گیا تھا کہ ان کو اس اشتہار سے اپنی مرحومہ بیوی کی یاد
آگئی تھی۔ میں نے ڈھارس کے پروچنوں کا سہارا لے کر ان کو
طرح طرح سے سمجھایا دلاسا دیا منشی جی آپ ٹھیک کہتے ہیں۔
واقعی بیوی کے مرنے کے بعد آدمی کے تمام سکھوں کا جیسے
انت ہی ہوجاتا ہے۔ منشی جی سونی آنکھوں سے میری جانب
دیکھتے ہوئے بولے۔

"رو بہت بیوی کے مرنے کے بعد نہ صرف آدمی کے سکھوں
کا خاتمہ ہوجاتا ہے بلکہ سماج کی نظروں میں اس شخص کی مان مریادا
اور وقار بھی جاتا رہتا ہے۔ نہ اس کا اعتبار قائم رہتا ہے نہ اعتماد
ساری ساکھ ختم ہوجاتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کی شرافت اور
بھل منسا ہٹ کو بھی شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے"

منشی جی کی ایک بات سے تو میں اتفاق کرتا تھا۔
مگر یہ تمام باتیں ـــ بیوی کے مرنے کے بعد عزت، شرافت
وغیرہ سب ختم ہوجاتی ہیں۔ مجھے اس پر شک تھا اور
دل ہی دل میں اس امر سے متفق نہیں تھا۔ لیکن ابھی میں
نے لب کشائی بھی نہیں کی تھی اور بہ تن ان کی طرف متوجہ
تھا کہ انھوں نے سلسلۂ کلام کو آگے بڑھایا۔ "رو بہت
مجھے اس کا تجربہ اپنی بیوی کے مرنے کے بعد ہوا ہے۔ وہ
چند ثانیے ٹھہرے میں نے ان کے دل کو کریدا تو وہ بولے۔
جب میری بیوی کا انتم سمے آیا اس وقت میرے پاس
دو بچے تھے ایک ڈیڑھ برس کا دوسرا تین ماہ کا پھر جب میں

نشان گھاٹ تک اس کو وداع کرنے گیا۔ تو ایک بشیر
بیوی کو کہاں بھی ایسی تھی۔ جس نے میرے بچوں کو سنبھالا ہاں
دا گیا بیوی کی بیماری میں بچوں کی دیکھ بھال بھی تو اسی نے کی تھی
ردا اکثر عورتیں تو دو دن میں ہی دیکھتی ہوئی نکل جاتی تھیں۔
جیسے بیماری کہیں ان کو آتا ہوا دیکھ کر خود اڑ کر ان تک نہ
پہنچ جائے۔ اور پھر ٹھیک ہے کچھ بیماریاں ایسی ہوتی ہیں
جن سے لوگ ڈرتے ہیں۔ اب تو کریمن بھی اللہ کو پیاری ہو چکی
ہے۔ ایک بیٹی ہی اس نے چھوڑی تھی۔ میری طرح بشیر نے
بھی دوسری شادی نہیں کی اور بچی کی پرورش برداشت کی۔
ایک بار کی بات ہے میرا لڑکا پتنگ اڑاتے ہوئے چھت سے
پھسل گیا۔ بشیر کو خبر ہوئی وہ دوڑا ہوا آیا میں وہاں پہلے ہی
پہنچ چکا تھا۔ وہ اس کو لے کر فوراً اسپتال چلا گیا۔ اور چلتے
چلتے مجھے تاکید کرتا گیا: بیا کلثوم آپ کے ذمے ہے۔ ذرا
خیال رکھئے گا۔ اس کے مجھ پر ویسے بھی بڑے احسان تھے۔
میں نے پڑوسی کا حق ادا کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی اپنے
بچوں کی طرح حفاظت کے ساتھ اس کو رکھا اور جب تک بشیر
لوٹ نہیں آیا لمحہ بھر کو اسے تنہا نہیں چھوڑا۔ اگر میری اپنی بیٹی
ہوتی تو اس کو بھی اتنا عزیز نہ رکھتا اور بھگوان بہتر جانتا
ہے۔ مگر اس سماج نے کیا کیا نہ کہا۔

منشی جی کی باتیں میں بغور سن رہا تھا۔ اور سچ پوچھئے
تو یہ سب کچھ ان کی زبان سے سن کر ہمدردی کے ساتھ
ان کی قدر و منزلت میرے دل میں اور بھی بڑھ گئی تھی۔ میں
نے احترام آمیز نگاہوں سے استفسار کے انداز میں ان
کی طرف دیکھا۔ انھوں نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا
اگر میری بیوی زندہ ہوتی تو ایک معمولی بات تھی۔ کوئی انگلی
اٹھائی نہ کرتا۔ ایک بیوی کے نہ ہونے سے میری شرافت پر
بھی شک کیا گیا۔ اور مجھے بات بات پہ بدنام کیا گیا۔

منشی جی کی باتوں میں میری دلچسپی بڑھ گئی تھی۔ اور میں
بے اختیار پوچھ بیٹھا بات بات پر ــــ کیا مطلب؟ کیا ایسے
اور بھی واقعات ہیں؟ مجھے اپنے سوال پر خود حیرت ہوئی مگر
اب تو بات زبان سے نکل چکی تھی۔ لہٰذا کچھ خفت اور کچھ
شرمندگی کے احساس کے ساتھ میں نے گردن جھکا لی باتیں
کرتے ہوئے ہم لوگ منشی جی کی ڈیوڑھی میں آ چکے تھے۔ اب
پرسکون انداز میں بیٹھ کر یہ سارا سلسلۂ کلام جاری تھا۔ میرے
سوال پر انھوں نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں مجھ پر گاڑ دیں۔
بوڑھی اور ویران آنکھیں۔ جو میری توجہ کا مرکز تھیں اور جن
میں کوئی معنی تلاش کر رہا تھا۔ آنکھیں انسانی جذبات کی
کی صحیح ترجمان ہیں۔ کتنا درد سمٹ آیا تھا ان آنکھوں میں کتنی
بے کراں وسعت تھی کہ میں نقل آکاش سب سما جائیں لیکن کیسی
ویرانی تھی دور دور تک کیسا سونا پن تھا۔ کتنی بے چارگی جھلکتی
تھی ان آنکھوں سے۔ یہ اس نیک دل انسان کی آنکھیں تھیں
جو زمانے کو محبت پیار اور خوشیاں دیتا تھا۔ لیکن زمانہ اس
پر شک کرتا تھا۔ اور اس پر کیچڑ اچھالتا تھا۔ عجیب دنیا ہے ظالم
میں پتہ نہیں کیا کیا انداز سے رہا کہ میرے خیالات
کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ وہ کہہ رہے تھے روہت بیٹے تمھیں
کیا بتاؤں یہ تو واقعات کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے جو مجھے
کچھ یاد آ رہا ہے میں تمھیں بتاتا ہوں۔ ایک بار چنیا دھوبن
کی لڑکی کی شادی کے موقع پر اس کو کچھ روپیوں کی ضرورت پڑی
غریب چنیا سارے گاؤں میں گھوم لی مگر کسی نے کانی کوڑی
دینا تو درکنار سیدھی آنکھوں اس کی طرف دیکھا بھی نہیں
کہ اس سے دو بول ہمدردی کے کہہ کر اس کی ہمت ہی بڑھاتا
غریب عورت اوپر سے شوہر کا بھی قرض اسے کوئی کیوں
دیتا اور کس بھروسے پر دیتا اس دنیا میں قرض اسی کو ملتا ہے
جس سے واپسی کی امید ہوتی ہے۔ تھک ہار کر بڑی نا امید
ہو کر میرے پاس بھی آئی۔ میں نے غریب کی حالت پر ترس
کھا روپیہ اس کو دے دیا اور کہہ دیا کہ تم اس روپے کو آہستہ آہستہ
کے ساتھ ادا کر دینا میں تقاضہ نہیں کروں گا کیونکہ یہ روپیہ
میں لڑکی کی شادی کے لئے دے رہا ہوں۔ بے سہارا عورت نہال
ہو گئی اور طرح طرح کی دعائیں دیتی چلی گئی۔ چنیا نے میرے
اس ہمدردانہ سلوک کی جگہ جگہ تعریف کرنا شروع کی۔ سارے گاؤں
بھاگ تو اس کے منہ پر کہہ دیتے تھے کچھ اس کے پیچھے کہنے
لگے۔ کہ منشی جی نے اتنی بڑی رقم اور وہ بھی بنا سود کیسے

بتا نہیں وہ سدا کا ہے رنڈوا آدمی ہے۔ ایک کام اس کا نکال دیا تو دس کام اپنے ہی نکالے گا۔ وہ بھی احسان سے دب کر بچاری کچھ نہ کر سکے گی۔ اس زمانے میں بے مطلب کوئی کسی کی مدد نہیں کرتا ہے۔ بستی کے لوگوں کی یہ ساری باتیں کسی نہ کسی طرح مجھ تک بھی پہنچتی رہیں۔ بہت دکھ ہوا کبھی تو جی چاہتا کہ گھر چھوڑ کر کہیں دور چلا جاؤں اور ان لوگوں کی شکل نہ دیکھوں پھر خیال آتا کہاں جاؤں کہیں بھی جاؤں گا سماج ضرور بدلا ہوا ملے گا۔ مگر سوچنے کا ڈھنگ اس سماج کا بھی یہی ہوگا۔ اس لئے یہی ٹھیک ہے میں اپنے راستے پر ٹھیک ہوں۔ اس طرح میں اپنے دل کو سمجھا لیتا۔

ایک بار وہ بہت سخت بیمار ہوگئی لوگ تو جانتے ہی ہو گئے اس کا لڑکا سردی کے مارے سکڑ رہا تھا میں نے ترس کھا کر اپنے بچوں کے کچھ اترے ہوئے کپڑے اس کو دے دئے۔ جس سے اس کا جسم ڈھک گیا اور سردی دور ہوگئی اس بچے کو مجھ سے پیار ہوگیا اور وہ میرے گھر آنے جانے لگا۔ گھنٹوں میرے بچوں کے ساتھ کھیلتا رہتا تھا کبھی کبھار میں اس کو کھانا بھی کھلا دیتا تھا۔ کبھی کوئی چیز بھی دے دیتا تھا۔ وہ میری ان باتوں کو بھی اس سے بھی کہہ دیتا تھا اس کی ماں ان باتوں کو اپنی ساتھی عورتوں سے بلا تکلف کہہ دیتی تھی۔ عورتوں کی کافی زبان ہوتی ہے اس طرح میری یہ باتیں ساری بستی میں عام ہوگئیں۔ وہی لوگ جو میری تعریف کیا کرتے تھے اب میں پیار کی بھی کسوٹی پر [illegible] کو بہت [illegible] رنڈوا [illegible] پیار نہیں ہوتا تاکہ کسی عورت کا دل لبھانے والا پہلے اس کے بچے ہی کو پیار کرتا ہے [illegible] باتیں میرے کانوں میں آتیں میرے [illegible] سا لگ جاتا مگر میں ضبط سے کام لیتا رہا [illegible] اس طرح کی باتیں سننے کا عادی ہوگیا تھا۔ اور کسی کا کوئی بس نہیں کرتا تھا سے جو اچھا لگتا وہ کرتا تھا۔ میں اپنی عادت سے مجبور تھا۔ اور اپنی عادت کے مطابق ہی [illegible] لوگوں کی وقت ضرورت مدد کر دیتا تھا ایک بات ختم نہیں ہونے پاتی تو دوسری یاد آجاتی ہے اسے سنبھالئے مگر [illegible] کو [illegible] نے پیچھے کر دیا۔

ابھی اس کی شادی کو ایک ہی برس ہوا تھا۔ اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی پلاسٹر چڑھایا گیا۔ اور وہ بے چارہ چالیس روز تک بستر پر پڑا رہا۔ گاڑی بھرا [illegible] تھا۔ مگر کسی نے اس کے گھر کا کام دیکھنا تو درکنار آ کر جھانکا تک نہیں۔ وہ اپنی بیوی کو تنہا کھیت کیاری میں بھیجنا پسند نہیں کرتا تھا۔ بیچارے اس کا سر دوشی تھا جس سے اس کی مجبوری میں بگڑتا ہوا کام نہیں دیکھا گیا۔ اس ہمدردی کا کیا نتیجہ نکلا پتہ ہے؟ میں نے ان کے سوالیہ انداز پر کہا کیا نتیجہ نکلا۔

وہ بولے لوگ چہ می گوئیاں کرنے لگے منشی جی بہت ہوشیار آدمی ہیں۔ گردیش کی بیوی سے ملاقات کا کیا طریقہ نکالا ہے۔ کبھی کھیتوں پر اپنا کام دیکھنے جاتے ہی ہی مجبوری سب کو ڈکا دیتی ہے۔ اس طرح یہ اپنا الو سیدھا کرلیں گے۔

ان تمام باتوں سے تم نے کیا مطلب نکالا رو بہت؟ منشی جی نے مجھ سے سوال کیا۔ میں نے کہا منشی جی آپ نے شرافت سے کسی کی حفاظت کی کسی مجبور کی مدد کی کسی غریب پر ترس کھا کر اس کو قرض دیا۔ کسی کے بچے کے ساتھ اپنا بچہ سمجھ کر خلوص دیا، ہمدردی کا اور کسی لاچار کے وقت پر کام آئے یہ سب بڑے پن اور اچھے رشتوں کی علامت ہے۔ مگر سماج نے ان تمام باتوں کا ایک ہی مطلب نکالا۔ کیونکہ سب کے سوچنے کا ڈھنگ ایک ہی جیسا ہے۔ اگر آپ کی بیوی زندہ ہوتیں تو بھی لوگ اور طرح سے سوچتے اور آپ کی شرافت کو پھر بھی نہ اچھالتے۔ منشی جی آپ نے جن لوگوں کے ساتھ اچھائی کی ہے۔ کیا وہ بھی آپ کو غلط سمجھتے ہیں؟ میرے سوال پر منشی جی ایک دم چونک کر بولے نہیں ان میں سے ایک بھی نہیں۔ وہ سبھی میری تعریف کرتے ہیں۔ بلکہ مجھے بُرا بتانے والے سے وہ لوگ لڑ بھی بیٹھتے ہیں۔

منشی جی بھگوان کا شکریہ ادا کیجئے کہ وہ سبھی لوگ آپ کے ممنون ہیں۔ مداح ہیں۔ پوری بستی میں آپ کی تعریف کرنے والے اور احسان ماننے والے چار چھ لوگ ہیں تو سہی۔ دیکھتے جائیے ایسا وقت بھی آنے والا ہے۔

باقی صفحہ پر

بمبئی مرکنٹائل کوآپریٹیو بنک لمیٹڈ

رجسٹرڈ آفس ۷۸ محمد علی روڈ بمبئی ۴۰۰۰۰۳

دہلی آفس نمبر ۲۳۵۵ نیتاجی سبھاش مارگ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

فون نمبر:- ۲۶۸۲۶۶ —— ۲۶۴۳۷۲

- ہمارے یہاں شرح سود تمام نیشنلائزڈ اور رشیڈولڈ کمرشیل بنکوں کی مقابلہ ایک فیصد زیادہ ہے
- ہندوستان کا پہلا کوآپریٹیو بنک جس کو زر مبادلہ میں کاروبار کے لئے لائسنس جاری کیا گیا۔
- ہمارے بنک میں اوقاف کی جمع شدہ رقم کی آمدنی دفعہ ۱۳ (۵) (الف) ۱۱ انکم ٹیکس ایکٹ ۱۹۶۱ء کے تحت انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہے۔

اس کے علاوہ

- ہم آپ کے آرام و آسائش کی ضروریات مہیا کرنے کے لئے آسان قسطوں پر قرضہ فراہم کرتے ہیں۔ ایک فیصدی کا فرق بہت بڑا فرق ہے۔ یہ آپ کی رقم میں ہزاروں روپیہ کا اضافہ کرتا ہے۔ آپ بھی اس کا فائدہ اٹھائیں۔

زین۔ جی رنگون والا
مینیجنگ ڈائرکٹر

حسینی۔ ایس ڈاکٹر
(چیرمین)

شمیم کاظم
(اسسٹنٹ جنرل منیجر۔ شمالی ہند)

بابِ تنقید

(ادارہ)

کلیاتِ میر

(جلد اول، مکمل چھ دیوان) مرتب ظلّ عباس عباسی سائز ۲۰×۲۶/۸ ضخامت ۸۴۰ صفحات۔ کتابت طباعت بہترین۔ کاغذ سرکاری امداد جو فلیمٹ ہے۔ قیمت مجلد باون روپیہ ناشر ڈائریکٹر ترقی اردو بیورو۔ ویسٹ بلاک ۸ ۔ آر۔ کے پورم نئی دہلی ۱۱۰۰۶۶

پیشِ لفظ:۔ ڈاکٹر فہمیدہ بیگم ڈائریکٹر ترقی اردو بیورو۔ تعارف:۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی۔ مختصر حالاتِ زندگی:۔ قاضی عبدالودود۔ اس کے بعد مولف نے میر کا ذکر تذکروں میں" کے تحت سترہ ایسے مستند تذکروں کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ جن میں میر کا ذکر آیا ہے۔ اس کے بعد میر کے مطالعہ کی اہمیت" عنوان سے پروفیسر آل احمد سرور کا سیر حاصل مقالہ ہے جسے میر کا کلام پڑھنے سے پہلے مطالعہ کرنا انتہائی ضروری ہے۔ اور پھر پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری نے "میر کی عالمگیر مقبولیت" عنوان سے جن بیش بہا خیالات کا اظہار فرمایا ہے اس کی ابتدا یوں کی ہے۔

"میر کی جادو نگاری اور کلامِ میر کی سحرکاری میں جو بات سب سے زیادہ اہم معلوم ہوتی ہے۔ جو حقیقت سب سے زیادہ نظر آتی ہے اور جس میں اس کی عالمگیر مقبولیت کا راز پنہاں ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے نازک ترین محسوسات کی اتنی فطری مصوری اور وہ بھی کم سے کم الفاظ میں، سادہ سے سادہ الفاظ میں، معمولی سے معمولی الفاظ میں اردو کا کوئی دوسرا شاعر نہیں کرسکا۔ ان کے ایسے اشعار ہمارے دلوں کی آخری تہوں سے نکلتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ میر نہیں بول رہے ہیں۔ ہماری انسانیت اور ہماری فطرت بول رہی ہے۔"

جناب ظلّ عباس عباسی صاحب نے کلیاتِ میر مدت ہوئی کسی دوسرے ادبی ادارے کے تعاون سے شائع کی تھی۔ یہ اسی کا دوسرا ایڈیشن ہے جو ہر لحاظ سے بہتر انداز میں شائع ہوا ہے۔ باذوق حضرات اور عاشقانِ میر کے لئے یہ کلیاتِ میر ایک نعمت سے کم نہیں ہے۔

(دفترِ شانِ ہند سے بھی کلیاتِ میر دستیاب ہے)

رقصِ آواز

مجموعۂ کلام جناب جنک راج کنول سائز ۱۸×۲۲/۸ حجم ۱۱۲ صفحات۔ کاغذ، کتابت، طباعت دیدہ زیب۔ جلد دلکش قیمت ۲۰ روپے۔

جناب جنک راج کنول گورداس پوری پنجاب کے سرکردہ شعراء کی صفِ اول میں اپنا ایک مقام رکھتے ہیں حال ہی میں ان کی اکاون غزلیات اور گیارہ نظموں کا یہ مجموعہ منصۂ شہود پر آیا ہے جو اُن کے گزشتہ چالیس سال سے زائد کے شعری سرمایہ کا سرسری انتخاب ہے۔ جو ہر باذوق سخن فہم کے ذوقِ مطالعہ کے لئے نعمتِ خداوندی سے کم نہیں۔ پیش گفتار عنوان کے تحت جناب کرشن کانت صاحب نے جو پُرمغز مقالہ کنول صاحب کی شاعری پر لکھا ہے اس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ پنجاب کے شعراء اور ادیب اس دور میں بھی اُردو زبان کے تحفظ کے امین ہیں۔ کتاب کی قیمت تو پیش گفتار پڑھنے سے ہی وصول ہو جاتی ہے۔ ایک اچھے شعری مجموعے کے طالبان سے رقصِ آواز کے مطالعہ کی پُرزور سفارش کی جاتی ہے۔ رقصِ آواز کے تقسیم کار کتب کیندر گوپال نگر۔ امرتسر پنجاب ہیں۔ ویسے یہ مجموعہ دفترِ شانِ ہند نئی دہلی ۵ سے بھی مل سکتا ہے۔

گل تر

:۔ راجیش نگار اوجع کا یہ مجموعۂ کلام ۲۰×۳۰/۱۶ سائز پر ۱۹۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ کاغذ بہت اچھا۔ چھپائی لکھائی اردش اور بہترین۔ سرورق دیدہ زیب اور دلکش قیمت چالیس روپیہ (جو یقیناً زیادہ ہے) ہے انجمن ترقی

بالوگنج شملہ اور دفتر بیسویں صدی دریا گنج نئی دہلی علا کے علاوہ دفتر شانِ ہند۔ دریا گنج۔ انصاری مارکیٹ نئی دہلی علا سے خریدا جا سکتا ہے۔

شروع میں نو صفحات پر ابو الاثر حفیظ جالندھری نے اوج صاحب اور ان کی شاعری پر ایسا پیش لفظ لکھا ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ مغیث الدین فریدی دلی یونیورسٹی نے مختصراً گل تر اور اوج صاحب کے بارے میں اپنی رائے گرامی سے نوازا ہے۔ جناب رحمٰن نیر ایڈیٹر بیسویں صدی نے دو صفحات میں اوج صاحب کی صفات اور "گل تر" کی شاعرانہ حیثیت پر جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ اس بات کا مظہر ہے کہ رحمٰن نیر صاحب خود شاعر تو نہیں مگر سخن فہمی اور سخن شناسی سے دور نہیں ہیں اور پھر جناب دھرم پال صاحب عاقل نے اوج صاحب اور ان کی شاعری کے سلسلے میں جچے تلے الفاظ میں اپنے خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔

جناب اوج صاحب شملہ میں پولیس کے ڈی۔ آئی جی ہیں۔ اس لئے خیال گزرا کہ مذکورہ بالا حضرات نے محض ان کے عہدے اور ذاتی تعلقات کی بنا پر دیوان اور صاحب دیوان کی تعریف کر دی ہوگی۔ مگر اپنے دیرینہ کرمفرما مرحوم نواب امین الدین احمد لوہارو سابق گورنر ہماچل کی تقریظ پڑھ کر اپنی رائے بدلنی پڑی کہ گورنر کو اپنے ڈی آئی۔ جی پولیس سے کیا غرض ہو سکتی تھی جو انھوں نے اوج صاحب کے فرائض منصبی کی تعریف کے ساتھ ساتھ ان کے کئی اشعار کا حوالہ دیتے ہوئے ان کے وطن پرستانہ، صوفیانہ، مناظر فطرت سے متعلق اور عاشقانہ اندازِ سخن پر بھی خوشنودی کا اظہار فرمایا ہے۔ اور اس کے علاوہ جب اوج صاحب کی غزلیات۔ قطعات۔ رباعیات اور نظموں کو پڑھا تو دل نے گواہی دی کہ اوج واقعی شاعر ہے۔ راقم الحروف کی مصروفیات اتنی زیادہ ہیں کہ مطالعہ کے لئے بہت کم وقت ملتا ہے تاہم یہ اعتراف کرنے میں کوئی باک نہیں کہ "گل تر" کو میں نے شروع سے آخر تک پڑھا۔ اگر آپ کی جیب اجازت دے یا آپ

کسی لائبریری کے ممبر ہیں تو گل تر کو ضرور پڑھئے یقیناً آپ میرے ہمنوا ہوں گے کہ گل تر واقعی مطالعہ کے قابل شعری مجموعہ ہے۔

جنوبی ہند کی تاریخ :۔ مصنف: کے۔ اے نیل کنٹھ شاستری۔ مترجم آر۔ کے بھٹناگر، سائز ۱۸×۲۲ ضخامت ۶۷۵ صفحات۔ کاغذ چھپائی لکھائی بہتر۔ ناشر ترقی اردو بیورو۔ نئی دہلی۔ قیمت ۲۲ روپے۔ یہ کتاب دفتر شانِ ہند سے بھی دستیاب ہے۔

زمانہ ماقبل تاریخ سے وجے نگر کے زوال تک کی اس تاریخ کا شروع کے ۴۸ صفحات میں جائزہ بہت اچھی طرح تاریخی ماخذ کی روشنی میں لیا گیا ہے اور پھر تاریخی پس منظر میں جغرافیائی حالات۔ ابتدائی اقوام اور تہذیبی تاریخ کا آغاز اور آریوں کا عروج۔ موریہ سلطنت کا زمانہ ستواہن اور ان کے جانشین۔ سنگم اور اس کے بعد کا عہد تین سلطنتوں کا تصادم۔ دو مملکتوں کا توازن۔ چار سلطنتوں کا عہد بہمنی اور وجے نگر سلطنتوں کا عروج۔ وجے نگر سلطنت معاشی و معاشرتی زندگی۔ ادب، مذہب اور فلسفہ فنون لطیفہ اور طرزِ تعمیر عنوانات سے پندرہ ابواب کے زیر بحث اس تاریخ کو ہر ممکن طور پر مکمل اور بہتر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ مترجم نے نہایت صاف سلیس اور آسان اردو میں قاری کے لئے ان تاریخی واقعات کے مطالعہ کے آسانیاں پیدا کی ہیں۔ یعنی بلا ضرورت اپنی ہمہ دانی کا ثبوت دینے کے لئے مشکل اور ثقیل زبان کا استعمال نہیں کیا گیا۔ تاریخ سے رغبت رکھنے والوں کے لئے یہ کتاب من بھاتی تو ہے ہی مگر اردو زبان سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اس کتاب کا سیر حاصل باب "ادب" یقینی طور پر ادبی معلومات میں متعدد اضافوں کا باعث ہوگا۔

علم عروض ہندی میں :۔ (ہندی عروض کی پرچا۔ ایک تعارف) مصنف و ناشر:۔ جناب آر۔ پی شرما [illegible] سائز ۱۰×۱۴/۱۶ کے ۱۰۶ صفحات پر یہ کتاب اپنے ڈھنگ کی نرالی کتاب ہے جسے مصنف نے حضرت علامہ عرش ملسیانی اور جناب جوش ملسیانی کے عروضی جانشین ا، روشن ر، کنور زار سہاری کی نگرانی میں لکھا ہے۔ مصنف

تعمل سکے عروض کو ہندی میں اس طرح ڈھالا ہے کہ ہندی غزل کہنے والے بھی اس علم سے پورے طور سے روشناس ہو سکیں ابھی تک ہندی میں عروض پر ایسی کوئی تصنیف نہیں شائع ہوئی جس میں عروض کا پورا احاطہ کیا گیا ہو۔ ارکان۔ اوزان فروعات و زحافات۔ بحور وغیرہ سب ہندی میں ہیں جسے ہندی کے شاعروں کے لئے عروض سے متعلق ایک نئی در یافت کیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر فعولن کو "[illegible]" فاعلن کو "[illegible]" اوزان کو "[illegible]" فروعات و زحافات کو "[illegible]" بحر متقارب کو "[illegible]" وغیرہ کیا گیا ہے اس لئے کہ ہندی والوں کو سمجھنے میں کوئی دقت نہ ہو۔

تقطیع کے مکمل اصول ہندی الفاظ کے تلفظ اور قواعد کو مد نظر رکھ کر تشکیل کئے گئے ہیں۔ مقبول بحور اور اوزان کو تقطیع کر کے سمجھایا گیا ہے۔

علم عروض میں بحر متقارب اور بحر متدارک میں جو فرق اور پیچیدگیاں ہیں انھیں بھی مصنف نے امثال دے کر بخوبی سمجھایا ہے۔ تخنیق اور تسکین کا عمل ان بحور میں کس طرح واقع ہوتا ہے یہ بھی اس تصنیف میں تفصیل سے بتایا گیا ہے تخنیق کو "[illegible]" اور تسکین کو "[illegible]" کیا ہے۔

مروجہ انیس بحور اور فروعات کی مکمل فہرست دی گئی ہے اور فروعات سے بحریں تشکیل کرنے کا طریقہ بتایا گیا ہے۔ رباعی کے مروجہ ۲۴ اوزان اور ان کے علاوہ حضرت علامہ سحر عشق آبادی کے ایجاد کردہ بارہ اوزان کی فہرست بھی دی گئی ہے۔

کتاب کے آخر میں تقطیع کے لئے کچھ مشق بھی فراہم کی گئی ہے جناب ڈاکٹر زار علامی نے اس تصنیف کو بغور ملاحظہ فرمانے کے بعد مصنف کو گراں قدر مشوروں اور عروضی اصلاحوں سے نوازا جس کی روشنی میں مصنف نے یہ علم عروض پر مستند کتاب شائع کی۔

چونکہ ہندی ارکان۔ اوزان، فروعات و زحافات۔ [illegible] کے ہندی ناموں کے ساتھ ساتھ اردو ارکان وغیرہ دستے گئے ہیں۔ اس لئے ہندی اور اردو دونوں زبانیں جاننے والوں کے لئے یہ کتاب یکساں طور پر مفید ثابت ہوگی شائقین علم عروض کے لئے تو یہ کتاب بہرا نمول تحفہ ہے ہی مگر مبتدی اور منتہی دونوں کے حق میں اس کا مطالعہ باعث راحت ثابت ہوگا۔

بقیہ :- بے آواز روشنی

جب کوئی کسی کا احسان ہی نہیں مانے گا۔ اور بھلے مناسب کی تعریف ہی نہیں کرے گا۔ اچھا سوچنا اور اچھا کرنا اچھا کام ہے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ اچھے لوگ گھٹتے جا رہے ہیں۔ اچھائی کم ہوتی جا رہی ہے۔

میری بات سن کر منشی جی کے چہرے پر ایسی خوشی کی لہر دوڑ گئی جیسے عموں سے بے زار کسی مضطرب کے چہرے پر صبح کی روشنی دیکھ کر خوشی چھا جاتی ہے۔

پاکستانی نژاد شہنشاہ غزل
مرحوم ناصر کاظمی
کا شہرہ آفاق مجموعہ کلام

دیوان

آفسٹ چھپائی۔ بہترین کاغذ۔ خوشنما جلد
بہت کم جلدیں فروخت کے لئے موجود ہیں
قیمت : ساڑھے بارہ روپیے
آج ہی طلب فرمائیے
دفتر شانِ ہند۔ فلیٹ ۵ انصاری مارکیٹ
دریا گنج۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

ماہنامہ شانِ ہند۔ نئی دلی ۱۱۰۰۰۲

اِندرا، ماں امر شہید ہوئی

محترمہ اندرا گاندھی کی شہادت پر جناب ساحر ہوشیارپوری نے ایک نظم "امر شہید" کہی (جو سرورق کے دوسرے صفحہ پر مرحومہ کی تصویر کے ساتھ شائع کی جا رہی ہے) اس نظم کو ساحر ہوشیارپوری نے بڑے ہی اچھے انداز میں مرحومہ کی تصویر اور ان کی آخری تقریر کے ایک یادگاری فقرے کو شائع کیا ملک بھر کے ادیبوں، شعراء اور دانشوروں نے اس نظم کی پسندیدگی پر جو آراء گرامی بھجوائی ہیں انھیں امر شہید محترمہ اندرا گاندھی کی پہلی برسی پر انتہائی دلی عقیدت کے ساتھ مرحومہ کے چرنوں میں بھینٹ کیا جا رہا ہے۔

ودیا پرکاش سرور تونسوی، ایڈیٹر

نورالحسن ہاشمی۔ لکھنؤ۔

آپ نے اندرا گاندھی کی شہادت پر 'امر شہید' کے عنوان سے جو نظم لکھی ہے۔ وہ بہت خوب ہے۔ مختصر اور جامع۔ مطلع تو بہت خوب۔ ظاہری طباعت وغیرہ بہت نفیس۔

عروج زیدی رامپور

اب سے پہلے اور بہت پہلے آپ کی خوب صورت نظم 'امر شہید' کے مطالعہ کا شرف نصیب ہوا تھا میں اس زمانہ میں بستر علالت پر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی رسید بروقت ارسال خدمت نہ کر سکا۔ اب حالت قدرے سنبھلی ہے تو یہ سطور معرض تحریر میں لائی جا رہی ہیں۔ تاخیر پر ندامت کے ساتھ۔ مذکورہ بالا عنوان نظم تو دوسروں کے ہاتھ بھی مل سکتا ہے مگر انداز بیان میں جو قدرت اور صلابت ہے اس کا جواب ممکن نہیں۔

امر چند قلیس۔ بسی کلاں (ہوشیارپور)

"امر شہید" خوب ہے۔ کیا کہنا اس سلسلہ کی تمام 'نیں' ایک طرف (ترازو کے پلڑے میں) اور 'امر شہید' دوسرے پلڑے میں۔ دوسرا پلڑا بھاری رہے گا پہلے شعر میں 'دو' 'والا' 'درد' سے 'بالا' ایسے شعر کو مرصع شعر کہتے ہیں۔ دونوں مصرعوں کے الفاظ کی تعداد برابر (صنعت ترصیع) دوسرے شعر کا دوسرا مصرع۔ لاجواب تیسرے مصرع میں تشبیہ (مثال) خوب۔ اگلے تین اشعار کا کیا کہنا! (طنز جمیل) آپ کی جرأت؟ خدا کی شان!

کتابت، طباعت دیدہ زیب اعلیٰ بینظیر۔

بخشی اختر امرتسری۔ دلی

آپ کی ارسال کردہ نظم اندرا جی سے متعلق 'امر شہید' کے عنوان سے مجھے اور عزیز راکا دونوں کے لئے نظر نواز ہوئی بہت بہت شکریہ۔ نظم 'امر شہید' کا آغاز بہت ہی عمدہ ہے جس کی داد کے لئے مجھے الفاظ نہیں مل رہے کہ میں اس کی خوبی کو ظاہر کر سکوں کہانی کے انداز میں اس کا آغاز آپ نے کیا جو دل میں بیٹھ جانے والا ہے۔ (ایک رانی کے دو محافظ تھے) کون کون؟ اور پھر کیا ہوا؟ انھوں نے کیا کیا؟ نتیجہ کیا نکلا۔ قربان جاؤں اس انداز پر۔ یہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ شعر نمبر ۱۔ ایک پیام دیتے ہوئے نام ہوتے ہوئے اس کی بیوفائی کی ندا کو ظاہر کر رہا ہے اور ایک ست ونت۔ یہ بھی اس کے نام کو ظاہر کرتے ہوئے اس کی بے حیائی کی سچی ملکیت کا مظہر ہے خوب اور بہت خوب۔ طنز کی چاشنی بھی ہے جو اللہ کرے زور قلم اور زیادہ آمین۔ پھر سے پاک نظم سلک مروارید ہے

... مختصر ترین نظم کے لئے میری اور عزیز ناز کی طرف
سے داد و تحسین کے ساتھ مبارکباد قبول فرمائیں۔

پرکاش دیال لعل (جالندھر)

آپ کی جدت کی کوئی کیا داد دے گا۔

امن کے دشمنوں کی عید ہوئی
اندرا ماں امر شہید ہوئی

نظم کے جملہ اشعار آپ کی عقیدت کی گواہی دے رہے ہیں اور سب کے سب حقیقت پر مبنی ہیں۔

علی سردار جعفری (بمبئی)

اندرا گاندھی کی شہادت پر آپ کی نظم کا خوبصورت شکریہ [illegible] ہے۔ ع دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے

قمر جلال آبادی (بمبئی)

آپ کے دل کی آواز بھارت کے دل کی آواز۔

"اندرا ماں امر شہید ہوئی"

ڈاکٹر جاوید وششٹ (دلی)

آپ کی کتابچہ نما نظم "امر شہید" مختصر مگر جامع ہے۔ یہ نظم EVERY DROP OF MY BLOO[D] سے "اندرا ماں امر شہید ہوئی" تک خلوص جذبات کا آئینہ ہے [illegible] مرثیے کی صنف میں "امر شہید" ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ آپ نے "امر شہید" کے لئے "زہر عشق" کی طرز کا انتخاب کر کے نظم کے ترنم کو مقصد غم سے ایسا ہم آہنگ کیا ہے اس اقدام سے شدید تاثیر ابھرتی ہے۔ شہید اندرا گاندھی کے لئے آپ نے جس خلوص و غم و غصہ کا اظہار کیا ہے وہ نظم کی [illegible] کو نمایاں کرتا ہے۔ واقعی آپ نے اس نظم میں شاعری نہیں [illegible]

امیت علی کرامت (اڑیسہ)

[illegible] نظم "امر شہید" موصول ہوئی حالانکہ اس قسم کی [illegible] نظموں کا معیار برقرار رکھنا مشکل ہوتا ہے مگر [illegible] جذبات [illegible] نے اس نظم میں دیرپا اثرات پیدا کر دیئے ہیں۔ پوری نظم کا لہجہ طنز آمیز بھی ہے اور چند [illegible] حقائق کا صحیح ترجمان بھی، لیکن آخری دو مصرعوں میں

آپ نے نظم جس عمدگی سے [illegible] دیا ہے کہ [illegible] بے ساختہ [illegible] کہانی بن کر نظر آتی ہیں۔

ڈاکٹر [illegible] علاقی (کرنال)

تاریخی دستاویز

"دریا کو کوزے میں بند کرنا" کسی بڑی بات کو مختصر الفاظ میں بیان کرنا۔ ہماری وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی آنجہانی کی شہادت کیوں ہوئی اور کن حالات میں ہوئی یہ ایسے سوالات ہیں جن کی تشریح کے لئے ایک دفتر چاہیئے۔ حضرت ساحر ہوشیارپوری نے جن کا شمار ملک کے برگزیدہ شعرائے کرام میں ہوتا ہے "اس سانحہ کو نہایت مختصر اور جامع الفاظ میں بیان فرما کر اپنی کہنہ مشقی، فن کاری اور قادر الکلامی کا ثبوت دیا ہے۔ ساحر کی یہ تخلیق یقیناً ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔

رام لعل (لکھنؤ)

اندرا گاندھی کے بارے میں آپ کی مطبوعہ نظم ملی۔ بہت ہی اثر انگیز اور جذبات مندانہ ہے۔ یہ کام آپ ہی کر سکتے ہیں اس سے کروڑوں دلوں کی ترجمانی ہوتی ہے۔

جوگندر پال (نئی دلی)

آپ کی نظم میں جس انداز سے طنز اور خفگی کے عناصر ابھر کر آتے ہیں اس سے احساس ہوتا ہے کہ آپ کو اپنی [illegible] کی نیک قدروں کا کتنا زیادہ پاس ہے۔

وشنا ملک پوری (پونہ سیٹی)

۱۴ مارچ کو آپ کا ارسال کردہ بک پوسٹ موصول ہوا۔ اسے پا کر اور پڑھ کر میں اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا اور جب آپ کی ارسال کردہ نظم میں نے اپنے گھر کے افراد کو سنائی تو گویا ایک مجلس غم برپا ہو گئی۔ یہ حقیقت ہے کہ ہمارے ملک کی ایک انتہائی مضبوط اور عظیم المرتبت خاتون وزیر اعظم کے سفاکانہ قتل کے تاثر میں ملک کے بیشتر معروف و غیر معروف اہل قلم نے اپنے جذبات و محسوسات کا اظہار کیا ہے خود میں نے بھی ایک نظم کہی ہے مگر میری نظر سے کوئی نظم "امر شہید" سے زیادہ مختصر اور جامع نہیں گزری۔ اس کا پہلا ہی مصرعہ

قاری کی توجہ کو اپنی طرف جذب کر لیتا ہے اور بعد کا شعر اس ابہام کی تفصیل بن جاتا ہے۔ قاتلوں کے نام کی معنویت سے آپ نے فائدہ اٹھاتے ہوئے بڑی شاعرانہ سلیقہ مندی کا مظاہرہ کیا ہے اور پھر بعد کے دو شعروں میں جو الفاظ ایسے ننگِ انسانیت اور بد سرشت قاتلوں کے لئے استعمال کئے گئے ہیں دراصل وہ اسی کے مستحق ہیں۔

کام دونوں نے لا مثال کیا
خوب حق نمک حلال کیا

میں چھپے ہوئے طنز، درد، کرب اور کراہ کو صرف محسوس ہی کیا جا سکتا ہے آپ نے اس کو جس اہتمام و احتشام سے شائع کرایا ہے یہ نظم اپنے ایجاز کے اعجاز کی وجہ سے اس اعزاز کی بلاشبہ مستحق ہے۔ میں تو اسے فریم میں سجا کر بطور یادگار رکھ دوں گا۔ یہی نہیں جب سے مجھے یہ نظم ملی ہے اپنے کئی سخن فہم دوستوں کو سنا چکا ہوں سب نے اسے بے حد پسند کیا۔ آپ نے یہ بھی بہت اچھا کیا کہ ایک طرف ہندی رسم الخط میں اسے چھپوا دیا۔ میرے ایک عزیز اردو داں دوست سری کھیم چند ہیں انھوں نے مجھ سے فرمائش کی ہے کہ ایک کاپی ان کے لئے منگوا دوں۔ وہ بھی اسے فریم میں سجا کر رکھنا چاہتے ہیں اور بھی کچھ احباب کی فرمائش ہے اگر آپ کے پاس کچھ کاپیاں موجود ہوں تو آپ کچھ اور بھجوا کر مزید کرم فرمائیں۔

واکی آسی (لکھنؤ)

آپ نے اپنی بے انتہا نفاست پسند طبیعت کے تقاضے سے "امر شہید" نامی خوبصورت نظم چھپوا کر اردو کے تمام شاعروں کے جذبات کی نمائندگی کی ہے۔ اتنی مختصر سی نظم میں اتنی بڑی بات کہنا ہر ایک کے بس کی بات بھی نہیں۔

ہمت لال شرما (بمبئی)

آپ کی ارسال کردہ معرکۃ الآرا نظم "امر شہید" نظر نواز ہوئی۔ واللہ کیا بات ہے! اس سے پیشتر بھی میں نے یہ نظم کریم ارشل صاحب کے دفتر میں آپ سے سنی تھی۔ ایسی لاجواب نظم کم ہی دیکھنے میں آئی ہے۔ آپ کی یہ کاوش قابل ستائش [illegible]

صابر ابوہری (نئی دلی)

"امر شہید" اندرا گاندھی سے متعلق آپ کا ارسال کردہ پمفلٹ مل گیا۔ شکریہ۔ نظم جتنی مختصر ہے اتنی ہی زیادہ موثر ہے۔ پمفلٹ کی تشکیل و ترتیب اور اندرا گاندھی کے انگریزی اظہارات کی شمولیت نے اس کے تاثر کو اور بھی دل گداز بنا دیا ہے۔

تسنیم فاروقی (لکھنؤ)

آپ کی نظم "امر شہید" ملی۔ حسین و جمیل کارڈ پر ایسی اہتمام و رنگ آپ کے جذبات کو منظوم دیکھ کر دلی مسرت ہوئی۔ یہ صرف و حرف کسی نہایت حساس شاعر ہی کا حصہ ہو سکتا ہے۔ آپ نے بجا طور پر اردو کے شعرا کی نمائندگی اس انداز میں انجام دی ہے۔ سہل و معیار کے اعتبار سے یہ آپ کی پہلی نظم ہے ورنہ بہت سی نظمیں آنجہانی اندرا گاندھی پر میری نظروں سے گزریں اس خلوص آفریں لہجہ کا فقدان تھا۔

کرشن چندرن (نئی دلی)

محترمہ اندرا گاندھی کی شہادت پر آپ کی نظم مل گئی تھی۔ بہت دل سوز اور پراثر تخلیق تھی۔ ایک شاعر کا والہانہ خراج عقیدت تھا۔ ایک دردمند کے آنسوؤں کا نادر مرقع تھا۔

اختر نظمی (گوالیار)

"امر شہید" آپ کا ایک امر اور لازوال کارنامہ ہے اس میں احساس کی گہرائی بھی ہے اور تاثرات کی گہرائی بھی۔

عفت موہانی (حیدرآباد)

کل آپ کا مرسلہ اندرا شہید کا کارڈ ملا۔ بہت خوبصورت بہت موثر ہے مجھے بہت پسند آیا۔ یہ ایک مستقل دستاویز بن سکتا ہے۔ ہم سب کے لئے۔ پوری قوم کے لئے۔ ایک کاپی [illegible] رہبری وزیر اعظم کی خدمت میں بھی پیش کیجئے۔ آپ کے اشعار موقع کی مناسبت سے اتنے مضبوط ہیں جیسے کسی زمین پر کوہ گراں ان میں کوئی تبدیلی کوئی رد و بدل نہیں ہو سکتا۔

ممتاز مرزا (دلی)

"امر شہید" محترمہ اندرا گاندھی کی دردناک شہادت کی دلدوز تصویر ہے۔ آپ نے جس سادگی اور خلوص سے ہم سب کے جذبات کی عکاسی کی ہے۔ وہ در حقیقت آپ ہی کا حصہ ہے۔ [illegible]

نذرِ قلم اور زیادہ۔

کاش یہ نظم ذرا طویل ہوتی تاکہ اندرا جی کی ذات کے دوسرے پہلو بھی اجاگر ہو سکتے اور اس طرح اس سانحۂ عظیم اور ناقابلِ تلافی نقصان کا بیشتر احساس ہو سکتا۔

یادؔ دہلوی (لکھنؤ)

اندرا جی کے المناک حادثے نے پورے ملک کو ہلا کر رکھ دیا اس پر جتنا بھی لکھا جائے کم ہے۔ آپ نے اپنے تاثرات بڑی خوبصورتی سے نظم کئے ہیں۔

کنہیا لال پوسوال (چنڈی گڑھ)

"امر شہید" نظم فرما کر آپ نے قوم پر احسان کیا ہے۔ مبارکباد۔ مجھے بے حد پسند آئی اور جن دوستوں نے پڑھا سب نے داد دی۔

شریف الحسن نقوی (سکریٹری اُردو اکادمی۔ دہلی)

"امر شہید" کے نام سے آپ کی نہایت خوبصورت نظم اندرا جی کی تصویر کے ساتھ ملی۔ آپ نے واقعی بہت اچھا فولڈر نکالا۔ اس ... بھی تھی اور اہمیت بھی۔

دانش (دہلی)

اندرا جی کو خراجِ عقیدت جس طریقے سے آپ نے پیش کیا ہے اس ... آپ کی قدر و منزلت بڑھ جائے گی۔

حکیم گنگا رام گاندھی (دہلی)

... اندرا جی کی شہادت کے سلسلے میں لکھی ہوئی آپ کی چھپی ہوئی نظم مع مرحومہ کا فوٹو ملی۔ "بے انت" اور "ست ونت" سے تاریخ و زمن کی تشبیہ بہت خوب ہے۔ اگر اس سے موزوں لفظ تلاش کر سکتے تو اور اچھا ہوتا۔

ایس پی جین (نئی دہلی)

یاد آوری کا شکریہ۔ نظم بہت خوب لکھی ہے اور حسبِ موقع ہے۔ یقیناً ملک کے لئے مفید ثابت ہوگی۔

ایم۔ اے۔ صدیقی۔ (دہلی)

مسز گاندھی کی موت سے متعلق کارڈ ملا۔ شکر گزار ہوں۔ یہ خیال اچھا ہے منفرد اور بہت اچھا رہا۔ مبارکباد قبول فرمائیں۔ ترتیب اور طباعت وغیرہ سب ٹھیک ہے۔ بہرحال یہ کارڈ دستاویزی حیثیت کا حامل ہے۔

سرداری لال نشتر (شملہ)

ابھی ابھی نوکِ خامہ کو نوکِ نشتر بنا نے والا "امر شہید" موصول ہوا۔ بہت بہت شکریہ! عجیب شے تھی۔ امر شہید ہونے والی عظیم ہستی ... جو زمیں سے گردوں کی وسعتوں تک بھی ستاروں کی طرح شرارے اچھالتی تھی ... تاکہ رابطہ نہ ٹوٹے زندگی سے روشنی کا!

حسن نعیم (بمبئی)

آپ کی خوبصورت نظم "امر شہید" موصول ہوئی تھی پڑھ کر بہت سی یادیں تازہ ہو گئیں۔ آپ نے اچھا کیا جو یہ فولڈر تیار کروا لیا۔

دل الوبلی (ٹونک)

ابھی گھنٹہ بھر پہلے آپ کی نظم "امر شہید" کارڈ کی صورت میں موصول ہوئی نظم ہی کیا کم تھی اس پر یہ اندازِ پیش کش! یہ ادا بھی دل کے کلیجے کر گئی!! معاً خیال ہوا کہ نظم کی داد نظم ہی میں کیوں نہ دی جائے ملاحظہ ہو:۔

ایک ماں کے شہید ہونے سے
جتنے فرزند تھے، تڑپ اٹھے
چین دل کا خیال و خواب ہوا
موجِ خوں، دیدۂ پُر آب ہوا
آسمان و زمیں کو ماتم تھا
خامشی کیا تھی ہُو کا عالم تھا
وار اک اور کر گیا قاتل
خوں ہوا قلبِ شاعرِ بسمل
رگِ احساسِ فن بھڑک اٹھی
پارۂ آگ سی بھڑک اٹھی
... جب نہیں رہا یارا
بند کوزے میں کر گیا دریا
دل کا آئینہ چور چور ہوا
ساحرِ ہوشیار پور ہوا

یوگیندر پال صابر (شکوہ آباد)

آپ کی نظم "امر شہید" موصول ہوئی۔ نظم پڑھ کر دل خوش ہو گیا۔ اندرا جی کی شہادت پر جو بہترین نظمیں کہی گئی ہیں ان میں آپ کی نظم ادھر سے ایک ہے۔

برہانند جلیس (نئی دہلی)

لافانی نظم بروفات اندرا گاندھی موصول ہوئی۔ اس مختصر اور مکمل گراں مایہ تخلیق کے لئے جس قدر داد دی جائے کم ہے تمام حضرات کے پاس یہ پہنچے گی یقیناً خراج تحسین حاصل کرے گی۔ پھر جس اہتمام سے آپ نے اسے محترمہ گاندھی کے فوٹو کے ساتھ اشاعت پذیر کروایا ہے وہ ایک نادر چیز بن گئی ہے جو یادگار کی شکل میں محفوظ رہے گی۔

نظام الدین نظام (بمبئی)

خوبصورت کاغذ پر آپ کی شاہکار نظم امر شہید موصول ہوئی بلاشبہ آپ کی یہ نظم غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ بالخصوص پہلا شعر جس میں امانت اور سہاگن کا خوب صورت استعمال آپ ہی کا حصہ ہے۔

رئیس رامپوری (رامپور)

آج محترمہ اندرا گاندھی صاحبہ پر آپ کی نظم ان کا آخری تاریخی ارشاد اور ان کی تصویر نظر نواز ہوئی۔ اس مختصر مگر جامع نظم کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے یوں تو اس سلسلے میں ان پر بہت کچھ کہا جا چکا ہے مگر جس انداز سے آپ نے قلم اٹھایا ہے وہ انتہائی متاثر کن ہے اور اس لیئے لائق صد ستائش ہے۔

پرکاش ناتھ پرویز (چنڈی گڑھ)

آپ کی نظم امر شہید موصول ہوئی شکریہ۔ محترمہ اندرا گاندھی کی شہادت سے متعلق آپ کے اشعار لاکھوں دلوں کے جذبات اور محسوسات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ مرحومہ کا نام تاابد ہمیشہ درخشندہ و تابندہ رہے گا۔

چندر پرکاش جوہر بجنوری (الہ آباد)

محترمہ اندرا گاندھی پر لکھی ہوئی نظم امر شہید موصول ہوئی۔ اس نظم کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے میری جانب سے اس سلسلے میں دلی مبارکباد قبول فرمائیں۔ آپ نے اس نظم کو چھپوانے میں بڑے اہتمام سے کام لیا ہے۔ آپ کے اس سلیقے کی داد دیئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ خدا آپ کو بہت دنوں تک ہم لوگوں کے درمیان قائم رکھے۔

پرکاش تیواری (نئی دہلی)

آپ کا ارسال کردہ نظم والا کارڈ ملا گیا۔ بہت بہت شکریہ اور ساتھ ہی یادآوری کے لئے سراپا سپاس ہوں نظم پسند آئی اور ایک اچھی نظم کے لئے مبارکباد قبول فرمائیں۔

شفیع اللہ خان راز فراشادی (اٹاوہ)

ابھی ابھی ڈاک سے عنایت کردہ تحفہ نظم امر شہید موصول ہوئی پڑھ کر جھوم رہا ہوں۔ کالج میں احباب کو پڑھنے کو دی سب حضرات نے نظم کو بہت سراہا۔ نظم کی ندرت و انفرادیت متاثر کرتی ہے۔

پرکاش فکری (رانچی)

امر شہید کے لئے آپ نے مجھے بھی یادوں میں رکھا میں اس کے لئے سراپا سپاس ہوں۔ میرا غم و غصہ پورے دیش کو سالتا رہا اس کا اظہار اسی ڈھنگ سے ہونا چاہیئے تھا۔

ہردیال شوق (چنڈی گڑھ)

آپ کی نظم بعنوان امر شہید بہت خوب اور مؤثر ہے اس میں ہندوستانی عوام کے عقیدتمندانہ جذبات کی بدرجہ اتم ترجمانی کی گئی ہے۔

گوہر عثمانی (مرادآباد)

امر شہید موصول ہوئی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اندرا جی کی شہادت پر لکھی گئی ہندوستان کی تمام نظموں میں یہ سرفہرست نظم ہے۔ بہترین بندشیں۔ اچھوتے خیالات اور ندرت بیاں ہر مصرعے سے آشکار ہے۔ آپ کا شمار ہندوستان کے صف اول کے اساتذہ میں ہے۔ میں دست بدعا ہوں کہ مولائے کائنات آپ کا سایہ ہمارے سروں پر قائم و دائم رکھے۔ آمین۔

شاہد احسن (مرادآباد)

مقتولہ وزیر اعظم محترمہ اندرا گاندھی جنہیں آپ نے بجا طور پر امر شہید کہا ہے ان کے قاتلوں کی مذمت میں لکھی نظم کا فوٹو موصول ہوا۔ یاد آوری کے لئے شکر گزار ہوں۔ آپ نے اپنی نظم میں ایک سچے وطن پرست کے دل میں چھپے ہوئے درد کی عکاسی اور جن بے ریا جذبات کا اظہار کیا ہے وہ لائق ستائش ہے۔

نسیم شاہجہانپوری (شاہجہانپور)

آپ کی نظم امر شہید نظر نواز ہوئی بہت بہت شکریہ

آپ کی نظم میں حقیقت کی صحیح عکاسی پائی جاتی ہے آپ کی شاعرانہ عظمت سے کسے انکار ہے۔

آتش بہاولپوری (سونی پت)

سابق وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کی شہادت کے متعلق قبلہ ساحر ہوشیارپوری کی نظم "امر شہید" ایک نہایت متاثر کن اور کامیاب تخلیق ہے۔

عرش صہبائی (روہتک)

"امر شہید" مختصر لیکن پُر تاثیر نظم ہے۔ جس قدر بھی تعریف کی جائے کم ہے۔

آزاد گورداسپوری (جمشید پور)

شریمتی اندرا گاندھی سے متعلق آپ کی بہترین کاوش بعنوان "امر شہید" باصرہ نواز ہوئی۔ آپ نے نہایت ہی مؤثر انداز میں نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے۔ جس کے لئے آپ مستحق ہزار تحسین و آفریں ہیں۔

م۔ م۔ راجندر (دلی)

اندرا جی کی موت ساری قوم کے لئے المناک ترین سانحہ ہے۔ آپ کے محسوسات پر مشتمل کارڈ ملا۔ یاد آوری کے لئے بیحد شکرگزار ہوں۔

سیف الرحمٰن عباد

آپ کا ارسال کردہ کارڈ ملا۔ نظم اور اسے پیش کرنے کا انداز دونوں خوب ہیں۔ مبارکباد قبول فرمائیں۔

کیلاش ماہر (نئی دلی)

مدتوں بعد آپ نے یاد کیا وہ بھی اپنی نظم بھجوا کر۔ بہت خوب نظم لکھی ہے جو بالکل ساحر ہوشیارپوری، فصاحت و بلاغت کا دوسرا نام، جیسی ہے

آزاد گلاٹی (نابھہ)

آپ نے نہایت سادہ، لیکن دل کی گہرائیوں میں اترنے والے الفاظ میں قومی المیہ کو فنکارانہ چابکدستی سے اس طرح پیش کیا ہے کہ قاری کے دل میں اس المیے سے پیدا شدہ حزنیہ کیفیت پوری طرح سرایت کر جاتی ہے اور کہیں کہیں طنز کی ہلکی سی چاشنی آپ کے ذاتی ردعمل کو بتلانے ہی والا

کا ردعمل بنا دیتی ہے۔

پریم کمار نظر (ہوشیارپور)

آپ کی نظم "امر شہید" اس شخصیت کی طرح بے مثال ہوکر پر کہی گئی ہے اور میں اس حوصلے اور اہتمام کی داد دوں گا اسے کہنے اور پیش کرنے میں برتا گیا ہے۔ مبارک۔

مہر گیرا (جالندھر)

آپ کی نظم اور فولڈر بہت خوب ہے۔ سبھی دوستو اس قومی احساس کی بہت تعریف کی ہے۔

ساحر پالمپوری (مارنڈہ)

مرحومہ وزیر اعظم اندرا گاندھی کی تعزیت میں تخلیق آپ کی حقیقت پسندانہ بیباک نظم ایک دیدہ زیب کارڈ کی صورت میں باصرہ نواز ہوئی۔

ع اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

کرشن کمار طور

میں شکرگزار ہوں کہ آپ نے مجھے شریمتی گاندھی کے بہیمانہ قتل پر اپنے تاثرات سے نوازا۔ آپ کی نظم کے دلی دکھ کی نہ صرف آئینہ دار ہے بلکہ ہم سبھوں کے جذبات کی بھی عکاسی کرتی ہے۔

سکھدیو شرما (جالندھر)

شہید شریمتی گاندھی پر آپ کی درد انگیز نظم پڑھ کر متاثر ہوا ہوں۔

اجیت کمار دل (نکودر)

"امر شہید" کے عنوان سے جو نظم قابل تعریف اور پُر ہے۔ دیش کے داغ قوم کے غدار، خوب کہا صاف گوئی کی زندہ مثال ہے۔

ضیا فتح آبادی (دلی)

کچھ روز پیشتر شریمتی اندرا گاندھی کی شہادت پر آپ کی مختصر مگر جامع نظم نظر نواز ہوئی تھی۔ نظم واقعی آپ نے بڑی محنت اور لگن سے کہی ہے اور اسے شائع بھی بڑی خوبصورتی سے کیا ہے۔ اس نظم میں آپ نے بڑی چابکدستی سے رقت اور صداقت کے [illegible] جذبات کو سمو دیا

مل یہ جذبات آپ کے ہر کسی تمام تر ہے کے ہیں اور
سبب اس چھوٹی سی نظم کی تاثیر اور تاثر کا ہے۔ اس
اب نظم پر آپ واقعی مستحق مبارکباد ہیں۔ جب غزل کا
رکامیاب نظم کہتا ہے تو وہ نظم کچھ زیادہ ہی کامیاب
ہے۔ اندرا جی کو یہ بیش قیمت خراجِ عقیدت ہے۔

بل نند سوز (فرید آباد)

شاعر کا خراجِ عقیدت ہمیشہ اس کے اشعار ہی ہے
۔ وہ نہ تو کسی کا مجسمہ کھڑا کرنے کی استطاعت رکھتا ہے
نہ کوئی تاج محل بنوانے کی۔ اس کے جذبات اور
احساسات ہی اس کا سرمایہ ہوتے ہیں جنھیں وہ پورے
ن اور صدق دلی کے ساتھ الفاظ کے گلدستوں میں
کر اس عظیم اور قابلِ تعظیم ہستی کی نذر کرتا ہے جس سے
عقیدت ہوتی ہے۔

جناب ساحر ہوشیار پوری نے بھی اسی جذبے کے
ت وطن دشمنوں کے سفاکانہ فعل سے دل گرفتہ ہو کر
ب رہنمائے ملت شریمتی اندرا گاندھی کی شہادت پر
ل کی گہرائیوں سے نکلے ہوئے اشعار عقیدت کے طور پر
ش کئے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس المناک تاریخی سانحہ
بارگاہ میں یہ گلہائے عقیدت صدیوں تک شگفتہ اور
بہار رہیں گے۔

م پرکاش راحت (فرید آباد)

جناب ساحر ہوشیار پوری کی نظم "امر شہید" پڑھ کر
محسوس ہوا کہ ابھی کچھ اہلِ قلم باقی ہیں۔ جو حق بات
کی جرأت رکھتے ہیں۔ قاتلوں کے ناموں کو جس خوبی
معنوی طور پر انھوں نے استعمال کیا ہے۔ یہ انہی کا
ہے۔

او۔ پی۔ منگال (لدھیانہ)

سابق وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی سے متعلق آپ
نظم پمفلٹ کی صورت میں نظر نواز ہوئی۔ نظم اور فولڈر
دونوں نہایت شاندار ہیں۔ اس ناقابلِ تلافی نقصان
آپ نے جس انداز سے نظم کو پیش کیا ہے اس سے
آپ کے شدید رنج و غم کا احساس ہوتا ہے۔
(انگریزی سے ترجمہ)

او پی۔ او ہری (مدراس)

آپ کا فرستادہ فولڈر موصول ہوا۔ جسے دیکھ کر
گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ تمام افرادِ خانہ کو نظم پڑھ کر
سنائی اس وقت میری آنکھوں سے آنسو رواں تھے
کارڈ اور نظم دونوں کی حلقۂ احباب نے بھی بہت تعریف
کی۔ آپ مزید کرم کر کے کچھ فولڈرس اور بھجوا دیں
تاکہ میں انھیں یہاں کی چند اہم شخصیتوں اور دوستوں
میں تقسیم کر سکوں۔ (انگریزی سے ترجمہ)

پی۔ ایم۔ اگروال (دہلی)

اندرا گاندھی سے متعلق آپ کی نظم بعنوان "امر
شہید" کا فولڈر موصول ہوا۔ نظم کیا ہے سفاکانہ مزاج
رکھنے والے اندرا گاندھی کے محافظوں کی منہ بولتی تصویر
ہے۔ جنھیں مرحومہ اپنے بچوں کی طرح عزیز رکھتی تھیں۔
کامل یقین ہے کہ یہ نظم اردو اور ہندی کے معروف اخبارات
و رسائل میں نمایاں طور پر شائع ہوگی۔ بہر کیف ایسی عمدہ
نظم پیش کرنے کے لئے مبارکباد قبول فرمائیں۔
(انگریزی سے ترجمہ)

اوم پرکاش ورما (نئی دہلی)

آپ کی نظم بعنوان "امر شہید" کا فولڈر ملا، شکریہ،
نظم واقعی بڑی ہی دلدوز اور اعلیٰ درجے کی ہے۔ میرے
کئی دوستوں نے اس کی بڑی سراہنا کی آپ اس کے لئے
مبارکباد کے مستحق ہیں۔
(ہندی سے ترجمہ)

بیگم توقیر نیازی (امرتسر)

آنجہانی مسز گاندھی کی موت پر جو چند اشعار آپ
نے کہے ہیں واقعی پڑھ کر دل پر گہرا اثر ہوتا ہے اس
حادثہ کی سنگینی کو بڑی خوبی سے آپ نے اپنے شعروں
میں ڈھال لیا ہے۔

"ایکلا چلو رے"
صحیح راستے پر
آپ کا عزم صمیم کے ساتھ
اکیلے ہی گامزن رہنا
آپ کا حوصلہ اور آپ کی رہنمائی
محروم اور مایوس لوگوں کے لئے
آپ کی فکرمندی
ہندوستان اور ہندوستانیوں
کے لئے آپ کی محبت
ہر رنگ کے بنی نوع انسان کے لئے
آپ کی جدوجہد
اسے ہم آج اور ہر روز
یاد کرتے ہیں۔
ہم جانتے ہیں کہ آپ کو
یاد رکھنے کا صحیح طریقہ ہے
اپنے اتحاد کو قائم رکھنا
آپ کی شان کے شایان یادگار ہے
امن و آشتی بنائے رکھنا

davp 85/399

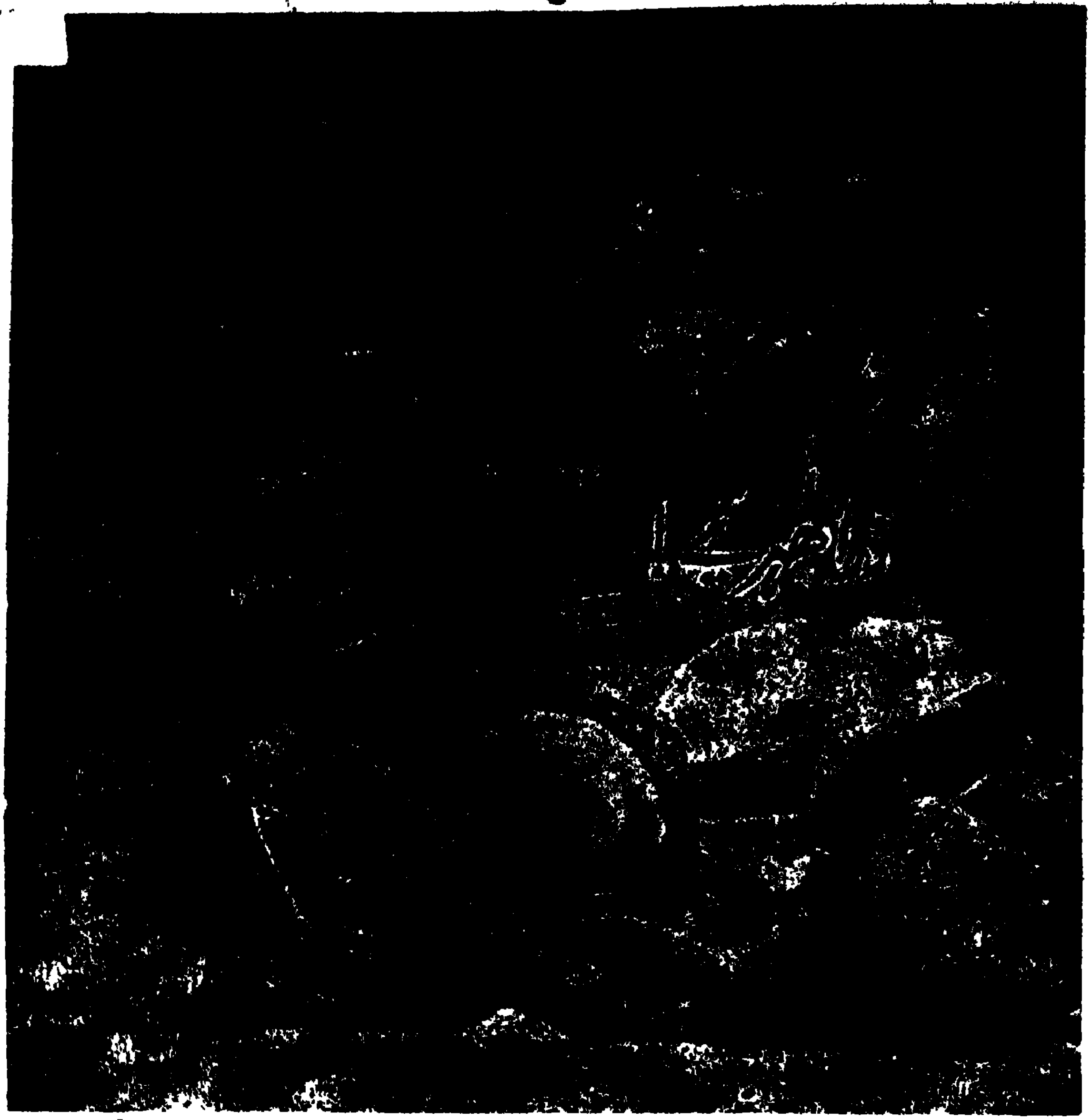

کیا آپ گلے کی تکلیفوں میں اکثر مبتلا رہتے ہیں اور اس کی وجہ سے سخت پریشان ہیں، لیکن یہ نہ سمجھئے کہ ایسی پریشان کن بیماری سے گلا کاٹ دینے سے ہی چھٹکارا مل سکتا ہے۔ ذرا ٹھہریئے! خالص دیسی ادویات سے تیار کیا ہوا "ٹونسلیکس" ایک بار صرف ایک بار استعمال کرکے تو دیکھئے، پھر آپ کو گلے کے غدود بڑھ جانے، گلے کی سرسراہٹ، خراش، گلے کے ورم، زخم اور دوسرے تمام امراض کی شکایت نہیں رہے گی۔ اگر آپ کے علم میں کوئی ایسا مریض ہو، جس کے گلے کے غدود (ٹان سلائٹس) کا آپریشن ہونا ہے تو اُسے اس دوا کے بارے میں ضرور بتایئے گا کیوں کہ پھر اُسے آپریشن کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ چھوٹے بچے جو کھٹی میٹھی چیزیں کھا کر گلا خراب کر لیتے ہیں، اُن کے لئے بھی یہ بہت کام کی دوا ہے۔ گھر میں اس کا رہنا بہت ہی ضروری ہے۔

—— شرع (یونانی اینڈ آیورویدک) لیبارٹریز، لال کنواں، دہلی ۱۱۰۰۰۶

خرید کر پڑھئے :
مانگ کر پڑھئے :
یا پھر
چوری کر کے پڑھئے

یہ ہے ہی اتنا خوب صورت،
اتنا دل کش،
اتنا مکمّل کہ اسے کسی طرح بھی
حاصل کریں کیوں کہ
یہ فیض کی شخصیت اور فن پر ایک
شان دار ادبی دستاویز ہے۔ اِس میں شامل ہیں:

قیمت : پندرہ روپے

- ★ خلوت اور جلوت کے بھید کھولنے والے ذاتی نقوش۔
- ★ نادر و نایاب تصویریں۔
- ★ سدا بہار، ہزار رنگ و منتخب کلام۔
- ★ فیض کی شخصیت کے وہ ڈھکے چھپے گوشے جن پر سے پہلی بار پردہ اُٹھایا گیا ہے۔
- ★ ہندوستان، پاکستان، رُوس اور انگلستان کے دانش وروں کی مشترکہ کاوشوں کا گلدستہ۔

ساری اُردو دنیا میں شبستان کے "فیض نمبر" کا چرچا ہے

اس سے پہلے کہ اسٹاک ختم ہو جائے آج ہی اپنے قریبی نیوز ایجنٹ سے طلب کیجئے یا براہِ راست ہم سے منگوائیے۔

شبستان اُردو ڈائجسٹ، آصف علی روڈ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

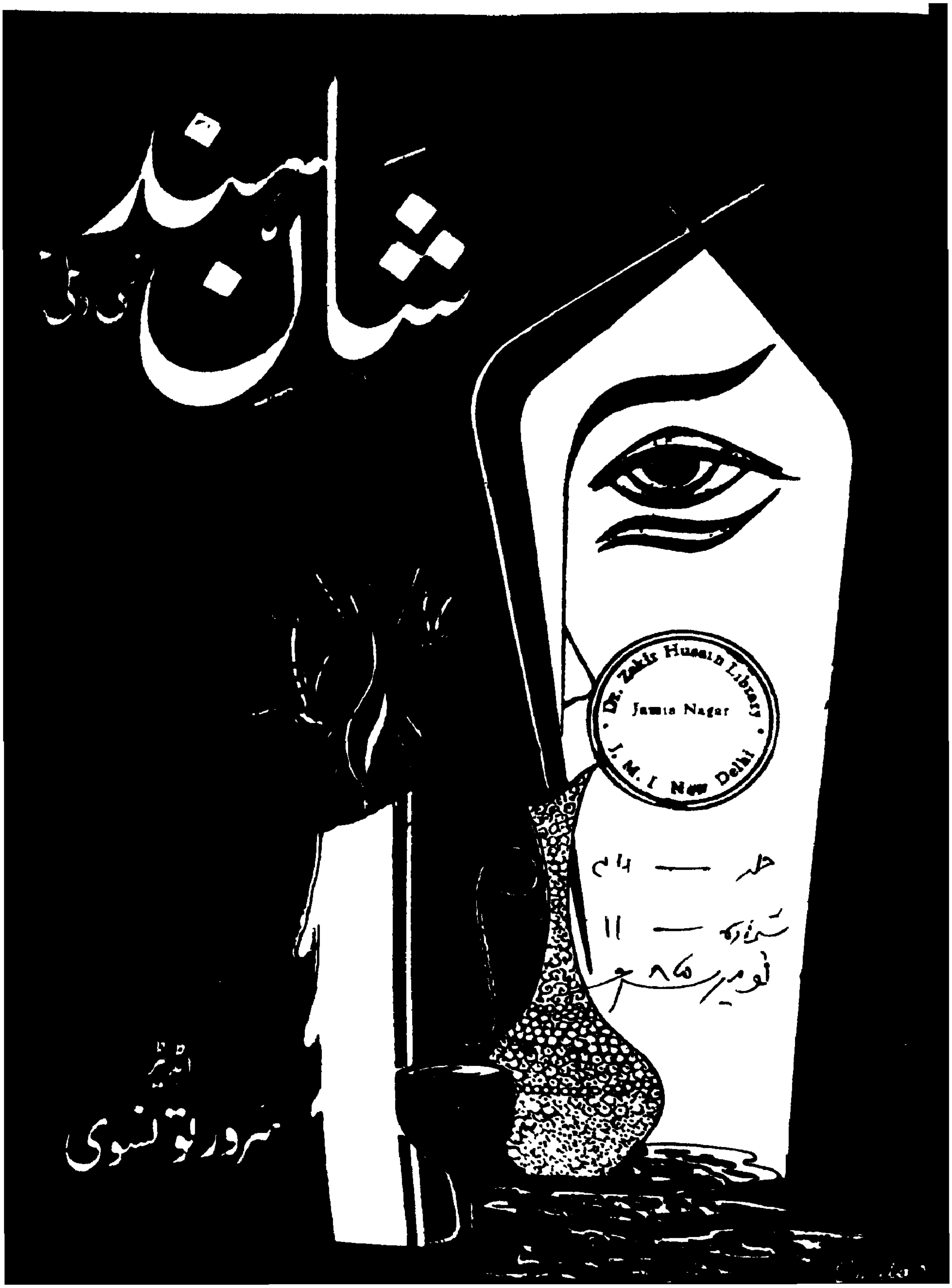
شانِ ہند
ایڈیٹر
سرور تونسوی
Dr. Zakir Husain Library
Jamia Nagar
J.M.I New Delhi

ٹیلیفون نمبر ۲۷۵۶۰۲ | رجسٹرار آف نیوز پیپرز انڈیا محکمہ رجسٹریشن نمبر ۶۴/۴/۵۷ | رجسٹرڈ نمبر ڈی ڈی (سی) ایل ۱۵۴۱

ہندو پرست ہوں نہ مسلمان پرست ہوں
ہر ذرۂ وطن سے ہے فیاضؔ مجھ کو پیار
دامن پرست ہوں نہ گریبان پرست ہوں
یعنی وطن پرست ہوں انسان پرست ہوں
فیاضؔ گوالیاری

ماہنامہ

شان ہند نئی دہلی

ایڈیٹر سرور تونسوی

فی پرچہ ۲/۵۰ روپے
زر سالانہ ۲۴/- روپے

جلد ۲۶ | نومبر ۱۹۸۵ء | شمارہ ۱۱

ضروری اعلان

پچھلے دنوں دفتر شان ہند کی ایک چھت گر جانے کے باعث نیز دیمک کی وجہ سے کئی ہزار روپیہ کی کتابوں کا اسٹاک اور دفتر کا ریکارڈ تہس نہس ہو گیا۔
اب دو ماہ سے مکان کی مرمت وغیرہ مکمل ہو چکی ہے اور دفتری کام باقاعدگی سے ہو رہا ہے۔ لہٰذا اس سلسلے میں حسب ذیل معروضات پر دھیان دیا جائے۔

۱- اگر کسی مصنف یا بک سیلر کا فروختگی کتب کے سلسلے میں کوئی بل ہمارے ذمہ واجب الادا ہو۔ تو براہ کرم تفصیل سے آگاہ فرمایئے تاکہ ایسے بلوں کی ادائیگی فی الفور ہو سکے۔

۲- اس کے علاوہ اگر کسی بھی صاحب کی کوئی رقم ہمارے ذمہ واجب الادا ہو تو براہ کرم تفصیلی طور پر تحریر فرمایا جائے تاکہ جائز مطالبات کی ادائیگی کی جا سکے

۳- جن حضرات کو خطوط کے جوابات موصول نہ ہوئے ہوں وہ بھی دوبارہ یاد فرمائیں تو کرم ہوگا۔ فقط

نیاز مند — سرور تونسوی ایڈیٹر و مالک ماہنامہ شان ہند نئی دہلی ۲---۱۱

ودیا پرکاش سرور تونسوی ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے خواجہ پریس چھتہ شیخ منگلو جامع مسجد دہلی سے چھپوا کر دفتر شان ہند فلیٹ نمبر ۸-انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۲---۱۱ سے شائع کیا۔

امر شہید

شانِ ہند کے سابقہ شمارے میں جناب ساحر ہوشیار پوری کی مشہور نظم "امر شہید" کی اشاعت پریس میں ہاکروں کی ہڑتال کی وجہ سے عمل میں نہ آسکی۔ جس کی وجہ سے قارئینِ شانِ ہند کو شکایت کا موقع ملا۔ جس کے لیے ہم معافی خواہ ہیں۔

ذیل میں جناب ساحر ہوشیار پوری کی یہ امر نظم "امر شہید" شائع کی جا رہی ہے۔ (ادارہ)

ایک رانا کے دو محافظ تھے

ایک "بے انت" بے وفائی میں
ایک "ست ونت" بے حیائی میں

دیش کے داغ، قوم کے غدار
بد نظر، بد لحاظ، بد اطوار

بد رگ و بد قوم، وطن دشمن
بد سرشتی میں زاغ اور زغن

غیر سے نامہ و پیام کیے
زر کے بدلے ضمیر بیچ دیے

کام دونوں نے لا مثال کیا
خوب حقِ نمک حلال کیا

اپنی رانی کو مار دی گولی
دھوم سے کھیلی خون کی ہولی

ان کے دشمنوں کی عید ہوئی
اور اماں امر شہید ہوئی

[illegible] ہوئی

بلبل چہ گفت؟ گل چہ شنید؟ و صبا چہ کرد؟

دلی کے لفٹیننٹ گورنر کے نام کھلا خط

محترم المقام جناب کپور صاحب - خوش آمدید
فارسی زبان میں ایک کہاوت ہے کہ ہر کہ آمد عمارت
اخت (یعنی جو بھی آتا ہے وہ نئی عمارت بناتا ہے)
کہاوت کے مطابق آپ نے بھی دلی کے لفٹیننٹ گورنر کا
د سنبھالتے ہی جو وعدے فرمائے ہیں آپ کے پیشرو
ب ایم - ایم - کے دلی صاحب نے بھی یہی وعدے
ے تھے اور اُن سے پہلے جناب جگموہن صاحب نے
ہی کچھ فرمایا تھا۔
(۱) رشوت ستانی ختم کی جائے گی - (۲) عوام کو انصاف
دران کی زندگی نیز مال و متاع کو تحفظ ملے گا - (۳) غنڈہ
دی ختم کی جائے گی (۴) پولیس عوام کے تئیں اپنے
ائض کو ایمانداری سے نبھائے گی - وغیرہ وغیرہ - مگر
ور والا اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ
دے وہی پورے کر سکتا ہے جو نہ تو خوشامد پسند ہو اور
ہی کسی خوشامدی کو اپنے پاس پھٹکنے دے - اور دوسرے
کہ وہ کسی سیاسی دباؤ کے تحت نہ ہو - اور تیسرے
کہ وہ خود ایمانداری، دیانت داری اور حق انصاف
لدادہ و شیدا اور اعلیٰ منتظم ہو اور اپنے کسی بھی ماتحت
قصوروار پائے تو قرار واقعی سزا دے - اور سب سے
وری یہ کہ فریادی اُس تک بلا جھجک اس یقین کے
اتھ پہنچ سکے کہ اس کی بات سُنی جائے گی اور اُسے
اف ملے گا۔

آئیے اس ضمن میں کچھ حقائق بھی سُن لیجئے -
جناب جگموہن صاحب کی گورنری کے دور اول میں
ایک اخبار نویس خوشامد کے اس بلند مینار [illegible]
کہ جگموہن صاحب کے سوا اُنہیں دلی میں [illegible] تا
تھا - کرنا خدا کا کہ جناب جگموہن صاحب گوا کے لفٹیننٹ
گورنر مقرر کر دیا گیا تو ان کے گوا تشریف لے جانے کے بعد اسی
اخبار نویس نے لکھا کہ جگموہن کا مزاج بگڑ گیا تھا اچھا ہوا
کہ اندرا گاندھی صاحبہ نے انہیں دلی سے رخصت کر دیا
اور نئے لفٹیننٹ گورنر صاحب کی تعریف کے پُل باندھنے
شروع کر دیئے - حالات نے پھر پلٹا کھایا اور جناب جگموہن
صاحب پھر دلی کے لفٹیننٹ گورنر ہو کر آ گئے تو اس اخبار
نویس نے جگموہن صاحب کی تعریف میں وہ وہ قصیدے
لکھے کہ شعرائے متقدمین نے بھی اپنے بادشاہوں کی شان
میں کیا لکھے ہوں گے - یہ تو تھا خوشامد اور خوشامد پسندی کا
ایک نمونہ - سیاسی دباؤ عوام کو نظر نہیں آتا مگر جب وہ
کارفرما ہوتا ہے تو عوام اُسے محسوس ضرور کرتے ہیں مگر ان
بیچاروں کے بس کی بات نہیں ہوتی کہ وہ اس ضمن میں کچھ
کہہ سکیں -

سب سے ضروری بات یہ کہ فریادی کی فریاد سُنی جائے
اور فریادی بلا جھجک اور بغیر کسی رکاوٹ کے انصاف کرنے
والے کے سامنے جا سکے - اس ضمن میں ایک ذاتی واقعہ سُن لیجئے -

ہم جناب جگموہن سابق ایل - جی دلی کی خدمت میں
کچھ ایسے سچے واقعات رکھنا چاہتے تھے جن میں کچھ لوگوں
کی حق تلفی ہوئی تھی اور کچھ کے ساتھ سرکاری کارندوں نے
ظالمانہ سلوک کیا تھا - لہٰذا ہمیں رجسٹرڈ خط لکھا گیا کہ کچھ
سچے واقعات آپ کے ماتحت سرکاری کارندوں کی کارگزاری

سے آپ کے گوش گذار کرتے ہیں ملاقات کا وقت دیجئے مگر ان کے پاس سچی باتیں سننے کا وقت ہی نہ تھا۔ اسی طرح جناب ایم۔ ایم۔ کھوسلی صاحب سابق ایل جی کی خدمت میں ایک سرکاری ادارے کی فضول خرچیوں اور من مانیوں کے بارے میں وضاحت گوش گذار کرنے کے لئے بذریعہ رجسٹرڈ خط وقت مانگا گیا مگر جواب ندارد۔

اب آپ ہی غور فرمایئے جب لفٹیننٹ گورنر تک اپنے کسی ماتحت افسر یا محکمے کے بارے میں سچے واقعات تک سننے کو تیار نہیں تو وہ رشوت ستانی کیسے ختم کر سکتا ہے۔ وہ ظالم اور بد قماش ملازمین سرکار کی کارستانیوں کے خلاف کیا قدم اٹھا سکے گا۔

اگر کوئی خوشامدی اور چاپلوس شخص ان سابقہ گورنر صاحبان کو یہ کہ آپ تو دھرم راج ہیں۔ دلی کی ساری خلقت آپ کی تعریف کر رہی ہے اور میں ایک وفد وزیر اعظم صاحب کے ہاں لے جانا چاہتا ہوں جو وزیر اعظم صاحب سے کہے گا کہ ہمارے گورنر تو ایسے ہیں کہ شاید دنیا میں ایسا کوئی گورنر ہی نہیں تو یہ ایل۔ جی صاحبان فوراً انھیں شرف ملاقات بخشتے اور ہر طرح کی مدد بھی فرماتے

مندرجہ بالا واقعات لکھنے سے نہ تو کسی سابقہ ایل۔ جی صاحب کی توہین کرنا ہے اور نہ ہی یہ مقصد ہے کہ وہ نا اہل تھے۔ بلکہ صرف اور صرف یہ کہنا ہے کہ جو لوگ واقعی عوام کی بھلائی کے لئے کچھ کرنا چاہتے ہیں یا کم از کم ایسی توقع رکھتے ہیں انھیں محض اس لئے درگزر کیا جاتا ہے کہ وہ خوشامد کا ڈھنگ نہیں جانتے۔

آپ ایک فوجی ہیں۔ اور ایک کامیاب فوجی کے بارے میں جو کچھ کتابوں میں پڑھا ہے وہ یہ ہے کہ ۱۔ فوجی خوشامد پسند نہیں ہوتا اور نہ وہ خوشامدیوں کو اپنا مشیر بناتا ہے۔ ۲۔ ڈسپلن ہر فوجی کا پہلا اور آخری کرتو ہے۔ ۳۔ ہر فوجی وطن پرست ہوتا ہے اگر وہ وطن پرست نہ ہو تو وہ فوج میں بھرتی ہی کیوں؟ اور فوج میں بھرتی ہونے کا مطلب ہی یہ ہے کہ وہ اپنے وطن پر قربان ہو جانے سے گریز نہیں کر سکتا۔

اور جس شخص میں یہ خوبیاں ہوں ۔ وہ اپنے عوام کو منانے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ آپ ایک فوجی ہیں اور فوج کے ایک اعلےٰ عہدہ سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ اس لئے آپ نے تو مندرجہ ذیل بالا پہاڑ اپنے ماتحت فوجیوں میں پیدا کرنے کی اور ہمیں کوشش کی ہوگی۔ لہٰذا آپ پر اہل دلی کو کافی حد تک اطمینان ہے کہ آپ ان کے دکھ درد کو سمجھیں گے۔ جن کا ثبوت بھی آپ نے چند دنوں میں ہی دے دیا ہے۔ ڈی۔ ڈی۔ اے اب جو مکانات بنوا رہی ہے اُن کی بنیاد کافی گہری ہے جیسا کہ جنتا کوارٹرز جنک پوری میں بن رہے ہیں۔ اگر آپ نے ڈی ڈی اے کی رشوت ستانی کسی حد تک بھی روک دی تو یہ سمجھئے کہ دلی کی آدھی بدعتیں ختم ہو جائیں گی۔ آپ کی اسی ڈی ڈی اے نے جناب مشتاق عراقی صاحب دہرن (سعودی عرب) کے ساتھ جو نامناسب سلوک روا رکھ چھوڑا ہے اس کی تفصیل بہت جلد آپ کی خدمت میں بھجوائی جا رہی ہے۔

ہم کہیں گے کہ آپ کی توجہ ایسے واقعات کی جانب مبذول کراتے رہیں گے جن میں ناانصافی ہوا ہی ہوگی۔

آپکا احسان ہوگا اگر آپ اپنے پرنسپل افیسر صاحب سے ہمارا رجسٹرڈ خط تلاش کرا کے ملاحظہ فرمائیں جو جناب ایم۔ ایم کے ولی صاحب کی خدمت میں بھجوایا گیا تھا (باقی پھر)

دلی اُردو اکاڈمی اور خوشتر گرامی

دلی اُردو اکاڈمی ہر سال ایک ایوارڈ کسی ایسے صحافی کو دیتی ہے جس نے اُردو صحافت کی قابل قدر خدمت کی ہو۔ اس سلسلے میں اب تک جناب ناز انصاری جناب دھرم پال گپتا وفا اور جناب مفتی شوکت علی فہمی کی قدر افزائی کی جا چکی ہے "بیسویں صدی" جب تک خوشتر

ی صاحب کی دیکھ ریکھ میں رسالہ "ہند" ... ان کا
ب معیاری اُردو ماہنامہ رہا۔ اور اُردو ادب کی
دمت "بیسویں صدی" نے کی اُسے کوئی بھی اُردو داں
موش نہیں کر سکتا۔

خوشتر گرامی گذشتہ چار سالوں سے تشویشناک حد تک
ل ہیں۔ محترم المقام عالی جناب گیانی ذیل سنگھ صاحب صدر
ہند گذشتہ سال جب بمبئی تشریف لے گئے تھے
ب کی مزاج پرسی کے لئے ان کی رہائش گاہ پر بھی تشریف لے گئے تھے
اشٹرپتی صاحب نے وعدہ فرمایا تھا کہ خوشتر صاحب کا علاج
الجہ حکومت کی طرف سے ہوگا۔ مگر نہ معلوم کیا وجہ ہوئی کہ
اشٹرپتی صاحب کے احکام کی تعمیل ابھی تک نہ تو حکومت
ند کی طرف سے ہوئی اور نہ ہی حکومت مہاراشٹر کی طرف سے۔

اس وقت حالت یہ ہے کہ خوشتر گرامی اپنے علاج
الجہ کے لئے قیمتی ادویات بھی نہیں خرید سکتے۔ چنانچہ پچھلے
نوں ہم نے دلی اُردو اکادمی کی ایوارڈ کمیٹی کے سرکردہ
مبران کی توجہ اس طرف مبذول کرائی تھی کہ دلی اُردو اکادمی
پنے فرض کا احساس کرے اور اس مشکل وقت میں
ردو صحافت کا ایوارڈ خوشتر گرامی صاحب کو دیا جائے۔ مگر
میں یہ بتایا گیا کہ چونکہ خوشتر گرامی صاحب مالدار ہیں اس
لئے انھیں انعام کی کیا ضرورت ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ
دلیل کچھ وزن نہیں رکھتی۔ ایوارڈ خدمات کی بنا پر دیا
جاتا ہے۔ حال ہی میں غالب انسٹی ٹیوٹ نے صحافت کا
ایوارڈ عزیز محترم جناب یونس دہلوی مدیر "شمع" کو دیا
ہے۔ اگر غالب انسٹی ٹیوٹ والے بھی یہی نظریہ رکھتے تو پھر
یونس دہلوی صاحب شاید اس کے حق دار نہ ٹھہرائے
جاتے کیونکہ وہ بفضل خدا خوشتر صاحب سے کہیں زیادہ
مالدار ہیں۔ مگر غالب انسٹی ٹیوٹ کی انعامی کمیٹی نے
یونس صاحب کی خدمات کو ملحوظ نظر رکھا۔ اسی طرح
ہم چاہتے ہیں کہ دلی اُردو اکادمی بھی ایوارڈ دیتے
وقت خدمات کو پیش نظر رکھے۔ کسی کی اچھی مالی حالت
اس انتخاب میں رکاوٹ نہیں ہونی چاہئے۔ اور پھر اس
وقت تو خوشتر گرامی صاحب کی مالی حالت اچھی ہے بھی نہیں۔

ہمیں یہ بھی بتایا گیا کہ دلی اُردو اکادمی کی ایوارڈ کمیٹی کے
اکثر و بیشتر فیصلے جناب ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور جناب گلزار
دہلوی ہی فرماتے ہیں اور گلزار دہلوی صاحب کسی وجہ سے
خوشتر گرامی سے ناخوش ہیں اس لئے وہ کسی طور بھی خوشتر
گرامی صاحب کو یہ ایوارڈ دینا منظور نہیں کریں گے۔

اگر کسی وجہ سے گلزار دہلوی صاحب خوشتر گرامی صاحب
سے ناخوش ہیں تو حق و انصاف کا تقاضہ یہ ہے کہ گلزار دہلوی
صاحب کو اپنی ذاتی رنجش دلی اُردو اکادمی کے معاملات
میں نہیں لانی چاہئے اور پھر ایسی حالت میں تو یہ اور بھی کفر
ہے کہ گلزار دہلوی صاحب ایک جج کی حیثیت سے ایوارڈز
کا فیصلہ کرنے والے ایک ممبر ہیں اور جب کوئی فیصلہ بہ
حیثیت جج کیا جاتا ہے تو اس میں ذاتی رنجش کو بروئے
کار لانا انتہائی گناہ ہے اور اللہ اس گناہ کو کبھی معاف
نہیں کرتا۔ اسی لئے ہماری مودبانہ گذارش ہے کہ اب
اُردو اکادمی دلی کے پاس اتنا روپیہ وافر ہے کہ وہ اسے
ٹھکانے لگانے کے ذرائع سوچ رہی ہے کیا یہ ممکن
نہیں ہے کہ تیس لاکھ کی گرانقدر رقم سے دس پانچ ہزار
روپیہ خوشتر گرامی صاحب کی ادبی خدمات کو سراہنے کے
لئے انھیں سپیشل ایوارڈ دیا جاسکے۔؟

ہم جائز طور پر یہ اُمید رکھتے ہیں کہ اُردو اکادمی دلی
کی ایوارڈ کمیٹی اپنے فرض کا احساس کرے گی اور ایک
ایسے شخص کی عزت افزائی کرے گی۔ جس نے فی الحقیقت
اُردو کی بہت بڑی خدمت کی ہے۔

مشاعرۂ جشن جمہوریت ۱۹۸۶ء اور دلی اُردو اکادمی

۱۹۸۵ء کا مشاعرۂ جشن جمہوریت جس قدر ناکام
ہوا تھا اُس کی مثال دلی کی تاریخ میں نہیں ملتی اور اس
کے بعد جشن آزادی ۱۹۸۵ء کا مشاعرہ بھی قطعاً ناکام
رہا تھا۔ اور یہ حقیقت بلا شبہ دلی اُردو اکادمی کے

...ء باعث ندامت ہے کہ جو مشاعرے گذشتہ چھتیس ...ینتیس سالوں سے اپنا جواب آپ ہوا کرتے تھے اب ...ان کے قعر مذلت میں گر چکے ہیں اور اس کی وجوہات ...ی سے کسی کی ڈھکی چھپی نہیں ہیں۔ پہلے ملک بھر کے شعراء ان ...شاعروں میں کلام سنانے کے لئے ہر ممکن کوشش اس ...لئے کیا کرتے تھے کہ جو شاعر ان مشاعروں میں کلام سنا تا تھا ...ملک بھر میں مشہور ہو جاتا تھا اور اب شعراء کی بڑی تعداد ...س لئے سفارشوں کی بھرمار کراتی ہے کہ مقامی ممک... ...روں کو ساڑھے چار صد روپیہ اور فائیو اسٹار ہوٹل ...یا بہترین کھانا ملتا ہے جب کہ غزل کے صرف پانچ ...اشعار سنانے ہوتے ہیں ان دونوں مشاعروں کو ...اسٹیبلشمنٹ کی ہمدردی نے بھی ناکام بنانے میں پوری ...ری مدد پہنچائی اور شعراء کے انتخاب میں زور رعایت بھی ...مشاعرے کی زبوں حالی کی ذمہ دار تھی۔

اکاڈمی کے مشیر جناب نقوی صاحب ہر تقریب ...یں صاف صاف الفاظ میں اعلان فرماتے ہیں کہ ...وگرام کمیٹی کے سربراہ جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر ہیں ...لہٰذا وہی اس تقریب کے ذمہ دار ہیں۔ یعنی دوسرے ...الفاظ میں ان مشاعروں کی ناکامی کی تمام تر ذمہ داری ...ب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر پر ڈال دی جاتی ہے۔

اس سلسلے میں ہماری مودبانہ گذارش ہے کہ اس وقت ...کہ جشن جمہوریت کے مشاعرے کے لئے شعرائے کرام ...انتخاب کے بارے میں ابھی سے مشورے کر لئے جائیں ...ر جو فہرست ترتیب دے دی جائے پھر اس میں ردو ...بدل قطعاً نہ کیا جائے۔ دوسرے جب شعرائے کرام راشٹرپتی ...بھون کے مشاعرے میں پچاس پچاس روپیہ پر تشریف لا سکتے ہیں تو پھر اردو اکاڈمی کے مشاعرے میں وہ ...کیسی بات ہے کہ انھیں پانچ پانچ اشعار سنانے کا ...معاوضہ ساڑھے چار صد روپیہ دیا جائے۔ اس سلسلہ میں ...اکاڈمی کو سوچنا چاہئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ...اکاڈمی کے پاس بے تحاشہ روپیہ ہے اور اسی لئے آمدنی

گذشتہ برس کی نسبت شعرائے کرام اور مشاعرے میں حصہ لینے والے مقامی حضرات کے معاوضہ میں مزید پچاس روپیہ کا اضافہ کر دیا ہے۔ مگر فضول خرچی تو آخر فضول خرچی ہی ہے۔ ہمیں اس کا بھی حق پہنچتا ہے کہ ہم اکاڈمی کے اکابرین سے یہ مطالبہ کر سکیں کہ اکاڈمی کو روپیہ محض مشاعروں، سمیناروں، قوالیوں اور ناچ گانے کے لئے نہیں دیا جاتا بلکہ اس لئے دیا جاتا ہے کہ اردو کی بقاء حیات کے لئے ایسے طریقے اختیار کئے جائیں کہ یہ زبان زندہ رہ سکے۔ اردو کی تعلیم کو عام کیا جائے۔ اور اردو کی وہ کتابیں جو نایاب ہیں انھیں شائع کیا جائے۔ جیسا کہ اتر پردیش اردو اکاڈمی کر رہی ہے حالانکہ اس کا بجٹ دلی اردو اکاڈمی سے کم ہے جب کہ دلی کا علاقہ اتر پردیش کی ایک تحصیل کے برابر بھی نہیں ہے۔ اور نہ ہی اکاڈمی کو یہ روپیہ اس لئے دیا جاتا ہے کہ اس روپیہ سے اکاڈمی کے کچھ ممبران کا بینک بیلنس بڑھانے کے نت نئے طریقے ایجاد کئے جائیں۔ مثال کے طور پر ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں کہ اکاڈمی کے ایک ممبر کو صرف پانچ ہفتوں میں بطور شاعر، ایکٹر اناؤنسر، تحسین نگار وغیرہ کے قریباً تین ہزار روپیہ دیا گیا اسی طرح کچھ اور ممبران اکاڈمی بھی ہیں جو مالی مفاد کے حصول میں گامزن ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ اکاڈمی کے شاعر ممبران کو ہر مشاعرہ میں پڑھوایا جائے۔ جب کہ ملک کے مشہور شعرائے کرام کے ساتھ ایسا نہیں ہوتا۔ نقوی صاحب اکاڈمی کے مشیر ہیں اس لئے انھیں ایسے ممبران کو مشورہ دینا چاہئے کہ وہ خدمت اردو کریں تاکہ اکاڈمی کو جلب زر کا ذریعہ بنائیں۔

بقیہ: بہ کوچۂ یار بہ انداز محرمانہ گزر

اب حافظ صاحب اپنے مالک حقیقی کے ہاں جا چکے ہیں مگر آج بھی مندر کے منتظمین اور مندر میں آنے والے اکثر حضرات انھیں یاد کرتے ہیں حافظ صاحب کی علالت کے دوران مندر میں کئی بار ان کی صحت کے لئے دعائیں مانگی گئیں۔ اور ان کے انتقال پر ملال کے بعد دعائے خیر مانگی گئی۔ مندر کے منتری جی کا کہنا ہے کہ ہمیں حافظ صاحب کی کمی بہت کھلتی ہے مندر میں ان کے لئے دعائے خیر کے لئے مناسب انتظام میں ان کی خدمت کر [illegible]۔

بہ کوئے یار بہ اندازِ محرمانہ گزر

سرور تونسوی

مرحوم حافظ محمد یوسف صاحب دہلوی کا یہ معمول تھا کہ ہر اتوار کو وہ صبح پہلا کلک حبش خاں تشریف لے جاتے۔ وہاں حکیم صاحب کی دوکان پر چند منٹ ضرور بیٹھتے پھر لالہ منوہر لال کی دوکان پر چند منٹ بیٹھتے حالانکہ لالہ منوہر لال نے حافظ صاحب کو کافی مالی نقصان پہنچایا مگر حافظ صاحب نے اپنی روایت میں فرق نہیں آنے دیا۔ اس کے بعد شیخ لیبارٹریز تشریف لاتے دواخانہ کا ایک چکر لگاتے دواخانہ کے تمام ملازمین کو پتہ ہوتا تھا کہ حافظ صاحب تشریف لائیں گے لہٰذا ہر شخص چاق و چوبند اور اپنے کام میں مگن ہوتا حافظ صاحب ہر ایک پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہوئے سپلائی ڈیپارٹمنٹ میں آتے جن آرڈرز کی تعمیل ہو رہی ہوتی اُن پر ایک نظر ڈالتے اور حکیم صاحب کے پاس چند منٹ بیٹھنے کے بعد جامع مسجد پر موٹر پارٹس کی ایک دوکان پر چند بیٹھتے یہاں پر ان کے چند مداح پہلے سے ہی جمع رہتے تھے۔ کچھ گپ شپ کے بعد جامع مسجد کے اردگرد بیٹھے فقیروں کو پیسے بانٹتے اور کار میں بیٹھ کر دریا گنج میں میرے غریب خانہ پر تشریف لاتے اس کے بعد اپنی کوٹھی پر تشریف لے جاتے۔
اگر ان کی مرضی ہوتی تو میرے غریب خانہ پر چند منٹ تشریف رکھتے اور کیمپا اور دہی پی کر تشریف لے جاتے۔ ورنہ گاڑی میں ہی بیٹھے رہتے اور میں کیمپا اور دہی کی بوتل وہیں پیش کرتا اور وہ اسے پی کر تشریف لے جاتے حافظ صاحب کو کوکا کولا، ڈرنکس میں کیمپا اور نمکین زیادہ اچھا لگتا تھا۔
میرے غریب خانہ کے سامنے دریا گنج سناتن دھرم کا رام [illegible] ی کے اکثر و بیشتر مندروں میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ مندر کی طرف سے ہر روز ساڑھے گیارہ بجے بلا تفریق مذہب و ملت لنگر بٹتا ہے جس کا جی چاہے کھانا کھا سکتا ہے۔ ایک اتوار کو حافظ صاحب مجھے میرے غریب خانہ پر چھوڑتے ہوئے اپنی رہائش گاہ پر جا رہے تھے کہ مندر کے برآمدے میں متعدد مفلوک الحال لوگوں میں لنگر تقسیم ہوتے ہوئے دیکھ کر گاڑی ایک کنارے رکوا کر انہوں نے ڈرائیور کو مجھے بلانے کے لئے بھیجا۔ میں فوراً حاضر ہوا تو فرمانے لگے سرور صاحب یہ جو لنگر تقسیم ہو رہا ہے اس کے بارے میں مندر کے منتظمان سے مفصل دریافت کر کے مجھے بتائیے اگلے روز میں نے حافظ صاحب کو اس سلسلے میں واقفیت بہم پہنچا دی تو فرمانے لگے یوں کیجئے کہ ہر جمعرات کو مندر کے لنگر کے اخراجات میں ادا کیا کروں گا اور ایک مہینے کی چار جمعرات روپے مجھے دے دیجئے۔
میرا معمول تھا کہ ہر روز شام کو ساڑھے پانچ بجے تک دفتر شمع پہنچ جاتا۔ اور منوہر لال اور جناب ماہر نقوی کم تشریف لے آتے مسٹر ترلوک ناتھ ہفتہ میں ایک دن تشریف لاتے۔ اور یہ محفل رات کے سات ساڑھے سات بجے تک چلتی اس کے بعد حافظ صاحب ماہر نقوی صاحب کو ڈیلائٹ سنیما کے قریب اور مجھے دریا گنج میرے غریب خانہ تک پہنچا کے بعد اپنے دولت خانہ پر تشریف لے جاتے۔ مندر کے لنگرخانے کے لئے حافظ صاحب کے دیئے ہوئے روپے میرے پاس تھے لہٰذا میں نے راستے میں ڈرائیور کی موجودگی میں حافظ صاحب سے مخاطب ہوتے ہوئے عرض کیا کہ حافظ صاحب آپ مسلمان ہیں اور مندر کے لنگرخانے کے لئے روپے دے رہے ہیں کیا اس سے آپ کے ہم مذہب اعتراض نہیں کریں گے۔ فرمانے لگے اول تو یہ بات کسی سے کہنے کی ہے ہی نہیں اور اگر انہیں پتہ چل بھی جائے کہ کوئی سچا مسلمان جو خدا اور اس کے رسول پر ایمان رکھتا ہے اس پر اعترا

نہیں کریگا۔ کیونکہ ہمارے خُدا کا حکم ہے کہ بھوکوں کو کھلاؤ یہ نہیں کہ مسلمانوں کو کھلاؤ لہٰذا آپ کے ہاں مندر میں بھوکوں کو کھلایا جاتا ہے اس لئے میرا یہ اقدام کسی طور بھی قابلِ اعتراض نہیں ہوسکتا۔

مَیں نے مندر کے منتری جی کو حافظ صاحب کے دیئے ہوئے روپے دیئے اور ساتھ ہی حافظ صاحب کا بتایا ہوا یہ جملہ بھی دہرایا کہ ہمارے خُدا کا یہ حُکم ہے کہ بھوکوں کو کھلاؤ نہ کہ مسلمانوں کو کھلاؤ۔ منتری جی اُچھل پڑے اور دوسرے ہی دن صبح کے کیرتن میں اُنھوں نے حافظ صاحب کے اس اقدام کی تعریف کرتے ہوئے تمام حاضرین سے التجا کی کہ وہ حافظ صاحب کے اس طرزِ عمل پر چلیں اور بغیر یہ سوچے کہ بھوکا ہندو ہے یا مسلمان اُسے کھانا کھلائیں۔ چنانچہ حافظ صاحب کے اس اقدام کا نتیجہ یہ ہوا کہ مندر میں آنے والے سینکڑوں ہندو اب محض براہمنوں کی تلاش میں مارے مارے نہیں پھرتے کہ اُنھیں کھانا کھلائیں بلکہ جو بھی بھوکا اُنھیں نظر آتا ہے اُسے کھانا کھلاتے ہیں اور تہواروں کے دنوں میں بھی پیٹ بھرے براہمنوں کی جگہ ضرورت مند بھوکوں کو بلا تمیز مذہب و ملت کھانا کھلایا جاتا ہے میں تو خیر کئی باتوں میں حافظ صاحب کو اپنا گرو تسلیم کرتا ہوں مگر میرا نواسہ جو حافظ صاحب سے بہت مانوس ہے اور اب بھی اُن کی تصویر جہاں کہیں دیکھتا ہے تو آبدیدہ ہوجاتا ہے۔ درگاہ حضرت بختیار کاکیؒ پر لنگر میں حسب توفیق ہر ماہ نذرانہ پیش کرتا مگر یہ سلسلہ اب منقطع ہوگیا ہے کیونکہ حافظ صاحب کے ساتھ مَیں اور میرا نواسہ ہر جمعرات کو حضرت نظام الدین اولیاؒ۔ حضرت امیر خسروؒ۔ حضرت بختیار کاکیؒ۔ حضرت شاہ فرہادؒ محمد اور کئی مزارات پر فاتحہ کے لئے جایا کرتے تھے۔ حافظ صاحب کی علالت کے بعد یہ سلسلہ منقطع ہوگیا۔

کچھ دنوں بعد حافظ صاحب نے ہر جمعرات کے علاوہ ہر جمعہ کے روز کے مندر کے لنگر کے اخراجات اپنے ذمہ لے لئے اور یہ سلسلہ کئی سال چلتا رہا اُن کی علالت کے زمانے میں بھی اور اب اُن کے انتقال فرما جانے کے بعد یہ سلسلہ اُن کے فرزندان ارجمند جاری رکھے ہوئے ہیں۔

چونکہ مندر کے منتری اکثر اپنی تقریر میں حافظ صاحب کی تعریف کرتے لہٰذا مندر کی مینجنگ کمیٹی کے ممبران اور مندر میں حاضری دینے والے اکثر حضرات نے منتری جی کی معرفت اپنی اس خواہش کا اظہار حافظ صاحب تک پہنچایا کہ وہ حافظ صاحب کو دیکھنا چاہتے ہیں کہ وہ کونسا مسلمان ہے جو اُن کے فرقہ پرستی کے زمانے میں مندر کے لنگر خانے میں ہر ماہ ایک معقول رقم دان دیتا ہے۔ چنانچہ مندر کے منتری اور مینجنگ کمیٹی کے چار ممبران میرے ہمراہ حافظ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اُن سے جنم اشٹمی کے روز مندر میں آنے کا نمنترن دیا۔ جسے حافظ صاحب نے بخوشی منظور کرتے ہوئے مجھے ہدایت کی کہ میں اُنھیں اُس روز مندر لے چلوں

جنم اشٹمی کے روز وقت مقررہ پر حافظ صاحب میرے ہمراہ مندر میں آئے۔ سینکڑوں ہندو حضرات اور مَیں خود ننگے سر تھے مگر حافظ صاحب نے سر پر ٹوپی رکھ لی۔ مندر کے منتظمان نے حافظ صاحب کی اس طرح عزت افزائی کی جیسے کوئی اُن کا مذہبی دیوتا مندر میں آیا ہو۔ ایک پنڈت جی تقریر کررہے تھے تو حافظ صاحب فرمانے لگے کہ حضرات ہمارے قرآن میں یہ آیت ہے جس کا مطلب بالکل وہی ہے جو پنڈت جی ابھی کہہ رہے تھے۔ حاضرین نے حافظ صاحب کی بات سُن کر پُرزور تالیوں سے اظہار پسندیدگی کیا۔ حافظ صاحب کو پھولوں سے لاد دیا گیا۔ اور مندر میں موجود ہر شخص حافظ صاحب کی فراخدلی پر اظہار خوشنودی کررہا تھا۔ اُنھوں نے مندر کے لنگر خانے کو ہر ماہ مالی مدد دے کر عملی طور پر ثبوت دیا ہے کہ ہمارے خدا کا یہ حکم ہے کہ بھوکے کو کھلاؤ نہ کہ مسلمان کو کھلاؤ۔ اس مندر کی طرف سے ماہ اکتوبر میں ایک خاص دن عام لنگر ہوتا ہے جس کا انتظام مندر کے قریب ہندی پارک میں شامیانے لگا کر اور ہزاروں آدمیوں کے بیٹھنے کا فرشی انتظام کیا جاتا ہے۔ کم و بیش کئی ہزار افراد بغیر امتیاز مذہب و ملت اور بلا تمیز امیر و غریب صفوں میں بیٹھ کر پتّلوں پر کھانا کھاتے ہیں۔ اور اس تقریب میں پرشاد (کھانا) حاصل کرنا نیک فال سمجھا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ کئی ہزار اشخاص کے لئے میٹھا کھانا جس میں کھیر یا حلوہ۔ پوری، کچوری۔ دو سبزیاں ہوں اس کے لئے کافی اخراجات کا متحمل ہونا پڑتا ہے اور یہ اخراجات عوامی عطیات ہی سے پورے ہوتے ہیں۔ حافظ صاحب نے اپنی علالت سے پہلے تک ہر سال اس مجلسی تقریب کے لئے معقول رقم عطیہ میں دی اور دو ہر سال جنم اشٹمی کے موقع پر بھی لنگر کے لئے تین صد روپے بھجوایا کرتے تھے۔ مندر کی ایگزیکٹو کمیٹی ہر سال آمدنی و اخراجات کی رپورٹ شائع کرتی ہے اس فہرست میں حافظ صاحب کا نام جگہ جگہ نظر آتا تھا۔ باقی ۔ ۔ ۔ پر

گوشۂ عقیل صدیقی

آل انڈیا مسالمہ کامٹی

خلیل انجم

ہر سال کی طرح اس سال بھی کامٹی میں الحاج صوفی عبدالحکیم رح کے ۶۹ ویں عرس مبارک کے موقع پر نیز شہدائے کربلا بالخصوص حضرت امام حسین رض عالی مقام کی شہادت عظمیٰ کی یاد میں ایک غیر طرحی کل ہند مسالمہ آج ۲۳ ر محرم الحرام ۱۴۰۶ھ بمطابق ۹ ر اکتوبر ۱۹۸۵ء بعد نماز عشاء منعقد ہوا۔ آستانۂ صوفی میں آراستہ کئے گئے خوبصورت پنڈال میں اسٹیج کو سجا کر دولہن بنا دیا گیا ہے۔ سامعین کرام و نیز عقیدت مند حضرات کثیر تعداد میں یہاں جمع ہیں اور مسالمہ کی کارروائی کے بے تابی سے منتظر ہیں۔ مسالمہ کی صدارت جناب جوگا سنگھ انور صاحب فرما رہے ہیں۔ میں نے اُن سے درخواست کی ہے کہ وہ مسندِ صدارت پر رونق افروز ہو کر ممنون فرمائیں کامٹی کے نوجوان شاعر عبدالباری عارف نے تائید فرمائی ہے اور صدر محترم کے ساتھ ساتھ بیرونی و چند مقامی شعرائے کرام بھی اسٹیج پر تشریف لاتے ہیں۔ اس وقت رات کے ساڑھے دس بج چکے ہیں اور مجمع اپنے شعرائے کرام کے کلام سے مستفیض ہونے کے لئے بے تاب ہے۔ مسالمہ کے کنوینر استادِ محترم شاطر حکیمی صاحب کی ذاتِ گرامی کا یہ اثر ہے کہ آج بھی چند نامور بیرونی شعرائے کرام اسٹیج کی زینت بنے ہوئے ہیں ؎

یہ ایک حقیقت ہے ہمدم جب ماہِ محرم آتا ہے
کونین کے ذرّے ذرّے پر اک رنگِ الم چھا جاتا ہے
حسین رض کے عزم و ہمت نے اک درس دیا ہے دنیا کو
اللہ کے سچے بندوں کا جھکتا نہیں سر کٹ جاتا ہے

جناب نیاز انجم مرحوم کے ان اشعار سے مسالمہ کی کارروائی کا آغاز ہوا۔ مسالمہ کے اغراض و مقاصد پر مختصراً عرض کرنے کے بعد میں نے کامٹی کے خوش گلو فن کار صوفی محمد جابر کو دعوت دی ہے کہ وہ کلام پاک کی تلاوت فرمائیں۔ صوفی محمد جابر سورۂ رحمٰن کے چند آیات کی تلاوت کرنے کے بعد محترم شاطر حکیمی کی نعت شریف پیش کر رہے ہیں اور مجمع نے نعت پر داد بھی دی ہے۔ محترم شاطر حکیمی صاحب کی اس نعت شریف کے یہ دو شعر بہت پسند فرمائے گئے۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیں ؎

دمِ فراق جب آئی صبا مدینے سے
نکل کے رہ گئی اک آہ میرے سینے سے
ہم اس کو لازمۂ زندگی سمجھتے ہیں
یہ اور بات ہے ہم دور ہیں مدینے سے

محمد جابر صاحب کے بعد کہکشاں صاحبہ سے درخواست کی گئی ہے کہ وہ بھی ایک نعت شریف عطا کریں۔ کہکشاں صاحبہ ناگپور کی طالبہ ہیں اور اپنی خوش گلوئی کی وجہ سے ریڈیو اور ٹی وی پر بھی اپنے فن کا مظاہرہ کرتی رہتی ہیں۔ اگرچہ کہ مسالمہ کی باقاعدہ کارروائی میں تاخیر ہو رہی ہے تاہم سامعین اس خوش گلو اور نوجوان فن کارہ کو توجہ سے سن رہے ہیں اور حوصلہ افزائی فرما رہے ہیں۔ کہکشاں صاحبہ کی نعت شریف کا یہ شعر بہت پسند کیا گیا ؎

آنکھیں ، کھا رہا ہے لحد ، خوفِ مغفرت
دل شاد ہے کہ شافعِ محشر رسولؐ ہیں

نعت شریف ختم کر کے کہکشاں صاحبہ "واہ واہ" کی صداؤں میں اسٹیج سے رخصت ہوئیں تو مجھے مومن کا یہ شعر یاد آگیا ؎

اس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

اب آستانۂ صوفی کی جانب سے صدر محترم کی خدمت میں ایک سپاسنامہ پیش کیا جا رہا ہے۔ سپاسنامہ میں سردار جوگا سنگھ صاحب انور کی شعری و ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں "ترجمانِ اردو" کے خطاب سے نوازا گیا ہے۔ اب مسالمہ کی باقاعدہ کارروائی شروع کی جا رہی ہے۔ اس مسالمہ کی نظامت کے لئے ملک کے مشہور شاعر اور ناولسٹ ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد صاحب کا اسم گرامی منتخب کیا گیا تھا۔ ان کی منظوری آچکی تھی مگر اچانک انھیں یوپی اردو رابطہ کمیٹی کے وفد کے ساتھ صدر جمہوریہ گیانی ذیل سنگھ صاحب سے ملاقات کی غرض سے دلی جانا پڑ گیا۔ کامٹی کے نوجوان شاعر اشفاق بجلی معمولی سی پس و پیش کے بعد نظامت کے فرائض کے لئے راضی ہو گئے ہیں۔ اور میں مائیک اشفاق بجلی صاحب کے سپرد کر کے انھیں کے پاس بیٹھ گیا ہوں تاکہ گاہے گاہے ان کی مدد بھی کر سکوں۔ مسالمہ کے آغاز کے لئے کامٹی کے نوجوان شاعر ابو الحسن کمال کو زحمت دی جا رہی ہے۔ کمال صاحب ترنم میں اپنا کلام سنا رہے ہیں اور داد وصول کر رہے ہیں۔ ان کے دو شعر خاص طور سے بہت پسند کئے گئے۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیں ؎

مانگے گی اب نہ ہاتھ کسی بھی امام کا
بیعت کی توڑ دی ہے کلائی حسینؑ نے
جنت کو چھوڑ چھوڑ کے بسنے لگے ملک
بستی وہ کربلا میں بسا دی حسینؑ نے

کمال صاحب مائیک سے رخصت ہوئے تو کامٹی کے نوجوان اور خوش گلو شاعر عبد الباری عارف کو آواز دی گئی ہے۔ مائیک پر آکر خلافت اور ملوکیت کے تضاد کو بڑے اہتمام کے ساتھ اپنے کلام میں پیش کر رہے ہیں ؎

خلافت سجدۂ عرشِ الٰہی ٭ ملوکیت ہے کیا اک آذری ہے
خلافت پر ملوکیت ہے خنداں ٭ ملوکیت پہ مولا خندہ زن ہے

عارف صاحب بڑے اطمینان کے ساتھ اپنا کلام سنا رہے ہیں اور سامعین جھوم جھوم کر داد دے رہے ہیں [illegible] ؎

خلافت سے ہر اک بن باغ ہوگا ٭ ملوکیت میں ہر اک باغ بن ہے

اور جب وہ اس شعر پر پہنچے تو مسالمہ گاہ میں واہ واہ اور "سبحان اللہ" کے شور سے طوفان مچ گیا ہے ؎

ملوکیت ہے انساں پر اماوس ٭ خلافت صبح کی پہلی کرن ہے

داد و تحسین کا شور کم ہوا تو عارف صاحب نے پھر اس شعر پر ہنگامہ مچا دیا ہے ؎

ملوکیت ہے کیا دندانِ ہندہ ٭ خلافت کیا ہے حمزہؓ کا بدن ہے

عارف صاحب اپنی کامیابی پہ مائیک سے مسکراتے ہوئے لوٹ رہے ہیں۔ اشفاق صاحب ان کے کچھ اشعار دہرا[illegible] مہمان شاعر انور اشرفی صاحب کو جو رائے پور سے تشریف لا[illegible] ہیں۔ زحمت دے رہے ہیں۔ انور اشرفی اونچے توانا قسم[illegible] شاعر ہیں۔ اپنی وضع قطع سے بھی شاعر لگتے ہیں۔ مائیک پر آکر الاپ رہے ہیں ؎

چمکی ہے نور بن کے شجاعت حسینؓ کی
اسلام کی بقا ہے شہادت حسینؓ کی
میدانِ کربلا سے اُٹھی شمس کی طرح
عالم پہ چھا گئی ہے صداقت حسینؓ کی

انور اشرفی کا ترنم اور ان کے پڑھنے کا انداز سامعین کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے ہیں اور جب وہ اس شعر پر پہنچے تو سامعین ہر طرف سے ہاتھ ہلا ہلا کر داد و تحسین کے شور و غل سے ان سے بار بار پڑھنے کی درخواست کر رہے ہیں ؎

جو بدنصیب ہیں انھیں کیسے نصیب ہو
اللہ کا کرم ہے محبت حسینؓ کی

اپنا سلام ختم کر کے انور اشرفی رخصت ہو رہے ہیں اور اب شہر کے ایک اور نوجوان اور خوش فکر شاعر ظہیر حیدری کو آواز دی جا رہی ہے۔ ظہیر حیدری حسب معمول تحت میں[illegible] سلام سنا رہے ہیں اور داد سے نوازے جا رہے ہیں ؎

سوا حسینؓ کے یوں سر کٹا سکا نہ کوئی
فضائے مرگ میں جینا سکھا سکا نہ کوئی
خودی کا شیش محل چور ہو گیا آخر
پڑا وہ صبر کا پتھر بچا سکا نہ کوئی

حصارِ فکر سے باہر ہے عظمتِ شبیرؑ
بقدرِ فہم بھی اب تک بتا سکا نہ کوئی

اب رمضان طالب ناگپوری سے درخواست کی جا رہی ہے۔ رمضان طالب نے ابھی پڑھنا ہی شروع کیا تھا کہ بارش کا زوردار حملہ ہوا۔ جو لوگ باہر سے لطف اندوز ہو رہے تھے جگہ بنا کر اندر شامیانے میں آ رہے ہیں۔ مسالمہ کی روانی کچھ دیر کے لئے روک دی گئی ہے۔ جلد ہی بارش کا دور ختم ہو گیا۔ یہ سامعین کے لئے امتحان کی گھڑی تھی۔ سامعین بھلا کب ہمت ہارنے والے تھے نام لیوائے حسینؑ جو ٹھہرے۔ اب پھر مسالمہ کی کارروائی شروع ہو رہی ہے اسٹیج پر بچھائی ہوئی چادریں اور گدے بھیگ چکے ہیں اس لئے ان پر کرسیاں لگا دی گئی ہیں۔ بارش کے اثر سے ماحول تھوڑا نم ناک ہو گیا ہے۔ مگر داد و تحسین کی آنچ میں کوئی کمی نہیں آئی۔ رمضان طالب کے اس شعر سے سامعین پر گرمی آ گئی ہے ؎

فسانہ اپنی جگہ پھر فسانہ ہوتا ہے
حقیقتوں کے دریچوں کی داستان ہے حسینؑ

اب مختصر سے تعارف کے بعد مہمان اور خوش گلو شاعر نیر دہلوی کو زحمتِ سخن دی جا رہی ہے۔ سامعین سنبھل کر بیٹھ گئے ہیں ہر طرف ایک خوشی کی لہر دوڑ گئی ہے کیونکہ انہیں معلوم ہے کہ اب مسالمہ نقطۂ عروج کی طرف بڑھ رہا ہے۔ نیر دہلوی گزشتہ مسالمہ میں بھی تشریف لائے تھے۔ اس سال پھر انہیں یاد کیا گیا ہے جو اس بات کا مظہر ہے کہ سامعین انہیں پسند فرماتے ہیں۔ وہ اپنی وضع قطع سے شاعر بھی نظر آتے ہیں اور مولوی بھی۔ میری نظر میں ایک اچھے فن کار کے لئے ضروری ہے کہ وہ اچھا آدمی بھی ہو۔ نیر دہلوی سے ایک بار ملو تو بار بار ملنے کی تمنا ہوتی ہے بہرحال! نیر صاحب مائک پر آ کر ماحول کا جائزہ لے رہے ہیں اور چند قطعات سنا کر سخن فہمی کا امتحان سامعین سے لے رہے ہیں۔ ایک قطعہ آپ بھی ملاحظہ فرمائیں ؎

رسول اللہ کا دلبر اگر منبر پر آ جاتا
فلک کیا شے ہے عرشِ خالقِ اکبر اتر آتا

حسینؑ ابنِ علیؑ کی تشنگی میں راز تھا ورنہ
زمینِ کربلا پر چشمۂ کوثر اتر آتا

اب ترنم میں اپنا سلام سنا رہے ہیں ؎

دین کی زندگی حسینؑ سے ہے ❊ شانِ ایمان کی حسینؑ سے ہے
اس کو کوئی مٹا نہیں سکتا ❊ جس کو وابستگی حسینؑ سے ہے
اللہ اللہ حسینؑ کی عظمت ❊ منسلک ہر ولی حسینؑ سے ہے

نیر دہلوی اپنا سلام سنا کر رخصت ہوا ہی چاہتے ہیں کہ ہر طرف سے "ایک اور" "ایک اور" کی صدائیں گونجنے لگیں۔ مجبوراً نیر دہلوی کو مائک پر ہی ٹھہرنا پڑا۔ اور سامعین کی فرمائش پر ایک گیت نما سلام پیش کر رہے ہیں جس کے بول ہیں ؎

دین کے سنتری ایمان کی بگیا کے ولی ❊ حسینؑ ابنِ علیؑ
ذات تمری مورے سرکار لگے رب کو بھلی ❊ حسینؑ ابنِ علیؑ

اس گیت نما سلام پر مجمع بے قابو ہوا جا رہا ہے اور دل کھول کر داد دی جا رہی ہے۔ ہر بند کو سراہا جا رہا ہے۔ میں خود اتنا محو ہو گیا کہ کوئی بند نوٹ نہیں کر سکا۔ بہرحال، مسالمہ نہایت کامیاب جا رہا ہے۔ بارش سے گرچہ ماحول کچھ سرد ہو گیا ہے لیکن سامعین موسم کی بے کیفی کو نظر انداز کر کے اپنی سخن فہمی اور بیداری کا ثبوت دے رہے ہیں۔ نیر دہلوی نہایت کامیاب اور خوش کلام سرد ماحول میں بھی پسینہ پونچھتے ہوئے مائک سے لوٹ رہے ہیں۔ اب کامٹی کے نوجوان شاعر منظور رشاکر مائک پر آ گئے ہیں منظور رشاکر کی شاعری میں مذہبی رنگ کی آمیزش زیادہ ہوتی ہے اور چونکہ یہ مجلس بھی اسی نوعیت کی ہے اس لئے منظور رشاکر کو خاطر خواہ داد مل رہی ہے۔ وہ کامیابی کے ساتھ مائک سے لوٹ رہے ہیں اور ادھر خاکسار کو آواز دی جا رہی ہے۔ آج دوپہر میں محترمہ ملکہ نسیم صاحبہ نے دورانِ مباحثۂ مسالمہ کے عنوان کے پیشِ نظر شاعر جمالی کے سلام کے چند شعر سنائے تھے۔ سلام کا مطلع میرے ذہن میں گونج رہا تھا۔ مائک پر آ کر اسی مطلع کو نذرِ سامعین کر رہا ہوں مگر ردیف میں کچھ بھٹک سا گیا تو محترمہ ملکہ نسیم نے پیچھے سے ٹوک دیا تو مجھے راہ مل گئی۔ شاعر جمالی کے اس مطلع کو سامعین نے بھی بے حد پسند فرمایا۔ مطلع آپ کی نذر کر رہا

ہوں ۔

نہ کوئی تیر نہ تلوار ساتھ لے جانا
محاذِ جنگ پہ کردار ساتھ لے جانا

بہرحال! حسبِ معمول اپنا سلام بعنوان "غمِ حسینؑ" ترنم میں سامعین و شعرائے کرام کی نذر کر رہا ہوں۔ سلام کے جن اشعار کو سامعین نے پسند فرما کر خاکسار کی حوصلہ افزائی کی آپ کی ضیافتِ طبع کے لئے درج کر رہا ہوں ۔

دل کا سکوں نظر کا سہارا غمِ حسینؑ
ہوتی نہ زندگی جو نہ ہوتا غمِ حسینؑ
صدیوں کا واقعہ ہے یہ برسوں کی بات ہے
دیکھا گیا ہے آج بھی تازہ غمِ حسینؑ
سورج سے واسطہ نہ غرض چاند سے مجھے
ہے دل کی انجمن کا اُجالا غمِ حسینؑ

اب جمیل احمد جمیل ناگپوری مائیک پر آگئے ہیں اور تحت میں اپنا سلام سنا رہے ہیں مگر مجمع کو متاثر نہیں کر پا رہے ہیں۔ لیجئے! اب پھر ایک مہمان شاعر خادم شبیر نصیر آبادی کو زحمت دی جا رہی ہے۔ خادم شبیر نوجوان ہیں اور ترنم کسی قدر بلند ہے۔ مجمع پر قابو پا تو گئے ہیں مگر اشعار میں سطحی پن زیادہ ہے۔ ہاتھ ہلا ہلا کر پڑھنے کا اسٹائل ہی صرف سامعین کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ تاہم یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں ۔

رُکا نہیں ہے کسی اک جگہ یہ ذکرِ حسینؑ
زمیں کی بات ہے کیا آسمان کے پار گیا
بلند نیزے پہ جو سر تھا سر بلند ہے آج
بتا یزید کہاں تیرا اقتدار گیا
یہ شام و کوفہ کے ذرّوں سے آ رہی ہے صدا
حسینؑ جیت گئے اور یزید ہار گیا

خادم شبیر کو داد تو ملی مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ داد اشعار پر کم اور ان کے اسٹائل پر زیادہ دی گئی ہے۔ بہرحال اب کامٹی کے ایک بزرگ شاعر عبدالرحیم خاں صاحب طالب سے درخواست کی جا رہی ہے۔ طالب صاحب ترنم میں پڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں مگر سامعین بیزاری و ناپسندیدگی کا اظہار کر رہے ہیں حالانکہ طالب صاحب کے کچھ شعر میں شعریت ضرور ہے۔ اشفاق انجمی صاحب کسی ضرورت سے اسٹیج چھوڑ کر چلے گئے ہیں اور ان کی جگہ میں نے مائیک سنبھال لیا ہے۔ سامعین کے اصرار پر جوں ہی میں نے شاعرۂ ملت ملکہ نسیم صاحبہ کا نام لیا مجمع میں ایک خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ مختصر سے تعارف کے بعد میں نے ملکہ نسیم صاحبہ کو ہی اس شعر کے ساتھ ان سے مائیک پر تشریف لانے کی زحمت دی ۔

ظلمت کی آندھیاں بھی نہ جس کو بجھا سکیں
اُلفت کی رہگزر کا وہ جلتا دیا ہیں ہم

ملکہ نسیم آج تیسری بار اس تاریخی مسالمہ میں شریک ہوئی ہیں۔ سامعین حضرات و خواتین محترم کی نگاہیں مائیک پر جمی ہوئی ہیں۔ ماحول پر ایک نظر ڈالتے ہوئے ملکہ نسیم پہلے تو شاعر جمالی کے وہ شعر سنا رہی ہیں جس کا مطلع سنا کر میں نے سامعین کو تشنہ چھوڑ دیا تھا۔ شاعر جمالی کے بقیہ اشعار آپ بھی ملکہ نسیم صاحبہ کی زبانی سماعت فرمائیں ۔

تمہاری نسل کو حاجت ہے اک مسیحا کی
مرے قبیلے کا بیمار ساتھ لے جانا
تمہارا سر کوئی ظالم جھکا نہیں سکتا
بس ایک جرأتِ انکار ساتھ لے جانا
ارادہ کر تو لیا ہے وطن سے ہجرت کا
تم اپنے سب در و دیوار ساتھ لے جانا؟
میں جانتا ہوں وہاں تن سے سر جدا ہوں گے
منافقوں کو بھی بے کار ساتھ لے جانا

سامعین شاعر ... کے اشعار سے بہت محظوظ ہو رہے ہیں۔ اور اب ملکہ نسیم اپنا سلام حسبِ معمول ترنم میں سنا رہی ہیں۔ ملکہ نسیم کو قدرت نے کھنکتی سریلی آواز سے نوازا ہے۔ اور ان کے پڑھنے کا انداز بھی لائق

ے اس لیے ترنم کی کمی کا احساس نہیں ہوتا۔ دُور درشن
شاعروں کی مقبولیت اس بات کا ثبوت ہے کہ ترنم
کلام سنانا اہمیت کا حامل نہیں ہے۔ ملکہ نسیم سلام
مطلع عنایت کر رہی ہیں ؎

اللہ رے شانِ شبیری نیزے پہ تلاوت ہوتی ہے
تعظیم عبادت کی خاطر تیغوں میں عبادت ہوتی ہے

داد ہے کہ اس مطلع کا حق ہے۔ پنڈال میں ایک ہنگامہ
مچا ہوا ہے۔ قدرے سکوت کے بعد ملکہ نسیم ارشاد
رہی ہیں ؎

وہ کوفہ ہو یا کرب و بلا اس گھر کا چلن ہے قربانی
ایمان کی عظمت کی خاطر سجدے میں شہادت ہوتی ہے

اس شعر نے پھر پنڈال اڑانے کی کوشش کی ہے۔ ملکہ نسیم
اسی اعتماد کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہیں ؎

جب کفر جہاں میں بڑھتا ہے تسلیم و رضا والے بڑھ کر
سر راہِ خدا میں دیتے ہیں ایماں کی حفاظت ہوتی ہے
یہ ان کے کرم کا صدقہ ہے اسلام جواب تک زندہ ہے
شبیرؑ کے خوں سے ایماں کی رگ رگ میں حرارت ہوتی ہے

دراصل جس کے دل میں امام حسین عالی مقام کی محبت
ہے وہی ایسے شعر کہہ سکتا ہے۔ ملکہ نسیم اپنا سلام ختم کرکے
رخصت ہونا چاہتی ہیں لیکن ہر طرف سے "ایک اور ایک اور"
کا نعرہ بلند ہونے لگا تو وہ ٹھہر گئیں۔ اور دوسرا سلام پیش
کر رہی ہیں ؎

تمہاری بزم میں جلتے ہیں برتری کے چراغ
تمہیں نے دین کو بخشے ہیں روشنی کے چراغ
تو بادشاہ ہوتا [illegible] بادشاہ آج بھی ہے
تمام دنیا میں جلتے ہیں تیری ہی سروری کے چراغ

اہلِ فن کار میں اگر صلاحیت ہے تو وہ سنگلاخ زمین
کو بھی اپنی محنت سے گلزار بنا سکتا ہے۔ یہی الفاظ ملکہ نسیم
صاحبہ پر بھی صادق آتے ہیں۔ آگے فرماتی ہیں ؎

سلگتے خیموں کی زینبؑ تھیں پاسبان اِدھر
یزیدیت نے جلائے اُدھر خوشی کے چراغ
ترے لہو سے لویں تیز ہو گئیں سب کی
لرز رہے تھے ہوا میں پیمبری کے چراغ

ملکہ نسیم کو ان کے ہر شعر پر بھرپور داد مل رہی ہے۔ اب
مقطع عنایت کر رہی ہیں ؎

تمہارے غم کے تصدق میں کربلا والو
نسیم کو بھی عطا ہوں سخنوری کے چراغ

ملکہ نسیم اپنا سلام ختم کرکے بہت کامیاب مائیک سے
رخصت ہو رہی ہیں۔

اس وقت رات کے دو بجا چاہتے ہیں۔ وقت کا کچھ
پتہ ہی نہیں چل رہا ہے۔ ابھی صدرِ محترم تک پہونچنے کے لئے
پانچ منزلیں باقی رہ گئی ہیں۔ میرے پاس آستانۂ صوفی
کے سجادہ نشین محترم صوفی مجیب الرحمان صاحب نے پیغام
بھیجا ہے کہ چند عقیدت مند حضرات جو دور دراز سے تشریف
لائے ہیں صدرِ محترم کو سننا چاہتے ہیں۔ گرچہ یہ مسالمہ یا
کسی مشاعرہ کے روایتی اصول کے خلاف ہے کہ درمیان میں
صدرِ محترم کو زحمت دی جائے لیکن جوں ہی حکم کے مطابق اعلان
کیا گیا سامعین دخل اندازی پر اتر آئے۔ لہٰذا سامعین کا ردِّ
عمل دیکھ کر اصول کی خلاف ورزی کی جرأت نہیں کی جا سکی۔
اب تحیہ ناگپوری کو آواز دی جا رہی ہے۔ لیکن وہ زیادہ متاثر
نہیں کر سکے اور جیسے ہی وہ مائیک سے کھسکے کامٹی کے تابش
حلیمی کو آواز دی گئی۔ تابش حلیمی کا شمار اب کامٹی کے بزرگ
شعراء میں ہونے لگا ہے مگر ان کے ترنم میں جس کی وجہ سے
وہ جانے پہچانے جاتے ہیں وہی لوچ ہے۔ اپنا ایک بہت
پرانا سلام سنا رہے ہیں۔ ان کا یہ شعر بہت پسند کیا گیا ؎

کربلا والے تو اپنا فرض پورا کر گئے
اسوۂ حسنہ پہ چلنا اب ہمارا کام ہے

اب ناگپور کے مولانا مصطفیٰ شائق صاحب کو زحمت
سخن دی جا رہی ہے۔ شائق صاحب بھی بجھے بجھے سے نظر آ رہے
ہیں۔ ان کا یہ شعر بڑی مشکل سے نوٹ کر سکا ؎

حائل کر جس کو کہتے ہیں ہمارا کربلا
نرغے میں قاتلوں کے سما دکھائی دے

شائق صاحب کے بعد ایک اور مہمان شاعر گوپال کرشن راہی سکرالوی کو زحمت دی جا رہی ہے۔ راہی صاحب دبلے پتلے سے درمیانے قد کے آدمی ہیں۔ تحت میں اپنا کلام سنا رہے ہیں اور لوگ انھیں توجہ سے سماعت فرما رہے ہیں مگر افسوس کہ ان کا کوئی شعر نوٹ نہیں کر سکا۔ اب صابر صدیقی ناگپوری کو آواز دی جا رہی ہے۔ صابر صاحب بھی مجمع کو زیادہ متاثر نہیں کر پا رہے ہیں۔ لوگ پہلو بدل بدل کر انھیں سن رہے ہیں۔ صابر صاحب مائیک سے ہٹے تو ناگپور کے نوجوان اور مترنم شاعر اختر کبیر کو دعوت دی گئی۔ اختر صاحب کامیاب رہے چھوٹی بحر میں خوشگوار ترنم میں اپنا سلام سنا رہے ہیں۔ ان کا ترنم کانپور کی شاعرہ ترنم کا بھولا بسرا یاد تازہ کر رہا ہے ؎

بات بگڑی جادو کی تنویر کی ÷ یہ ضیا ہے جلوۂ شبیرؑ کی
پائے عابدؑ کی جرأت دیکھ کر ÷ ہر کڑی تھرا گئی زنجیر کی

اب صدر محترم سے پہلے محترم شاطر حکیمی صاحب سرپرست مسالمہ کی باری ہے مگر جب ان سے رجوع کیا گیا تو انھوں نے معذرت طلب فرمائی کیونکہ آج کل ان کی طبیعت ناساز رہا کرتی ہے۔

بہرحال اب مسالمہ کے صدر محترم جوگا سنگھ انور صاحب کو نہایت ادب و احترام کے ساتھ زحمت سخن دی جا رہی ہے۔ اس وقت گھڑی میں ساڑھے تین سے کچھ زیادہ ہو گئے ہیں۔ سامعین جس ذوق و شوق سے اپنے شعرائے کرام کو سن رہے ہیں اس کے پیش نظر میں دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کر رہا ہوں کہ چند نامور بیرونی و معتبر مقامی شعرائے کرام کی عدم شرکت کے باوجود بھی آج کا مسالمہ نہایت کامیابی کے ساتھ اختتام کو پہونچ رہا ہے ذہن میں محترم شاطر حکیمی صاحب کا یہ مصرعہ جانے یہ کس کی دعاؤں کا اثر ہوتا ہے گونج رہا ہے۔ کیونکہ مسالمہ کے ابتداء میں ایسا لگ رہا تھا کہ مسالمہ دو گھنٹے سے زیادہ نہیں چل سکے گا۔ محترم جوگا سنگھ انور اپنی مختصر سی صدارتی تقریر کے بعد اپنا کلام اپنے مخصوص ترنم میں سنا رہے ہیں ؎

بالیقیں قتل کی شب قافلہ پیاسا ہوگا۔
اور یہ حادثہ یارو لب دریا ہوگا

جوگا سنگھ انور جب مائیک پر آئے تھے تو پنڈال میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ماحول پر سکوت غالب تھا۔ جس طرح سمندر کی خاموشی سے طوفان کے آثار کا اندازہ لگا لیا جاتا ہے جیسا کہ ڈاکٹر ایل بھی رند صیر صاحب مرحوم کا یہ شعر ہے ؎

طوفان سے کچھ پہلے خاموش سمندر ہے
کیوں درد ہوا کم کم ہم خوب سمجھتے ہیں

بالکل ایسا ہی ماحول یہاں بنا ہوا ہے یعنی اب مسالمہ گاہ میں ایک بہت بڑا دھماکہ ہونے والا ہے اور جیسے ہی جوگا سنگھ انور نے اپنا مطلع پورا کیا مسالمہ گاہ کی چھت "سبحان اللہ" اور "واہ واہ" کی صداؤں سے اڑنے لگی۔ انور صاحب قدرے سکوت پاکر ارشاد کر رہے ہیں ؎

موجزن سامنے جس کے ہوں فرات و دجلہ
کتنا باظرف وہ انساں ہے جو پیاسا ہوگا

جوگا سنگھ انور صاحب واقعی صدارت کا حق ادا کر رہے ہیں۔

آسماں تیری بلندی بھی اسے ہیچ لگے
جس کی نظروں میں رخ گنبد خضرا ہوگا
مدتوں خاک میں اشکوں کی نمی بھی ہوگی
قافلہ درد کا جس راہ سے گزرا ہوگا
جہل سے ہاتھ سے پتھر ہی ملیں گے انور
اور ہونٹوں پہ مگر حرف دعا کا ہوگا

انور صاحب حسب معمول بہت کامیاب رہے۔ ان کے تمام اشعار بار بار پڑھائے گئے اور جوں ہی انھوں نے اپنا سلام ختم کر کے رخصت ہونے کا ارادہ کیا "ایک اور ایک اور" کی ایک ساتھ کئی آوازیں بلند ہونے لگیں لیجئے انور صاحب تعمیل ارشاد میں اپنا دوسرا سلام بھی پیش کر رہے ہیں۔ سلام کی ردیف غزل کی ردیف ہے لیکن اس میں بھی انور صاحب نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ سلام کے تقاضے کو پورا کیا ہے۔ سامعین بھی انھیں خوب داد دے رہے ہیں ؎

بچا بچا کر تو کردار کا اثاثہ رکھ
ملے جو شرط پہ دریا تو خود کو پیاسا رکھ
حسینؑ پیاس کی عظمت کو تو بھی ترسے گا
یزید ہے تو ہوا کر تو اپنا دریا رکھ

جہاں میں صاحبِ کردار بن کے جینا سیکھ
نظر میں عزمِ حسینیؓ کو تو ہمیشہ رکھ
کلام ایسا کہ دشمن کا بھی نہ دل ٹوٹے
لبِ حسینؓ کی مانند شیریں لہجہ رکھ

واقعی حضرت امام حسینؓ عالی مقام کی شہادتِ عظمیٰ ہمارے لئے ایک بہت بڑا سبق ہے۔ ہم ہر سال محرم میں ان کی یاد میں بڑے خلوص اور عقیدت کے ساتھ مجلسیں منعقد تو کرتے ہیں مگر یہ سب چیزیں محض رسمی بن کر رہ گئی ہیں جیسا کہ محترم کریم الاحسانی صاحب نے ارشاد کیا ہے ؎

ہم شہیدوں کے ذکر پر اب بھی
سر جھکاتے تو ہیں مگر رسماً

بہرحال! اس وقت صبح کے چار سے کچھ زیادہ بجا چاہتے ہیں اور مسالمہ کے اختتام کا اعلان کیا جا رہا ہے اس کامیاب اور تاریخی مسالمہ کے لئے محترم نشاط حکیمی صاحب اور محترم صوفی مجیب الرحمان صاحب کے علاوہ صوفی حفیظ الرحمٰن۔ صوفی غلام رسولؐ صادق۔ غلام رحمان ساجد وغیرہ بھی بجا طور پر مبارکباد کے مستحق ہیں۔ یہ حق تلفی ہوگی اگر ڈاکٹر عشرت جاوید انصاری صدر استقبالیہ۔ محترم ڈاکٹر ایس ناتھ، ماسٹر ظہیر عمر، ماسٹر کاظم علی اور جمشید پور سے تشریف لائے ہوئے عقیدت مند حضرات مثلاً ڈاکٹر پٹنائک صاحب۔ ایڈوکیٹ جوالا پرساد صاحب، عبد الوہاب صاحب فوٹو گرافر، گلزار احمد صاحب، گنگولی صاحب وغیرہ کا بھی شکریہ ادا نہ کیا جائے جن کے پُر خلوص تعاون سے آج کا مسالمہ حسبِ معمول بہت کامیاب اور تاریخی ثابت ہوا۔

رام لعل نابھوی کی دو گرانقدر تخلیقات

"تبسم" طنزیہ مزاحیہ خاکوں کا مجموعہ دوسرا ایڈیشن -/۲۰
"آم کے آم" انشائیوں کا مجموعہ آفسیٹ طباعت -/۳۰

ملنے کا پتہ
دفتر شانِ ہند فلیٹ نمبر ۸ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۲

گرسرن لال ادیب لکھنوی

اندرا گاندھی کی یاد

یہ اشعار ۱۳؍ اکتوبر کو راشٹرپتی بھون کے مشاعرے میں پڑھے گئے۔

غیر ممکن ہے مٹائے اس کو مرگِ ناگہاں
ہیں نمایاں چار جانب جس کی عظمت کے نشاں

اپنی ہستی جو مٹا دیتے ہیں کارِ خیر میں
لاتی ہے موت ان کی پیغامِ حیاتِ جاوداں

اندرا گاندھی سراپا امن کی دیوی تھی تو
تھی یہ کوشش متحد ہو جائیں اقوامِ جہاں

چاند غائب ہے مگر ہے چاندنی پھیلی ہوئی
جسم خاکی مٹ گیا ہے روح لیکن ضو فشاں

کیوں نہ ہم کو یاد اس دیوی کی آئے اے ادیب
اپنے خوں سے جس نے سینچا گلشنِ ہندوستاں

غزل

نور جہاں بیگم نور حیدرآبادی

بسر کرنی ہے ان کی یاد میں اب زندگی اپنی
سمو کر رہ گئی ہے اب خودی میں بیخودی اپنی

شکستِ آرزو ٹوٹے ہوئے دل کا نمونہ ہے
جنوں کے نذر ہو کر رہ گئی ہے آگہی اپنی

نگاہوں کے تصادم نے ہمیں مدہوش کر ڈالا
عجب انداز سے ساقی نے کی ہے میکشی اپنی

متاعِ دردِ الفت ہے فقط اک کائناتِ دل
ہوئی اندرِ محبت زندگی بھر کی خوشی اپنی

جگر میں درد ہے ویران ہے محفل اضطرابِ دل
سمٹ کر رہ گئی ہے نورؔ ان میں بے کسی اپنی

"اجنتا"

ڈاکٹر حقیر آستانی
ڈبل ایم اے۔ ایل ایل بی۔ پی ایچ ڈی
(ڈی ایس اے)

سمو کر نظر میں نظارت کے رنگ
وہ بیٹھا ہوا ہے مصوّر کوئی

گلابی شرابی نشیلے تمام — کوئی خم کے خم جیسے پی لے تمام
لجیلے کٹیلے رنگیلے تمام — کوئی زندگی جیسے جی لے تمام
نضارت، صباحت، بشاشت کے رنگ
سمو کر نظر میں نظارت کے رنگ
وہ بیٹھا ہوا ہے مصوّر کوئی

کہیں کھل رہے ہیں چمن در چمن — کہیں موجزن ہے دلوں کی لگن
کہیں رقص میں ہے اروبھی ترن — کہیں حسن ہے تو کہیں حسنِ ظن
صداقت، بہارت، سعادت کے رنگ
سمو کر نظر میں نظارت کے رنگ
وہ بیٹھا ہوا ہے مصوّر کوئی

کہیں ماہِ کامل کہیں کہکشاں — کہیں وصول اُڑاتے ہوئے کارواں
کہیں گھر کے چھائی ہوئی بدلیاں — کہیں زندگی ہے دما دم رواں
مشقت، اعادت، ریاضت کے رنگ
نظر میں سمو کر نظارت کے رنگ
وہ بیٹھا ہوا ہے مصوّر کوئی

کہیں حسن نازاں کہیں اشکبار — کہیں عشق خنداں کہیں سوگوار
کہیں حسن مائل بہ لطف ہزار — کہیں عشق بے خود بے اختیار
نزاکت، لطافت، بشارت کے رنگ
نظر میں سمو کر نظارت کے رنگ
وہ بیٹھا ہوا ہے مصوّر کوئی

سنبھلتی ہوئی سرخوشی ہے کہیں — مچلتی ہوئی دلبری ہے کہیں
سکوں ہی سکوں دائمی ہے کہیں — خودی ہے کہیں بیخودی ہے کہیں
اخوت، مروت، رفاقت کے رنگ
نظر میں سمو کر نظارت کے رنگ
وہ بیٹھا ہوا ہے مصوّر کوئی

یہ صدیوں کے رنگیں نقوشِ کہن — نمائندۂ خاکسارانِ فن
کمالِ نفاست ہیں شانِ وطن — ہمیشہ رہے گی یہ ... کی پھبن
عقیدت، عزیمت، عبادت کے رنگ
نظر میں سمو کر نظارت کے رنگ
وہ بیٹھا ہوا ہے مصور کوئی

یہ شہکارِ ماضی ابد کے مکیں — خداؤں کے محرم بتوں کے امیں
صدا آ رہی ہے ز چرخ بریں — زوال ان کو آئے گا ہرگز نہیں
حقیقت، شریعت، شہادت کے رنگ
سمو کر نظر میں نظارت کے رنگ
وہ بیٹھا ہوا ہے مصور کوئی

غزل

مجھ کو مجھ سے چرا لیا ظالم — ہائے تو نے یہ کیا کیا ظالم
جان لے گی یہ ایک دن میری — جان لیوا تری ادا ظالم
تیرے وعدے کا اعتبار نہیں — میرے سر کی قسم نہ کھا ظالم
عمر بھر تیرا انتظار کیا — تو نہ آیا نہ آئے گا ظالم
اک جھلک دیکھنے کی چاہت میں — ہم نے خود کو مٹا دیا ظالم
اب مرا دم نکلنے والا ہے — اب تو جلوہ ذرا دکھا ظالم
ہو نہ مغرور یوں جوانی پر — ہے یہ دھوکا سراب کا ظالم
ہم کو تجھ پر بہت بھروسہ تھا — تجھ کو سمجھے تھے ناخدا ظالم
لاکھ طوفان سے کنارے پر — کیوں سفینہ ڈبو دیا ظالم
ان کا کچھ اثر نہیں ہوتا — ہے زمانہ بہت بڑا ظالم
وقت پہ موت ساتھ دیتی ہے — زندگی تو ہے بے وفا ظالم
جان سے بھی عزیز تھا جو رفیق
دشمنِ جاں وہ بن گیا ظالم

بقیہ: اندرا گاندھی

روشنی کی مشعل اب اس کے لڑکے کے ہاتھ میں آ گئی تھی لیکن مجھے محسوس ہوا گویا دیوتاؤں خصوصاً ہندوستانی دیوتاؤں کی مدھم روشنی گل ہو رہی تھی۔ تب مجھے اسپینی ادیب رسے میرو گیلو کا قول یاد آیا اس نے کہا ہے کہ اس دور میں جنون اور پاگل پن کتنا ہی زور کیوں نہ پکڑ لے لیکن زندگی کے بحرِ ظلمات میں ہندوستان کی روشنی کا مینار ہمیشہ راہ دکھاتا رہے گا۔

اندرا کی راکھ کے نزدیک چنبیلی اور گلاب کی بنی ہوئی ایک لڑی میں نے اٹھا لی جو بڑی حسین اور سرسبز تھی۔ افسردہ سے میں نے اسے زمین پر رکھ دیا۔ مجھے محسوس ہوا جیسے یہ میرا خیر مقدم کر رہے ہوں مسکرا رہے ہوں۔ وہ مسرور تھے کہ میں ہندوستان لوٹ آیا ہوں۔ یہ علامت تھی اس امر کی کہ کوئی شے ہمیشہ باقی رہتی ہے۔ ایک عظیم ہندوستانی دوستی اور انسانی محبت کے نمایاں کارنامے لازوال ہوتے ہیں۔

نذرِ عقیدت

بخدمتِ گرامی
الحاج حکیم حاذق
عالیجناب حکیم
سید یحییٰ احمد
صاحب
مدظلہٗ العالی

مراد

ذہن میں اس وقت میرے حکمتِ ابداع ہے
علمِ طب کا ذکر ہے قرآنِ اعظم میں ندیم
علمِ حکمت میں یہ ہستی اک عظیم الشان ہے
بعدِ لقماں پھر ہوئے سقراط بھی بقراط بھی
پھر بنے ہیں فیساغورث اصل میں قائم مقام
علمِ طب میں دونوں گزرے ہیں بہت عالی مقام
آج بھی وردِ زباں ہے بو علی سینا کا نام
آج بھی دنیا میں اجمل خاں کی شہرت لاکلام
نظم میری کیوں نہ ہو جذبات کی آئینہ دار
یعنی وہ یحییٰ میاں حاذق حکیم معتبر
آپ سے ہیں آج روشن علم و حکمت کے چراغ
آپ کے اسلاف میں احمد علی سیماب تھے
آپ کے والد سعید احمد میاں ذی اقتدار
آپ ہی کے خاندان میں ہستیاں گزریں عظیم
وہ سعیدی خاندان ہے جس نے پایا شرف
افضل و اعلیٰ جو گزرے ہیں طبیبِ نیک نام
فضلِ حق سے ٹونک میں ہیں صاحبِ عظمت نشاں
آپ کو قدرت نے وہ دستِ شفا بخشا جناب
ضامنِ صحت ہے بے شک آپ کا دارالشفا
طالبانِ فنِ طب کو آپ دیتے ہیں سبق
علمِ طب میں آج بھی ہیں آفتاب و ماہتاب
باغِ حکمت میں بہاراں آپ ہی کے دم سے ہے
آسمانِ علمِ طب پہ یوں منور آنجناب
علمِ طب میں جگمگاتے ہی رہے اس شان سے
آپ کو آلِ محمدؐ سے وہ نسبت ہے جناب
روضۂ اقدس بھی دیکھا اپنی آنکھوں سے ندیم
آپ کو اللہ نے بخشی بزرگی دوام
خوش نظر خوش فکر اور خدمت گزار یکساں
یہ دعا ہے میرے دل کی اے خداوندِ کریم
اللہ مہ و اختر کا جب تک یہ فلک یاور رہے

جس کا قائم آج تک بھی حضرتِ لقمان ہے
علمِ طب کو مرتبہ اللہ نے بخشا عظیم
تک کی شاہد حشر تک اک سورۂ لقمان ہے
علمِ طب میں آج بھی شہرت ہے اُن کے نام کی
زندہ جاوید ہے اب تک جہاں میں ان کا نام
تھے فلاطون و ارسطو فنِ طب کے تاجدار
اور جالینوس بھی استادِ فن تھے لاکلام
تھا شریفی خاندان بھارت میں مقبولِ عوام
جب کہ شخصیت ہے میرے ذہن میں عالی وقار
خدمتِ خلقِ خدا کرتے ہیں جو شام و سحر
حشر تک مہکا کریں گے علم و حکمت ہی کے باغ
بحرِ حکمت کے وہی اک گوہرِ نایاب تھے
شاعری اور فنِ طب تھے دونوں اک شاہکار
جن میں شاعر مولوی تھے اور تھے حاذق حکیم
جن کی شہرت علم و حکمت میں ہے چاروں طرف
ان کی صف میں حضرتِ یحییٰ میاں ہیں لاکلام
جن کے ہر نسخہ میں پوشیدہ شفا ہے بے گماں
آپ کی ہر اک دوا ہو کر رہی ہے کامیاب
تندرستی جس سے ہوتی ہے مریضوں کو عطا
ہر کتابِ طب کا اب بھی یاد ہے اک اک ورق
علمِ طب میں بن گئے کہتے ہی ذرّے آفتاب
باغِ حکمت یوں گل افشاں آپ ہی کے دم سے ہے
دیکھ کر شرمندہ جس کو آفتاب و ماہتاب
سلسلہ ملتا ہے جا کر آپ کا لقمان سے
آپ کو ملتا رہا فیضِ علی بو تراب
بن گئی تکمیلِ حج خوشنودیٔ ربِ کریم
ہند و مسلم آپ کا کرتے ہیں بے حد احترام
اپنے فن میں کامل و اکمل بنے یحییٰ میاں
مرتبہ اعلیٰ ملے کونین میں ربِ حکیم
آپ کا سایہ جہاں میں تا ابد سر پر رہے

سارا عالم جس کو کہتا ہے مُراد خوش بیاں
وہ سعیدی خاندان کا ہی رہا ہے قدرداں

بقیہ: عقل و حکمت

تم جھوٹ بولتے ہو غداری کی ہے دھوکا دیا ہے تم نیچ ہو۔ ظالم ہو بزدل ہو۔"

"چوہے دوست تم ناراض مت ہو میں بیمار بھی ہوں اور جنگل کا راجہ بھی جو تم سوچ رہے ہو میں نے ایسا کچھ نہیں کیا ہے میں نے تمہاری بیوی کو تمہارے جاتے ہی چھوڑ دیا تھا۔ مجھے پکا بھروسہ تھا کہ تم میرا کام کرکے ضرور لاؤ گے چھوٹے لوگ دل کے صاف ہوتے ہیں۔ دھرم ایمان کو نبھانے والے ہوتے ہیں اُن کی ہمدردی پاک صاف ہوتی ہے میں اپنا پیٹ بھر لوں اور تم اپنی بیوی سے جاکر حال چال پوچھو تو کہتے ہوئے بھوکے شیر نے ہرن کے گلے پر جبڑے جما دیئے اور ہرن کے خون کے دھار اُس کے منہ میں جانے لگی۔

چوہا گھر پہنچا تو چوہیا منہ پھولے کی بالیں کتر رہی تھی وہ تم آگئے" دیکھتے ہی بالیں ایک طرف رکھتے ہوئے پاس آکر بولی ربان آگیا۔ تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی۔

بالکل نہیں۔ وہ آدمی کی طرح دھوکے باز تھوڑے ہی تھا جو بے شمار دانوں میں زہر کا ٹکڑا لگا کر بھوکے چوہوں کو پھنسا کر مار ڈالتا ہے۔ اس نے تو تمہارے جاتے ہی پنجہ ڈھیلا کر دیا تھا۔ اور مجھ سے پیار سے بولا۔ بیٹی تم گھبراؤ مت میں تمہیں کھاؤں گا نہیں۔ تم میرے دوست کی بیوی ہو۔ میں آدمی کی طرح دوستی میں دغا نہیں کروں گا کبھی کوئی کام آپڑے تو یاد کرنا اب مجھ میں طاقت تو ہے ہی نہیں عقل ہی رہ گئی ہے اور رہ گیا ہے عمر بھر کا تجربہ اسی سے دُنیا بھر پر راج کیا جاتا ہے اسی کے بل پر تمہاری کسی وقت پر مدد کر سکتا ہوں۔ اتنا کہہ کر شیر نے چھوڑ دیا اور میں چلی آئی۔

چلتے وقت نمستے اور شکریہ بھی نہیں کہا۔

"ارے میں تو یہ سب کچھ بھول ہی گئی۔

"کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ کبھی تمہارے کام آسکتا ہے چوہے کے سوال پر چوہیا چپ ہو گئی اور کچھ سوچنے لگی چوہا پھر بولا" مجھے تو اس کی اس بھولی میں بھی ایک چال نظر آتی ہے جو کبھی ظاہر ہو جائیگی بڑے لوگوں سے دوستی کرنا اچھا نہیں ہوتا ہے پیڑوں کے سایہ میں پودے کبھی بھی پرورش نہیں پاتے ہیں سمجھیں!"

غزل

نوّر ریوانی

جب بھی میرے پاس آیا کیجئے
آپ یوں ہی مسکرایا کیجئے

آنکھوں میں آنسو نہیں سجتے حبیب
بیٹھ کر کچھ گنگنایا کیجئے

جتنا ہنس ہنس کے اٹھایا جا سکے
بوجھ اُتنا ہی اٹھایا کیجئے

پھول سے چہرے پہ غم اچھا نہیں
پھول جیسا مسکرایا کیجئے

آپ کیوں ہم کو سمجھتے غیر ہیں
حالِ دل کچھ تو سنایا کیجئے

دور منزل اور راہیں پُرخطر
یوں نہ تنہا آیا جایا کیجئے

تیرگی ہو جائے گی نظروں سے دور
نوّر کو دل میں بسایا کیجئے

غزل

ڈاکٹر سید محمود دیوان (مرشد)

اٹھیے وقتِ شام آگیا ✣ ساقی کے لئے پیام آگیا
آپ آئے کیا جہاں میں ✣ دہر میں نظام آگیا
میری نطق چومے لب مرا ✣ لب پہ حُسن کا نام آگیا
آپ کے طفیل میں جناب ✣ مجھ کو بھی سلام آگیا
سامنے حضور کے ہوں جب ✣ حکم ہو غلام آگیا
جان بھی نثار اب کروں ✣ دل تو آن کے کام آگیا
میری بے بسی نہ پوچھئے ✣ موت کا پیام آگیا
آپ کیا حضور آئے گئے ✣ میکدہ تمام آگیا
ٹوٹ کے گھٹا برس پڑی ✣ کون تشنہ کام آگیا
ٹک جھونک چل کے کیجئے ✣ قادر الکلام آگیا
اب تو تم دیوان کو کہو ✣ جنت المقام آگیا

دیوالی

کے مقدس تہوار پر

ہر ہندوستانی کو دلی

مبارکباد

دُعا ہے کہ ہم سب کے لئے دیوالی حقیقی خوشیوں، خوشحالی اور قومی ایکتا کی ضامن روایات کی امین ثابت ہو۔ اور ہم سب مل کر ملک کی ترقی کے نئے قدم سے قدم ملا کر گامزن رہیں تا کہ آنے والی نسلیں بہتر انداز میں دیوالی کی خوشیوں سے ہم کنار ہو سکیں۔

موہن گولڈ واٹر

ڈالی گنج لکھنؤ۔ یوپی

شعرائے غازی آباد

جناب گربسرن لال ادیب لکھنوی

غازی آباد میرٹھ سے تیس کلو میٹر اور دہلی سے بیس کلو میٹر کے فاصلے پر ہے۔ اسی لئے اس شہر پر ان دونوں شہروں کے اثرات بہت نمایاں ہیں۔ نہ صرف کاروباری معاملات میں بلکہ اُردو ادب کے معاملے میں بھی۔ آج بھی جب کہ اُردو زبان کا بازار سرد ہے یہاں کم و بیش اُردو کے شاعروں کی تعداد ۲۵ ہے۔ اس شہر میں اردو شاعری کے اعتبار سے مانگے کا اُجالا ہے بیشتر شعرا غازی آباد سے باہر کے رہنے والے ہیں۔ بقول حضرت امیر مینائیؔ۔

امیرؔ جمع ہیں احباب دردِ دل کہہ لے
یہ اختلاطِ دلِ دوستاں رہے نہ رہے

غازی آباد کے شعراء کا ایک تذکرہ ترتیب دینے کا خیال مجھ خاکسار کے دل میں آیا۔ ممکن ہے ادب اردو کی تاریخ لکھنے والوں کو اس تذکرے سے کچھ سہولت بہم پہنچے۔

ضیا میرٹھی:۔ کرشن مراری لال برہمن ضیا تخلص۔ ولادت ضلع میرٹھ میں بتاریخ ۱۴ فروری ۱۹۱۳ء۔ ابھی ۸ ہی سال کے تھے کہ والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ بڑے بھائی نے پرورش کی۔ حسبِ دل خواہ تعلیم کا سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ اُردو اور ہندی مڈل پاس کیا اور اپنا ایک مدرسہ جاری کیا۔ اسی اثنا میں ہائی اسکول اور اعلیٰ قابلیت کے امتحانات پاس کئے۔ عرصہ تک ایک سرکاری منظوری پائے ہوئے مڈل اسکول میں مدرس رہے۔ منشی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ آخر کو ہیڈ ماسٹری سے ریٹائر ہوئے۔

خاندان۔ آپ کے والد بھی معلم تھے۔ آپ کی اہلیہ کا انتقال عالم شباب میں ہو گیا۔ آپ نے دوسری شادی نہیں کی۔ آپ کے دو فرزند ہیں۔ بڑے صاحبزادے ہندی میں ایم اے ہیں۔ جونیر ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر۔ چھوٹے صاحبزادے لیبر افسر ہیں۔ اردو میں شعر کہتے ہیں اور مگنؔ تخلص فرماتے ہیں۔ جناب ضیا کا قیام بیشتر بڑے صاحبزادے کے پاس رہتا ہے یعنی پرلیشد کے جونیر ہائی اسکول میں گھنٹہ گھر غازی آباد کے پاس۔

شاعری:۔ جناب ضیا میرٹھی فنِ عروض میں اچھا دخل رکھتے ہیں۔ طالب علمی کے زمانے سے ہی شعر کہتے ہیں۔ جملہ اصنافِ سخن میں طبع آزمائی فرماتے ہیں بہت زود گو ہیں۔ کلام معائبِ سخن سے پاک ہے۔ شروع میں جناب شمس میرٹھی تلمذ اختیار کیا کچھ کلام جناب سیماب سیماب اکبر آبادی کو دکھایا۔ ان کے پاکستان چلے جانے کے بعد کچھ کلام پر جناب علامہ کیفی دہلوی سے اصلاح لی۔

اخلاق و عادت:۔ بہت وسیع الاخلاق ہیں۔ مذہبی تعصب سے بہت دور۔ آپ کے ملنے والوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی تعداد قریب قریب برابر ہی ہے۔ بہت سادہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ لباس اور غذا دونوں ہی میں تکلف نہیں۔ دودھ دہی کا شوق ہے اس لئے بھینس یا گائے ہمیشہ پالتے ہیں۔ بہت مہمان نواز اور منکسر مزاج ہیں۔ ایک بار مل کر دوسری بار ملنے کو جی چاہتا ہے۔ زبان اُردو سے بہت محبت ہے۔ انجمن یادگار امن غازی آباد کے ماہانہ مشاعرے آپ ہی کے دردولت پر ہوتے ہیں۔ [illegible] یا اور کوئی نشہ استعمال نہیں کرتے۔ آپ کو ہندوستان سے محبت ہے اور ہمیشہ کانگریس کے ہمنوا رہے ہیں۔

آپ نے اپنی سرگزشتِ حیات کے عنوان سے ایک نظم لکھی جو درج ذیل ہے۔

نہ پوچھو آہ۔ ہمنشیں شرح ملالِ غم کشی میری
بھائی اندوہ گیں ہے سرگزشتِ زندگی میری
بروز پنج شنبہ تھی [illegible] سن تیرہ
مہینہ فروری کا تھا ولادت جب ہوئی میری

اٹھا اب یہ پدر کا سر سے میرے عین بچپن میں
بڑے بھائی نے کی بیچارگی میں پاوری میری
پڑا اتھا بار سر پر اپنے بچوں کا جوانی میں
غنی دے کر امانت میں شریکِ زندگی میری
رہا مسلک ہمیشہ خدمتِ قوم و وطن میرا
ملا پیشہ معلم کا یہ تھی خوش قسمتی میری
مری فطرت ہے ہمدردی محبت میرا ایمان ہے
برہمن ہو کہ گر ہے شیخ سب بھی دوستی میری
یہ دولت گر نہ کام آتی تو غم سے گھٹ کے مر جاتا
ضیا کام آگئی ناکامیوں میں شاعری میری
نمونۂ کلام پیش ہے ۔

رباعی

بنسنا بھی کبھی عذاب ہو جاتا ہے
رونا بھی عتاب ہو جاتا ہے
افسوس یہ رازِ عشق ہم پر نہ کھلا
رخ کون سا کامیاب ہو جاتا ہے

دیگر

اُلفت کی بہاروں میں تجھے ڈھونڈھ لیا
دلچسپ نظاروں میں تجھے ڈھونڈھ لیا
اک شوخ طرحدار کی آنکھوں کی قسم
نازک سے اشاروں میں تجھے ڈھونڈھ لیا

قطعہ

قابلِ رشکِ جہاں ہے باعثِ اعزاز ہے
ہے وطن ہندوستاں میرا جو انساں ساز ہے
نغمہ برانداز ہوں میں جس کی زباں میں اے ضیا
وہ زباں اُردو ہے میری جس زباں پہ ناز ہے

قطعہ

بر وفات لال بہادر شاستری ۔ وزیر اعظم ہندوستان ۔

جو تھا طوفانوں میں دل کا آسرا جاتا رہا
کشتیِ ہندوستاں کا ناخدا جاتا رہا
اب لکھو تاریخِ رحلت خونِ دل سے اے ضیا
ہمت و عزم و ارادے کا خدا جاتا رہا

نظم صبحِ وطن کے چند بند

پتا پتا زر نگار ✤ ذرہ ذرہ مشکبار
یہ عطائے کردگار ✤ دل مرا تجھ پر نثار
اے مری صبحِ وطن

تیرا نغمہ سرمدی ✤ جلوہ سحرِ سامری
تو ہے روحِ دلکشی ✤ تو ہے جانِ شاعری
اے مری صبحِ وطن

جناب ضیا کے اشعار کی تعداد ہزاروں میں ہے مگر افسوس ہے کہ ضیا صاحب کوئی مجموعۂ کلام شائع نہیں کر سکے نیچے غزل کا نمونہ ملاحظہ ہو ۔

غزل

نہ وہ کیف جامِ شراب میں نہ وہ لطف صبح و مسا میں ہے
جسے کہئے حاصلِ زندگی وہ تو ذکر و فکرِ خدا میں ہے
نہیں نالۂ دل کا مرا رسا نہ اثر ہی میری دعا میں ہے
مرا آفتابِ نصیب کیا ابھی ابرِ شامِ بلا میں ہے
ترا حسن زیرِ نقاب کیا کوئی برق دامِ سحاب کیا
وہی بات جو ہے حجاب میں تری رسمِ شرم و حیا میں ہے
جو ہے مہر و ماہ میں روشنی جو گلوں نے پائی ہے دلکشی
وہی شان و شوکت و تازگی ترے حسنِ رنگیں ادا میں ہے
جسے پہلے اپنا بنا لیا ۔ اُسے غیر کہہ کے اٹھا دیا
یہی ذکر ہے تری بزم میں یہی شور اہلِ وفا میں ہے
شب و روز رہتے تھے بدگماں جسے تم نے سمجھا تھا ناتواں
وہی اک مسافرِ خستہ جاں ابھی کاروانِ وفا میں ہے
میں شہیدِ ناز ہوں اے ضیا مرا دل ہے پیار کا آئینہ
نہیں راہِ حق سے گریز پا، مرا اعتقاد خدا میں ہے

غزل دیگر

ہے قدم ہوش کی منزل میں کہاں تیز ابھی
توسنِ عقل کو ہے حاجتِ مہمیز ابھی
باغباں کی نظرِ خاص ہے اب تو ان پہ
غنچے جن کا نہ کھلا تھا کہیں گل نو خیز ابھی
پینے والوں کا یہاں قحط رہا ہے شاید
ساقیا جامِ نظر ہے ترا لبریز ابھی

اے ضیا بن کے رہیں گے یہ چراغِ محفل
داغ دل اپنے نظر آتے ہیں ضو ریز ابھی

بُقدم چچا کا عشقِ حقیقی

جوزف انور

محلّے میں ہمارے گھر کے عین مقابل ہمارے لنگوٹیا یار بلکہ اس سے بھی ماقبل پیریڈ کے خاص الخاص دوست ماموں رشتہ عرف بُقدم چچا کا مکان تھا۔ عجیب باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے۔ شاعری کے علاوہ دیگر فنونِ لطیفہ یعنی پتنگ بازی کبوتر بازی، نظر بازی یعنی بجملہ دیگر زبانوں میں محلہ تو کیا سارے شہر میں ہمارے سوا ان کا کوئی مدِمقابل نہیں تھا۔ والدین کی جوتیوں کے صدقے، جیسے تیسے آٹھویں جماعت بھی پاس کر ڈالی تھی اگرچہ مزاج روزِ اوّل کے بجائے صرف لڑکپن ہی سے عاشقانہ لکھا کر لائے تھے مگر اللہ ہو غنی۔ دیکھتے ہی دیکھتے شریعت کی حدِ آخر یعنی چار عدد بیگمات کو شرفِ قبولیت عطا فرما چکے تھے تاہم شاکر نہیں تھے جہاں کوئی لالہ فریب صورت قریب سے گزرتی کہ حضرت کی آنکھیں گرگٹ کی طرح پھیلنے سکڑنے لگ جاتیں۔ چونکہ آٹھویں جماعت پاس تھے اور آٹھویں جماعت اور شاعری کا چولی دامن کا ساتھ ہے لہٰذا اس سے قبل کہ وہ شاعری کی چولی پر اپنا دستِ ناروا بڑھاتے خود شاعری نے بڑھ کر ان کا دامن تھام لیا تھا۔ ویسے یہ ان کی ذرّہ نوازی تھی کہ مشورۂ سخن کا اعزاز انھوں نے ہمیں ہی بخشا۔

کہتے ہیں کہ افراط ہر چیز کی بُری ہوتی ہے چنانچہ بُقدم چچا کے گھر والوں نے دیکھا کہ ان کی شاعری میں مجازی رنگ ضرورت سے زیادہ آنے لگا ہے۔ تو والدین اور بزرگوں نے ان کا قافیہ تنگ کرکے انھیں گوشت کی دوکان پر بٹھا ہی دیا۔

بزرگوں کا قول ہے کہ عاشقانہ مزاج دمِ واپسیں کے وقت بھی مشکل سے جاتا ہے۔

چنانچہ دوکان پر بھی بُقدم چچا کا یہ عالم تھا کہ جب کوئی قبول صورت بھی دوکان پر آتی کہ حضرت نہایت احتیاط سے تہ بند گھٹنوں تک چڑھا کر حسبِ زاویۂ چشم سرِ گیر نشست بنا کر بیٹھ جاتے اور اس توجہ سے گوشت کاٹتے گویا ڈاکٹر برنارڈ دل کی جراحی کر رہا ہو۔ ساتھ ہی بڑی معنی آفریں گفتگو بھی فرماتے جاتے۔

"ہائے کیا عمدہ چانپ ہے۔ لے میری طرف سے ایک اور لے لے۔ ارے عذرا ان کی کیا بات کرتی ہو مجنوں کی ران کا گوشت تو لیلیٰ کو بھی پسند نہیں آیا تھا۔ یہ چانپ کھا کر دیکھ جانب!"

آس پاس کی کنجڑیاں بُقدم چچا کی اس رگِ نازک کی پھڑکن سے واقف ہو چکی تھیں۔ علی الصبح کنگھی چوٹی، سرمے سے لیس ہو کر دوکان پر آ دھمکتیں اور سراپائے دل و نگاہ کے ساتھ بُقدم چچا سے ادلے کے بدلے کی لالچ میں سو چھ ادلہ مفت مار لے جاتیں مگر بُقدم چچا بھی اپنے پیشے میں ماہر تھے۔ ترازو کے چند جھٹکوں ہی میں ناکوں سے اس نقصان کی تلافی فرما لیتے۔

گھر پر یہ عالم تھا کہ بیگمات میں ہفتے کے دن کلینڈر کی طرح بانٹ رکھے تھے بڑی تین بیگموں کے لئے ایک ایک دن اور سب سے چھوٹی ممتاز بیگم چونکہ ابھی کمسن تھیں۔ لہٰذا ازراہِ کرم اُن کے ابلاغ کے لئے تین دن وقف کر رکھے تھے۔ تینوں بڑی بیگم عدل و انصاف کے ترازو کا پلڑا اپنے حق میں ہلکا ہو جانے پر ناخوش بھی تھیں مگر کہتیں بھی کیا۔ البتہ اتوار کا دن بُقدم چچا کا نجی ہوتا جس میں [illegible] وہ ہم سے بیت بازی یا پتنگ بازی فرماتے اور [illegible] دوشیزۂ سخن کے گیسوؤں کی مشاطگی کرتے جسے عرفِ عام میں غزل گوئی بھی کہتے ہیں۔

ممتاز بیگم اگرچہ بُقدم چچا کی چہیتی بیگم تھیں مگر ممتاز بیگم

بھی اس بات سے بخوبی واقف تھیں کہ جہاں پناہ کی پناہ گاہ میں پناہ گزینوں کی تعداد وافر ہے۔

سنیچر کا دن ممتاز بیگم کا تھا لہذا وہ شام ہی سے بن سنور کر بیٹھ گئیں۔ رات کے ساڑھے بارہ بجے تک بُندم چچا گھر نہیں آئے تو ممتاز بیگم بھی سمجھ گئیں کہ آج جہاں پناہ دشتِ غزالاں میں شکار کرنے جا پہنچے ہیں۔ دل ہی دل میں کافی پیچ و تاب کھاتی رہیں اور بُندم چچا کو کوستی رہیں "وہ بھی کمبخت کہتے ہیں میں تیرے لئے تاج محل بنوا دوں گا۔ آنے تو دو آج میرے تاج محل نہ بنوائے تو میں ہی اُن کا مقبرہ بنوا دیتی ہوں" دو بجے تک ہار کر دل مسوس وہ بھی کمرے کا دروازہ چٹخنی لگائے بغیر بند کر کے مسہری پر سو گئیں۔

رات کے ڈھائی بجے بُندم چچا گھر لوٹے تو ڈرے ڈرے تھے۔ جوتے انہوں نے ہاتھ میں لئے اور صحن کی دیوار چڑھ کر دالان میں کود گئے۔ آہستہ سے ممتاز بیگم کے کمرے کا دروازہ کھولا۔ ممتاز بیگم نے بھی دروازے سے پہلو بہ قریب یعنی پیتل کی تھال لگا رکھی تھی۔ پیتل کی تھالی گرتے ہی ٹھن۔ ٹھن... ن کے شور سے ہڑبڑا کر ایک طرف کودے تو ان کا پاؤں سگِ لیلیٰ کی دُم پر پڑ گیا۔ لیلیٰ نے بھی آؤ دیکھا نہ تاؤ چیں پیں کرتے ہوئے اپنے دانت م چچا کی پنڈلی میں پیوست کر دئے۔

بندم چچا درد کی شدت سے چیخ اُٹھے۔

"ہائے رے کتیا کی بچی نے کاٹ کھایا۔"

شور شرابے سے ممتاز بیگم کے علاوہ تینوں بڑی بیگم بھی جاگ اٹھی تھیں ممتاز بیگم نے لائٹ آن کر کے فوراً دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

"اتنی رات گئے کہاں ابھی کہوں جو وہ کھانے گئے تھے۔" ممتاز بیگم نے آہستہ مگر غصے سے کہا۔

"چپ ناہنجار۔ ہائے میری پنڈلی سے تو خون بہہ رہا ہے کہاں چھپ گئیں پلنگ کے نیچے سور کی بچی۔ میں ابھی تجھے ٹھیک کرتا ہوں" بُندم چچا پھر چیخے۔

"آہستہ بولو باہر دروازہ سے کان لگائے سوتنیں سن رہی ہیں" ممتاز بیگم پھر پھسپھسائیں۔ "ٹھہرو میں دوا لگاتی ہوں یہ" کہتے ہوئے ممتاز بیگم نے طاق سے ایک ڈبے میں سے کچھ نکال کر بُندم چچا کی پنڈلی پر رگڑ دیا۔

"ہائے مر گیا" چلاتے ہوئے بُندم چچا نے اُچھل کر پنڈلی کی طرف دیکھا۔

"ہائے۔ ہائے مار ڈالا۔ ارے اس بدبخت نے تو مرچ بھر دیں"

دروازے کے باہر تینوں بیگموں نے پہلے تو حیرت و استعجاب سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر مسکرائیں اور دفعتہ کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

غزل

ڈاکٹر ایس۔ پی شرما تفتہ
(کوروکشیتر)

تمام عمر تو یکساں یہ من نہیں رہتا
ہمیشہ ایک سا اِس کا چلن نہیں رہتا

وہ دل کہیں بھی اسیرِ محن نہیں رہتا
کہ جس کو خطرۂ دار و رسن نہیں رہتا

بشر کو چاہئے کچھ تو زباں کا پاس کرے
زباں نہیں تو وقارِ سخن نہیں رہتا

تم اپنے کپڑے اُترنے کی بات کرتے ہو
یہاں تو لاش کے اوپر کفن نہیں رہتا

غروب ہوتا ہوا دیکھئے کبھی سورج
شباب ڈھلنے پہ وہ بانکپن نہیں رہتا

وجود زن ہی سے قائم ہے آدمی کا وجود
بجز رتی[1] تو مدن[2] بھی مدن نہیں رہتا

کچھ ایسے بھی ہیں جہاں میں رہا پسند انساں
وطن بھی جن کی نظر میں وطن نہیں رہتا

جنابِ رازؔ کے حلقے میں جو بھی آتا ہے
فنِ سخن میں وہ ناکام فن نہیں رہتا

مقام ایسے بھی آتے ہیں عشق میں تفتہؔ
وجودِ روح تو رہتا ہے تن نہیں رہتا

[1] رتی۔ کام دیو کی بیوی۔ [2] مدن = کام د

عقل و حکمت

ڈاکٹر اودے سرن ارمان

ایک بہت ہی بوڑھا شیر جو چلنے پھرنے سے بھی معذور تھا
کچھار میں پڑا پڑا موت کی گھڑیاں گن رہا تھا۔ زندگی بہت
ہی عزیز شے ہے کوئی بھی اس کو آسانی سے کھونا نہیں چاہتا۔
یکایک شیر نے سوچا بوڑھا شیر اور بھوکا مرے عجیب بات ہے
بڑھاپے میں جب طاقت جسمانی ساتھ چھوڑ دیتی تو عقل و حکمت
ساتھ دیتے ہیں۔ یہ دنیا عقل و حکمت ہی سے جیتی جاتی ہے میں
بھی عقل سے کام کیوں نہ لوں۔ وہ جگت لگانے لگا۔ ہونٹوں پر زبان
پھیری بھوک ستے؟ ہرنوں کے تازہ خون کی للک اس کو جیسے تیسے کچھار
سے باہر کھینچ لائی۔ باہر آکر وہ ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ بغیر ہاتھ
پیر ہلائے روزی روٹی نصیب نہیں ہوتی ہے لیکن ہاتھ پیر ہلانے
میں عقل و دانش بھی تو شریک کار ہوتی ہے طاقت ہی تو ہر جگہ کام
نہیں آتی۔ ناامیدی کی اُفق پر امید کی ایک کرن پھوٹی۔ اس نے
کچھار کے آس پاس ہی چوہے کا ایک بل کھوجا اس نے جوانی میں
دیکھا تھا کہ بہت سے چوہے منڈوے کی بالیں کترتے کھاتے رہتے
تھے اور وہ ان کو ناچیز شے سمجھ کر کبھی دھیان نہیں دیتا تھا شیر
نے منڈوے کی بال کتر کر چوہے کی بل پر رکھ دی۔ بالی کی خوشبو
سونگھ کر ایک چوہیا باہر نکل آئی مستعدی سے کھڑے شیر نے
فوراً جھپٹ کر اس کو پنجوں میں دبوچ لیا۔ بیچاری نے مدد کے لئے
چوہے کو بلایا چوہا اس کی پکار سن کر فوراً باہر آیا تو بل سے
کچھ ہی دور ایک شیر کو آرام سے لیٹا ہوا پایا اور اس کے پنجے میں
گرفتار چوہیا کو دیکھا وہ بری طرح چیخ رہی تھی اور اس کی ننھی
ننھی موتی کے دانوں کی طرح آنکھیں جھکی ہی تھیں۔ جیسے مرغو
کی طرح پونچھ لٹکائے ہی تھی۔ یہ دیکھتے ہی چوہے کے ہوش اڑ گئے
اس نے دھیرے سے کہا دادا ٹھیک کہتے تھے بڑوں کا سر دوش
ہمیشہ چھوٹوں کو نقصان پہنچاتا ہے۔ اس نے دانتوں کو کٹکٹایا
اور پیچھے سمٹ کر بیٹھ گیا۔ اس کے علاوہ وہ کر بھی کیا سکتا تھا
اس کے دانت کمزور کسان کے کھیت کو کتر سکتے تھے مگر شیر کے پنجوں
کو نہیں۔ وہ مجبوری میں آنسو بہانے لگا۔ مگر پھر بھی اس نے ہمت
نہیں ہاری اور سوچ لیا کہ جب اس کی گھروالی اس کے سامنے
مر رہی ہے تو اس کا زندہ رہ کر بھی کیا ہوگا اس کو کون سا آدمی کی
طرح جہیز کا لالچ ہے جو خوش خوش اپنی بیوی کو مرجانے دے۔
اس نے مضبوطی سے کہا۔

اے بوڑھے شیر تم جنگل کے راجہ ہو اور راجہ کے فرائض
سے واقف ہو۔ جانوروں میں سب سے زیادہ طاقتور ہو سبھی تمہارا
لوہا مانتے ہیں پھر تم کمزور چوہیا کو اپنے فولادی پنجوں میں دبائے
کیوں پڑے ہوئے ہو؟ اگر تم نے اس کی کسی بے ادبی پر ناخوش
ہو کر اس کو مار بھی ڈالا تو تمہاری بہادری کو چار چاند نہیں لگیں گے۔
اور اگر کھا لیا تو تمہارا [illegible] سا پیٹ بھرے گا نہیں الٹے قتل
کرنے کا پاپ اور چڑھے گا کیونکہ یہ حاملہ ہے اور آٹھ دس بچوں سے
کم کبھی نہیں دیتی ہے۔ یہ سن کر شیر غرایا جیسے اس کو حیرت ہوئی
ہو اس نے کہا۔

"اگر تم اپنی عزیز بیوی کی جان بچانا ہی چاہتے ہو تو میرا ایک
کام کرو۔ پاس آکر سنو میری آواز بھاری ہے دور دور تک جاتی ہے
کوئی جانور سنے گا تو میری کالی چال فیل ہو جائے گی" یہ سن کر
چوہا بجائے آگے سرکنے کے سکڑ کر اور پیچھے ہٹ گیا شیر حقیقت
کو بھانپ گیا۔ اور پیار سے بولا "تم ڈرو مت میں تم کو ستاؤں گا
نہیں بلکہ تم سے دوستی کروں گا۔ تمہاری دوستی میرے بڑے
کام آئے گی۔ میں راجہ ہوں راجہ کبھی غریبوں کو ختم نہیں کرتا ہے
بلکہ ان کو بنائے رکھتا ہے۔ کیونکہ حکومت انہیں کے سہارے چلتی
ہے۔ اب چوہیا کا چیخنا بند ہو گیا تھا شاید شیر کا پنجہ کچھ ڈھیلا
ہو گیا تھا اور اسی لئے وہ چوہے کی طرف پرسکون انداز میں ٹکر ٹکر
دیکھ رہی تھی وہ مجھ جیسا چھوٹا جیو آپ کے کیا کام آ سکتا ہے

چوہے نے متعجب ہو کر کہا۔
"چھوٹے لوگ بڑے لوگوں کے بہت کام آتے ہیں یہ تو بڑے لوگوں کی قابلیت پر منحصر ہے کہ وہ اُن سے کیسے کام لیتے ہیں۔ چھوٹے بڑے کی بات چھوڑو ہر ایک کی اپنی جگہ ایک خاص اہمیت ہوتی ہے" یہ سن کر چوہے کے دل میں شیر کی طرف سے کچھ یقین جاگا۔ اور وہ کچھ آگے آ گیا اس نے دونوں ہاتھ منہ پر پھیر کر خالی منہ چلایا اگلے دونوں ہاتھ پچھلے دونوں گھٹنوں پر ٹیک لیے آنکھیں مٹکائیں مونچھیں پھڑپھڑائیں "تو کہو" وہ بولا۔

"تم کسی ایسے ہرن کے پاس جاؤ جو غیر شادی شدہ ہو شادی شدہ ہرن آسانی سے تمہارے کہنے میں نہیں آئے گا۔ کیونکہ اس کی بیوی اس کو اکیلا نہیں آنے دے گی اور تم سے سیکڑوں سوال پوچھے گی۔ عورتیں بڑی شکی اور تاڑو بھی ہوتی ہیں تم اس کے سوالوں میں الجھ کر کہیں نہ کہیں ضرور گڑبڑ کر دو گے اور بات بگڑ جائے گی"

"شادی شدہ کی پہچان کیسے ہو گی"

"جو چنچل ہے سمجھ لو غیر شادی شدہ ہے۔ تم اس سے کہنا ایک شیر ہارٹ فیل ہو کر میرے بل کے پاس گر گیا ہے میری بیوی دانا دنکا چگ رہی تھی وہ اس کے نیچے ایسی دبی کہ خود بھی نہ نکل سکی اور مجھ سے بھی نہ نکالی گئی میں اس کے پنجوں کو کتر کتر کر بھی ہلکا نہیں کر سکا۔ تم پل بھر کو وہاں تک چلے جاؤ اور اپنے سینگوں سے اس کا پنجا اٹھا دینا جس سے میری بیوی نکل آئے گی۔ میں زندگی بھر تمہارا احسان مانوں گا اور تم کو اپنے بل میں سے نکال کر منڈوا کھلاؤں گا۔ دھرم کما لو۔ تمہاری برادری نے سیتا [illegible] کے تمام کُل کو بدنام کر دیا ہے اگر تم نے میری بیوی کی جان بچا دی تو میں دنیا بھر میں تمہاری تعریف کروں گا اور سالوں سے ماتھے پر لگا آ رہا یہ کلنک کا داغ بھی چھوٹ جائے گا۔

ہرن کہنے میں آ جائے گا اور ساتھ ہو لے گا جیسے ہی وہ سر جھکا کر پنجے کو اٹھائے گا میں اس کی گردن دبوچ لوں گا اور تمہاری بیوی کو چھوڑ دوں گا"

"بغیر محنت کے پیٹ بھرنے کی ترکیب تو اچھی سوچی ہے مگر یہ ڈھنگ تم نے کچھ [illegible] ہے۔"

"آدمی سے۔ دیکھا نہیں؟ وہ جنگل میں آ کر بھینس بکری وغیرہ کسی پیڑ سے باندھ دیتا ہے اور بھوکے کھانے شیر آس پاس پھرتے ہیں اور وہ بھی آس پاس چھپا ہوا آدمی گولیاں چلا اس کو مار ڈالتا ہے شیر جیسے بہادر کو آدمی جیسا کمزور ناکارہ جیو مار ڈالتا ہے۔ یہ سب عقل و دانش ہی سے ہوتا ہے طاقت سے تھوڑے ہی ہو سکتا ہے"

"بات تو صحیح ہے مگر اس طرح کسی کو دھوکا دینا تو بری بات ہے۔ پاپ ہے"

"تم میرے پیٹ بھرنے کی ترکیب کو پاپ بتلاتے ہو اور آدمی کو دیکھو جو کھانے کو نہیں صرف تفریح کے لیے ہمارا خون بہاتا ہے"
یہ سن کر چوہا چپ ہو گیا اور چوہیا کو دیکھتا ہوا چلا گیا۔ اس نے بہت جلد ایک غیر شادی شدہ ہرن کو تلاش کر کے ادھر آنے کے لیے راضی کر لیا۔ چھوٹے لوگ بڑوں کو دھوکا نہیں دیتے ہیں صرف اسی بات پر اس نے چوہے کی باتوں پر غور نہیں کیا اور سوچے سمجھے عمل کرنا شروع کر دیا۔ شیر تو فلم ایکٹر کی طرح اوندھا بنا پڑا ہوا تھا ہی ہرن کے سر جھکاتے ہی اس کو دھر دبایا وہ بہتیرا چھٹپٹایا مگر شیر کے آہنی پنجوں سے چھٹکارا نہ پا سکا دونوں کی ملی بھگت کا اس کو اب اندازہ ہوا اور وہ مرتے مرتے بولا

"کمینے غدار۔ تیرے اسلاف مرقوں گنیش جی کی سواری رہے تو نے آج ان کا نام بھی بدنام کر دیا ممنوں کی اولاد ہوتے ہوئے بھی تجھ میں کوئی بھلائی نہیں آئی۔ زندہ شیر کو مردہ بتا کر مجھے اس کا شکار بنوا دیا اس کے کسی بھی پنجے میں چوہیا نہیں ہے اور اگر سچ ہے تو یہ اس کو بھی کھا گیا تجھے بھی کھا جائے گا۔ دنیا کے جانوروں کے اتہاس میں یہ پہلی مثال ہے کہ ایک جانور نے دوسرے جانور کو اس طرح دھوکے سے مروایا ہے۔ خونی کا ساتھی ہونا بڑا پاپ ہے"

دیکھتے دیکھتے ہرن کی آواز دھیمی پڑ گئی۔ چوہا دور بیٹھا بیٹھا اس کی باتوں پر غور و خوض کر رہا تھا اب اس کو یقین ہو گیا کہ شیر اس کی چوہیا کو منہ میں رکھ گیا۔ درندوں کا وشواس ہی کیا۔ بلی سانپ کتا اپنے بچوں تک کھا جاتے ہیں۔ اس نے من کی بھڑاس نکالتے ہوئے کہا۔

"جنگل کے راجا یہ تم نے کیا کیا۔ میری چوہیا ہی کھا گئے اس سے تمہارا پیٹ بھی نہیں بھرا ہو گا اور دوست کی بیوی کے ساتھ بھی گیا۔ شرناگت کو مار کھانے والا بہادر راجہ نہیں ہو سکتا باقی

بمبئی مرکنٹائل کوآپریٹیو بینک لمیٹڈ

رجسٹرڈ آفس ۷۸ محمد علی روڈ بمبئی ۴۰۰۰۰۳

دہلی آفس ۱۵۵۶ نیتاجی سبھاش مارگ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

فون نمبر:- ۲۶۸۲۶۶ – ۲۶۴۳۷۲

- ہمارے یہاں شرح سود تمام نیشنلائزڈ اور شیڈولڈ کمرشیل بینکوں کے مقابلہ ایک فیصد زیادہ ہے
- ہندوستان کا پہلا کوآپریٹیو بینک جس کو زرمبادلہ میں کاروبار کے لئے لائسنس جاری کیا گیا۔
- ہمارے بینک میں اوقاف کے جمع شدہ رقم کی آمدنی دفعہ ۱۳(۵)(الف) (۱۱۱) انکم ٹیکس ایکٹ ۱۹۶۱ء کے تحت انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہے۔

اس کے علاوہ

ہم آپ کے آرام و آسائش کی ضروریات مہیا کرنے کے لئے آسان قسطوں پر قرضہ فراہم کرتے ہیں۔ ایک فیصدی کا فرق بہت بڑا فرق ہے۔ یہ آپ کی رقم میں ہزاروں روپیہ کا اضافہ کرتا ہے آپ بھی اس کا فائدہ اٹھائیں۔

زین جی رنگون والا
مینجنگ ڈائرکٹر

حسینی۔ ایس ڈاکٹر
(چیرمین)

شمیم کاظم
(اسسٹنٹ جنرل منیجر شمالی ہند)

اندرا گاندھی کے ساتھ اس کے آخری لمحہ تک

مترجم عظیم فیروزآبادی

ذیل کا مضمون ترجمہ ہے میگوئل سیرالز کے اسپینی مضمون کا۔ موصوف ۱۹۵۴ میں ہندوستان میں اسپین کے سفیر تھے ان کی کئی کتابیں انگریزی میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔ یہ خاکہ اندرا جی کے مزاج، ان کی پسند ناپسند اور ان کی اس مخصوص انسانی صفت کی نمائندگی کرتا ہے جسے محبت اور خلوص سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

مجھے ہندوستان لوٹنے کا اتفاق ہوگا۔ یہ میں نے سوچا بھی نہ تھا۔ جب اچانک یہ موقع ہاتھ آگیا۔ اس میں میرے ارادے کو کوئی دخل نہ تھا آسمان پر بجلی کے کوندنے کی طرح مجھے خبر ملی اور میں نے دہلی جانے والا پہلا جہاز پکڑا۔ شہر ویران اور خاموش تھا۔ ہر وقت بھیڑ سے گھری رہنے والی گلیوں میں ایک بھی آدمی نظر نہیں آرہا تھا۔ صرف سپاہیوں سے بھری لاریاں دوڑ رہی تھیں اگر ہماری کار پر سفارتی پلیٹ نہ لگی ہوتی تو شاید ہمیں گزرنے بھی نہ دیا جاتا۔ ہوائی اڈے پر مجھے وہی پرانا برہمن سکریٹری ملا جو تیس سال پہلے میری ایک سفیر کی حیثیت سے پذیرائی کرتا تھا۔

ہماری کار نے امپیریل ہوٹل کی طرف رخ کیا جہاں میں پہلی بار مقیم ہوا تھا میں اپنی ان پرانی بھولی بسری یادوں کو تازہ کرنا چاہتا تھا جن کا گویا دوسرے جنم سے تعلق تھا۔ ہوٹل کا باغیچہ سکھ ٹیکسی ڈرائیوروں سے بھرا ہوا تھا جنہوں نے ان بپھرے ہوئے ہندوؤں کے ہجوم سے بچنے کے لئے وہاں پناہ لی تھی جو اپنے ہونے والے نقصان کا ان سے بدلہ لینا چاہتے تھے۔ میں نے کار کا دروازہ کھولا اور ہندوستانی گلاب اور چنبیلی کی راحت افزا خوشبو لینے کے لئے باہر سر نکالا۔ لیکن سردی کی شروعات کی وجہ سے اس کا پتہ نہ تھا۔

آخری بار اندرا کو میں نے ویانا میں دیکھا تھا۔ وزیر اعظم کرسکی نے اندرا کے اعزاز میں جو ڈنر دیا تھا۔ میں بھی اس میں مدعو تھا۔ ہمیشہ کی طرح وہ جاذب نظر تھی۔ خدا نے اسے ایسا حسن دیا تھا جو برسوں میں دیکھنے کو ملتا ہے اور میرے لئے تو وہ ملکہ شیبا کی حیثیت رکھتی تھی۔ ایک بار اس نے مجھ سے کہا تھا "لوگ عام طور پر مجھے 'اتھوپیائی' سمجھتے ہیں اور وہ بھی آج کی نہیں۔ پانچ ہزار سال پرانی۔"

اس نے ایک بار مجھے یہ بھی بتایا "روم میں ایک شخص نے میرا پیچھا کیا جو للچائی ہوئی نظروں سے دعوت شوق دے رہا تھا۔ میں نے پولیس والے سے اس کی شکایت کی تو وہ کیا کہہ رہا تھا؟ پولیس افسر نے مجھ سے پوچھا؟ "وہ کہہ رہا تھا، میں تمہیں چاہتا ہوں۔ ایک ایسی زبان میں جسے میں ہی سمجھ سکتی ہوں" اندرا نے جواب دیا "اور میں بھی تو تم سے محبت کرتا ہوں" پولیس والے کا جواب تھا۔

اپنے والد کے وفات کے بعد اندرا کے پاس قلیل سرمایہ تھا۔ نہرو خاندان نے آزادی کی جنگ میں اپنی ساری دولت گنوا دی تھی۔ اس کے والد کے کریا کرم کے موقع پر میں نے اس سے کہا کہ وہ مجھ سے رابطہ قائم رکھے اور آئندہ ملاقات کے خیال سے میں نے اس سے دریافت کیا کہ آئندہ آپ کا کب سفر کرنے کا ارادہ ہے۔ ایک بار جب ہم دونوں لندن میں تھے میں نے سفارت خانے سے اسے فون کیا۔ اس نے اپنے اور راجیو کے ساتھ کار میں آؤٹنگ کرنے کی مجھے دعوت دی۔ اسے ایک چھوٹا سا مکان مل گیا تھا۔ جسے وہ خریدنا چاہتی تھی یہ ایک خوشنما تنگ گلی میں تھا اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور ایک چھوٹے بچے کی طرح وہ کمرے دکھائے جنہیں وہ سجانا چاہتی تھی واپسی میں ہم دونوں پچھلی سیٹ پر تھے جب کہ راجیو اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے پاس بیٹھا تھا۔ اس نے منہ موڑ کر کہا "ممی تم پاگل تو نہیں ہو گئی ہو جس مکان کو تم خریدنا چاہتی ہو اسے خریدنے کے لئے تمہارے پاس روپیہ کہاں ہے"

"راجیو تم ٹھیک کہتے ہو" اس نے کہا "لیکن خواب دیکھنے میں کیا حرج ہے"

والد کی وفات کے بعد اندرا وزیر اطلاعات بن گئی اور اس

حیثیت سے اس نے یوگوسلاویہ کا دورہ کیا جہاں میں بھی سفیر ہو گیا تھا حالانکہ وہ سرکاری مہمان تھی لیکن علی الصبح میرے ساتھ بیلگریڈ کو دیکھنے کے لئے وقت نکال لیا۔ شہر کے مضافات میں جو جنگل تھے۔ دراصل وہ انہیں دیکھنا چاہتی تھی وہ وہاں ٹہلتی رہی اور زمین پر گری ہوئی پتیوں کو چنتی رہی۔ اس وقت میرا دھیان اس طرف گیا کہ اس طرح وہ شاید اپنے والد کی یاد سے دل بہلا رہی ہے۔

وزیر اعظم ہو جانے کے بعد بھی اس نے یوگوسلاویہ کا دورہ کیا۔ اس کی آمد سے باخبر ہوتے ہی میں کار کے ذریعہ پولا گیا جو براؤنی کے جزیرے کے اس پار واقع ہے۔ جہاں اسے ٹیٹو کے ساتھ قیام کرنا تھا۔ یہ ۱۹۶۸ء کا موسم بہار تھا اور ملک اس سیاسی بحران سے گزر رہا تھا جو ٹیٹو نے اپنے حامی روس نائب صدر سے نجات حاصل کرنے کے لئے پیدا کیا تھا۔ میرے پولا پہنچنے پر یوگوسلاویہ کے ہندوستانی سفیر بھی وہاں آ گئے ہم دونوں نئی دہلی ہی میں دوست بن گئے تھے۔ انھوں نے اندرا کے استقبال کی تقریب میں شامل ہونے کے لئے مجھے بھی دعوت دی۔ مجھے بیلگریڈ لوٹنا تھا لیکن ہوٹل کے اس کمرے میں جو میں نے شب باشی کے لئے لے رکھا تھا۔ میز ہی پر دوسرے دن سرکاری ڈنر میں شرکت کرنے کے لئے مجھے دعوت نامہ ملا۔

جزیرے کے دورے کے لئے ایک جنگی کشتی کا اہتمام کیا گیا تھا جس کی نگرانی مسلح گارڈ سے بھرا ہوا ایک ہیلی کاپٹر کر رہا تھا۔ ان میں ہندوستانی عملے کے علاوہ میں ہی ایک غیر ملکی سفیر تھا۔ اس کے بعد جہاز کی گودی میں افسر رابطہ نے مجھے مطلع کیا کہ اندرا مجھ سے ملنا چاہتی ہے وہ اس مہمان خانے میں مقیم تھی جو ٹیٹو نے شاہ ایران کے قیام کے لئے تعمیر کیا تھا یہ سمندر کے اوپر تعمیر کیا گیا تھا اور پانی کی لہروں پر پوشیدہ روشنی کی شعاعیں دل پذیر منظر پیدا کر رہی تھیں۔

دیر تک ہم چبوترے پر بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ یوگوسلاویہ سے فارغ ہو کر اندرا کو روس جانا تھا اور وہ اس سلسلے میں فکر مند تھی۔ خروشچیف کا تختہ الٹ دیا گیا تھا اور بریژنیف اور اس کے اردگرد کے لیڈروں کے مزاج سے وہ واقف نہیں تھی۔ اس نے مجھ سے مشورہ کیا۔ میں نے اسے خوفزدہ نہ ہونے کی صلاح دی کیونکہ روس بھی ہندوستان کے تعاون کا اس قدر طلب گار تھا جتنا خود ہندوستان چین اور پاکستان دونوں کے مشترکہ مسائل نے انھیں ایک دوسرے

سے قریب کر دیا تھا اس سلسلے میں میں نے اس سے ٹیٹو سے مشورہ کرنے کے لئے کہا کیونکہ اس وقت ٹیٹو سے زیادہ اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ روس کے ساتھ ہمارا کیا رویہ ہونا چاہیئے۔

اندرا نے اس طرح کا سوال کر کے مجھے پہلی بار متعجب نہیں کیا ایک بار اس کے والد کے مکان میں ہم دونوں نے ساتھ ساتھ وزیر اعظم نہرو سے پوچھا "آپ ایسا کیوں سوچتے ہیں کہ انگریز ہمیں پسند نہیں کرتے" اس نے بڑی گہری نظروں سے مجھے دیکھا اور مجھے یاد آیا کہ اس سے پیشتر بھی ہم نے ایک بار محبت آمیز باتیں کی تھیں۔ اس نے کہا۔ محبت نام ہے خود کو محبوب کی ہستی میں ضم کر دینے کا۔

نئی دہلی میں میں نے ساری رات پرانی باتیں یاد کرنے میں گزار دی۔ میں جب ہندوستان آیا تھا۔ ہم دونوں ہم عمر تھے۔ میں جوان تھا اور سیدھا سادا تھا۔ وہ وزیر اعظم کی اکلوتی بیٹی تھی اس تک رسائی کا میرے پاس کوئی ذریعہ نہ تھا۔ کلوڈی اداراؤ نے مجھ سے کہا "میں ہندوستان میں اپنے فن کا مظاہرہ کرنا چاہتا ہوں۔ ضابطہ کو بالائے طاق رکھ کر میں سیدھے اندرا کے پاس پہنچا کیونکہ مجھے علم تھا کہ وہ مغربی موسیقی کی دلدادہ ہے اس کے بعد اس نے ہمیشہ میری اعانت کی اور اپنے خاندان کے ایک فرد کی طرح میری پذیرائی کی۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے اپنی پہلی تقریر کے وقت وہ کس قدر خوفزدہ تھی۔ اس کے بعد میں نے اسے کانگریس پارٹی کا چارج سنبھالتے دیکھا۔ میں اس وقت کی اس کی توانائی اور حوصلہ مندی کا چشم دید گواہ ہوں۔ وہ بڑی نازک اندام تھی۔ ایک کمزور قسم کی عورت لیکن جب وزارت عظمیٰ کی باگ ڈور اس نے سنبھالی تو کسی قسم کی کمزوری ظاہر نہیں ہونے دی۔

وہ شاعری، موسیقی اور فطرت کی بھی دلدادہ تھی۔ ایک صوفی کی طرح اسے اپنے باطن سے واقف ہونے کی تمنا تھی اور ہندوستانی دانشور مردوں اور عورتوں کے ذریعہ جنہیں اس کا قرب حاصل تھا اس نے فلسفہ و حکمت اور خدا کی معرفت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ وہ سادھوؤں، جوگیوں اور راہبوں کے متعلق اکثر بات چیت کرتی تھی۔ میں نے اسے ہرمن ہیس کی کتاب "سفر مشرق" پڑھنے کو دی اور اس نے میری کتاب لیریکا کے انگریزی تراجم بھی پڑھے۔ ہم گویا ایک ہی خاندان کے فرد تھے اور راجیو، سنجے اور میرے بچے ہندوستان میں ساتھ ساتھ کھیلا کرتے تھے۔

آخر کار صبح کی روشنی ہوٹل کی کھڑکی سے اندر داخل ہوئی۔ ایک چھوٹی چمگادڑ رات بھر اڑتی رہی تھی۔ اب ایک گہری اداسی اور اس نے متجسس نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں ساری رات ماضی کی دنیا میں گھومتا رہا تھا اور اندرا بھی میرے تصور میں میرے ساتھ محوِ گفتگو رہی تھی۔ میں نے اس کی موجودگی کو اس طرح محسوس کیا جیسے اس کے آخری سفر سے پہلے اس سے ملاقات کے لئے ہندوستان میں میری واپسی اس کی ایما سے ہوئی ہو۔ جو کچھ پیش آنے والا تھا کاش اس کا علم مجھے اس سے پیشتر ہو گیا ہوتا تو میں صندل کی لکڑی کا وہ بیڑہ اپنے ساتھ لے آتا جو ہم دونوں کے آخری لنچ کے بعد نہرو نے مجھے دیا تھا جب بیلگریڈ میں اپنی نئی ذمہ داری سنبھالنے کے لئے میں نے ہندوستان کو الوداع کہا تو مجھے رخصت کرنے کے لئے اندرا اسٹیشن تک آئی تھی۔

اس احساس سے کہ نہرو کے گھر آنے کا میرا یہ آخری موقع ہے۔ مجھے ایک گونہ خوشی محسوس ہوا۔ گولیوں کی بوچھاڑ سے مجروح اندرا کا جسم پھولوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ درشن کے لئے لمبی قطاریں گزرتے ہوئے معززین کے صف میں میں بھی شامل ہو گیا۔ یہاں نیم وا آنکھوں سے تقریباً نہ دیکھتے ہوئے ملکہ شیبہ کی پرانی تصویر میری نظروں میں گھوم گئی۔ ہاتھ جوڑتے ہوئے میں نے نمستے کہا۔ جس کا مطلب ہوتا ہے۔ تم میں جو دیوتا ملتا ہے میں اسے سلام کرتا ہوں۔

ایمبیسی کار میں مجھے بھی تابوت کے ساتھ چلنے کی دعوت دی گئی لیکن گلیاں سپاہیوں اور سوگ منانے والوں سے اس قدر کھچا کھچ بھری ہوئی تھیں کہ ارتھی مشکل سے آگے بڑھ رہی تھی۔ میں جلوس سے باہر آ گیا اور اندرا کے گھر گیا۔ اس جگہ کو دیکھا جہاں اندرا کا جسم اس کے قاتلوں نے چھلنی کر دیا تھا۔ اس کے بعد میں اس جگہ پہنچا جہاں ہندو رواج کے مطابق اندرا کا کریا کرم ہونا تھا وزارت خارجہ میں تعینات میرے دوست نٹور سنگھ نے مجھے پہچان لیا اور مجھے ان غیر ملکی مہمانوں میں شامل کر دیا جو مجھ سے پہلے یہاں اکٹھے تھے ان میں جان کے گل برتھ بھی تھے جو نئی دہلی میں میرے ہم عصر رہے تھے ارتھی کوئی ساڑھے تین گھنٹے میں اپنی منزل پر پہنچی۔ میت کو چتا میں رکھا گیا اور پنڈتوں نے وید شلوک اور منتر پڑھنا شروع کیا۔ پھول ہٹا کر انہوں نے میت کے ارد گرد صندل کی لکڑی کے گٹھے چن دیئے۔ راجیو گاندھی سفید کھدر کے لباس میں گاندھی کی ٹوپی پہنے ہوئے تھے۔ انہوں نے میت کے بالوں کو درست کیا اور اس پر گھی تیل اور صندل کا پاؤڈر ملا۔ چتا کو سلگا کر میت کے چاروں طرف سات چکر لگائے اور اس آگ کو بھڑکایا جس میں اس کی ماں کا جسم بھسم ہونے والا تھا۔

چتا کی آگ کئی گھنٹے تک جلتی رہی اور جب سب اکابرین چلے گئے تو عام آدمی چتا کے قریب پہنچے۔ میں بھی چتا کے پاس گیا اور شمشان گھاٹ پر اس جگہ تعظیماً سر جھکایا۔ جہاں جسم جل کر خاک ہو گیا تھا اب آگ نے سب کچھ جلا کر ختم کر دیا تھا اس کا چہرہ، اس کے پیر اس کے نازک ہاتھ اور انگلیاں سب جل گئے تھے۔ اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ میں راجیو کے قریب کھڑا ہوں۔ راجیو نے اپنے لڑکے کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا اور وہ مشکل سے اپنے آنسو ضبط کر پا رہے تھے۔ میں نے اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیا مجھے تم میں تمہاری ماں تمہارے باپ اور تمہارے نانا کی روح محسوس ہوتی ہے۔ اس کی نظریں جیسے میرے جسم میں سرایت کر گئیں۔

دوسرے دن راشٹرپتی بھون میں صدر اور وزیر اعظم کی موجودگی میں اندرا کی تعزیتی تقریب منعقد ہوئی۔ اتفاق سے دوبارہ میں راجیو کے سامنے آ گیا میں اس جوان آدمی کی آنکھوں کو کبھی نہیں بھول سکتا۔

ان میں بڑی اداسی اور غم چھپا ہوا تھا جس کا اظہار خلوص اور تشکر کے الفاظ کرنے سے قاصر ہیں۔

اس صبح مجھے دلائی لامہ کو بھی دیکھنے کی سعادت حاصل ہوئی جسے میں نے تقریباً پچھلے بیس سال سے نہیں دیکھا تھا جبکہ چینیوں کے حملے کے وقت اسے اپنے وطن تبت سے فرار ہونا پڑا تھا اس نے مجھے ایک چھوٹا سا تبتی کتا دیا۔ یہ کتا کئی سال تک میرے ساتھ رہا۔

اس حادثے کے متعلق ہم میں باہمی گفتگو ہوئی اور ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ کلجگ ہے۔ آہنی تباہی کا زمانہ جس میں فساد پھیلتا ہے دھرم بھرشٹ ہو جاتا ہے۔

ان پتیوں کی طرح جو بیلگریڈ کے جنگلوں میں گری تھیں۔ اندرا کا جسم بھی زندگی کے پیڑ سے جدا ہو گیا تھا اور اس کا ذہن جسم کو پیشتر ہی دوسری دنیا میں منتقل ہو گیا تھا۔

بابِ تنقید

(ادارہ)

کلیاتِ سراج :

ضخامت ۴۳۲ صفحات حجم $\frac{۲۰ \times ۲۶}{۸}$ - کاغذ، کتابت اور چھپائی ترقی اُردو بورڈ کی روایات کے مطابق قیمت ۴۴ روپے - ناشر: ترقی اُردو بیورو - ویسٹ بلاک ۸ - آر - کے - پورم - نئی دہلی ۱۱۰۰۲۲ -

سید شاہ سراج الدین سراجؔ اورنگ آبادی کی کلیات کا شمار قدیم شاعری کے شاہ پاروں میں ہوتا ہے - جسے پروفیسر عبد القادر سروری نے نواب سالار جنگ بہادر کی سرپرستی میں قائم ہوئی مجلسِ اشاعت دکنی مخطوطات کے اشاعتی پروگرام کے تحت بڑی محنت اور جانفشانی سے مرتب کیا اور ۱۹۴۰ء میں شائع کیا تھا - چونکہ اب یہ کلیات نایاب ہے اس لیے ترقی اردو بیورو نے کتابت کی چند غلطیوں کی تصحیح کے بعد اس کا عکسی ایڈیشن شائع کیا ہے جس میں خطوط اور فارسی کلام کو حذف کر دیا گیا ہے -

جناب عبد القادر سروری نے سراج کی حیات تصنیفات اور شاعری کے عنوان سے جو مقدمہ لکھا ہے وہ ۱۴۰ صفحات پر محیط ہے جس کے مطالعہ کے بعد یہ کہے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ کتابوں کے دیباچے اور مقدمہ لکھنے والے حضرات اگر اس مقدمہ کو پڑھ لیں تو انھیں دیباچہ اور مقدمہ لکھنے کی صحیح سمتوں کا پتہ چل سکے گا -

سراجؔ اورنگ آبادی کے کلام کے بارے میں صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ دکنی اُردو شاعری کا اس سے بہتر نمونہ نہیں مل سکتا - شاہ سراج اورنگ آبادی کی تحریر کا عکس اور گنبد شاہ سراج اورنگ آبادی کی تصاویر بھی شامل کتاب ہیں کلیاتِ سراج، دفتر شانِ ہند نئی دہلی ۲ سے بھی مل سکتی ہے

موجِ کوثر :-

جناب کوثر ساگری مدھیہ پردیش کے مشہور استاد شاعر جناب سلام ساگری کے شاگرد رشید ہیں اور مدھیہ پردیش کے گنتی کے اچھے شعراء میں ان کا شمار ہے - اُردو اکیڈیمی مدھیہ پردیش کی مالی معاونت سے ان کا مجموعہ کلام موجِ کوثر شائع ہوا ہے - جس کی ترتیب و تدوین مسٹر صہبائی اور ساغر الغازی ساگری نے فرمائی ہے -

کوثر ساگری کا کلام جس قدر اچھا اور قابل تعریف ہے مجموعہ اتنا ہی ناقص شائع ہوا ہے مگر جس طرح ایک خوبصورت اور نیک عورت کو خوبصورت نظر آنے کے لئے پشواز کی ضرورت نہیں ہے اسی طرح کوثر ساگری کے کلام کو اس بدصورت مجموعہ میں پڑھتے ہوئے بھی داد دیئے بغیر نہیں رہا جا سکتا - ۱۱۲ صفحات کے اس مجموعہ کی قیمت پندرہ روپیہ ہے جو یقیناً زیادہ ہے - مگر اچھے اشعار کا لطف لینے والوں کے لئے "موجِ کوثر" واقعی ایک بہترین مجموعہ ہے - دفتر ایم - پی - اُردو رائٹرس سنگم - برکھیڑی بھوپال سے یا دفتر شانِ ہند نئی دہلی ۲ سے اسے حاصل کیا جا سکتا ہے -

گلِ صحرا :-

حضرت اعجاز وارثی اتر پردیش میں نہیں بلکہ ملک کے ان اچھے شعراء میں شمار ہوتے ہیں جن کا کلام ہر لحاظ سے قابل تعریف اور قابل مطالعہ ہوتا ہے اور جن کی شاعری میں روایتِ غزل کے بنیادی عناصر اور اہم ترین اجزا کا احترام پورے طور پر ملحوظ رکھا جاتا ہے اور نہ ہی صنف غزل کے مسلمہ خصائص سے کہیں کوئی انحراف ملتا ہے -

غزلیات - رباعیات قطعات، تاریخی قطعات اور مختلف چوبیس نظموں پر مشتمل گلِ صحرا $\frac{۱۸ \times ۲۲}{۸}$ سائز کے ۲۴۰ صفحات پر پھیلا ہوا ہے - غزل کے کچھ مختلف اشعار سنئے ؂

شامِ وعدہ اس طرح آوازِ پا آتی رہی
جانبِ در بار بار اپنی نظر جاتی رہی
دل کے ویرانے میں آہٹ ہے کوئی اب نہ صدا
یاد بھی اُن کی دبے پاؤں گزر جاتی ہے

توبہ اور ہے بے! ذرا ہم بھی تو چل کر دیکھیں
پڑ گئے عقل پہ جس شخص کی پتھر دیکھیں

میکدوں کی بزمِ یار میں ہم پر کمی نہ تھی
بیٹھے تھے گرچہ چار طرف دیکھ بھال کے

جو تری زلف کے سائے میں گزری اس کے بعد
خدا گواہ کہ پھر کوئی رات، رات نہ تھی

واعظ! خیال توبہ بجا ہے مگر ابھی
میں تو بقدرِ ظرف گنہگار بھی نہیں

کتنی نازاں ہے گلستاں میں نسیم سحری
اور اگر ایسے میں وہ مست خرام آجائے

ایسے سیکڑوں اشعار اس مجموعہ میں موجود ہیں۔ یہ نہ …جھئے کہ غزلیہ اشعار ہی اس مجموعہ کی جان ہیں۔ اگر آپ …سنبھال کی صبح اور ایک نرس پڑھیں گے تو یہ فیصلہ کرنا آپ کے لیے مشکل ہو جائے گا کہ اعجاز وارثی غزل بہتر کہتے ہیں یا اچھے …ظم گو ہیں۔

اعجاز وارثی صاحب کا پہلا مجموعہ کلام طنز و مزاح کا تھا۔ …س کا نام پلیش دستی تھا۔ "پلیش دستی" اپنی طرز کا ایک بہترین …طنزیہ و مزاحیہ مجموعہ تھا اور زیر نظر مجموعہ پڑھنے کے بعد یہ کہنے …میں کوئی خدشہ نہیں کہ اعجاز وارثی صاحب کو طنز و مزاح اور …سنجیدہ شاعری پر یکساں قدرت حاصل ہے۔

"رنگِ صحرا" بلا شک و شبہ ایسا شعری مجموعہ ہے جو کسی بھی قدر…دانِ شاعری کی ذاتی لائبریری میں ایک خوشگوار اضافے کا موجب …بن سکتا ہے۔ یہ مجموعہ پچیس روپیہ میں مجلد مصنف کے پتہ …محلہ کوٹ غربی۔ سنبھل۔ ضلع مراد آباد۔ یوپی سے یا دفتر شانِ ہند …سے منگایا جا سکتا ہے۔

ر ادارہ

پنجرے کے پنچھی :- مصنف: مانک ٹالا۔

…سرورق نگار: رام لعل نابھوی۔ قیمت:- ۳۵ روپے۔ ۱۴۶ …صفحات۔ کتابی سائز۔ ناشر: ماڈرن پبلشنگ ہاؤس۔ گولا …مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی۔ ملنے کا پتہ۔ دفتر ماہنامہ شانِ ہند نئی دہلی ۲
…آٹھ کہانیاں، آٹھ مزاحیہ مضامین۔ ایک خاکہ اور ایک …آپ بیتی سے مزین اس مجموعہ کے مصنف افسانہ نگار بھی ہیں اور ناول …

مصنف کا کہنا ہے کہ افسانوں اور مزاحیہ مضامین کی ترتیب الگ الگ نہیں رکھی۔ کچھ کہانیاں مزاحیہ ہیں اور کچھ کہانیاں پوری کی پوری طنز و مزاح سے بھرپور ہیں۔ البتہ دو خاکے آخر میں دے دیئے ہیں۔

افسانہ لکھنے کے لئے عمیق مطالعہ۔ گہرا مشاہدہ۔ عقابی نظر درکار ہے۔ افسانہ میں واقعات کی نوعیت محدود ہو لیکن اس محدود نوعیت کو محسوس کیا جا سکے۔ افسانہ زندگی کے مخفی گوشوں میں پھیلتا چلا جائے۔ جزئیات نگاری۔ تسلسل، جامعیت فنی چابکدستی، جمالیاتی لطافت اور ارتفعیت ہو۔ افسانہ شروع ہوتے ہی قاری کو گرفت میں لے اور یہ سب تبھی ممکن ہے جب زبان افسانوی ہو۔ تحریر میں ندرت ہو۔ بات کہنے کا سلیقہ ہو۔ زیر و بم کی کیفیت ہو۔ افسانہ حقیقت نظر آئے۔ مصنف کا مشاہدہ وسیع ہے۔ مصنف نے غیر ملکوں کی سیاحت کی ہے۔ زندگی سے نبرد آزما رہے ہیں۔ زبان بڑی خوبصورت استعمال کرتے ہیں۔ طنز کا نشتر اور مزاح کی زیریں لہریں قاری کو لطف اندوز کرتی ہیں۔ علاقے کی لسانی چھاپ تو ہونی ہی تھی۔ اردو زبان نے وقت کے دھارے کے ساتھ ساتھ بے شمار الفاظ اپنے اندر جذب کر لئے ہیں۔

مکالموں میں موزونیت اور نفاست ہے۔

افسانے سبھی عمدہ ہیں۔ بہتر ہوتا اگر انگلستان کی میکسی دنیا کی بات کرتے ہوئے وہ وہاں کی ادبی دنیا کی کہانی بھی سناتے۔ "پانی پت کی لڑائیاں" ڈرامائی انداز میں پیش کیا جا سکتا ہے طنزیہ۔ مزاحیہ مضامین خاکہ اور آپ بیتی۔ الگ الگ چھپنے چاہیئے تھے۔

مصنف لفظ "بنیا" کا استعمال کرتے ہیں۔ لیکن "بنیا" کوئی لفظ نہیں۔ محض غلط العوام ہے۔

کتابت۔ طباعت ٹھیک ہے۔ سرورق خوبصورت اور قیمت مناسب ہے۔

Dr. Zakir Husain … Jamia Nagar … New Delhi

Phone: 275602 Regd·No D- (DN) 353
THE SHAN-E-HIND MONTHLY NEW DELHI-110002 NOVEMBER 1985
Regd. with the Registrar of Newspaper at R. No. 644/57

خرید کر پڑھئے :
مانگ کر پڑھئے :
یا پھر
چوری کر کے پڑھئے

یہ ہے ہی اتنا خوب صورت،
اتنا دل کش،
اتنا مکمّل کہ اسے کسی طرح بھی
حاصل کریں کیوں کہ
یہ فیض کی شخصیت اور فن پر ایک
شاندار ادبی دستاویز ہے۔ اِس میں شامل ہیں :

قیمت : پندرہ روپے

- ★ خلوت اور جلوت کے بھید کھولنے والے ذاتی نقوش۔
- ★ نادر و نایاب تصویریں۔
- ★ سدا بہار، ہزار رنگ و منتخب کلام۔
- ★ فیض کی شخصیت کے وہ ڈھکے چھپے گوشے جن پر سے پہلی بار پردہ اُٹھایا گیا ہے۔
- ★ ہندوستان، پاکستان، رُوس اور انگلستان کے دانش وروں کی مشترکہ کاوشوں کا گلدستہ۔

ساری اُردو دنیا میں شبستان کے "فیض نمبر" کا چرچا ہے

اس سے پہلے کہ اسٹاک ختم ہو جائے آج ہی اپنے قریبی نیوز ایجنٹ سے طلب کیجئے یا براہِ راست ہم سے منگوائیے۔

شبستان اُردو ڈائجسٹ، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

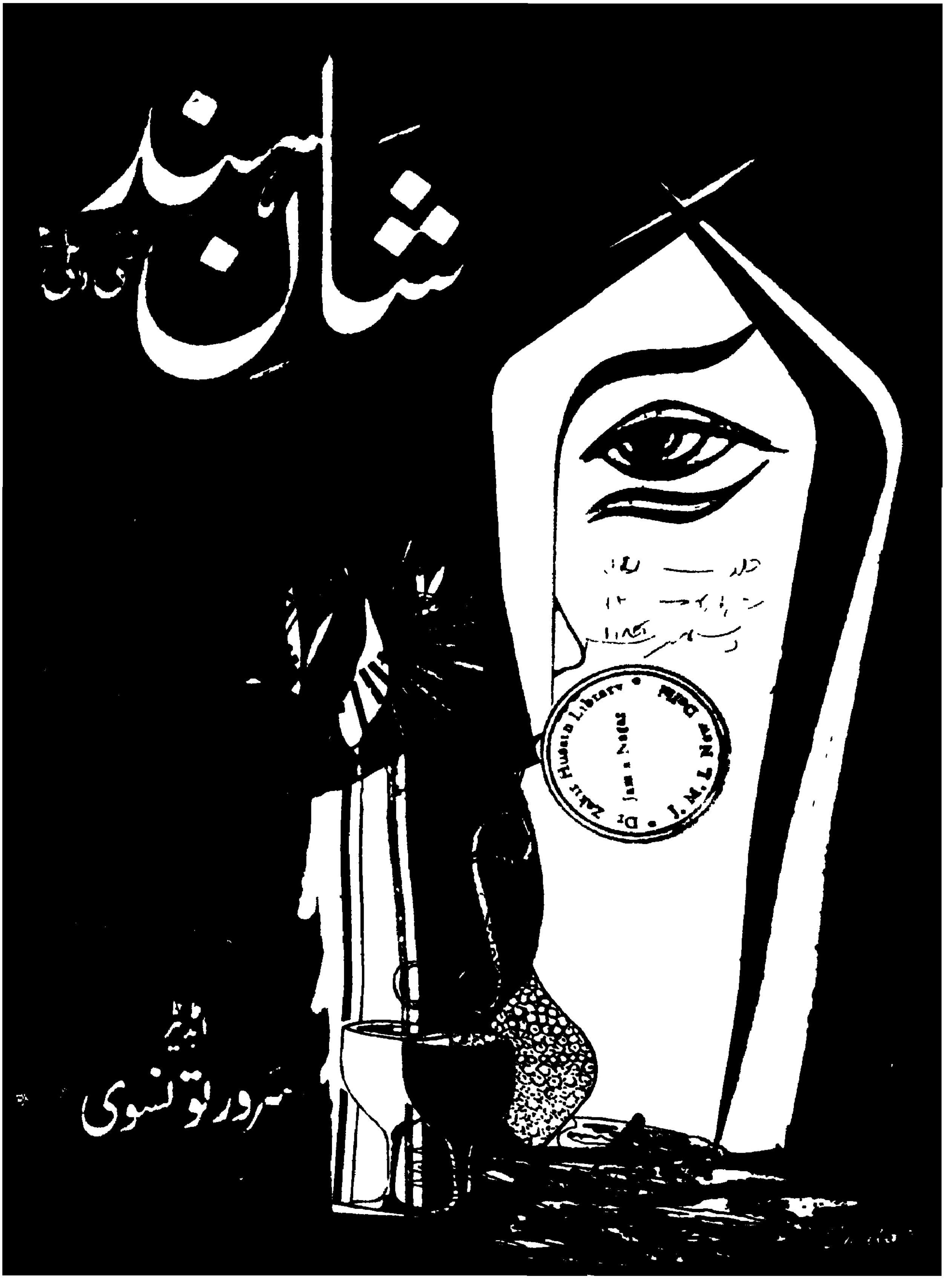
شانِ ہند
ایڈیٹر
سرور تونسوی
Dr Zakir Husain Library
J.M.I. New Delhi

अफ़ग़ानिस्तान की स्वाधीनता अमर रहे

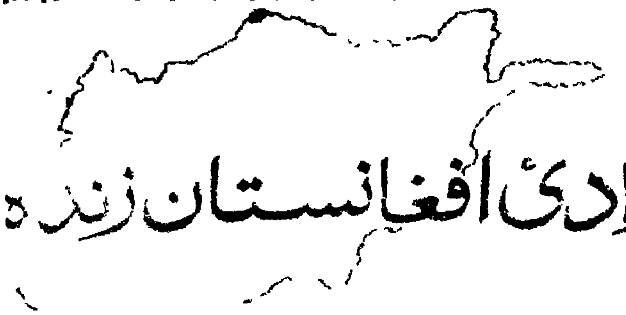

آزادیٔ افغانستان زندہ باد

LONG LIVE FREEDOM OF AFGHANISTAN

[illegible] GHANISTAN ASSOCIATION [illegible]

ہم وطن دوستو :-

افغانستان میں غیر ملکی فوجوں [illegible] سال [illegible] ۔

[illegible]

یہ حقیقت [illegible] ہیں ۔

[illegible] اپنے ملک کی آزادی کو [illegible] لئے [illegible] ۔

افغانستان [illegible] ۔

۲۰ دسمبر ۱۹۸۵ء

کو صبح [illegible] افغانستان کی [illegible] کا [illegible] احاطہ [illegible] کی جانب [illegible] ۔

آچاریہ [illegible] عارف بیگ } جنرل سکریٹری

انجمن افغان دوستان (ہند)

(۱۵ - C - ایم - ایل - اے - کوارٹرز - جے پور - (راجستھان)

لائسنس نمبر ۲۷۵۰۲ رجسٹرار آف نیوز پیپرز فار انڈیا کا رجسٹریشن نمبر ۵۷/۲/۶۲ رجسٹرڈ نمبر ڈی (ڈی این) ۲۵۴

ہندو پرست ہوں نہ مسلماں پرست ہوں
دامن پرست ہوں نہ گریباں پرست ہوں
ہر ذرۂ وطن سے ہے فیاضؔ مجھ کو پیار
یعنی وطن پرست ہوں انساں پرست ہوں
فیاض گوالیاری

ماہنامہ

شان ہند نئی دہلی

ایڈیٹر سرور تونسوی

فی پرچہ ۲/۵۰ روپے
زرسالانہ ۲۴/- روپے

جلد ۴۶ — دسمبر ۱۹۸۵ء — شمارہ ۱۲

ماہنامہ شانِ ہند کی تازہ ترین پیشکش

ہر بار کہا دل نے

جو ملک کے مشہور افسانہ نگار ڈاکٹر اودے سرن ارمان کے افسانوں کا ایسا مجموعہ ہے جسے سال سن ۱۹۸۵ء کا سب سے بہترین افسانوی مجموعہ کہا جا سکتا ہے۔
لکھائی، چھپائی اور کاغذ نیز گٹ اپ کے لحاظ سے شاید ہی اس سال میں شائع شدہ کوئی کتاب اس کا مقابلہ کر سکے۔
۲۲۴ صفحات — قیمت ۳۵ روپے
تاجرانِ کتب کو کم از کم پانچ جلدیں خریدنے پر ۳۳ فیصد رعایت لائبریریوں کو ۱۵ فیصدی رعایت۔ محصول ڈاک ہر حالت میں خریداروں کے ذمہ۔

دفتر شانِ ہند۔ فلیٹ نمبر ۸ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی نمبر ۱۱۰۰۰۲

ودیا پرکاش سرور تونسوی ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے خواجہ پریس چھتہ شیخ منگلو جامع مسجد دہلی سے چھپوا کر دفتر شانِ ہند فلیٹ نمبر ۸ انصاری مارکیٹ دریا گنج دہلی نمبر ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا۔ سرورق رین بو پرنٹرز بلیماران دہلی میں چھپا۔

عورتوں کی نس بندی

نئے طریقے (آلہ دوربین) کے ذریعے

- آسان، محفوظ نیز قابل اعتماد طریقے سے۔
- آپریشن ماہر اور جراحی میں قابل ترین ڈاکٹروں کے ذریعہ
- ہسپتال میں داخل ہونے کی ضرورت نہیں
دلی کے تمام بڑے ہسپتالوں میں یہ آسانیاں حاصل ہیں۔

یاد رکھئے

دو بچوں کا سندر سپنا
سورگ بنالو یہ گھر اپنا

مزید معلومات کے لئے اپنے نزدیکی فیملی ویلفیر سنٹر / ہسپتال سے رجوع کریں

ڈائریکٹوریٹ آف فیملی ویلفیر دہلی انتظامیہ دہلی

بُلبُل چہ گُفت ؟ گُل چہ شُنید ؟ صبا چہ کرد ؟

ارجن سنگھ

ع زباں پہ بارِ خُدایا یہ کس کا نام آیا

کچھ ایسی ہستیاں ہوتی ہیں جنھیں قُدرت کچھ ایسی صلاحیتیں ودیعت کر دیتی ہے جن سے وہ اپنی ایک الگ ہی پہچان رکھتے ہیں اور قدرت اُن سے ایسے کام سرانجام دلاتی ہے کہ جن کی اہمیت اور افادیت اس قدر اہم ہوتی ہے کہ دشمن کی زبان سے بھی بے ساختہ نکل جاتا ہے ۔ اللّٰھُمَّ زِدفزِد

جناب ارجن سنگھ ایسی ہی ایک ہستی ہیں جنھیں قدرت نے عقلِ سلیم سے اس قدر نوازا ہے کہ آج اُن کی ایک ایسی پہچان بن گئی ہے جو رہتی دُنیا تک قائم رہے گی اور اُن کی یہ پہچان ہے "مسئلہ پنجاب کو بخیر و خوبی حل کرانے میں ایک ایسا اہم رول" .. جسے ہندوستانی عوام ہمیشہ یاد رکھیں گے ۔

ہمارے محبوب وزیر اعظم جناب راجیو گاندھی نے جناب ارجن سنگھ کو مدھیہ پردیش کے وزیر اعلیٰ سے آنِ واحد میں پنجاب کا گورنر بنا کر چنڈی گڑھ بھجوایا ۔ کیونکہ وزیر اعظم کی دور رس نظروں نے بھانپ لیا تھا کہ پنجاب کے پیچیدہ مسئلہ کے باعزت حل کے لئے اگر کوئی اہم رول ادا کر سکتا ہے تو وہ ہیں ارجن سنگھ صاحب ۔ اور دُنیا نے دیکھ لیا کہ جناب ارجن سنگھ نے پنجاب کی گورنری ایک مثالی گورنری کی طرح کی ۔ اور وزیر اعظم کے صلاح مشورہ سے انھوں نے پنجاب میں ایسے حالات پیدا کیے کہ انتہائی ڈرامائی انداز میں پنجاب کا مسئلہ حل ہو گیا اور وہاں عام انتخابات جس اچھے انداز اور بہتر ماحول میں ہوئے وہ بھی ایک مثالی تھے ۔ اور جب پنجاب کی حکومت پنجابیوں کے نمائندوں کے حوالے ہو گئی تو وزیر اعظم نے اس قیمتی ہیرے ارجن سنگھ کو پھر دلی بُلا لیا اور ایک نہایت اہم وزارت کی ذمہ داری اُن کے سپرد فرمائی ۔ تاکہ ان کی صلاحیتوں سے ملک مستفید ہو سکے

اہلِ دلی کی خوش قسمتی ہے کہ کانگریس پارٹی ہائی کمان نے جنوبی دلی کے حلقہ انتخاب کے ضمنی انتخاب کے لئے کانگریس (آئی) کا لوک سبھا کے لئے اُمیدوار جناب ارجن سنگھ کو مقرر کیا ہے ۔ چنانچہ اس حلقہ کے ہر ووٹر کا یہ فرض ہی نہیں بلکہ ملک دوستی ہے کہ اپنی نمائندگی کا حق جناب ارجن سنگھ کو دے تاکہ یہ آزمودہ کار کانگریس (آئی) کا سپاہی اپنے حلقہ انتخاب کی زیادہ سے زیادہ خدمت کر سکے ۔

دراصل ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ جناب ارجن سنگھ بلا مقابلہ منتخب ہوتے اور ایسا ہونا اس امر کا اظہار ہوتا کہ اہلِ دلی ایک ایسے فرض سے عہدہ برآ ہو رہے ہیں جو ملک کے تئیں اُن کے ذمہ ہے ۔ مگر ہماری یہ بدقسمتی ہے کہ کانگریس (آئی) کی مخالف سیاسی پارٹیاں اس کی اہمیت نہ دینا سمجھتی ہیں کہ اگر کوئی فرد واحد ملک کے مفاد کے لئے مہرہ ہے تو اُسے بلا تخصیص سیاسی مخالفت بلا مقابلہ منتخب کیا جائے ۔ مگر ہمارا سیاسی شعور ابھی اس نہج پر نہیں پہنچا اور ہم سیاسی تعصب میں ملک کے مفاد کو بھول جاتے ہیں ۔

جنوبی دلی کے ہر ووٹر کا یہ فرض اولین ہے ۔

اپنے دل کو ٹٹولے اور ایمانداری کے ساتھ یہ فیصلہ کرے کہ اس کا ووٹ ملک کے مفاد میں جانا چاہئے یا محض ذات برادری یا ناکام سیاسی پارٹیوں کے کسی امیدوار کے لئے اسے یہ بھی نگاہ میں رکھنے کہ جناب ارجن سنگھ مدھیہ پردیش کے وزیر اعلیٰ پانچ سال تک رہے اور ان کی وزارت اعلیٰ نے مدھیہ پردیش کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا۔

چار بیت کا ناکام پروگرام

دلی اردو اکاڈمی نے پچھلے سال ٹونک راجستھان کی دو پارٹیوں کا مقابلہ چار بیت ایوان غالب میں کرایا تھا جو اس قدر کامیاب ہوا تھا کہ اہل دلی اس حربیہ فن موسیقی و شاعری سے اس قدر مسحور ہوئے کہ اب تک اسے یاد کیا جاتا ہے

اس مرتبہ دلی اردو اکاڈمی نے پھر اعلان فرمایا کہ ۱۴ دسمبر ۱۹۸۵ء کو ایوان غالب میں چار بیت کا پروگرام منعقد ہو رہا ہے۔ اور یہ خصوصی پروگرام ریاستی اردو اکاڈمیوں کی رابطہ کمیٹی کے تیسرے اجلاس میں مختلف اردو اکاڈمیوں کے معزز سکریٹری صاحبان کے استقبال کے طور پر کیا گیا تھا افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ رام پور کی دونوں چار بیت پارٹیوں منجو خاں اینڈ پارٹی اور محمد احمد خاں اینڈ پارٹی کا یہ پروگرام قطعاً ناکام تھا اور مقرر محترم شبیر علی خاں شکیب نے جس انداز میں نظامت کی وہ از خود اس پروگرام کو ناکام کرنے کی بہت حد تک ذمہ دار تھی۔ چار بیتوں میں جو کلام پیش کیا گیا تھا وہ نہ صرف کمزور ہی تھا بلکہ چار بیتوں کے لئے موزوں بھی نہ تھا

ٹونک راجستھان کی دونوں چار بیت پارٹیوں نے جس خوبی انداز میں پروگرام پیش کیا تھا اسے اہل دلی کبھی فراموش نہ کر سکیں گے۔ ٹونک کی دونوں پارٹیوں کے سربراہ حضرت صولت ٹونکی۔ حضرت بسمل سعیدی ٹونکی جیسے حضرات تھے۔ ٹونک کے شعرائے کرام کا بہترین منتخب کلام تھا۔ مگر ان پارٹیوں کے پاس بالکل معمولی کلام تھا عالیجناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر نے مختلف ریاستی اردو اکاڈمیوں کے سکریٹری صاحبان سے گذارش کی کہ چار بیت دن دن ختم ہوتا جا رہا ہے اور اب یہ محض ٹونک اور رام پور تک ہی محدود رہ گیا ہے۔ ضرورت ہے کہ موسیقی اور شاعری کی اس حربیہ صنعت کو نابود نہ ہونے دیا جائے اور اس کی زیادہ سے زیادہ سرپرستی کی جائے اور مختلف اردو اکاڈمیز اگر چار بیت پارٹیوں کے پروگرام اپنی اپنی ریاستوں میں منعقد کرائیں تو اس سے "چار بیت" کو زندگی ملے گی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کنور صاحب نے "چار بیت" کو زندہ رکھنے کے لئے بالکل مناسب اپیل فرمائی ہے۔

اور ہم چاہتے ہیں کہ دلی اردو اکاڈمی ایک بار پھر ٹونک کی چار بیت پارٹیوں کو دلی میں مدعو کرے تاکہ اہل دلی کو رام پور کی چار بیت پارٹیوں سے جو مایوسی ہوئی ہے اس کا ازالہ ہو سکے۔ اس کے ساتھ ہی ہم کنور مہندر سنگھ بیدی سحر صاحب سے یہ مودبانہ گزارش کریں گے کہ ۲۶ جنوری کے جشن جمہوریت میں مختلف ریاستوں کی پارٹیاں جو پروگرام پیش کرتی ہیں ان میں چار بیت کا پروگرام بھی رکھوایا جائے۔ تاکہ ملک بھر سے آئے ہوئے لاکھوں لوگ اس حربیہ فن موسیقی و شاعری کا مظاہرہ دیکھ سکیں

اردو کا بھانگڑہ "چار بیت"

نہ معلوم روزنامہ "قومی آواز" دن دن عقل سلیم کو کیوں تلانجلی دینے پر تلا ہوا ہے۔ پہلے تو اس نے رام لیلا ایسے مقدس تاریخی قومی پروگرام کو نوٹنکی کے ہم پلہ قرار دیا۔ اور اب "چار بیت" ایسے حربی اور قابل تعریف پروگرام کو اردو کا بھانگڑہ لکھ کر ایک طرف وہ نشانہ لگاتے ہوئے پنجاب کے ہر دل عزیز لوک گیت اور لوک ناچ نیز "چار بیت" ایسے حربی پروگرام کا بھونڈا مذاق اڑا رہے ہیں۔

قومی آواز کے مدیر محترم عام طور پر لکھنؤ رہتے ہیں اور دلی کے قومی آواز کی ادارت دیکھ ریکھ جناب لیلا دھر شرما

اپنے کچھ ایسے منظورِ نظر لوگوں کے ہاتھوں میں دے رکھی ہے جو کسی روزنامے کی ادارتی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ بلکہ روزنامے کی ادارتی فرائض کے انجام دینے کی الف۔ ب سے بھی واقف نہیں ہیں۔ یہ لوگ اپنی کامیابی کا اندازہ محض اُن مکتوبات میں اپنی کی گئی تعریف سے لگاتے ہیں۔ جو محض خوشامدی مکتوب نگار محض اپنا نام یا مکتوب قومی آواز میں شائع کرانے کے لئے جھوٹی تعریف کرتے ہیں۔

دلی قومی آواز کا ادارتی سٹاف (جناب عشرت علی صدیقی کے علاوہ) "جارحیت" کی حرفی "سلیقے سے قطعاً ناواقف ہے اور بھاگلپور کی اہمیت سے تو ان کے آباواجداد بھی واقف نہیں ہیں۔ کیا ستم ظریفی ہے کہ یش پال کپور صاحب خود پنجابی ہوتے ہوئے پنجاب کے قابلِ فخر لوک راج کا بھونڈا مذاق برداشت کرنے پر مجبور رہیں۔

کانگریس دعوے تو کرتی ہے قومی یکجہتی کا اور سیکولرازم کا کانگریس کے کچھ سرکردہ اصحاب کے زیرِ اثر شائع ہونے والا قومی آواز دن دن زیادہ سے زیادہ مشرف بہ اسلام ہوتا جا رہا ہے اور اب تو اس میں پاکستانی اخبارات کے صفحات جوں کے توں لگا دیے جاتے ہیں جن میں بعض اوقات پاکستانی فوجی حکومت کا مذاق اڑایا ہوتا ہے یا ہندوستان کے بارے میں خیر کے کلمات نہیں ہوتے۔ آج کل جب کہ دونوں ممالک کی حکومتیں صلح و آشتی کے لئے کوشاں ہیں۔ قومی آواز میں پاکستان کی موجودہ حکومت پر کئے گئے چھینٹوں والے مضامین کو بڑی شدومد سے شائع کیا جاتا ہے۔

کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ سیکولرازم کا دعوے دار اور قومی یکجہتی کا بزعم خود علم بردار قومی آواز ملک کے لاکھوں ہندوؤں کی مقدس روایت رام لیلا کو نوٹنکی کا ہم پلہ قرار دینے پر اب تک اظہارِ ندامت کے طور پر کچھ نہ لکھنے پر اپنی متعصبانہ روش پر قائم ہے۔ کاش کہ قومی آواز کے کارکن اپنی ذمہ داریوں کا احساس کریں۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور بلراج کومل کو ایوارڈ

ماہ دسمبر ۱۹۸۵ء اُردو کے ہندو دانشوروں کے لئے ایک مبارک مہینہ ثابت ہوا ہے۔ اس ماہ میں اعلان ہوا کہ ساہتیہ اکاڈمی نے ملک بھر کی اُنیس زبانوں میں سے اُردو کا ایوارڈ جناب بلراج کومل کو اُن کے شعری مجموعے "پرندوں بھرا آسمان" پر دیا ہے۔ جو دس ہزار روپیہ نقد اور توصیفی سند پر مشتمل ہوتا ہے۔

اور پھر ۲۰ دسمبر ۱۹۸۵ء کو بین الاقوامی غالب سیمینار کے افتتاح کے موقع پر غالب ایوارڈز کے سلسلے میں عزت مآب گیانی ذیل سنگھ صدرِ جمہوریہ نے پروفیسر گوپی چند نارنگ کو ان کی مجموعی ادبی خدمات کے سلسلے میں فخرالدین علی احمد غالب انعام عطا فرمایا جو دس ہزار روپیہ کا ہے۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ کا شمار اُردو کے صفِ اول کے معتبر ترین ادیبوں اور دانشوروں میں ہوتا ہے۔ تنقید، تحقیق اور لسانیات تینوں میں وہ پایۂ امتیاز رکھتے ہیں۔ آپ نے لسانیات کے فیضان سے اُردو تنقید کی نئی جہات کو روشن کیا ہے۔ ہندوستان سے باہر اُردو کو مقبول بنانے میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے جو جدوجہد کی ہے اس کی مثال نہیں مل سکتی۔

آپ یہ سُن کر حیران ہوں گے کہ جب سے ساہتیہ اکاڈمی نے ایوارڈ کا سلسلہ شروع کیا ہے بلراج کومل پہلے غیر مسلم عوامی شاعر ہیں جنہیں یہ ایوارڈ دیا گیا ہے اور اسی طرح غالب انعامات بھی جب سے شروع ہوئے ہیں یہ پہلا موقع ہے کہ کسی غیر مسلم کو اُسے مجموعی ادبی خدمات پر ایوارڈ دیا گیا ہے۔

ہمیں مسرت ہے کہ اب ساہتیہ اکاڈمی اور غالب انعامات کے ناخداؤں کو یہ احساس ہونے لگا ہے کہ اُردو محض مسلمانوں کی ہی زبان نہیں ہے بلکہ غیر مسلم بھی اسے زندہ رکھنے میں پیش پیش ہیں۔ غالب انعامات دینے والوں نے دس فیصد غیر مسلمانوں اور نوے فیصد انعامات مسلمانوں کو دیئے ہیں دو سالوں میں پندرہ میں سے تین غیر مسلم باقی بارہ پر

بہ کوئے یار بہ اندازِ محرمانہ گزر

سرور تونسوی

تقسیم ملک کے بعد خواتین میں شاعرہ بننے کا شوق اس شدت سے اُبھرا کہ ہند و پاک کے اُردو مشاعروں میں شاعرات کے نام اس کثرت سے سُننے میں آنے لگے کہ حیرت ہونے لگی جیسے ہیروشیما میں پہلا ایٹم بم گرائے جانے کے بعد وہاں کی فصل اپنے عام سائز سے بڑی پیدا ہونے لگی ٹھیک اسی طرح ہند و پاک کے بٹوارے میں ہونے والے قتل و خون کے بعد اُردو شاعرات کی تعداد میں دن دونا اضافہ ہونے لگا۔ یہاں تک کہ کوٹھوں پر گانے والیوں کی اکثریت نے بھی شاعرات کا روپ دھارن کرلیا۔ اور اُردو مشاعروں میں شاعرات کی کھیپ نے مشاعروں ایسی شئے لطیف کو خاصا کثیف بنا کر رکھ دیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ کچھ شاعرات واقعی قابلِ احترام اور قابلِ فخر ہیں اور وہ انتہائی شریف اور مجسمۂ اخلاق ہیں مگر ایسی اُنگلیوں پر گنی جانے والی شاعرات کے مقابلہ میں وہ شاعرات جن کو شاعرات کہنا بھی لفظ شاعرات کی توہین ہے۔ اور غیر ادبی مخلوق اپنی عشوہ طرازیوں اور جنسی سکنڈلوں کے باعث منتظمین مشاعرہ پر اس قدر حاوی ہوگئیں کہ کوئی بھی مشاعرہ ان کے بغیر پھیکا سمجھا جانے لگا۔ ایسی ہر غیر شاعرہ نے کسی نہ کسی مشہور شاعر کا سہارا لے رکھا ہے اور یہ سہارے ایسے ہیں جو کمیشن وصول کرنے کے ساتھ ساتھ انھیں برسرِ اقتدار لوگوں تک بطور تحفہ پیش کرکے اعزازات پانے لگے۔

ایک ایسی شاعرہ بھی میدان میں آدھمکی جن کے سو کالڈ فادر کو اپنی شراب نوشی سے کام تھا ان کی سو کالڈ ڈاٹر بے شک اپنے اور اپنے سو کالڈ فادر کے نام ناموس کو چار چاند لگا دیتی پھریں انھیں اس سے کوئی غرض نہ تھی۔ کہا

جاتا ہے کہ کسی بین الاقوامی شہرت یافتہ شاعر نے انھیں ایک وزیر یا تدبیر کی خدمت میں بطور تحفہ پیش کرکے متعدد مطا[...] برایوں سے ہمکنار ہوکر فائدے اٹھائے۔ اسی شاعرہ نے [...] ایک بہت بڑے افسر کو اپنا سہارا بنایا اور اس سہارے [...] اپنا جنسی کمیشن حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی بع[...] مل اونرز تک رسائی کرادی اور ان کی شاعری میں نکھ[ار] آتا گیا۔

کچھ ایسے اُردو کے خودساختہ دانشور بھی ہیں جو اپنے علم و عمل کے بل بوتے پر پنپنے کی صلاحیت نہ رکھتے تھے تو ا[نھوں] نے ترقی، شہرت اور طلب زر کے لئے حوا کی ایسی بیٹیو[ں] کو جنھیں عرفِ عام میں کال گرلز کہتے ہیں کچھ خوش ذ[وق] بڑے لوگوں کو یہ کہہ کر پیش کیا کہ یہ "توخانہ زاد" ہیں محض آپ کی خاطر مقصود تھی اس لئے انھیں قبول فرمائیے۔ ا[...] اُردو کے یہ خودساختہ دانشور اُلجھتے ہیں ہم ایسے [...] سے۔ حالانکہ ہم نے ان حضرات کی اسرار راہ [...] میں کبھی خلل انداز ہونے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔ مگر [...] بچے کے قوال کے مصداق ان کے دماغ اُونچی اڑان [...] ناکام کوشش کر رہے ہیں۔ اور آ بیل مجھے مار کے مصداق دوسرے لفظوں میں بہ زبان پنجابی "پنگا" لیتے ہو[ئے] اُلجھ رہے ہیں۔ شانِ ہند اور اس کے مدیر عزیز حقی [...] تونسوی سے۔

ہم بطور دوست انھیں مشورہ دیں گے کہ آپ ا[...] بے غیرتی کے بل بوتے پر بے شک اقتدار اور شہرت [کی] سیڑھیاں طے کرتے جائیے ہماری بلا سے۔ مگر یہ یاد [رکھئے] کہ جس روز شانِ ہند میں آپ کی کارستانیوں کا پردہ چاک [کرنا] مقصود ہوا تو پھر ہمیں اس ارادے سے کوئی روک نہیں [...]

ر شان ہند میں جب بھی ایسے معاملات پر کچھ لکھا جاتا
ہے تو ایڈیٹر شانِ ہند سپریم کورٹ کی طرف منہ کر کے
ھتا ہے تاکہ بعد میں بغلیں نہ جھانکنی پڑیں۔

شانِ ہند کے اداریوں کے باعث ہی مسٹر رفعت سروش
لیسے سرکش کو غالب انسٹی ٹیوٹ کی ڈائریکٹرشپ سے برطرف
یا گیا۔ اور ہم بہت جلد اس لڑکی کا عدالت سے تصدیق
شدہ وہ حلفیہ بیان بھی شائع کر رہے ہیں جس کو رفعت
روش کے باعث ہی غالب انسٹی ٹیوٹ کی ملازمت سے
طرف کیا گیا۔ حالانکہ اس بے قصور لڑکی کا یہ قصور تھا کہ
س کے بیان کے مطابق رفعت سروش صاحب نے اس
ر مجرمانہ حملہ کرنا چاہا اور ہم محترمہ شیلا کول سابق وزیر تعلیم
کومت ہند اور کانگریس صدی تقریبات کی انچارج اور
ناصدار بابر صاحب سے دریافت کریں گے کہ انھوں نے
کانگریس صدی مشاعرہ کا کنونیر رفعت سروش کو کن اوصاف
کی بناء پر بنایا۔

یہی حال پاکستان کی کچھ آزاد خیال شاعرات کا
پچھلے دنوں ایک مشاعرہ پاکستانی شاعروں کے طائفہ کے
ساتھ آئی تھیں۔ راقم الحروف نے اپنی زندگی میں
ویسے تو ایسی کئی عورتوں کو دیکھا ہے جو شراب پی لیوی
تو مل ہی جائیں اور ان کے ہوش و حواس بجا رہتے ہیں مگر
پاکستانی شاعرہ نے جس بے باکی سے شراب نوشی فرمائی
اس کی مثال کسی ہندوستانی شاعرہ میں بھی نہ مل سکے گی اور
پھر کثرت شراب نوشی کے ساتھ ساتھ اچھے اشعار سنانے
اور ہر من پسند شاعر کے ہاں شب بسری بھی اُن کا من بھاتا
انداز تھا حالانکہ اُن کی اس فراخدلی کے باعث دلی اور
نئی دلی کے کئی شاعروں اور ادیبوں کی ازدواجی زندگی میں
کئی دنوں تک ہنگامے بپا رہے۔

عزیز محترم یونس دہلوی کو غالب صحافی ایوارڈ

غالب انعامات کے سلسلے میں اس سال غالب ...
ایوارڈ شمع گروپ کے سربراہ عزیز محترم یونس دہلوی کو دیا گیا
ہے۔ غالب انعامات کے سلسلے میں ہر سال یہ شکایت
سننے میں آتی رہتی ہے کہ یہ انعامات زیادہ تر سفارشی
لوگوں کو دیئے جاتے ہیں مگر اس سال انعامات کم از کم
فیصدی یقیناً حق داروں کو دیئے گئے ہیں۔ یونس دہلوی
صاحب نے اپنے والد محترم حافظ محمد یوسف صاحب دہلوی کی
سرپرستی اور زیر ہدایات شمع گروپ کے رسائل کے
ذریعے اُردو صحافت کو جس رکھ رکھاؤ سے نبھایا ہے
اُس کا تقاضا تھا کہ یونس صاحب کو اس اعزاز سے نوازا
جاتا۔ ہم اس اعزاز پر عزیز محترم یونس دہلوی صاحب کو مبارکباد
پیش کرتے ہیں اور ان کے اس اقدام پر تو اور بھی دلی دعائیں
دیتے ہیں کہ اُنھوں نے ایوارڈ کی یہ رقم ثانوی درجے کے اُردو
طالب علموں کو وظائف دینے کے لئے عطا فرمائی اور
آئندہ ہر سال شمع گروپ کی طرف سے ۵ ہزار روپیہ کے
وظائف اُردو کے طالب علموں کے لئے دینے کا اعلان
فرمایا۔

بقیہ: ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

اصحاب کو انعامات دیئے گئے ہیں۔ اس طرح دو سالہ
کا تناسب دس فیصدی ہے اور حالانکہ حقیقت یہ ہے
کہ اُردو کو زندہ رکھنے میں نوے فیصدی کوشش غیر مسلم
کی ہے اور دس فیصدی مسلمانوں کی۔ اس سے نہ
چونکیے گا کہ ہندوستان میں اُردو قلم کاروں کی تعداد با
ہزار ہے اور مسلمانوں کی آٹھ ہزار۔ تاہم ادارہ شانِ
ہند جناب بابر لج کول اور پروفیسر گوپی چند نارنگ کی خدمت
میں دلی مبارکباد پیش کرتا ہے اور دُعا گو ہے کہ خدا انہیں
عمر طویل دے۔

دلّی میں صارفین تحریک

نئی دہلی۔ دلی انتظامیہ نے ابھی حال میں صارفین کے معاملات کے لئے ایک ڈائرکٹوریٹ قائم کیا ہے۔ اس کا اہم مقصد صارفین تحریک کو مضبوط بنانا اور صارفین کے مفادات کی حفاظت کرنا ہے۔ یہ اس لئے لازمی ہے کہ موجودہ بزنس سسٹم میں صارفین کی شکایات اور دشواریوں کو دور کرنے کے لئے کوئی بندوبست نہیں ہے۔

روزمرہ کے بڑھتے ہوئے مسائل اور صارفین طبقے کی ضروریات کے پیش نظر یہ اپنے دائرہ عمل میں آزاد اور اپنی تنظیم میں وسیع تر بنیادوں کی حامل ہوگی۔

صارفین کی رضاکار تنظیمیں، مختلف کالونیوں کے باشندوں کی بہبودی سے انجمنیں، خواتین کی بہبودی تنظیمیں اور دیگر سماج بہبودی تنظیمیں اس تحریک کو بھرپور تعاون دے سکتی ہیں۔

اس تحریک کی بھرپور اور مکمل کامیابی اس بات پر منحصر ہے کہ خواتین زیادہ سے زیادہ تعداد میں شریک ہوں۔ ان کے اشتراک و تعاون سے یہ تحریک اور زیادہ مضبوط اور موثر ہوگی۔

ہر ایک کالونی میں صارفین تحریک شروع کرنے کی تجویز ہے۔ شہریوں کی بہبودی تنظیمیں یا صارفین کے مفادات میں دلچسپی رکھنے والے افراد اس تحریک کو مقبول عام بنانے کے لئے اپنی تجاویز بھیج سکتے ہیں۔

جگ پرویش چندر
چیف ایگزیکیٹو کونسلر دلی
اولڈ سکریٹریٹ دلی

جاری کردہ: **محکمہ اطلاعات و اشاعت، دہلی انتظامیہ دہلی**

ڈی آئی پی

مشاعرہ اوسلو ۱۹۸۵ء

سید مجاہد علی
ایڈیٹر "کارواں" اوسلو (ناروے)

اوسلو میں سکنڈے نیویا کا پہلا عظیم الشان اُردو/پنجابی مشاعرہ تین نومبر ۱۹۸۵ء کو منعقد ہوا۔ اس مشاعرے کا اہتمام کثیر الثقافتی ایکٹیویٹی سنٹر اوسلو نے کیا۔ جس کے روح رواں سید مجاہد علی ماہنامہ "کارواں"۔ اوسلو کے مدیر سردبیر تھے۔ (ادارہ)

مشاعرے کا مقصد ایک طرف اُردو اور پنجابی جاننے والے تارکین وطن کے ذوق سماعت کی تسکین کے لئے ایک تقریب کا اہتمام تھا تو دوسری طرف نارویجین معاشرے کو یہ باور کرانا مقصود تھا کہ تارکین وطن بھی بعض ایسی قیمتی ثقافتی روایات لے کر آئے ہیں جن کا بیج نئی سرزمین میں بویا جاسکتا ہے۔ منتظمین کے نزدیک دانشورانہ سطح پر باہمی گفت و شنید اس سلسلہ میں اہم کردار ادا کر سکتی تھی لہٰذا اس بات کا اہتمام کیا گیا تھا کہ مہمان شعرا حلقۂ کرام مقامی ادیبوں، صحافیوں اور سیاسی و سماجی زندگی سے متعلق مختلف لوگوں سے مل سکیں۔

مشاعرہ اوسلو ۱۹۸۵ء میں شرکت کے لئے ہند و پاک کے نامور ترین شعراء کو دعوت دی گئی تھی لیکن بعض شعرا مختلف وجوہ کی بنا پر شرکت نہیں کر سکے تاہم بھارت سے علی سردار جعفری اور پاکستان سے شریف کنجاہی، قتیل شفائی، حمایت علی شاعر، ضمیر جعفری، جمیل الدین عالی اور شاہد لطفی، لندن سے احمد فراز اور افتخار عارف اور سویڈن سے احمد فقیہہ مشاعرے میں شرکت کے لئے تشریف لائے۔ اُردو کے ممتاز نقاد اور انگریزی زبان کے نامور صحافی محمد علی صدیقی بھی کراچی سے تشریف لائے تھے۔ مہمانوں کی آمد یکم نومبر کو ہی شروع ہو گئی اور ۲ نومبر کی شام تک سب مہمان اوسلو پہنچ گئے۔ مقامی معاشرت سے مہمانوں کی شناسائی کا عمل ۲ نومبر سے شروع ہو گیا۔ مشاعرے سے پہلے تمام مہمانوں کو نارویجین پارلیمنٹ کی سیر کرائی گئی۔ ملک کی سب سے بڑی پارٹی آربائیدر پارٹی (لیبر پارٹی) کی طرف سے رکن اسمبلی آنے لیزے ڈودم (ANNE LISED RUM) اور اوسلو کے مضافاتی علاقے لورنس کوگ (LORENSKOG) کی بلدیاتی کونسل کے پاکستانی رکن اسلم احسن جو آربائیدر پارٹی میں ممتاز شمار ہوتے ہیں اور پاکستان ورکرز ویلفیئر یونین کے سکریٹری اطلاعات بھی ہیں نے میزبانی کے فرائض انجام دئے۔ آنے لیزے ڈودم نے مہمانوں کو اسمبلی کی عمارت کی سیر کرائی اور ملک کی پارلیمانی تاریخ اور سیاسی نظام کے بارے میں قابل قدر معلومات بہم پہنچائیں۔ اس موقع پر چائے کا اہتمام بھی کیا گیا تھا۔

تین بجے سہ پہر اوسلو کنسرٹ ہاؤس میں جو اوسلو کا سب سے شاندار ہال ہے۔ مشاعرے کے سلسلے میں پروگرام کا آغاز ایک غیر رسمی ملاقات سے ہوا۔ اس میں پاکستانی تنظیموں کے نمائندوں کے علاوہ نارویجین ادیب و صحافی اور سماجی کارکن بڑی تعداد میں موجود تھے۔ مٹھائی، سموسوں اور چائے سے شرکا کی تواضع کی گئی۔

چار بجے سہ پہر باقاعدہ کارروائی کا آغاز ہوا۔ تاہم پروگرام کا یہ حصہ انگریزی میں منعقد کیا گیا تھا۔ تاکہ نارویجین حاضرین کو مشاعرے اور اُردو ادب کے بارے میں تھوڑی

معلومات فراہم کی جا سکیں۔ انیس احمد جو ناروے جین براڈ کاسٹنگ کے کارپوریشن کے اُردو پروگرام کے انچارج ہیں نے میزبانی کے فرائض انجام دیئے۔ انھوں نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ اور شعر کو روح کی غذا قرار دیتے ہوئے امید ظاہر کی کہ اوسلو میں اس قسم کی شعری تقریبات منعقد ہونے کی روایت آگے بڑھ سکے گی۔

اوسلو کے نائب میئر ہانس سویلاند (SVELLAND HANS) نے مشاعرے کا باقاعدہ افتتاح کرنے کی رسم نبھائی۔ ان کے بعد پاکستان سے آئے ہوئے دانشور محمد علی صدیقی نے اُردو کی شعری روایت اور مغربی ادب سے اس کے تعلق پر مختصر گفتگو کی اور پھر مشاعرے میں شرکت کے لئے آئے ہوئے شعراء کا مختصراً تعارف بھی کرایا۔ علی سردار جعفری، احمد فراز اور جمیل الدین عالی نے اپنی بعض نظموں کے انگریزی تراجم پیش کئے۔ آخر میں اوسلو یونیورسٹی کے شعبۂ ادب کے پروفیسر ایڈورڈ بائیر (EDWARD BEYER) نے ناروے کی شعری روایت پر گفتگو کی۔ اور کلاسیکل نارویجین شعراء کے حوالے دیتے ہوئے بتایا کہ وہ سب آفاقی پیغام محبت پر یقین رکھتے تھے۔

باقاعدہ مشاعرہ ۵ بجے شام شروع ہوا۔ یاسمین مجاہد نے کثیر الثقافتی ایکٹیویٹی سنٹر کی طرف سے مختصراً استقبالیہ تقریر کی۔ انھوں نے کہا کہ اوسلو میں مشاعرے کا اہتمام کسی اتفاقی حادثے کا نتیجہ نہیں ہے جب کہ اوسلو میں مقیم تارکین وطن کے مابین طویل ادبی و ثقافتی عمل کا نتیجہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہم نئے معاشرے میں گھلنا ملنا چاہتے ہیں لیکن اپنی شناخت کھونا نہیں چاہتے ہم یہاں سے بہت کچھ سیکھنا چاہتے ہیں لیکن انھیں بھی اپنے بارے میں بتانا چاہتے ہیں تاکہ باہمی احترام و محبت کا دو طرفہ عمل شروع ہو سکے۔ انھوں نے کہا کہ فیض احمد فیض جو ہمارے عہد کی سب سے توانا شعری آواز رکھتے آج ہم میں موجود نہیں لیکن ہم ان کی کمی بتہہ دل سے محسوس کرتے ہوئے انھوں نے مشاعرے کی صدارت کے لئے اُردو کے

جادو بیان شاعر علی سردار جعفری کو زحمت دی اور کہا کہ گو حمایت علی شاعر ہمارے مہمان ہیں لیکن وہ اوسلو میں پہلے مشاعرے کے میزبان بھی ہوں گے۔ پاکستان ورکرز ویلفیئر یونین کے صدر قیصر سعید صدیقی نے پاکستانیوں کی طرف سے تمام مہمان شعراء کو پھولوں کا گلدستہ پیش کیا۔ یہ پھول علی سردار جعفری نے شعراء کی طرف سے وصول کئے۔

حمایت علی شاعر جو مشاعروں کی میزبانی اور ٹیلی ویژن پروگراموں کی کمپیئرنگ میں یدِ طولیٰ رکھتے ہیں نے مائک سنبھالا تو محفل کا رنگ ہی بدل گیا۔ انھوں نے سب سے پہلے تمام شعراء کو یکے بعد دیگرے سٹیج پر آنے کی دعوت دی۔ ایک ایک شاعر کی آمد پر پُرجوش تالیوں سے ان کا استقبال کیا جاتا۔ سٹیج کو نہایت خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔ فرش پر خوبصورت پاکستانی قالین بچھا تھا اور تین اطراف شعراء کے بیٹھنے کے لئے کرسیاں لگائی گئی تھیں۔ درمیان میں پھول آراستہ تھے۔ سامنے گاؤ تکیوں کے ساتھ مختصر فرشی نشست بنائی گئی تھی تاکہ اسٹیج کے روایتی انداز کی جھلک نمایاں رہے۔ ہال جس میں ۳۰۰ افراد کے بیٹھنے کی گنجائش تھی کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ بے شمار لوگ جگہ نہ ملنے کے باعث کھڑے تھے یا فرش پر بیٹھے تھے حمایت علی شاعر نے خود اپنے کلام سے اس تاریخی محفل شعر و سخن کا آغاز کیا۔

میں سو رہا تھا اور کوئی بیدار مجھ میں تھا
شاید ابھی تک میرا پندار مجھ میں تھا
وہ کج ادا ہی سہی میری پہچان بھی تھا وہ
اپنے نشے میں مست جو فنکار مجھ میں تھا

سویڈن سے آئے ہوئے احمد فقیہہ نے وطن سے آئے ہوئے شعراء کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

یہ کربلا کے مسافر نہیں پھر بھی
وطن سے شام غریباں کی یاد لائے ہیں

کراچی سے آئے ہوئے جواں سال شاعر شاہد نقوی کے بعد لندن سے آئے ہوئے افتخار عارف نے اپنا کلام سنایا اور اپنے برموقع شعروں سے محفل کا رنگ ہی بدل

دیا ہے

شگفتہ لفظ لکھے جا رہے ہیں
مگر لہجوں میں ویرانی بہت ہے
بلند ہاتھوں میں زنجیر ڈال دیتے ہیں
عجیب رسم چلی ہے دعا نہ مانگے کوئی

ان کے بعد احمد فراز آئے اور انھوں نے اپنی مشہور نظمیں "ہم اپنے خواب کیوں بیچیں" اور "محاصرہ" سنا کر بے پناہ داد پائی۔

طنز و مزاح کے جانے پہچانے شاعر جناب ضمیر جعفری تشریف لائے تو محفل کا سنجیدہ رنگ بدل گیا اور سامعین جناب جعفری کے چبھتے ہوئے معنی خیز اشعار پر لوٹ پوٹ ہو گئے ہے

مغربیوں کا گھر ہے نرالا
کھیلے گورا دوڑے کالا
اک طرف پہاڑی ہے اک طرف سمندر ہے
اس کے بعد جو کچھ ہے بس اسی کے اندر ہے

جمیل الدین عالی نے اپنی مختصر نظموں اور دوہوں سے حاضرین کو محظوظ کیا ہے

تھر تھر کانپے کاغذ اور سیاہی اُڑتی جائے
سچ کا بوجھ ترازو جھوٹی کتنی دیر اُٹھائے

عالی جی اپنی آواز کی خرابی کے باعث سامعین کی فرمائش کے باوجود اپنا مشہور نغمہ "جیوے جیوے پاکستان" نہ سنا سکے۔

قتیل شفائی نے کئی غزلیں سنائیں اور خوب داد پائی۔

شہر مندا انھیں اور بھی اے میرے خدا کر
دستار جنھیں دی ہے انھیں سر بھی عطا کر
اک موج دبے پاؤں مرے پیچھے چلی آئی
میں خوش تھا بہت ریت پہ تصویر بنا کر

شریف کنجاہی پنجابی کے شاعر ہیں اور انھوں نے زیادہ تر اپنا پنجابی کلام پیش کیا تاہم انھوں نے اردو کی ایک غزل بھی سنائی ہے

شریف جو بھی اٹھا ابر بن گیا آدمی
مقدروں میں اب کوئی گھٹا ہی نہیں

آخر میں صدر محفل علی سردار جعفری نے مختصر سے خطبے کے بعد اپنی متعدد نظمیں سنائیں۔ اور سامعین سے داد پائی۔ یوں اوسلو کی تاریخ کا یہ سا نرہ سا ڑھے تین گھنٹے مسلسل نشست کے بعد اپنے اختتام کو پہنچا۔

پیر کی دوپہر کو سٹی کونسل کے پاکستانی رکن خالد محمود نے مہمان شعراء کے اعزاز میں مقامی ریسٹورنٹ "بہار" میں ظہرانہ دیا۔ ناروے کی پارلیمنٹ کے سپیکر یو بینکو اور ان کی اہلیہ آنے لیزر ہوگ جو خود بھی رکن اسمبلی ہیں بھی اس موقع پر موجود تھے۔ یو بینکو نے مہمان شعراء کا خیر مقدم کیا اور کہا کہ یہ ثقافتی تبادلہ دونوں معاشروں کے لئے قابل قدر ہو گا۔ سپیکر نے اس موقع پر مہمانوں میں مشاعرہ اوسلو ۱۹۸۸ء کے سوونیئر بھی تقسیم کئے جو کیئر الثقافتی ایکزیکیوٹیو سنٹر نے خاص طور سے تیار کروائے تھے۔ یہ ہاتھ سے بنی ہوئی چینی کی پلیٹ تھی جس پر قدیم اور مقبول نارویجین نقش نگاری کی گئی ہے۔

اسی رات پاک نارویجین یونین کی طرف سے مہمانوں کے اعزاز میں ایک نارویجین گھر میں عشائیہ دیا گیا تاکہ مہمانوں کو ناروے کے بارے میں قریب سے معلومات حاصل کرنے کا موقع مل سکے۔ اس موقع پر مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے لوگ موجود تھے۔ یونین کی طرف سے ناروے کے بارے میں معلوماتی سلائیڈز بھی دکھائی گئیں۔

منگل کی صبح کو معزز مہمان اوسلو کا سٹی ہال دیکھنے گئے جہاں اوسلو کے میئر البرٹ نورڈنگن (ALBERT NORDENGEN) نے ان کا خیر مقدم کیا اور اپنے دستخطوں کے ساتھ اوسلو کی باتصویر کتاب انھیں پیش کی۔ بعد میں انھوں نے اوسلو سٹی ہال کی عظیم الشان عمارت دیکھی۔ اس کے بعد مہمان شعراء اوسلو یونیورسٹی کے انڈو ایرانین انسٹی ٹیوٹ تشریف لے گئے جہاں شعبہ اردو کے انچارج فین تھیسن نے ان کی ملاقات اردو کی تعلیم حاصل کرنے والے طلباء سے کرائی۔

باقی صفحہ ۱۶ پر

شاعرِ حُسن و حیات ــ جناب محمد عثمان عارف نقشبندی

ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی

وہ انسان کتنا خوش قسمت اور بلند مقام ہوتا ہے۔ جس کا ورثہ، ماحول اور معاشرہ اس کے رجحانِ طبع اور ذوق کے مطابق ہو۔ جناب محمد عثمان عارف نقشبندی صاحب کو یہ شرف و امتیاز حاصل ہے کہ ان کے ورثے میں ذوقِ ادب و شعور ملا۔ شائع انسانیت و شرافت ملی۔ اور سرمایۂ اخلاق و تصوف حاصل ہوا۔ انھوں نے شاعری و شرافت اور تصوف کے آغوش میں آنکھیں کھولیں اور وہ علمی و اخلاقی و روحانی ماحول میں پروان چڑھے۔ ان کے والد بزرگوار الحاج محمد عبد اللہ بیدلؔ مرحوم (ڈسٹرکٹ کشن جج) حضرت بیخودؔ دہلوی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ بیخود مرحوم کو اپنے اس شاگرد کی شاعرانہ صلاحیت اور زبان دانی پر فخر تھا۔ انھوں نے اعتراف و اعلان کیا کہ:۔

"بیدل نے میری زبان پہ ڈاکہ ڈالا ہے۔ میرے پاس مالِ دنیا اور کچھ تو تھا نہیں۔ ایک زبان رکھتا تھا وہ حضرت بیدل کی نذر ہو گئی۔ ان کے بہت سے شعر میرے ہی رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ انھوں نے کمال، محنت اور جانفشانی سے، میری زبان، میرا بیان اور میرا تخیل حاصل کر لیا ہے" ۱؎

یہی زبان، بیان اور تخیل، عارف صاحب کو وراثت میں ملا ہے۔ شعر و شاعری کے متعلق اپنے ایک انٹرویو میں عارف صاحب نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان سے موصوف کے نظریاتِ شاعری، رجحانات، احساسات وغیرہ کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

"میں اپنی شاعری میں خاص طور پر یہ بھی دھیان رکھتا ہوں کہ [illegible] شعری معائب سے پاک رہے۔ شعر میں کسی خوبی کا ہونا تو وہ مری منزل ہے" ۲؎

"میں نے نظم و غزل دونوں ہی میں اپنے شعری لب و لہجہ میں شدت احساس کی انتہاؤں کو چھونے کی کوشش کی ہے۔ جو ایک حساس فنکار کی خصوصیت ہوتی ہے" ۳؎

"میرے یہاں شاعری کا ڈکشن نیا نہیں ہے لیکن میرے خیالات، جذبات و احساسات آپ کو بھرپور انداز میں ملیں گے اور میں نے کوشش کی ہے کہ صاف ستھری اور اچھی زبان میں اسے پیش کر دوں" ۴؎

عارف صاحب کا تعلق داغ اسکول سے ہے۔ وہ شعر کو لفظی و معنوی معائب سے پاک رکھنے پر زور دیتے ہیں اور خود بھی اس پر سختی سے عمل کرتے ہیں۔

عارف صاحب صرف حسنِ بندشِ الفاظ کے قائل نہیں ہیں اور ہونا بھی نہیں چاہئے۔ یہ تو شعر کا ایک ظاہری وصف ہے جس میں اظہارِ خیال کا حسن تو پایا جاتا ہے لیکن خیال کیا ہے؟ ہماری زندگی سے اس کا کتنا اور کیسا تعلق ہے؟ وہ زمانے کے تقاضوں، عصری رجحانات، ماحول و معاشرہ کے معاملات و مسائل کی ترجمانی کرتا ہے یا نہیں؟ اگر خیال صرف لفظی یا خیالی ہے تو یہ لفظی فنکاری ہے۔ اصلیت، صداقت، واقعیت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ شاعری کے حسن و جمال کو فروغ دلِ گداختہ کے بغیر نہیں ہو سکتا۔

عارف صاحب کو گداختہ دل پیدا کرنے کی زحمت

۱؎ تا ۴؎ شاعر بمبئی جلد ۵۵، شمارہ ۹ ــ صفحہ: ۱۴۱، ۱۴۲

میں ہوئی وہ تصوف کو اپنی جبلت اور خمیر کا جزو پاتے ہیں اور صوفی کا دل سوز و گداز، خلوص و محبت، شرافت و انسانیت، طہارت و نفاست، صبر و قناعت، درویشی و بے ریائی، ہمدردی، خدمتِ خلق کا گہوارہ اور سرچشمہ ہوتا ہے عارف کے دل میں جو ہوتا ہے وہی زبان پر بھی۔ سخنِ عارف کا "ترجمانِ دلِ عارف" ہے۔

حسنِ حبیب، درد، محبت، غمِ جہاں
عارف جو دل میں ہے وہی شعر و سخن میں ہے

اور حقیقت یہ ہے کہ کلامِ عارف، حسنِ حبیب، دردِ محبت اور غمِ جہاں کا پیکرِ جمیل ہے۔ ایک ایک شعر ان کی دلی واردات اور ذہنی کیفیات کا ترجمان ہے

اس کے ساتھ ہی ساتھ عارف صاحب نہ صرف زبان کے رموز و نکات، اس کی سادگی و پرکاری، فصاحت و سلاست، لطافت و نزاکت سے بخوبی واقف ہیں۔ بلکہ اندازِ بیان، ایجاز و اختصار، اس کی دلکشی و تاثیر پر بھی قدرتِ کاملہ رکھتے ہیں۔ ان کو زبان و بیان کی تمام خصوصیات اور آدابِ فن سے آگاہی ہے۔ وہ زندگی اور زمانے کے مسائل پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ عصری رجحانات اور زمانے کے تقاضوں کو سمجھتے ہیں اور ان کو بہتر سے بہتر انداز میں بیان کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان کے کلام میں فکر و نظر کی رفعت و وسعت، جذبات و خیالات کی صداقت و طہارت [illegible] ہے۔ شعوری [illegible] سے ان کا کلام ہشت پہل نگینہ کی طرح ہے جس کی آب و تاب، زور، چمک، دمک لیے ہوئی ہر صنفِ سخن میں پائی جاتی ہے لیکن غزل میں سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ غزل میں حسنِ حبیب کا بیان بڑے والہانہ انداز میں عارف صاحب کرتے ہیں، گل افشانیٔ گفتار کا یہ انداز دوسری صنفِ سخن رباعی، قطعہ، نظم وغیرہ میں اس لیے کم ہے کہ ان میں موضوع کے اعتبار سے خیالات کا اظہار کرنا پڑتا ہے اور اس غزل میں اشاریت و رمزیت، خوشنمائی و رعنائی اور تاثیر پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ نظم، رباعی یا قطعہ وغیرہ میں اس حد تک نہیں ہو پاتی تاہم عارف صاحب کا کمال یہ ہے کہ وہ ہر صنفِ سخن کو اپنے سوزِ دروں، اپنے خلوص، اپنی متانت و شرافت اور ہمدردی و محبت سے شاہکار بنا دیتے ہیں۔ ان کا پہلا مجموعہ "نذرِ وطن" نظموں پر مشتمل ہے۔ یہ نظمیں زبان و بیان، ہیئت و مواد کے اعتبار سے اس امر کا ثبوت ہیں کہ عارف صاحب کو اپنے فن پر پوری دسترس حاصل ہے۔ اور ان کو اپنے وطن اور وطن والوں سے کتنی والہانہ محبت ہے۔ "حبِ وطن از ملکِ سلیمان خوشتر" اور "حب الوطن من الایمان" ان کا عقیدہ اور عمل ہے۔ جناب پی . . . [illegible] کے الفاظ میں:۔

"عارف کا دل جذبۂ حب الوطن سے لبریز ہے، وہ سچے اور پکے ہندوستانی ہیں ان کا نقطۂ نظر بہت [illegible] ہے۔ ان کی نظمیں ان کے سیکولر کردار، جمہوری ذہن اور سماجی و ادبی مزاج کی آئینہ دار ہیں جن میں سے اکثر جوش اور جذبے سے بھرپور رہی ہیں" ۱؎

عارف صاحب نے اردو شاعری اور شاعروں کی قومی و وطنی خدمات و رہنمائی کا بھی اعتراف کیا ہے۔

"اردو شاعری میں قومی و وطنی شاعری کا ایک مستقل باب ہے اردو کے شعرا اور ادیبوں نے جنگِ آزادی سے اب تک بہت جاندار اور حسین اور ولولہ انگیز قومی و ملکی تاریخی لٹریچر کی تخلیق کی ہے جو ہمارے ہندوستان کا بیش بہا ادبی و لسانی خزانہ ہے۔ اہلِ اردو نے ملک و قوم کا ہر مشکل میں اور ہر منزل پر نہایت خلوص اور سچائی اور دلیری سے ساتھ دیا ہے وہ خود بھی جذبۂ حب الوطنی سے سرشار ہیں اور اپنی تخلیقات کے ذریعہ سے عوام و خواص کو بھی سرشار و دلشاد کرتے رہتے ہیں" ۲؎

سرزمینِ راجستھان ہمیشہ حریت پرور اور حریت نواز

رہی ہے، عارف صاحب اسی حریت بخش آب و ہوا میں پروان چڑھے۔ ان کے دل میں وطن کی محبت کا جذبۂ صادق نہ ہوتا تو تعجب تھا۔ وہ اپنے وطن کو ہر اعتبار سے سارے جہاں سے اچھا بنانا چاہتے ہیں۔

نذرِ وطن میں ۱۸ نظمیں ہیں اور ہر نظم ہندوستان کی عظمت اور اس کے روشن مستقبل کی ترجمان ہے۔ مادرِ وطن کو نذرِ خلوص و محبت پیش کرنے کے بعد، عارف صاحب نے حمد و نعت و منقبت کا مجموعہ "عقیدت کے پھول" (۱۹۸۱ء) شائع کیا۔ تصوف، عارف صاحب کے خمیر کا جزو ہے وہ "با خدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار" پر عقیدہ رکھتے ہیں۔ فرقِ مراتب کا خیال رکھتے ہیں۔ نعت گوئی کی سعادت "بزورِ بازو" نصیب نہیں ہوتی۔ یہ تو اللہ کا کرم ہے جس کو حاصل ہو جائے عارف صاحب نقشبندی سلسلۂ طریقت سے وابستہ ہونے کی وجہ سے روحانیات سے زیادہ قریب اور متاثر ہیں اس لئے:۔

"ان کے نعتیہ کلام میں ایک والہانہ کیفیت، ایک
نیا آہنگ، ایک دلکش لے، ایک نئی ترتیب اور
ایک نئی فضا کا احساس پایا جاتا ہے اور یقیناً یہ
چیز ان کی انفرادیت کو ممیز و ممتاز کرتی ہے" [ش]

"نعتِ عارف، ایک عارف و سالک، صوفی و درویش کا قلب ہے۔ جو حبِ رسول میں سرشار رہتا ہے۔ لیکن یہ سرشاری، حدِ ادب سے بڑھنے کی جرأت نہیں کرتی وہ رحمتِ عالم کے مقام و مرتبہ کا ہر لمحہ ہر پل لحاظ رکھتی ہے۔ حرمین شریفین کی زیارت اور بارگاہِ نبوی میں حاضری نے ان کے قلب کو اور زیادہ صاف اور گداز بنا دیا ہے۔ سیرتِ پاک کے مختلف پہلو اس طرح بیان کرنا کہ مبالغہ یا غلو نہ ہو اور شاعرانہ حسن بھی قائم رہے۔ حالی کی طرح عارف صاحب کی بھی خصوصیت ہے عارف صاحب بارگاہِ نبوی میں نذرانۂ عقیدت پیش کر رہے ہیں ...

الفات و عدل وہ ہے طبیعت میں آپ کی
شاہ و گدا ہیں ایک شریعت میں آپ کی

بھٹکے ہوؤں کو راہ دکھانے کو آ گئے
سینے سے بے کسوں کو لگانے کو آ گئے

• حضرت امام حسینؓ کی منقبت میں ایک مسدس "درسِ شہادت" لکھا ہے جس کا ہر بند اور بند کا ہر شعر ...آموز ہے اور حق و صداقت کے لئے مرنے کو تڑپ پیدا کر... والا ہے۔ کتنی سچی بات کہی ہے کہ حسینؓ نے دنیا کو د... ہے وہ آئین زندگی ملتی رہے گی موت میں تسکین زند...

عارف صاحب امام حسینؓ کی تعلیمات حق و صداقت... قربانی و ایثار تسلیم و رضا، عزتِ نفس و خودداری کو دہرا... اور اس کے رسولؐ کا حکم ہے یاد دلا کر، ان کی پیروی کرنے... زور دیتے ہیں۔

وہ ظاہری اور لفظی عقیدتوں کو اچھا نہیں سمجھتے۔

لفظی عقیدتیں ہیں جناب امام سے
نسبت نہیں ہے کوئی ہمیں ان کے کام سے

عہدِ حاضر میں جناب عارف صاحب نقشبندی نعت گ... حیثیت سے بھی منفرد و ممتاز مقام حاصل کر چکے ہیں خ... کرے حبِ رسولؐ، عشقِ رسولؐ میں بدل جائے ا... نعت گوئی کا سلسلہ قائم رہے تاکہ اس صدی میں بھی "حسان الہند" حضرت محسن کاکوروی کے مبارک و مقد... پاکیزہ اضافہ ہوتا رہے

نذرانۂ عقیدت کے بعد عارف صاحب کی ۴۲ غزلوں... مجموعہ "قلم کی کاشت" ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا۔ غزل کو ار... شاعری کی آبرو کہا گیا ہے۔ غزل کی ہمہ رنگی و ہمہ جہتی... عارف صاحب کو ابتدا ہی سے متاثر و مسحور کر دیا تھا ان... اندر یہ خداداد صلاحیت موجود ہے کہ وہ ہر قسم کے جذبا... و خیالات و احساسات اور تاثرات کو غزل میں بیا... کر سکیں "قلم کی کاشت" میں کشش حسن بھی ہے شیو... عشاق بھی، تہذیب رسم عاشقی بھی ہے ناز و عشوۂ محبوب... بھی، حیاتِ انسانی کے مسائل و معاملات بھی ہیں، عصری... اور زمانے کے تقاضے بھی، غرض غزلیاتِ عارف، قدیم صا... روایات کی امین، عہدِ حاضر کے مسائل کی ترجمان ا...

...ش مستقبل کی مبشر ہیں۔ عارف صاحب، عارفِ حسن ہو
...ل میں، وہ کائنات کی ہر حسین چیز سے محبت کرتے۔ وہ
...ی غزلوں میں انسانی زندگی کے ہر مسئلے اور ہر جذبے کو
...سے دلکش پیرائے میں بیان کرنے کا شعور رکھتے ہیں
...س بات یہ ہے کہ کوئی جذبہ ہو، کوئی خیال ہو، کوئی تاثر ہو
...نگ تغزل سے خالی نہیں ہوتا۔ ان کی غزل حسن و حیات
تاج محل ہے۔ چند اشعار دیکھئے۔

عشق کی آگ متاعِ دل و جان ہے عارفؔ
خاک رہ جائے جو یہ آگ بجھائی جائے

آتشِ غم سے کہو آنچ ذرا تیز کرے
تپ کے اس آگ میں کچھ اور نکھر جاؤں گا

اس دورِ خود پرست میں دیکھا جو غور سے
عارفؔ خدا بہت ملے، انسان کم ملے

کیا شکوہ بہاروں کا عارفؔ کس سے یہ شکایت کرتا
غنچوں کی طلب پر شعلے، پھولوں کی طلب پر خار ملے

اپنے پہ اعتماد اگر ہے تو ڈر نہ کچھ
اک نقش جاوداں ہے یہ دھوکا نہ جانیے

بے لطف ہے، محروم ہے کانٹوں کی خلش سے
جو زندگی پھولوں سے ہم آغوش رہی ہے

کرو بہار کو رنگین، ہے خونِ دل حاضر
جلاؤ میرا نشیمن کہ روشنی کم ہے

دل کا رشتہ ٹوٹتے ہی چوٹ سی دل پر لگی
پھول بھی پھینکا ہے اپنوں نے تو وہ پتھر لگا

ضمانت ہے حیاتِ نو بہ نو تازہ بہ تازہ کی
نئے خورشید کا ہر صبح کرنوں میں بکھر جانا

غزل کی طرح عارف صاحب کو رباعیات و قطعات پر
...کمال حاصل ہے "نوائے زندگی" مطبوعہ ۱۹۸۲ء میں ۲۹
...عیاں اور ۵۵ قطعات شامل ہیں۔ رباعی اور قطعہ
...زل سنجیدہ اور فلسفیانہ علمی و اخلاقی موضوعات کے لئے
...وں ہیں۔
"نوائے زندگی" پر جناب مالک رام صاحب اور پروفیسر

گوپی چند نارنگ جیسے باکمال محققین نے تعارف اور دیباچہ لکھا ہے۔ مالک رام صاحب کو حیرت ہے کہ

"عارف صاحب نے اس جوانی کے عالم میں رباعی اور مختصر قطعہ پر توجہ کی ہے۔ یہ امر نہ صرف ان کی قادر الکلامی اور پختگی پر دلیل ہے بلکہ ان کی خود اعتمادی کا بھی بین ثبوت ہے۔"

واقعہ بھی یہی ہے کہ رباعی کا فن، دریا کو نہیں بلکہ سمندر کو کوزے میں بند کرنے کا فن ہے۔ اس کے موضوعات مذہب، اخلاق، فلسفہ و تصوف، ادب، سیاست، تمدن و معاشرت، کردار و عمل وغیرہ ہیں جو رفعتِ فکر، وسعتِ نظر، اظہار و بیان پر قدرت کے بغیر حسن و خوبی کے ساتھ ادا نہیں کئے جاسکتے۔ عارف صاحب میں یہ خداداد صلاحیت و صفت موجود ہے کہ وہ ہر موضوع کو ہر صنفِ سخن میں ادا کرنے کا شعور و سلیقہ رکھتے ہیں۔ یہ رباعیاں ملاحظہ ہوں۔

سیلابِ حوادث کی فراوانی ہے ÷ انسان کو کس درجہ پریشانی ہے
اللہ سے پھر بھی ہے بغاوت قائم ÷ جو کام ہے انسان کا شیطانی ہے

طوفان تو اٹھتا ہی چلا جاتا ہے ÷ سیلاب تو امڈا ہی چلا جاتا ہے
انسان کی کشتی کو ترانے والو ÷ انسان تو ڈوبا ہی چلا جاتا ہے

کیوں گردشِ ایام سے گھبراتا ہے ÷ ہر دورِ زمانہ کا گذر جاتا ہے
وہ فصلِ خزاں میں بھی شگفتہ خاطر ÷ کانٹوں میں بھی جو گل بہار دکھلاتا ہے

قطعات پر پروفیسر گوپی چند نارنگ نے بصیرت افروز تبصرہ کیا ہے میں، قطعاتِ عارفین کو، مذہبی و اخلاقی، ملکی و ملی، قومی و وطنی، سیاسی و سماجی، ادبی و تعلیمی، خودی و خود اعتمادی جیسے اہم موضوعات پر، عارف صاحب کی لسانی و فنی قدرت و صلاحیت تسلیم کرتا ہوں، خشک، فلسفیانہ اور سنجیدہ موضوعات کو بھی دلنشین انداز میں بیان کرنے کے فن پر انھیں عبور حاصل ہے۔ نئی زندگی کو کتنی ولولہ انگیز زندگی ثابت کیا ہے۔

مجاکے چاند ستاروں کی رات بھر محفل
ہر ایک صبح نئے نور میں نکھرتا ہوا
ہر ایک لمحہ مرے ارتقا کی منزل ہے
نئی امنگ، نئی زندگی کا مژدہ ہوں

مذکورہ بالا شعری مجموعوں کے تعارف اور مختصر ذکر سے عارف صاحب کی شاعرانہ حیثیت و صلاحیت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ وہ فطری شاعر ہیں۔ شاعری کا ملکہ خداداد ہے۔ شاعری قوت ہے اور یہ قوت عارف صاحب میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ اس قوت کی کرشمہ سازی اور برکت ہے کہ وہ ہر صنفِ سخن پر قدرتِ کاملہ رکھتے ہیں۔ ان کے کلام کا بیشتر حصہ سہل ہے۔ دقیق سے دقیق مسئلہ یا موضوع کو وہ دلنشین اور سلجھے ہوئے انداز میں اس طرح بیان کر جاتے ہیں کہ دل و دماغ دونوں متاثر ہو جاتے ہیں۔ "نورِ زندگی" کے ساتھ ان کا یہ فیضِ سخن "لمحوں کی دھڑکنیں" تک پہنچ گیا ہے۔ جس میں تقریباً ۱۴۰ غزلیات کا تحفہ لے کر وہ داخل ہوئے ہیں اور اس ساز و سامان کے ساتھ کہ نئے زمانے، نئے امکانات، نئے مسائل اور نئے جہان و مکان کی بھرپور ترجمانی کریں۔ ہمارے ادبی و جمالیاتی ذوق کو سنواریں اور نکھاریں، زندگی کے مسائل، جدید خیالات و رجحانات سے آگاہ کریں۔

مندرجہ ذیل اشعار عارف صاحب کے اس جدید رنگِ تغزل کے آئینہ دار ہیں۔

بنتے ہیں گر ہزار دعاؤں سے آشیاں
گرتی ہیں بجلیاں بھی بڑے اہتمام سے
چار تنکے کہیں رکھ لوں گا ٹھکانے کے لئے
باغباں میں ترے گلشن کے سہارے تو نہیں
حیات روز نئے رنگ میں نمایاں ہے
جو اک چراغ بجھا سینکڑوں چراغ جلے
مسافر کام لے کچھ کام اپنے جذبۂ دل سے
نہ منزل دور ہے تجھ سے نہ تو ہے دور منزل سے
طوفان سے نکلے ہو، رہے ساحل پہ اگر

بے مانگے یہ دیکھ یہ شبنم کا فیضِ عام
پھولوں پہ اور کانٹوں پہ یکساں نکھار ہے
ہوتی ہے خیالوں ہی میں تنظیم چمن کی
کردار ہی بدلے ہیں نہ گفتار ابھی تک
اُن ظلم کے ماروں کی گنتی ہے کہاں عارف
ڈرتے ہوئے ظالم کا جو نام نہیں لیتے

بقیہ: ۔ مشاعرہ اوسلو ۱۹۸۵ء

مہمانوں کو رحمان بابا کی شاعری کے انگریزی تراجم پر مشتمل کتابیں بھی تحفتاً پیش کی گئیں۔

بدھ کو مہمان اوسلو کے قابل دید مقامات کی سیر کے لئے گئے۔ رات کو پاکستان ورکرز ویلفیئر یونین نے ان کے اعزاز میں عشائیہ دیا۔ صدر یونین قیصر سعید محمد لقی نے ... کرتے ہوئے کہا کہ ایسے معزز مہمانوں کو بلا کر اور اوسلو میں شاندار مشاعرے کا انعقاد کر کے کثیر الثقافتی اکیڈیمی سند... انتہائی قابل قدر ثقافتی خدمت سرانجام دی ہے۔

جمعرات کو مہمان اوسلو کے نواح میں سیر کے لئے گئے۔ شام کو نارویجین رائیٹرز یونین کے زیر اہتمام ایک شام میں شرکت کی۔ اس موقع پر محمد علی صدیقی نے اُردو شاعری کا مختصر جائزہ پیش کیا اور اس ضرورت پر زور دیا کہ اُردو ادب کے تراجم نارویجین میں ہونے چاہئیں۔ علی سردار جعفری، جمیل الدین عالی اور احمد فراز نے اپنی نظمیں سنائیں اور فین تحسین۔ ان کے نارویجین تراجم پڑھے۔ یوں مشاعرہ اوسلو ۱۹۸۵ء کے سلسلہ میں ہونے والی تقریبات اپنے اختتام کو پہنچیں۔ یہ مشاعرہ گو ناروے بلکہ سکنڈے نیویا کی تاریخ کا پہلا مشاعرہ تھا لیکن اس کی یاد طویل عرصہ تک دلوں میں محفوظ رہ سکے گی۔

جوزف انور

دوسری قسط

"بُغدم چچا کا فوبیا"

بُغدم چچا کو سگ لیلیٰ عرف لیلیٰ نے کیا کاٹا کہ گھر میں کہرام مچ گیا۔ خیر سے ممتاز بیگم جانتی تھیں کہ سانپ کا کاٹا تو پھر بھی پانی مانگ لیتا ہے مگر انسان اور کُتّے کا کاٹا پانی بھی نہیں مانگتا وہ یہی جانتی تھیں کہ فوبیا ہو جانے پر انسان پانی سے ڈرنے لگتا ہے۔ وہ دل ہی دل میں دعائیں مانگنے لگیں۔ یا اللہ میاں کروسوتنوں کی نظر بد سے بچانا۔ خدا نہ کرے اگر انھیں کچھ ہو گیا تو وہ عین جوانی میں بے آسرا ہو جائیں گی اور جب بُغدم چچا کی حرکات و سکنات میں بھی انھیں قدرے تبدیلی نظر آئی۔ تو ہزاروں وسوسے پیدا ہونے لگے سوچا دیکھیں تو سہی میاں پر پانی سے کیا ردِ عمل ہوتا ہے۔

بُغدم چچا مہینے میں دو مرتبہ نہاتے تھے لیلیٰ کو کاٹنے سے ایک دن پہلے ہی وہ جسمانی طہارت سے فراغت حاصل کر چکے تھے۔ پنڈلی کے زخم بھی مندمل ہو چکے تھے پھر بھی ایک دن ممتاز بیگم ڈرتے ڈرتے بولیں۔

"اللہ نے آپ کو نئی زندگی بخشی ہے غسلِ صحت فرما لیجیے۔"

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا ارے مجھے کون سا فلیریا ہو گیا تھا جو غسلِ صحت کے لئے کہہ رہی ہو۔" بُغدم چچا نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔

"تمہیں میری قسم آج تو نہانا تم پر فرض بھی ہے۔"

"بکومت۔" بُغدم چچا نے پھر تڑاخ سے جواب دیا۔ اجی ہفتے میں دو دفعہ نہایا بھی لیتے تو کون سی آپ پر سے میل کی تین تہوں میں سے دو تہیں اُتر جائیں گی۔

بُغدم چچا خاموش رہے۔

ممتاز بیگم کی تشویش میں اور اضافہ ہو گیا۔ شام کو انھوں نے باورچی خانہ میں پانی گرم کیا۔ بُغدم چچا اس وقت شعر گوئی کے موڈ میں بیٹھک میں بیٹھے تھے آمد کا عالم تھا اشعار سیہ نیوں کی طرح نازل ہو رہے تھے ممتاز بیگم نے سلسلۂ آمد توڑتے ہوئے کہا۔ آپ نہا لیجیے۔ میں نے پانی گرم کر دیا ہے۔ "تم بھی کمال کرتی ہو بیگم ابھی چھ دن پہلے ہی تو نہایا ہوں۔ ڈبل نمونیہ ہو گیا تو غسلِ صحت غسلِ میت میں بدل جائے گا جبر یا ٹکو تم یہاں سے دفع ہو جاؤ۔ مجھے غزل مکمل کرنی ہے۔"

مگر ممتاز بیگم کی تشخیص کیسے نامکمل رہتی۔ انھوں نے پانی کی بالٹی لا کر بُغدم چچا کے سامنے رکھ دی۔ چلیے نہاتے نہیں تو بالٹی میں منہ ہاتھ دھو لیجیے بُغدم چچا اس وقت غزل کا مطلع کہہ رہے تھے۔ مقطع میں جو سکتہ پڑا! تو آگ بگولہ ہو گئے اور بالٹی کو ایک ایسی لات ماری کہ تمام پانی فرش کے ساتھ ان کے کاغذ پر بھی پھیل گیا۔

"ستیا ناس بیگم۔ تم نے میری حاصلِ مشاعرہ غزل پر پانی پھیر دیا۔"

"تو کون سا آپ کے ارمانوں پر پانی پھیر دیا۔" ممتاز بیگم بھی آپے سے باہر ہو گئیں۔ "نہانے کے لئے کہا تو بولا تھا کوئی چلو بھر پانی میں ڈوب مرنے کو تو نہیں بولا تھا صاف کیوں نہیں کہتے کہ پانی کاٹتا ہے پانی سے ڈر لگتا ہے۔"

"ہاں ہاں مجھے پانی سے ڈر لگتا ہے پانی مجھے کاٹتا ہے۔" بُغدم چچا کا سلسلۂ آمد آورد میں تبدیل ہو چکا تھا۔

ممتاز بیگم ایک دم سنجیدہ ہو گئیں۔ دل ہی دل میں کہنے لگیں۔ ہائے اللہ انھیں تو واقعی وہ ہو گیا ابھی تو شادی کو ایک ہی سال ہوا ہے ابھی تو اُن کی جہیز کی رقم کا سود بھی وصول نہیں ہوا۔ یہ موذی کاٹیاں تو گل پہ گل کھلا کر گلزار بنی بیٹھی ہیں مگر اُن کے اپنے کشتِ چمن کو تو ابھی

شادابی کے سوا اور ملا ہی کیا ہے۔

دوسرے دن ممتاز بیگم نے بڑی بیگم کے چھپن کو ہمارے پاس بھیجا کہ فوراً آکر سجانی میاں کو بلا لاؤ۔ ہم گندم چچا کے گھر پہنچے تو ممتاز بیگم نے چک کی آڑ سے کہا سجانی میاں ان پر نہ جانے کس چڑیل کا آنچل پڑ گیا یا پاگل کتے نے کاٹ لیا۔ آثار بھی خراب نظر آ رہے ہیں آپ انھیں ہسپتال لے جا کر سوئیاں لگوا دیجئے۔ میری تو یہ ایک بھی نہیں سنتے۔

شامت کو ہمارے بہت سمجھانے بجھانے بلکہ یوں کہئے کہ منت وسماجت کے بعد گندم چچا چودہ انجکشنوں کا کورس لینے پر آمادہ ہو گئے۔ مگر شرط یہ رکھی کہ روز ہم بھی اُن کے ساتھ ہسپتال جائیں گے۔

صبح جو گندم چچا کو لے کر ہم ہسپتال چلے تو ایک فرلانگ کا راستہ ایک گھنٹے میں طے کرتے کرتے ہمارے بھی چھکے چھوٹ گئے۔ بات یہ ہے کہ ہر دس قدم پر گندم چچا سے لغزش یا سرزد ہوتی اور ہمیں اُنھیں سہارا دے کر آگے بڑھانا ہوتا۔ آپ نے برڈواچر کا نام تو سنا ہوگا مگر آج ہمارا سابقہ ایوواچر سے پڑا تھا۔ گندم چچا کی آنکھیں گویا راڈر اسکرین جہاں کوئی طیارہ حضرت کے راڈر اسکرین کے دائرہ گرفت میں آتا کہ حضرت کی آنکھیں گرگٹ کی طرح پھیلنے سکڑنے لگتیں اور حضرت وہیں کھڑے ہو جاتے۔ تھوڑی ہی دیر میں ہمارا بھی یہ عالم ہو چکا تھا کہ جہاں حضرت کی ذرا سی بھی چال لوٹتی تو ہم گھبرا کر دائیں بائیں آگے پیچھے دیکھتے اور ہوتا بھی یہی کہ کبھی کوئی جیٹ نظر آتا تو کبھی کوئی بینٹ۔ ہم دل ہی دل میں گھبرا رہے کہ اگر اسی طرح ہم چودہ دن اس ہیر کا راڈار عشق کے ساتھ چلے تو چودہ تو کیا چار ہی دن میں اپنی کمر ٹیک جائے گی۔

خدا خدا کر کے ہسپتال پہنچے۔ ڈاکٹر نے چودہ انجکشنوں کا کورس لکھ دیا۔ چونکہ گندم چچا انجکشن سے بہت گھبراتے تھے لہذا ہمیں بھی انجکشن روم ساتھ لے گئے۔ ابھی گندم چچا نے انجکشن روم میں پہلا ہی قدم رکھا تھا کہ وہ ٹھٹھک کر کھڑے ہو گئے اور آنکھیں گرگٹ کی طرح اور سکڑنے لگیں۔

یا الٰہی خیر کہہ کر جو ہم نے کمرے میں جھانکا تو ایک حسین و جمیل نرس کمرے میں مریضوں کو انجکشن رہی تھی۔ تین چار مریضوں کے بعد نرس نے گندم طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"چلو بڑے میاں اب تمہارا نمبر ہے"

اس اندازِ تخاطب پر پہلے تو گندم چچا چونک اُٹھے پھر بچھیں ہوتے ہوئے بولے "محترمہ آپ کو ہماری داڑ مغالطہ ہو گیا ہے۔ ابھی تو ہماری عمر ہی کیا۔ صرف پچپن سال ہے ماشاء اللہ ابھی تو ہم گبرو ہیں"

"دیکھو مسٹر گبرو ہم نے تمہاری عمر نہیں پوچھی۔"

گندم چچا پھر بھڑک اُٹھے "دیکھئے محترمہ اس عم پر بد کلامی زیب نہیں دیتی آپ کو نہیں معلوم کہ اس آپ کو کس کا شرفِ نیاز حاصل ہے ہم شاعرِ جمال میم۔ لون سمرقندی ہیں"

نرس سمجھ گئی کہ آج اُس کا پالا کسی مردِ مومن سے چنانچہ مسکراتے ہوئے بولیں "دیکھئے مسٹر آپ قاف لام میم ہوں کہ ح۔ عین، دال، یہ ہسپتال ہے امام نہیں۔ چلو پلنگ پر لیٹ جاؤ۔"

"تم ہی کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے" کا مصرع د ہوئے گندم چچا پلنگ کی طرف لپکے اور لیٹتے ہوئے ا پاجامے کے ناڑے پر ہاتھ ڈالا۔

"وہاں نہیں انجکشن پیٹ پر لگے گا" نرس نے تن کر کہا۔

گندم چچا نے کرتا اوپر کیا۔ تو نرس نے چشم زدن انجکشن ٹھوک کر بانک لگائی "چلو کھڑے ہو جاؤ"

مگر گندم چچا اتنی آسانی سے کہاں شکست ماننے وا تھے "سبحان اللہ کیا ہلکا ہاتھ ہے ماشاء اللہ آپ کا با ہے کہ گلِ بنفشہ مزہ آ گیا۔ اگر اللہ نے موقع دیا تو دا

الوں کا آپریشن بھی آپ کے ہاتھوں کراؤں گا۔
نرس مسکرا کر رہ گئی۔

چودھویں دن تو چودھویں کا چاند آنکھوں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ گندم چچا کا پیٹ ہی نہیں دل، جگر، جان سب چھلنی ہو چکے تھے۔

ایک ماہ آہ و زاری میں گزر گیا۔ اسی اثنا میں گندم چچا کو تقریب ملاقات کے لئے نہایت عجیب و غریب ترکیب سوجھی راستے چلتے انھیں جو بھی کتا نظر آجاتا اسے شو شو کرتے اور اپنی پنڈلی پر ہاتھ مارتے۔ ہوتا یہ کہ یا تو کتا دُم دبا کر بھاگ جاتا یا کسی چلتے راہ گیر کو کاٹ کھاتا اور گندم چچا کلیجہ مار کر رہ جاتے۔

ایک شام گندم چچا ہمارے ساتھ سیر کو نکلے تو دیکھا ایک زبردست ڈیل ڈول کا کتا تنہا درجنوں کتوں سے مقابلہ کر رہا ہے۔ جو بھی کتا اس کی جھپٹ میں آتا میں..... میں کرتے ہوئے دُم دبا کر بھاگ جاتا

مل گیا مل گیا آج میرا شیرا مل گیا کا نعرہ لگاتے ہوئے گندم چچا کتوں کے بیچ میں کود پڑے۔ دوسرے تمام کتے تو گندم چچا کو دیکھتے ہی بھاگ گئے مگر شیرا کھڑا رہا۔

غر... ر... ر... ر گندم چچا نے شیرا کو مقابلے کے لئے للکارتے ہوئے کہا۔

غر... ر... ر... ر۔ شیرا بھی گندم چچا کے چیلنج کو قبول کرتے ہوئے خوفناک صورت بنا کر سامنے کھڑا ہو گیا۔

دفعتہً گندم چچا نے جست لگائی اور شیرا کی گردن پر سوار ہو کر پہلے تو اسے ایک گھونسا رسید کیا پھر اس کے جبڑے کھول کر اس کے منہ میں اپنی پنڈلی دے دی۔
شیرا کی زندگی میں ایسا جارحانہ حملہ اس پر کسی نے نہیں کیا تھا۔ بوکھلا کر اس نے سوچا کہ شیرا آج بچہ کا بھی ہاتھ اس کے دارو غہ کے پیچھے پڑ گیا۔ کا بھی ہاؤس کا خیال آتے ہی شیرا اس بری طرح سے تڑپا کہ گندم چچا کی گرفت ڈھیلی پڑی۔ گرفت ڈھیلی پڑتے ہی شیرا ٹیں ٹیں کرتے ہوئے بھاگا پیچھے مڑ کر دیکھنے تک کا نام نہ لیا۔

وہ بھاگ گیا نا مختون کہیں کا"۔ گندم چچا نے کفِ افسوس ملتے ہوئے کہا۔
سڑک پر اچھا خاصہ مجمع لگ چکا تھا لوگ حیران تھے کہ گندم چچا کو یہ کونسی نئی قسم کا فوبیا ہو گیا ہے مگر یہ فوبیا کس قسم کا تھا اس کا علم ہمیں ہی تھا۔

بقیہ: اپنا دامن اپنی آگ

اس میں جھلسا دینے والی آگ کے بھڑکتے شعلے نہیں، میٹھی میٹھی آنچ کی مسرور کن تپش ہوتی ہے ―― اب ذرا سنبھل کر چلنا ورنہ زندگی بھر محبت کی خواہش کے لئے تڑپتی رہو گی۔"

(پیاسی روحیں)

کیول دھیر ہمارے معاشرے کے ان مسائل پر قلم اٹھاتے ہیں جن کا تعلق انسان اور انسانیت سے بہت ہی گہرا ہوا کرتا ہے۔
"اپنا دامن اپنی آگ" کے تمام افسانوں کا اختتام انسان پرور ہے۔ محبت کی ڈور سے یہ افسانے گہرائی کے ساتھ اس دھرتی اور اس میں سانس لیتی ہوئی رواں دواں زندگی سے جڑے ہوئے ہیں۔
کیول دھیر کے افسانوں کا درد نا میں موج تہ نشیں کی مانند درد، کسک، تڑپ اور دھڑکتے ہوئے انسانی دلوں کی ٹیس نمایاں ہو کر ان افسانوں کی فنی قدر و قیمت میں اہم اضافہ کر دیتی ہیں۔
کیول دھیر کا اندازِ بیاں خوشگوار، سادہ، سلیس، رواں دواں اور بڑا ہی شگفتہ ہے۔ وہ کرداروں سے حسب حال مکالمے ادا کروا کے اس میں متحرک زندگی کے رنگ بھر دیتے ہیں۔
"اپنا دامن اپنی آگ" اردو افسانہ نگاری میں خوشگوار اضافہ ہے۔ میں اس کا افسانوی دنیا میں استقبال کرتا ہوں اور اسے پڑھنے کا آپ کو مشورہ دیتا ہوں۔
بڑے سائز کے ۱۷۲ صفحات، بہترین کاغذ، عمدہ چھپائی و دیدہ زیب کتابت ملاحظہ کیجئے گلشن کر آپ تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ قیمت ۲۰ روپیہ

[illegible]

دو غزلیں

ڈاکٹر حقیر آستانی
ڈبل ایم اے - ایل - ایل بی - پی ایچ ڈی
(ڈی ایس اے)

طرب تم ہو، سرورِ دل تم ہو، سکونِ بے فغاں تم ہو
ترنم آبشاروں کا، خموشی کی زباں تم ہو
اُجالا تم، اندھیرا تم، عیاں تم ہو، نہاں تم ہو
بشکلِ گردشِ دوراں، رہِ وقتِ رواں تم ہو
زمیں تم، آسماں تم ہو، نشانِ بے نشاں تم ہو
قریب از رگِ دل ہو، بعید از کہکشاں تم ہو
نظر تم ہو، نظارہ تم، یہاں تم ہو، وہاں تم ہو
کہیں شعلہ، کہیں شبنم، کہیں برقِ تپاں تم ہو
مدرس تم، سبق تم، ممتحن تم، امتحاں تم ہو
نمودِ کامرانی تم ہو، سعیِ رائگاں تم ہو
تمہی تم ہو ہواؤں میں، فضاؤں میں، خلاؤں میں
حقیقت تم، فسانہ تم، حکایت، داستاں تم ہو
تماشہ گر، تماشائی، تماشہ بھی تمہی سے ہے
کہ اب ہو داورِ کون و مکاں، اب لامکاں تم ہو
مفر ہی نہ ہوں جیسے حدیثِ سیلِ تلوّن کی
ابھی تم ذرۂ خاکی، ابھی دونوں جہاں تم ہو
مسیحائی مسیحوں کی، فقیروں کی زبوں حالی
غرورِ مہوشاں تم ہو، نیازِ میکشاں تم ہو
ذرا بھی غم کی شدت میں، کمی بیشی نہیں ہوتی
اس ابدی پیاس کے مختار تم، پیرِ مغاں تم ہو
ہمارے درمیاں پردہ، نہ واجب ہے، نہ ممکن ہے
کہ سب کے راز تم، ہمراز تم ہو، رازداں تم ہو
اُسے افسوسِ ماضی، فکرِ فردا، آج کا غم کیا
کہ جس کے حال پر اے جانِ جاناں، مہرباں تم ہو
چلو مانا، حقیر بے نوا، تم ہیچ ہو، لیکن
کبھی رعبِ تکلم تم ہو، کبھی زورِ بیاں تم ہو

غبارِ دل کے بشکل کتاب نکلے ہیں
سوال بن کے خود اپنا جواب نکلے ہیں
ہماری کھوج میں شاید کمی رہی ہو گی
ہمارے شوق بھی، کچھ بے حساب نکلے ہیں
نہ جانے کتنے ارادے، نہ جانے کتنے اصول
ذلیل ہو کے یہاں، خراب خواب نکلے ہیں
ضمیر جن کا مفاد کے سدِّ راہ نہ تھا
وہ لوگ دیکھا، بہت کامیاب نکلے ہیں
خلوص، مہر و مروّت، وفا، رواداری
ہمارے حق میں تو خانہ خراب نکلے ہیں
مُدام، ایک گرہ سی لگی ہوئی باقی
کہیں حیات کے سب پیچ و تاب نکلے ہیں
کسی کی بزم نہیں ہے یہ خلوتِ دل ہے
تمام چہرے یہاں، بے نقاب نکلے ہیں
خرید کر انھیں لایا گیا تھا کن داموں
جو طاق طاق یہاں، آفتاب نکلے ہیں
ہماری پیاس تو اک بوند ہی سے مٹ جاتی
یہ کس خیال میں اتنے سراب نکلے ہیں
کٹے ہیں گردشِ دوراں نے رت جگے لاکھوں
نصیب اپنے ہی کچھ کم خواب نکلے ہیں
کیا تھا زہد کا دعویٰ تو پھر یہ کیسا ہوگا
ادھر تو قبلہ غرقِ شراب نکلے ہیں
نظر لگے نہ کسی کی خدا کرے اب تو
کسی کی آنکھ کا ہم انتخاب نکلے ہیں
ملے تھے یوں ہی سرِ راہ آج حقیر ہم سے
سنا ہے برسوں میں، گھر سے جناب نکلے ہیں

اپنا دامن اپنی آگ ۔ افسانوی ادب میں خوشگوار اضافہ

(احمد رجمال پاشا ۔ سیوان بہار)

اُردو کے جدید افسانوی ادب میں ڈاکٹر کیول دھیر کی شخصیت ممتاز اور نمایاں ہے ۔ اُردو افسانے کی بنیادی جہت رومانی ہے ۔ جو روزِ اوّل سے افسانے اور افسروں کی محرک رہی ہے اور رہے گی کرشن چندر اے حمید اور اشفاق احمد کے ساتھ ڈاکٹر کیول دھیر کا نام ہمیشہ بڑے احترام کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے ۔

ڈاکٹر کیول دھیر کی شخصیت اُردو دنیا کے مقبول عام ادبی رسائل میں اپنے افسانوں کی وجہ سے ممتاز نظر آتی ہے ۔ اور اب رومانی افسانہ نگاری میں وہ سند کا درجہ رکھتے ہیں وہ افسانوی دنیا میں اب تک ہر اعزاز اور انعام سے نوازے جا چکے ہیں ۔

" اپنا دامن اپنی آگ " میں پندرہ افسانے شامل ہیں جو چار مختلف عنوانات کے تحت ہیں ۔ پنجاب کی کہانیاں دیش کی کہانیاں ، سماج کی کہانیاں اور پیار کی کہانیاں پنجاب کی کہانیوں میں تین ، دیش کی کہانیوں میں چار ، سماج کی کہانیوں میں تین اور پیار کی کہانیوں میں ، پانچ افسانے شامل ہیں ۔ پنجاب کی کہانیوں کی ابتدا خوف دہشت ، نفرت اور قتل و غارت سے ہوتی ہے ۔ یہ کہانیاں بڑی خوشگوار ، اصلاحی اور مقصدی ہیں ان میں انسانیت کا گہرا پیغام ملتا ہے ۔ وہ بہ حیثیت ایک ماہر سرجن کے معاشرے کا آپریشن کر کے اسے صحت بخشنا چاہتے ہیں ۔ اور امن ، سکون ، بھائی چارے کے علمبردار بن کر اُبھرتے ہیں ۔

" رشتوں کی پہچان " میں انسانی خون کو بنیادی رشتہ قرار دے کر وہ آفاقیت کا تصور اُبھارتے ہیں ۔

...... " یہ مت بھولنا کہ اس گھر کے در و دیوار میں ندیم کی سانسوں کی خوشبو بسی ہوئی ہے ۔ یہ خوشبو وہ ہے جو تمہارے دل و دماغ میں موجود ہے اور تمہارے خون کی لالی میں بھی نمایاں ہے ۔ " گرودیو نے ندامت سے اپنا سر جھکا لیا تھا ۔ اُس رات ایک بھی گھر جلا نہیں تھا ندیم کے لہو کی خوشبو محبت بن کر ماحول میں بکھر گئی تھی ۔ "

(رشتوں کی پہچان)

کیول دھیر بڑے خلاق و شاداب ذہن کے مالک ہیں اُن کے ذہن پر معاشرے میں بکھری ہوئی ہلکی سی لغزش میں اُبھر جاتی ہے ۔ جسے وہ قصے کے تانے بانے میں بُن کر جیتے جاگتے افسانے کی شکل میں پیش کر دیتے ہیں ۔ اس میں ہر انسان اپنا عکس دیکھ سکتا ہے ۔ کیول دھیر خواہ دیش کی کہانیاں لکھیں یا سماج کی ، اُن کی نظریں واقعات کی تہہ تک پہنچ جاتی ہیں ۔

کیول دھیر نے " کمپٹیشن " میں یہ دکھانے کی سعی کی ہے کہ ایک دوسرے پر فوقیت حاصل کرنے کے لئے معاشرے میں کیسے کیسے حربے اختیار کئے جاتے ہیں اگر وہ عورتیں ہوں تو بازی لے جانے کے لئے جسمانی نمود و نمائش کے ساتھ جنسی نمائش تک سے گریز نہیں کرتیں ۔ جس کی خوبصورت مثال یہ افسانہ ہے ۔

پیار و محبت کی کہانیاں کیول دھیر کا اصل میدان ہے ان کا پیرایۂ اظہار بے حد دلچسپ اور دلکش ہے ۔ یہ محبت کی نزاکت و لطافت سے آشنا ہیں

..... محبت ایسی چیز نہیں ، جو خواہشات کو بھڑکا کر ہیجانی کیفیت پیدا کر دے ۔ محبت وہ عظیم و مقدس جذبہ ہے ۔ جو جذبوں میں ہلچل تو پیدا کرتا ہے ۔ لیکن اس ہلچل میں ہیجان نہیں ۔ ٹھہراؤ ہوتا ہے ۔

"خونِ جگر" اور اُس کا مصنف

امر چند قیس

"خونِ جگر" حضرت جگر جالندھری کا تیسرا مجموعۂ کلام ہے۔ جو زیورِ طبع سے آراستہ ہوکر ہمارے سامنے آیا ہے۔ پہلے دو مجموعہ ہائے کلام "سوزِ جگر" اور "لختِ جگر" کی طرح اسے بھی حکومت اور مختلف ادبی انجمنوں کی طرف سے اعزاز و انعامات عطا ہوئے ہیں۔ "خونِ جگر" کو بھی قبولِ عام کی سند حاصل ہو رہی ہے۔

جگر جالندھری شاعری کے دبستانِ ملسیانی سے وابستہ ہیں۔ جس کے بانی ابوالفصاحت قبلہ جوش ملسیانی تھے۔ جو حضرت داغ دہلوی کے آخری جانشین تھے۔ جگر صاحب نے جوش صاحب کے علاوہ اُن کے ایک سرکردہ شاگرد جناب ساحر سیالکوٹی سے بھی استفادہ حاصل کیا۔ اُن کی رہنمائی میں مشقِ سخن جاری رکھتے ہوئے جگر فارغ الاصلاح ہوئے۔ اگر انھیں ساحر سیالکوٹی صاحب کا جانشین کہہ دیا جائے تو اس میں نہ مبالغہ ہوگا نہ غلط۔

جگر اعلیٰ تعلیم یافتہ، بلند مرتبہ انسان ہیں۔ اس لئے بلند پایہ شاعر بھی۔ مختلف زبانوں کی ادبیات کا وسیع مطالعہ رکھتے ہیں۔ عروض سے بھی واقف ہیں اُن کا کلام اغلاطِ زبان اور اصولِ فن کا پابند ہے۔ نقائص سے پاک حسن سے مالا مال۔ جس میں فصاحت و بلاغت پہلو بہ پہلو نظر آتی ہیں۔ وہ پنجاب کے نوجوان شعرا کے محبوب رہنما ہیں اور اُن کی شہرت کی خوشبو ہندوستان بھر کے مختلف صوبوں کے علاوہ پاکستان میں بھی پھیلی ہوئی ہے۔ ریڈیو اور دُور درشن کے علاوہ دوسرے آل انڈیا مشاعروں میں اُن کا کلام شنا۔ پیش کش محفل پر چھا جاتی ہے۔ زبان کا استعمال خیالات کے مطابق ہوتا ہے۔ گمراہی کے اس دور میں وہ ثابت قدم رہے ہیں۔ قدامت اور روایت کی بنیادی اقدار کے ساتھ جدید تقاضوں کو بھی مدِ نظر رکھتے ہیں۔

جناب جگر کے کلام میں اُلجھنیں نہیں ہوتیں۔ صفائی، روانی، شگفتگی اس کا خاص وصف ہے، جوش، سادگی اور جدت اس میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ جن کی مجموعی کیفیت کا نام تاثیر ہے۔ جس کے بغیر شعر غرابت ہوکر رہ جاتا ہے۔ قارئین "خونِ جگر" کے مطالعہ سے محسوس کریں گے کہ اس میں لطافت، ندرت، نزاکت، نفاست، درد اور حلاوت سبھی کچھ موجود ہے۔ اُن کی ترکیبیں شستہ ہوتی ہیں اور اندازِ سخن بوسیدگی سے پاک اور رنگِ تغزل طفلانہ نہیں ہوتا۔ غزلوں میں تیر و نشتر اکثر مل جاتے ہیں جو بغیر یاد کئے یاد ہو جاتے ہیں۔ جہاں وہ عام فہم ہیں وہاں خاص پسند ہیں۔ نثر کے نزدیک ہوتے ہیں۔ سنتے ہی دل میں اُتر جاتے ہیں۔ اُن کی "حسنِ آمد" قابلِ داد ہے۔ یہ "آورد" سے سراسر دُور ہیں۔ ملک بھر کے نامور رسائل اور اخباروں میں اُن کا کلام بلا ناغہ نہایت احترام سے شائع ہوتا ہے۔ وہ اعزازات وغیرہ سے قطعاً بے نیاز ہیں۔ مختلف اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کرتے ہیں لیکن غزل اُن کا دوامی مشغلہ ہے۔ جسے وہ شاعری کا وقار سمجھتے ہیں۔

"خونِ جگر" صرف غزلیات پر مشتمل ہے۔ مسلسل غزل سے آغازِ "حمد" ہوتا ہے۔ پھر یہ مجموعہ اختتام پذیر ہے۔ ایکتا کے ساتھ جو حمد کی طرح مسلسل غزل ہی ہے۔ غزلیات کے بعد دوسرے حصّے میں منتخب اشعار بھی درج ہیں۔

اب میں اپنے بیان کی تائید میں چند شعر پیش کرتا ہوں مجھے یقین ہے کہ ان کے مطالعہ سے قارئین میرے ہمخیال ہوں گے۔ سارا مجموعہ پڑھیں گے تو اُن کے ذوقِ ادب

کی تسکین ضرور ہوگی ۔ اشعار کی تشریح کی ضرورت نہیں ۔ یہ اپنی تشریح آپ ہیں ۔ بلکہ میرا یقین ہے کہ یہ جذبات کے نازک آئینے تو صحیح کے لمس سے ٹوٹ جائیں گے ۔ ویسے بھی یہ احساس سے تعلق رکھتے ہیں ۔ آپ ان اشعار کو ملسیانی دبستان کے نمائندہ پائیں گے ۔

پہلے دو مقطع ملاحظہ فرمائیے ! ۔

خلشِ دِل سے بھی تو ہو سکتی ہیں سُرخ آنکھیں جگرؔ !
ہم نے ساغر ہی پئے ہوں یہ ضروری تو نہیں

جگر کے خون سے آنکھوں میں سُرخ ڈورے ہیں
سمجھ رہا ہے زمانہ شراب خوار مجھے

پڑھئے اور سر دُھنئے ۔ اب اشعار : ۔

یہ دل کا آئینہ اب توڑنے کے قابل ہے
دِکھائی دیتا نہیں ، اس میں کوئی یار مجھے

اک ات کی بات کہ وہ بچھڑے تھے ہم سے
اُس دن سے وہیں کی وہیں وہ رات کھڑی ہے

ہمارا حال سُن کر وہ اگر اتنے پریشاں ہیں
ہمارا حال دیکھیں گے تو ان کا حال کیا ہوگا

غیر ممکن میرا جینا ہے محبت کے بغیر
پانچ حرف اس کے جو ہیں ۔ پانچ عناصر ہیں مرے

ڈال کر عکس وہ آئینے میں بھر دیتے ہیں رنگ
ورق سادہ کو تصویر بنا دیتے ہیں

مری خودداریوں نے عشق کی دُنیا بدل ڈالی
بنا ہوں منتظر سے منتظر آہستہ آہستہ

یہ علم مجھ کو بعد ملاقات ہی ہوا
جس کی تلاش تھی وہ کوئی دوسرا نہ تھا

دل تڑپتا ہے اس کی صورت کو
جس کی صورت سے رُوشناس نہیں

میں تو اس اُمید پر آیا تھا تم پونچھو گے آنسو
تم تو خود ہمراہ میرے اشک ٹپکانے لگے

حسرتوں کا ہوگیا ہے اس قدر دل میں ہجوم
سانس رستہ ڈھونڈتی ہے آنے جانے کیلئے

کوئی جمال دیکھنے والا نہیں رہا
پچھتا رہے ہیں وہ مری آنکھیں نکال کر

مُنہ پھیر کے محفل میں اُدھر بیٹھنے والے !
بیٹھے ہیں ترے طالبِ دیدار اِدھر بھی

تُو اگر پیاسا ہے ۔ دریا سے نہ پانی کی بُوند
اپنی خودداری کو قائم رکھ کنارے کی طرح

سب زندگی کو کہتے ہیں اک دردِ سر مگر
مرنے کے واسطے کوئی تیار بھی نہیں

جب ہزاروں ولولے تھے ۔ وہ تھے ہم سے بے نیاز
جب ہوئے وہ مہرباں ۔ دل میں کوئی ارماں نہ تھا

سُننی ہی پڑے گی تمہیں ۔ سُننی ہی پڑے گی
آوازِ محبت ہے یہ ۔ آوازِ محبت

مجھے یقینِ واثق ہے کہ قارئین میرے ان خیالات کی تائید کرنے میں بخل سے کام نہیں لیں گے ۔ جن کا اظہار میں نے "خونِ جگر" اور اس کے مصنف کے متعلق کیا ہے جانتا ہوں جگرؔ انسان ہیں ۔ انسان سے غلطیاں ہو سکتی ہیں ۔ مگر یہاں اُن کا امکان کچھ کم ہی ہے ۔

" خونِ جگر" ۱۶۰ بڑے صفحوں پر مشتمل ہے ۔ کتابت عمدہ ہے ۔ طباعت دیدہ زیب ۔ کاغذ بڑھیا ۔ جلد پختہ سرورق کئی رنگوں کا ۔

قیمت صرف ۔ /۲۵ روپے جو معقول ہے ۔

غرض ۔

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ مے نگرم
کرشمہ دامنِ دل مے کشد کہ جا اینجاست

ملنے کا پتہ : ۔

دفتر ماہنامہ شانِ ہند ۔ فلیٹ ۸ انصاری مارکیٹ ۔ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

محمد مشتاق شارق میرٹھی

"زاویہ ہائے نگاہ"

"زاویہ ہائے نگاہ" جناب ضیاء فتح آبادی کے نثری مضامین کا پہلا قابلِ قدر مجموعہ ہے۔ (اس میں مضامین معاصرین کی فکری کاوشوں پر بطور تبصرہ لکھے گئے ہیں)۔ راقم الحروف کی رائے میں یہ مضامین دوامی قدر و قیمت کے حامل ہیں۔ جب بھی اس عہد کی ادبی تاریخ مدوّن ہوگی۔ ان مضامین کے بعض حصوں سے اخذ و استفادہ کیا جائے گا۔

جناب ضیاء فتح آبادی نے اپنے محاکموں میں تنقید کے معیاروں کو اس طرح پیش نظر رکھا ہے کہ کہیں ذاتی تعصب نہیں جھلکنے پایا۔ ان کے تبصرے بھرپور اور بے لاگ ہیں۔ احسن پر جو مضمون ضبطِ تحریر میں لایا گیا ہے وہ خاص طور سے جملہ اوصاف کا حامل ہے۔ اہلِ علم حضرات کو احسن اور سیماب کی ادبی معرکہ آرائی ابھی یاد ہوگی۔ مرحوم احسن نے علامہ سیماب کی گرانقدر تصنیف "دستور الاصلاح" پر جس انداز سے نکتہ چینی کی تھی۔ اس کا تقاضا تھا کہ جناب ضیاء فتح آبادی اس سے متاثر ہو کر احسن صاحب پر خامہ آرائی کرتے۔ مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ انھوں نے جہاں احسن کی عروض دانی کو سراہا ہے وہیں بقول جگدیش بھٹناگر حیات "اس حقیقت کے انکشاف سے گریز نہیں کیا کہ عروضی واقفیت اچھے شعر کی تخلیق میں معاون نہیں ہو سکتی۔" اس کے ساتھ مندرجہ بالا تلخ معرکہ آرائی میں احسن کی پاکیزگیٔ طبیعت پر کس انداز سے روشنی ڈالی ہے پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس اختلافِ رائے کی توجیہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"علامہ موصوف کی مخالفت میں احسن کے دل میں وہ جذبۂ عصبیت کارفرما تھا جو انھیں اپنے بزرگوں سے ملا تھا اور ان کو علامہ کی وہ ادا پسند نہ آئی جس کے تحت انھوں نے اپنے بزرگوں کی اصلاحوں میں غلطیاں نکالی تھیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا۔ تو شاید وہ اپنی مخالفت علامہ کی وفات (جنوری ۱۹۵۱ء) کے بعد بھی جاری رکھتے مگر ان کا ایسا نہ کرنا دلیل ہے اس بات کی کہ وہ دراصل علامہ موصوف کو اپنے استاد کا درجہ دیتے تھے۔ اور ان کی اتنی ہی قدر و عزت کرتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے علامہ کی وفات کے بعد 'احسن' کا ایک شمارہ (سیماب نمبر) کے طور پر شائع کیا تھا۔" ص ۴۷

ایسا ہی بے ریا انداز جناب ضیاء فتح آبادی نے اس مقام پر اختیار کیا ہے۔ جہاں انھوں نے عرش ملسیانی مرحوم کی شخصیت کی ایک نفسیاتی خامی کو نمایاں کرتے ہوئے لکھا ہے۔ لکھتے ہیں:-

"... ایک روز میں کنول انبالوی کے سکوٹر کے پیچھے بیٹھ کر عرش کی مزاج پرسی کے لیے ان کے مکان پر پہنچا۔ وہ بیمار تھے۔ اور بستر سے اٹھنے سے معذور۔ جب ہم چلنے لگے۔ تو میں نے ان سے چند سطریں، تحریر کے [illegible] نمبر کے لئے لکھنے کی درخواست کی، جسے انھوں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ "تندرست کا ہو جانا پہلے ضروری ہے۔" بعد ازاں مجھے اوم پرکاش بجاج کی زبانی معلوم ہوا۔ کہ بیمار سے اٹھ جانے کے بعد عرش نے بذاتِ خود مالک رام سے ٹیلیفون پر بات کی اور جب مالک رام نے اپنے ارادے کی تصدیق کر دی تو عرش نے ان سے پوچھا "کیا ضیاء کے علاوہ آپ کو کوئی دوسرا شاعر نظر نہیں آیا" اگر میری جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو شاید اس فقرے کے تخریبی اور تضحیکی

باقی ص ۳۲ پر

قسط ۹

دھرتی کانپ اٹھی

احمد حسین شمس ایڈوکیٹ کشن گنج

کشن لال نے سلیم کو دیکھ کر حسین بخش سے کہا "سلیم بہت بیمار معلوم ہوتا ہے"

"ہاں تو یہی تو اس نے عقلمندی کی ہے مگر دلاور خان ...رار ہونے سے کہاں بھاگ کر جانے والا تھا۔ دلاور نے اسے ...قع واردات پر پکڑ لیا۔ یہی پانچ چھ آدمی پکڑے باقی ...رار ہو گئے مگر دلاور انھیں چہرے سے پہچانتا ہے۔"

"داروغہ صاحب نے کہا۔ ان بدمعاشوں کو میں اچھی ...رح جانتا ہوں۔ میاں صاحب یہ لوگ کوئی کام بغیر وکیل مختار ...ے مشورہ کیے نہیں کرتے۔ کسی وکیل نے رائے دی ہوگی ...ھ تم بیمار ہو کسی طرح تم یہ کام جا کر کر آؤ پھر تو میں الی... ثابت کر ہی دوں گا اور میاں سلیم سمجھتے کہ ...گئے اپنے وکیل کی باتوں میں مگر یہ معلوم نہیں کہ ان کا ...ب اسی تھانے میں رہتا ہے" اور پھر داروغہ صاحب نے ...و چار غلیظ غلیظ گالیاں سلیم اور اس کے ساتھیوں کو ...ے ڈالیں۔

سلیم نے کہا۔ "خدا سب کچھ دیکھتا ہے ایک دن سب ...اس کے دربار میں حاضر ہونا ہے۔"

حسین بخش نے داڑھی سہلاتے ہوئے کہا "اچھا آپ کو خدا کا بھی خوف ہے" اور پھر میاں صاحب نے ...روغہ کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھا داروغہ صاحب نے ...ب سپاہی کو آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ اشارہ کیا وہ سپاہی ...ا اور دو تین تھپیڑ سلیم کی پیٹھ پر جما دیئے۔ سلیم تلملا کر ...لیا زبان سے چیخ نکلی اور پیٹھ سے خون بہہ نکلے اور ...کی قمیص سرخ ہو گئی دوسرے قیدی سہم کر رہ گئے کشن ...نے نفرت سے آنکھیں پھیر لیں اور حسین بخش قہقہہ ...ر ہنسنے لگے۔

کشن لال نے داروغہ سے پوچھا "اب کیا ارادہ ہے داروغہ صاحب؟"

"ان سالوں کو اگر تین تین سال قید با مشقت کی سزا نہ دلوا دوں تو پھر میرا نام کے بی اگروال نہیں ۳۶۰ کا مقدمہ کوئی معمولی مقدمہ نہیں ہو سکتا۔ اس کا فیصلہ سیشن میں ہوتا ہے بڑا سنگین جرم ہے کشن لال اب میں تحقیقات شروع کروں گا جب تک ان کے اور ساتھی گرفتار نہ ہو جائیں میں چارج شیٹ نہ دوں گا" داروغہ صاحب حسین بخش کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔

کشن لال نے پوچھا "گواہوں کے بیانات قلمبند ہو چکے"

"ابھی تک تو صرف اطلاع اول قائم ہوئی ہے ان ویسٹی گیشن کل سے شروع کروں گا۔ دیکھوں اس علاقہ کے بدمعاش کہاں بھاگ کر جاتے ہیں" داروغہ صاحب نے کہا

حسین بخش بول اٹھے "ان بدمعاشوں نے تو ناک میں دم کر رکھا ہے اس سال میں نے حج کا ارادہ کیا تھا مگر اب دیکھتا ہوں یہ کمبخت مجھے جانے نہ دیں گے"

داروغہ صاحب نے کہا "سوشلسٹوں اور کمیونسٹوں نے ان کسانوں کے دماغ آسمان پر چڑھا رکھے ہیں"

حسین بخش کھلکھلا کر ہنس دیئے اور کہا "... داروغہ صاحب آپ نے یہ سوشلسٹ کیا کہتے ہیں دھن اور دھرتی بٹ کے رہے گی خدا کی مشیت میں دخل دینا چاہتے ہیں یہ سب"

داروغہ صاحب نے ایک فرمائشی قہقہہ لگا کر کہا "بھئی دیکھئے ان لوگوں کو جب تک کانگریس برسر اقتدار ہے یہ سوشلسٹ اور کمیونسٹ کتوں کی طرح بھونکتے ہی رہیں گے"

کشن لال پوچھ بیٹھے "اور جب کانگریس شکست کھا گئی؟"

حسین بخش نے کہا "سوشلسٹ تو ہوائی باتیں کرتے ہیں بھلا دھن اور دھرتی بھی کہیں [illegible] سکتی ہے یہ تو اللہ کا دین ہے جسے چاہے دے"

"یہ سب تیین نعرے ہیں" داروغہ صاحب نے کہا۔ "یہی سب بے معنی نعرے لگا لگا کر تو روسی ایجنٹ اپنی پارٹی مضبوط کرنا چاہتے ہیں علاقے کے غریب اور جاہل عوام ان کی باتوں میں آجاتے ہیں اور پھر یہ کمبخت ایسے ایسے بڑبولے ہانک چلتے ہیں کہ بس تو یہ ہی بھلی سچ پوچھئے تو یہ ڈاکوؤں کی ٹولیاں ہیں جو سیاسی نام دے کر لوگوں کو بدنام کر رہی ہیں ابھی حال ہی میں ایک جگہ ڈکیتی ہوئی بہت سے کمیونسٹ پارٹی کے سرگرم کارکن گرفتار ہو گئے دو دو سال تین تین سال کی سزا ہو گئی ان لوگوں کو۔ حکومت کو چاہئے کہ ان پر پارٹیوں پر پابندیاں عائد کر دے"

"جبھی تو علاقے میں شانتی برقرار رہ سکتی ہے" میاں صاحب نے کہا۔

اتنے میں دلاور خاں نے آکر کہا۔ حضور ناشتہ تیار ہے تینوں اٹھ کر دوسرے کونے میں گئے اور ناشتہ کرنے لگے۔ کشن لال نے پوچھا "داروغہ صاحب کیا یہ مقدمہ چل کر رہے گا؟"

حسین بخش نے متعجب ہو کر کشن لال کی طرف دیکھا اور پوچھا "تمہارا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ منگلو سے مجھے ساری باتیں معلوم ہو چکی ہیں"

بس فوراً میاں حسین بخش نے اپنا پاؤں بڑھا کر کشن لال کے پاؤں کو دبایا کشن لال نے حسین بخش کی طرف دیکھا حسین بخش نے کہا "اگر منگلو نہ [illegible] کشن لال تو آج اس عالیشان عمارت کی جگہ [illegible] کا ڈھیر دیکھتے اس خدا کے بندہ ہی نے تو میری جان بچائی ہے"

"اچھا تو تم نے داروغہ صاحب کی کچھ خاطر تواضع کی؟" داروغہ صاحب نے اپنے چہرے پر انکسار اور شرم کے مصنوعی آثار پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "کشن لال ہم لوگ تو بس لوگوں کی جان و مال عزت آبرو کے محافظ ہیں خیر ملی کہ دور سے دوڑے آکر واقعات کی تحقیق کی ملزموں کو سزا دلوائی اگر ہم لوگ [illegible] رکار [illegible] نہ رہیں تو دن دہاڑے ڈکیتیاں ہونے لگیں میری خاطر تواضع سے کیا مطلب؟ انگریزوں نے تو ہم لوگوں کو یہی سکھایا ہے کہ جب داروغہ صاحب آئیں تو ان کے بال بچوں کے لئے ان کی جیب میں ضرور کچھ نہ کچھ رکھ دینا چاہئے"

"چھوڑیئے ان باتوں کو" ذرا انکسار کے ساتھ داروغہ صاحب نے کہا۔

حسین بخش نے کہا۔ "نہیں ہمنا بے چھوڑا کیوں جائے آپ کو میں خوش کر دوں گا مگر ان [illegible] کو تین تین سال کی قید دلوا کر رہئے"

کشن لال نے کہا "حسین تم جاؤ اور گن کر پانچ لے آؤ" داروغہ صاحب بول اٹھے "پانچ تو بہت کم ہوتا ہے اتنے بڑے دربار سے پورا ایک ہزار ملا تو کیا ملا"

حسین بخش کبھی داروغہ صاحب کبھی کشن لال کو دیکھتے تھے

[illegible] لال نے کہا کہ "ابھی تو آپ صرف پانچ سو پر ہی اکتفا کیجئے۔ آپ گھبراتے کیوں ہیں آپ تو یہاں نئے نئے آئے ہیں، وہ تدبیر بتلاؤں گا کہ تینوں گھروں میں آسمان سے روپے برسنے لگیں گے" اور پھر انھوں نے حسین بخش سے کہا جاؤ جلد از جلد پانچ سو روپے لے آؤ حسین بخش اٹھ کر اندر چلے گئے تو کشن لال نے کہا "داروغہ صاحب اس مقدمہ کو چلانے کی میری خواہش نہیں حسین بخش خواہ مخواہ ان لوگوں کے پیچھے پڑے ہیں"

"آپ ایسی بات کیوں کہہ رہے ہیں" چائے کی ایک چسکی لے کر داروغہ نے پوچھا۔

اس لئے کہ جن لوگوں کو گرفتار کیا گیا ہے ان سے کچھ ملنے کی امید نہیں سب کے سب غریب اور قلاش ہیں اگر ایک مقدمہ میں دس دس ہزار ہم لوگوں کے پلے نہ پڑا تو پھر وہ مقدمہ ہی کیا حسین بخش تو سمجھتے ہی نہیں اگر میں نہ رہتا تو

ہرگز انھیں ایسی رائے نہ دیتا آپ تحقیقات جاری رکھئے مگر آخر میں فائنل رپورٹ دے دیجئے میں حسین بخش کو سمجھا دیتا ہوں وہ میری بات مان جائیں گے۔

"اب آپ دونوں مل کر جو کہیں وہی کروں گا۔"

مگر ابھی یہ راز حسین بخش پر ظاہر نہ ہو آپ ایک ہفتہ کے بعد میرے یہاں تشریف لایئے وہیں حسین بخش کو بھی بلوا لوں گا اور پھر کوئی ایسی چال چلی جائے کہ آپ کا بھی شہرہ ہو اور ہماری بھی گوٹیاں لال ہوں اور پھر جب یہاں سے جائیں تو ڈی ایس پی ہو کر جائیں موقع آتا نہیں لایا جاتا ہے اگر حکومت کی نظروں میں سرخروئی حاصل کرنی ہو تو آپ کو اس بڈھے کی باتوں پر عمل کرنا چاہئے۔ میری عمر دیکھتے ہیں نا اسی دشت کی سیاحی میں گذری ہے۔

اتنے میں میاں حسین بخش پانچ سو روپئے لے آئے اور داروغہ صاحب کے ہاتھوں میں دے دیا داروغہ صاحب نے روپئے اپنی جیب میں رکھ لئے۔

حسین بخش نے پوچھا "تو آپ ان قیدیوں کو اسی وقت تھانے لے جایئے گا؟"

کشن لال بول اٹھے "نہیں انھیں ضمانت پر چھڑا لیا جائے۔"

"کیوں؟"

"یہ لوگ اگر حراست میں چلے گئے تو فرار شدہ بدمعاشوں کا سراغ نہیں مل سکتا۔"

"ہاں بات تو معقول ہے۔"

داروغہ صاحب نے ایک سپاہی کو آواز دی سپاہی کے آنے پر داروغہ صاحب نے اس کے ہاتھ میں ایک سو روپئے دے کر کہا یہ تم لوگوں کا حصہ ہے جا کر ان قیدیوں سے کہو اگر کوئی ضمانت دار ملے تو وہ لوگ بلوا لیں میں سب کو ضمانت پر چھوڑ دوں گا۔

سپاہی کے جانے کے بعد حسین بخش نے کہا۔ داروغہ صاحب وہ تو کہئے خدا مجھ پر خاص مہربان ہے کہ عین وقت پر اس نے کشن لال کو بھیج دیا۔

اور پھر تینوں باہر آئے قیدی ضمانت پر چھوڑ دیئے گئے پھر ملزم نے کشن لال کے جان و مال کی دعائیں دی اور اپنے گھر چلدیئے۔

داروغہ صاحب اپنے سپاہیوں کے ساتھ تھانے چلے گئے اور کشن لال گاڑی پر سوار ہو گئے۔

گاڑی کے پاس حسین بخش نے آکر کہا "کشن لال! باتوں باتوں میں وقت بھی گذر گیا اور میں تمہاری خیریت بھی نہ پوچھ سکا۔ کہو اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے۔"

"کام ادھورا چھوڑ آیا ہوں مگر بھگوان نے چاہا تو یہ رشتہ ہو کر رہے گا۔"

"کچھ میں بھی سنوں۔"

"لڑکا تو مجھے پسند ہے مگر اس کے پتا جی بڑے لالچی ہیں مظفر پور گیا تو وہاں ان سے ملاقات نہ ہوئی معلوم ہوا وہ موتیہاری چلے گئے ہیں اور ایک ہفتے کے اندر نہیں آسکتے مجبوراً میں موتیہاری گیا اور ان کا پتہ لگا کر ان سے ملاقات کی پہلے تو وہ سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتے تھے مگر جب میں نے کہا شرما جی میں تلک میں تین ہزار روپے لڑکے کی نذر کرنے والا ہوں تو بولے یہ کون سی بڑی ہمت آپ نے کی ہے آٹھ ہزار تو مجھے مظفر پور ہی میں ملتا ہے۔

"بڑا لالچی ہے کمبخت کیا اس کے لڑکیاں نہیں ہیں۔"

(باقی)

اطلاع

سٹیٹ بنک آف انڈیا کے ایک سینئر آفیسر شعری مجموعہ "متوازی سائے" کے مصنف جناب ادم پرکاش آزاد بہاولپوری ۴۰ سال کی طویل ملازمت کے بعد ۳۰ نومبر ۱۹۸۵ کو سبکدوش ہو گئے ہیں۔ موصوف غازی آباد میں مقیم ہیں۔

Dr. Zakir Husain Library

ناشرین اور تاجران کتب

متوجہ ہوں!

دلی اردو اکادمی اردو ناشرین اور تاجران کتب کی ایک جامع اور ضخیم ڈائرکٹری شائع کر رہی ہے۔ اس ڈائرکٹری کے لئے اپنے ادارے کا مختصر تعارف (کب قائم ہوا / کتنی کتابیں شائع کی ہیں۔ کسی دوسری زبان کی کتابیں شائع / فروخت کرتے ہیں۔ نصابی کتابیں شائع / فروخت کرتے ہیں یا متفرق وغیرہ) اور دیگر تفصیلات زیر ترتیب ڈائرکٹری کے لئے ذیل کے پتہ پر جلد از جلد ارسال فرمائیں۔

اردو ڈائرکٹری

دلی اردو اکادمی۔ سن لائٹ بلڈنگ

آصف علی روڈ۔ نئی دہلی ۲ ۱۱۰۰۰۲

فون ۲۵۶۲۱۱

غزل

ایم۔ آر قریشی سوز ریوا

نارسا آہِ رسا ہو یہ ضروری تو نہیں
پوری ہر ایک دعا ہو یہ ضروری تو نہیں
تم مٹا دو گے مجھے کیوں یہ قسم کھاتے ہو
بس تمہارا ہی خدا ہو یہ ضروری تو نہیں
میں نے بھی برق چمکتی ہوئی دیکھی ہے مگر
آشیاں میرا جلا ہو یہ ضروری تو نہیں
آپ خود دعوتِ نظارہ مجھے دیتے ہیں
صرف میری ہی خطا ہو یہ ضروری تو نہیں
عشق میں جان کئی لوگوں نے دے دی سچ ہے
زہر سب نے ہی پیا ہو یہ ضروری تو نہیں
گدگداتی ہے جو دلِ اہلِ چمن کا اے سوز
تیرے دامن کی ہوا ہو یہ ضروری تو نہیں

غزل

عبدالستار عاصی دبوری (کویت)

شانِ مقتل کو پھر سے زندہ کر
اپنے شوریدہ سر کا سودا کر
راہ میں پاؤں ڈگمگائیں اگر
اپنی بیساکھیاں نہ دکھا کر
واسطہ ہے کئی رُتوں کا تجھے
اجنبی بن کے یوں نہ گزرا کر
اپنا اپنا ضمیر ہے ناداں
چڑھتے سورج کی تو نہ پوجا کر
ہم بھکاری ہیں بس ترے در کے
ہم کو نفرت سے یوں نہ دیکھا کر
عاصی ہر اک ردیف بولے گی
اپنی غزلوں میں سوز پیدا کر

غزل

ڈاکٹر سعید اکبر قمر ریواڑی

ترا گر آشیاں بردوشِ گلشن سے ہوا گزری
بتا دل پر ترے کیا بلبلِ رنگیں نوا گزری
آغازِ اُلفت میں پریشانی کا یہ عالم
نہ جانے انتہا کیا ہو جو ایسی ابتدا گزری
مہک اٹھا جہاں کا کونہ کونہ اس کی خوشبو سے
ترے دامن سے چھو کر بھی اگر بادِ صبا گزری
نہ کر فکرِ ملالِ زندگی ہم غم کے ماروں کا
گزر جائے گی جیسی آج تک اے بے وفا گزری
نہ دوزخ نے جگہ دی اور نہ جنت ہی ملی ہم کو
پرستاروں پہ تیرے یہ صنم روزِ جزا گزری
ڈبو دی کس لئے منجدھار میں کشتی محبت کی
ترے دل پہ بتا کیا کچھ نہیں اے ناخدا گزری
اگر وعدہ نہ کرتے تو تمہارا کیا بگڑ جاتا
تمہاری بے وفائی سے قمر کے دل پہ کیا گزری

غزل

یوسف ثانی سلیمان پالی

جہاں وہ گلبدن ٹہلتا رہا ہے
ابھی تک وہ دریچہ مہکتا ہے
ہوا تھا نیم شب وہ بے تکلف
پھر اپنا بھی پتہ کس کو رہا ہے
کبھی دیکھا نہیں اس نے مرا گھر
تو گھر گھر کیوں مرا چرچا رہا ہے
ہیں یکجا ماہ و انجم اور جگنو
الٰہی یہ سب احساس کیا ہے
ہوئی متوالی پچھلی رات ثانی
سویرے کا نگہباں پھر خدا ہے

بمبئی مرکنٹائل کوآپریٹیو بنک لمیٹڈ

رجسٹرڈ آفس ۷۸ محمد علی روڈ بمبئی ۴۰۰۰۰۳

دہلی آفس نمبر ۳۶۵۵ نیتاجی سبھاش مارگ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

- ہمارے یہاں شرح سود تمام نیشنلائزڈ اور شیڈولڈ کمرشل بنکوں کے مقابلہ ایک فیصد زیادہ ہے۔
- ہندوستان کا پہلا کوآپریٹیو بنک جس کو زر مبادلہ میں کاروبار کے لئے لائسنس جاری کیا گیا
- ہمارے بنک میں اوقاف کے جمع شدہ رقم کی آمدنی دفعہ ۱۳ (۵) (الف) (۱۱۱) انکم ٹیکس ایکٹ ۱۹۶۱ء کے تحت انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہے

اس کے علاوہ

ہم آپ کے آرام و آسائش کی ضروریات مہیا کرنے کے لئے آسان قسطوں پر قرضہ فراہم کرتے ہیں۔ ایک فیصدی کا فرق بہت بڑا فرق ہے۔ یہ آپ کی رقم میں ہزاروں روپیہ کا اضافہ کرتا ہے آپ بھی اس کا فائدہ اٹھائیں

زین جی رنگون والا — **حبیلی ایس ڈاکٹر** — **شمیم کا**

مینیجنگ ڈائرکٹر — (چیرمین) — اسسٹنٹ جنرل مینیجر

فون نمبر: ۲۶۸۲۶۶ — ۲۶۴۳۷۲

باب انتقاد

(ادارہ)

سکوت گل :-

جناب ثاقب امروہوی ایڈووکیٹ کا مجموعہ کلام ہے
۲×۲۳ سائز کے ۱۲۸ صفحات پر پھیلا ہوا ہے
لوم نہیں کہ ثاقب امروہوی وکالت میں کیسی قانونی
کافیال کرتے ہوں گے مگر ان کی شاعری ہر انداز
قابلِ تعریف ہے کوئی ایسی صفحہ کھولئے آپ مطلع
لحقیقت مطلع الوار پائیں گے۔ ہر غزل کے
شعار پر قاری داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا جس
م صاف۔ شستہ اور فن شاعری کا بہترین نمونہ
اسی قدر مجموعہ بھی بہت ہی صاف شستہ اور فن
ت کی قابلِ تعریف پیش کش ہے پھر وہ باذوق
۔ ملکہ بہت ہی اچھے اشعار کا دلدادہ ہے۔ اس
سکوتِ گل واقعی نعمت ہے۔ کاغذ ایسا کہ شاید
یں اس سے بہتر کاغذ دستیاب نہ ہو سکے۔ تہذیب
ب امروہوی نے گرد و پوش کے ڈیزائن میں
رت فن کا مظاہرہ فرمایا ہے اس کی داد نہ
ر [illegible] کی دلیل ہوگا۔ چھپائی اس قدر
کی آنکھوں کی روشنی بڑھائے اور کتابت
ندر سے جلی ہے مگر ہے قابل تعریف۔ قیمت
۔۔ ہے۔ مصنف سے محلہ قریشی امروہہ یو پی
شان ہند سے طلب فرمائیے۔

...اجگان :-

دراس یونیورسٹی کی تاریخی سیریز ۸ "چولا راجگان (
م) انڈین کاونسل آف ۔۔۔ ریسرچ نئی
ہے اشتراک سے ترقی اردو بیورو نے بڑے اہتمام
ائع کیا ہے۔ چولا آرٹ کی اس بے مثال

تصنیف کے مصنف کے۔ اے نیل کنٹھ شاستری
ایم اے امیریٹس پروفیسر تاریخ ہند و علم آثار قدیمہ
یونیورسٹی آف مدراس نیز پروفیسر آف
یونیورسٹی آف مدراس ہیں اور مترجم شریمتی ایدمن
سیٹھی ایم اے ہیں اس کتاب کا پہلا ایڈیشن
۱۹۳۵ء اور ۱۹۳۷ء میں دو جلدوں میں شائع
ہوا تھا۔ اور ہر جلد کے ساتھ منتخب کتبوں کا
ضمیمہ بھی شائع کیا گیا ہے مگر اس ایڈیشن میں یہ ضمیمہ
شامل نہیں کیا گیا کیونکہ اب اس کی ضرورت کئی وجوہات
کے باعث نہیں رہی۔

مصنف نے اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ چولا آرٹ
کے مکمل جائزے کی راہ میں بہت سی مشکلات حائل
ہیں کیونکہ جس طرح فرانسیسی اور ولندیزی ماہرین
آثار قدیمہ نے کمبا انکام اور جاوا میں کام کرتے
ہوئے جو تاثر پیدا کیا ہے وہ ضروری وسائل
کی کمی کے باعث اس ضمن میں پیدا نہیں کیا جا
سکتا۔ ہاں مصنف نے ایک نئے باب کا اضافہ
کیا ہے جس میں مختصر طور پر چولا آرٹ کی تاریخ کے اہم
پہلو کافی وضاحتی تصاویر کے ساتھ واضح کر دیئے
گئے ہیں۔ مصنف نے تمام متن پر احتیاط کے ساتھ نظر
ثانی فرمائی ہے اور جزوی طور پر اس کے بعض حصوں کو
تازہ انکشافات اور تاویلوں کی روشنی میں از سرِ نو بھی
لکھا گیا ہے۔ اور چند جاگیرداروں کے خاندان
سے متعلق کچھ ضمنی مواد جو بیان میں کچھ رکاوٹ ڈالتا
دکھائی دیتا تھا۔ چھوڑ دیا گیا ہے اور حاشیے اب
ہر باب کے خاتمے پر یکجا کر دیئے گئے ہیں جنہیں یہ جانیے

ہر صفحے کے نیچے بکھرے ہوئے تھے۔ اس ایڈیشن میں جناب کے۔ آر۔ سری نواسن کے نجی مجموعۂ تصاویر سے بھی کچھ تصاویر شائع کی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ پہلے ایڈیشن کی نسبت دوسرے ایڈیشن میں بہت کچھ اضافہ اور ترمیم کی گئی ہے۔

چولا آرٹ یہ مفصل تاریخ ۱۱۵ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے یہ کتاب ایسی ہے کہ اسے ہر لائبریری میں رکھا جائے تاکہ آثار قدیمہ سے دلچسپی رکھنے والے حضرات چولا آرٹ کے بارے میں مکمل واقفیت حاصل کر سکے۔ ترقی اردو بیورو کا یہ کارنامہ یقیناً اس کی نیک نامی میں اضافے کا باعث ہوگا۔ اس بیش بہا تصنیف کی قیمت ساٹھ روپیہ ہے۔ ترقی اردو بیورو ویسٹ بلاک ۸ آر۔ کے پورم نئی دہلی ۱۱۰۰۶۶ سے یا دفتر شان ہند نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے یہ کتاب حاصل کی جاسکتی ہے۔

مولیئر:-

مولیئر کے منظوم اور نثری ڈراموں سے سترھویں صدی میں فرانس کی تہذیبی علمی و ذہنی زندگی سے متعلق جس موثر انداز میں روشنی اسی اور اس معاشرہ سے واقفیت زیر نظر کتاب میں شائع شدہ مولیئر کے دو ڈراموں "بیویوں کا مدرسہ" اور تارتوف سے حاصل ہوتی ہے اس سے یہ اندازہ بخوبی ہوسکتا ہے کہ سترھویں صدی میں کلاسیکی ڈراموں کے قواعد میں زمان، مکاں اور حال کی تثلیث کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ اور فرانسیسی ڈرامہ نگاروں نے سترھویں صدی کے وضع کئے ہوئے کلاسیکی اصولوں کی سختی سے پابندی کی۔ فرانسیسی زبان کے بڑے ڈرامہ نگار کورنئی، مولیئر اور سین اسی نوکلاسیکی عہد کا عطیہ ہیں۔

ثریا حسین نے سترھویں صدی میں فرانس کا ادبی سیاسی ماحول، مولیئر کا فن اور اس کی معنویت، مولیئر۔ خاندان، حالات زندگی، عنوانات کے زیر تحت شروع میں تیاری کے لئے مولیئر کے ڈراموں کے بارے میں مفصل واقفیت بہم پہنچانے کے ساتھ ساتھ فرانسیسی ڈرامہ نگاری پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے۔ دونوں ڈرامے پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ "بیویوں کا مدرسہ" "ہدایت نامہ بیوی" پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ کاش کہ یہ ہدایت نامہ ہمارے یہاں کی خواتین پڑھ لیتیں۔ گو خواتین کی اکثریت قدامت پسندی اور پور زدہ ہونے کا فتویٰ صادر فرمائیں گی مگر تین صد سال گزر جانے کے بعد بھی اس ہدایت کی حرف بہ حرف اپنی جگہ پر ایک ایسی اٹل حقیقت ہے کہ جسے شاید رہتی دنیا تک بھی جھٹلایا نہ جاسکے گا۔

یہ کتاب بھی ترقی اردو بیورو۔ ایسٹ بلاک ۸۔ آر۔ کے پورم نئی دہلی ۱۱۰۰۶۶ نے شائع کی ہے اس خوبصورت کتاب کی قیمت پندرہ روپیہ ہے۔ خاتون جو اپنے شوہر کے دل کی ملکہ بننے کی خواہشمند ہو اسے مولیئر کے ڈرامے، بیویوں کا مدرسہ ضرور پڑھنا چاہئے۔ دفتر شان ہند نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے یہ کتاب دستیاب ہے۔

بقیہ: زاویہ ہائے نگاہ

پہلو کو نظر میں رکھتے ہوئے اُن سے گلہ گزار ہوتا۔ مگر میں نے ایسا نہیں کیا کیونکہ میں جانتا تھا کہ مالک رام صاحب کچھ بھی کریں مگر عرش اپنی صحیح رائے کے اظہار میں نہیں ہچکچائیں گے۔ یہ بھی تو انسان کے کردار کی بلندی کا ثبوت ہے۔

جناب ضیا فتح آبادی بڑی شگفتہ اور سادہ نثر لکھتے ہیں اسی کے ساتھ اسلوب میں تقلیل الفاظ کی خوبی پائی جاتی ہے وہ چاہتے تو مضامین کو کھینچ تان کر بڑھا سکتے تھے مگر انھوں نے دریا کو کوزہ میں بند کرنے کی کوشش کی ہے مزید یہ کہ ہر سطر اُن کے خلوص کی آئینہ دار ہے۔

مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ جناب ضیا فتح آبادی خوش فکر شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب اسلوب نثر نگار بھی ہیں امید ہے زاویہ ہائے نگاہ کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ زاویہ ہائے نگاہ دفتر شان ہند دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے دستیاب ہے۔

Phones 275602
THE SHAN-E-HIND MONTHLY NEW DELHI-110002
Regd. with the Registrar of Newspaper 14/57
Regd. No. D- (DN) 353
DECEMBER 1985

خرید کر پڑھئے
مانگ کر پڑھئے :
یا پھر
چوری کر کے پڑھئے

یہ ہے ہی اتنا خوب صورت،
اتنا دل کش،
اتنا مکمل کہ اسے کسی طرح بھی
حاصل کریں کیوں کہ
یہ فیض کی شخصیت اور فن پر ایک
شان دار ادبی دستاویز ہے ۔ اس میں شامل ہیں :

قیمت : پندرہ روپے

- ★ خلوت اور جلوت کے بھید کھولنے والے ذاتی نقوش۔
- ★ نادر و نایاب تصویریں۔
- ★ سدا بہار، ہزار رنگ و منتخب کلام۔
- ★ فیض کی شخصیت کے وہ ڈھکے چھپے گوشے جن پر سے پہلی بار پردہ اٹھایا گیا ہے ۔
- ★ ہندوستان، پاکستان، روس اور انگلستان کے دانش وروں کی مشترکہ کاوشوں کا گلدستہ۔

ساری اردو دنیا میں شبستان کے "فیض نمبر" کا چرچا ہے

اس سے پہلے کہ اسٹاک ختم ہو جائے آج ہی اپنے قریبی نیوز ایجنٹ سے طلب کیجیے یا براہ راست ہم سے منگوائیے۔

ڈائجسٹ، آصف علی روڈ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲